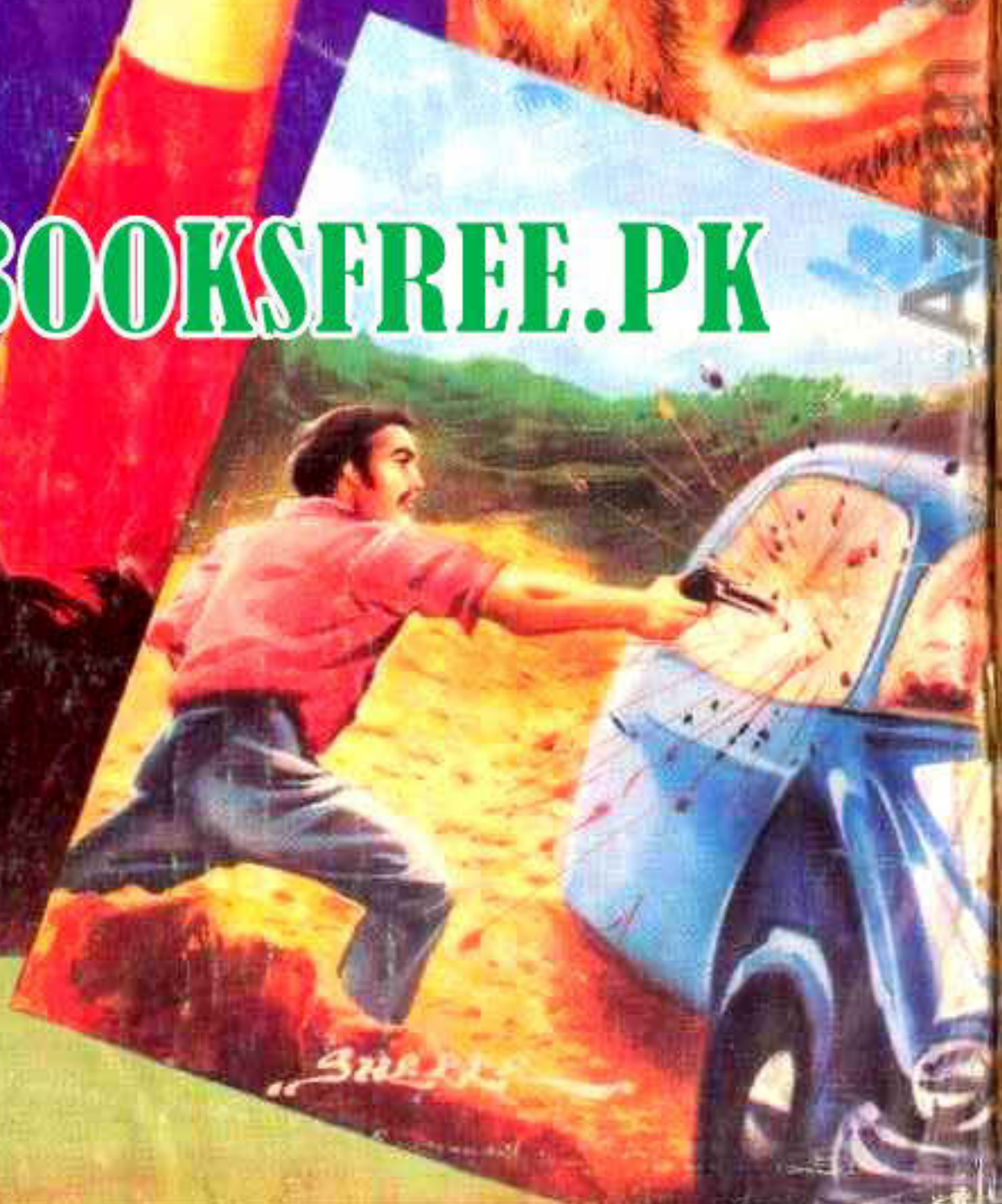
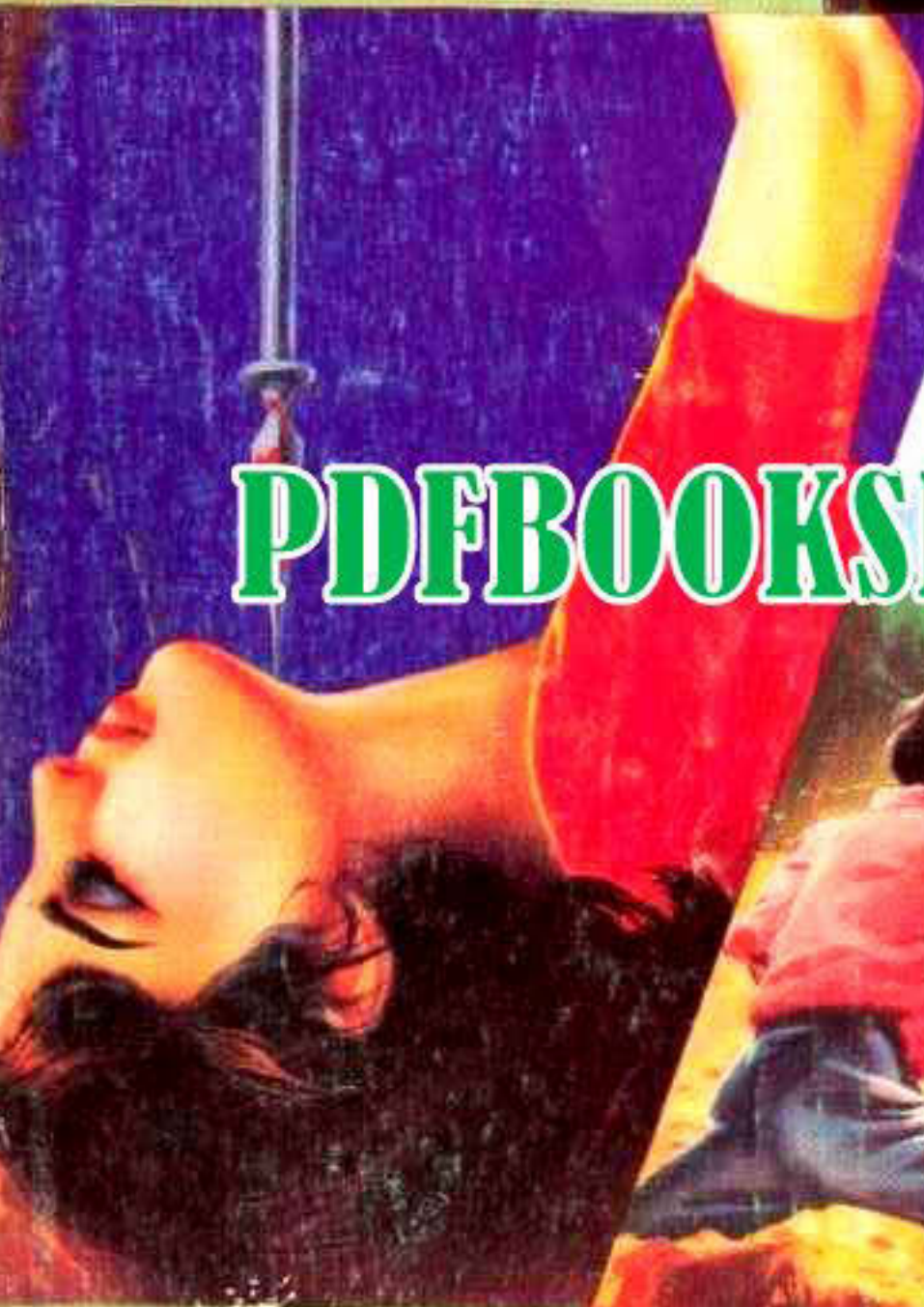


اولادِ گد



PDFBOOKSFREE.PK



نئے افق کا طویل ترین سلسلہ جس کا قارئین بے چینی سے انتظار کرتے تھے



پنجاب کے گھبرو جیائے خرم سلطان چوہدری کی سرگزشت
جس نے بدی کے خلاف قدم قدم جہاد کیا

آوارہ گرد

چوتھا حصہ

تحریر
ابن آدم

احیاء

پوسٹ بکس ۲۱۴۷ ناظم آباد، کراچی

Ali and Azam

Aleeraza@hotmail.com
Aazzamm@yahoo.com
(Lahore & Sahiwal)



آ رہا ہوں! اُس نے ریسورڈ رکھ دیا اور پلٹ کر بولا مو معاف کر
بلیک اسٹون! میرا ایک جہان نارا من ہو کر جا رہا ہے آپ لوگ
باتیں کریں! دروازہ کھول کر وہ دوڑتا ہوا نکل گیا۔
”تم بہت اچھے لدا کار بھی ہو خرم سلطان!“ نورین پُرتا کُتر
آوازیں بولی ”داؤد خان جیسے شخص کو تم نے جڑوں سے ہلا کر رکھ
دیا ہے اب وہ تمہیں ساتھ لے جائے گا کیا تم...؟“

”نہیں نورین ابھی نہیں! داؤد خان یقیناً اپنی نئی دریافت کا
ذکر اپنے پاس سے کرے گا اگر یہ احمق ہے تو ملک نواز احمقوں
کی جنت میں نہیں رہتا۔ وہ ان دنوں جاگتی آنکھوں سے خرم توہمہ رز
کے خواب دیکھ رہا ہوگا وہ نئی دریافت طلب کرے گا اور میرا
مصنوعی چہرہ فروج لے گا!“

”تو پھر اس ڈولے کا مقصد؟“
”چند دنوں کے لیے میں غائب ہو جاؤں گا، تم اُس کے قریب
رہ کر دیکھو گی ملک نواز سے ذکر کرتا ہے تو ملک کا کیا رد عمل ہوگا
اگر اپنے ملک ہی محدود رہا تو پھر میں اُس سے مل لوں گا۔“
”تھیک ہے نورین بولی! چند دن تم میرے جہان رہو گے
میرے پاس محفوظ فلیٹ ہے۔“

”نہیں جان! فی الحال اپنی ذات کا ہی اسیر رہنے دو، میں
واپس پنڈی جا رہا ہوں، ورنہ کوئی دوسرا مارکیٹ پر اپنا پرچم لگا
دے گا۔ میں نے خوریز جنگ لڑ کر قبضہ کیا تھا۔“
”اُنکی اجازت لے کر اندر داخل ہوئی، رُخسے میں چاندی کے دو
کپ تھے۔“

”ماشر کے لیے؟“ نورین نے دو کپ دیکھ کر پوچھا۔
”اُن کے لیے! ادھر بھوادی ہے دلبر خان اور کیشو بھڑ گئے تھے۔“

”ایک حوالے سے میں پاکستانی ہوں! میں نے بتایا تو وہ
تڑپ کر رک گیا! میرے والدین کا تعلق اسی قوم اور ملک سے ہے
مگر میں اپنی شناخت گم کر بیٹھا ہوں۔“
”سنا ہے حسن کارگر سفارش ہوتا ہے! داؤد نے زیدہ لگا ہوا
سے نورین کو دیکھتے ہوئے کہا! اگر مشرق کا حسن سفارش کرے تو آپ
مان جائیں گے نا؟“

”ہاں داؤد خان! میں نے اثبات میں گولن ہلائی! مشرق
کی یہی کشش مجھے یہاں لے آئی ہے میرے بڑوں نے میری
اس مجبوری سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے میرے حوالے مشرقی ونگ کر
رکھا ہے میں سال کا بیشتر وقت یہاں گزارتا ہوں۔ یہاں سے مال
اور مشرق کی چاندنی جیسی یادیں ساتھ لے جاتا ہوں۔“
”نورین کیا خیال ہے آپ مشرق کی نمائندگی کرتے ہوئے
مشر اسٹون کو اس چاندنی میں رہنے کی درخواست کریں گی؟“

”دل و جان سے! نورین! طلاق ہوئی بولی روکاش ایسا ہو جائے!
”آتی جلدی نہیں دوستو! میں نے قہقہہ لگایا میں گیلے کا
پودا نہیں ہوں، بہر کیف میں اس نورین کی خاطر اپنا قیام بڑھا سکتا ہوں۔“
”آپ کو کبھی احساس نہیں ہوا بلیک اسٹون! داؤد چلتے ہوئے
بولا! آپ کے ملک کو آپ کی ضرورت ہے۔“

”میں اپنے ملک اور قوم کی خدمت ہی تو کر رہا ہوں! مشر
داؤد خان! میں نے ٹھوس بیسے میں جواب دیا! یہاں سے زہر
لے جاتا ہوں اور وہاں سے زہر مبادلہ لاتا ہوں۔“

”بے شک!“ داؤد ملی فون پر ہجک گیا! وہ آپ کا جذبہ قابل
قدر ہے! اُس نے ایک نمبر ڈال کیا! دلبر خان جب فارغ ہو
جائے تو اُسے ہونٹ چھوڑ آنا۔ وہ نہیں! تم سب گدھے ہو! میں

کافی کڑوی مگر خوشبودار تھی۔ میں مستقبل کے سہانے سنوں جیسی باتیں کرتا رہا تھا۔ جھوٹی اور منافقانہ باتیں جو ایک جذباتی نوجوان لڑکی کے لیے خواب اور گولیوں جیسا اثر رکھتی تھیں۔ میں نے نورین کی آنکھوں میں غم کی سُرُخ سُرُخ دُوریاں ابھرتی دیکھ کر مسالہ کچھ اور بھی تیز کر دیا تھا۔

پھر مجھے بھی سُور سا آنکھ لگا تو میں نے سر کو جھٹک کر دیکھا۔ نورین شکل آنکھیں کھول رہی تھی۔ اُس نے بھی سر کو دو بار جھٹکا تھا۔ تب ہی میرے اندر خطرے کا الارم بجنے لگا۔ میں نے اپنی تمام تر قوت جمع کرتے ہوئے خود کو بیدار رکھنے اور اُٹھنے کی کوشش کی تھی۔ لیکن میں ہلک کر رہ گیا تھا۔ میرا ذہن جاگ رہا تھا لیکن جسم پر غنودگی کا غلبہ حاوی ہو گیا تھا۔ میں سوچ سکتا تھا مجھے معلوم ہو گیا تھا کہ داؤد خان نے اپنی ذہانت کا زہر میری رگوں میں داخل کر دیا ہے۔

جب وہ دروازے میں آکر کھڑا ہوا تو میں اُسے کھلی آنکھوں سے دیکھ رہا تھا۔ اُس کے پیچھے چار آدمی کھڑے تھے۔ وہ ہولے ہولے چلتا ہوا میرے قریب ہو کر بولا۔ مجھے جو لوگ پسند آ جاتے ہیں اُن کو یونہی روک لیا کرتا ہوں۔ وہ جھکا اور میرے بال منہ میں جکڑ کر جھکے دینے لگا۔ پھر چہرے پر ہاتھ پھیرتا ہوا پیچھے ہٹ گیا۔ صرف ایک رات کے لیے بیک اسٹون... اگر تم کالے پتھر ہی ہوتے تو معذرت کر لوں گا۔ اُس نے پٹ کر اپنے آدمیوں کو اشارہ کیا اور اُنہوں نے اندر آکر سُرُخ پھر بچھا دیا اور مجھے اُٹھا کر لٹا دیا۔

مجھے باہر نہیں لے جایا گیا تھا۔ ہول کے ہی ایک کمرے میں لے جا کر ایک لڑکی نے انجکشن لگایا۔ اگر سرخ میرے سامنے نہ ہوتی تو مجھے انجکشن کا احساس تک نہ ہوتا۔ جسم اُنسان ہو گیا تھا کہ جب اُس نے رگ میں سوئی اتاری تو مجھے درد کا احساس تک نہ ہوا تھا۔ صبح میری آنکھ جب کھلی تو ایک میسلی کا پٹر اوپر سے گور رہا تھا۔ میں نے چونک کر دائیں بائیں دیکھا۔ میں کھلے آسمان تلے کسی عمارت کی چھت پر تھا اور میرے ارد گرد اور اوپر لوہے کا موٹی سلاخوں کا پیچہ تھا۔ پیچہ کو فرش سے پیوست رکھنے کے لیے کولوں میں زنجیروں تھیں جن کے سرے فرش میں گڑھے کولوں میں پھنسے ہوئے تھے۔

میرے ذہن میں اپنے دشمن کے بارے میں دو باتیں آئی تھیں۔ وہ مجھ سے خوفزدہ تھا۔ مجھے سب کا سب کا کوارنے کا فیصلہ کر چکے تھے۔ پہلی صورت میں اُن کو سودا بازی کرنا تھی اور میں نے خوری فیصلہ ہی کیا تھا کہ اس آہنی پیچہ سے نکلنے کی

ہر شرط اور قیمت منظور کر لوں گا۔

میں ابھی دوسری صورت کے بارے میں سوچنے ہی جا رہا تھا کہ قدموں کی دھمک سنائی دی۔ گردن موڑ کر دیکھا، داؤد خان کسی پالتو کتے کی طرح دم ہلاتا ملک نواز کے پیچھے پیچھے آ رہا تھا۔ پیچھے کی اونچائی بہت کم تھی اگر بیٹھنا چاہتا تو گھٹنوں اور کہنوں کے بل سمجھنے کی حالت تک جاسکتا تھا۔ وہ پوزیشن مجھے گوارا نہ تھی اس لیے کروٹ کے بل ہو گیا تھا۔

”داؤد خان!“ ملک نواز نے داؤد کے شانے پر پتھری دی۔ تم دہرے انعام کے مستحق ہو، تم نے میرے جہان کے شایان شان رہائش کا انتظام کیا ہے۔ کیوں خرم سلطان! خیر کو ایسے ہی پیچھے میں رکھا جاتا ہے نا؟“

”میں بھی اپنے میزبانوں کا تہ دل سے ممنون ہوں۔“
”جاؤ داؤد خان میرے کتے کے برتن میں خستہ کھانے کے لیے ناشائے آؤ۔“

”آپ اپنی بات کی تردید کر رہے ہیں ملک صاحب! میں نے بھرپور کہا۔ خیر برتنوں میں ناشائے نہیں کیا کرتے۔“
”ہاں“ ملک سکرایا۔ لیکن میں تھا۔ اندر سے شیک کی تمام خصوصیات اور قہر میں سلب کر کے تمہیں اپنا وفادار کتا بنانا چاہتا ہوں۔ ابتدا رات سے ہوئی۔“

”نہیں ملک نواز! میں نے مضبوط بے میں کہا تو تمہیں ماہر حیوانات سے مشورہ کر لینا چاہیے تھا۔ شیر آخری سانس تک اپنی فطرت پر ہی زندہ رہتا ہے۔“

”جاؤ داؤد خان!“ ملک نواز بھڑک کر بولا۔ اپنے ساتھ کتا بھی لانا، وہ اسے کتوں کی طرح کھانا سکھائے گا۔“
”اپنا وقت ضائع کرو گے ملک!“

”میں تفریحاً ایسے کھیل کھیلتا رہتا ہوں۔ برادر! انسان اور شین میں کچھ تو فرق ہونا چاہیے۔“
”میرا خیال تھا کہ تم دل خوش کن خبریں سننا پسند کرو گے۔“

”پہلے دشمنس مناظر دیکھوں گا۔“ ملک نے کہا۔ وہ منظر کیا دہشتیں ہو گا جب خرم سلطان چوہدری اور ایک کتا ایک ہی برتن میں کھائیں گے۔“

”یہ حسرت تم دل میں لے کر مر سکتے ہو۔ ملک نواز مگر خرم سلطان کو مجبور نہ کر سکتے۔“

”موت کی آنکھیں بڑی ظالم ہوتی ہیں چوہدری۔“
”ہاں، لیکن بزدلوں اور مجرموں کے لیے۔“

”تم بھی تو اوقات نہیں ہو۔“

”چھوڑو ملک!“ میں نے ہاتھ نچا کر کہا۔ جو کچھ پوچھنے آئے ہو پوچھو، تم جیسا شخص محض تفریح کرنے اتنی سیڑھیاں نہیں چڑھ سکتا۔ میرے پاس بہت کچھ ہے ملک نواز! اتنا کچھ کہ تم شاید سہارا بھی نہ سکو گے۔ میں نے ان دونوں میں بہت سے ناگ دیکھے ہیں جو تھاری آستین کی پناہ میں دوڑھ می تھارانی رہے ہیں اور...!“
”معاذ اللہ! بیڑیا نکلتا جھونکتا ہوا اُپر آیا۔ اُس کے پیچھے ایک شخص زنجیر ہلاتا ہوا دوڑ رہا تھا۔ کتا قریب آکر ملک نواز کے قدموں سے لپٹ گیا تھا۔“

”جیک!“ ملک نے کتے کے سر پر تھکیاں دیتے ہوئے کہا۔
”تھارے لیے بہترین شکار تازہ اور صحت مند خون، جو تھاری مرغوب غذا ہے۔“

داؤد خان جب اُپر آیا تو اُس کے ہاتھوں میں چمچی تھی اُسے دیکھ کر کتا غرے لگا تو ملک نے کتے کی گردن پر پاؤں رکھ دیا۔ دُور قریب رکھ دو خرم چوہدری گردن تک دم باہر آؤ گے۔“

چمچی میں ڈبل روٹی کے ٹکڑے، شوربا، ہڈیاں اور دی ملا کر رات بھر کیا گیا تھا۔ ملک نواز نے کتے کی گردن سے پاؤں ہٹایا تو کتا پلک کر چمچی پر گرا اور رات بھر کھانے لگا۔

داؤد خان! تم دس تک گنو گے اور رحیم داد دس کی گنتی ختم ہوتے ہی خرم کے دائیں ہاتھ کو گولی مار دے گا پھر گنتی دہرائی جائے گی اسی طرح ایک ایک گولی ہر دس سیکنڈ کے وقفے سے ماری جائے گی جب تک خون صاف کرتا جائے گا، دونوں اپنی اپنی پوزیشن سنبھال لو۔“

رحیم داد بولا اور دان کر میرے سر پر ہاتھ پھرا۔ ہو گیا داؤد خان گھٹنوں کے بل پیچھے کے قریب بیٹھ کر بولا۔ خرم چوہدری! ملک نواز کا حکم مان لو پیارے! چلو منہ نہیں کتے کے ساتھ کھاؤ۔“

”پہلے اپنے پاس سے کھو کتے کی طرح جھونک کر حکم دے۔“
”فائر!“ ملک نواز واقعی کسی پاگل کتے کی آوازیں سن رہا تھا اور ایک انگارے کے ہاتھ کی پشت سے رگڑ کھاتا گڑ گیا تھا۔

”کسی بھی ظالم اور جابر دشمن سے مقابلہ اتنا مشکل ثابت نہیں ہوتا جس قدر ایک احمق سے ہوتا ہے اور جب کوئی ذہین شخص غصے سے دیوانہ ہو جائے تو وہ حماقت کی تمام حدیں ایک ہی جگہ تک پہنچا جاتا ہے، پھر اُسے دلائل اور باتوں سے قابو کرنا اور بھی مشکل ہو جاتا ہے۔ ملک نواز بھی ایک شاطر اور ذہین آدمی تھا جس پر دیوانگی اپنی پوری شدت

کے ساتھ حملہ آور ہوتی تھی اور شاید وہ اپنا ذہنی توانا ہی کھو بیٹھا تھا۔ ایک معروف سیاست دان اور بین الاقوامی اسمگلر سے ایسی اونچی باتوں اور حرکتوں کی توقع نہیں کی جا سکتی، مگر وہ انتہائی ذلیل حد تک نیچے آ گیا تھا۔

داؤد خان نے دوبارہ گنتی شروع کر دی تھی۔ چوہدری وہ نوپر پہنچائیں نے دونوں ہاتھ اٹھا کر اُسے روک دیا۔ کیونکہ ضروری نہیں تھا کہ رحیم داد کی دوسری گولی بھی راستہ بٹلک جاتی۔ پہلی نے صرف ہاتھ کی جلد پھیل لی تھی، دوسری سوراخ بھی کر سکتی تھی۔ میں اتنی بے بسی اور خاموشی سے مرنا نہیں چاہتا تھا۔

”ہاں بولو کیا کہنا چاہتے ہو۔“ ملک نواز سفاک آوازیں بولا۔ ”سوچ لو، دونوں شرائط قبول کرنا ہوں گی تمہیں۔“

”میں نے سنا تھا۔ یہاں ہی نہیں جب میں ملک سے دُور تھا تب بھی آپ کی دونوں شہرتوں سے آگاہ تھا۔ آپ کی سیاسی بصیرت کا لو، ایوان بالائیں تسلیم شدہ ہے۔ آپ کے فیصلے ہمیشہ پارٹی اور قوم کے لیے مفید رہے ہیں اور بحیثیت بزنس میں آپ کا نام اندرون ملک ہی نہیں بلکہ بین الاقوامی سطح پر بھی کسی حد تک جانا پہچانا ہے لیکن یہاں آکر آپ کے نزدیک رہنے والوں سے مل کر میں الجھ گیا ہوں۔ میں نے چند منٹ قبل بھی اُدھر اشارہ کرتے ہوئے آستین کے سانچوں کا حوالہ دیا تھا۔ آپ کو ایک سیاست دان اور اچھے بزنس میں کی طرح کم از کم میری بات سن لینی چاہیے تھی۔ میں پیچھے ہٹ رہا ہوں، شرائط آپ جب چاہیں منوائے ہیں۔ گولیاں آپ کے پاس ہیں اور بے بس جسم میرے پاس ہے۔ مجھے جیسے لوگ مرتے ہی رہتے ہیں بلکہ ہم موت اپنے کانڈھوں پر اٹھاتے پھرتے ہیں جس طرح کل میرے ہاتھوں میں داؤد کے ساتھی مارے گئے۔ آج اُن کا نام لینے والا کوئی نہیں، میں مر گیا تو کوئی انقلاب نہیں آئے گا لیکن آپ کو کسی دن اچانک میری یاد آئے گی کہ ایک شخص کچھ بتائے بغیر مر گیا ہے۔“

”سنو لڑکے!“ ملک نواز ایک قدم آگے بڑھ کر غرا گیا۔ میری آستین میں جتنے سانپ ہیں وہ صرف دوسروں کو ڈستے ہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ ملک نواز پر کوئی زہر اثر نہیں کرتا جس نے بھی مجھے دانت مارا، وہی میرے زہر سے خود ہلاک ہوتا رہا ہے پھر بھی تمہاری باتیں میں سن لوں گا۔ ہاں بتاؤ۔“ وہ بولا اور میں گون گھٹا کر رحیم داد اور داؤد کی طرف دیکھنے لگا۔ ملک نواز میری نگاہوں

کا مقہوم بھانپ گیا۔

”یہ میرے وفادار سانپ ہیں“ وہ ستائشی نظروں سے دونوں کی جانب دیکھتے ہوئے بولا ”تم بات کرو“

”ایک سیاست دان کو اتنا خوش فہم اور غیر محتاط نہیں ہونا چاہیے“

”تم دونوں اُدھر کونے میں چلے جاؤ“ ملک نواز نے کہا اور وہ دونوں دوڑتے ہوئے سیڑھیوں تک چلے گئے۔

”بات پتہ سے شروع کروں یا لاہور سے؟“ میں نے پیٹ کے بل لیٹتے ہوئے پوچھا ”لیکن میں چاہوں گا۔ آپ میری تلاشی لے لیں۔ میں اعتماد کے ماحول میں گفتگو کرنا چاہتا ہوں۔

جب تک میری جیب میں ہتھیار رہتا ہے میرے ہاتھ کھلی کرتے رہتے ہیں کیا میں خود ریو اور نکال دوں؟“

”نہیں...“ ملک ایک دم گھٹنوں کے بل بیٹھ کر نزدیک ہو گیا۔ ”تم ہاتھ سینے کے نیچے رکھو گے“

”دائیں جیب میں ہے“ میں نے بتایا اور ملک نواز نے سر سلاخوں کے ساتھ گادیا کیونکہ مطلوبہ جیب اُس کی پہنچ سے دور تھی۔

ملک نواز کو یقیناً نا کامی کے دکھ اور ہنگامے کے احساس نے عقل سے غاری کر دیا تھا، ورنہ اُس جیسے محتاط اور شاطر شخص کو

بچہ جیسے خطرناک دشمن کی باتوں میں ہرگز نہ آنا چاہیے تھا دوسری حماقت بھی اُس سے میری خواہش کے مطابق ہی سرزد ہوئی تھی۔ عقل سے سوچتا تو بات اُس کی سمجھ میں آ جاتی... اگر

خرم سلطان کے پاس ہتھیار ہوتا تو وہ بچہ کی طرح مار نہ کھاتا۔

میری جیبوں کی صفائی داؤد خان اور نورین نے بے ہوشی کے دوران ہی کر دالی تھی اور مجھے اُن پر نہ تو غصہ آیا تھا، نہ

کوئی شکوہ تھا۔ دونوں نے اپنا ذہن اور حق استعمال کیا تھا۔ میں نے حال پھینکا تھا، اگر وہ جال میرے خلاف ہی استعمال

کرنے کا فن دکھا گئے تھے تو میرے نزدیک وہ قابل ستائش ہی تھے۔ دشمن کی اچھی اور کامیاب چال کی ایک اچھے جزیل کو تعریف کھلے دل سے کرنی چاہیے۔

میں دے ہوئے اسپرنگ کی طرح ہی تڑپ کر سیدھا ہوا تھا۔ ملک نے بھی خود کو میری دسترس سے بچانے کے لیے بڑی

پھرتی کا مظاہرہ کیا تھا لیکن بوکھلا ہٹ میں اُس کا سر سلاخوں سے ٹکرا گیا۔ پناہ وہ ایک دوسینڈ میری پھرتی سے پیچھے رہ گیا تھا۔ سارا تھیل دوسینڈ کا ہی تھا۔ جب داؤد اور رحیم داد

دوڑتے ہوئے آئے تو ملک نواز کی گردن میری گرفت میں پئی اور اُس کا ہاتھ پھیرے سے باہر پھڑک رہا تھا۔

”خبردار داؤد خان!“ میں نے ملک نواز کی گردن کو ہلکا سا جھٹکا دیا۔ اگر تم لوگوں نے کوئی حماقت کی تو اپنے چیفت کی گردن توٹی ہوئی دیکھو گے، تمہیں شاید کسی نے بتایا نہ ہو میں

گردن توڑنے میں بہت ماہر ہوں“

”رحیم داد!“ داؤد خان چیخ کر بولا۔ اس کی پیشانی کا نشانہ بولا۔ ”نہ... نہ... نہیں...“ ملک نواز ہاتھ اٹھا کر پچھلی پچھلی آوازیں چیخا۔

”داؤد خان!“ میں نے سر دلیچے میں کہا۔ اب بولو، اگر مجھے برنس پارٹنر بنانے کی پیش کش قائم ہے تو لاہور کی مارکیٹ

میری گرفت میں ہے۔ تم نے یہی بتایا تھا نا کہ ملک نواز کی موجودگی میں کوئی خود مختار نہیں ہو سکتا۔ تم ہاں کہو تو ملک نواز کی ذات نفی ہو جائے گی“

”کیا تم سنجیدگی سے بات کر رہے ہو چوہدری؟“ داؤد خان ہچکچاتے ہوئے بولا۔ ”کیا واقعی تم...“

”ہاں داؤد خان!“ میں نے جواب دیا۔ ”شاہ زمان کی بیٹی نے بھی اپنے خوابوں پر باپ کو قربان کر دیا ہے۔ اُس نے

ملک نواز کو گھیرنے کا منصوبہ بنایا تھا، ورنہ میں اتنا بڑا گدھا نہیں ہوں کہ تمہیں سواری کی اجازت دے دیتا۔ یہ سب کچھ

نورین کی ایما پر ہوا ہے اور اُسی نے مجھے بتایا تھا کہ منصوبے کے اصل خالق تم ہو۔ تم نہ صرف ملک نواز کی جگہ حاصل کرنے کا فیصلہ کر چکے ہو بلکہ نورین سے شادی کا خواب بھی دیکھ رہے

ہو۔ نورین لاہور کی مارکیٹ پر قبضہ کر کے عوفانے میں پتہ کی مارکیٹ جہانگیر سے چھپی کر میرے حوالے کرنا چاہتی ہے“

ملک نواز کی گردن پر میری گرفت بے حد دوستانہ ہو گئی تھی۔ کیونکہ اُس نے جدوجہد ترک کر دی تھی اور بے حس و حرکت پیٹ کے بل لیٹا ہمارے گفتگو سن رہا تھا۔

”ٹھیک ہے چوہدری“ داؤد خان بولا۔ ”اگر یہ منصوبہ نورین کا ہے تو مجھے تم اپنا دوست پاؤ گے“

”شکریہ داؤد خان!“ میں نے دوستانہ لہجے میں کہا۔ ”تم ملک نواز کو سزا موت سناتے ہو؟“

”ہاں...“ داؤد خان مضبوط آوازیں بولا۔ جب تک یہ بڑا درخت ہمارے اوپر کھڑا رہے گا ہم اپنا قد نہیں بڑھا سکتے۔ اور نہ ہی پھل اور ہونٹے ہیں۔ اس خاردار درخت کو اب گہری

جانا چاہیے“

”سن لیا آپ نے ملک صاحب!“ میں نے گرفت کو اور بھی نرم کر دیا۔ ”ایک ناگن اور ناگ کو پہچان لیا آپ نے“

”رحیم داد!“ ملک نواز کے حلق سے دھڑا آہری۔ ”داؤد کو شوٹ کر دو“

داؤد نہ ہٹتا تھا، جب کہ رحیم داد کے ہاتھ میں بھرا ہوا ریو اور تھاجس کا رخ ایک لمحہ قبل میری جانب تھا۔ رحیم داد نے حکم کی تعمیل میں ایک سیکنڈ سے بھی کم وقت لیا تھا۔ گولی داؤد خان کا پیچھا بکھیرتی ہوئی نکل گئی تھی اور اُس کے حلق سے ابھرنے والی احتجاجی چیخ بھی بکھر کر معدوم ہو گئی تھی۔

”رحیم داد!“ میں نے نرم انداز میں کہا۔ ”ریو اور پتھر کے اندر پھینک دو“

”ہاں رحیم داد!“ ملک نواز نے میرے حکم کی تصدیق کرتے ہوئے کہا۔ ”خرم سلطان اب بہار دوست ہے“

رحیم داد نے جھک کر ریو اور میرے قریب رکھ دیا اور چند قدم پیچھے ہٹ گیا۔

”شکریہ خرم چوہدری!“ اب مجھے چھوڑ دو۔ ”ملک نواز نے گردن جھڑاتے ہوئے کہا۔

”گستاخی معاف ملک صاحب!“ میں نے معذرت خواہانہ آوازیں جواب دیا۔ ”ابھی میں پتھر سے میں ہوں“

”رحیم داد!“ اس سکتے کی لاش سے چابی لے کر پتھر کا دروازہ کھول دو۔ ”ملک نے مصالحہ انداز میں کہا اور چھوڑ دے“

داؤد خان کی جیب سے چابی نکال کر پتھر کے دروازہ کھول دیا میں نے ریو اور سے دونوں کو کور کیا ہوا تھا باہر نکل کر میں نے ریو اور جیب میں رکھ لیا۔

”چوہدری!“ ملک گردن سہلاتے ہوئے بولا۔ ”ہم ایک دوسرے پر کس طرح اعتماد کر سکتے ہیں؟“

”فی الحال مشکل ہے جناب“

”بہر دوستی کی بنیاد کیسے رکھی جائے؟“

”وقت اور عمل کی کدالیں ہی یہ کام کریں گی“

”میں کچھ اور چہروں سے نقاب نوچنا چاہوں گا چوہدری“ ابھی اُس ناگن کا سر بھی کچلنا ہے۔ ہاں تم نے جہانگیر کا نام بھی لیا تھا کیا وہ بھی اس سازش میں شریک ہے؟

”ہاں ملک صاحب!“ میں نے اثبات میں گردن ہلائی۔ ”سلیمان اور رنگ باز کے بعد کم از کم پتہ کی اسلام آباد کی حدود

میں وہ اپنا اقتدار خود مختار ہو کر چلنا چاہتا ہے۔ گزشتہ رات جو کارروائی کی گئی ہے۔ اُسی نے مجھے اپنا آدمی اور آتش گیر مادہ دیا تھا“

”سنو خرم سلطان!“ سیڑھیاں اُترتے ہوئے وہ بولا۔ ”تم مجھے ریو اور کی زد میں رکھ کر جہاں چاہو چلو، جتنے دن پسند کرو اپنی حرارت میں رکھو۔ میں تمہیں یقین دلانا چاہتا ہوں“

جب یقین ہو جائے تو پھر مجھ سے بات کرنا اور کوئی ضرورت نہیں ہے“

”آپ کرنا کیا چاہتے ہیں؟“ میں نے اُسے سوالیہ نگاہوں سے دیکھا۔

”صرف تمہارا تعاون اور اعتماد حاصل کرنا چاہتا ہوں“

چوہدری!“ اُس نے میرے شانے پر ہاتھ رکھ دیا۔ اُس کا لہجہ التجائیہ ہی تھا۔ جب تمہیں پتہ ہی سے لایا گیا تھا تو بے شک مقصد دوسرا تھا۔ میں تمہاری صلاحیتوں کو آزمانا چاہتا تھا میں

تمہیں اپنے نائب کی حیثیت دینا چاہتا تھا لیکن میرے ذرائع جب بولے تو میں نے ارادہ بدل لیا تھا۔ مجھے بتایا گیا تھا کہ تم

سواری نہیں بلکہ ہمیشہ سوار بن کر رہنا پسند کرتے ہو۔ تم نے ہمیشہ اپنے چیف کی جگہ حاصل کی ہے۔ تم بہت اچھے چیف تو ہو سکتے ہو مگر ماتحت بن کر رہنا تمہاری فطرت میں شامل نہیں۔ لہذا

میں نے فیصلہ کیا تھا کہ ماضی کے چیف ماسٹر کو لاہور کی سڑکوں پر گیدڑ کی موت مارا جائے۔ میں اعتراف کرتا ہوں، تم نے مجھے

قدم قدم پر ذلت آمیز شکست دے کر اپنی برتری تسلیم کروا لی ہے۔ میں تمہیں اپنا چیف تو نہیں تسلیم کر سکتا، ہاں برابر کی

کی سطح پر برنس پارٹنر بنا سکتا ہوں“

”کیا ضمانت ہے ملک صاحب کہ آپ اب بھی اچھا سوچ رہے ہیں؟“

”کوئی ضمانت نہیں“ ملک نے بتایا۔ ”اسی لیے تو کہہ رہا ہوں جب مجھے شکست دے چکے ہو تو قیدی بناؤ۔ جب

میرے خلوص پر یقین ہو جائے تمہارا تو بات کرنا“

”نہیں ملک صاحب!“ میں نے بے پروائی سے کہا۔ ”میں آپ کو آزادی دے کر بھی یہ مقرر جاری رکھ سکتا ہوں۔ قیدی کو تو میرے اشاروں پر چلنا پڑے گا۔ جب کہ میری خواہش ہے کہ

آپ آزاد رہ کر خود کو دوست یا دشمن ثابت کریں... میں دشمنیاں اور دوستیاں بہت کم کچکا ہوں۔ ہر ذائقے سے آشنا ہوں“

باتیں کرتے کرتے ہم پارکنگ شید میں داخل ہوئے تو ایک باوردی ڈرائیور نے دوڑ کر سیاہ مرسیڈیز کا دروازہ کھول دیا۔ ملک نواز نے استفہامیہ نگاہوں سے میری جانب دیکھا۔ ڈرائیور کی موجودگی میں وہ شاید اپنا دوستانہ اور فدیہ انداز برقرار نہ رکھنا چاہتا ہوگا۔

”مجھے اجازت دیں۔ میں نے ہاتھ بڑھایا۔ بوقت ضرورت میں خود رابطہ قائم کر لوں گا۔“

”سنو...“ وہ پلٹ کر سرگوشیاں آوازیں بولا۔ ”میں اپنی گاڑی واپس کر دوں گا۔ ہم ابھی کچھ وقت ساتھ گزاریں گے۔ میں نوین سے بھی منٹ لینا چاہتا ہوں مجھے اپنے ساتھ کسی بھی جگہ لے چلو۔“

”اگر میں آپ کے ساتھ چلوں تو...؟“

”کیا تم...؟“

”ہاں ملک نواز۔ میں نے اُس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔ میں خوف زدہ نہیں ہوں کیا پہلے بھی میں گھیرے نہیں توڑتا رہا؟ اگر چاہو تو پھر گھیر لینا۔“

”آؤ...“ اُس نے مجھے بازو میں لے لیا۔ ایک تجربہ اور سہی...“

ڈرائیور کی وجہ سے سفر خاموشی سے ہی طے ہوا تھا۔ ماڈل ٹاؤن کی ایک وسیع و عریض کوٹھی کے کپاؤنڈ میں کار روک کر ڈرائیور نے ہمارے لیے دروازے کھولے اور ملک مجھے ساتھ لے کر پائیں باغ کی بارہ دری میں پہنچ گیا۔ ایک لڑکی قالین پر کنبیاں لٹکائے کتاب پر جھکی ہوئی تھی۔

”بیلو شانی۔ لڑکی نے جب کوئی نوٹس نہ لیا تو دروازے میں رُک کر ملک بولا تھا۔ لڑکی نے چہرہ اٹھایا اور مجھ پر نگاہ پڑتے ہی وہ اچھل کر کھڑی ہو گئی۔ یہ ہمارے مہمان خرم سلطان ہیں۔“

”آداب۔ لڑکی نے خالص مشرقی انداز میں سلام کیا۔ میں نے صرف مسکراہٹ اور گردن کو ہلکا سا ہلکا دیا تھا۔

”یہ میری بھانجی۔ ملک نواز بولا۔ رشتے میں لیکن ہے مجھے بیٹی سے بھی پیاری۔ ملک نواز کے لیے میں پدرانہ شفقت تھی۔ اس وقت وہ صرف محبت کرنے والا ایک بزرگ نظر آ رہا تھا۔

میں یہ بات آنکھ نہیں سمجھ سکتا تھا کہ معاشرے کی جڑوں کو دیکھ کی طرح چاہئے والے یہ درندے قوم کی رگوں میں تو

بے رحمی سے زہر آتارے ہیں لیکن اپنی اولاد کو وہ اس زہر سے اور اپنے اس روپ سے کوسوں دور رکھتے ہیں خواہ می جو ہو۔ رنگ باز ہوا ملک نواز، سب ہی کو میں نے اس معاملے میں یکساں ہی پایا تھا۔

”شانی بیٹے! کچھ کھلاؤ پلاؤ گی؟ ملک نواز شفقت سے پرہیز میں بولا۔

”کھانا تو ایک بچے ملے گا انکل۔“ شہناز کتاب اٹھاتے ہوئے بولی۔ ”البتہ پینے پر کوئی پابندی نہیں خرم صاحب کیا پسند کریں گے؟“

”سننا ہے یہ کافی کے رسپا ہیں۔“ ملک نے مسکراتی ہوئی نگاہوں سے میری طرف دیکھا اور پھر قہقہہ لگا کر بولا۔ ”کیوں جو ہدیری؟ شاہ زمان اور داؤد نے بھی تمہاری خدمت کافی سے ہی کی تھی نا؟“

”جی ہاں۔ میں نے مسکرا کر جواب دیا۔ اسی کافی کے طفیل آج یہاں آنے کا شرف حاصل ہوا ہے۔“

”لیکن میں ویسی کافی تو نہ پواسوں گا۔“ ملک نواز نے پھر قہقہہ لگایا۔

”ویسے مجھے کوئی اعتراض نہ ہوگا۔ میں نے بھی ہتے ہوئے کہا۔

”بیٹے قہوہ بھجوا دینا۔“ ملک نے کہا اور شہناز بہتر انکل کہتی ہوئی بارہ دری سے نکل گئی۔

”ایک بات بتائیں گے ملک صاحب! میں داؤد کے سامنے میک آپ میں گیا تھا۔ کیا نورین نے اُسے بتایا تھا؟“

”اُسے ہی نہیں بلکہ جب تم اُس تک جا پہنچے تھے تو اُس نے ہاتھ روم میں جا کر ٹرانسمیٹر پر مجھے بھی بتایا تھا۔ میں نے ہی اُسے اور پھر داؤد کو ہدایات دی تھیں۔“

”تو پھر ڈرامے کی کیا ضرورت تھی۔ آپ مجھے یہاں بھی منگوا سکتے تھے۔“

”سچ پوچھو تو میں خوف زدہ تھا۔“ ملک بولا۔ ”مجھے لوں محسوس ہوا تھا بلکہ ہو رہا ہے کہ تمہارے ساتھ کوئی دوسری طاقت بھی ہے۔ اب یہی دیکھ لو میں فیصلہ کر چکا تھا۔ تم میری گرفت میں بھی تھے لیکن تم نے میرے ہی آدمی کو میرے ہاتھوں مل کر وادیا اور خود قتل گئے ہو۔ اس لیے میں نے پتھرے میں بند کرنے کی ہدایت دی تھی، اگر میں صاف گوئی سے کام لوں تو مجھے کہنا پڑے گا۔ زندگی میں تم پہلے شخص ہو جس نے مجھے

خوف زدہ کیا ہے۔ میں رات ٹھیک سے نیند بھی نہیں لے سکا۔ میں نقصان سے سمجھی نہیں گھبراتا۔ مال جل گیا ہے اور ہونٹ کو بھی نقصان پہنچا ہے۔ مال اور بہت ہے اور ہونٹ کی بھی مرمت ہو جائے گی۔ میں ڈرتا رہا ہوں کہ اچانک کسی دیوار سے خرم جو ہدیری میرے سامنے آن کھڑا ہوگا۔ اسی لیے میں نے داؤد خان کو حکم دیا تھا، اُسے حالت بے ہوشی میں ہی پتھرے میں بند کر دیا جائے۔“

”آپ کے ذرائع نے صرف ایک بات میرے بارے میں سچ بتائی ہے۔ میں نے بتایا۔ میں واقعی ماتحت نہیں رہ سکتا۔ مجھے جس نے بھی پابند کرنا چاہا، جو بھی میری پشت پر سوار ہوا اُسے میں نے مغلوب کر لیا تھا۔“

”اسی لیے میں نے فیصلہ کیا ہے۔“ ملک پرجوش آوازیں بولا۔ ”میں تمہیں دوست بناؤں گا۔ ہم اپنی اپنی ذیل مقرر کر لیں گے اور ایک دوسرے سے تعاون کرتے ہوئے عدم مداخلت کا معاہدہ کریں گے، بولو دریا نے جہلم سے ادھر کا علاقہ تمہیں منظور ہے۔“

”اتنی جلدی نہیں جناب۔“ میں نے نفی میں گردن ہلائی۔

”میں نے آپ کو بتایا تھا آپ کی آستینوں میں سانپ ہیں آپ کے نوٹے فی صد ماسٹر لوگ جہانگیر کی ایما پر آپ کے خلاف ہو چکے ہیں۔ میری ذیل میں جہانگیر ہوگا اور آپ کے ادھر بھی رکاوٹیں ہیں۔ پہلے ہم مل کر باغی موبیداروں اور عہدیداروں کا سر جھکا دیں گے، ورنہ یہ لوگ ہمیں مسلسل پریشان کرتے رہیں گے۔ ہم انہیں ہٹا کر نئے لوگ بلکہ نیا خون اپنے بنس کو دیں گے۔“

”کیا ہم دونوں باغیوں سے مقابلہ کریں گے؟“

”جی ہاں۔ میں نے باوقوف انداز میں جواب دیا۔ ”لیکن طاقت سے نہیں بلکہ سیاست سے۔“

”وضاحت کرو جو ہدیری۔“

”آپ نے تاریخ میں اُن بادشاہوں کے واقعات پڑھے ہوں گے جنہیں ہم بھولے بادشاہ کہتے ہیں لیکن وہ بھولے نہ تھے۔ بارہا ایسا ہوا ہے کہ ایک بادشاہ نے باغی عناصر کو کسی تقریب میں مدعو کیا اور جلا دوں نے سب کی گردنیں اڑا دیں۔“

”یعنی ہم بھی...“ وہ چونک کر بولا، پھر غم ادا ہوا اور پھر گرا میرا چہرہ مکے لگا۔

”لیکن میں بادشاہ نہیں ہوں خرم سلطان میں ایک مہذب دور کا انسان ہوں اور ایسے ملک کا باشندہ ہوں... جہاں جمہوریت اور قانون کی حکمرانی ہے۔ قتل عام آسان بات نہیں۔“

”کل سے اس وقت تک میں چھ لاشیں دیکھ چکا ہوں۔“ میں نے مسکرا کر کہا۔ ”لیکن ابھی تک قانون نے مجھ سے کچھ نہیں پوچھا، داؤد خان بھی اسی ملک کا باشندہ تھا۔ اُس کی لاش کہاں ہے؟“

”مجھے سوچنے کا موقع دو جو ہدیری۔“ ملک پشیمانی رنگ نے لگا۔ ”میری ایک حیثیت اور بھی ہے، اگر میں بے نقاب ہو گیا تو ملک میں تہلکہ مچ جائے گا۔ میرا ہی نہیں میری پارٹی کا بھی مستقبل تباہ ہو جائے گا۔“

”آپ پس نقاب رہیں گے جناب۔ صرف خرم جو ہدیری اپنی بقا اور مستقبل کے لیے کام کرے گا۔“

”طریقہ کار کیا ہوگا؟“

”ایک طریقہ ہے انفرادی۔ میں نے بتایا۔ آپ مجھے اپنے تمام ناہین کی فہرست دیں گے اور سب کو ایک خصوصی پیغام دیں گے کہ ایک ایجنٹ مال حاصل کرنے آ رہا ہے۔

دوسرا طریقہ ہے۔ آپ تمام ماسٹروں کی مینٹنگ طلب کریں اور وہ لوگ مال کے ساتھ آئیں۔ مینٹنگ کے دوران دھماکا ہوگا اور حادثے میں وہ لوگ مارے جائیں گے۔ ایسے حادثے سربراہوں کے اجلاس میں بھی ہوتے رہتے ہیں خبر ہوگی کہ

ملک نواز پارٹی اجلاس سے خطاب کرنے والے تھے کہ کسی مخالف نے، عمارت بم سے اڑا دی، ایک تیر سے تین شکار ہوں گے۔ تمام بکھرا ہوا مال آپ کو مل جائے گا، غدار سزا پائیں گے اور سیاسی پلیٹ فارم پر حزب اختلاف بنام ہوگی۔“

”شاندار... شاندار...“ ملک اچھل پڑا۔ ”تم واقعی لیڈر ہو۔ ذہین ہو اور پھیلنے جیسے مکار۔ ٹھیک ہے۔ ہم آج ہی پروگرام چاک آؤٹ کر لیں گے۔“

”قہوہ ایک ملازم لایا۔ جب اُس نے قہوہ چاندی کے چھوٹے چھوٹے پیالوں میں انڈیلا تو فضا معطر ہو گئی تھی۔ قہوہ پیتے ہوئے میں سوچ رہا تھا۔ کسی نہ کسی جگہ کوئی ٹوڑ ہے۔ ایک

گرہ سی تھی جو کھل نہیں رہی تھی۔ ملک نواز جیسا شخص اتنی آسانی سے زیر دام آ گیا تھا۔ یہی بات میرے حلق سے نہیں اُتر رہی تھی۔ رنگ باز جیسے سادہ لوح شخص کو گھیرنے اور

م کرنے میں خاصا وقت لگا تھا کئی ڈرامے کرنے پڑے تھے۔ لیکن وہ تو آخری لمحے تک آنکھ میچولی کھلتا رہا تھا... لیکن ایک نواز جو تمام شیطانوں کا سردار تھا۔ ایک دوسری بھی سہم سکا تھا۔

اگر ایک مروجہ اصول مدنظر رکھا جاتا تو بات کچھ سمجھ سکتی تھی کہ ہم مٹی کا گھڑا بھی جب خریدتے ہیں تو ٹھونک بجا رہتے ہیں کہ یہیں ترسیر زندہ تو نہیں، گھوڑا میدان میں آزمایا جاتا ہے۔ رنگروٹ کو بھرتی کرنے سے قبل کئی آزمائشی مراحل سے گزرنا پڑتا ہے۔ ملک نواز نے مجھے اپنا نائب بنانے سے قبل آزمائشوں میں ڈالا تھا تو یہ کوئی حیران کن بات نہ تھی۔ میرا انتخاب کسی درس گاہ کے لیے نہیں ہو رہا تھا اور نہ ہی کسی عبادت گاہ کی امامت ہی اس کے پیش نظر تھی۔ اسے تو ایک ایسے شخص کی ضرورت تھی جو جان دینے اور جان لینے کے فن سے آگاہ ہو۔ میں نے اپنی جان اتھیلی پر رکھ کر دوسروں کی جان لے کر امتحان پاس کر لیا تھا اس حوالے سے اگر اس نے مجھے قبول کر لیا تھا تو خطرے کی کوئی بات نہ تھی مگر اس کے وجود خطرے سے قبل از وقت آگاہ کرنے والی جس بیدار تھی۔ یہی وجہ رہی تھی کہ قہوے کے دو چار سپ لے کر میں نے اپنے ذہن اور اعصابی نظام کو چیک کیا تھا۔

”اوں... تو تمہاری اطلاع کے مطابق ادھر جہانگیر اقتدار کے لیے ہاتھ پاؤں مار رہا ہے۔“ اس نے قہوے کا آخری ٹھونٹ لے کر کہا۔ ”لیکن تم ثبوت پیش نہیں کر سکو گے!“

”کیا ہماری دنیا میں ایسی سازشیں دستاویزی ہوتی ہیں؟ میں بڑا مان جانے والی اداکاری کرتے ہوئے بولا۔

”میں شک اور یقین کی وجوہ معلوم کرنا چاہوں گا۔“

”مجھے سلیمان نے جب رنگ باز خان کے خلاف استعمال کرنے اور اپنے ساتھ بزنس کرنے کی پیش کش کی تھی تو اس میں جہانگیر کا ذکر آیا تھا کہ وہ ہائی آفیشلز کو ملک نواز کے خلاف

بھڑکار رہا ہے اور کچھ باختیار لوگوں کو اسلام آباد اور

ہالی ڈے ان جیسے بڑے ہونٹوں میں دعوتیں دے رہا ہے،

بقول سلیمان کے ملک نواز کو کلاس کرنا چاہتا ہے، پھر ایسی

ہی باتیں رنگ باز خان نے بھی بتائی تھیں کہ عنقریب بڑی

تبدیلی متوقع ہے۔ شاید اس کا بھی اشارہ جہانگیر کی طرف

رہا ہوگا۔“

”ٹھیک ہے میں اسے کال کروں گا۔“ ملک نواز نے میرے کی انگوٹھی ٹھٹھاتے ہوئے کہا: ”اگر اس کی نیت میں فتور ہو تو وہ نہیں آئے گا۔“

”کیا میرے جعفر اپنے سلطان کے بلاوے پر نہیں آیا کرتا تھا؟“

میں نے مسکرا کر پوچھا: ”نہیں ملک صاحب کسی کی وفاداری

کو پرکھنے کا یہ کوئی پیمانہ نہیں ہے۔ غدار لوگ بظاہر بے حد

نرم اور وفادار ہوا کرتے ہیں۔“

”زبان کھولنے کے دوسرے طریقے بھی میرے پاس ہیں۔“

”ملک نواز سرد لہجے میں بولا: ”اس کا رُواں رُواں بولے گا

خرم سلطان تم خوش نصیب ہو میرے انتقام کا رخ ہی

بدل گیا ہے۔“

”ہم لوگ سچے تو نہیں ہوتے لیکن اصول ہماری ضرورت

بھی ہے اور بنیادی شرط بھی۔ میں چاہوں گا آپ مجھ پر اصولوں

کے تحت مکمل بھروسہ کریں یا دشمنی۔ اگر بھروسہ کرنے میں

تو ایسے لوگ میرے حوالے کر دیں، میں ایک ایک کو جین کر مار

دوں گا۔ سوال و جواب اور زبان کھولنے کا طریقہ کار

میرے نزدیک وقت ضائع کرنے کے مترادف ہوگا۔ کچھ لوگ

اعتراف کر لیں گے اور کچھ معافی مانگ لیں گے اور وقت

کا انتظار کریں گے جو ایک بار غدار ہو جائے... وہ کبھی

وفادار نہیں بن سکتا۔ جہانگیر نے ملک گیر ہم نہ جانے کب سے

شروع کر رکھی ہوگی۔“

”پھر بھی میں برسوں کے ساتھیوں کو شک کی بنا پر سزا

نہیں دے سکتا۔“ ملک نواز نے اپنی ذات کی ایک اور

پرست اُٹ دی۔ ”جہاں تک تمہارا تعلق ہے، میں نے تمہیں

ذہانت اور طاقت کے میدانوں میں آزمایا ہے۔ تمہاری

مہارت اور برتری تسلیم کر چکا ہوں۔ دوسرے فیصلے

تک تم چاہو تو میرے مہمان رہ سکتے ہو، جانا چاہو تو جو بھی

ذریعہ پسند کرو گے تمہیں مل جائے گا۔“

”میں کسی کے فیصلے کا پابند ہوں نہ انتظار کر سکتا ہوں،

انتظار حاجت مند کیا کرتے ہیں میرے محترم۔ آپ کو میری

ضرورت ہے۔ میں صرف یہاں سے جا رہا ہوں۔ ذرائع بھی

میں اپنی پسند کے استعمال کرنے کا عادی رہا ہوں۔“ میں

اُٹھنے لگا تو ملک نواز نے میرا ہاتھ تھام لیا۔ اس کا تپا ہوا

چہرہ یک دم ہی ڈھیلا ہو گیا تھا۔

”ناراض ہو کر نہیں چوبداری۔“ وہ نرم آوازیں بولا۔ میں

نے وقت مانگا ہے۔ اتنا وقت کہ میں پُرانے گھوڑوں کو آخری

بار آزمائوں۔ تمہیں شاید نہ معلوم ہو کہ جہانگیر صرف میرا ایک

نائب ہی نہیں ہے بلکہ میرے بزنس کا مین گیٹ ہے۔ بڑی

جڑ ہے، تمام مال کا روٹ ہے، یوں سمجھ لو وہ اسنو کیپر ہے۔

میں حسب ضرورت مال وہاں سے منگواتا ہوں اور دوسرے

لوگوں کو پرمٹ الیٹو کرتا ہوں۔ وہ اس سے مال وصول

کر لیتے ہیں، اگر وہ باغی ہو چکا ہے تو پہلے میں اس سے اسلور

کی چابیاں واپس لوں گا۔“

”یہ آپ کی دوسری ہے جناب۔“ میں نے مصنوعی کیندگی

چہرے اور لہجے میں رچاتے ہوئے کہا۔ ”میں اب کوئی مشورہ

نہیں دوں گا بلکہ انگ رہ کر تیل کی دھار دیکھوں گا۔ میں

جانتا ہوں کیا ہوگا، پھر میں فاتح شخص سے معاملہ طے کر

لوں گا۔“

”تم اتنے باوقوف اندازے کیوں قائم کر رہے ہو چوبداری؟“

”ملک اُلجھ کر بولا۔“ تمہیں میرے ذرائع اور طاقت کا اندازہ

کر لینا چاہیے تھا جو شخص حکومت وقت کو تبدیل کرنے

کے ذرائع رکھتا ہو، اسے ایک غندہ ٹکست نہیں دے سکتا۔“

”ہاتھی کو بھی ایسا ہی رزم ہوتا ہے ملک صاحب۔“ میں

نے طنز یہ انداز میں کہا۔ ”لیکن چیونٹی جیسی حقیر مخلوق جب

ہولے سے اس کی ٹونڈ میں گھس جاتی ہے تو وہ درختوں

سے سر ٹکراتے ٹکراتے مر جاتا ہے۔ گستاخی معاف جناب عالی

آپ کی ٹونڈ میں بھی کی چیونٹیاں گھس چکی ہیں۔“

”بلکواس...“ وہ حلق پھاڑ کر دہرایا۔ ”تمہارے پاس

کوئی ثبوت نہیں ہے۔“

”بے شک۔“ میں نے پُرسکون آوازیں گردن کو اٹھاتی

جنش دی۔ ”ہاں اگر آپ مجھے مہلت دیں تو میں ثبوت

پیش کر سکتا ہوں۔“

”کتنی مہلت؟“ وہ پھٹکارتے لہجے میں بولا۔

”یہ آپ کی سلطنت اور دائرۂ اختیار کی حدود پر

منحصر ہے جناب، اگر پنڈی اور لاہور کی بات ہے تو

صرف تین دن... ہاں دوسرے اضلاع کے لیے کچھ وقت

درکار ہوگا۔“

”ٹھیک ہے، چوبداری۔“ وہ جبرے کی ہڈیاں پھڑکاتے

ہوئے بولا۔ ”تم صرف جہانگیر کو غدار ثابت کرو، اگر وہ

غدار ہے تو میں تسلیم کر لوں گا۔ میرے تمام نائبین متصرف ہو

چکے ہیں۔“

”آپ اسے کال کریں اگر وہ آگیا تو اس کو عارضی طور پر

معطل کر دیں اور پھر اسے آزاد کر دیں۔“

”مجھے تمہاری بات پسند آتی لڑکے۔“ وہ مسکراتے لگا۔...

”بے شک یہی کوئی اسے پرکھ سکتی ہے۔“

”اب آپ دیگر لوگوں کی ایک فہرست عنایت فرمائیں

میں ان پر بھی کام کرنا چاہتا ہوں۔“

”نہیں...“ ملک نے نفی میں سر ہلایا۔ ”فی الحال انہیں

چھیڑنا نامناسب ہوگا۔“

”ایک خطرہ آپ نظر انداز کر رہے ہیں جناب۔“ میں نے

دوسرا پتہ پھینکا۔ ”اگر جہانگیر نے اپنی معطلی کو خطرے کا الارم

مان کر سب کو الرٹ کر دیا تو وہ لوگ متحد ہو کر محاذ قائم کر

لیں گے۔“

”تم کرنا کیا چاہتے ہو؟“ وہ میری آنکھوں میں جھانک کر

بولا۔ ”اگر تم نے قبل از وقت مجھے کو پتھر مار دیا تو...؟“

”کیا میں آپ کو احمق دکھائی دیتا ہوں؟“

”ایک وعدہ کرو خرم سلطان۔“ وہ ملتیانہ لہجے میں بولا۔

”تم صرف ان لوگوں پر نظر رکھو مجھے میری اجازت کے بغیر کوئی

کارروائی نہیں کرو گے۔ تم نہیں جانتے وہ لوگ میرے لیے کیا

اہمیت رکھتے ہیں۔ سب غندے نہیں ہیں بہت سے لوگ

سوسائٹی میں اعلیٰ اور محترم مقام رکھتے ہیں میرے بزنس کی

آرٹھیست ہے، ظاہر ہے میرے نائبین بھی اسی فیلڈ کے ہوں

گے۔ میں بزنس اور سیاسی ساکھ کو بیک وقت داؤ پر لگانے کا

رہسک نہیں دے سکتا۔“

”میں جب اپنا مستقبل آپ سے وابستہ کروں گا تو میں آپ

کو نہیں بلکہ اپنی ذات کو تحفظ دوں گا۔“ میں نے ٹھہر ٹھہر کر

ایک ایک لفظ پر زور ڈالتے ہوئے کہا۔ ”میں آقاؤں کا ہمیشہ

دشمن رہا ہوں مگر دوستوں کا دوست رہا ہوں۔“ میری اس

بات پر ملک نواز بغور میرا چہرہ دیکھنے لگا۔ اس کی تجسّر بہ کار

لگا ہوں میں سوچ کی پرچھائیاں لہرا رہی تھیں۔ یوں محسوس

ہوتا تھا، جیسے وہ کسی فیصلے پر پہنچنے کی کوشش کر رہا ہو۔

دو بجے جب میں ملک صاحب کے وسیع و عریض

ڈرائنگ روم سے نکلا تو میرے پہلو میں شہناز چل رہی تھی ملک نواز قیلولہ کرنے بغل دروازے سے دوسرے کمرے میں چلا گیا تھا شہناز صرف طعام میں شریک ہوئی تھی اور ہمارے درمیان بس یہی سی گفتگو ہوتی تھی۔

”صاف کیجیے گا“ پوریج کے قریب جا کر وہ مندرت خوانانہ آوازیں بولی ”میری گاڑی آف روڈ ہے، ورنہ میں آپ کو ڈراپ کر آتی“ کھلے گیلارج میں تین گاڑیاں کھڑی تھیں اور ملک نواز کا ڈرائیور بھی شہناز کو دیکھ کر مستعد ہو گیا تھا، لیکن شہناز نے اس کی طرف دیکھا تک نہ تھا۔ مطلب یہی رہا ہوگا کہ ملک نواز نے میرے بارے میں فیصلہ کیا ہے کہ پیدل چلا جائے گا۔ شہناز نے خدا حافظ کہہ کر گویا رخصت کی اجازت دے دی تھی تب ہی وہ شے جو میرے حلق میں چبھ رہی تھی گولہ بن گئی۔ چار گاڑیاں اور ڈرائیور کی موجودگی میں ملک نواز کا فیصلہ معنی خیر ہی تھا۔

وہ کیوں چاہتا تھا تھا کہ اس کا مہمان پیدل جائے؟ میری وہ تمام حسیات جو ایسے لمحات میں سنسناتے گنتی تھیں، چونکہ ہو گئی تھیں۔ میں نے گیٹ سے نکل کر دائیں بائیں دیکھا جیسے درندہ جنگل کی آخری جھاڑیوں سے نکلتے وقت دیکھ رہا ہو کہ کوئی شکاری گھات میں تو نہیں، لیکن مجھے یہ بھی سوچ لینا چاہیے تھا کہ درندوں کے شکاری اور مجھ جیسے انسان کے شکاری میں فرق ہونا چاہیے، درندے صرف اپنی جنتوں اور قدرتی حسیات سے اپنا دفاع کرتے ہیں۔ جب کہ خرم چوہدری جیسا انسان اپنے تحفظ کے لیے عقل، تجربات کی روشنی اور قوت بازو سے کام لیا کرتا ہے۔

میں ابھی دس پندرہ قدم ہی چلا تھا کہ ٹیکسی چرچاتی ہوئی چند قدم آگے جا کر رک گئی۔ ڈرائیور نے چہرہ باہر نکال کر کچھ بولنا چاہا تھا کہ میں نے ہاتھ نفی میں ہلا دیا۔ ڈرائیور کی حرکت خلاف قاعدہ ہی تھی کوئی بھی ڈرائیور وہ بھی لاہور جیسے شہر کا اشارے کے بغیر نہیں رکتا۔ وہ تو جیسے میرا ہی منتظر تھا اور میرے ہی لیے رکتا تھا۔ میرے انکار پر وہ خفت آمیز انداز میں مسکرایا اور ٹیکسی بڑھ گئی۔

مجھے ٹیکسی کی ضرورت تو تھی لیکن میں محتاط تھا۔ ایسی ٹیکسی میں بیٹھنا نہیں چاہتا تھا جو اتفاق کی آڑ میں میرے لیے گھوم رہی ہو۔ دو فز لانگ پیدل چلنے کے بعد مجھے ایک

ڈائنس دکھائی دی۔ ڈرائیور اسٹریٹنگ وہیل پر سر رکھے آؤنگھ رہا تھا۔ میں نے انگلی سے ٹیکسی کی باڈی پر دستک دی اور ڈرائیور نے چہرہ گھما کر سوالیہ نگاہوں سے دیکھا۔

”کہاں جانا ہے؟ میں لانگ روٹ پر چلتا ہوں، وہ بنیازی سے بولا۔“

”اگر دو چار گھنٹے کے لیے یک کروں تب؟“

”پچاس روپے فی گھنٹہ منظور ہے تو بیٹھے“ وہ تھیک آمیز انداز میں بولا جیسے اسے یقین تھا کہ میں پچاس روپے فی گھنٹہ کا سختی تیری سے آگے بڑھ جاؤں گا، مگر میں نے اشبائی مسکراہٹ دے کر دروازہ کھول لیا۔

”پہلے آئی جی پولیس آفس چلو“

”پھر تو میرا اللہ ہی حافظ ہے“ ڈرائیور نے ہنس کر کہا۔

”آپ انسپکٹر ہوں گے؟“

”گھبراؤ نہیں دوست، تم نے جس ہستی کو بٹھایا ہے اس کے ہوتے ہوئے کوئی انسپکٹر تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکتا“ میں نے بھی جواباً ہنستے ہوئے کہا تھا۔ ڈرائیور نے عقب نما آئینے میں عجب نگاہوں سے میری جانب دیکھا اور انہی اشارت کر دیا۔

”میرے دوست، اب میں اتنا خوب صورت بھی نہیں ہوں“ میں نے نرم آوازیں کہا۔ اس لیے آئینے کا زاویہ ذرا دائیں اور اوپر کر دوں میں عقب کے مناظر سے نطف اندوز ہونا چاہتا ہوں؟ اس نے میری ہدایات کے مطابق زاویہ ایڈجسٹ کر دیا۔ پیچھے دو کاریں آ رہی تھیں۔ ایک نیلی ٹوٹا، دوسری سیاہ مرسیدیز تھی۔ دوسرے ٹوک ٹوک دونوں کے بعد دیگرے ٹیکسی سے آگے نکل گئی تھیں لیکن اشارہ بند تھا اس لیے ٹیکسی دونوں کے درمیان جا کر رکی تھی۔

”تم مالک ہو یا ڈرائیور؟“ نیلی کار کے ڈرائیور نے چہرہ باہر نکال کر پوچھا۔

”جی... میں آپ کا مطلب نہیں سمجھا“ ٹیکسی ڈرائیور نے استغماچی انداز میں پوچھا۔

”مطلب بہت آسان اور نتیجہ بے حد خوفناک ہے اگر تمہاری ٹیکسی حادثے سے دو چار ہو جائے تو نقصان کس کا ہوگا؟“

”سنو دوست“ سیاہ کار والے نے کہا۔ ”تم میرے پیچھے آؤ گے اور میرا ساتھ کسی بھی حادثے کے لیے تیار رہے گا“

”ادھر دیکھ لو“ نیلی کار والے نے ڈرائیور کو مخاطب کیا لیکن ڈرائیور سے پہلے میں نے دیکھ لیا تھا۔ نیلی کار کی پچھلی سیٹ پر بیٹھے ہوئے شخص کے ہاتھ میں اسٹین گن تھی۔

”میں تمہاری سواری مطلوب ہے۔ ہمارے مطلوبہ شخص کو مقررہ جگہ اتار دینا اور اپنا معاوضہ لے کر واپس چلے جانا۔ بس تمہارا اتنا سا کام ہوگا“

”میں سواری کو یہاں ہی آپ کے حوالے کر دیتا ہوں...“

ڈرائیور نے پلٹ کر میری طرف دیکھا۔ ”اُترے صاحب“

”نہیں“ وہ گرج کر بولا۔ ”آگے بڑھو“ اشارہ کھل گیا تو سیاہ کار آگے نکل گئی اور نیلی کار رکی رہی تھی۔

”سنو دوست“ میں نے ڈرائیور کے شانے پر تھپکی دی۔

”میں پولیس انسپکٹر ہوں اور یہ لوگ اسمگلر ہیں جو حملہ رکھنا یہ بھونک تو سکتے ہیں مگر مصروف سڑک پر کانٹے کی جرات نہیں کریں گے۔ اگر تمہاری گاڑی کو نقصان پہنچا تو کاربمر کار میں تعاون کے صلے میں تمہیں بہت کچھ ملے گا“

”اور اگر جان چلی گئی تو...؟“ ڈرائیور گھبرا کر بولا۔

”وہ میرے دشمن ہیں۔ تمہیں کچھ نہیں ہوگا“ میں نے کہا۔

”تم کسی بھی چوک سے دائیں بائیں نہ جانا“

سیاہ کار آگے تھی اور نیلی کار بالکل ٹیکسی کے ساتھ پیچھے لگی ہوئی تھی۔ گن بردار بائیں طرف ہو گیا تھا میں ملک نواز کی ذہنی کیفیت پر حیران تھا۔ وہ شخص بے درپے نقصان سے حواس باختہ ہو گیا تھا یا اپنی ذہانت اور قوت کے مظاہرے سے مجھے مرعوب کر رہا تھا، اگر مجھے مروانا ہی چاہتا تھا... تو اپنی کوٹھی میں اسے ایسی سہولت میسر تھی۔ وہ باہر سڑکوں پر میری موت کیوں چاہتا تھا؟

”میں اُن کی ہدایات پر ہی عمل کروں گا“ ٹیکسی ڈرائیور نے کہا۔ ”میں مزہ نہیں چاہتا“

”موت تو تمہاری ٹیکسی کے اندر بھی موجود ہے“ میں نے سخت لہجے میں سفاکی پیدا کرتے ہوئے کہا اور ریو اور نکال کر اُس کی پشت پر رکھ دیا۔ وہ تو صرف مجھے مارنا چاہتے ہیں، مگر میری گولی تمہاری کھوپڑی میں سوراخ کر دے گی۔ ادھر صرف خطرہ ہے اور ادھر موت یقینی ہے۔ اب یہ تم پر منحصر ہے۔ میری ہدایات مانو یا اُن کی ہدایات پر چلو“

”ایک طریقہ ہے“ ڈرائیور بولا۔ ”میں پیٹرول لینے پمپ

پر رُک سکتا ہوں۔ وہاں تم میری ٹیکسی چھوڑ دینا“

”ٹھیک ہے“ میں نے کہا۔

ایک خیال بڑا سہارا دے رہا تھا کہ اگر اُن لوگوں کو مارنے کا حکم ملا ہوتا تو برسٹ مارتے ہوئے نکل جاتے۔ وہ صرف مجھے زندہ کسی کے حوالے کرنا چاہتے تھے۔ دوسرے دن کی روشنی اور لوگوں کی موجودگی بھی باعث تقویت تھی۔

پیٹرول پمپ سڑک سے سو گز بہت کر وسیع کمپاؤنڈ کے اندر تھا۔ ٹرکوں کی قطار لگی ہوئی تھی۔ شاید ڈیزل کی راشن بندی تھی۔ فلنگ پوائنٹس پر خاماوش تھا ٹیکسی کو پیٹرول لینے دوسری قطار میں جانا تھا، لیکن ڈرائیور حاضر دماغی سے کام لیتے ہوئے ٹیکسی ٹرکوں کے درمیان لے گیا تھا میں نے پلٹ کر دیکھا، سیاہ کار بیک میں آ رہی تھی اور نیلی کار ٹرکوں کی آڑ میں بھی میں نے دروازہ کھولا اور ڈرائیور کا شکریہ ادا کرتا ہوا نیچے کود گیا اور نزدیک ترین ٹرک کی فرنٹ سیٹ پر چڑھ گیا۔ ڈرائیور اور کلینر پمپ کی انتظامیہ سے شاید لڑ جھگڑ رہے تھے۔ بیشیش سے جھانک کر دیکھا، نیلی کار کا ڈرائیور ٹیکسی کی جانب آ رہا تھا اور ٹیکسی ڈرائیور کہیں میں داخل ہو گیا تھا۔

چونکہ اُس نے مجھے ٹرک میں چڑھتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔ اس لیے خطرہ تھا کہ وہ اپنی جان بچانے کے لیے میری نشاندہی نہ کر دے۔ اس لیے میں ڈرائیور کی سیٹ پھلاٹکا ہوا نیچے اُتر گیا اور جھوپ میں شامل ہو گیا۔ اُن کی تو جہ ٹیکسی ڈرائیور پر مرکوز رہی ہوگی۔ پوچھ گچھ میں کچھ وقت لگ سکتا تھا اور میں اسی مختصر سے وقت میں اُن کی دسترس سے دور ہو جانا چاہتا تھا۔ سیاہ کار کی ڈرائیورنگ سیٹ بھی خالی تھی ٹرکوں کی قطار سڑک تک چلی گئی تھی میں ٹرکوں کے ساتھ ساتھ چلتا ہوا سڑک پر گیا اور ایک وین کو لفٹ کا اشارہ دیا۔ محض اتفاق تھا یا میرے ماتھے کا ستارہ روشن تھا، وین چند قدم آگے جا کر رُک گئی تھی اور میں نے فرنٹ سیٹ پر بیٹھ کر اُس شریف شخص کا شکریہ ادا کیا تھا۔

”مجھے ماڈل ٹاؤن جانا ہے“ اُس نے بتایا۔

”اور مجھے صرف یہاں سے جانا ہے“ میں نے مسکرا کر کہا۔

”آپ مجھے اگلے چوک پر ڈراپ کر سکتے ہیں“

”نہیں نہیں...“ وہ بھی ہنس پڑا۔ ”اگر ادھر ہی جانا ہو تو میری گاڑی کوئی شکایت نہیں کرے گی“

”مگر میری گاڑی میرے فراق میں پریشان ہوگی۔ میں اُس کے لیے ڈاکٹر لینے جا رہا ہوں۔“

”اوہ...“ وہ زندہ دل تھا، قہقہہ لگا کر بولا۔ ”ٹھیک ہے، میں آپ کو روڈ ماسٹر ورکشاپ میں اتار دوں گا۔ یہ گاڑیاں بھی بے وفا عورتوں کی طرح اچانک دغا دے جاتی ہیں۔“

”بالخصوص پرانی۔“ میں نے تائیدی انداز میں کہا۔

”ہاں اس لحاظ سے گاڑی اور عورت میں فرق ہے۔ پرانی عورت بہت کم بے وفا ہوتی ہے۔“

”شاید اس لیے کہ وہ جانتی ہے مارکیٹ ویلیو ماضی کے اندھیروں میں گم کر چکی ہے۔“

”یقیناً...“ اُس نے جاندار قہقہہ لگایا۔ ”آپ عورتوں کی نفسیات کے ماہر ہیں۔“

”جی ہاں صرف کتابوں کی حد تک۔“

”یعنی عملی تجربہ نہیں؟“

”ظاہر ہے ابھی عمر ہی کیا ہے، جب کہ اس صنف کو سمجھنے کے لیے طویل عمر چاہیے۔“

میں نے محتاط انداز میں گردن موڑ کر دیکھا۔ میرے شکاری ٹریفک میں کہیں دکھائی نہ دے رہے تھے۔ انھیں شکار کے نکل جانے کا افسوس رہا ہوگا اور مجھے افسوس تھا کہ میں یہ معلوم نہ کر سکا تھا کہ وہ کس شکاری کے پالتو کتے تھے، اگر مجھے کچھ ضروری کام نہ ہوتے تو میں اپنا اصل دشمن جاننے کے لیے دام میں پھنس جاتا۔ میں ابھی انھی لوگوں کے متعلق ہی سوچ رہا تھا کہ اچانک وین ایک دھچکے سے رُک گئی اور میں چونک کر باہر دیکھنے لگا، پھر ہمارے گاڑیوں کے درمیان گریس زدہ نوجوانوں کو گھومتے پھرتے دیکھ کر اندازہ لگا لیا کہ مجھے یہیں اترنا ہے۔

”مختصر سے سفر اور خوش گوار وقت کو میں یاد رکھوں گا جناب۔“ میں نے اترتے ہوئے کہا۔

”شکریہ...“ اُس نے میرا ہاتھ تھام کر مسکراتے ہوئے کہا۔

”میں آپ کی بیمار گاڑی کی صحت کے لیے دعا کروں گا۔“ میں نے بھی دوستانہ مسکراہٹ دے کر دروازہ بند کیا اور گہری سانس لے کر ایک طرف چلنا شروع کر دیا۔ کیونکہ کوئی نیکیسی دکھائی نہ دے رہی تھی۔ چند سوگند آگے ایک مارکیٹ تھی میری نگاہیں ٹیلی فون تلاش کر رہی تھیں۔ زیادہ تر دکانیں کریانے

اور پیڑے کی تھیں۔ برابری ڈیلر کا سائن بورڈ دیکھ کر میں اندر چلا گیا۔ استقبالیہ نمین میں ایک کچی عمر کی خوش روڑکی بیٹی نچر کی ورق گردانی کر رہی تھی۔

”جی فرمائیے۔“ اُس نے سنجیدگی سے پوچھا۔

”مجھے ایک فوربیڈ کوئٹی چاہیے۔“ میں نے اُس کی شفاف آنکھوں میں جھانک کر کہا۔

”سوری سر۔“ اُس کا انداز ایک دم معذرتی ہو گیا تھا۔

”ہم صرف پلاس فروخت کرتے ہیں۔“

”کوئی اور ادارہ آپ بتائیں گی؟“

”اندر تشریف لے جائیں، چوہدری صاحب یقیناً آپ کی رہنمائی کریں گے۔“

میں دو سرے کین میں دستک دے کر داخل ہو گیا۔ اندر ایک وجیہ نوجوان کسی کے ساتھ فون پر مصروف گفتگو تھا۔ اُس نے ہاتھ کے اشارے سے گریسی کی طرف اشارہ کیا اگر میرا اعصابی نظام شک پر وف نہ ہوتا تو میں گریسی پر بیٹھتے ہی اُچھل پڑتا۔ وہ کہہ رہا تھا۔

”ہمارے پاس پورا دن ہے میڈم۔ شام تک ہم گودام سے مال شفٹ کر لیں گے۔ ہاں آپ بھی...“ وہ اچانک کچھ کہتے کہتے رُک گیا اور میری طرف دیکھ کر محتاط انداز میں بولا۔ ”میریانی کا اعزاز مجھے دیں میڈم، بلکہ جب تک وہ یہاں ہے۔ اپنا ہیڈ کوارٹر میرا گھر ہی بنالیں۔ اوہ... تھینک یو میڈم... تھینک یو ویری میچ۔“ اُس نے ریسپور رکھ کر چہرے پر پیشہ ورانہ مسکراہٹ بکھیری اور بولا۔ ”جی فرمائیے۔“

”مجھے فوربیڈ کوئٹی چاہیے۔“ میں نے بتایا۔ ”میں صاحبہ نے مجھے بتا دیا ہے کہ یہاں صرف پلاس کا بزنس ہے۔ آپ اس سلسلے میں میری کیا مدد کر سکتے ہیں؟“

”کوئٹی خریدنا چاہتے ہیں یا کرائے پر؟“

”جو کام پہلے ہو جائے۔“ میں نے فدیہانہ انداز میں کہا۔

”جیسے میں انتہائی ضرورت مند ہوں۔“

”ٹھیک ہے چار بجے آئیے میں آپ کو دو چار کوٹھیاں دکھا دوں گا۔“

”آپ کا آفس کتنی دیر کھلا رہتا ہے؟“

”شام چھ بجے تک۔“

”پھر مجھے اپنے گھر کا فون نمبر دے دیجیے۔ میں آٹھ بجے

رابطہ قائم کر لوں گا۔“

”سوری...“ وہ نفی میں سر ہلانے لگا۔ میں بزنس صرف آفس میں بیٹھ کر ہی کرتا ہوں۔“

”بزنس نہیں دوست، میں نے دوستانہ لہجے میں کہا۔ صرف رابطہ۔“ اُس نے دراز سے وزینگ کارڈ نکال کر دے دیا۔

میں نے دیکھے بغیر کارڈ جیب میں رکھ لیا اور ہاتھ ملا کر باہر نکل آیا۔

اگر وہ شخص جس میڈم سے باتیں کر رہا تھا، وہ نورین ہی تھی تو میں اسے اتفاق نہیں کہوں گا۔ میں تو یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ قدرت میری رہنمائی میری انگلی اُس کے ہاتھ میں تھی جس طرح انجان بچے کو گڑھے، ٹھوکر اور نقصان سے بچانے کی ذمہ داری انگلی پکڑنے والے پر ہوتی ہے اور وہ بچے کو صاف سیدھے راستوں پر چلاتا ہوا لے جاتا ہے۔ اسی طرح میرا خدا مجھے روشن راستے دکھا رہا تھا۔ انسان تو آنکھیں رکھنے کے باوجود اندھا ہوتا ہے۔ آنے والے اگلے لمحے کو بھی نہیں دیکھ سکتا، ذہانت کا دعویٰ کرتا ہے... مگر بے خبر رہتا ہے وہی دیکھتا ہے جو اللہ دکھائے اور اتنا ہی جانتا ہے جتنا جاننے کا ادراک ہوتا ہے۔

اگر میں ہانگ کانگ کی زمین سے اُٹھنے والا شیطان ہوتا تو نورین کو کبھی معاف نہ کرتا۔ اُس نے دوست بن کر پیٹھ میں خنجر گھونپ دیا تھا لیکن میں ذاتی دشمنی پر وقت ضائع کرنا نہیں چاہتا تھا۔ نورین نے جو کچھ کیا تھا، مجھے اس پر کوئی تعجب نہیں ہوا تھا۔ وہ جس پیشے میں تھی، اس کا تقاضا یہی تھا میں نے بھی تو اُسے سیرھی بنا کر کامیابی حاصل کی تھی۔ اس لیے جوابی کارروائی کا حق وہ بھی رکھتی تھی۔

نورین ایک حوالے سے پہلے بھی میرے نزدیک قابل نفرت تھی۔ وہ میری نہیں انسانیت کی دشمن تھی اور مجھے جو ذمے داری سونپی گئی تھی میں ذاتیات سے بالاتر رہ کر اس ذمے داری کو نبھانے کا عزم کر چکا تھا۔ اُس خوب رو برو کر سے ایڈریس لینے کا مقصد بھی یہی تھا کہ اُس کی میڈم نورین ہی تھی تو میں بوکری ایڑیوں پر پاؤں رکھتا، نورین اور نورین سے اُس کے گودام تک رسائی حاصل کرنا چاہتا تھا۔ ویسے اُس نے ٹھیک ہی کہا تھا کہ دن کی روشنی میری کارروائی کے درمیان بڑی رکاوٹ تھی۔ اُن کے پاس مال

شفٹ کرنے کے لیے خاصا وقت تھا اور میں شام تک گودام کی نگرانی بھی نہیں کر سکتا تھا۔ کارڈ حاصل کر کے میں مطمئن ہو گیا تھا میں کسی بھی وقت الورخان کو نورین تک جانے کے لیے مجبور کر سکتا تھا۔

وہ میری خوش قسمتی تھی، جب میں نیکیسی چھوڑ رہا تھا تو آئی جی صاحب کی کار نیکیسی کے قریب سے گزرتی ہوئی گیٹ میں داخل ہو گئی تھی۔ میں جب اُن کے پی اے کے آفس میں ہوا تو وہ انٹرکام پر صاحب سے باتیں کر رہا تھا۔

”میرا خیال ہے سرسٹر خرم سلطان میرے سامنے ہیں۔“ اُس نے میری جانب دیکھا اور میں نے آنکھوں سے اُس کے خیال کی تائید کر دی۔ بہتر سر، اُس نے ریسپور رکھ دیا۔ میرے ساتھ آئیے۔“ وہ گریسی سے اُٹھتے ہوئے بولا۔ ہم تین آباد کمروں سے گزر کر جو بھی ایک دروازے پر پہنچے مسلح گارڈ نے پی اے کو دوستانہ مسکراہٹ دی۔

”میننگ شروع ہو چکی ہے جناب۔“ وہ مؤدب لہجے میں بولا۔

”ہاں...“ پی اے نے گردن کو اٹھاتی جنبش دی۔ میں جانتا ہوں، صاحب ملاقاتی سے ملنا چاہتے ہیں۔“

گارڈ نے لپک کر دروازہ کھول دیا۔ وہ میننگ ہل تھا۔ پندرہویں اعلیٰ افسران اخباری رپورٹر اور عوامی نمائندے نیم دائرے میں بیٹھے ہوئے تھے۔ آئی جی صاحب ڈالس پر رچی ہوئی گریسی پر بیٹھے ایک ایس پی سے ہولے ہولے باتیں کر رہے تھے۔ مجھے دیکھتے ہی اُنھوں نے ہاتھ اٹھا کر ایک گریسی کی طرف اشارہ کیا۔ پی اے آگے بڑھتا چلا گیا۔

”مسٹر فلپ فرام ہانگ کانگ۔“ جو نبی میں نے گریسی بھلی آئی جی صاحب کی آواز اُبھری، حاضرین کی نگاہیں میری جانب اُنھی تھیں۔ انٹرپول کی نمائندگی کر رہے ہیں۔ کارروائی شروع کی جائے۔“ ایس پی نے کھانس کر ایجنڈا پڑھنا شروع کر دیا۔ ایجنڈے میں سر فہرست حزب اختلاف کے چند سرکردہ لیڈروں کی سیاسی سرگرمیوں پر گہری نگاہ رکھنے اور نقل و حرکت کو محدود رکھنا شامل تھا۔ کچھ حکیمانہ امور اور آخر میں سماج دشمن عناصر کی سرکوبی کا ذکر تھا۔ چونکہ مجھے سیاست سے کوئی دلچسپی نہ تھی، اس لیے بوریت طاری ہونے لگی تھی۔ پھر جب ایک انسپکٹر نے آخری پوائنٹ پر اپنی رپورٹ

شروع کی تو میں سنبھل کر بیٹھ گیا۔

”کل رات کسی تخریب کار نے ملک نواز کے ہوٹل کو بم سے اڑانے کی کوشش کی ہے۔ ملک نواز نے کسی جانی نقصان کی رپورٹ نہیں دی۔ جب کہ مجھے ایک نامعلوم شخص نے فور پر بتایا ہے کہ ملک نواز کا دست راست شاہ زمان اسی رات سے غائب ہے اور دوسری طرف ایک ویران حویلی سے تین لاشیں ملی ہیں۔ تینوں کا تعلق شہر کے ایک بدنام غنڈے داؤد خان سے بتایا گیا ہے اور داؤد خان روپوش ہے۔“

”ملک نواز کیا کہتا ہے؟“ آئی جی صاحب نے پوچھا۔

”اُن کے خیال میں سیاسی مخالفین انھیں ہراساں کر رہے ہیں۔“

”منشیات کی روک تھام کے لیے جو نیم بنائی گئی تھی، اُس کی کیا رپورٹ ہے؟“ ایک اخباری رپورٹر نے سوال کیا۔

”کچھ لوگ سامنے آئے ہیں۔ اس نے جواب دیا۔ لیکن سب کے سب تیسرے درجے کے سپلائر ہیں۔ اُن کی نگرانی جاری ہے۔ ہم اصل گروہ تک پہنچنا چاہتے ہیں۔“

”کیا آپ کے علم میں ہے کہ تیسرے درجے کے سپلائر ہماری درس گاہوں تک پہنچ چکے ہیں؟“

”ہاں...“ اس نے اعتراف کر لیا۔ لیکن ہم اُن پر ہاتھ ڈال کر بڑی جھلی کو گہرائی میں اُترنے کی اجازت نہیں دے سکتے۔ اور انھیں قوم کے بچوں کو برباد کرنے کی اجازت دی جا رہی ہے، کیوں؟“

”مسٹر اکرم! آئی جی صاحب نرم آواز میں بولے۔ ہماری بھی کچھ مجبوریاں ہوتی ہیں۔ بہر کیف میں آپ کو یقین دلاتا ہوں، اب کوئی قدم ہماری درس گاہوں کو ناپاک نہیں کرے گا۔“

”شکریہ جناب۔“ رپورٹر نے شکریہ ادا کیا اور بیٹھ گیا۔

”ہمارے کچھ نیچے اس سلسلے میں کام کر رہے ہیں...“

آئی جی صاحب کی نگاہ بے اختیارانہ مجھ پر آن پڑی۔ آپ یہ جان کر خوشی محسوس کریں گے کہ پٹری اسلام آباد کو اس لعنت سے پاک کر کے اُن بچوں کا رخ اس شہر کی طرف ہو چکا ہے۔ عنقریب یہاں بھی صفائی کا کام شروع ہو جائے گا۔“

”کیا یہ خبر آف دی ریکارڈ ہے سر؟“

”ہاں...“ آئی جی صاحب بولے۔ ”فی الحال...“

ایک گھنٹے کی آکٹا دینے والی کارروائی میں میرے لیے کوئی نئی اور خوش آہنگ خبر نہ تھی، وہی کاغذی گھوڑے تھے

اور جھوٹی رپورٹیں اور جھوٹے منصوبے۔ وہ لوگ صرف گرجنے والے بادل تھے جن کے اندر خلوص اور لگن کی ایک بوند بھی نہ تھی۔ اگر وہ برسے والے ہوتے تو قوم اخلاقی لحاظ سے بخر نہ ہوتی۔

جب اجلاس کی کارروائی ختم ہوئی تو آئی جی صاحب اٹھ کر میری طرف آئے، میں نے چند قدم آگے بڑھ کر اُن سے مصافحہ کیا۔ میرا ہاتھ تمام کر وہ مجھے اپنے آفس میں لے گئے۔ چالنے کا آرڈر دے کر انھوں نے اردلی کو دوسرا آرڈر دیا کہ کوئی اندر نہ آئے۔

”تمہاری آمد متوقع تھی۔“ وہ کرسی پر بیٹھ کر بے حد پیار سے بولے۔ ”پٹری سے مجھے رپورٹ ملی تھی کہ خرم سلطان لاہور روانہ ہو چکا ہے، پھر کل رات تمہاری رسید مل گئی۔ طریقہ کار تم نے بدل لائیں۔“

”میں تو کچھ بھی نہیں کرتا سر۔“ میں نے کسر نفسی سے کہا۔ ”جیسا اوپر سے اشارہ ملتا ہے، تعمیل کرتا ہوں۔“

”اوپر سے مراد؟“ انھوں نے استفہامیہ انداز میں پوچھا۔ کیا منسٹر صاحب...؟“

”نہیں سر۔“ میں نے نفی میں گردن ہلاتی۔ وہ جس کے شکم کے بغیر پتہ بھی جنبش نہیں کرتا۔“

”ہاں اللہ تعالیٰ کی تائید کے بغیر پتہ کچھ نہیں کر سکتا۔ مجھے یقین ہے تمہارے ساتھ اللہ کی تائید ہے، ورنہ ملک نواز جیسے درندے کی کچھاریں گھس کر اُس کی دم پر پاؤں رکھنا آسان بات نہیں تھی۔ جب مجھے بتایا گیا تو میں نے اپنی خصوصی ٹیم کو الرٹ کر دیا تھا، شاید تمہیں کسی بھی وقت مدد کی ضرورت پیش آئے لیکن تم نے ہمیشہ کی طرح تنہا ہی معرکہ سر کر لیا ہے۔“

”اُس نے نگر مارنے کی خود دعوت دی تھی، ورنہ اتنی جلدی میں ادھر کا رخ نہ کرتا۔ پٹری کے بعد ہمارا ارادہ وہ تمام راستے اور بیل بند کرنے کا تھا جو منشیات کا زہر لگتے ہیں۔ جب تک منبع بند نہ ہوگا زہر کی ندیاں خشک نہیں ہوں گی۔“

”اُس پر وجیہ کے لیے جو ڈوکرائے کی نہیں بلکہ بین پاؤں کی ضرورت ہوگی میرے بیٹے اور حکومت ابھی اس پوزیشن میں نہیں ہے کہ اس نازک اور حساس حقے کو ناراض کر سکے، جس طرح ادھر بااثر لوگ ہی منشیات اپنی پشت پر لادے پھرتے ہیں۔ اسی طرح ادھر بھی بڑے لوگ ہی منشیات اُگاتے... اور

بھٹیوں میں تیار کرتے ہیں اور وہ کوئی ایک دو افراد نہیں محدود رقبہ نہیں ہے۔“

”میں پوچھ رہا ہوں کہ پوچھنے والے ہاتھ کونوں کا جناب۔“

”وہی تو بتا رہا ہوں کتنے ہاتھ کاٹو گے؟“

”ہر وہ ہاتھ جو بیج ڈالتا ہے۔“

”جذبے کی حد تک تو میں تمہاری تعریف کروں گا لیکن عمل کے لیے طویل وقت، بھرپور کارروائی اور افرادی قوت درکار ہوگی۔ یہ کام صرف مسلح قوت ہی کر سکتی ہے اور میں بتا چکا ہوں کہ حکومت فی الحال اس حقے کو پتھر مارنے کی پوزیشن میں نہیں ہے۔ ہر چند وہ پر جو کچھ ہو رہا ہے۔ ان حقائق کے پیش نظر ہم قبائلی بھائیوں کو ناراض نہیں کر سکتے۔“

”انھیں اخلاقی درس پودے سکتے ہیں پھر پوسے کا پورا قبائلی علاقہ تو منشیات فروش نہیں، وہاں بھی درندوں کے مقابلے میں انسانوں کی اکثریت ہوگی اور وہی اکثریت اُن سُٹھی بھر درندوں کو درس دینے میں ہماری معاون ثابت ہوگی۔“

”کیا تم ملک نواز کو ایسا درس دے سکتے ہو؟“ آئی جی صاحب نے دھک بھرے لہجے میں پوچھا۔ ”نہیں پیارے دولت کے بچاویوں کو کوئی درس نہیں دے سکتا۔“

”بہر طور...“ میں نے باوثوق لہجے میں کہا۔ ”میں ملک نواز سے نمٹ کر ادھر کا رخ ضرور کروں گا۔ کسی ایڑی کے لیے میڈا ہونے والا ایک کاٹا بھی اگر ضائع کر سکا تو ضرور کروں گا۔ کانٹوں کا وجود اگر ختم نہ ہوا تو کم تو ہوں گے۔“

”چھوڑو وہ کل کی بات ہے۔“ آئی جی صاحب آگے جھک کر بولے۔ ”آج کی بات کرو۔ کیا کچھ کر چکے ہو اور کیا پروگرام ہے؟“

میں نے اسلام آباد سے اغوا ہونے، ملک نواز کے ساتھ ہونے والی گفتگو اور بتی چوہے کا کھیل سب کچھ تفصیل سے بتا دیا، پھر ملک نواز کی دی ہوئی فہرست اُن کے سامنے رکھ دی۔

”کیا تمہیں یقین ہے یہ بھی اُس کے کھیل کا ایک حصہ نہیں؟“

انھوں نے فہرست پڑھ کر پوچھا۔

”میں آپ کا مطلب نہیں سمجھا جناب۔“

”سنو خرم سلطان؟“ وہ کہنیوں پر جھک کر بولے۔ ”ایک طرف وہ تمہیں اپنے شکاریوں کے سامنے بار بار لارہا ہے اور

دوسری طرف اپنی شہرگ تمہارے ہاتھ میں دے رہا ہے۔ یہ تضاد قابل غور نہیں؟“

”جناب میں تین چھتوں کی بھڑی چیر چکا ہوں۔“ میں نے بتایا۔ ”ملک نواز، شاہ زمان اور داؤد خان، اب جو پارٹی میرے تعاقب میں ہے اُس کا تعلق دوسری پارٹی سے بھی ہو سکتا ہے۔ میں نے جہانگیر کا نام بم ملک نواز کے پاؤں سے باندھ دیا ہے، وہ ہر صورت میں میرا تعاون چاہ رہا ہے۔“

”کون جیسا نیگر بدر...؟“

”جی ہاں اُس کا نام شاہ زمان کی بیٹی نے بتایا ہے۔“

”اُس کا اصل نام جاگیر خان ہے اور بدر اُس کا باڈی گارڈ ہے۔ معلوم نہیں کیوں اُس نے اپنا نام تبدیل کر لیا ہے۔ اب وہ دونوں ایک نام سے پکارے جلتے ہیں جس طرح عمود وایاز تائیںخ میں ایک نام سے زندہ ہیں۔ دونوں علاقہ غیر سے تعلق رکھتے ہیں۔“

”میں نے اپنے ہیڈ کوارٹر کو کچھ دیال ہے اُس شخص کو ٹریس کیا جائے۔“

”اُس کا ایڈریس میری ڈائری میں ہے۔“ انھوں نے دراز سے سیاہ کور والی ڈائری نکالی اور درج گزائی کرنے لگے۔ وہ عمارتی ٹکڑی کا بہت بڑا تاجر ہے۔ اُس نے دولت کا کچھ حصہ سیاست دانوں کی ہمدردیاں چھل کرنے کے لئے مخصوص کر رکھا ہے۔“

”کیا آپ کے علم میں ہے کہ ملک نواز کا تمام مال جاگیر خان کی وساطت سے آتا ہے؟“

”نہیں... یہ میرے لئے نئی خبر ہے۔“ وہ چونکتے ہوئے بولے۔ ”اگر ایسا ہی ہے تو تم وہ جڑ کیوں نہیں کاٹ دیتے؟“

”ایک جڑ کاٹ لینے سے ملک نواز کی ذات کا تن اور خیرت نہیں سوکھ سکتا سر۔“ اُس کی بے شمار جڑیں پنجاب اور سندھ کی زمینز مٹی سے غذائیں لے رہی ہیں۔ میں بیک وقت تمام جڑیں کاٹنا چاہتا ہوں اور اسی سلسلے میں یہاں حاضر ہوا ہوں۔“

”میں ہر تعاون کے لئے تیار ہوں چوہدری۔“ وہ پرجوش لہجے میں بولے۔

”میں ملک نواز کو بے دست و پا کرنا چاہتا ہوں لیکن اس طرح کہ وہ اپنے ہاتھ پاؤں خود کاٹنے پر مجبور ہو جائے۔ میں اُسے وہ سزا نہیں دینا چاہتا جو رنگ باز خان، سیٹھ سلیمان اور شاہ زمان کو دی ہے۔ ملک نواز اتنی کم سزا کا مستحق نہیں

میرے گرد موت کے چوڑے کی صورت میں بھیرنا پھانسیوں پر کرچی رقص کرے گی، فتنے لگائے گی اور وہ بدحواس ہو کر شہر بھگتا پھرے گا اور موت کی بھرپور شہر میں لہرائی فتنے لگائی اپنے وجود کے غریب محسوس کرے گا۔ تب وہ گھبرا کر خود موت سے لپٹ جائے گا۔

"مجھے یقین ہے تم جو کہتے ہو کر دکھاؤ گے۔" آئی جی صاحب بولے۔ "میں بھی یہی چاہتا ہوں کہ ملک نواز پہلے اپنی قبر کھودے اور پھر جاکر لیٹ جائے کیونکہ ہم اپنی بے بسی کا اعتراف کر چکے ہیں، یہ جانتے ہوئے کہ وہ قوم و ملک کے لئے کتنا زہر ملا ناگ ہے ہم اس کا سر بھی نہیں کچل سکے۔ تم بتاؤ مجھے کیا کرنا ہوگا؟"

"میں پہلے مرحلے میں اُسے یہ یقین دلانا چاہتا ہوں کہ اُس کے نابین متدہوکر اُس کے خلاف کام کر رہے ہیں۔ آپ جاگیر خان کی سرگرمیوں کا ذکر اس طرح کریں گے کہ وہ چونک اٹھے، آپ اُسے آنے والے طوفان کی پیشگی اطلاع دے کر اپنی ہمدردیاں جتانیں گے۔ باقی کام میں کر دیں گا۔ اگر اُس نے اس اطلاع کے ذرائع کو پھیلے تب..."

"میرا خیال ہے آپ کے عہدے سے وہ ایسا سوال کرنے کی جرأت نہیں کرے گا۔"

"اگر میرے کردار سے تمہارے ڈرامے میں جان پر دستکی ہے تو میں اپنا کردار بھرپور انداز میں نبھاؤں گا۔"

"شکر یہ جناب۔" میں نے ممنون لہجے میں کہا۔ اب مجھے پینڈی کچھ پیغامات دینے ہیں۔"

انھوں نے ریسور اٹھا کر پی اے سے لائن کلیر کروائی اور ریسور میری طرف بڑھا دیا میں نے بیگن کا نمبر ڈال کیا دوسری گھنٹی پر سب لوگ جانی پہچانی آواز سنائی دی۔

"ہیلو پیلیس! میں لاہور سے بول رہا ہوں۔"

"اوہ چیف! مزاج کیسے ہیں آپ کے؟ اُس کی آواز میں خوشی کی چمک اور عقیدت تھی۔"

"شاندار، ماسٹر کہاں ہیں؟"

"میرے دائیں ہاتھ بات کریں چیف..."

"السلام علیکم چیف۔" بیگن بولا۔ "پاکستانی کماؤت اور عیسائی کے مطابق آپ لمبی عمر پائیں گے ہم آپ ہی کی باتیں کر رہے تھے۔ میں ہارون سے رپورٹ سن رہا تھا۔"

"شکر یہ ماسٹر۔" میں نے جواب میں بتایا۔ "کماؤت تب پہنچتی ہوتی ہے جب ذکر یادوں کی فضا میں ہو، میرے بھائی اور ادھر لڑکیاں کسی ہے؟"

"سب لوگ بخیریت ہیں۔ میں صبح ادھر گیا تھا۔ پچھلے لئے پریشان ہیں۔"

"باپ کے سلسلے میں انھیں پریشان نہیں ہونا چاہیے ماسٹر۔"

"شانہ میری چھاؤں میں وہ راحت اور فرحت نہ ہو۔"

"نہیں میرے محترم۔" میں نے پرجوش آواز میں جواب دیا۔ "جب میں اس چھاؤں کے احساس سے ہی فرحت محسوس کرتا رہا ہوں تو..."

"اوہ... چیف۔" بیگن کی آواز میں گھبراہٹ تھی۔ "ہولڈ دیکھیں ہنٹ اندر آیا ہے، اُس کا لباس خون آلود ہے۔"

میرے حلق کی چرھائی میں دھار لڑکھائی تھی کیونکہ میں نے ریسور رکھنے کی آواز سن لی تھی۔ میرے جسم میں کسنی کی گرم گرم لہریں سنسنائے لگی تھیں اور خون کا دباؤ بڑھنے لگا تھا۔

"ہیلو چیف۔" بیگن کی آواز بھری۔ "ہنٹ کی گاڑی کو ایک ٹرک نے ٹکراتی ہے۔ ہنٹ ماسٹر جاگیر سوری جہاگیر خان کا تعاقب کر رہا تھا۔"

"جوٹ کی نوعیت کیا ہے؟"

"چند خراشیں ہیں چیف! گھبرانے کی کوئی بات نہیں ہے۔ ہارون اُسے ڈرینگ کے لیے لے گیا تھا۔"

"تو کیا آپ نے اُسے ٹریس کر لیا ہے؟"

"یس چیف۔" بیگن نے بتایا۔ "اور نگرانی بھی شروع تھی۔"

"اب میری بات غور سے سنیں ماسٹر۔" میری آواز اور لہجے میں ایک دم ایسے کانڈر کی روح حلول کر گئی تھی جو اونچی ٹکری پر بیٹھالینے ماتحت آفیسر کو جنگی حکمت عملی سمجھا رہا ہو۔ آئی جی سیکرٹری پر چہرہ رکھے متوجہ لگا ہوں سے دیکھ رہے تھے۔ میں نے بیگن کو حکمانہ انداز میں کہا تھا۔ جاگیر خان کے گرد مضبوط حصار قائم کر دیا جائے اور اُسے ہر سال کرنے کے لئے ناکام قاتلانہ حملے کیے جائیں اور اُسے کسی بھی قیمت پر پینڈی اسلام آباد سے باہر نہ نکلنے دیا جائے۔ اگر ضرورت پڑے تو اعوا کر لیا جائے۔ آخر میں اُسے رنگ باز خان کی بیٹیوں کے بارے میں سختی سے حکم دیا کہ ان کی حفاظت کے لئے آجی مقرر کر دیے جائیں۔

جس طرح چھوٹا ملک کسی سپر پاور کی جارحیت کا مقابلہ کرتا

ایمانی، جہد بنا یا تار و حکمت عملی سے ہی کرتے ہوئے اپنی بقا کی جنگ جیت سکتا ہے، اسی طرح میں ملک نواز جیسے بااثر شخص سے لڑنا چاہتا تھا، اُس کی طاقت مسلمہ تھی جو کمیتیں تبدیل ہوتی رہی تھیں۔ ملک کئی انقلابات سے گزرتا رہا تھا لیکن ملک نواز کا بال کوئی بھی ہیکانہ کر سکا تھا۔ وہ حضرت کی طرح قوم کا خون چوس چوس کر بچھوتا چلا جا رہا تھا۔ میں نے ایک انگریزی فلم دیکھی تھی۔ اُس میں ایک بے نام ڈسکل حضرت کو شکر پر دکھایا گیا تھا جو شروع میں گیند نمائش تھی جو بھی ختم ہوتی تھی اُس سے مس کرتی تھی فوراً تحلیل ہو کر اُس میں جذب ہو جاتی تھی اور گیند کی جسامت اُسی تناب سے بڑھ جاتی تھی کہ اُس حضرت کا جسم سات منزلہ عمارت جتنا ہو گیا تھا جب تمام کوششیں ناکام ہو گئی تھیں تو ایک پولیس سرجنٹ اپنے جسم پر طاقت ور ٹائم بم باندھ کر اُس حضرت میں جذب ہو گیا تھا اور پانچ منٹ بعد دھماکے سے حضرت کے پرچے اڑ گئے تھے۔

میں تہیہ کر چکا تھا اگر مجھے بھی اپنی قوم کی خاطر ملک نواز کے اندر جذب ہونا پڑا تو اس قربانی سے بھی دریغ نہیں کروں گا۔ چنانچہ بیگن سے رابطہ منقطع کر کے میں نے جاگیر خان کا نمبر ڈال کیا۔ دوسری طرف کوئی پتہ چان بولا تھا۔

"بڑے خان صاحب سے بات کرؤ۔ میں لاہور سے بول رہا ہوں۔"

"خان صیب ادھر نہیں ہوتے۔" جواب میں بتایا گیا۔

"دیکھو بھائی! بہت ضروری بات کرنی ہے اُن کا کوئی دوسرا نمبر دے دو۔"

"بھیرو... پھر اُس نے کسی گل خان کو آواز دی۔"

"جی صیب گل خان بول رہا ہوں۔" گل خان ٹاپتی ہوئی آواز میں بولا۔ "بڑے خان لالہ کا بیٹا ہے۔"

"میں خان کا دوست بول رہا ہوں اُن کے لئے بے حد ضروری پیغام ہے۔"

"پھر پیلیس جناب! ابھی پیغام پہنچاؤں گا۔"

"نہیں خان صاحب، میں خود اُن سے بات کروں گا۔"

اُس نے ایک لمحے کے لئے سوچا۔ فون پر سنگین خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ میں اُس کے سانس لینے کی آواز لاہور میں بیٹھا بخوبی سن رہا تھا۔ پھر اچانک ریسور میں ایک ٹولیل ٹھنکار سنائی دی۔ میں سمجھ گیا کہ وہ کسی فیصلے پر پہنچنے میں کامیاب ہو گیا ہے۔ بھو ابھی یہی اگلے ہی لمحے مجھے ایک نمبر بھوارا تھا۔ نمبر اسلام آباد کا تھا۔ میں نے کرڈل دیا کہ وہ نمبر ملایا تو دوسری گھنٹی پر ہی ایک کرنٹ آواز

میری سماعت سے نگرانی۔

"ہالو یس جہاگیر بول رہا ہوں۔"

"سنو جاگیر خان... میں نے غرائی آواز میں کہا۔ "نام بدلنے سے شخصیت اور چہرہ نہیں بدل سکتا۔"

"کون ہو تم...؟ وہ سرد آواز میں بولا۔"

"تمہارا ایک دیرینہ احسان مند ہے تم بھول چکے ہو گے مگر میں عسکوں کو فراموش کرنے والوں میں سے نہیں ہوں۔"

"چلو احسان مند خان۔" اُس کا ہجرت قدرے نرم ہو گیا۔ "بولو کیا چاہتے ہو؟"

"احسان کا بدلہ چکانا چاہتا ہوں خان۔"

"بات جلدی کرو بھائی، میں بے حد مصروف ہوں۔"

"کیا لائن محفوظ ہے خان؟"

"ہاں ہاں بھائی، تم بات کرو۔"

"تمہاری زندگی خطرے میں ہے جاگیر خان۔"

"خطرے کی نشان دہی کر دے پیلیس بھائی؟"

"لیکن تم یقین نہیں کرو گے جاگیر خان۔" میں نے مضبوط لہجے میں کہا۔ "لیکن جلدی دنیا کا چین ہی ایسا ہے۔ بعض اوقات اپنا سایہ ہی قاتل بن جاتا ہے۔"

"تم بات کرو فیصلہ میں کر دوں گا۔"

"رنگ باز اور سیٹھ سیماں کو جاننے ہو جاگیر خان؟"

"ہاں... ہاں... بولو... ختم..."

"اُن کا قاتل اب تمہارے شہر میں تمہارے نام کی گولیاں لے کر گھوم رہا ہے۔"

"کیا بھگت س ہے۔" وہ ایک دم دھڑکا۔ "تم کون ہو نام بتاؤ۔"

"نام کچھ بھی رکھ لو جاگیر خان لیکن میں تمہارا ہمدرد ہوں۔" میں نے پرسکون انداز میں بتایا۔ ملک نواز اپنی حکومت میں ہم تہذیبیال لا رہے تھے۔ تمام پرنسپل نے ہیرے بساط سے ہٹانے کا کام اُس نے غیر ملکی کرٹے کے قاتلوں کے سپرد کر دیا ہے۔ اُس کے پروگرام میں ایک کال بھی ہے وہ تمہیں لاہور بلائے گا۔"

"اوہ... بس دوست! اُس کی کال مجھے مل چکی ہے اور میں نے پہلی فلائٹ کا ٹکٹ لینے آدمی بھیج دیا ہے۔"

"تو کیا تم لاہور آ رہے ہو جہاگیر خان؟"

"ہاں... لیکن اب انٹرویو سے میرے قدموں کا رخ تمہاری طرف ہو گا۔ مجھے تباہی تم کہاں ملو گے؟"

"نہیں خان۔ اپنے ساتھ مجھے بھی جینے دو۔"

"یہ... میں... تمہارا تعاون چاہتا ہوں دوست! اس کا اندازہ التجا تمہارے۔ اگر چند روز ہو تو آؤ وقت میرے بدلے کو سہارا دو۔ میں تمہارا اس درندے سے مقابلہ نہ کر سکوں گا۔"

"فی الحال اپنی حفاظت پر توجہ دو جاگیر خان اور گودام سے مال شفٹ کر دو۔"

"کیا گودام بھی خطرے میں ہے؟"

"ہاں خان، تمہاری جگہ ایک شخص مقرر کر دیا گیا ہے جو وہی تم منظر سے ہٹے۔ وہ شخص گودام پر قابض ہو جائے گا۔"

"وہ ایسا کیوں کر رہے۔ میں تو ہمیشہ اس کا دفاع کرتا ہوں۔"

"وہ بزنس کو نیا خون اور نئے تجربے دینا چاہتا ہے۔"

"میں نے بتایا۔ یہ تو بتاؤ جاگیر خان اس وقت گودام کی پوزیشن کیا ہے قبضہ کرنے کی تیاریاں بتاتی ہیں کہ ملک کا تمام اثاثہ تمہارے قبضے میں ہے۔"

"اس کی تیاریاں بجا ہیں میرے بھائی، یہاں جاگیر خان بولا۔"

"ملک نواز جادوگر ہے لیکن اس کی جان میرے گودام کے پھرے میں بند ہے، کروڑوں بلکہ اربوں کی مالیت کا گودام ہے۔"

"میں نے اپنا فرض ادا کر دیا ہے جاگیر خان تمہیں شاید وہ نوجوان یاد نہ ہو گا جس کی ایک چھوٹی سی غلطی کی سزا ملک نواز نے موت تجویز کی تھی۔ تم نے اس نوجوان کو بچا دیا تھا۔ میں آج زندہ ہوں مگر یہ زندگی اداوار کی ہے۔ میں نے وہی قرض ادا کیا ہے۔ اپنا خیال رکھنا جاگیر خان... پھر اس سے قبل کہ وہ کچھ بولتا میں نے سلسلہ توڑ دیا تھا۔"

"بڑی خطرناک اور شاطرانہ چال چل رہی ہے ہو مگر سلطان! آئی جی کے لیے میں توصیف کے ریشم میں حمد کے انگارے لپٹے ہوئے تھے۔ اگر تمہاری اٹھائی ہوئی دیواریں تم پر آن گریں تو کیا ہوگا؟"

"کچھ بھی نہیں۔ ایک شخص تو کم مردم شماری سے نفی ہو جائے گا۔ میں نے بے پروائی سے جواب دیا۔ اور دنیا کا کاروبار چلتا رہے گا۔ رنگ باز، سیٹھ سیال، ملک نواز اور جاگیر خان جیسے مجرم پیدا ہوں گے، پچھلیں گے پھلیں گے اور آپ کے حکمے کی پانچوں انگلیاں گھٹی میں ڈوبی رہیں گی۔"

میرے بچے کی کٹ محسوس کرتے ہی آئی جی ہنس پڑے تھے لیکن اس ہنسی میں کھسیا ہٹ غالب تھی جس میں مخدرت کا رنگ چمک رہا تھا۔ اپنی بات کے مضامین انھوں نے بھی محسوس کر لیے تھے، جھٹک کر میرے ہاتھ کی پشت تھپک کر بولے۔

"میں تمہارے جذبات کا اظہار کرنے میں ناکام رہا ہوں میں تمہیں

محاطہ کرنے کی تلقین کرنا چاہتا تھا کیونکہ ملک نواز با اثر ہی نہیں وہ سیاح ذرا لٹ بھی رکھتا ہے۔ اگر تمہاری ذرا سی بھی غفلت سے وہ تمہاری پلاننگ کو سمجھ گیا تو پھر یہ ہماری بدقسمتی ہوگی۔ تم سب ایسا ضائع کر کے قوم بدلتا اس خلا کو پُر نہ کر سکتے گی۔ اس لیے ہر قدم احتیاط سے اٹھانا۔"

"میں اللہ کے بھروسے پر ہی قدم اٹھاتا ہوں۔ لٹا چھ انسانوں کو ہی نہیں بلکہ اللہ کو بھی ناپسند ہے۔ میں اللہ اور اس کے بندوں کی ناپسند کو ہی مٹانے میدان میں اترتا ہوں۔ اس لیے مجھے یقین ہے اللہ تعالیٰ کی تائید اور نیک بندوں کا تعاون میرے ساتھ ہے گا۔"

"ایک بات شروع سے اب تک جو میں نے نوٹ کی ہے وہ ہے تمہاری پولیس سے نفرت..."

"نفرت نہیں جناب۔" میں نے تردید کرتے ہوئے کہا۔ "یاد رکھیں میں پولیس کے طریقہ کار سے مایوس ہوں۔"

"اس کی وجہ بھی جانتے ہو؟"

"جی ہاں، ہم سب اپنی ذات ہر جذبے سے مقدم رکھتے ہیں۔ ہم یہ نہیں سوچتے کہ ملک و قوم کی بقا ہماری ذات کی پہچان ہے۔ ہر شخص یہ سوچتا ہے کہ اگر مجھے کوئی فائدہ نہیں تو میرے لئے ملک کی ترقی اور قوم کی سرخ رونی بے معنی ہے۔"

آئی جی پھیلا ہونٹ اتول میں دبائے سامنے والی دیوار کو گھورتے ہے پھر کرب ناک آواز میں بولے۔ "جب میں نے اس کرسی کا چارج لے کر پہلی حکمانہ میٹنگ بلائی تو بالکل ان ہی الفاظ میں میں نے افسران سے سوال کیا تھا۔ جانتے ہو مجھے کیا جواب دیا گیا تھا؟"

"میں ہی نہیں جو بھی انہیں پڑھتا ہے وہ جانتا ہے۔"

میں نے جواب دیا۔ "قلیل تنخواہ اور عمدہ وسائل کا جواز پیش کیا گیا ہوگا۔ ایک بڑے صاحب سے میری بھی بات ہوئی تھی۔ اس نے تم آمدنی کے علاوہ یہ بھی بتایا تھا کہ منشیات کے اسمگلر تیرے درجے کے بد معاش نہیں ہوتے۔ ایک اسمگلر جب لاکھوں کا مال اپنی ساکھ اور سلامتی لے کر چلتا ہے تو حفاظت کا انتظام بھی اسی سطح پر کرتا ہے۔ ان کے پاس تیز رفتار گاڑیاں اور جدید ترس اسلحہ ہوتا ہے۔ ان کے سامنے لاکھوں نہیں بلکہ بعض اوقات کروڑوں کا فائدہ ہوتا ہے جب کہ ایک پولیس کے اہل کار کے پاس صرف اپنے پاؤں ہوتے ہیں پرانی گاڑی اور اس کے سامنے کوئی منافع نہیں ہوتا۔ اس کا خیال نیوی بچوں کی طرف ہوتا ہے۔ اس لیے وہ کئی کترا جاتے ہیں۔"

"کیا تم اس جواز کو تسلیم کرتے ہو مگر؟"

"جی ہاں کسی حد تک..." میں نے سرکوبات میں ہلانے ہوئے کہا۔ "اس احساس کو ختم کرنے کی ضرورت کا بھی میں قائل ہوں اور پرانے ذہن کی جگہ نیا ذہن اور نیا خون لانے کے حق میں بھی ہوں۔ موجودہ لوگوں کو اگر آپ دولت میں ڈوبیں تب بھی مال کی سچ نہیں بدلتی۔ اور منہ خور کو ہیٹ بھر کر اگر دوسری جواراں دی جائے تب بھی وہ انسانی خون کے ذائقے کو پس پشت نہیں ڈالے گا۔"

"میں نے ان خطوط پر کام شروع کر رکھا ہے۔" انھوں نے بتایا۔ "لیکن سوچ بدلنے کے لئے کئی لسلوں کی تبدیلی کا انتظار کرنا پڑتا ہے۔"

"لیکن جواز ہر نئی نسل کی رگوں میں اٹھل کیا جا رہا ہے۔ اگر اس کا تذکرہ نہ کیا گیا تو تبدیلی ہو کر نئے والی نسل اُونگھتے اور لٹھرتے لوگوں کی ہوگی۔"

"بے شک..." میری بات کی انھوں نے پر زور تائید کرتے ہوئے کہا۔ "میں اس خطرے سے بے خبر نہیں ہوں لیکن مایوس نہیں ہوں۔ ہر فرعون کا پنجہ مروڑنے کے لئے اللہ تعالیٰ اپنا نیک بندہ مقرر فرمالتے ہیں۔ مجھے یقین ہے حکومت کی کوششوں اور تمہاری کاروائیوں سے جلد یا بدیر یہ زہریلے درخت بھی سوکھ جائیں گے۔"

"میں چند دن یہاں رہوں گا۔" میں نے ایک فوری خیال کے تحت کہا۔ "مجھے یہاں نقل و حرکت میں دشواری ہوتی ہے۔ اگر مجھے کوئی پراٹھٹ گاڑی مل جائے تو..."

"کوئی مشکل نہیں بولو جیپ یا کار..." آئی جی نے میری بات پوری بھی نہ ہونے دی۔ "اگر میں پاور کی ضرورت ہو تو وہ بھی ہوں لباس میں مل جائے گی۔"

"فی الحال میں جس منصوبے پر کام کر رہا ہوں اس کے لیے میں پاور کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔"

انھوں نے ایک موٹر جینسی سے نئے ماڈل کی ٹوٹا منگوائی اور ایک رسید کا بھی انتظام کیا جس سے یہ ظاہر ہوتا تھا کہ لائسنس پولیس کے پاس ہے اس طرح ممکنہ رکاوٹ کو دور کر دیا گیا تھا اور میری نقل و حرکت میں بوجہ خود شواہد اُتی رہی تھیں کار کی بہت سے آسانی دی تھیں۔

رات نو بجے میں نے پراپرٹی ڈیلر کو کال کیا۔ یوم چانک ہی خراب ہو گیا تھا۔ بادلوں کی گرج سے ماحول ہیبت ناک بن گیا تھا۔ کال اس نے خود ہی اینڈ کی تھی۔ اس کا بوجہ مہذب اثرات کشتہ تھا۔

"میں آپ کا ایک کلائنٹ ہوں مندر صاحب۔ میں نے آواز میں نرمی رچاتے ہوئے بتایا۔ "آپ نے مجھے وزنگ کارڈ

دیا تھا۔"

"میں ہر روز درجن بھر کارڈ تقسیم کرتا ہوں میرے بھائی! کوئی نام کوئی حوالہ دیجئے۔"

"میں کو بھی خریدنا چاہتا ہوں۔" میں نے بتایا۔ "آپ نے کسی دوست کی ایسی کا ذکر کیا تھا۔"

"مجھے یاد نہیں۔" وہ بولا اور پھر کسی سے مخاطب ہوا۔ "پتا نہیں کون ہے آپ ہاتھ نہ روکیں میڈم۔ ہاں آپ کل کسی وقت آفس تشریف لائیں۔"

میں نے بہتر کہہ کر ریسور رکھ دیا۔ جتنا کچھ میں معلوم کرنا چاہتا تھا۔ وہ معلوم ہو گیا تھا۔ اس نے جس میڈم کا ذکر کر کے میرے اندر نورین کے لئے نفرت بھر کا دی تھی وہی میڈم اس کے قریب موجود تھی۔ وہ اگر نورین نہیں تھی تب بھی میرے لئے باعث توجہ تھی کہ ان کی گفتگو میں مال اور گودام کا ذکر آیا تھا۔

طوفانی بارش کے طمانچے فضا سکریں پر لگ رہے تھے اور پیر کی ہتھیلیاں فضا سکریں کے چہرے کو صاف کرنے میں مصروف تھیں۔ اگر صفحہ ملاقات کی اجازت دیتا تب ہی میں اس سے ہٹس گا۔ کال اسٹارٹ ہو چکا تھا۔ اب میرے پاس صرف ٹیلی فون نمبر کا ذریعہ تھا۔ اگر کسی نے ایریا اور مکان نمبر تک رہنمائی کی تھی۔ دیار غیر میں ایک اجنبی کو راستہ کون بتاتا۔ اگر موم ٹھیک ہوتا تو کسی راہگیر سے مدد لے لیتا۔ لب بمل سگریٹوں کا کھوکھا تھا۔ میں نے کار کو کھکھکے ساتھ لگا کر شیشہ گرایا اور پیچ پیچ کر پتلا پوچھا اور اس نے اشاروں سے راستہ بتایا۔

اسٹریٹ نمبر چوٹی کی کمر پر کار روک کر میں نے چھاتہ بردار کی طرح چھلانگ لگائی تھی۔ عجالت میں وجہ وہ شخص تھا جو چھتری لیے گلی میں داخل ہوا تھا۔ میں چار چھلانگ لگنے کے نیچے چھتری کے نیچے پہنچا دیا تھا۔ تکلف اور اخلاقی ضابطوں کا وقت نہ تھا، وہ بدک گیا تھا۔

"اگر یہ گستاخی ہے تو میں معافی چاہتا ہوں۔" میں چھتری کے نیچے جا کر بولا۔

"کوئی... کوئی بات نہیں۔" وہ اپنی بوکھلاہٹ کی وجہ سے کھسیانی آواز میں بولا۔ "موم ہی ایسا ہے۔"

چھتے پردائیں ہاتھ میرا مطلوبہ مکان تھا۔ میں گیٹ کے قریب جا کر ایک دم چھتری سے نکلنا اور بند گیٹ سے جا کر یا گیٹ آٹھ۔ فٹ سے اونچا تھا بھری سے آنکھ لگا کر دیکھا۔ برآمدے کی سیڑھیاں گیٹ سے پیاس ساتھ قدم دوڑتیں۔ کوئی دو منزلہ عمارت تھی۔ اگر میں کال ہیل کے فریے اندر اطلاع بھجواتا تو شاید صفحہ کسی میڈم

کی موجودگی کے پیش نظر کسی کی آمد پسند نہ کرتا اور کسی ملازم کے ذریعے کہہ دیتا کہ صاحب گھر نہیں ہیں یا سہرے سے پیغام پر عمل ہی نہ کرتا۔

کہاؤند وال پر بیلوں کا چھتہ سنا بنا ہوا تھا۔ جس اسی چھتے کے نیچے چلتا ہوا پچھواڑے چلا گیا۔ چوری کی وارداتوں اور جانوسی کارروائیوں کا سہارا سیوےج پانپ بتایا جاتا ہے لیکن اس کو بھی میں ایسا کوئی سہارا نہ تھا صرف گیس لائن تھی۔ پانپ چھ فٹ سیدھا اٹھ کر دیوار کے ساتھ زمین کے متوازی چلا گیا تھا۔ کھڑکیاں پھول دار گول سے بند تھیں۔ میں گول میں پاؤں پھنستا ہوا اوپر گیا اور پھر دوسری منزل کی کھڑکی کی سل پر ہتھیلیاں جاکر اوپر لٹھنے لگا پورے جسم کا بوجھ ہتھیلیوں پر سہارنا اور پھر اوپر اٹھنا ایک مشکل ترین مرحلہ تھا۔ جب میں چھاتی تک اوپر گیا تو میرا جھیکا ہوا جسم گرم سلاخ بن گیا تھا۔ دوسری منزل کی کھڑکی میں کوئی گرل نہ تھی۔

میں نے لمحہ بھر سوچا اور پھر خطرناک رسک لیتے ہوئے شیشے کو ٹکرا دی۔ شیشہ چھین چھینا ہوا اندر جا بکھا تھا۔ ہاتھ سے ٹوٹ کر چھنی ہوئی کرچیاں صاف کیں اور پھر کھڑکی کو پکڑ کر سل پر چڑھ گیا۔ گھر میں اندھیرا تھا جب میں فرش پر اترا تو پٹنگ کی چھراہٹ میری سماعت سے ٹکرانی۔ میں دیوار کے ساتھ چپٹ کر کھڑا ہو گیا تھا۔ "لگ... کون... کون ہے..." آواز سنائی دیتی تھی اور اس پر خوف کا تاثر غالب تھا۔ میں نے طویل سانس لی اور بھیگی ہوئی ٹانج روشن کر دی۔ وہ پٹنگ پر کڑول بیٹھی ہوئی تھی اور سیاہ بالوں نے اس کا آدھا بدن ڈھانپ رکھا تھا۔ شاید روشنی کو محسوس کر کے ہی اس نے سیاہ گٹھناؤں کی آؤٹ سے اوپر دیکھا تھا۔

میرے ہونٹ پھڑک کر منہر ہو گئے تھے۔ میں نے بولنا چاہا تھا لیکن ایک زنجیر پر نظر پڑتے ہی آواز پھل اٹھی تھی۔ زنجیر اس کے پاؤں تک پٹنگ پر لٹھی ہوئی تھی اور دوسرا سیرافرش میں جذب تھا۔ فرش کو اکھاڑ کر زنجیر دبا لی گئی تھی اور یہ کام دو چار دن قبل ہی ہوا ہو گا۔

"آپ کون ہیں؟" لڑکی نے بھڑائی ہوئی آواز میں پوچھا۔
"آپ کے لئے صرف انسان۔" میں نے قدم بڑھاتے ہوئے جواب دیا۔ "اب آپ اپنا تعارف کرائیں۔"
"یہ..." اس نے زنجیر چھٹکتے ہوئے کہا۔ "میرا تعارف ہے۔ جس قیدی ہوں۔"
"غالباً میں آپ سے مل چکا ہوں۔"

"ہاں..." اس نے ہاتھوں سے بال بکھیر کر پشت پر ڈالتے ہوئے کہا۔ "میں صفر کی سیکورٹی ہوں۔"
"کیا آپ کو ہرات یوں ہی باندھ دیا جاتا ہے؟"
"نہیں..." اس نے نفی میں سر ہلایا تو بال پھر اس کے شانوں پر بکھر گئے تھے۔ "اس نے سات بجے میرے گھر ایک عورت کو بھیجا تھا کہ ایک ضروری کام ہے تو اس نے چائے میں بے ہوشی کی دوا ملا دی۔" میں نے زنجیر پکڑ کر دروازہ کھٹکا دیا۔ فرش کے ٹکڑے کے ساتھ زنجیر اکھڑی۔ پاؤں کی کڑی مقفل تھی۔ اس نے زنجیر اس نے ہاتھوں میں لے لی تھی۔

"یہاں صفر کے علاوہ اور کون ہوتا ہے؟" میں نے طرف کا جائزہ لیتے ہوئے پوچھا۔
"ایک ملازم..." اس نے چادر اوڑھتے ہوئے بتایا۔
"آپ دیوار نہ پھانڈ سکیں گی۔ میں صفر سے ملنے جا رہا ہوں۔ اگر زندہ دہیں آیا تو آپ کو ساتھ لے چلوں گا۔"
"میں گیٹ پر آپ کا انتظار کروں گی۔" وہ میرے ساتھ چل پڑی۔ "اس کے ساتھ ایک لڑکی بھی ہے۔ ناگن سے زیادہ زبردستی اور ٹوٹری جیسی مکار۔ شاید اسی نے مجھے منگا لیا ہے۔ وہ لڑکیاں مقامی طور پر بھی سپلائی کرتی ہے اور باہر بھی اسمگل کر دیتی ہے۔ اگر آپ کا تعلق پولیس سے ہے تو صفر گردن ڈال دے گا۔"
"وہ اس وقت کس کمرے میں ہوں گے؟" سیرھیاں اتر کر میں نے پوچھا۔

"میرے ساتھ ہیں۔ اب میں اس سے نہیں ڈرتی۔"
ابھی ہم اس دروازے سے چند قدم دور ہی تھے کہ اندر سے مردانہ قہقہہ دیواروں سے ٹکراتا باہر آیا۔ میں نے خیمہ کو اڑھل سے جھانک کر اندر دیکھا اور پورے جسم پر سنسنی سی دورانی۔ نورین صفر کے قریب بیٹھی ہوئی تھی۔ صفر نے جھک کر ڈرائی فروٹ پلیٹ سے اٹھایا اور نورین کے منہ میں ڈال دیا۔ میں نے اس لڑکی کو بچانے کا اشارہ کیا۔ جب وہ ماہداری کا موڑ مڑی تو میں نے کواٹر اندر دبا دیا۔ بلکی سی سرسراہٹ پیدا ہوئی تھی لیکن وہ دونوں اپنے جذبول کی سرسراہٹوں میں ڈھلے ہوئے تھے۔

نورین کا منہ چلتے چلتے یوں رک گیا تھا جیسے یونی گریڈا برقی دو منقطع ہو جانے سے ساکت ہو گئی تھی۔ اس کی آنکھیں بھی کھلی کی کھلی رہ گئی تھیں۔ صفر نے پھرتی سے پٹ کر دیکھا اور اچھل کر اٹھا تھا۔ اس نے الماری کی جانب طویل جست لگائی میں اگر چاہتا تو اس کی پھلانگ کا سفر اڈھوراہ جاتا مگر میں چپ چاپ

بھڑا ہوا تھا۔ پھر جوں ہی اس کا ہاتھ الماری کی جانب اٹھا میں نے الماری کی اُبھری ہوئی ناب گولی سے آڑا دی صفر لٹے پاؤں اچھل کر بیڈ سے جا کھڑا ہوا تھا۔
"اپنی خوب خدمت یہاں کے پاس بیٹھ جاؤ مشر صفر۔" میں نے سفاک آواز میں کہا۔ "درد دوسری گولی تمھاری اُبھری ہوئی ناک غائب کر دے گی۔"
"تت... تم نے ہی فون کیا تھا؟" صفر نے پوچھا اور دم سے سائنڈ ٹیبل پر بیٹھ گیا۔

"یہاں نہیں صفر صاحب؟" میں نے لیوا اور لہرایا۔ "میں نورین کے ساتھ..."
میری نگاہ جٹی ہوئی تھی اور اس سے نورین جیسی شاطر لڑکی کو فائدہ اٹھانا چاہیے تھا۔ اس نے جھپٹ کر اپنا پرس اٹھایا دوسرے لمے پرس میں سوراخ ہو گیا اور چہرے سے دھویں کی بکیر لہرائی ہوئی اٹھنے لگی۔ "نہیں نورین زبان! انجان نہ ہو! جو لوگ خرم چوہدری سے واقف ہیں وہ ایسی حقائق نہیں کیا کرتے۔" صفر کوکس نے ہاتھ اٹھانے کا حکم نہیں دیا تھا لیکن اس نے خود ہی تابعداری کی رسم ادا کرتے ہوئے دونوں ہاتھ گردن پر رکھ لیے تھے اور نورین کے پاس بیٹھ گیا تھا۔

میں نے انٹی ٹھوکر سے دروازہ بند کیا اور بغیر دیکھے بائیں ہاتھ سے ٹکٹ لگا دیا۔ پرس کو چھیدی ہوئی انگارہ سی گولی صوفہ سیٹ میں پیورٹ ہوئی تھی۔ فوم سے بھی دھواں اٹھنے لگا تھا۔ مجھے کبھی شعر یاد نہیں رہتا۔ میں نے نورین کی بلوری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔ "وہ شعر کیا ہے؟" کبھی ہم میں تم میں بھی پیار تھا۔ تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو۔ پھر کس پیار اور عہد و پیمان کی نظر زیادہ بھی نہیں ہوئی ابھی کل کی بات ہے۔ ہم نے پھر ساتھ بچانے کا عہد کیا تھا۔"

بیٹھ کر بات کر دھرم۔ "وہ بھڑائی ہوئی آواز میں بولی۔ میں کوئی صفائی پیش نہیں کروں گی۔ میرے پاس میری سچائی کا کوئی ثبوت نہیں ہے۔ حالات و واقعات کے سائے تلنے بانیے میرے خلاف ہیں۔ کٹھ پتلی تو اپنی مرضی سے مگر ابھی نہیں سکتی میری ڈوجیں کے ہاتھ میں ہے۔ وہ اتنا ظالم اور شاطر ہے کہ کڑی دوپہر کی دھوپ کو آدھی رات کی کھنکی سے لے سکتا ہے۔ اس نے جو چاہا وہی کچھ مجھے کرنا پڑا کیونکہ جو بھی اس کے اشارے کی خلاف ورزی کرتا ہے اس سے زندگی چھین لی جاتی ہے۔"

"وہ آخر کرنا کیا چاہتا ہے؟"
"یہ سوال کون پوچھ سکتا ہے خرم۔" نورین روٹنے والے انداز

میں بولی: وہ اتنا گہرا ہے کہ کوئی بھی اس کی ہتھاتھ تک نہیں اتر سکتا۔ ویسے کہہ رہا تھا کہ لڑکا جی دار ہے مگر ہے آواز کشتی مرحلوں سے گزر گیا تو گردہ میں قابل قدر اضافہ ہو گا لیکن مجھے اس کی زبان پر کبھی یقین نہیں آیا۔ وہ کہتا کچھ ہے کرتا کچھ ہے۔
"آج میرے پیچھے شکاری کتنے کتنے چھڑے تھے؟"
"میں نے..." نورین نے بے دھڑک جواب دیا۔ "مجھے ملک کے حوالے کسی نے فون پر حکم دیا تھا۔"
"مقتصد کیا تھا؟" میں غزبیا۔

"تمہیں ہر سال کرنا اور کسی چھوٹے موٹے حادثے سے دوچار کرنا۔" کیا اس نے شاہ زمان کی لاش داپس کر دی ہے؟
"نہیں..." نورین کے چہرے پر دکھ اور نفرت پھیل گئی۔ شدید لکڑھٹھکانے لگا دی گئی ہے۔ اس نے میرے ذریعے گھڑاؤں کو بتایا ہے کہ شاہ زمان بزنس ٹور پر جاپان چلا گیا ہے۔
"مال گودام سے کیوں ہٹایا گیا ہے؟" میری بات پر دونوں اچھل پڑے تھے۔

"اوہ..." صفر ہونٹ کاٹنے لگا۔ "مادام! جب میں فون پر آپ سے باتیں کر رہا تھا تو یہ میرے آفس میں تھا۔ وہیں سے یہ میرے پیچھے لگا ہے۔"
"اگر وہاں نہ ہوتا تب بھی اسے یہاں آنا تھا۔" نورین ٹھہرے ٹھہرے لہجے میں بولی۔ "تم نہیں جانتے صفر! یہ شخص کون ہے۔ اس شخص نے چف کورہروں سے ہلا کر رکھ دیا ہے۔ یہ جہاں چاہتا ہے پہنچ جاتا ہے۔"

"آپ اٹھ چلو نورین!" میں نے دوستانہ آواز میں کہا۔ "ہمیں عہد و پیمان کی تجدید کر کرنی ہے۔"
"منہو خرم!" نورین خشک ہونٹوں پر زبان پھیر کر بولی۔ "اس کی آوازیں خوف کی کیکیاہٹ نمایاں تھی۔ میں نے قصور ہوں۔ وہ ہی چاہتا ہے کہ شاہ زمان کے بعد اب نورین بھی منظر سے ہٹ جائے۔ میں کھویا ہوا اعتماد حاصل کرنے کی بھرپور کوشش کر رہی ہوں۔ جو ٹھہرے پٹ جاتے ہیں وہ انھیں بساط پر رکھنا پسند نہیں کرتا۔۔۔ تمھاری کامیاب کارروائی نے ہماری ساکھ تباہ کر دی ہے۔ مجھے اس جال سے نکلنے کا موقع دو خرم سلطان۔ پھر میری وفاداری آزمائینا۔"

"ہمیں جان من..." میں نے لگاؤٹ بھرے انداز میں کہا۔ "اتنا وقت کہاں ہے؟ میں تو اب تمھارے بغیر ایک پل بھی نہیں رہ سکتا۔"
"میں... میں..." نہیں جاؤں گی تمھارے ساتھ۔"
"اور میں اپنی محبوبہ کو بغیر کے گھر میں دیکھ سکتا۔"

”یہ غیر ختم نہیں میرا ماتحت ہے۔ میرے لیے کام کرتا ہے“
 ”ہاں وہ تو میں دیکھ چکا ہوں“ میں نے کہا۔ ”تھاری خاطر یہ معصوم لڑکیوں کو آغا کر لیتا ہے؟“
 ”اوہ...“ نورین چونک پڑی۔ ”تو تم سب کچھ جانتے ہو؟“
 ”ہاں نورین، میں اس لڑکی کو دیکھ چکا ہوں۔“
 معاذروانے پردہ تنگ کی آواز اٹھری۔ میں نے بالکل غیر ارادی طور پر پیٹ کر دیکھا تھا۔ سنا ہے جو قوم پہلے وقتوں میں بدراہ ہو جاتی تھی اللہ تعالیٰ فوراً اس قوم کو سزا دے دیا کرتے تھے۔ ہماری دنیا میں بھی فلاسی غفلت کی سزا فی الفور مل جاتی ہے۔ مجھے بھی اس غلطی کی سزا ملنی تھی۔ صدف اڑتا ہوا نہ صرف مجھے جڑوں سے اکھاڑ گیا تھا۔ بلکہ ریوا اور بھی پھین لے گیا تھا۔
 ”اس کی عمر زوردار نہ ہوتی تو میں شاید لاکھ لاکھ کر سنبھل جاتا۔ لیکن میں پشت کے بل گرا تھا۔ صدف دونوں پاؤں جوڑ کر اوپر اٹھا اٹھا کا ہاتھ غالی تھا۔ غائب ریوا اور پر وہ بھی گرفت برقرار نہ رکھ سکتا تھا۔ میں نے اُسے اُٹے دیا۔ وہ سینے پر پاؤں مارنا چاہتا تھا۔ میں نے دونوں ہاتھوں پر اس کے پاؤں کو روکا اور واپس اُچھال دیا۔ وہ اڑتا ہوا صوفے پر جا کر بیٹھ گیا۔ جب میں اُچھل کر اٹھا تو وہ بھی مقابلے کے لیے اٹھ کھڑا ہوا تھا۔
 ”اگے بڑھو دوست“ میں نے اُسے تاؤ دلاتے ہوئے کہا۔
 ”اگر تم مجھے خاموشی سے رخصت کر دیتے تو میں تمہیں پراپرٹی ڈیلر مان کر بھول جاتا۔“
 معاصیری نگاہ ریوا اور پر جا پڑی لیکن فاصلہ نورین کے حق میں تھا۔ اور وہ اُڑنے کے لیے فاختہ کی طرح پرتول رہی تھی۔ پھر وہ ہی صدف رقص کے انداز میں میری جانب چڑھائیں نے تھرکنا شروع کر دیا تھا۔ مقصدانہ دکھانا تھا بلکہ میں تھرکتے ہوئے ریوا اور کے نزدیک ہونا چاہتا تھا۔ فاصلہ تیزی سے کم کرتا ہوا وہ جوں ہی میرے ہاتھوں کی زد میں آیا میں نے دایاں ہک دکھاتے ہوئے یایاں ہاتھ اس کی بغل کے نیچے ملا۔ وہ ایک طرف جھک گیا میں نے اس وقت کو استعمال کرتے ہوئے ریوا اور اٹھا اٹھا چاہا تو میری پسلیوں پر قیامت ٹوٹ پڑی تھی۔ صدف نے ترچھی لگ مار کر خود کو ماہر فن تسلیم کروا دیا تھا۔ میں کھڑا تو پاؤں پر تھا مگر سینے میں جیسے سانس رُک گئی تھی۔ اور آنکھوں سے بینائی غائب ہونے لگی تھی۔ ایسی پوزیشن میں مقابلے کے لیے ہر طرف ریت کی بوری ثابت ہوتا ہے۔ صدف نے گڑے آرام سے میری گردن پر ہاتھ مارا تھا اور میں بھی آہستگی سے ڈوبا جا گیا تھا۔

خود اعتمادی اچھی ہوتی ہے۔ مگر کبھی کبھی عقل کی طرح اچانک دھوکا بھی دے جاتی ہے۔ مجھے خود پر اور مارشل آرٹ پر بڑا نا تھا لیکن ایک انٹری سے نوجوان نے میرے ناز کو شرمندہ کر دیا تھا۔ پسلیوں کی شدید ضرب نے مجھے مغلوب کر دیا تھا۔
 صدف نے میرے چہرے کو ٹھوکری اور پیشانی پر پاؤں لکھ کر بولا۔ ”میڈم... ابھی وہ شخص ہے جس نے ہمارے چیف کی منہیں حرام کر رکھی ہیں...“
 ”اسے گولی مار دو صدف“ نورین کے بچے میں سفاکی تھی۔
 ”چیف کی ذمہ داری میں لیتی ہوں۔“
 ”بہتر میڈم...“ صدف نے پاؤں ہٹاتے ہوئے کہا۔ ”آپ کی خوشنودی کے لیے میں چیف کو بھی گولی مار سکتا ہوں۔“
 اس نے ایک قدم ہی بڑھایا تھا کہ میری دائیں ٹانگ کو جیسے غیرت آگئی تھی۔ غیرت منہ کی ضرب میں ہلا کی قوت ہوتی ہے صدف کے حلق سے کرب ناک آواز اٹھری اور وہ گھٹے موڑتا ہوا بیٹھ گیا۔ میں نے لیٹے لیٹے اُچھل کر تھوڑا سا رخ بدلا اور پھر دونوں پاؤں اس کے سینے میں جا لگے۔ نورین نے جب پانسے پلٹے دیکھا تو ہاتھ لڑتی ہوئی اٹھی۔ انداز ایسا تھا جیسے مجھے روکنا چاہتی ہو۔ لیکن میں اس کی چال سمجھ گیا تھا۔ وہ جینتی ہوئی ریوا اور کی جانب بڑھ رہی تھی۔ میں نے اُٹی ز قند بھری اور ریوا اور لیتا ہوا دوسری طرف نکل گیا۔
 ”اب مجھے حکم دو مادام“ میں نے سر کو خم دے کر کہا۔ ”عورت! تلوار اور گھوڑا صرف فاتح کا ساتھ دیتے ہیں۔ میں تمہارے لشارے پر چیف ہی کو نہیں ستارے شہر کو ہلاک کر سکتا ہوں۔“
 ”ٹھیک ہے خرم سلطان“ وہ پھر صوفے پر بیٹھ گئی۔ ”میں واقعی فاتح کا ساتھ دینے والی ہوں۔ اگر تم چاہو تو میں تمہارا ہاتھ نہیں روکوں گی۔ اسے گولی مار دو“ اب میں اپنے سال کے ساتھ اس کا مال بھی واپس لے جاؤں گی۔“
 ”مجھے کیا ملے گا میڈم؟“
 ”میں اور میرے ساتھ سب کچھ۔“
 ”مستر صدف!“ میں نے صدف کے بال بکڑ کر اس کا چہرہ اُپر اٹھایا۔ ”تمہاری میڈم نے تمہاری قیمت لگا دی ہے۔ تم اگر بولی میں حق لینا پسند کرو تو میں تمہیں بھی موقع دینے کو تیار ہوں۔ تو تم میڈم کی کیا قیمت لگاتے ہو؟“
 ”اپنا اور اس کا مال“ صدف بولا۔ اور اس کے پرس میں میری سیکرٹری کی قیمت کی ایڈوائس رقم۔“

”اب تم بولو نورین“
 ”میرا جواب سنو گے“ وہ اُچھل کر اٹھی اور صدف کی گردن پر کھڑی تھیلی مار کر ہاتھ جھاڑتی ہوئی پیچھے ہٹ گئی۔
 مجھے اپنی تھیلی کی ضرب پر بڑا مان تھا لیکن نورین جیسی نازک اندام لڑکی نے اس رات مجھ سے یہ مان بھی چھین لیا تھا۔ اس نے جھک کر ایسا کٹ مارا تھا کہ صدف کی گردن ٹوٹ کر شانے پر اوندھی ہو گئی تھی۔ اگر وہ اُسی انداز کی دوسری ضرب لگاتی تو عین ممکن تھا کہ گردن تن سے جدا ہو جاتی۔
 ”میں ناکارہ پُرزے اپنی ذات کی گاڑی میں پسند نہیں کیا کرتی۔“ اس نے پرس اٹھاتے ہوئے کہا۔ ”پہلے میرے نزدیک تم ناکارہ ہو گئے تھے۔ اب تم نے خود کو فعال ثابت کر دیا ہے۔ لہذا میں نے ناکارہ پُرزہ نکال پھینکا ہے... آؤ چلیں...“
 ”اس کی بخوری نہیں دیکھو گی؟“
 ”وہ میں پہلے ہی غالی کر چکی ہوں“ اس نے ہلکا سا قہقہہ لگایا۔
 ”اپنے وقت کی قیمت“
 ”کتنی...“
 ”تم بھی معلوم کرنا چاہتے ہو؟“ وہ ہیٹ کر بولی۔
 ”نہیں خرم مجھ سے نہ پوچھو“ اس کی آنکھوں کے چراغ بجھ گئے۔
 ”مجھے پہلے ہی بڑا دکھ ہے کہ تم نے میرا دوسرا رخ بھی دیکھ لیا ہے۔ ہمارا زنس ہی ایسا ہے۔“
 ”میں بھی ولی نہیں ہوں میں نے بے پرواہی سے جواب دیا۔
 ”تم لمبے فروخت کرتی ہو اور میں خریدار ہوں۔ ہمارے حمام میں سب ننگے ہی ہوتے ہیں۔ ہاں جب تم میری بن جاؤ گی تو ان لمحات کا صرف میں خریدار ہوں گا۔“
 ”خرم...“ باہر نکل کر وہ التجائیہ انداز میں بولی۔ ”میری مدد کرو گے، ایک لڑکی یہاں سے لے جانی ہے۔“
 ”کیا اس کا سودا ملے ہو چکا ہے؟“
 ”ہاں ڈیر“ نورین بولی۔ ”دو دن بعد وہ دوسری لڑکیوں کے ساتھ بھیجی جائے گی۔“
 ”کیا یہ لڑکیاں اپنی مرضی سے جاتی ہیں؟“
 ”کچھ مرضی سے اور کچھ کو ایک دوا کے زیر اثر ذہنی طور پر مغلوب کر دیا جاتا ہے۔ سب ملازمت کے ویزے پر روانہ کی جاتی ہیں۔ پر موزوں کا ایک ایجنٹ ساتھ جاتا ہے اور تقسیم کر آتا ہے۔“
 ”خوب...“ میں نے پُرسائش آواز میں کہا۔ ”برا محظوظ طریقہ“

اپنا یا جاتا ہے۔“
 ”اگر ایسا نہ ہوتا تو ہم زیادہ غصہ یہ بزنس کیسے کرتے۔“ نورین نے دروازہ کھولا اور پھر اکھڑا ہوا فرش اور غالی پلنگ دیکھ کر مہبوت سی رہ گئی تھی۔
 ”اوہ غالباً فاختہ آراوی گئی ہے“ میں نے ہنس کر کہا۔
 ”تم نے...“ اس نے میرے گریبان پر ہاتھ ڈال دیا۔
 ”ہاں...“ میں نے اس کی کلانی پر ہاتھ مارا میں سمجھتا تھا اُسے صدف نے اپنے لیے قید کر رکھا ہے۔
 ”یہ تم نے کیا کر دیا کتے“ وہ کسی باؤلی کتیا کی طرح بھونکی ہوئی مجھ پر چھٹی۔ گالی کا انگارہ میرے لیے ناقابل برداشت ہی ہوتا ہے ورنہ میں اس پر ہاتھ نہ اٹھاتا۔ تجھ پھر کھارو دیوار سے جا ٹکرائی۔
 ”اگر اب تم نے ٹیلنڈر بان استعمال کی تو میں زبان کھینچ لوں گا۔“ میں نے بالوں کو پکڑ کر اُسے جھٹکا دیا۔ وہ کراہتی ہوئی بولی۔
 ”تم... تم نے مجھیں ہزار کا نقصان کر دیا ہے ظالم میں تو اس سوڈے کی اطلاع باس کو بھی دے چکی ہوں۔ وہ میری ہڈیاں توڑ دے گا۔“
 ”فکر نہ کرو وہ زنجیر کے ساتھ باہر نہیں جاسکتی۔ گیٹ پر میرا نظارہ کر رہی ہو گی۔“
 ”اوہ... آؤ چلیں کہیں نکل نہ جاؤ وہ دوڑی تو میں نے ہاتھ اٹھا کر اُسے روک لیا۔ نہیں خرم مت رو کو اگر وہ آزاد ہو گئی تو پولیس تک چلی جائے گی۔“
 ”تم بھی پولیس سے ڈرتی ہو پولیس تو تمہارے باس کے اشاروں پر ناچتی ہے۔“
 ”پھر بھی وہ جواب طلب کر لیا کرتا ہے۔“
 ”تم باس کو چھوڑ کیوں نہیں دیتیں۔“
 ”چھوڑ کر کہاں زندہ رہ سکتی ہوں۔“
 ”میرے پاس میں ضمانت دے سکتا ہوں نورین ہم کچھ دنوں کے لیے اس ملک سے دور چلے جائیں گے۔ میرے پاس انٹرنیشنل پاسپورٹ ہے اور میں کئی مالک کی شہریت رکھتا ہوں تمہیں شاید کسی نے بتایا نہ ہو کہ میری آدھی زندگی مشرق بعید میں گزری ہے۔ میں اگر ملک نواز سے پیچھے آزما کر لے گیا ہوں تو میری پشت پر کوئی بڑی طاقت ہے۔ ایسی طاقت جو اس قلعے کی اینٹ سے اینٹ بچا سکتی ہے۔ مجھے بچاؤ نورین، تب ہی کل کے سورج سے زندگی حاصل کر سکو گی ملک نواز

کا سورج اب غروب ہو رہا ہے چڑھتے سورج کا ساتھ دو۔
”جب غروب ہوگا تب دیکھا جائے گا۔“ نورین اپنی چوٹ
سہلاتے ہوئے بولی۔ ”فی الحال میں بغاوت کا تصور بھی نہیں
کر سکتی۔ تمہیں بھی مشورہ دوں گی اس کی اطاعت قبول کر لو۔“

”مشورے کا شکریہ... میں نے اسے شانوں سے ہٹا
اور کمرے میں اچھال کر دروازہ بند کر دیا۔ وہ پہلو کے بل گری اور
چمکنے فرش پر پھسلتی ہوئی دیوار تک چلی گئی تھی۔ اگر وہ گرہستن
ہوتی تو گھٹنوں میں چہرہ چھپا کر رحم کی بھیک مانگنے لگتی۔ وہ تڑپ
کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ میں سینے پر ہاتھ باندھ کر ٹہلتا ہوا اس کے قریب
جاکھڑا ہوا۔ نورین زبان آج تم میری اطاعت قبول کرو گی۔“
”مجھے وحشی اور اکھڑا مرد بہت پسند ہیں۔“ وہ کہنی سہلانے
لگی۔ ”لیکن تمہارا رویہ نامناسب ہے۔“

”میں نے تعاون کی پیشکش کی ہے۔“ میں نے ٹھہرے
ہلچے میں کہا۔ ”صرف دو منٹ یہ پیشکش قائم رہے گی۔“
”تم چاہتے کیا ہو حرم؟“ اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ
اُبھری۔ بڑی ہی مکاڑ اور زہریلی مسکراہٹ تھی۔ ”اگر مجھے خریدنا
چاہتے ہو تو میں...“

”بزنس کی بات کرو میں نورین میں جہموں کا بیوباری
نہیں ہوں۔“

”میں معذرت کر چکی ہوں۔“ اس نے کچھ بے بالوں کو جھٹک
کر کہا۔ ”میں ملک نواز کو نہیں چھوڑ سکتی۔ اُسے چھوڑنے کا مطلب
ہوگا کہ میں نے دنیا چھوڑنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ اور میں ابھی دنیا
میں رہنا چاہتی ہوں۔“

”مجھے اُس پر موٹر کا نام بتا دو جو لڑکیاں لے جاتے ہیں۔“
”سوری... میں نے نفی میں سر ہلادیا۔ بات وہی کرو۔
سے غداری کی ہوگی۔ وہ بھی ملک نواز کا ہی شعبہ ہے۔“

”نہیں بتاؤ گی؟ میں نے ایک قدم بڑھایا۔
”نہیں... نہیں... اس کی آنکھوں سے خوف جھانکنے لگا۔
”میرے نزدیک نہ آنا چوہری۔“

میرا اٹھا ہوا قدم رک گیا تھا۔ اُس نے لباس سے شکاری
چاقو نہ صرف چھڑتی سے نکال لیا تھا بلکہ ٹن دبا کر چم چماتا ہوا چھل
بھی کھول لیا تھا۔ میں کسی کرلے کے قاتل کی گولی سے مرنے
کی بجائے لڑکر مرنا پسند کروں گی۔ آؤ چوہری یہ تماشا بھی دیکھ
ہی لو۔“

میں نے ہاتھ پھیلائے اور نورین تھک کر جھپٹی۔ اُس نے

ترجہ داد لگایا تھا۔ میرا دایاں ہاتھ دائرے میں گھوم کر زد سے نکل
گیا تھا۔ چاقو پھرنے اور وار کرنے کے انداز سے یہ ظاہر تھا کہ
وہ ایک تربیت یافتہ چاقو زدن ہے۔ تب ہی مجھے سنبھل سنبھل کر
مقابلہ کرنا پڑا تھا۔

”واپس پھلے جاؤ خرم سلطان شاید آنے والا کوئی وقت
ہمیں دوست بناوے۔“

”نہیں نورین، فیصلہ آج ہی ہونا چاہیے۔“ میں نے خود کو
چاقو کی زد سے بچاتے ہوئے پیچھے ہٹایا اور نورین اچھل کر دو
قدم لگے بڑھ آئی تھی۔ میں پھر ٹکڑے لگا۔ میں اُسے یہ تاثر دینا
چاہتا تھا کہ چاقو سے خوفزدہ ہو کر میں راہ فرار تو نہیں کم از کم فاصلہ
ضرور بڑھانا چاہتا ہوں۔ اس نے میری چال سمجھ لی تھی۔ یہی
وجہ رہی تھی کہ وہ فاصلہ برقرار رکھتے ہوئے تھک چکی ہوئی آگے
بڑھتی چلی آ رہی تھی۔

چنانچہ میں نے خود کو ایک دم پشت کے بل گرایا اور
سلیب میں ڈوب گیا۔ یہ ایک اندھی اور خطرناک چال تھی۔ ایسی
صورت میں مت مقابل کو عموماً اپنے اوپر گرایا پڑتا ہے۔

نورین منہ کے بل فرش پر آن گئی مگر چمکنے فرش نے
میری پوزیشن بدل دی تھی حالانکہ میں نے کوئی کوشش نہ
کی تھی، اتنا وقت بھی نہ تھا۔ میں اُسے سلیب کی طرف لگاتا
ہوا آگے سرک گیا تھا۔ یہی وجہ رہی تھی کہ نورین کے گھٹنے میرے
سینے پر لگے تھے اُس کے ہاتھ اور چہرہ ننگے فرش سے ٹکرایا تو
اس کی چیخ بند کمرے میں دیواروں سے سر ٹکراتی معدوم ہو گئی
تھی... میں نے اُسے موقع دیے بغیر اچھالا اور دوسرے لمحے
اس کے بال میری منہ میں تھے۔

”اب بولو کہ تمہاری آواز سننا پسند کرو گی یا گردن...“
”نہیں... نہیں... اس نے دونوں ہاتھوں سے میرے
بال پکڑ لیے۔ چھوڑ دو ورنہ... چھوڑ دو۔“

”پیش کش کا وقت ایک منٹ بڑھا سکتا ہوں؟ میں
نے اس کی گردن کو ہلکا سا جھٹکا دیا۔

”ٹھیک ہے، باقی ہوں۔ اس نے کہا ہستی ہوئی آواز
میں ہار مان لی۔ ”لیکن کیا ضمانت ہے تم مجھے زندہ چھوڑ دو گے؟“
”میں وعدہ نہیں کروں گا کیونکہ میں فاتح ہوں مفتوح
شرائط کی پوزیشن میں نہیں ہوا کرتے۔ ویسے تمہاری زندگی
اور موت میرے نزدیک برابر ہیں۔“

”وہ ملک نواز کا بھائی اعظم خان ہے۔ ایک جیسی مال روڈ پر

ہے لیکن... قدموں کی دھمک سن کر ہم دونوں ہی بُری
طرح چونکے تھے، میری گرفت سے اُس نے جھٹکے سے بال چھڑا
لیے تھے۔ میں نے ایک کر دروازہ کھولا اور جھانک کر دیکھا...
راہداری میں تین پولیس والے آ رہے تھے ان کے پیچھے ایک
عورت تھی، پھر وہ اس دروازے پر ٹک گئے جس کے اندر
صنذر کی لاش تھی۔

جوہی وہ چاروں کمرے میں داخل ہوئے میں پنچوں
کے بل باہر نکلا اور دائیں ہاتھ تاریک راہداری میں دوڑنے
لگا۔ میں نے پلٹ کر نہ دیکھا مگر میری سماعت سے نورین کے
قدموں کی چاب نکلا رہی تھی، جتنی تھک تارکی میں ڈوبا ہوا تھا۔
مجھے برآمدے میں پڑی کرسی کی تھوک بھی لگی، اگر میں بروقت
کرسی پر نہ لیتا تو کرسی گرنے کی آواز سناتے کو چونکا دیتی، کچاؤ
وال ادھر بھی اونچی ہی تھی، میں نے دس قدم دور سے ہی
دوڑ لگائی اور دیوار پر پاؤں کا پیچہ مارتا ہوا نیچے آ گیا۔ ہاتھ
دیوار کے کنارے کو چھو کر پھسل گیا تھا۔

”راہداری سے خرم،“ اندھیرے میں نورین کی آواز
سنائی دی۔ اندھیرے میں اُس کا ہیولا دوڑتا ہوا دکھائی دیا۔
پھل دار پودوں کے درمیان کچی روش بریں بھی دوڑنے لگا۔
نورین جالی دار گیٹ پر چڑھ کر دوسری طرف کود گئی۔ جب میں
نے گیٹ پھاندا تو وہ فٹ پاتھ پر جا گئی تھی۔

تس طرح قوم کے افراد بیرونی جارحیت کے خلاف ذاتی
اور گردہ ہی اختلافات پس پشت ڈال کر متحد ہو جایا کرتے ہیں۔
اسی طرح بڑے لوگوں کے درمیان بھی ایک خاموش معاہدہ
اصول کا درجہ رکھتا ہے۔ وہ بھی اجتماعی خطرے کا الارم سن کر
ذاتی مفادات اور دشمنی فراموش کر کے ایک صف میں کھڑے
ہو جاتے ہیں، نورین نے بھی اسی معاہدے پر عمل کرتے ہوئے
اُسے باہر جانے کا راستہ دکھایا تھا۔

”خرم!“ وہ ہانپتے ہوئے بولی۔ ”میری گاڑی اندر ہے۔
گاڑی کے ذریعے پولیس مجھے تک پہنچ جائے گی۔“

”اُس خطرہ تو ہے لیکن وہ لوگ نظر انداز بھی کر سکتے ہیں؟
میں نے جواب دیا۔ ”اگر گاڑی ہٹانے کی کوشش میں تم دیکھی
گیں تو ابھی دھکی جاؤ گی۔“

پھر کیا کروں...؟ وہ رہنمائی ہو کر بولی۔ ”میرا بیکار ڈاکٹر
صاف رہے۔ میں پولیس کے بیکار ڈاکٹر نہیں چڑھنا چاہتی۔“
”پھر تو تمہیں فرار نہیں ہونا چاہیے تھا۔ میں نے کہا۔

”اس کی ملازمہ تمہاری صفائی پیش کر دیتی؟“
”لیکن لاش کا جواز کیا دیتی؟“
”یہی کہ کوئی صنذر کا دشمن تھا۔ دونوں میں تکرار اور ہاتھ
پائی ہوئی تھی۔“

”ایک تجویز ہے۔ میں چوری کی رپورٹ دوں۔ کسی
نے میری کارڈ کیٹ سے چرائی ہے۔“

”آؤ کوئی نہ کوئی حل سوچ لیں گے۔“ میں نے کہا اور
ہم گھوم کر گلی کی نکتہ پر آ گئے۔ جہاں میری کارڈ کیٹ تھی لیکن اس
وقت میری کارڈ کے ساتھ ہی پولیس کی ایک پیپ کھڑی تھی
نورین فوراً ہی میرے پہلو میں آئی تھی اور اس نے ہنس ہنس
کر باتیں کرنا شروع کر دی تھیں۔ باوردی ڈرائیور ڈرائیونگ
سیٹ پر بیٹھا لپچائی لگا ہوں سے نورین کو دیکھ رہا تھا۔ اس
نے یقیناً مجھے خوش نصیب مرد سمجھا ہو گا جس کے پہلو میں
ایک حسینہ انگلیاں کرتی اور چپکٹی چل رہی تھی۔
داناؤں نے سچ کہا ہے کہ بعض اوقات آنکھ جو کچھ دیکھتی
ہے اور ذہن جو اندازے لگاتا ہے وہ سب کچھ غلط ہوتا ہے۔

وقت نے دو دشمنوں کو دیکھنے والوں کے لیے یک جان دو
قالب بنالیا تھا۔ میں نے اندر بیٹھ کر اس کے لیے دروازہ کھولا
اور اندر بیٹھتے ہی چپکٹی بل ناگن کی طرح چھٹکارے ہوئے
بولی تھی۔

”خرم سلطان، حالات نے دونوں کو ایک کشتی پر
بٹھا دیا ہے لیکن ہم جانتے ہیں کہ ہماری منزل ایک نہیں
ہے۔ لہذا تم مجھے اب اپنی منزل تک نہیں لے جا سکو گے۔“
میں نے انگلیشن میں چٹائی گھماتے ہوئے چہرہ موڑ کر دیکھا۔
اپنی حماقت پر بھرپور قہقہہ لگانے کو ہی چاہ رہا تھا۔ نورین نے
اپنے زخمی پرس کے پیٹ سے چھوٹا سا پستول نکال لیا تھا
”تم نے یہ کیسے جان لیا کہ میں تمہیں اپنے ساتھ لے
جاؤں گا۔“ میں نے انجن اسٹارٹ کرتے ہوئے کہا۔

”اچھا! وہ ہنس پڑی۔ ”پھر کیا کرتے میرے ساتھ؟“
”جو یہاں دشمن کمزور دشمن کے ساتھ کیا کرتے ہیں؟“
”لیکن اب پوزیشن بدل چکی ہے چوہری۔“ وہ طنز پر انداز
میں مسکرائی۔ ”بولو تمہارے ساتھ کیسا سلوک کروں؟“

”جو محبوبہ دل نواز اپنے محبوب کے ساتھ کرتی ہے؟“
”سنو خرم! وہ دھمک کر بولی۔ ”بے شک تم نے مجھے متاثر
کیا تھا لیکن وہ صرف تمہاری مردانہ وجاہت تھی۔ اُس مرد کی

جس نے خود کو مظلوم ظاہر کیا تھا۔ یوں سمجھو کہ ایک جذباتی لڑکی نے ایک وسیعہ لڑکے کو پسند کر لیا تھا لیکن خرم سلطان کو نورین زمان بھی پسند نہیں کر سکتی۔ میں پہلے بھی بتا چکی ہوں کہ میرے دوزدپ میں ایک چاہنے اور چاہے جانے کی پیاسی لڑکی اور دوسری نورین زمان جو بے حس مشین ہے۔ اب ہمارا تعلق دوسرے ہی خرم سلطان چوہدری ہوا اور میں نورین زمان ہوں۔ تم نہ محبوب ہو اور نہ میں محبوبہ ہوں۔

"چلو پھر دونوں بڑی سرکار کے دربار میں اپنا مقدمہ پیش کرنے چلتے ہیں؟"

"بڑی سرکار...! وہ اُلجھ کر بولی۔

"ہاں ملک نوازہ میں مسکراتے ہوئے بولا۔

"کیا تم سنجیدہ ہو؟"

"ہاں میری بیل میں اسی کے لیے کام کر رہا ہوں۔" میری بات سن کر اس نے بایاں ہاتھ ڈیش بورڈ پر مارا اور بولی۔

"میں لڑکی ضرور ہوں مگر اتنی احمق نہیں ہوں۔"

"کیوں بڑیاں احمق ہوتی ہیں؟"

"ہاں۔ تم مردوں کے نزدیک۔"

"پھر ٹھیک ہی ہوگا۔ میں نے دیوان فٹ پاتھ پر ایک دم کار چڑھا دی اور میرا بایاں ہاتھ تیزی سے اپنا کام کر گیا تھا۔ کلائی تک ترچھی ضرب نورین جیسی نازک لڑکی کے لیے ناقابل برداشت ہی تھی۔ وہ ڈکراتی ہوئی اچھلی اور پھر اس کا سر ڈیش بورڈ سے ٹکرایا۔ میں نے بے توازن کار کو بڑی مشکل سے توازن دیا تھا۔

جب کار واپس سڑک پر اتری تو نورین سیٹ پر اوندھی ہو کر نیچے لڑھک گئی تھی اور میں کوئی فیصلہ نہیں کر پا رہا تھا کہ اُسے کہیں اتار دوں یا اپنے ساتھ ہوٹل لے جاؤں۔ اُس کی ضرورت تھی۔ اُس نے اپنے گودام سے تمام مال صندوق کے گودام میں ڈال دیا تھا۔ میں چاہتا تھا مجھے ہاتھوں نورین اور صندوق کا مال خارج کر جاؤں۔ ملک نوازہ کے بعد یہی دو ایجنٹ سامنے آئے تھے بقایا کی صفائی کے لیے میں نے ملک نوازہ کے ذہن میں جو چنگاری رکھ دی تھی اُس پر بھی مجھے اعتماد تھا۔ میں اس چنگاری کو ہوا دینے کی ہدایات پنڈی دے چکا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ میرا کام ملک نوازہ اپنے ہاتھوں پایہ تکمیل تک پہنچا دے گا۔

کار ہوٹل کے پارکنگ سٹیڈ میں پارک کر کے میں نے نورین کو اُلٹا کر کچلی سیٹ پر ڈال دیا اور خود اندر کا جائزہ لینے چلا گیا۔ لابی میں ہوٹل کے ہیرے بیٹھے ہوئے تھے اور ڈاننگ ہال بھی آباد تھا۔

"میری چابی لے آؤ۔ ایک معمر ہیرے کا انتخاب کرتے ہوئے میں نے کہا۔ اُس نے روم نمبر پوچھا اور چابی لے آیا۔ میرے ساتھ چلو کچھ کام ہے۔ اُس کے انتخاب کے پس منظر میں اُس کی ضروریات کا فرما تھیں۔ میں اُس کی ضروریات کو ہی استعمال کرنا چاہتا تھا۔

"کیا حکم ہے جناب؟" لفٹ سے نکل کر اُس نے پوچھا۔

"میرے ساتھ میری دوست آئی ہے۔ میں نے سوکا نوٹ اُس کی طرف بڑھایا وہ لابی سے گزرنا نہیں چاہتی۔ بیک ڈور اگر تم کھول دو تو صبح اُسی راستے واپس کر دوں گا۔"

"بڑا خطرہ ہے جناب پولیس چھاپے مارتی رہتی ہے۔"

"لیکن رجسٹر میں اندراج نہیں ہے۔ میں نے دوسرا نوٹ دکھایا تو اُس نے دونوں نوٹ لے لیے۔

"ٹھیک ہے جناب میں ہیڈنگ کو اپنے ساتھ تھوڑی دیر کے لیے باہرے جاؤں گا۔ آپ کچن والے راستے اُسے بیڑیوں سے اُپر لے آئیں۔"

"شکریہ آؤ چلیں۔ میں نے واپس ہوتے ہوئے کہا۔ جب تم اشارہ دو گے تو میں باہر جا کر اُسے آؤں گا۔ وہ اتنا ہی تابعدار اور ہمدرد بن گیا تھا جیسے صدیوں سے اُس کے آباؤ اجداد میرے خاندان کے ملازم رہے ہوں کسی زمانے میں بے شک طاقت کی حکمرانی رہی ہوگی مگر ہمارا دور پیسے کا غلام ہے۔ دولت کی جھلک سے ہمالیہ کی بلند ترین چوٹی بھی سکڑ سکتی ہے۔ دولت مند کے قدموں میں جھکتی چلی آتی ہے۔ وہ شخص میری نہیں دوسرے نوٹوں کی تابعداری کر رہا تھا۔

میں لابی میں آویزاں تین سینریاں ہی دیکھ سکا تھا کہ اُس نے قریب آ کر سلام کیا اور آٹھ دبا کر اشارہ دے دیا۔ میں نے اُس کا شکریہ ادا کیا اور ٹہلتا ہوا باہر نکل گیا۔ ایک کار بیک میں جا رہی تھی۔ اس لیے میں انتظار کرنے لگا۔ جو نبی اُس نے ٹرن لیا میں نے اپنی کار کا دروازہ کھولا اور پھر طویل سانس لے کر مسکرا پڑا۔ سیٹ پر ناگن کی کینچی پڑی ہوئی تھی صرف ریشمی رومال وہ خود نکل گئی تھی۔ یقیناً وہ ہوش میں ہی رہی ہوگی۔

کار لاگ کر کے میں واپس چل پڑا۔ مجھے اُس کے فرار کا رانی کے دانے جتنا بھی افسوس نہ ہوا تھا۔ وہ تو ڈھول کی طرح گلے پڑ گئی تھی اور نہ ہی ایک شاطر لڑکی کے ساتھ ہوٹل کے کمرے میں رات گزارنے کا بھی تصور ہی نہ کر سکتا تھا۔ اُسے رات بھر سنبھالنا کوئی آسان مسئلہ نہ تھا۔ فرار ہو کر اُس نے میرا مسئلہ حل کر دیا تھا۔

اُس رات میں نے کسی سے بھی رابطہ نہ ملایا تھا۔ میں پرسکون نیند سونا چاہتا تھا لیکن ذہنی رابطے کی تاریں میں نہ کاٹ سکتا تھا۔

بید پر لینا تو ذہن میں مافنی کی یادوں کے بزد گنگنانے لگے۔ کتنی یادیں تھیں تلخ و شیریں کتنے چہرے ایک ایک کر کے سامنے ابھرتے چلے آئے تھے، خوش رنگ، ہمایونگ مہربان اور شہنشاہ زندہ اپنے اور پرانے، انسانوں کے اور درندوں کے چہرے۔ میں سپاٹ چھت کو ایک ٹمک دیکھ رہا تھا جیسے چھت فلم اسکرین ہو۔

میں چاہتا تھا کہ میری رات پرسکون گزرے۔ اس لیے میں نے یادوں سے خوش رنگ یادیں اور چہروں بے مہربان چہروں کا انتخاب کیا تھا۔ اُن میں میری منہ بولی بہن مارشا تھی۔

میرا جان تیار تو تم تھا، چپ چپ روشن روشن چہرے والی عابدہ تھی اور میری اپنی میرے وجود میں ٹوٹن میں شامل رہنے والی زینت تھی۔ اور اُن سب کے آخر میں رشیدہ اور ٹینڈ بھی

قطار میں بھری تھیں۔ اتنے انہوں اور پیارے لوگوں کو ذہن میں در آنے کی دعوت کیسے دیتا میں نے سب کو شب بخیر کہہ کر واپس کر دیا تھا۔ اپنے پاس صرف ٹینڈ گل کو رہنے دیا تھا۔ وہ سنہری مچھلی رات بھر میرے خوابوں کے تالاب میں تیرتی رہی تھی۔

السان جو خود کو جڑا توں اور دانائی کا پہاڑ کہتا ہے اصل میں عاجز اور بے بس ہے، لوگ کہتے ہیں کہ انسان آنے والے لمحے سے ہی بے خبر ہوتا ہے لیکن ٹینڈ گل گزرے لمحات اور حالات سے بھی بے خبر تھی۔ اُس نے اپنی بڑی بڑی بھوری آنکھوں میں جس شخص کو بسا رکھا تھا۔ اُس نے اُس سے دنیا کی عزیز ترین ہستی متجارتشہ اور مضبوط سہارا چھین لیا تھا۔ گو اُس کی رگوں میں ایسا خون رواں تھا۔ جس کے خمیر میں انتقام کی چنگاریاں دبی رہتی ہیں۔ پٹھان اپنے دشمن کو صدیوں معاف نہیں کرتا۔ ایک بار دشمنی کی آگ بھڑک اُٹھے تو اُسے زندہ رکھنے کا فرض نسل در نسل ادا کیا جاتا ہے۔ آتش پرستوں کی عبادت گاہ میں بھڑکتی ہوئی آگ تو بجھ سکتی ہے، مگر پٹھان کے سینے میں انتقام کے

شعلے کبھی سرد نہیں ہوتے لیکن ٹینڈ گل اپنے باپ کے قاتل کی پرستش کر رہی تھی۔

میں نے اُس وقت کے بارے میں سوچا تھا۔ جب ٹینڈ گل اپنے باپ کے قاتل کا چہرہ پہچان لے گی تب خرم سلطان کی طرف اُس کے بڑھنے کا انداز کیسا ہوگا۔ اُس کے انداز میں غصیلی شیرنی کی لپک ہوگی یا محبوبہ دننواز جیسی وارفتگی ہوگی۔ تین شخص اس راز سے واقف تھے۔ دو پولیس کے اعلیٰ آفیسرز اور ایک ملک نواز مجھے آئی جی اور ڈی آئی جی سے کوئی خطرہ نہ تھا۔ دونوں مجھے کئی حوالوں سے بے حد چاہتے تھے۔ انہیں قومی ذمے داری کا بھی احساس تھا لیکن ملک نواز کسی بھی موڑ پر میرے خلاف یہ اہم پتہ چل سکتا تھا۔

جب دستک کی آواز میرے خواب کی دیواروں سے ٹکرائی تو میں نے ہل پڑا۔ تھوڑے کلائی موڑ کر وقت دیکھا۔ دو بج کر چالیس منٹ ہو رہے تھے اور دستک مسلسل دی جا رہی تھی۔ میں نے اُلٹ کر جیب سے ریو اور نکال لیا۔

"کون ہے؟" دروازے میں جا کر پوچھا پھر کی ہول سے آنکھ لگائی جو بھی کوئی تھا، سوراخ کے سامنے پھیلا ہوا تھا۔

"میں ہوں جناب کاؤنٹر کلرک پولیس چیک پڑتا رہا ہے۔"

"جاؤ اس وقت مجھے دُسر ب نہ کرو کچھ دے دلا کر واپس کر دو، صبح میں ادائیگی کر دوں گا۔"

"ابھی انہیں رافٹی کر دیں جناب، سوالدار صاحب میرے ساتھ ہیں۔"

میں نے ایک لحظہ سوچا مقرر کا کوئی راستہ نہیں تھا نہ انہیں روکنے کے لیے کوئی معقول حوالہ... میں نے ناب دبا کر لاگ کھولا جو نبی دروازہ کھلا اسٹین گن کی نال میرے سینے سے آن لگی۔ وہ تین تھے اور تینوں مسلح تھے۔ کلرک دوڑتا ہوا ہی واپس جا رہا تھا۔

"اندر چلنے کو نہیں بولو گے دوست؟" ایک شخص نے مسکراتی ہوئی نگاہوں سے میرے سراپا کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔

"پہلے انداز کو دوستانہ ماحول دو پیارے۔" میں نے پرسکون لہجے میں جواب دیا۔ زبان سے دوست کہنے والے کو دوست دکھائی بھی دینا چاہیے۔

"وقت ضائع نہ کرو فرید خان۔" جس آدمی نے میرے سینے پر اسٹین گن لگا رکھی تھی، سرد آواز میں بولا۔ "کیا تمہیں بتایا نہیں

گیا کہ خرم سلطان کون ہے؟ وہ عمر کے لحاظ سے سب میں بڑا تھا۔ شاید اس پارٹی کا سربراہ بھی رہا ہوگا۔ پیچھے ہٹو خرم سلطان ہم کچھ وقت تنہا رہ سکتے ہیں۔ تیسرے آدمی نے بڑے پیار سے میرے دائیں گال پر پھکی دی اور میرے ہاتھ سے یوں رپوا اور لے لیا جیسے بچے کے ہاتھ سے چاقو لے رہا ہو۔

”بچے خطرناک کھلونوں سے نہیں کھیلا کرتے!“ اس نے پچکار کر کہا اور رپوا اور اپنی جیب میں رکھ لیا۔

میں اٹھنے قدموں ہٹتا ہوا صوفے کے قریب گیا تو اس نے نال دبا کر زوردار دھکا دیا۔ میں صرف جھول کر سنبھل گیا تھا۔

تب دوسرے نے اچھل کر میرے پیٹ میں دو فنی ماری ضرب بلاشبہ شدید تھی لیکن میرے اندر ضرب سہارنے کی قوت بھی مضبوط تھی لیکن خواہ مخواہ اپنی قوت برداشت کا مظاہرہ کر کے میں مزید ضربوں کو دعوت نہیں دینا چاہتا تھا۔ یہی وجہ رہی تھی کہ میں کراہتا ہوا صوفے پر گرتا چلا گیا تھا۔

”استاد کہیں ہم غلط آدمی کو تو نہیں پھاپ بیٹھے؟“

”نہیں مادام نے ہمیں غلط آدمی نہیں بتایا۔ انھوں نے جس ویٹر کو انھوں نے اس نے روم نمبر بتایا تھا۔“

”پھر مادام نے ہمیں خواہ مخواہ ڈرایا ہوگا؟ وہ شخص منس پڑا۔ یہ تو بچہ کی طرح ایک بھوکے بھی نہیں برداشت کر سکا۔“

”بکواس بند کرو اور اسے پارسل بناؤ۔“

کسی نے میرے بال پکڑے اور میں نے پلٹ کر دیکھے دونوں ہاتھ اس کے چہرے پر جڑ دیے۔ وہ لڑکھڑاتا ہوا جب اٹھا تو اسٹین گن کا بیٹ میرے سر پر لگا، آنکھوں میں نیلی نیلی پچھلیاں پھوٹ پڑی تھیں۔

”سنو دوستو! میں نے ہاتھ اٹھا کر کہا۔ اگر تمہاری مادام نورین ہے تو مجھے پارسل بنانے کی ضرورت نہیں۔ میں خاموشی سے تمہارے ساتھ چلوں گا۔ کیا تمہیں تشدد کا حکم دیا گیا ہے؟“

”اگر تشدد کا نہیں تو تیار کرنے کا بھی حکم نہیں دیا گیا۔“

”پھر درمیان راستہ اختیار کرو۔“ میں نے مسرہلاتے ہوئے کہا۔ ”میری شکایت پر نورین یقیناً میری خوشنودی کی خاطر تم لوگوں سے باز پرس کرے گی۔“

”یہ ہمارا مسئلہ ہے برادر! پارٹی لیڈر نے جواب دہ حجاز پر گولی چلانے اور لڑنے کے انداز صرف ٹرننگ سینئر میں سکھائے جاتے ہیں، وہاں ہر سپاہی اپنی صوابدید پر لڑتا ہے۔ ہمیں کیا

کرنا ہے اور کیا نہیں کرنا تم سے مشورہ نہیں لیں گے۔ جسے میرے ہاتھ لگے تھے وہ ناک مسلتا ہوا بڑے جارحانہ انداز میں میری جانب بڑھا۔ اس سے قبل کہ کوئی اسے روکتا اس نے اچھل کر میرے سینے پر ٹکرماری۔ میں نے گرتے گرتے ٹانگیں اٹھالیں مگر وہ پھرتی سے پیچھے ہٹ گیا تھا۔

”نہیں قہرے!“ جب دوبارہ وہ فلاٹنگ کک کے لیے پرتول رہا تھا تو پارٹی لیڈر کو درمیان میں آگیا۔ ”جو یہ چاہتا ہے تم وہی کرنے لگے ہو۔ پوئل میں اچھل کر اس کے غاذیں بھی ماسکتی ہو۔“

”ہٹ جاؤ استاد!“ وہ پھنکارا۔ ”میں ہانگ کانگ کے بڑے ماسٹر کو باور کرنا چاہتا ہوں کہ پاکستان کے ادنیٰ لڑاکے ٹرائی کے فن میں کتنے ماہر ہوتے ہیں۔“

”تم لوگ مادام سے بات کرنے کی اجازت دو گے؟“

”ٹھیک ہے مجھے کوئی اعتراض نہیں۔“ اس نے سر ہلاتے ہوئے کہا اور ایک آدمی نے ٹیلی فون سیٹ اٹھا کر میرے قریب کر دیا۔ میں نے سوالیہ نگاہوں سے دیکھا تو مجھے نورین کا نمبر بتا دیا گیا۔ پہلی رنگ پر ہی اس نے جواب دیا تھا۔ وہ ٹیلی فون سیٹ کے قریب ہی رہی ہوگی۔ حالانکہ وہ وقت بیداری کا نہ تھا لیکن نورین کو باپ کے بعد جو تے داری سوچی گئی تھی اسے وہ اچھی طرح نبھا رہی تھی۔

”نورین! میں خرم سلطان ہوں۔“ اس کی صرف چھکار سنائی دی تھی۔ ”چلے تو میں تمہیں دعوت دیتا ہوں۔۔۔“

”کیا...؟“ وہ ہلکا رہی تھی۔ خرم کیا تم نے مینوں کو...؟“

”نہیں!“ میرے حلق سے بھی غراہٹ ابھری۔ ”صرف دو۔ سنو نورین! میں چاہتا ہوں تم یہاں آؤ، اگر نہیں تو اپنے آدمی کو حکم دو مجھے دوستانہ انداز میں ساتھ لے چلے۔ بصورت دیگر تمہیں صرف لاشیں ملیں گی۔ ان میں میری لاش بھی ہو سکتی ہے۔ میں اسے ریسور دے رہا ہوں۔ ذرا سوچ کر فیصلہ کرنا نورین تم اپنے فیصلے سے ایک اعجاز دوست گواہی سکتی ہو۔ ہم دشمن نہیں ہیں صرف اصولی جنگ لڑ رہے ہیں۔ یہ لو بات کرو۔“ میں نے ریسور لیڈر کی طرف بڑھایا۔

”جی مادام! باقر بول رہا ہوں۔ جی... بہتر مادام... میں

خیال رکھوں گا۔“ اس نے ریسور مجھے دے دیا۔

”ہاں نورین اب اپنا فیصلہ مجھے بھی سنا دو۔“

”میں... میں... تمہیں گوانے کا فیصلہ نہیں کر سکتی خرم۔“ اس کی آواز میں آنسو کھلے ہوئے تھے۔ ”تم میری کمزوری بن گئے ہو۔“

”باقر تمہیں پوری عزت دے گا۔ آنا چاہو تو چلے آؤ۔“

”تمہیں یو نورین! ویسے یہ وقت مناسب نہیں ہے کیا بہتر نہ ہوگا ہم صبح مل لیں؟“

”نہیں خرم بس چلے آؤ۔“

”بہتر، میرے ساتھ صرف باقر ہوگا اور وہ بھی دوست کی حیثیت سے۔ میں آ رہا ہوں۔“ میں نے ریسور رکھ کر ایک شخص کو ٹوٹ اٹھانے کا اشارہ کیا۔ وہ مینوں پالتو کتوں کی طرح فوہر دار اور مرغوب ہو گئے تھے۔ ٹوٹ پن کر میں نے اس آدمی کی جانب مسکرا کر دیکھا جس کی جیب میں میرا رپوا لور تھا۔ اس نے بھی جواباً مسکرا ہٹ دی۔

”اب ہم دوست ہیں۔“ میں نے نرم آواز میں کہا۔ ”دوستی کی فضا کو برقرار رکھنے کے لیے ایک دوسرے پر اعتماد کرنا ہوگا۔ اگر تمہارا دل مانے تو رپوا لور واپس کر دو۔“ اس نے اپنے لیڈر کی طرف دیکھا۔

”ٹھیک ہے واپس کر دو۔“ لیڈر سر ہلاتے ہوئے بولا۔ ہم نے سیڑھیاں استعمال کی تھیں۔ جب لابی میں اترے تو کاؤنٹر کلرک سہما ہوا کھڑا تھا۔ میں نے چلتے چلتے چابی اس کی طرف اچھال دی اور ان کے ساتھ باہر نکل گیا۔

”تم لوگوں نے سن لیا تھا۔“ انہی کا کہ قریب جا کر میں نے کہا۔ ”میرے ساتھ صرف باقر خان چلے گا۔ تم لوگ اپنی گاڑی میں جاؤ گے۔“

”ٹھیک ہے تم لوگ ہمارے پیچھے آؤ گے۔“ باقر بولا۔

”نہیں دوستو! میں نے نفی میں ہاتھ ہرایا۔“ اس طرح اس نے اپنا ہت جروح ہوگا۔ مجھے گزرائی کا احساس رہے گا، ہاں آگے چل سکتے ہو۔“

”تم لوگ! باقر نے فرنٹ سیٹ کا دروازہ کھولتے ہوئے طوفان ماریا کہا۔ ”آگے آگے چلو۔“ اس نے رپوا لور نکال کر ہاتھ میں رکھ لیا اور اسٹین گن دونوں گھٹنوں کے درمیان کھڑی حالت میں لکھل۔ جب ان کی کار ٹرن لیتی ہوئی سیدھی ہوئی تو میں نے انجن اسٹارٹ کیا۔ میں جان بوجھ کر کچھ وقت اور فاصلہ حاصل کرنا

چاہتا تھا۔ حالانکہ میری سوچ احمقانہ ہی تھی۔ ان کے پاس گاڑی بھی تھی اور خطرناک ہتھیار بھی تھے۔ میری کسی بھی کوشش کے حلق میں برسٹ اٹار سکتے تھے لیکن میں اپنی فطرت کے ہاتھوں مجبور تھا۔ چوڑیاں پہن کر میں خود کو کسی کے حوالے کرنے کو تیار نہ تھا۔

گیٹ سے نکل کر اگلی کار بائیں مڑی تھی۔ گیٹ سے چند گز دور ہی میں نے ایک فیصلہ کر لیا تھا۔ اندھا اور انتہائی احمقانہ فیصلہ تھا لیکن میرے تجربات کی جھولی میں ایک یقین تھا کہ کوئی بھی کھیل خطرہ مول لے بغیر جیتا نہیں جاسکتا۔ دیال میں کوونے والا ہی ڈوبتا ہے یا ساحل مراد حاصل کر سکتا ہے۔

کنارے پر کھڑا سوچنے والا وقت ضائع کر کے واپس ہی جاسکتا ہے۔ ”دروازہ کھول کر ٹھیک سے بند کر دو باقر خان!“ میں نے نرم اور دوستانہ لہجے میں کہا۔ اس نے رپوا لور جھولی میں رکھا اور جونہی اس نے لاک لیور کو پکڑ کر دروازہ کھولا میرا منہ اس کی کپٹنی پر لگا۔ وہ شاید جھول کر سنبھل جاتا مگر میں نے ایک دم نہایت ہی خطرناک ٹرن دائیں جانب لیا وہ ڈکراتا ہوا باہر چلا گیا تھا۔

میں نے پلٹ کر دیکھا۔ اس کے ساتھی ایک فرلانگ دور جا چکے تھے۔ چونکہ یہ کارروائی گیٹ کے درمیان ہوئی تھی اس لیے انھوں نے اپنے ساتھی کو گرتے نہیں دیکھا تھا۔ البتہ کار روک کر شاید وہ تعاقب کا فیصلہ کرنے لگے تھے لیکن چلتی کار اور فیصلے کی رفتار میں جو فرق تھا وہ میرے حق میں گیا تھا۔ جب انھوں نے کوئی فیصلہ کیا ہوگا اس وقت میں کئی موڑ مڑتا ہوا ایک ذیلی سڑک پر پہنچ چکا تھا۔

”خرم فرار ہو کر جائے واردات سے دور ہو جانے کی کوشش کرتا ہے لیکن میں ایسا خرم تھا جسے دام سے انسیت تھی میں فرار ہو کر پھر انھیں لوگوں کے درمیان جانے پر مجبور تھا جو میرے خون کے پیاسے تھے۔ مگر میرا خون شاید کڑوا تھا کہ جو بھی میری شررگ برداشت رکھتا خون پینے سے ہچکچاتا تھا اور میں ان کی ہچکچاہٹ سے ہی فائدہ اٹھا کر خون آشام درندوں کے زخم پر چھاؤ دیتا تھا۔“

میں نے نورین کے گیٹ پر رُک کر برقی گھنٹی کا بٹن دبایا۔ اگلے ہی لمحے کسی کے بھاری قدموں کی چاپ سنائی دینے لگی۔ قدموں کی بھاری چاپ سن کر ہی میں نے آگے

احساس والے یہ بزنس کر سبھی تو نہیں سکتے۔ کیا تمہیں کبھی احساس ہوا ہے کہ جیونیٹوں کی طرح انسان کو پاؤں تلے روند ڈالتے ہو۔ قتل تو منشیات کی سپلائی سے بھی بڑا جرم ہوتا ہے۔ یقیناً نہیں ہوتا ہوگا۔ کیونکہ ہمارا ضمیر مردہ ہوتا ہے۔ ہم صرف اپنی ذات کے لیے سوچتے ہیں۔ اپنے لیے ہی زندہ رہتے ہیں۔ ”نہیں نورین“ میں نے بڑبڑا کر انداز میں تردید کرتے ہوئے کہا: ”قتل اتنا بڑا جرم نہیں ہے۔ کیونکہ مقتول تمام جذبول اور نالوں سے اپنا تعلق منقطع کر لیتا ہے۔ جبکہ نشے کا عادی شخص ہر روز مرنا ہے پھر اسے ڈونڈے کر زندہ کر دیا جاتا ہے۔ وہ زندگی بھر مرنا اور جیتنا رہتا ہے۔ موت سے ایسی زندگی کہیں زیادہ کرب ناک ہوتی ہے جس سے فعالیت چھین لی جائے۔ منشیات کے عادی لوگ زندہ مردے بن کر رہ جاتے ہیں۔ جو نہ صرف خاندان بلکہ قوم کے لیے بھی بوجھ بن جاتے ہیں۔“

”کتاہوں جیسی باتیں تمہاری زبان سے زیب نہیں دیتیں خرم چوہدری“ وہ طنز یہ انداز میں بولی: ”بھڑیا اخوت اور محبت کا درس دے تو لو مریاں مذاق اڑاتی ہیں۔ پھر تم جیسا سفاک شخص بقائے انسانیت کی باتیں کیسے کر سکتا ہے۔ ہر روز دو چار انسانوں کا خون پینے والا آدم خوب مجھے اخلاق کا درس دے رہا ہے۔“

معاہدہ راہداری میں قدموں کی آواز گونجنے لگی۔ تب میں اچھل پڑا اور اسٹین گن سیدھی کر لی۔



”سنو نورین! میں تمہارے آدمیوں کو ڈاج دے آیا تھا۔ اگر وہی ہوں تو تم انہیں باہر سے ہی واپس کر دو گی“

”شکر یہ خرم“ نورین کی بھٹی بھٹی آواز میں کھٹک لوٹ آئی۔ ”تمہارے اس احسان کا بدلہ تو دینا ہی پڑے گا“ جب وہ دروازے کی جانب بڑھی تو میں نے اسٹین گن کی نال اس کی پشت سے لگا دی۔ ”کسی پر اعتماد کیا کرو خرم“ میں اپنے گھر کوئی ہنگامہ پسند نہیں کرتی۔ وہ بھی مسلح ہوں گے۔ ادھر دیوار کی اوٹ میں ہو جاؤ“ وہ ایک دم پلٹی اور اسٹین گن کی نال کے نیچے ہاتھ مارتی ہوئی ایک طرف ہو گئی۔

وہ اتفاق تھا یا نورین نے صبح اندازہ لگا کر فیصلہ کیا تھا۔ ابھی میں سنبھلا بھی نہ تھا کہ دروازہ دھڑکے کھلا اور وہ تینوں اندر آ گئے۔ اگر میں چاہتا تو برسٹ مار کر تینوں کو جھوٹ سکتا تھا۔ وہ بھی برسٹ مارنے کی پوزیشن میں تھے۔ گرتے گرتے بھی اُن میں سے کسی کی انگلی میرے لیے گولیاں اگل سکتی تھی۔

”تم چاروں ایک ایک کر کے میرے ہیڈ ٹاک جاؤ گے“ نورین نے حکمانہ لہجے میں کہا: ”اپنی اپنی گن بیڈ پر رکھ دو گے۔ خرم سلطان دوستی کی ابتداء تم کرو گے“ میں نے کھڑے کھڑے اسٹین گن اُچھال دی اور ہاتھ سینے پر باندھ کر ٹھہرتا ہوا صوفے پر بیٹھ گیا۔ وہ تینوں الرٹ پوزیشن میں تھے۔ دو تو وہ تھے جنہیں میں ڈاج دے آیا تھا۔ تیسرا عارف تھا جو مارا کھا کر بڑا بے ابرو ہو کر چند منٹ قبل نورین کے بیڈ روم سے نکلا گیا تھا۔

تینوں ہی چوٹ کھائے ہوئے ناگ کی طرح چھنکاریں مار رہے تھے اور کینڈ توڑ لگا ہوں سے گھور رہے تھے۔ میں نے سوچ کر ہی اپنا رویہ اپنی فطرت سے الگ کر لیا تھا۔ میری گزشتہ تمام کامیابیوں میں جارحیت اور عجلت کے برعکس عقل اور سیاست نے اہم کردار ادا کیا تھا۔ میں نے اُس پالیسی پر عمل کیا تھا جو میری سیمائی فطرت کے منافی تھی لیکن میرا مقابلہ صرف غنڈوں سے نہ تھا جو لالوں کی زبان بولتے اور سمجھتے تھے بلکہ مہذب اور معزز مفاد پرستوں سے تھا۔ یہی وجہ رہی تھی کہ میں نے بیگن سے سابقہ حالات معلوم کرنے کے بعد اپنی فطرت کو تنہا کر سیاست اور مصلحت کی راہ پر ڈال دیا تھا۔

”تم بھی ہتھیار رکھ دو“ نورین نے ٹرس آواز میں کہا۔ ”ہم خرم سلطان سے دوستی کی زبان میں بات کریں گے“

”نہیں مادام“ عارف نے اسٹین گن لہراتے ہوئے کہا۔ ”اب یہ میرا جرم ہے۔ میں آپ سے مانگ رہا ہوں“

”سن رہے ہو خرم“ نورین استہزائیہ انداز میں بولی۔ ”بچہ

کتنے خطرناک کھلونے کی فرمائش کر رہا ہے“ اور اُلٹا ہاتھ عارف کے ہونٹوں پر مار دیا۔ ”گن چھینک دو عارف“ یہ کسی غنڈے کا آدھ نہیں گھر ہے اور خرم سلطان لایا نہیں گیا خود آیا ہے“ اس لیے میرا جہان ہے۔ گن میرے حوالے کر دو یا یہاں سے دفع ہو جاؤ“

”نہیں نورین زمان“ عارف نے اُلٹی زقند لگائی اور کھلے دروازے سے باہر چلا گیا۔ اب تم اپنے گروں کو ہتھیار ڈالنے کا حکم دو گی۔ صرف ایک منٹ دول گا۔ تم جانتی ہو میں درجنوں قتل کر چکا ہوں“

”میں بھی تمہیں ایک منٹ دیتی ہوں ٹائیگر“ نورین اُس کے سامنے تن کر بولی۔ ”دوسرے منٹ پر ہتھاری گن میرے قدموں میں ہونی چاہیے یا گولی میرے سینے میں اُترنی چاہیے“ اُس نے کلائی موز کر گھڑی دیکھی: ”لیکن یاد رکھنا عارف خان میری لاش روند کر جب تم یہاں سے باہر جاؤ گے تو موت تمہارے تعاقب میں ہوگی۔ کسی محفوظ جگہ ہماری باتیں ریکارڈ ہو رہی ہیں“

”ایک درمیان راستہ بھی ہے مادام“ عارف کا تن اُٹھنے لگا تھا۔ ”مجھے صرف دس منٹ دے دو“

”ٹھیک ہے“ نورین نے پلٹ کر میری جانب دیکھا۔ ”لیکن ہتھیار استعمال نہیں کرو گے“

عارف نے اسٹین گن نورین کی طرف اُچھال دی۔ وہ گن لے کر درمیان سے ہٹ گئی اور دوسرے لوگوں کو بھی اُس نے پیچھے ہٹنے کا اشارہ دیا تھا۔

”میں نے تمہارا بڑا شہر سنا ہے لڑکے“ عارف ناگیں پھیلا کر میرے سامنے آکر بولا: ”سنا ہے پنڈی میں تمہارا ہٹکا قائم ہے۔ اٹھو کچھ داؤ میں بھی سیکھنا چاہتا ہوں“ میں گھٹے پر دائیں ٹانگ رکھے نیم دراز تھا۔ ”بڑے بھائی پہلے یہ توفیصد کرو مقابلہ باتوں کا ہو گا یا لاتوں کا“ میں نے مسخرانہ انداز میں پوچھا: ”بیت بازی ہو جائے“ ”مادام“ وہ دو قدم پیچھے ہٹ کر بولا: ”وقت بڑھایا جائے یہ وقت ضائع کر رہا ہے“ نورین صرف مسکرا کر رہی تھی۔ میں نے جب پوزیشن تبدیل تو وہ فلائنگ بک لگانے کے لیے اُچھلا۔ میں ایک دم کروٹ میں چلا گیا۔ وہ صوفے سے ٹکراتا ہوا جب پشت کے بل گر اتو میں بھی اپنی جگہ سے اُپر اُٹھ گیا اور دونوں پاؤں اُس کے پیٹ پر مارتا ہوا آگے نکل گیا تھا۔ اُس نے ضرب سے بچنے اور سنبھلنے میں دو منٹ لگائے تھے اس

وقفے میں میں سائیڈ ٹیبل پر بیٹھا رہا تھا۔ وہ ہاتھ دائیں بائیں پھیلائے لیے پکارتا تھا جیسے کبڑی کا کھلاڑی مخالف کھلاڑی کو روکنے اور پکڑنے کے لیے بڑھ رہا ہو۔ جو بہی فاصلہ کم ہوا میں نے دونوں ہاتھ سائیڈ ٹیبل پر ٹیک کر دو لپٹی جھاڑی، وہ ایک دم پیچھے ہٹ گیا اور میں قلابازی لگاتے ہوئے دوسری طرف چلا گیا تھا۔ درمیان میں ٹیبل تھا۔

”باہر آؤ“ عارف نے دہاڑ کر کہا: ”چوہے کی طرح کونے مت تلاش کرو“

میں نے رقص کے انداز میں دائیں جانب سر کننا شروع کر دیا۔ وہ بھی تھرکتا ہوا میرے برابر ہی ہٹ رہا تھا۔ میں اُس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے ہوئے تھا کہ وہ پھرتی سے سلیپ میں گیا اور رونگ کراتا ہوا جب اُچھا تو میرے پہلو میں آ گیا تھا۔ میں حیران ہی تھا کہ اُس نے بے وجہ سلیپ لیا تھا۔ شاید کوئی داؤ آزمانا چاہتا تھا جسے میں نے رُک کر توڑ دیا تھا۔

وہ پہلو میں جا کر بیٹھو کے جھیر دے کی طرح غراتا ہوا اچھ پڑا۔ ٹوٹ پڑا تھا۔ میں لائیں اور گتے کھاتا ہوا پیچھے ہٹ گیا۔ اُس کے حملے میں کچھ ایسی تیزی اور پھرتی تھی کہ جوابی کارروائی کے لیے ایک سیکنڈ بھی نہ مل رہا تھا۔ میں بمشکل اُس کے ہاتھوں کو بازوؤں پر روک رہا تھا۔ پھر ایک زوردار ضرب کھا کر میں لوکھڑایا تو سائیڈ ٹیبل سے ٹکرا گیا۔ کوشش کے باوجود میں اپنا توازن برقرار نہ رکھ سکا تھا۔

”نہیں ٹائیگر“ نورین صبح کر بولی: ”خرم کو اٹھنے کا موقع تم بھی دو گے“

”میں اتنا ناگوار نہیں ہوں مادام“ وہ میرے گرد تھرکتا ہوا بولا: ”مجھے یاد ہے۔ اس نے مجھے موقع دیا تھا۔ اٹھو چوہدری ہاتھ اٹھا کر اپنی شکست کا اعتراف کر لو“

لیکن میں نہ تو اٹھا اور نہ ہی ہاتھ اٹھایا۔ چپ چاپ چپ لیٹا اُسے دیکھتا رہا۔ سر کی جانب جا کر اُس نے پاؤں کی ٹھوک میری گردن پر ماری اور پھر میرے پیچھے ہوئے دونوں ہاتھوں پر پاؤں رکھ کر تھرکتے لگا۔ اُس کے جوتوں کی ایڑیاں میری ہتھیلیوں کو کچل رہی تھیں۔ اُس کے انداز میں شرارتی تھی اور حلق سے قہقہے اُبل رہے تھے۔ میں نے سانس روک کر جسم کی تمام تر قوتوں کو سمیٹ کر نکارا۔ دوسرے لمحے میں گردن اور کہنیوں کے سہارے اُلٹی قلابازی میں اُٹھ گیا تھا اور دونوں جوتوں کی ٹکیوں عارف کے چہرے پر جا گئیں۔

کرنا ہے گا۔

میں نے سیاست کی جلتی ہوئی گیتان کے درمیان پھینک کر آگ کے کھیل کا جو آغاز کیا تھا اس کے لیے جاگیر خان جیسے کھلاڑی کو میدان میں موجود رہنا چاہیے تھا۔ یہ سن کر مسیری ساری خوشی کا نور ہو گئی تھی کہ انھوں نے خان کو بھی گرفت کر لیا۔ ایک شخص میرے عقب میں تھا۔ دو آگے آگے آتے تھے۔ تینوں ہی شاید مجھے غیر متعلق جان کر بے پروا ہو گئے تھے۔ اگر میں چاہتا تو آزادی کا حق حاصل کر سکتا تھا۔ کیونکہ پیچھے آنے والا بظاہر خالی ہاتھ تھا۔ میں آگے جانے والوں کی پشت پر فائرنگ لگ لگاتا ہوا نیچے لڑھک جاتا تو فرار ہونے کے امکانات روشن تھے۔ مگر میرے ذہن میں اپنا ملک ہی دوسرا کھیل شروع ہو گیا تھا۔ گواس کھیل میں خطرات غالب تھے لیکن خطروں سے میری دیرینہ دوستی تھی۔ میں نے ہمیشہ خطرات کے سمندر سے ہی گوہر مقصود حاصل کیا تھا۔

مجھے دوبارہ اسی کمرے میں لے جایا گیا تھا جہاں سے میں ایک لمحہ پیشتر فرار ہوا تھا۔ نورین کی لاش پر سیاہ شال ڈال دی گئی تھی۔ اس کے پہلو میں جاگیر خان کے ہزاراد اور جان نثار دوست بدری لاش بکھری ہوئی تھی۔ مردانہ دشمن کا شاہکار لوٹ بھوٹ چکا تھا۔ گو وہ بھی اسی گروہ سے تعلق رکھتا تھا جس سے مجھے شدید نفرت تھی لیکن اس کی جوانی اور دشمن کی ناوقت بربادی پر میرا دل دکھ گیا تھا۔

جاگیر خان صوفے پر..... بیٹھا شاید رو رہا تھا۔ قدموں کی چاپ سن کر اس نے سپرہ اوپر اٹھایا تو میں اس کی سرخ آنکھیں دیکھ کر لرز گیا۔ پھر اس سے قبل کہ میں اسے خاموش رہنے کا اشارہ کرتا۔ وہ بھڑائی آواز میں بول پڑا تھا۔

”گھر آنے کی ضرورت نہیں ہے خرم سلطان۔ میرے لیے چیف ان لوگوں سے نکل بہا ضرور طلب کرے گا۔ میں چیف کی غلط فہمیاں دور کر دوں گا۔“

”اور ہم... ایک نوجوان نے مجھے ہٹو کا دے کر کہا۔ چیف سے ڈبل انعام حاصل کریں گے چیف نے خرم سلطان کی تلاش پر ساری فوج لگائی ہوئی ہے اور یہ بہرہ ویا... اس نے مجھے پھر مارنے کے لیے ہاتھ اٹھایا۔ میں نے دایاں ہاتھ گردن سے ایک دم ہٹایا اور وہ کراہتا ہوا الٹ گیا۔ میں نے اس کے اٹھے ہوئے بازو پر تیرچھی کٹ لگائی تھی۔ دوسرا جونی دھڑک کر جھپٹا ایک مقرر شخص نے ٹانگ بڑھا کر اسے روک دیا۔

”نہیں جعفر خان۔ تم لوگ وقت اور انرجی ضائع کر رہے ہو۔ ہمیں فی الفور یہاں سے نکل جانا چاہیے۔ فائرنگ نے علاقے میں دہشت پھیلادی ہے۔ کوئی بھی پولیس کو اطلاع دے سکتا ہے میں چاہتا ہوں کہ پولیس صرف لاشیں اٹھانے کی رحمت ہی کرے، چلو خان۔“

جاگیر خان نے اٹھ کر بدری لاش دیکھی پھر گھٹنوں کے بل بیٹھ گیا اور لاش کی ادھڑی ہوئی پیشانی پر ہونٹ رکھ کر بولا۔ ”شکر ہے میرے بچے! تم نے وفاداری کی آن پر جان دے کر ثابت کر دیا ہے کہ ایاز ہر دور میں پیدا ہوتے رہتے ہیں۔ میں اگر زندہ رہا تو تمھارے خون کا بدلہ لوں گا۔ یہ میرا عہد ہے میرے بچے!“

”اٹھو خان! مقرر شخص نے خان کے کندھے پر ہاتھ مارا۔“ تم جیسے ماسٹر کو عورتوں کی طرح لاشوں پر بین کرنا زیب نہیں دیتا۔ مجھے بھی اس نوجوان کی جانکاری نے متاثر کیا ہے۔ برسٹ تمھارے لیے تھا لیکن یہ کوہ درمیان میں آگیا۔

جاگیر خان نے اپنی واسٹ آٹا کر لاش پر ڈال دی اور پھر لڑکھڑاتا ہوا چل پڑا۔ گیٹ پر کچھ لوگ کھڑے تھے۔ سڑک پر بھی دس پندرہ آدمی صورت حال جاننے کے لیے ٹولیاں بنائے کھڑے تھے۔

”جعفر خان تم جاؤ۔ مقرر شخص نے پریشانی بچے میں کہا۔“ انھیں مطمئن کرو۔ کہہ دو کہ ہم اسپیشل پولیس سے تعلق رکھتے ہیں۔ اشتہاری مجرموں کی گرفتاری کے لیے چھاپہ مارا ہے۔ جعفر خان دوڑتا ہوا گیا۔ گیٹ پر کھڑے لوگ گھبرا کر واپس بھاگنے لگے۔ جعفر خان نے انھیں آواز دے کر روک لیا۔ پھر وہ ان کے درمیان جا کھڑا ہوا تھا۔ جب وہ واپس آیا تو اس کے چہرے پر فتح مندی جھلک رہی تھی اور لوگ اشتہاری مجرموں کو دیکھنے کے لیے ایک طرف ہٹ کر کھڑے ہو گئے تھے۔

”ہمیں جس دین میں بٹھایا گیا تھا وہ یقیناً بٹ پروف اور ساؤنڈ پروف رہی ہوگی کیونکہ جب وہ اسٹارٹ ہوئی تو صرف تھر تھر ہٹ ہی محسوس ہوئی۔ ڈارک شیشوں کے باعث باہر کا منظر صاف دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ میرے اور خان کے درمیان دو آدمی بیٹھے ہوئے تھے۔ ایک سامنے سیٹ پر اسٹین گن تان کر چوکس بیٹھا تھا۔

”خوب صورت ناگن اب بول آسے یہاں کون ملیا؟“ ”خدا... خدا کی قسم... مم...“ خان نے اسے بالوں سے پکڑ کر اوپر اٹھایا اور ایسے فرش پر ڈبے مارا جیسے غصے میں کوئی پلیٹ فرش پر عمار رہا ہو۔

”بدر خان! خان نے نورین کے چہرے پر پاؤں رکھ کر کہا! اس کی لاش باہر پھینک دو!“ بدر خان نے تڑپتی ہوئی نورین کو ٹانگوں سے پکڑ کر دوبارہ فرش پر مارا۔ نورین کا سر چھٹ گیا تھا اور مغز کے ٹوٹنے کا لین پر بکھر گئے تھے۔

”میں غداروں کا مغز بھون کر کھا جایا کرتا ہوں!“ جہاگیر خان کی آواز میں درندگی عود کر آئی تھی۔ ”آؤ نکل چلیں چوہدری! اُس نے میرا ہاتھ تھام لیا!“ میں خودکشی کو بہادری نہیں سمجھتا۔ خان کے باقی یقیناً بے جگری سے لڑ رہے تھے۔ کیونکہ حملہ آور ابھی بلہادری میں داخل نہ ہو سکے تھے۔ جب ہم سڑھیل پڑھ رہے تھے بدر خان بھی دوڑتا ہوا شامل ہو گیا تھا۔ دوسری منزل کی کھڑکی سے پہلے جہاگیر خان کودا تھا۔ میں نے جھانک کر دیکھا وہ گتے کے کارنر پر جا گیا تھا۔ اُس نے اٹھ کر اوپر دیکھا اور بدر خان بھی کودیا۔ جہاگیر خان نے اُسے ہاتھوں پر سنبھال کر ایک طرف رکھ دیا تھا۔

”آرام سے کودو چوہدری!“ جہاگیر خان نے ہاتھ پھیلا کر اشارہ کیا۔ میں نے ہونہری ہر دل پر پاؤں رکھا نیچے سے برسٹ کی تڑتڑاہٹ سنائی دی۔ میں نے خود کو پچھلے گرا دیا تھا پھر جھانک کر دیکھا بدر خان خون میں نہایا تڑپ رہا تھا اور جہاگیر خان کپاؤنڈ وال چھاند کرنگا ہوں سے اوجھل ہو گیا تھا۔

وہ جال میرا ہی بچھایا ہوا تھا جس میں میں بھی چھنس گیا تھا۔ وہ چنگاری میں نے ہی ملک نواز اور جہاگیر خان کے درمیان وقت کی راکھ میں دبائی تھی جو بھڑک اٹھی تھی میں اس حقیقت سے آگاہ تھا کہ آگ جب بھڑکتی ہے تو اُس ہاتھ کو بھی معاف نہیں کرتی جس نے دیا سلائی جلائی ہوئی ہے۔

میں نے خالی کمرے کا جائزہ لیا۔ سوائے ہاتھ روم کے اور کوئی آؤر نہ تھی۔ باہر پوری عمارت میں گولیاں چل رہی تھیں۔ پھر کوئی سیریسوں پر چڑھنے لگا تھا۔ میں نے ہاتھ روم کی جانب دوڑ لگائی مگر ایک شخص نے کھٹے دروازے سے برسٹ مار کر میرے قدموں کو جام کر دیا تھا۔ مجھے تو یہ بھی معلوم نہ تھا

کہ اندر آنے والا جہاگیر خان کا ساتھی ہے یا ملک نواز کا کوئی گروہ ہے۔ میں نے فوراً ہاتھ اٹھا دیے تھے۔ اتنی جلدی تو چوہا بھی بی کے سامنے سپر نہیں ڈالتا ہوگا جتنی جلدی اور اسانی سے میں نے ہاتھ گردن پر رکھ کر شکست مان لی تھی۔ اگر وہ ڈاکو اور میں عام شہری ہوتا تو اُسے تعجب کا جھٹکا نہ دیتا۔ وہ چند قدم اٹھا کر ہی رگ گیا تھا۔ اس کے لیے میری یہ حرکت غیر متوقع ہی رہی ہوگی۔ جاگیر خان جیسے ڈنگ یڈر کے کسی ماتحت کو چوہے سے بڑھ کر بزدل نہیں ہونا چاہیے تھا۔

”تم کون ہو؟ اُس نے اسٹین گن کو جھٹک کر پوچھا۔“ جواب میں نے مسکرنے کی ایسی بھڑکی کوشش کی تھی جیسے ابھی ہلک ہلک کر دو دل گا۔ ”سنا نہیں تم نے؟“ میں نے اسی روتی ہوئی مسکراہٹ کے ساتھ اثبات میں گردن ہلاتی۔ ”مم... میں ڈرائیور ہوں جناب۔“

”کس کا...؟“ وہ دھڑکاتا ہوا میرے قریب آگیا۔ ”خلن کے ڈرائیور ہو؟“

”نن... نہیں جی! میں نے گھلیا تے ہوئے جواب دیا۔“

”مادام کا؟“

”اوہ۔ کیا تمھیں معلوم ہے تمھاری مادام کو...“

”جی جناب میرے سامنے خان نے اُن کو...“ میں نے اچانک اندر آنے والوں کی وجہ سے بات ادھوری چھوڑ دی۔ وہ دونوں پاگل اونٹ کی طرح بڑبڑاتے ہوئے اندر آئے تھے اور مجھے مغلوب دیکھ کر میرے قریب چلے آئے تھے۔

”کیا یہ بھی خان کا کتا ہے؟“

”نہیں۔ یہ مادام نورین کا ڈرائیور ہے۔ پہلے آدمی نے بتایا۔“

”کیوں شہزادے؟ ایک نوجوان نے میری ٹھوڑی پر ہلکی سی ہلک لگائی۔ کب سے مادام کے ڈرائیور ہو؟ میں نے سوچا کہ بات بگڑ گئی ہے کیونکہ نورین نے کبھی ڈرائیور رکھا ہی نہ تھا۔ وہ پہلا شخص یقیناً کرائے کا تھا ورنہ میرا جھوٹ کبھی ہضم نہ کرتا۔

”آج ہی! میں نے بتایا۔ ہوٹل ڈی ٹاپ نے میری خدمات مادام کے سپرد کی ہیں۔“

”چلو ملن یا! وہ بولا۔ اسے بھی نیچے لے چلو خان کے پاس۔“

جاگیر خان سے نہ میری رشتے داری تھی اور نہ ہی وہ میری ہمدردی کے قابل تھا۔ پھر بھی جب وہ کپاؤنڈ وال پھانڈ گیا تھا تو جیسے یک گونہ خوشی ہوئی تھی۔ خوشی کی وجہ یہ نہ تھی بلکہ اصل وجہ یہ تھی کہ بڑے دشمن کا ایک دشمن بن کر اس کی نیندوں کو بے سکون

یقیناً اُس کی آنکھیں متاثر ہوئی تھیں۔ جب میں اُچھل کر اُٹھا تو وہ آنکھوں پر ہاتھ رکھے جھک رہا تھا۔ پھر مجھ پر درنگ طاری ہو گئی تھی لیکن میں نے ہاتھ استعمال نہیں کیے تھے اُسے لاتوں پر رکھ لیا تھا۔ جب وہ تیور کر گرا تو اُس کی ناک اور مُنہ سے خون اُبل رہا تھا۔ میں نے آخری ضرب اُس کے سینے پر ماری۔ تب مجھے احساس ہوا تھا کہ نورین مجھے کچھ بچنے ہوئے ہیں رہی ہے۔ میں نے اُسے سچی دیوچ کر دیوار پر دے مارا تھا۔

مخامیری بھوپڑی پر قیامت ٹوٹ پڑی تھی۔ میرے حلق سے دبا ڈھجری۔ میں نے پلٹ کر دیکھا۔ لوہے کی موٹی مسلاخ فضا میں اُٹھ رہی تھی۔ وہ باقرخان تھا جس کا چہرہ ہوبہاں تھا۔ اس سے قبل کہ میں مسلاخ روکتا وہ وار کر چکا تھا۔ دوسری ضرب اپنے ساتھ مجھے سچی تاریکی میں اتار تی چلی گئی تھی۔

باقرخان نے کچھ زیادہ ہی دست درازی کی ہوگی۔ درنہ بے ہوشی کا دورانیہ اتنا طویل نہ ہوتا۔ وہ ایک ڈیکورٹڈ بیئر دوم تھا۔ دیواروں پر نہایت قیمتی اور دیدہ زیب پینٹنگز آویزاں تھیں۔ کھڑکیوں، دروازوں پر دیوار چھول دار پر دے تھے ہوئے تھے۔ ٹیلی فون اسٹینڈ پر چاندی کا ٹیلی فون بیٹ لگا ہوا تھا۔ میرا چہرہ کمرے کی طرح آہستہ آہستہ ناظر نگاہوں میں جذب کرتا گھوم رہا تھا۔

پھر ایک منظر پر چہرہ ٹک گیا اور نگاہیں جم گئی تھیں۔ وہ ایک خوب رُولڈی تھی جو آرام کرسی پر نیم دراز تھی اور بال فرش کو جُوم رہے تھے۔ میں نے کلانی موڈ کر وقت دیکھا۔ گیارہ بجے والے تھے۔ چڑیلوں کی چہکاروں کا اعلان کر رہی تھی۔ میں نے تپانی پر رکھے گلاس کو جاگ کے ساتھ ٹکرا کر آواز پیدا کی۔ میری پہلی ہی کوشش کامیاب رہی تھی۔ لڑکی نے دھیرے سے آنکھیں کھول دی تھیں۔ پھر مجھ پر نگاہ پڑتے ہی وہ ہڑبڑاتی ہوئی اُٹھ کھڑی ہوئی اور لپک کر میرے قریب چلی آئی۔

”جی فرمائیے“ اُس نے ایسے پوچھا جیسے ہونٹ کا ویر کھٹ کھٹ کی آواز سن کر آیا ہو۔

”پہلا سوال تو یہ ہے کہ میں کس کا جہان ہوں؟“

”اس سوال کا جواب میزبان ہی دیں گے“ وہ مسکراتے لگی۔

”نورین کہل ہے بل میں نے اچانک سوال کیا لیکن لڑکی مضبوط اعصاب اور ریفیز ذہن رکھتی تھی۔

”آپ بہت آسان سوال پوچھ رہے ہیں اور میں اتنی نالائق ہوں کہ ایک کا بھی جواب نہیں دے سکتی۔ اس لیے کہ

میں بطور خاص آپ کی خدمت کے لیے لائی گئی ہوں“

”اچھا تو میرے میزبانوں کو یہی اطلاع کریں“

اُس نے ٹیلی فون سیٹ کا ریسپورڈ اُٹھایا اور صرف دیر ڈاٹل کیے اور بڑے موڈ بے میں بات کرنے لگی۔ ”السلام علیکم سر امعز دہمان بیدار ہو چکے ہیں... جی نہیں بالکل نارمل بلکہ ہشاش بشاش ہیں... بہتر سرائیں اُن کو تیار رکھوں گی...“

اُس نے ریسپورڈ رکھا اور میری جانب پلٹ کر بتانے لگی۔

”آپ کے لیے وہیل چیئر بھی جا رہی ہے۔ ڈاکٹر کی ہدایت ہے کہ کم از کم دو دن آپ مکمل آرام کریں۔ چلنے سے آپ کے سر کے زخم کھل جانے کا اندیشہ ہے“

”کیا واقعی مجھے مہلک زخم آئے ہیں؟“

”جی ہاں، ڈاکٹروں کا یہی خیال ہے“ اُس نے بتایا۔ اگر بروقت طبی امداد نہ ملتی تو موت واقع ہو سکتی تھی“

ایک لڑکی کرسی دھکیلتی ہوئی اندر آئی، کرسی چھوڑ کر خاموشی سے واپس نکل گئی تھی۔ میں اُٹھا تو مجھے بدن میں نہ تو لقاہت محسوس ہوئی اور نہ ہی سر میں درد کی کوئی لہر تھی۔ تب ہی مجھ پر انکشاف ہوا تھا کہ میرا میزبان مجھے نفسیاتی طور پر مغلوب کرنا چاہتا ہے۔ میں نے ہاتھ سے سر کو ٹٹول کر وہ مہلک زخم تلاش کر لیا۔ بڑا سا گورہ تھا۔

لڑکی نے ہٹھ کر سہارا دیا اور میں نے بھی اُن کے ڈولے کا کردار بننے کا فیصلہ کرتے ہوئے کراہنا شروع کر دیا تھا۔ مددِ مخالف کی چال کو ڈھال بنانے کا فن جاننے والے ہی دشمن کو زک پہنچا سکتے ہیں۔

اُس نے سنبھال کر مجھے نازک کھلونے کی طرح کرسی پر رکھا اور ہاتھ روم میں لے گئی۔ اگر میں چاہتا تو لڑکی کو ہاتھ میں بند کر کے نکل جاتا لیکن میں خود ہی بند ہو گیا تھا۔ وجہ یہ رہی تھی کہ میں اپنے میزبان کو دیکھنا چاہتا تھا اور مجھے باہر کی سچویشن بھی معلوم نہ تھی۔ اگر جان کا خطرہ ہوتا تو ریسک لیا جاسکتا تھا لیکن وہ جو بھی تھا مجھے زندہ رکھنا چاہتا تھا۔ اگر اُسے مارنا ہی ہوتا تو خاطر تواضع نہ کرتا۔

ناشتے میں وہ سب کچھ تھا جو کسی رئیس زادے کے لیے ہو سکتا تھا۔ میں نے ڈش کرنا شکر کیا۔ کیونکہ آنے والا وقت دُھند میں تھا۔ جانے اونٹ کی طرح حالات کے صحرائیں کتنا فاصلہ ناشتے پر ہی طے کرنا پڑتا۔ لڑکی نے برتن رکھ کر پھر کسی سے رابطہ طلبا اور او۔ کے رپورٹ دے کر ریسپورڈ رکھ دیا۔

”میں اپنے مہربان میزبان سے ملنا چاہتا ہوں“ میں

نے چلنے کا آخری سرپ لے کر کہا۔

”وہ بھی آپ سے ملنے کے لیے بے کل ہیں“ لڑکی نے برتن لڑے میں رکھتے ہوئے جواب دیا۔ میں نے خالی کپ جو نہی لڑے میں رکھا اور واہ جہر تیرا ہوا کھلا اور ایک طویل القامت شخص اندر آ گیا۔ اُس کے ہونٹوں میں سگارا دبا ہوا تھا۔ پھر اُس کے پیچھے نورین دکھائی دی۔

”السلام علیکم عزیزم“ مرد نے ہشاش بےج میں سلام کیا اور مصلحے کے لیے چوڑا ہاتھ بڑھا دیا۔

”خیرم“ نورین بولی۔ یہ انکل جہانگیر ہیں۔ میں نے بے جان سی مسکراہٹ سے مصافحہ کیا۔ ”باقرخان ہم دونوں کو لے گیا تھا۔ اگر انکل مداخلت نہ کرتے تو وہ وحشی نہ جانے ہم سے کیسا سلوک کرتا“

”نہیں نہیں آرام سے لیٹے رہو“ میں اُٹھنے کے لیے جو نہی ہلا جہانگیر خان نے پیار سے روک دیا۔ پھر ایک خوب رو نوجوان اندر داخل ہوا۔ میں نے اُسے پہچان لیا تھا۔ وہ یقیناً بدر تھا۔ جہانگیر خان کا بھڑا اور وفادار ساتھی۔

”خان“ بدر بولا۔ ”باقرخان فرار ہو کر ملک نواز کی پناہ میں چلا گیا ہے“

”اوہ ناش“ جہانگیر خان حلق چھڑا کر دھاڑا۔ ”تم... تم نے اُسے روکا کیوں نہیں؟“

”خان آپ نے مجھے صرف نگرانی کا حکم دیا تھا۔ بدرخان بھی سخت آواز میں بولا۔ ”میں یہی سمجھ رہا تھا کہ وہ ملک نواز کی موجودہ پوزیشن معلوم کرنے جا رہا ہے“

”شاید یہی بات ہو؟“ نورین بول پڑی۔

”نہیں میں“ بدر نے نفی میں گردن ہلائی۔ ”میں نے ملک نواز کا قاتل گردپ باقرخان کے ساتھ دیکھا ہے۔ وہ خان کی تلاش میں نکلے ہیں“

”میں کیا سمجھوں جیتی جی؟ جہانگیر خان نے نورین کے شانے پر چھبکی دی۔ ”تم نے اپنے انکل کو بھیڑیلوں کے حوالے کر دیا ہے“

”نہیں... نہیں انکل“ نورین نے تروپ کر جہانگیر خان کا ہاتھ تھام لیا۔ ”بندہ ہرگز نہیں۔ مجھے باقرخان نے دھوکا دیا ہے۔ وہ ایک اصول پرست قاتل اور معاہدوں کا پابند شخص تھا۔“

”بدرخان“ جہانگیر خان سرد آواز میں بولا۔ ”مقابلے کی تیاری کرو“

”کیا فری اسٹائل کشتی کا مقابلہ ہوگا؟“ بدرخان نے

مسکرا کر پوچھا۔

”نورین“ جہانگیر خان نے سگارا اُچھال کر کہا۔ ”کیا تم نے اپنے ہاس کو یہ جگہ سنی بتائی ہے؟“

”آپ یقین کیوں نہیں کرتے انکل“ نورین بیخ پڑی۔

”میں غدار نہیں ہوں۔ ہاں باقرخان کا انتخاب میری غلطی ہے لیکن وہ ہمیشہ ہمارا وفادار رہا ہے۔ ہم نے جب بھی اُسے شکا دیا ہے۔ اُس نے کبھی مایوس نہیں کیا۔ کیا ایسا نہیں ہو سکتا انکل وہ ملک نواز کو بے بس اور بے سہارا کرنے کی چال چل رہا ہو؟“

”اگر اُس کا رُخ ادھر ہے تو تمہارا یہ شک بھی دُور ہو جائے گا“ جہانگیر خان نے پلٹ کر کرسی کو جھک کر ماری۔ ”میرم سلطان میں خوشگوار ماحول میں ملاقات کرنا چاہتا تھا۔۔۔“

رنگ بازخان مرحوم نے تمہارا غائبانہ تعارف کر دیا تھا۔ خان مرحوم میرا پگڑی بدل بھائی تھا۔ میں تمہیں وہی مقام دینا چاہتا تھا جو خان نے دیا تھا لیکن اب شاید میری یہ خواہش پوری نہ ہو سکے۔ میں اعتماد کی ضرب کھا چکا ہوں۔ اس سے قبل کہ میرا دشمن مجھے گھیر لے تم یہاں سے نکل جاؤ۔ زندگی ملی تو پھر اس ادھوری ملاقات کی تلافی ہوگی“

”ہم مقابلہ کریں گے خان“ میں نے مضبوط آواز میں کہا اور اُٹھ کھڑا ہوا۔ ”مجھے بتایا گیا ہے کہ باقرخان کی تحویل سے آپ نکال لائے ہیں۔ آپ میرے محسن ہیں اور باقرخان اب ہمارا مشترکہ دشمن ہے“

”ہاں انکل“ ہم مقابلہ کریں گے۔ نورین پر جوش بےج میں بولی۔ ”یہاں اتنا اسلحہ بارود ہے کہ ہم فوج کا مقابلہ بھی کر سکتے ہیں۔ بدرخان میرے ساتھ آؤ“

”مجھ پر بدرخان“ جہانگیر خان ہاتھ اُٹھا کر بولا۔ ”جوہد ہی کو بھی ساتھ لے چلو“

”اصل معاملہ کیا ہے خان؟“ میں نے توتے بہرے ہوئے پوچھا۔

”ملک نواز بساط سے پڑنے مہرے ہٹانا چاہتا ہے۔“

جہانگیر خان نے بتایا۔ ”پنڈی میں بھی اُس کے گھر کے مجھ پر قاتلانہ حملہ کر چکے ہیں۔ میں جوانی کا ردوائی کے لیے آیا تو پتا چلا کہ وہ میرے دوست شاہ زمان کو بھی ہلاک کروا چکا ہے“

”معاہدہ گولیاں چلنے لگیں تو جہانگیر خان اپنی جگہ سے اُٹھتا ہوا نورین سے جا کھڑا ہوا تھا۔

سنا ہے تم نے شاہ زمان اور داؤد خان کا گروہ ہنس نہس کر دیا ہے؟
 میرے کسی دشمن نے یہ پھل جھڑی چھوڑی ہوگی۔۔۔
 میں نے انکسار نہ انداز سے کہا: شاہ زمان میرے مرنے کے لیے
 دل کی مراد لے کر آیا تھا لیکن۔۔۔ میں نے ہونٹ چبا کر خشک
 آنکھوں کو استین سے پونچھنا شروع کر دیا۔
 لیکن لوزین نے میری موجودگی میں تمہیں باپ کا قاتل
 کہا تھا؟

ہاں یہ میری بد فیضی تھی۔ وہ یہی سمجھتی تھی؟
 پھر۔۔۔ پھر اس کا قاتل کون ہے؟
 چیف: جاگیر خان بولا: جس طرح وہ مجھے بھی قتل
 کروا رہا ہے؟

نہیں خان: معترض شخص ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا: چیف
 نے صرف آپ کو حاضر ہونے کا حکم دیا تھا۔ آپ نے معذرت کر کے
 پھر فیصلہ بدلا اور چیف کو لا رہوڑے کی اطلاع دوسرے ذرائع
 نے دی۔۔۔۔

میں جانتا ہوں لوزین نے مجھے دھوکا دیا ہے؟
 نہیں خان: وہ ہاتھ اٹھا کر بولا: آپ نے غلط فہمی میں
 ایک قیمتی جان ضائع کر دی ہے۔ وہ ذرائع پنڈی سے آپ کے
 ساتھ ادھر آئے ہیں؟

تو پھر وہی قاتل ہوں گے؟ جاگیر خان بھڑک کر بولا: غیر
 ملکی قاتل جو زمین کو شیشیں کر چکے ہیں۔ میں چیف سے بالمشافہ
 اٹھنے کے بارے میں بات کرنے آیا ہوں؟

معاذ میرے پیٹ میں مروڑا اٹھنے لگے تھے۔ اگر جاگیر خان
 واقعی ملک لواز سے بات کرنے ہی آیا تھا تو میرا منصوبہ بے موت
 مر جانے والا تھا۔ جب خان شکایت کرتا تو ملک لواز انکار کر دیتا۔
 کیوں کہ خان پر جتنے بھی حملے ہوئے تھے وہ میرے ساتھیوں نے
 میرے حکم پر ہی کیے تھے۔ انکار اور تکرار میں بہت کچھ سامنے
 آسکتا تھا۔ ملک لواز ایک بین الاقوامی گروہ کا چیف ہی نہ تھا
 بلکہ سیاست دان بھی تھا۔ وہ سوچ سکتا تھا کہ وہ کون ہیں جو

جاگیر خان کے تعاقب میں تھے۔ اس کا ذہن اس شخص کی
 طرف جانا چاہیے تھا جس نے اسے جاگیر خان کی وفاداریوں سے
 بدظن کیا تھا جس نے اسے وفاداری آزمائے کا مشورہ دیا تھا۔
 جس نے وفاداروں کو یہ کہنے کے لیے ایک کسوٹی دی تھی اور
 وہ شخص اس کے سامنے کھڑا ہوتا تو سوال و جواب دودھ اور

پانی الگ کر دیتے۔

میں نے جو چال چلی تھی، جو چال بچھایا تھا جاگیر خان حاضر
 ہو کر تار مار کر سکتا تھا۔ اپنے منصوبے کو سبوتاژ ہونے سے بچانے
 کا واحد حل ایک ہی تھا کہ وہ دونوں فریق آپس میں ملنے نہ پائیں۔
 اگر میں بھی تو ان کے درمیان مفاہمت کی فضا نہ ہو۔ وہ لغت
 کی دیوار کے پس منظر سے ہی ایک دوسرے سے باتیں کریں۔
 لیکن کیسے؟ یہی سوال میرے اندر ہوا کہ گولے کی طرح
 گردش کرنے لگا۔ صورت حال سراسر میرے خلاف تھی۔ جاگیر
 خان بہر صورت ملک لواز تک پہنچنا چاہتا تھا اس لیے جو
 کچھ کرنا تھا مجھے ہی کرنا تھا۔

میں نے حالات کا جائزہ لیا۔ میرے ساتھ بیٹھے دونوں
 آدمی پرسکون ہی نہ تھے بلکہ انھوں نے یہیں مائل بہ تعاون پاکر
 ریلوے پر بھی چھپا لیے تھے۔ البتہ میرے مقابل بیٹھا شخص ایک
 سیکورٹ کے نوش پر بھی، برسٹ مارنے کی پوزیشن میں تھا۔
 "میں نشے سے ٹوٹ رہا ہوں دوستو! میں نے چہرے پر
 کربطاری کرتے ہوئے التجا شیر آواز میں کہا۔

"اوہ! ایک آدمی بول پڑا: تم خود بھی اس لت میں
 مبتلا ہو؟

"ہاں! میں جیسے رو دیا: میں پہلے لت میں مبتلا ہوا پھر
 ڈکان کھولی کیونکہ دوسروں سے مانگنے والا طریقہ بعض اوقات
 بہت تکلیف دہ ہو جاتا تھا؟

جیرے: چوہدری کو ایک سگریٹ دے دو: معترض آدمی
 نے کہا اور سامنے والے شخص نے میری جانب ایسی نگاہوں
 سے دیکھا جیسے کوئی کجنوس بھکاری کو پیسہ دینے سے پہلے کھا
 جانے والی نگاہوں سے دیکھتا ہے۔ میں نے چہرے کو کشکول
 بناتے ہوئے میانی آواز میں کہا۔

"ادھار دوست! ایک کے بدلے دس؟
 "کیا دس؟" اس نے غراتی آواز میں پوچھا۔

"گناہ میرے بھائی؟ میرے بے ساختہ جواب پر معترض
 شخص نے جان دار قبضہ لگایا تھا۔

"خوب بڑا آگیا۔ ایک گناہ کے بدلے دس گناہ ہی مل سکتے
 ہیں، خوب صورت جواب کا انعام دے دو جیرے۔ اللہ تعالیٰ
 گناہوں میں اضافہ کرے گا: جیرے نے بڑا سا منہ بنایا اور جیب
 کی طرف ہاتھ لے گیا۔ اس کا وہ ہاتھ استین گن کے بٹ سے پٹا
 تھا۔ دوسرے ہاتھ نے استین گن کو متوازن کرنے کے لیے لوزین
 کا سہارا لیا تھا۔ اس طرح استین گن متوازن رہنے کے باوجود

اپنے ہدف سے منہ پھیرتی تھی۔
 اس نے پکٹ نکال کر اچھال دیا اور میں نے پکٹ
 پڑنے کے لیے دونوں ہاتھ آگے بڑھائے۔ ایک سیکورٹ میں گن
 میرے ہاتھوں میں تھی اور جیرا سیٹ پر الٹ گیا تھا۔
 "خبردار! میں کو دتا ہوا دین کے کونے میں اگر ڈول بیٹھ کر
 دہاڑا صرف جیرا مار کھائے ہوئے کتے کی طرح روتی آواز میں
 بھونکتا ہوا بچھڑا تھا۔ میں نے دین کی دیوار سے ٹیک لگا کر
 دونوں پاؤں اس کے چہرے پر مارے۔ وہ پھر ڈکرا ہوا الٹ
 گیا تھا۔

"بس جیرے: معترض شخص نے بے تاثر لہجے میں کہا۔
 "میرے مقابل کی شاندار کارروائی کو اچھے فائٹر تسلیم کر لیا کرتے ہیں۔
 نترم سلطان نے جی خوش کر دیا ہے؟

"میں ناراض دوستوں کا جی اسی طرح خوش کیا کرتا ہوں؟
 میں نے جیرے کا گلا ہوا مغلز اٹھا کر جاگیر خان کی جانب پھینک
 دیا: خان! اب آپ دوستوں کے ناراض ہاتھ پاؤں راضی کریں؟
 "نہیں چوہدری: جاگیر خان نے کھردرے لہجے میں کہا۔
 "میں تمھارا ساتھ دے کر چیف کے شک کو تقویت نہیں دے
 سکتا۔ میں تو سوچ رہا تھا چیف سے تمھاری سفارش کروں گا۔ تم
 چیف کے لیے بہترین اضافہ ہو گے؟

"الحق نہ ہو جاگیر خان: میں نے تڑختی آواز میں کہا: تمھارے
 بلیک وارنٹ پر دستخط میری موجودگی میں ہوئے تھے۔ ملک
 لواز نیا سٹریٹ تیار کر چکا ہے جس میں اہم عہدے دار غیر ملکی
 ہیں۔ وہ حکومت کا راز دال ہے۔ اسے یقین ہو چکا ہے کہ جلد
 یا بدیر اس ملک کی سرزمین منشیات اگانے اور پھیلانے سے
 انکار کر دے گی۔ موجودہ حکومت اس اجنت کو ختم کرنے کا تہیہ

کر چکی ہے۔ ملک جیسا بااثر شخص بھی اگر کبھی گرفت میں آگیا
 تو اسے حکومت معاف نہیں کرے گی۔ ملک کی انگلیاں وقت کی
 نبض پر ہیں وہ یقین کر چکا ہے کہ سامان دشمن عناصر کو اپنا رویہ
 تبدیل کرنا ہوگا یا اس پاک سرزمین سے اسے رخصت ہونا پڑے گا۔ وہ

اپنا پرنس باہر لے جانے سے قبل اپنے ماضی کے تمام لغووش
 منانا چاہتا ہے۔ کیا سیٹھ سلیمان، رنگ باز خان، شاہ زمان اور
 داؤد یہ سب لوگ ملک لواز کے پاؤں چاٹنے والے نہ تھے،
 آج کہاں ہیں، ان کی روٹوں سے پوچھو خان! انھیں عالم بالا
 روانہ کرنے والا کون ہے، اگر تم خود بھیڑیے کے بھٹ میں اترنا

پہلے ہوتو تم سے بڑا حق روئے زمین پر کھپیدانہ ہوگا؟
 میں چیف سے صرف ایک سوال کروں گا: جاگیر خان
 ایڑیاں جاکر اپنی بات پر جم گیا تھا: مجھے اُمید ہے اس کا جواب
 میرے حق میں ہوگا۔ تم نہیں جانتے تو ہدیری، ملک لواز مجھے
 ضائع کر کے خود صرف سیاست دان ہی نہ جانے گا۔ وہ نیا
 سٹریٹ کی گندم کی لوریوں پر چلائے گا؟ نہیں، برنور دار!
 اس کے پرنس کے لیے میری ذات ناگزیر ہے؟
 "جہنم میں جاؤ تم دونوں! میں نے بے پروائی سے کہا۔
 "لیکن تمھیں پچھانے کا بھی موقع نہیں ملے گا جاگیر خان؟
 "تم: وہ اچھل پڑا: تم میرا یہ نام کیسے جانتے ہو؟
 "ایسے ہی جہانگیر خان: میں نے استہزائیہ لہجے میں کہا۔
 "جیسے میں یہ جانتا ہوں کہ ملک لواز کے سٹاکسٹم ہواور یہ اطلاع
 بھی صرف میں رکھتا ہوں کہ تمھیں پہلے ہر سال کیا گیا پھر تمھیں
 پنڈی سے فرار ہونے کا راستہ دیا گیا تاکہ تمھاری عدم موجودگی
 میں تمام مال نے گودام میں شٹ کر دیا جائے؟
 "اوہ تو تم بہت گہرائی سے واپس ابھرے ہو؟
 "ہاں خان: میں نے اثبات میں گردن ہلاتی: میں اپنے
 منہ بولے باپ رنگ باز خان کا انتقام لینے آیا ہوں۔ میں نے
 پنڈی میں ملک لواز کو حیرت انگیز جھٹکے دیے تھے۔ وہ خود مجھے
 اپنے ساتھ لایا تھا اور اس نے مجھے تنظیم نو کی ذمہ داری سونپتے
 ہوئے اپنا نائب مقرر کرنا چاہا تھا؟
 "پھر تم الگ کیوں ہو گئے؟
 "بس دل کے ہاتھوں برباد ہوا ہوں خان: میں نے سر د
 آہ بھرتے ہوئے کہا: لوزین مجھے لے آئی۔ وہ میرے ذریعے اپنے
 باپ کا انتقام لینا چاہتی تھی؟
 "اب مجھے یقین کر لینا چاہیے: وہ بڑبڑاتا ہوا اٹھا اور منسل
 جھانسنے لگا: تم ان پر نظر رکھنا نترم، کوئی ذرا بھی گڑبڑ کرے تو سنگل
 داؤد سے کام چلانا؟
 کسی نے بھی کان کھرنہ نہ لایا تھا اور فرما ہر دار پتھوں کی طرح
 ہاتھ پاؤں بندھواتے رہے تھے۔ جاگیر خان نے ریشمی بیویوں
 سے بیویوں کو جبر کر فرسش پر ڈال دیا تھا۔
 مجھ میں ایک خای اتنی پختہ رہی ہے کہ بعض اوقات
 لب بام رستی میرے ہاتھوں سے چھوٹ جاتی رہی اور میں بندیلوں
 سے پستی میں گر تار ہوں۔ میں اچھا منصوبہ باز نہیں ہوں۔
 ارادے باندھتا اور توڑتا رہا ہوں۔ کبھی تو ایک خیال پر چٹان

ہوئے بولا۔
 پہلے مجھ پر مکمل اعتماد کریں خان پھر میں جواب دوں گا۔
 کیا اب بھی ہمارے درمیان بے اعتمادی رہ گئی ہے؟
 "تو پھر پہلے اپنا گھر بچائیں خان۔"
 "تم گہری گہری باتیں نہ کرو دل کے سیدھی بات کرو۔"
 "سیدھی بات یہ ہے خان میں نے سیٹ پر بیٹھے ہوئے
 کہا: ملک تو ایک کھینچ دھنسن ہے مفاد پرست اور ظالم
 انسان ہے۔ وہ اپنے مفادات کے لیے گو داغ پر قبضہ کرے گا۔
 پھر آپ کو سامنے لانے کی خاطر آپ کے خاندان کو۔۔۔"
 "نہیں۔۔۔ جاگیر خان دہاڑ کر بولا۔ وہ ایسا نہیں کر سکتا۔"
 "اُسے کون روکے گا خان لالہ؟"
 "میں۔۔۔ ہاں میں اُس کی بیڑیاں چاڈالوں گا۔"
 "آپ لاہور میں ہیں اور اُس کے گھر گئے پنڈی میں ہیں
 نے گرم لوہے پر چوٹوں کا تسلسل برقرار رکھتے ہوئے کہا: ہمیں
 پہلے مال بچانا چاہیے خان۔ مال ہی ملک تو ان کی جڑوں کی مٹی
 ہے۔ وہ مٹی اگر ہم نے ہٹا لی تو ملک کی ذات کا بیت ریزہ ریزہ
 ہو جائے گا۔"
 "شکر یہ چودہری: وہ سانشی بچے میں بولا۔۔۔ تم نہ صرف
 ملا کے پھرتے ہو بلکہ ذہین بھی ہو۔ ایک رنگ ماسٹر کی تمام
 خوبیاں رکھتے ہو۔ ٹھیک ہے ہم پنڈی چل رہے ہیں لیکن انہیں
 کہاں چھوڑا جائے۔ یہ سیدھے اپنے باپ کے پاس روتے ہوئے
 جائیں گے۔"
 "آپ دیکھتے جائیں خان: میں نے اُنھ کو ڈرائیور اور خان کے
 درمیان شیشے پر کھینچی کی ضرب لگائی۔ شیشہ ریزہ ریزہ ہو کر
 بکھر گیا۔ ڈرائیور نے گھبرا کر بریک لگائے پھر پٹ کر دیکھنے لگا۔
 "چیف کی کال موصول ہوئی ہے دوست۔ اب قیدی
 پنڈی جائیں گے۔ میں نے دوستانہ انداز میں بتایا۔ ڈرائیور نے
 اُچک کر پیچھے دیکھنے کی کوشش کی لیکن میں نے اُس کے
 سینے پر پٹ مار کر اُسے سیٹ پر دھکیل دیا۔ تم ٹرک ڈرائیور نہیں
 ہو۔ تمہیں اتنا تو شعور ہونا چاہیے کہ ہماری دنیا میں لاٹھی اور جھنڈ
 کا اصول چلتا ہے۔ اب یہ خطرناک لاٹھی میرے قبضے میں ہے
 اس لیے بھینس اُدھر ہی جانے گی جدھر میں لے جانا چاہوں
 گا۔ اگر یہ اصول دل سے تسلیم کرتے ہو تو ڈرائیورنگ سیٹ کا حق
 نہیں چھینا جائے گا۔ بصورت دیگر تمہیں دوسری بھینسوں کے
 ساتھ پایہ زنجیر ہونا پڑے گا۔"

جاگیر خان کو دھکیلے ہوئے اندر لے گئے۔ وہ یقیناً آٹھارہ برس ہوں
 گے۔ جاگیر خان ہاتھ پنا پنا کر اُن سے باتیں کرتا چل رہا تھا۔
 وہ شخص انارٹی تو نہ رہا ہو گا مگر اُسے یہ معلوم نہ تھا کہ کس
 سے مخول بازیاں کر رہا ہے۔ اُس نے شاید مجھے کرٹے کا ڈرائیور سمجھ
 کر ڈرانا دھمکانا چاہا تھا۔ در نہ وہ میرے ہاتھوں کی آزادانہ حرکت
 کو پہلے روکنا چھربات کرتا۔
 "یقین کرو میری جیب میں جو رقم تھی بروکر نے بطور فیس لے
 لی ہے۔ میں نے پاؤں جاکر کیا ہے بے شک تلاش لے لو؟"
 "اندھ پتو آلو کے پیچھے: اُس نے فارغ ہاتھ میرے چپکے
 پر جڑ دیا۔ میں جو وقت اور فاصلہ چاہ رہا تھا جاگیر خان جوں جوں دور
 ہو رہا تھا وہ فاصلہ کم ہوتا میرے نزدیک آ رہا تھا اُسے وہ رگیت
 لے جا رہے تھے۔ ایک شخص نے پٹ کر دیکھا تو میں لڑکھڑاتا ہوا گیٹ
 کی جانب بڑھنے لگا۔ غیر محسوس انداز میں میرا رخ گیٹ کے دائیں
 کی طرف تھا۔
 "میری گھڑی لے لو سیکو فائیو ہے: میں نے بازو اس کی طرف
 اٹھایا۔ اس وقت جاگیر خان میٹر حیاں چڑھ رہا تھا۔
 "کھول کر میری جیب میں ڈال دو: وہ ستون کی اوٹ
 میں ہو کر بولا۔ جلدی کرو: میں نے بوکھلائے انداز میں پتہ کھولا
 اور اس نے جھانک کر اندر دیکھا۔ گھڑی میری منٹھی میں تھی اور
 ہاتھ اُس کی جیب کی طرف گیا پھر اُس کے پیٹ میں مٹکا گھنٹس
 گیا تھا۔ اُس نے چیخنے کے لیے منہ کھولا لیکن آواز اس کے پیٹ
 میں ہی ٹوٹ کر دفن ہو گئی تھی۔ دوسری ہک کھا کر وہ جب گھٹنے
 موڑنے لگا تو میں نے تھاں کو ستون کے ساتھ بٹھا دیا۔
 "بارون دوڑتا ہوا آیا اور میں نے اُس شخص کا دھاری دار
 کوٹ اتار کر بارون پر اچھال دیا۔
 "جلدی پیارے: میں نے اُس کا مغز بھی نوج لیا تھا۔
 "بارون نے فوراً کوٹ پہن کر مجھے دیوالوری زد میں لے لیا تھا لیکن
 نے کوئی سوال کیے بغیر اُسے کلاوے میں بھر اور اپنی کار میں
 لے گیا تھا۔
 "کہیں حیا داپنے ہی دام میں تو نہیں اگیا ختم جی: بارون
 بے تکلفی سے بولا۔
 "امکان رد نہیں کیا جاسکتا: میں نے جواب دیا۔ لیکن
 جاگیر خان لانگ کی پوزیشن میں نہ تھا۔
 وہ نیم تاریک راہداری میں کھڑے شاید اپنے ساتھی کو
 انتظار کر رہے تھے۔ جو نہ ہی ہم میٹر حیاں چڑھ کر براہ راست میں پہنچ

ایک کمر روشن ہو گیا تھا جس نے گیٹ کھولا تھا: وہی روشن کمرے
 سے باہر آیا تھا۔
 "دلی محمد: ایک آدمی بولا۔ اسے ہمارے حوالے کر دو اور
 تم باہر بٹھہرو گے: بارون نے مجھے دھکا دیا اور میں جھوٹا ہوا ہاتھوں
 اور گھنٹوں کے بل فرش پر جاگرا۔
 "خان: تم نے بتایا نہیں یہ کون ہے؟
 "اندھ پتو آلو خان: جاگیر خان بولا۔ جب تم اس کا نام
 سُنو گے تو تمہاری غلط فہمی دور ہو جائے گی۔
 "بار بار غلط فہمی کا نام کیوں لے رہے ہو خان: اعظم بولا
 اُس کے بیچے میں خاصی نرمی اور مروت تھی۔ میں اپنی میموری
 بتا چکا ہوں۔ میں نے خود چیف کا حکم ٹیلی فون پر سنا ہے۔ آپ
 دونوں بڑے لوگ ہیں غلط فہمی آپ کے درمیان ہو سکتی ہے
 میں پہلے آپ کا تاجدار تھا۔ اب چیف کے حکم کی تعمیل کر رہا ہوں۔
 "فون پر میری بات کروا سکتے ہو، اعظم خان؟
 "میں آپ کو صرف جنت گل کے حوالے کرنے کا مجاز
 ہوں۔ مجھے یہی حکم ملا ہے۔
 "بہتر اُسے اطلاع دے دو: جاگیر خان نے گہری سانس
 لے کر کہا۔ ہاں اور کیا حکم ہے؟
 "دوسرا کام جنت گل نے سنبھالا ہے خان: اعظم
 اُنک اُنک کر بولا۔ آپ کی بیٹی اور خان رنگ باز کی بڑی بیٹی
 کو بھی طلب کیا گیا ہے۔ جنت گل۔۔۔۔
 "بیکواس بند کرو کتے: معاً جاگیر خان کے حلق سے زخمی
 دہاڑا بھری اور اعظم خان لات کی ضرب کھا کر دھرا ہوتا چلا
 گیا تھا لیکن دوسرے آدمی نے جاگیر خان کے سر پر اسٹین گن
 ماری اور میسرے نے جاگیر خان پر چھلانگ لگا دی تھی۔
 میں نے بڑے ہی آرام سے مضر دے شخص کو کولھوں
 سے پکڑ کر اوپر اٹھایا اور قریب ترین ستون پر دے مارا۔ بارون بھی
 بکھر گیا تھا۔ آبادی کی وجہ سے ہم نے حرف ہاتھوں کا استعمال کیا
 تھا۔ جاگیر خان نے بھی صورت حال کو سمجھ کر ہاتھ پاؤں کھول
 لیے تھے۔ میں اپنے حصے کا کام نمٹا کر فارغ کھڑا تھا کیوں کہ
 ستون اور انسانی سر کا مقابلہ ہوا تھا۔ سر پھٹ گیا تھا اور ستون
 میری طرح چپ چاپ کھڑا فائٹ دیکھ رہا تھا۔
 "بارون نے اپنے قدم مقابل کو بالوں سے پکڑ کر جھٹکا دیا اور
 پھر اُس کی ناک پر سیدھی تھیلی مار کر جاگیر خان کی مدد کو لپکا اور
 اُس کے ہاتھوں سے شکار نوج کو میری جانب اُچھالتا ہوا پیش کیا۔

میں نے دونوں ہاتھ جوڑ کر ایسے ہی ضرب لگائی تھی۔
 جیسے والی بال کو لگائی جاتی ہے۔ احتیاط کے باوجود میں اُس کے
 حلق سے ابھرتی آواز کو نہ روک سکا تھا۔ پسلیوں پر پاؤں کی
 ضرب اس کے لیے ناقابل برداشت رہی ہوگی، ورنہ کسی نے
 بھی اونچی سانس تک نہ لی تھی۔ بارون جب ہاتھ جھاڑتا ہوا
 جاگیر خان کو سہارا دینے بڑھا تو بالائی منزل کی میٹر حیاں بجنے لگیں۔
 کوئی عورت آوازیں دیتی چلی آ رہی تھی۔
 "یہ میں ہوں زینت بہن: جاگیر خان صورت حال کی نزاکت
 کو بھانپ کر میٹر حیاں کی طرف دوڑا گیا۔ سب ٹھیک ہے ایک
 ملازم کو میں سزا دے رہا تھا۔ تم اوپر ہی رہو۔
 وہ سب کچھ نیم تاریکی میں دیکھ چکی تھی لیکن خاموشی سے
 اوپر چلی گئی تھی۔ وہ باعثِ خطرہ تو نہیں ہوگی: میں نے پوچھا۔
 "نہیں سمجھدار عورت ہے: جاگیر خان اپنے ہونٹ پونچھنے
 لگا۔ زخمی سر سے بہنے والے خون نے اس کا چہرہ سُرخ کر دیا تھا۔
 لیکن آدمی جی دار تھا۔ اُس نے رومال سے چہرہ صاف کیا اور لیٹے
 ہوئے آدمیوں پر جھجک کر دیکھنے لگا: انہیں اس کمرے میں
 ڈال دو۔"
 "بارون نے تینوں کو باری باری گھسیٹ کر اندر پھینکا اور باہر
 گھڑی لگا دی۔ شکر یہ دوستو: جاگیر خان بولا۔ تم لوگوں نے۔۔۔۔
 "یہ رسم فارغ وقت کے لیے اُٹھا کھو خان: میں نے
 ناگوار لہجے میں کہا۔ ابھی میں کام کرنا ہے۔
 "ہاں آؤ تہ خانے میں چلتے ہیں؟
 میں نے بارون کو وہیں بٹھارنے کا اشارہ کیا اور جاگیر خان
 کے ساتھ چل پڑا۔ تہ خانے کا دروازہ دیوار گیر تھا۔ جاگیر خان
 نے برقی پلیٹ پر لگے بے شمار مٹوں میں سے ایک مٹ پر انگلی
 رکھ دی۔ ہلکی سی گڑگڑاہٹ کے ساتھ دیوار شق ہوتی چلی گئی تھی۔
 غلاف اتنا ہی تھا کہ بمشکل دو آدمی گزر سکتے۔ پہلے وہ اندر گیا
 اور میٹر حیاں کا بلب روشن کر کے میٹر حیاں پر کھڑا ہو گیا۔
 وہ تہ خانہ غالباً چار کنال میں پھیلا ہوا تھا، جاگیر خان
 نے اندر جا کر تمام ممر کی ٹیوٹیں روشن کر دی تھیں۔ اس کے باوجود
 آخری کونے میں رکھا ہوا سامان دور کی وجہ سے صاف دکھائی
 نہ دے رہا تھا۔
 میں تہ خانے کے درمیان مبہوت کھڑا اس زیر زمین بازار
 کو دیکھ رہا تھا جیسے بڑی مہارت سے سجایا گیا ہو گا۔ دائیں دیوار
 کے ساتھ دس عدد مرسیڈیز کھڑی تھیں۔ کاروں کے آگے

ایک پتھر تھا جس پر تریپال بچھا ہوا تھا۔ تریپال پر گاڑیوں کے نئے اینجن، چھت تک چار قطاریں ٹائمرز اور دیگر اسپیئر پارٹس ترتیب سے رکھے ہوئے تھے۔
یہ سب مال بذریعہ لنڈی کوتل آیا ہے۔ کسٹم کلیرنس نہ ہونے کی وجہ سے کالیں انڈر گراؤنڈ میں، جاگیر خان تباہ لگا۔ ان بیٹیوں میں دی سی آر، بیو پرنس اور اسی قسم کا دوسرا سامان ہے۔ وہ سیکشن ملکی کپڑے پر غیر ملکی مہر لگانے کا ہے۔ اس وقت بارے میں پچاس فیصد مال اور کپڑا ہم نے ہی سپلائی کیا ہے۔ اور منشیات...؟ میں نے پوچھا۔

اس تہ خانے کے نیچے ایک اور چھوٹا تہ خانہ ہے جاگیر خان نے ایک پڑنے کا رٹن سے ریموٹ کنٹرول آؤٹ کال کر دکھایا۔ نیچے والے تہ خانے کا راستہ صرف ایک نواز اور مجھے معلوم ہے اور والہ! تو ہمارے چند مخصوص کاندے کھوتے رہتے ہیں اس نے ایک جگہ رک کر ریموٹ کنٹرول کا بٹن دبایا فرش میں ہلکی سی تھر تھر ہٹ پیدا ہوئی اور پھر گول سودا خ پھیلنے لگا۔

میرے پیچھے آؤ چوہری، ایک نواز کی اصل قوت اس دس مربع گز جگہ میں سمیٹی ہوئی ہے۔ سیرھی کا صرف ایک قدم بڑھائی دے رہا تھا۔ جاگیر خان نے میرا ہاتھ تھام کر ساتھ کھڑا کر لیا اور پھر ریموٹ کنٹرول کا بٹن دباتے ہی قدم نیچے ڈوبنے لگا تھا۔ نیچلے تہ خانے کا وا حدیب جو نہی روشن ہوا میری کھلی آنکھیں چمکیں بھول گئیں۔ ایک جہان حیرت تھا جو میری آنکھوں کے سامنے پھیلا ہوا تھا۔ چرس کی سیاہی مائل بھوری سیلیں قطار در قطار ایک کونے سے دوسرے تک کھڑی تھیں۔ ہیر ورن کا سنہرا پاؤڈر شیشے کے مرتبانوں میں بند تھا۔ مرتبانوں کی تین قطاریں تھیں اور ہر مرتبان میں بقول جاگیر خان پانچ گلو پاؤڈر تھا۔ پلاسٹک کے تھیلوں میں خام اور دوسرے درجے کی ہیر ورن بھری ہوئی تھی۔ دوسری دیوار میں ایک بڑی الماری تھی جس میں اسمگل شدہ شراب کے بند کادرن تھے۔ الماری کی چوڑائی دیوار کے ایک کونے سے دوسرے تک تھی اور اونچائی چھت تک۔

جاگیر خان نے جھک کر الماری کا ایک دروازہ کھینچ لیا۔ میری آنکھیں پھٹنے کی حد تک پھیل گئی تھیں۔ دروازے میں لاش کش کرتے پیرے تھے۔ چھوٹے بڑے، تراشیدہ اور غیر تراشیدہ، خان نے ہٹھی بھر کر دروازے میں ٹھٹھی کھول دی تھی۔ یہ ہے ملک نواز کی اصل قوت، وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ اب

بتاؤ وہ اس مال کے لیے ملک کی سلامتی بھی داؤ پر لگانے سے دلچ کرے گا؟

بے شک نہیں، میں نے کہا۔ چلیے خان ہمیں صبح تک شاید سہت مل ہی جائے۔ ابھی جنت محل کا منہ بند کرنا ہے۔ ہاں چلو، خان دوڑتا ہوا پھر قدم پچھے پر پڑھا اور قدم اشارہ پا کر اوپر اٹھنے لگا۔

میں نے باہر آکر بارون اور بیگن کو صورت حال سے آگاہ کیا۔ اور انھیں نگرانی پر مامور کر کے خان کے ساتھ واپس چل پڑا تھا۔ کیونکہ مجھے ایک اور قیمتی شے بچا تھی اور وہ شے تھی قیمتی گل۔ جو میرے خون میں گردش کر رہی تھی اور جو میری ذمے داری میں تھی۔ جاگیر خان کے بس میں ہوتا تو کار فضا میں اڑا دیتا۔

مال روڈ آرمی اسٹینڈیم کے قریب اس نے ڈرائیونگ سیٹ میرے حوالے کرتے ہوئے اپنا ڈرائیونگ کار ڈرائیونگ بورڈ پر رکھ دیا۔ وہ بے حد نروس اور جھجکتا تھا۔ میرے اندر بھی طوفان بپا تھا کیونکہ ٹینک گل ویرانے کے شر دار درخت کی مانند خیر محفوظ تھی اور ملک نواز کے گڑے علی میدان میں کود چکے تھے اور میں ان دونوں صرف اسٹیرنگ سیدھا رکھنے والا ڈرائیور تھا۔ پھر بھی میں نے اپنی جان اور دیگر خطرات کو نظر انداز کرتے ہوئے کار کی رفتار خطرناک حد تک بڑھا دی۔ رفتار خاموشی جب تھرکتی ہوئی موکا بند سہ پھلا ایک گئی تو میں نے ادھر دیکھنا ہی ترک کر دیا تھا کیونکہ میرے دل کی رفتار خطرناک حد تک آگے نکلی جا رہی تھی۔

دل کی بے قراری کی وجہ آنے والے وقت کا خوف نہ تھا بلکہ چھٹی جس مسلسل الارم بج رہی تھی جیسے شہر میں خوفناک آگ لگ گئی ہو۔ یہ میری خوش قسمتی ہی تھی کہ سڑکوں پر رش نہ تھا۔ ورنہ کوئی نہ کوئی ناخوشگوار حادثہ لازمی بات تھی۔ میں دائیں بائیں ٹرنے کا اشارہ ملک کر ناجھول جاتا تھا۔

جو نہی میں نے چوک سے ٹرن لیا میرے ہاتھوں سے اسٹیرنگ وہیل نکل گیا تھا۔ ٹرن کی وجہ سے رفتار نہایت ہی کم تھی ورنہ گاڑی بے مہار اونٹ کی طرح نہ جانے کدھر نکل جاتی۔ رنگ باز خان کا گٹ سامنے تھا اور لوگ اندر جا رہے تھے۔ باہر نکل رہے تھے کچھ ٹولپوں کی صورت میں پاتھ دسے۔ پ۔ کھڑے تھے۔

پاتھ دسے کی بجری ٹائمرز تلے چڑھتی ہوئی ادھر ادھر بھر گئی تھی اور لوگوں نے کود کود کر راستہ چھوڑ دیا تھا۔ پورے میں

کار روک کر چھلانگ لگائی اور دوڑنے لگا۔ ایک سفید ریش شخص بید کی کرسی سے جھول کر اٹھا۔ اس نے کچھ کہنے یا شاید روکنے کے لیے ہاتھ اٹھایا مگر میں دوڑتا ہوا آگے نکل گیا تھا۔۔۔۔۔

طویل راہداری کی تمام قطاریں روشن تھیں اور اسی روشنی میں میرے دوڑتے قدموں کو بھر پور ٹھوکر لگی تھی۔ ڈائمنگ روم کے دروازے میں سلوا گروٹ کے بل پڑا ہوا تھا۔ اس کا ایک ہاتھ سر کے نیچے رکھا ہوا تھا اور دوسرا سر کے نیچے جھکا ہوا تھا۔ غلن آلود چہرے پر بکھری مسکراہٹ بخیر ہو چکی تھی۔ میں ٹھٹھوں کے بل اس کے قریب گرا۔ میرے ہاتھ اور سرے ہوئے ٹھٹھنے جیسے ہوئے غلن میں دھنس گئے تھے۔ اس کی چہرے کی جلیٹ پیٹ سے گلے تک چھید چھید تھی اور ہر چھید کے منہ پر لو ٹھٹھے جمے ہوئے تھے۔ میں نے غلن سے ٹھٹھے ہاتھوں سے اس کا چہرہ تھام کر اوپر اٹھایا اور پھر نہ جانے کب اس کا ادھر اڑا ہوا جسم میری بائیں میں چلا آیا تھا۔ میکر ہونٹ اس شخص نے جڑا کیے تھے جیسے میں بید کی کرسی پر چھوڑ آیا تھا۔

صبر کرو لونجوان! تمہاری فوری توجہ کی مستحق اندر پڑی ہوئی ہے؟ میں نے غلی غلی نگاہوں سے اس بوڑھے کی طرف دیکھا تو وہ ایک دم مجھے چھوڑ کر پیچھے ہٹ گیا تھا۔

کہاں ہے وہ...؟ میکر حلق سے ایسی خوفناک اور سرد غراہٹ ابھری جس سے میرے کان بھی نا آشنا رہے تھے۔ جو بائیں بوڑھے نے کمرے کی طرف اشارہ کر دیا تھا۔

میں نے جھلانگ لگائی اور اندر داخل ہو گیا۔ ڈائمنگ ٹیل پر رشیدہ پڑی ہوئی تھی اور اس کے دونوں ہاتھ دائیں بائیں پھیلے ہوئے جیسے کچھ مانگ رہے تھے۔

رشیدہ: میرے حلق سے دہاڑا ابھری، جان برادر...!! میں نے بمشکل نود کو اس پر گرنے سے بچایا کیوں کہ اس نے میری آؤ کا جواب دیا تھا۔ اس نے آنکھیں کھول کر میری جانب دیکھا تھا۔ اس نے ہمیشہ کی طرح مجھے پیار بھری مسکراہٹ دی تھی۔

تم... تم آگے خرم: وہ بے حد دھیمی آواز میں بولی۔ بس ٹھیک ہے۔ سب ٹھیک ہو جائے گا؟

مجھے بتاؤ جان، کیا وہ ٹینک کو لے گئے ہیں؟ شاید۔ میں اور سلوا آخری وقت تک انھیں روکتے رہے۔ وہ چھپے تھے۔ وہ اپنے ساتھ شاید تین لاشیں بھی لے گئے ہوں گے۔ ہم سنہرے کو لے گیا تھا۔ پھر ایک برسٹ نے سلوا کو مار گرایا اور مجھے زخمی کر کے وہ ادھر ہی گئے ہوں گے؟

فرش پر جہان خوں پھیل رہا تھا، کرسیاں الٹی اور کچھ ٹوٹی ہوئی تھیں کمرے کی ابتر حالت سے پتا چلتا تھا جیسے درندے آپس میں خونریز جنگ لڑتے رہے ہوں۔ میں نے ٹول کر جب گولی کا ٹم دیکھا چاہا تو رشیدہ نے نفی میں گردن ہلا دی۔

اسی اثناء میں چار پانچ آدمی اندر آ گئے۔ ان کے ساتھ وہی بوڑھا تھا۔ آنے والے سفید یونیفارم میں ملبوس تھے۔ انھوں نے انٹرکس پر فرش پر دکھا اور ڈائمنگ ٹیل کے پاس آکر کھڑے ہو گئے۔ ہم نے پولیس کو بھی اطلاع دے دی ہے، بوڑھے نے بتایا۔ لاش پولیس لے جائے گی۔ چچی کو فوری طبی امداد چاہیے؟

میں نے ان کو سر اثبات میں ہلا کر ہانڈت دے دی۔ خرم، رشیدہ اسٹریپر پر لیٹ کر بولی: تمہاری یہاں ضرورت ہوگی، ادھر بارون کو بھیج دینا: میں نے اسے کوئی جواب نہ دیا۔ جب وہ اسے لے کر نکل گئے تو میں لمحہ بھر خود کو سمیٹا اور متوازن کرتا رہا۔ غصہ اور دکھ میرے روئیں روئیں میں زہرین کر آ رہا تھا۔ غلن رنگوں میں یوں اچھل رہا تھا جیسے پہاڑی ندیوں میں طغیانی آتی ہو۔

منامیہ ساکت جسم جھجھکتا ہوا بیدار ہو گیا۔ میں دوڑتا ہوا باہر آ گیا۔ میرا رخ امینہ کے بیدار روم کی طرف تھا۔ میں اس معصوم لڑکی کو بھول ہی گیا تھا۔

وہ اپنے میڈ پر اوڑھتی پڑی ہوئی تھی۔ اس کے ہاتھ پشت پر بندھے ہوئے تھے۔ میں نے پک کر اسے سیدھا کیا اس کے منہ پر اسی کاسٹرخ اسکا رفس کس کر بندھا ہوا تھا۔ وہ پلٹ گئی تھی اور میں ریشمی اسکا رفس کی گرہ کھولنے میں وقت محسوس کرنے لگا تھا۔

آپ پیچھے ہٹ جائیں؟ ایک نرم ہاتھ میرے شانے پر چھکی دینے لگا۔ میں نے پلٹ کر دیکھا وہ سب انپکڑ تھا۔ اس نے جھک کر ساری بندشیں چاقو سے کاٹ دیں۔ امینہ بدستور میری بائیں ہاتھوں پر چہرہ رکھے بلکہ ہی تھی اور میں وہ سارے الفاظ اور طریقے تم کر بیٹھا تھا جن سے کسی روتی لڑکی کو چپ کر لیا جاسکتا تھا۔ ویسے بھی میرے پاس ندامت اور دکھ کے سوا کچھ نہ تھا۔ میں ہی اس پُرسکون آباد گھر کی بربادی کا ذمے دار تھا۔ اس گھر کو آگ میرے ہی ہاتھوں نے لگائی تھی۔

آپ میرے ساتھ باہر چلیں: انپکڑ نے کہا اور امینہ نے تڑپ کر چہرہ میری بائیں ہاتھوں سے اٹھالیا۔ میں اُمڈتے ہوئے آنسو نکل رہا تھا اور اس کا ترجمہ ہاتھوں سے صاف کر رہا تھا۔

”نہیں بھائی جان، آپ مجھے چھوڑ کر نہ جائیں۔“
 ”ہم کہیں باہر نہ جائیں گے بی بی،“ انیسٹر بولا۔
 ”میری باجیاں کہاں ہیں؟ امینہ نے میرا گریبان تھام کر پوچھا۔ وہ تمویاجی کو گھسیٹ رہے تھے۔
 ”سب ٹھیک ہیں جان،“ میں نے اسے تھپتھپایا اور انیسٹر کے ساتھ باہر نکل گیا۔ راہداری میں پولیس بھری ہوئی تھی کچھ دوسرے لوگ بھی اندر آنے کی کوشش کر رہے تھے سپاہی لوگوں کو دھکیل کر میٹھیوں پر روک رہے تھے۔
 ”آپ پہلے اپنی شناخت کروائیں،“ انیسٹر نے سلوا کی لاش کے قریب جا کر کہا۔
 ”آپ اپنا کام کریں انیسٹر، میں نے بھرائی آواز میں کہا۔
 ”گھر جل چکا ہے اب صرف منہ صاف کرنا ہے۔“
 ”آپ کہاں تھے اور گھر جلانے والے کون تھے؟“
 ”وہ میری عدم موجودگی میں آئے تھے، میں نے جواب دیا اور انیسٹر کی مونچھوں میں ناگ ٹھسکانے لگے تھے، لیکن وہ میرے سر دائر پر اسرار انداز گفتگو سے کچھ مرعوب ہو گیا تھا۔
 ”آپ میری نگرانی پر چند سپاہی لگا دیں انیسٹر، میں فون پر چند لوگوں کو اطلاع دینا چاہتا ہوں۔ ان کی آمد تک میں مریض کچھ نہیں بولوں گا۔“
 ”آپ مجھے مجبور کر رہے ہیں مسٹر، وہ ٹھسکا رہا۔
 ”کیا آپ ضابطے کی تمام کارروائی مکمل کر چکے ہیں؟ میں نے غصے سے آواز میں پوچھا۔ اگر نہیں تو پہلے وہ مکمل کریں، میں نے کندھوں سے پکڑ کر اسے ہٹایا اور آگے بڑھ گیا۔
 اندر جا کر میں نے پلٹ کر دیکھا انیسٹر دروازے میں کھڑا کینہ توڑ نگاہوں سے گھور رہا تھا۔ میں نے ایک لحظہ فیصلے کو دیا اور پھر میری پکیپاتی ہوئی انگلی ڈی آئی جی کے گھر کا نمبر ڈائل کرنے لگی۔ تیسری گھنٹی پر کسی خاتون نے ریسورسٹنگ کر مٹر تم آواز میں ہیلو کہا تھا۔
 ”خاتون محترم ایک نہایت ضروری کال صاحب کے لیے۔“
 ”نام بتائیے جناب۔“
 ”خرم سلطان، میں نے سرگوشی میں نام بتایا۔
 ”اوہ خیریت خرم سلطان صاحب۔ میں میں مس۔۔۔“
 ”پلیز اپنے ابو کو ذرا جلدی بلائیے، میں نے اس کی بات کاٹ دی، اس نے کھٹ سے ریسورسٹنگ رکھا اور ایک منٹ بعد ڈی آئی جی صاحب کی بوجھل آواز ابھری۔

”ہیلو بولنے کہاں پر؟“
 ”رنگ بازخان کے گھر جناب، باہر ایک لاش پڑی ہے۔“
 خان مرحوم کی بڑی صاحبزادی کو اٹھوا کر لیا گیا ہے اور رشیدہ اسپتال میں ہے۔
 ”کیا... کیا... کبہ رہے ہو خرم؟ وہ چیخ کر بولے۔ لاش کس کی ہے اور کیا ہوا؟“
 ”میرے ساتھی سلوا کی لاش ہے جناب، میں فون پر تفصیل نہیں بتا سکتا۔ ایک انیسٹر دروازے میں کھڑا ہے۔ پلیز آپ جلدی آئیے۔“
 میں نے انیسٹر کو اشارے سے بلایا۔ جب وہ قریب آیا تو میں نے ریسورسٹنگ کے ہاتھ میں تھما دیا۔ پھر وہ ٹوٹ کے انداز میں تھک تھک کر کپس کپس سر کرنے لگا تھا۔ اس نے جب ریسورسٹنگ کی طرف بڑھایا تو اس کا چہرہ پسینہ پسینہ ہو رہا تھا۔ میں جب جانے کا اشارہ کیا تو بوجھل ہٹ میں اس کا ہاتھ سیلوٹ کرتے کرتے رک گیا اور وہ دوڑتا ہوا باہر چلا گیا۔
 ”سنو خرم سلطان، گھر نا بنیں میں آ رہا ہوں سب ٹھیک ہو جائے گا۔ تم نے بتایا نہیں لیکن میں جانتا ہوں... کہ تمھارا بڑے مقابل کون ہے۔ میں لاہور تک تمام راستے بلا کر آ رہا ہوں۔“
 ”شکریہ جناب، میں نے جواب دیا۔ آپ کے لیے ایک اور اہم خبر بھی ہے۔ اتنی اہم کہ شاید آپ کو اپنی سروس اور ذات داؤ پر لگانے کا فیصلہ کرنا پڑے۔“
 ”میں تمام ذرائع اور حوصلے ساتھ لا رہا ہوں بیٹے۔ وہ باوثوق بھیجے میں ہونے۔ بس تم خود کو قابو میں رکھو، انھوں نے جو نہی سلسلہ منقطع کیا میں نے بیگن کے نمبر ڈائل کیے۔ میں دوسرے ساتھیوں کی خیریت معلوم کرنے کے لیے بے قرار تھا۔ میں یہ معلوم کرنا چاہتا تھا سلواتنہا کیوں اور کیسے وہاں تک آیا تھا۔
 ”ہیلو کونزرس اینڈ۔“
 ”میں خرم سلطان ہوں منٹ، دوسرے ساتھی کہاں ہیں؟“
 ”اوہ چیف، وہ ہسکلا گیا۔ وہ ان ڈیوٹی ہیں چیف۔ منٹ مسٹر جاگیر خان کے گھر کی نگرانی کر رہا ہے کیونکہ جاگیر خان دور دراز سے اندر بند ہے اور سلوا کو مس رشیدہ نے کسی کام پر لگا دیا ہے۔ مجھے چیف کی کال موصول ہوئی تھی لیکن یہاں کوئی بھی نہیں ہے۔ میں فاضل چابی سے دروازہ کھول کر اندر آیا ہوں۔“

”تم بھی چلے آؤ کونزرس میں خان رنگ باز کے گھر ہوں، یہاں حالات اچھے نہیں پولیس موجود ہے۔ میں ایک انیسٹر کو کچھ دواں لگا، تمہیں اندر لے آئے گا۔“
 ”مگ... کیا ہوا ہے چیف؟ کونزرس تقریباً چھتے ہوئے پوچھا۔
 ”جو کچھ ہوا بہت برا ہوا ہے میرے دوست، بس چل پڑو۔“
 میں نے ضرب لگا کر سلسلہ منقطع کیا اور جاگیر خان کا دروازہ کھول کر اس کا نمبر ڈائل کیا۔ گھنٹی بج رہی تھی۔ مجھے جوش تک تھا وہ یقین میں داخل ہونے لگا تھا جاگیر خان بھی میری طرح کسی مشکل میں گرفتار ہو چکا تھا۔
 ”ہیلو، کسی مرد نے بھرائی ہوئی آواز میں پوچھا۔ کون صاحب؟“
 ”انیسٹر بول رہا ہوں خان صاحب کو فون پر بلاؤ۔“
 ”خان صاحب کون؟“
 ”جہانگیر خان۔“
 ”ایک منٹ ہولڈ کریں جناب۔“
 لیکن انتظار پانچ منٹ طویل ہو گیا تھا، پھر ریسورسٹنگ نے کی آواز سنائی دی۔ جی میں بول رہا ہوں انیسٹر، جاگیر خان کی آواز میں جھجھکٹ نکلیاں تھیں۔
 ”خان محترم میں خرم سلطان بول رہا ہوں۔“
 ”اوہ۔ چوہدری، وہ کس کس کر بولا۔ میں... میں برباد کر دیا گیا ہوں۔ میری بیٹی وہ بھیڑیے لے گئے ہیں اور اس کی ماں نے دوسری منزل سے کوکر جان دے دی ہے۔“
 ”میں ایک پیارے ساتھی کی لاش پر کھڑا ہوں۔ میری بہن موت و زندگی کے درمیان لٹکی ہوئی ہے اور رنگ باز خان کی بڑی بیٹی غائب ہے۔“
 ”کیا تم لاش پر آنسو بہاتے رہو گے چوہدری؟“
 ”نہیں خان، میں یہ دم ضرور پوری کروں گا لیکن بھیڑیے کا خون پی کر میں بہتر طور پر ماتم کرنا چاہتا ہوں۔“
 ”تو پھر چلے آؤ، وہ غمرا کر بولا۔ میں لاہور جا رہا ہوں بذریعہ ایس۔“
 ”سنو خان، ہم خودکشی نہیں کریں گے، میں نے ٹھوس آواز میں کہا۔ اس نے ہمارے لیے لاہور کے راستے اسی لیے کھولے ہیں کہ ہم لاہور جائیں اور اس کے جال میں پھنس جائیں۔“
 ”میں چھپ کر نہیں جاؤں گا چوہدری، جاگیر خان بولا۔ اب جنگ کھلے میدان میں ہوئی۔ میرے بھی وہاں پھر داؤ اور وفا دار

ہیں۔ میں نے جو کچھ پرنس سے کیا ہے وہ بینک کے ہی حوالے نہیں کیا۔ میں دوستوں کی وفا داریاں پالتا رہا ہوں۔ تم جانتے ہو خرم ہم لوگ اندر حیدروں میں لڑا کرتے ہیں۔ دن کی روشنی میں ہم صفر و زعفران ہوتے ہیں۔ ملک نواز جیسا معزز میدان میں نہیں لڑ سکتا جبکہ میں اسے میدان میں گھسیٹ لاؤں گا۔ اسے صرف ایک فیصلہ کرنا ہو گا۔ میری بیٹی کی واپسی یا میدان میں اتر کر جنگ لڑنا۔“
 ”وہ میسر فیصلہ کرے گا خان، میں نے بتایا۔ تم کل لاہور سے پٹنٹی تک اس کا مشاہدہ کر چکے ہو۔ یقین کرو لاہور میں تمہیں ملک نواز سے نہیں قانون کے محافظوں سے لڑنا پڑے گا۔“
 ”اگر... اگر وہ ہانپ گیا۔ ہاں چوہدری اگر وہ خود سامنے نہ آیا تو میں بذریعہ گورنر صدر مملکت تک چلا جاؤں گا۔“
 ”تم کیسی باتیں کر رہے ہو جاگیر خان، میرے بچے میں طنز کی کٹ تھی۔ تم جو اچھی طرح جانتے ہو ملک نواز کی اپروچ کہاں تک ہے اور وہ ایوانوں میں کیا اہمیت رکھتا ہے۔ نہیں جاگیر خان احمقانہ باتیں نہ کرو۔ تم اٹھا کر جیل میں ٹھونس دیے جاؤ گے۔ جانتے ہو ملک نواز جلتے ہوئے جہاز کا رخ تمھاری طرف پھیر دے گا۔ جہاز اور اس کا سامان اس کا ہو گا لیکن اگ تمھاری ذات کو لگ جائے گی۔“
 ”کیا مطلب؟“
 ”وہ اپنے ہی گودام کی نشان دہی کر کے خود کو محبت وطن اور تمہیں قدر قوم بنا دے گا۔“
 ”نہیں، وہ ایسا نہیں کرے گا۔“
 ”وہ ایسا ہی کرے گا۔ جاگیر خان۔ کیونکہ جب وہ دیکھے گا کہ اس کے جہاز میں اگ بھڑک اٹھی ہے تو وہ ایسے جہاز کو اپنی سیاسی سالک بچانے کے لیے استعمال کرے گا۔“
 ”پھر میں کیا کروں؟“
 ”جنگ کی آزمودہ چال چلو خان، میں نے پُر زور آواز میں کہا۔ پہلے تم کرباؤ۔ میں تمھارا گواہ ہوں گا اور تم ملک نواز کے گودام...“
 ”نہیں، وہ دھاڑ کر بولا۔ میں اپنی قبر خود تیار نہیں کر سکتا۔“
 ”تو پھر ملک نواز نے تمھارے لیے جو تالوت تیار کیا ہے اس میں لیٹ جانا۔“
 ”کیا ایسا کر کے میں اپنی گردن بچا سکتا ہوں؟“
 ”ہاں خان جی، میں نے کہا۔ تم سلطانی گواہ بن کر ملک

نواز کے چہرے سے جھوٹے نقاب نوج سکتے ہو۔ بس یہی ایک راستہ کھلا رہ گیا ہے۔

”تم ضمانت دیتے ہو خرم سلطان؟“
”بادشاہ ضمانت جاگیر خان میں نے سرگوشی میں اپنی آواز بدل لی۔ سنو، میں نے ڈی آئی جی کو فون پر اطلاع دے دی ہے۔ وہ چند لمحوں کے بعد یہاں ہوں گے۔ میں نے بھی پرنس کا آدھا منافع تعلقات کی عمارتوں پر لگایا ہے۔ میں ان عمارتوں کا کرایہ وصول کر رہا ہوں۔۔۔۔۔ تم خود دیکھو گے کہ میری عمارتیں کیسا کرایہ دیں گی۔“

”کیا تم نے ڈی آئی جی صاحب کو بتا دیا ہے؟“
”صرف ہنگامے کی حد تک۔ میں نے بتایا۔ میں اتنا خیر فیتے دار نہیں ہوں خان۔“
”تو پھر تین قدم جانے کے لیے مال کی ضرورت ہوگی چوہدری۔ کم از کم سپروٹن اور موٹی نکال لینے دو۔“

”آپ کا کیا خیال ہے کہ میں اتنا بے وقوف ہوں کہ سب کچھ پولیس کی جھولی میں ڈال دوں گا؟ میں نے استہزائیہ انداز میں کہا۔
”نہیں خان، میں تو جس کا اسٹاک بھی اٹھانے کے حق میں ہوں، بس کچھ سپروٹن اور چند بلاک جس رہنے دیں گے تاکہ ملک نواز پر منشیات کا جرم بھی ثابت ہو جائے۔“

”ٹھیک ہے، میں اپنے چند آدمیوں کے ساتھ جا رہا ہوں۔ وہ بے قرار ہو کر بولا۔ تم پولیس کو ابھانے رکھنا۔“

”میرے آدمی کسی کو اندر داخل نہیں ہونے دیں گے۔ اگر آپ چلے گئے تو لازماً اپنے ہی آدمیوں میں تصادم ہو جائے گا۔ آپ دوسری کال تک انتظار کریں، میں ساتھ چلوں گا۔“

”ٹھیک ہے چوہدری۔ اس نے گہری سانس لے کر کہا۔
”بے بسی کا ایک تجربہ ہی یہی۔ میں کبھی اتنا بے بس نہیں ہوا تھا۔“
”وقت وقت کی بات ہے خان۔ یہ وقت بھی نہ رہے گا۔“
”میں نے ناصحانہ انداز میں کہا۔ مگر مجھ جب سمندر سے نکل جائے گا تو سمندر پراقت دار بنا ہی ہو گا۔“

”او کے خرم سلطان۔ میں آپ کی کال تک گھر ہی رہوں گا۔ جاگیر خان نے سلسلہ توڑا تو میں نے یہ معلوم کرنے کے لیے کہ اس وقت مخالف فوج کا کمانڈر کس پوزیشن میں ہے ملک نواز کا نمبر ڈائل کیا۔ سن اتفاق سے پہلی ہی رنگ پر ملک نواز نے کال اٹینڈ کر لی۔ وہ ایک اچھے کمانڈر کی طرح آپریشن روم میں حاضر تھا۔

”لاہور کا موسم کیسا ہے جناب؟ میں نے ثواب لہجے میں دریافت کیا۔“

”کون ہو اور کیا کام ہے؟“ ملک نواز نے حکمانہ لہجے میں پوچھا۔

”آپ کا بے لگام گھوڑا ہوں۔ میں نے آواز کو پُر سکون رکھا۔
”اور بس تینے کا انعام چاہتا ہوں۔“

”اوہ تو تم ہو۔ اس کی غڑاہٹ ابھری۔ کیا انعام کی پہلی قسط تمہیں نہیں ملی چوہدری؟“

”نہیں جناب۔ میں نے فدیہ انداز میں کہا۔ میں ابھی ابھی ٹریک سے باہر آیا ہوں۔ جاگیر خان کے تعاقب میں تھا۔ وہ لاہور میں اپنی وفاداری کی رسید چھوڑ آیا ہے۔ آپ کی دست راست مادم فوین کی لاش اور اس کے ایک پرستار کی لاش کیا دونوں لاشیں پولیس لے گئی ہے؟“

”نہیں مجھے صرف ایک ہی لاش دکھانی گئی ہے اور وہ ہے بدرخان کی۔ ملک نواز ایک ایک لفظ چپا کر بولا۔ جاگیر خان اپنا ایک بازو چھوڑ گیا ہے۔“

”ایک خبر اور بھی ہے جناب۔ میں نے کہا۔ ٹھیک بارہ بجے جاگیر خان گودام سے تمام مال شفٹ کر رہا ہے۔ اس سلسلے میں میرے لیے کیا حکم ہے؟“

”تم گیارہ بجے بالکل وہی کارروائی کرو میسر تچے۔ وہ چپکاتی آواز میں بولا۔ جو میرے ہونٹ کے تہہ جانے میں کر پئے ہو۔ اگر تم نے بارہ بجے اوکے، رپورٹ دی تو پھر میں تمہیں ایک بہت بڑے انعام کی پیش کش کروں گا۔ ایک گھنٹہ تمہارے لیے کے لیے بڑی مدت ہے۔ اسے صرف وہاں پکنگ مشین کی راکھ اور دھواں ملنا چاہیے خرم چوہدری۔ یقین کرو میری سٹی میں ایسا انعام ہے بلکہ کوہ قندیرا ہے جسے میں اپنے مال کے عوض تمہیں دوں گا۔“

”میں نے ٹیلی فون سیٹ اٹھا کر دیکھا ریکارڈنگ نظام اپنا کام کر رہا تھا۔ یہ نظام میری عدم موجودگی میں شاید بیگن نے ان کالوں کے لیے لگایا تھا جو اس کی عدم موجودگی میں لڑکیوں کو ہراساں کرنے یا ان کی موجودگی عدم موجودگی معلوم کرنے کے لیے ملک نواز کے کمرے کرتے تھے۔“

”ملک نواز میں نے ایک دم بوجھ بدل کر کہا۔ اگر تم مجھے پہچان چکے ہو تو تمہیں ایسی باتیں کرنے سے پہلے سوچ لینا چاہیے تھا۔ میں احمقوں کی جنت میں نہیں رہتا اور جس کوہ نور کو تم نے جھیلی میں بند کر لیا ہے۔ اس کی اہمیت میرے نزدیک کلکتہ جتنی ابھی

نہیں ہے۔ میں نے یہ قلعہ فتح کیا تھا اور یہاں جو کچھ تھا سال خیمت تھا۔ اگر مال غنیمت سے ایک شے تم نے حاصل کر لی ہے تو مجھے کوئی پروا نہیں۔“

”بکواس۔ وہ دہراتا ہوا بولا۔ وہ۔۔۔ وہ تمہاری محبوبہ اور بونے والی بیوی ہے۔“

”محبوبہ؟ میں نے قہقہہ لگایا۔ ہونے والی بیوی۔ دوسرا قہقہہ پیپے سے بھی بلند تھا۔ سنو ملک نواز! اگر میں ایسی محبوباؤں کو بیویوں کا درجہ دے کر شمار کروں تو پانچ ممالک میں دو ڈیو وین ہوں گی، چلو اگر تمہیں میری محبوبہ کو بریضاً بنا کر راحت ملتی ہے تو میں اسے تسلیم کر لیتا ہوں۔“

”میں تمہاری ماں کو بھی۔۔۔۔۔“

”مت بھونکو۔ میں نے کرفت آواز میں کہا۔ ماں جیسی مقدس ہستی کا نام تمہاری گندی زبان پر نہیں آنا چاہیے۔ جن کی مائیں ہوتی ہیں وہ تم جیسے شیطان نہیں بنتے۔ تم تو کسی غلیظ گھڑی پیداوار ہو۔ گندے اور کراہت آمیز کھیتڑے۔“

”کئی لحظے پس پردے ہانپنے کی سرسراہٹیں ابھرتی رہی تھیں۔ وہ یقیناً غصے سے اپنا دماغی توازن کھو بیٹھا تھا اور بگڑا ہوا توازن درست کرتا رہا تھا۔“

”دوسری خبر بھی سن لو۔ میں نے اسے ایک اور ضرب لگائی۔ جاگیر خان میری گرفت میں ہے۔ مجھے ابھی ابھی اس کے گھر سے میرے آدمیوں نے اطلاع دی ہے اور میں نے اسے بیوی کی لاش پر چند آنسو بہانے کی مہلت دے دی ہے۔ وہی شے گودام تک لے کر آئے گا اور اگر تم جہاز سے بھی آنا چاہو تو نہیں آسکو گے۔ اب پونے گیارہ ہونے والے ہیں۔ ٹھیک بارہ بجے میں تمہاری طاقت کا پرچم سرنگوں کر دوں گا۔ آنے والے ایکشن میں کوئی سیٹ لے لینا۔ ملک نواز نے میرا مخلصانہ مشورہ ہے۔ اب یہ تاج میرے سر پر ہو گا۔ اگر تم نے مقابلے کی حماقت کی تو پھر سیاسی نقاب بھی تمہارے چہرے سے نوج لیا جائے گا۔“

”ٹھیک ہے نوجوان۔ اس نے چھٹکار کر کہا اور پھر سلسلہ منقطع ہو گیا تھا۔

”میں نے ٹیپ آواز کو دراز میں رکھ دی۔ بیگن نے تو دفاعی انتظام کیا تھا مگر میں نے ٹیپ سے بھر پور فائدہ اٹھایا تھا۔ ملک نواز کے خلاف میرے پاس ناقابل تردید ثبوت اور مواد جمع ہو چکا تھا جسے کسی اور کی گواہی اور تعاون کی چندال ضرورت نہ رہی تھی۔ جاگیر خان اگر منحرف بھی ہو جاتا تو ملک نواز کی گردن

میری گرفت سے آزاد نہیں ہو سکتی تھی۔ اس کے باوجود میں جاگیر خان کو زیر دام لے جانا چاہتا تھا کیونکہ وہ جو آج ملک نواز کی ضرب کھا کر منکسلاں تھا کل ملک نواز کا ظالم ہاتھ تھا، اس کا شمار بھی انسان دشمن لوگوں میں تھا۔ وہ اس جہنم کا دار و غمر تھا جس کے دروازے ملک نواز نے قوم کے جوانوں کو کھول دیے اور نوجوانوں کو کھول رکھے تھے۔۔۔ ملک نواز ہنگ تھا اور جاگیر خان اس کا نہر تھا۔

”کونز کو دو سپاہی حراست میں لے کر اندر آئے تھے۔ کیونکہ اس کے ہاتھوں میں جدید اسٹین گن تھی اور وہ غیر ملکی تھا۔ اسے نہتا کر دیا گیا تھا۔ چونکہ میری ہدایت پر وہ آیا تھا اس لیے اس نے جواباً کوئی مزاحمتی کارروائی نہ کی تھی۔ انپکٹر میکس سائمن نے صرف مٹوہ کھڑا تھا بلکہ اس نے اینٹیاں بھی توڑ رکھی تھیں۔ نہ جانے ڈی آئی جی صاحب نے اسے کیا حکم دیا تھا۔ میں نے جو بہنی اشارہ کیا انپکٹر نے سپاہی سے اسٹین گن لے کر کونز کو واپس کر دی اور میں کونز کا ہاتھ پکڑ کر اندر لے گیا۔“

”میں بھٹ جائل گارجیف۔ اندر جا کر کونز بھڑائی آواز میں بولا۔ بتائیے یہاں کیا ہوا ہے؟ تب میں نے اسے تھپک کر پُر سکون رہنے کی تلقین کی اور پھر جو کچھ بیت چکا تھا اسے بتا دیا۔ اس کی بوٹی بوٹی پھر کتنے لگی تھیں لیکن وہ باحوصلہ اور فرمانبردار نوجوان سر جھکائے چپ چاپ بیٹھا رہا تھا۔ میں دیکھ رہا تھا کہ اس کی گرفت اسٹین گن پر اس قدر سخت ہو گئی تھی کہ اس کی انگلیوں کی پوڈیل پھٹنے پر لگتی تھیں۔“

”سلوا۔ ہمارا پیارا بھائی۔ جب وہ بولا تو اس کی آواز میں دُعا جہان کا کرب تھا اور آنسو اچھل کر میرے ہاتھوں پر آن پڑے تھے۔ فرض کی ادائیگی میں سب سے آگے رہا ہے۔ وہ باندی جیت لے گیا ہے جیف۔“

”ہاں، وہ امر ہو گیا ہے۔ میں نے گلوگیر آواز میں کہا۔
”میں خان کے لیے آپ نے کیا سوچا ہے جیف؟“
”ابھی کچھ نہیں پایا۔ وہ بھی اسی مقدس جنگ کی بھینٹ چڑھی ہے۔ وہ جہاں بھی ہے کم از کم اس کی جان کو کوئی خطرہ نہیں۔ ابھی کچھ ہماری جائلوں سے اہم مسائل ہیں۔ مجھے مین پاور کی ضرورت پیش آ سکتی ہے۔ ماسٹر اور بارون آن ڈیوٹی ہیں، اگر دوسرے دونوں ساتھی بھی مل جائیں تو ہم بارہ بجے ایک اہم فرض ادا کریں گے۔“
”میں انہیں کال کرتا ہوں جیف۔ کونز نے شارٹ رینج

ٹرانسپیرنٹ نکالتے ہوئے کہا: یہاں نہیں کونز، تم ہاتھ روم میں چلے جاؤ۔
ابھی کونز نے دو قدم ہی اٹھائے تھے کہ برآمدے میں
ایڑیاں بجنے لگیں اور پھر فل یونیفارم میں ملبوس طویل قامت
ڈی آئی جی تیزی سے اندر داخل ہوئے۔ میں نے اُنہ کو اُن کا
استقبال کیا۔ اُن کے پیچھے ایس پی اور ڈی ایس پی بھی تھے۔
دو توں فٹ میٹ پر ہی ڈک کر مجھے گھورتے ننگے تھے۔
ڈی آئی جی نے مصافحہ کیا اور گردن موڑ کر انصران کی جانب
دیکھا چونکہ ان کا چہرہ اوجھل تھا اس لیے میں نہیں دیکھ سکا تھا کہ
انہوں نے کیسا اشارہ کیا تھا۔ اُن کے ماتحت ایڑیاں بجاتے ہوئے
واپس پٹ گئے تھے۔
میں نے لاہور سے رنگ بازخان کے گھر تک جو کچھ ہوا تھا
انہیں تفصیل سے رپورٹ دی۔ اُن کے جیٹروں کی ہڈیاں اچھل
اچھل کر اُن کے جذبات کی ترجمانی کر رہی تھیں۔ جب میں خاموش
ہوا تو بھی لمحہ بھر وہ دیوار کو گھورتے رہے تھے۔ اب کیا کرنا چاہتے
ہو خرم سلطان؟ ان کا لہجہ جارحانہ اور محکمہ آمیز تھا۔
اگر میں جو چاہتا خود کرنے کا فیصلہ کرتا تو آپ کو کیوں
رحمت دیتا؟
”تم... ان کے حلق سے غراہٹ اُبھری۔ ہاں چوہدری،
کیا تم پولیس پر انحصار کرو گے؟“
”سوئی سر“ میں نے نفی میں گردن ہلاتی۔ ”صرف آپ کی
ذات پر۔“
”میں کون ہوں؟“
”ایک محبت وطن اور ذمے دار انسان۔“
”نہیں خرم سلطان، میں اپنی ذات سے قطع نظر پولیس ہوں۔
وہ بٹھیرے انداز میں بولے۔ ”اگر میں صرف انسان بن جاؤں تو صرف
اظہارِ افسوس کر کے لوٹ جاؤں گا۔“
”مجھے کوئی افسوس نہ ہو گا سر۔ میں نے بھی مہذب لیجے میں
جواب دیا۔ جو کچھ یہاں ہوا وہ میری ذات کے کھاتے میں ڈال
دیجیے۔ مجھ سے اظہارِ افسوس کیجیے لیکن میں ایک ملک کے
ایک ذمے دار اور وفادار فیصلے سے قومی سطح کی بات کروں گا۔
ایسی بات جس کا تعلق کسی خرم سلطان سے نہیں بلکہ پوری قوم سے
ہے۔ ہاں اگر آپ نے اس تعلق سے روگردانی کی تو مجھے بہت
دُکھ ہو گا۔“

”بولتے رہو خرم سلطان، بولتے رہو۔“
”کیا آپ جانتے ہیں ملک نواز کی تمام قوت، بلکہ سیاسی

سماجی اور معاشرتی جان جس قوت میں ہے اور وہ تو اتنی فـ
میں ہے وہ غار پندی کے علاقے میں ہے۔“
”نہیں؟“ انہوں نے نفی میں سر ہلایا۔ ”میں صرف یہ جانتا ہوں
کہ یہاں اُس کا نمائندہ جاگیر خان ہے اور ملک نواز ایک نمائندہ
بین الاقوامی بینکار اور ملکی سطح کا سیاسی لیڈر ہے۔“
”اگر میں آپ کو بتاؤں کہ فلاں جگہ ایک تہہ تختہ ہے جس
میں کروڑوں نہیں اربوں کی مالیت کا غیر قانونی مال بھرا ہوا ہے تو بـ
اگر اس تہ خانے کا تعلق ملک نواز سے ہے تو میں سنی ان
سنی کروں گا، کیونکہ اس موضوع پر تم پہلے ہی باتیں کر چکے ہو اور
میں جواب دیتا رہا ہوں۔“
”تو آج بھی آپ کا وہی جواب ہو گا؟ حیرت سے میری آواز
پھٹ گئی۔
”ہاں چوہدری، وہ طویل سانس لے کر بولے۔ ”کیونکہ میں...
حکومت اور ملک نواز کی سیاسی قوت، سب کچھ وہی ہے۔“
”پھر شریف لے جائیے؟ میں دیکتی آواز میں پھٹ پڑا۔
”یہاں انپکٹر ہے وہ حسب روایت ضابطے کی کارروائی کرے گا اور
کچھ دنوں بعد مرڈر کیس کا فائل داخل دفتر کر دیا جائے گا۔“
”اگر قاتل وہی ہاتھ ہیں تو بالکل ایسا ہی ہو گا۔ وہ بولے۔
اُن کی آنکھوں میں نمی تیر رہی تھی۔ انہوں نے تھوک نکل کر میرے
ہاتھ پر تھپکی دی۔ ”جو مر گیا اسے بھول جاؤ خرم سلطان، اس لڑکی
کو یاد رکھو، میں محکمانہ نہیں ذاتی کوشش کا وعدہ کرتا ہوں، اسے
باعزت واپس کر دیا جائے گا۔“
”شکر ہے جناب، میں نے اُن کا ہاتھ بہ آہستگی سے جھٹک
دیا۔ میں اس کے اغوا کی رپورٹ درج نہیں کروں گا۔ وہ اب
خان رنگ باز کی نہیں خرم سلطان کی آن ہے، اور میں اپنی آن بچا
کا عہد لکھتا ہوں۔ میں اس شخص سے مدد کی درخواست نہیں
کر سکتا جسے قوم کی ہزاروں بیٹیوں کی زندگی کا کوئی احساس نہیں
یاد رکھیں سر، مجرم ہاتھ بڑے بے رحم اور بے خوف ہوتے ہیں۔ کل
وہی ہاتھ جن سے آپ آج محض اس لیے خوفزدہ ہیں کہ انہیں
چھیننے سے آپ کی ملازمت خطرے میں پڑ جائے گی۔ آپ کی
بیٹیوں، بیٹے، پوتوں، نواسوں تک بڑھ آئیں گے۔ وہ نہریے قاتل
ہاتھ آپ کی آنے والی نسل کی دگوں میں بیروٹن کا زہرا بھیکٹ
کر دیں گے۔“
”تم گستاخ ہی نہیں ظالم بھی ہو لو گے؟ وہ مٹھیاں بھینچ

کر چیخے۔

”گستاخی کی میں معافی مانگ لوں گا: میں نے تپتے ہوئے
لیجے میں کہا۔ رہا سوال ظلم کا تو میں ظلم جاری رکھوں گا۔ میں نے
اس ظلم کا عہد رکھا ہے۔ اگر قوم کو اس بھڑکتی آگ سے بچانا ظلم ہے
تو میں ظالم ہوں اور خون کے آخری قطرے تک ظالم رہنا چاہوں گا۔“
”تم نے مجھے سرویس کا طعنہ دیا ہے، بخدا مجھے سرویس عزیز
نہیں ہے لیکن تم جذبات میں یہ بھول جاتے ہو کہ ملک نواز کے
ہاتھ میں جادو کی چھتری ہے اُس نے سب کو اندھا کر رکھا ہے۔
تم جو کچھ کسی کو دکھاؤ گے وہ کچھ اُنہیں دکھائی نہ دے گا تم ہیروئن
ہتھیلی پر رکھو گے وہ لوگ اُسے ریت کہہ کر تمہارا مذاق اڑائیں گے۔
اُس کے خلاف کوئی زبان گواہی نہ دے گی اور تم خود شرمندہ
ہو جاؤ گے۔“
”اگر میں اُسی کے ہاتھ پاؤں اس کے خلاف گواہ بنا دوں
اُسی کی اپنی زبان اور اپنی آواز اس کے خلاف ناقابل تردید گواہی
دینے لگے تو کیا پھر بھی انصاف کی کرسی پر بیٹھا کوئی شخص
قوتِ مہمت سے انکار کر سکتا ہے؟“
”نہیں، ڈی آئی جی بولے۔ ”لیکن ایسا ہونا ممکن نہیں۔
ایک منٹ: میں ایک کراٹھا اشد شیدہ کے بیڈروم میں
گیا۔ اُس کا ٹیپ ریکارڈ اٹھا لایا۔ دروازے ٹیپ نکال کر چڑھائی۔
ملک نواز کی آواز اُس کی ڈی آئی جی اچھل پڑے تھے۔ پھر
اُن کا سر جھایا ہوا چہرہ آہستہ آہستہ کھلنے لگا تھا۔ ”تم... تم؟ اُن
کی آواز شدتِ جذبات سے کپکپاتے لگی تھی۔ اس سے ابھی بڑے
جا دوگر ہو اب مجھے صرف آدھا گھنٹہ دو۔ اگر میں ناکام ہو گیا، میری
بات اُس کان نے نہ سنی تو میں یہ دھڑی یہیں اُتار بٹاؤں گا۔ یہ
میرا اٹل فیصلہ ہے۔“
وہ اٹھے اور سیلی فون سیٹ کی طرف دوڑتے چلے گئے۔
انہوں نے تین چار بار نمبر ڈائل کیے۔ اُن کی آواز بہت دھیمی تھی۔
اس لیے میں سن نہ سکا۔ البتہ ایک بات انہوں نے بلند آواز سے
کہی تھی کسی سے کہا تھا: ”اگر آپ بھی مجبور اور بے بس ہیں تو میں
بے بس حاکموں کا ماتحت نہیں رہوں گا۔ میرا استعفیٰ آپ کو قبول
کرنا ہو گا۔“
”سیلی فون سے فارغ ہو کر وہ میرے قریب آئے۔ اُن کا چہرہ
فیض و غضب سے سُرخ ہو رہا تھا۔ وہ محظوظ بھر خود پر قائلو پانے
میں معذرت رہے پھر بولے۔ ”میں نے ڈی آئی جی اور وزیر داخلہ
سے دو لوگ باتیں کی ہیں۔ دونوں نے مجھ سے اتفاق کرتے ہوئے
پندرہ منٹ کی مہلت مانگی ہے۔ بہر کیف تم تیاری کرو۔ اگر اُدھر سے

55

دوسرا جواب ملا تو میں یونیفارم اتار کر تمہارا کوئی لباس پہن لوں
گا مجھے... مجھے اپنے گروپ میں شامل کر لینا جس طرح تم نے
انپکٹر ہارون کو لے لیا ہے۔ تم انکم میپ انام بزدلوں اور مفاد
پرستوں کی لسٹ سے ٹو خواتین ہو جائے گا۔ میں قوم اور اللہ
دونوں کے سامنے سرخرو ہو جاؤں گا میں جو بوائی اس عرصے سے
نہ روک سکا وہ ہاتھ اپنی ذاتی طاقت سے توڑ دوں گا۔“
”آپ کی پشت پناہی میرے لیے بہت بڑی قوت ہوگی سر۔
میں نے ممنونیت سے کہا: ”اگر ایسا وقت آگیا تو میں دوسری لائن
میں چلا جاؤں گا سر، براہی آپ فرمائیں گے؟“
”سیلی فون کی گھنٹی بجنے لگی تو میں نے ایک کرسی پر اٹھایا
مگر ڈی آئی جی صاحب نے بات کرنے سے قبل مجھ سے لیسویر لے لیا۔
”کون، جاگیر خان، ہاں خرم چوہدری قریب ہی ہیں، انہوں نے
لیسویر میری طرف بڑھا دیا۔“
”جی خاں صاحب!“
”کیا تم تیار ہو؟“
”نہیں خاں، فی الحال میرا یہاں سے نکلنا محال ہے پولیس
میرے آسٹوٹس پونچھنا چاہتی بلکہ وہ لوگ مجھے میرے ماضی کے
حلقے سے کرینا چاہتے ہیں۔ ممکن ہے مجھے گرفتار کر لیا جائے؟“
”یہ تو بہت بڑی خبر ہے چوہدری، وہ بولا۔ ”تو پھر مجھے اجازت
دو میں مال شفٹ کرنے کے بعد تمہاری مدد کرنے کی یوزیشن میں
ہوں گا۔ فکر نہ کرنا چوہدری، میں اپنا اثر و رسوخ استعمال کر کے تمہیں واپس
لے آؤں گا۔ جو وہ کرتے ہیں انہیں کرنے دو۔ اس وقت ان سے
بھڑنا دانش مندی نہ ہوگی۔“
”ٹھیک ہے خاں، میں نے گہری سانس لے کر کہا: ”میں
اپنا آدمی وہاں بھیج رہا ہوں، وہ اپنے آدمیوں کو واپس لے آئے گا۔
آپ ٹھیک بارہ بجے وہاں جائیں، لیکن سیدھے راستے نہیں، ہو
سکتا ہے ملک کے کچھ اور لوگ گھات میں ہوں۔“
”شکر ہے چوہدری، وہ اندر کی خوشی دبانے کی ناکام کوشش
کرتے ہوئے بولا اور میں نے لیسویر رکھ کر ہاتھ روم کے دروازے
پر دستک دی، کونز ٹرانسپیرنٹ بے باہر نکل آیا۔ ڈی آئی جی پر ننگا
پڑتے ہی اس نے ہاتھ ایک دم جوچھے کر لیا تھا۔
”تم گلستان کا لونی جاؤ گے۔ وہاں ماسٹر اور ہارون ہیں انہیں
لے کر جی راسٹے سے باہر نکل جانا اور کہیں قریب ہی انتظار کرنا،
میں اس کو کھٹی کے قریب وجود میں داخل ہو کر تین ہارون دوں گا۔
پھر میں اُسے راستہ اور کھٹی نمبر بتا ہی رہا تھا کہ فون کی گھنٹی

بجھنے لگی۔ اُدھر سے بیگن کی جالی پہچانی آواز آئی۔ میں نے آواز دے کر کونزہ کو روک دیا تھا۔
 چیف! کوٹھی پر ایک بڑا اور منظم حملہ ہونے والا ہے، باہر
 تین ٹرک اٹھکریں اور تین پکاپ اچکی ہیں۔ اندازاً پندرہ مسلح
 افراد ہل گئے۔

میں نے فون کجا بارو کیجھ لیتے تھے۔ اگر ملک لٹوز خود جلدی نہ کرتا تو شاید
 میں اپنے ملک محدود درہ کو صرف منشیات کا ذخیرہ ضائع کر دیتا۔
 لیکن اس نے ٹکڑا کر میرے لیے کوئی راستہ کھلا نہ چھوڑا تھا۔ مجھے
 پولیس کے اعلیٰ افسران کی مجبوریاں معلوم تھیں۔ حکومت بھی چشم
 پوشی کا رویہ اختیار کرنے پر مجبور تھی۔ سیاسی حکومتیں سیاسی لیڈروں
 کے کندھوں پر ہاتھ ٹیک کر چلتی ہیں۔ وہ ان بیساکھیوں کو بہتر طور
 پر پالش کرتی رہتی ہیں۔ پھر ملک لٹوز کا طریقہ کار اس قدر پُر اسرار
 گہرا اور محفوظ تھا کہ اُس کا دامن منشیات کی بدولت سے ہمیشہ عاف رہا
 تھا۔ وہ پس پردہ رہ کر تمام کاروبار شاہ زمان، داؤد، سلیمان، رنگ
 باذن خان، جاگیر خان اور جنت گل جیسے لوگوں سے کرواتا تھا۔ اُس
 کے خریدے ہوئے لوگ اتنے ٹھوس اور وفادار تھے کہ آخری
 سال تک اُس کا بھرتہ قائم رکھتے تھے۔ جاگیر خان کو تو میں نے بڑی
 گہری منصوبہ بندی کی مادی تھی ورنہ وہ اپنے آقا کے خلاف اُف
 بھی نہ کرتا۔ اُس نے میری چال کی ضرب کھا کر جب اُف کی تو ملک
 نے میری ہدایات و اطلاعات کو بد نظر رکھتے ہوئے فوری کارروائی کر
 ڈالی تھی۔

میں نے تین یاد ہارن بجانے کی نشانی مقرر کی تھی لیکن وہاں تو بساط کا داگ ہی دوسرا تھا اس لیے ہارن کی یاد ہی نہ ضرورت باقی تھی۔ اس سرخ پر جیسے پوری کالونی کے مرد نکل آئے تھے۔ مطلوبہ کو بھٹی کے گیٹ کے سامنے گاڑیاں جل رہی تھیں۔ بلکہ جل چکی تھیں صرف دھواں اود رہا جلنے کی بدلو کالونی پر طاری تھی۔

کی زبان ہی جانا تھا۔ بارون نے دروازے پر برست مارا اور چہرہ چسپی ہوئی چادر کو ہاتھوں سے لیوں چہرے لگا جیسے تریال پھاڑ رہا ہو۔ اس رات مجھے بارون کی طاقت کا اندازہ ہوا تھا۔ نمل آسے پہلے وہ اور بیگن اندر داخل ہوئے تھے۔

یہ تھکے گرد پ کے آدمی ہیں؟ میں نے بارش شخص سے پوچھا جو کندھے پر تھیلی رکھے زخم کا منہ بند کیے بیٹھا تھا۔
 "ہاں! اُس نے اثبات میں گردن ہلائی۔ یہ ہمارا پاس ہے اس نے ہمیں یہاں بلایا اور پھر اس کے آدمیوں نے ہم پر فائر کھول دیا۔"

"جھوٹ مت بولو! میں نے سرداروں میں کہا: یہ جاگیر خزان ہے، ملک نواز کا ایک بھائی کا مندر۔ مجھے بھی اسے زندہ یا مردہ گرفتار کرنے کے لیے لاہور سے بھیجا گیا ہے لیکن تم لوگوں نے بہت جلدی دکھائی ہے؟"

اس نے غور سے میرے سر پرے کا جائزہ لیا اور پھر تھوک نکل کر بولا۔ مجھے بھی چھیننے کے حکم دیا تھا۔
 "چلو ہمارا کام تم نے آسان کر دیا ہے؟ میں نے کہا: تم مجھے اپنے منہ پاس جنت گل کے پاس لے چلو گے، یہیں مل کر مال۔۔۔ یہاں سے شفقت کرنا ہے؟"

"میں۔۔۔ میرا نام ہی جنت گل ہے۔
 غصے کی تیز دھار سرسراہٹ میرے پورے بدن میں سرسرا رہی تھی۔ میرے پیارے دوست سلوا اور نیشہ گل کو انوار کرنے والا میرے سامنے تھا، لیکن مجھے اپنی ذات سے ہٹ کر سونپنا تھا۔ اور کام کرنا تھا۔"

"ہارون! جنت گل زخمی ہے، اسے سنبھال کر باہر لے چلو۔
 ماسٹر کے حوالے کر کے۔۔۔ پھر وہیں بھی پسوں گا۔
 میں جنت گل کے سامنے ڈی آئی جی کا نام لیتے لیتے رُک گیا تھا کیونکہ میں نے جو کاشا پھینکا تھا اسے جنت گل نے نکل لیا تھا۔ زبان کھلنے کا عمل بعض اوقات طویل اڑنا کام ہو جاتا ہے۔ اگر پولیس کا نام سن کر جنت گل زبان بند کر لیتا تو میرا سفر مشکل ہو سکتا تھا۔"

جو پہلی ہم اوپر چڑھے میری احتیاط باوجود کوشش کے ہٹ گئی تھی۔ ڈی آئی جی صاحب مہماتحتوں کے برآمدے میں کھڑے بیگن سے پوچھ کر رہے تھے۔ چونکہ وہ سب یونیفارم میں تھے۔ اس لیے میں نے جنت گل کو باہر نہیں بھجوا کر ایک کھلے دروازے کی جانب چھلانگ لگائی تھی۔ ہم نیم تاریکی میں تھے اس لیے پولیس کے شکرے شکار پر چھپتے پڑے۔ انھوں نے تاریک کمرے کے دروازے پر رُک کر پہلے دروازے کی طرف اشارہ کیا تو میری روشنی میں ایک سب انسپکٹر اندر آ گیا۔

"اوہ۔ آپ ہیں جناب! اُس نے شاید گیٹ پر مجھے ڈی آئی جی

کے ساتھ دیکھ لیا تھا۔

"ہارون! میں نے جنت گل کو ایک چارپائی پر رکھ کر آواز دی۔ خان کو سنبھال لو۔"

میں نے باہر نکل کر پڑے صاحب کو بتایا کہ وہ خانے میں چار لاشیں ہیں جن میں جاگیر خان کی لاش بھی شامل ہے اور قاتل جنت گل ہارون کی کشتی میں دے دیا گیا ہے؟

"ان سے ملو خرم سلطان! ایکسپلین کی طرف انھوں نے اشارہ کیا۔ سٹی مجسٹریٹ ہیں، اسپیشل پولیس کے کمانڈر نے بڑی داناہی کا ثبوت دیا ہے وہ نہ میں تو عجلت میں یہ فارمیٹی بھول ہی گیا تھا۔ چلو ان کی نگرانی میں گودام کو سیل کیا جائے گا۔"

تمام چیزوں کی دو فہرستیں تیار کر کے جنت گل کے دستخط کروائے گئے۔ وہ پہلے تو پھر پھر کرنے لگا تھا۔ ہارون نے اسے ہاتھ دکھائے تو اس نے دستخط کر دیے۔ پھر ڈی آئی جی صاحب نے اپنے دستخط کے ساتھ میرے اور مجسٹریٹ کے دستخط کروائے۔ ضابطے کی کارروائیوں میں جنت گل کا بیان ضروری تھا لیکن اس نے دانوں پر دانت جمائے تھے۔ میں دس منٹ کی مہلت کے ساتھ اسے دوسرے کمرے میں لے گیا تھا۔

"سو جنت گل! میں نے نرم آواز میں کہا: فہرست پر تھکا رہے دستخط ہو چکے ہیں، تم زخمی حالت میں پولیس کو ملے ہو۔ زیادہ نہیں تو چار قاتل تو تمہارے کھاتے میں ڈالے جائیں گے۔ پھر جس کے لیے تم وفاداری دکھانا چاہتے ہو وہ وزیر داخلہ کے حکم پر ٹھیک بارہ بجے گرفتار کیا جا چکا ہے۔ منہ موت سے بچنے کا صرف ایک ہی راستہ تمہارے سامنے ہے۔ وعدہ معاف گواہ بن جاؤ؟"

"کیا واقعی ایک نواز گرفتار ہو گیا ہے؟"
 "ہاں خان! میں نے بتایا۔ اس کی گرفتاری کے بعد ریڈ کیا گیا ہے؟"

"ٹھیک ہے، مجھے یقین دلاؤ۔ پھر میں وعدہ معاف گواہ بن جاؤں گا؟"

"تمہارا بیان ہی ضمانت ہو گا خان! میں نے اُس کے شانے پر دوستانہ چھکی دی۔"

"صرف ایک سوال کا جواب دو اور پھر ہم ادھر چلیں گے۔ تم نے جو لڑائی رنگ باز خان کے گھر سے اٹھائی ہے وہ اب کہاں ہے؟"

"ادھر شادا گیا تھا! اُس نے بتایا: میں دوسری پارٹی کے ساتھ جاگیر خان کے گھر گیا تھا؟"

شادا کون ہے؟

"وہ بقایا جات وصول کرنے والا غنہ ہے ویسے میرا خیال ہے پروگرام کے مطابق لڑکیاں اندر سے ایئر بس لایا پھر بیچا دی گئی ہوں گی؟"

"شادا کہاں ملے گا؟"
 "وہ مکھا سنگھ اسٹریٹ کے ایک فلیٹ میں رہتا ہے۔"
 "شکر یہ خان! میں نے اس کا ہاتھ پکڑا اور دوسرے کمرے میں لے گیا۔"

جب ہم فلورنگ ہوئے تو تین بچے ولے تھے۔ زخمیوں اور لاشوں کے لیے پولیس کی ایک وین منگوائی گئی تھی۔

صبح سات بجے میں ہارون اور بیگن بولی فیملی اسپتال میں داخل ہوئے۔ رشیدہ سوئی ہوئی تھی یا بے ہوش تھی۔ بیڈ کے ساتھ ایک اینڈ تھا جس پر خون کی خالی پتیلی مٹی ہوئی تھی۔ ڈیوٹی نرس نے بیگن کی اجازت نہ دی۔ ڈیوٹی ڈاکٹر نے ہمیں باوثوق انداز میں بتایا کہ مضر و برکی حالت خطرے سے باہر ہے۔ کوئی مہلک زخم بھی نہیں ہے۔ ہارون اور بیگن کی حالت غیر ہو گئی تھی۔ ہارون نے خود پر قابو پایا تھا لیکن بیگن رشیدہ کے چہرے پر جھٹک کر ایسے دیا تھا جیسے کسی باپ کی اکوتی بیٹی مر رہی ہو۔

جنت گل کے بتائے ہوئے فلیٹ کے نیچے کارڈک کریں اور ہارون میرٹھیاں چڑھتے ہوئے تیسری منزل پر گئے۔ دروازہ ہلاک نہیں تھا، باہر چونکہ کل نیل کا بن نہ تھا اس لیے میں نے دستک دی یقین ہی نہیں آ رہا تھا کہ گردہ پر ٹوٹنے والی قیامت سے شادا بے خبر رہا ہو گا۔ جو سختی و خشک پر بولٹ کرنے کی آواز آئی۔ ہارون ریوالتور تانے سائیڈ میں کھڑا تھا۔ جونہی دروازہ کھلا ہارون بجلی کے شکار سے کی طرح لہراتا ہوا کھلتے کواڑوں سے ٹکرایا اور ایک طویل قامت نوجوان کو لیتا ہوا اندر چلا گیا تھا۔

میں نے بھی کھلے دروازے سے چھلانگ لگائی اور اندر جا کر پاؤں کی اٹھی ٹھوک سے دروازہ بند کر دیا۔ وہ شخص لڑکھڑا کر۔۔۔ سنبھل گیا تھا۔ کچھ تو نیند کا ہمارا اس پر طاری تھا۔ رہتی کسر چاہمک افتاد نے پوری کر دی تھی۔

وہ برزو اور کریمہ ندوخال کا مالک تھا۔ سیاہ چہرہ چپکے کے گہرے گول گول گڑھوں سے اٹا ہوا تھا اور ماتھے سے پچھلے ہونٹ تک زخم کی دو متوازی لکیریں تھیں البتہ وہ ایک کھائے ہوئے سڈل بدن کا مالک تھا۔

"تم کون لوگ ہو اور اس طرح اندر آنے کا مقصد؟ وہ ریوالتور کو گھومتے ہوئے بولا۔"

"ہم تمہاری موت کے ہر کارے ہیں؟ ہارون نے سرد آواز میں جواب دیا۔ اور ابل کے ہر کارے یوہتی اچانک ہی آنکرتے ہیں؟
 "کس کا اشارہ لے کر تھے ہو دوستو؟ اُس نے بڑے ہی ٹھہرے ہوئے لہجے میں پوچھا۔"

"کیا تمہارا نام ہی شادا ہے؟ میں نے غراتے ہوئے پوچھا۔ اور اس نے کراہت آمیز مسکراہٹ سے اثبات میں گردن ہلائی۔
 "میرے ساتھی نے اپنا تعارف کروا دیا ہے۔ تم بھی موت ہمارے ہاتھوں میں دیکھ رہے ہو لیکن یہ فیصلہ بدل بھی سکتا ہے؟
 "کس شرط پر؟"
 "تعافن اور دوستی؟"

"بیٹھ کر باتیں کریں؟ اُس نے کرسیوں کی طرف اشارہ کیا۔
 "زندگی جیسی شے کون خریدنا پسند نہیں کرتا، بتاؤ کیا چاہتے ہو؟"
 "کل رات تم رنگ باز خان کے گھر گئے تھے؟ میں نے اُس کی منہ آنکھوں میں آنکھیں ڈال دی، وہ ایک قدم پیچھے ہٹا اور پٹنگ کی پٹی پر اکڑوں بیٹھ گیا۔"

"کیا تم خرم سلطان جو بدری ہو؟ اس نے میری جانب دیکھا پھر ہارون کے سر پر کا جائزہ لینے لگا۔ تم دونوں میں سے خرم سلطان کون ہے؟"

"یہ میسر سوال کا جواب نہیں؟ میں نے اس کے پاؤں پر پاؤں مارا اور وہ کراتا ہوا اٹھا پھر بیٹھ گیا۔ بولو تم ہی وہاں گئے تھے؟
 "نہیں؟ اس نے نفی میں سر ہلایا اور ہارون کا اٹا ہاتھ اس کے چہرے سے ٹکرایا۔"

"ہم میزنی منڈی سے نہیں آئے؟ ہارون نے اُس کا گریبان جکڑ لیا۔ ہم بہت کچھ جان کر ہی ادھر آئے ہیں۔ اگر ہم اندر سے میں تیر چلائے والے ہوتے تو ہمارا رخ دوسرے راستوں پر ہوتا۔ بولو، تم گئے تھے نا؟"

"میں کہتا ہوں میں وہاں نہیں گیا تھا؟ اُس نے ہارون کی کلائی پر کٹ مارا جسے ہارون نے دوسرے ہاتھ پر روک لیا تھا۔ اس ہاتھ میں ریوالتور دبا ہوا تھا جو اچھل کر پٹنگ کی پائنتی جا پڑا۔ شادا نے ایک دم ترچھی کر وٹ بدلی اور ریوالتور لیتا ہوا نہ صرف اٹھا تھا بلکہ اٹھتے اٹھتے اس نے ہارون پر فائر بھی جھونک دیا تھا۔

گولی چونکہ بغیر نشانہ لیے چلائی گئی تھی اس لیے ادھر ادھر سے گزرتی ہوئی دیوار سے ٹکرائی اور ہارون اڑتا ہوا پٹنگ پھلانگ کر اس پر جا گرا تھا۔ دونوں ایک دوسرے میں اٹھتے دیوار سے ٹکرائے اور ہارون اس کے سینے پر سوار ہو گیا تھا۔ ہارون کی ۵۹ اجتماع

کوشش تھی۔ شادیاؤں پر جم کر کھڑا تھا اور لولہ کا سر بھی ٹھیک تھا۔ اگر وہ دوسرا فائر کر دیتا تو کوئی فضا میں اچھلتے جسم کو چھیدتی تھی۔ بارون کا ہاتھ اوپر اٹھا لیکن منزل مقصود ابھی دور ہی تھی کہ میں نے بارون کا جسم اوپر اچھلتے دیکھا۔ شاد نے اسے گھٹنوں اور ہاتھوں پر تول کر اچھال دیا تھا۔ بارون اچھلتا ہوا کرسی سے ٹکرایا اور شاد ابھی اوپر اٹھا پھر وہ جھک گیا تھا۔ شاید گرا ہوا لولہ اور مجھے جھکا ہوگا۔ اسی لمحے میرا سر کہ ٹوٹ گیا تھا کیونکہ اچانک ہی پچھلے نازک صورت اختیار کر گئی تھی۔

اگر میں اصل کی گردان یا دکر رہتا تو شاد میرے اصول کے حلق میں سودا کر دیتا۔ میں اسی لیے چپ چاپ تھا کہ دونوں برابر کے حریف تھے۔ میں اپنی جگہ سے فضا میں اٹھا اور دونوں پاؤں جوڑ کر شاد کے پشت پر مارے۔ وہ ڈکراتا ہوا فرش پر گر گیا تھا۔ میں نے اس کے بال منٹھی میں جکڑ کر ہلکا سا جھٹکا دیا۔ اس کے منہ سے بھی ہلکی سی سسکاری ابھری۔ پھر جھک کر میں نے اس کے پھیلے ہوئے دونوں بازو پکڑے اور ایک دم اٹھ کر کے آپس میں ملا دیے اور خود اس کی کمر پر دونوں پاؤں جکڑ کر کھڑا ہو گیا۔

”شادے! اب میں سوال کروں گا؟ میں نے پاؤں پر دباؤ ڈالا اور شادے کے حلق سے کرنک پتخ پتخ نکل گئی۔ یہ صرف نمونہ ہے پیارے۔ ہر سوال کے بعد تمہاری ریڑھ کا ایک مہرہ ٹوٹے گا۔ بولو رنگ باز کے گھر تم گئے تھے نا؟“

”ہاں... اے... وہ کہہ رہے لگا۔“ گیا تھا؟“

”وہاں نگران شخص کو بھی تم نے قتل کیا تھا نا؟“

”نہیں... نہیں... میکے ایک ساتھی نے؟“

”اب آخری سوال ہے لڑکی کہاں ہے؟“

”لاہور۔“

”بکواس نہیں شادے! میں نے جھٹکا دیا اور واقعی اس کی ریڑھ کا کوئی مہرہ نہ ٹوٹا گیا تھا۔ ہم نے تمام راستوں کی ناک بندی کر دی تھی۔ وہ لاہور نہیں گئی؟“

”جھ... جھوڑو... میں سب کچھ بتا دوں گا۔“

جب میں نیچے اترتا ہی وہ اسی پوزیشن میں پڑا رہا تھا۔ صرف ہاتھ اور ٹانگیں ہلکا کر جینے لگا تھا۔ میری کمر ٹوٹ گئی ہے۔ وہ بین کرنے والے انداز میں بولا۔ اب مجھے قتل کر دو۔ میں ایسی زندگی سے موت بہتر سمجھتا ہوں۔ نہیں بتاتا... مجھے ہلاک کر دو۔“

”تمہاری ہر خواہش پوری ہوگی شادے! بارون مجھے دھکیل کر آگے ہو گیا۔“

اس نے گھٹنوں کے بل بیٹھ کر شادے کا دایاں کان پتلی میں بھر دوسرے لمحے شادکتے کی آواز میں غسرایا اس نے دایاں گھٹنا پر پٹے شادے کے سینے پر مارا۔ اس کی آواز ایسے ہی رگ گئی تھی جیسے ریکارڈنگی موٹی مٹ گئی ہو۔

”اتنی آسان موت تمہیں نہیں دی جائے گی شادے! بارون کی آواز میں درندگی عود کر آئی تھی۔ جھسکا ہوا مہرہ اپنی جگہ آسکتا ہے مگر جو کچھ میں تمہارے بدن سے نکل کر الگ کر دوں گا وہ پھر واپس نہیں ہوگا! بارون نے پہلے اس کی ناک پر سیدھی ہتھیلی ماری پھر پٹکی میں پکڑ لی۔ صرصر آدھا منٹ! لولہ لڑکی کہاں ہے؟“

”لاہور لا... ہور! جب شاد بولا تو اس کی ناک سے خون کے جیلے ابھرے۔ لڑکیوں کو ایک بولنس میں بھیجا گیا ہے۔ ایک ڈاکٹر کی خدمات خریدی گئی تھیں۔ ڈاکٹر ساتھ گیا ہے۔“

”اسپتال اور ڈاکٹر کا نام؟“ بارون نے اس کی ناک جھوڑ دی۔

”ہولی کلیک ڈاکٹر عرفان آغا! شاد بولا۔ لڑکیوں کو زخمی کیا گیا تھا۔ ڈاکٹر کو بتایا گیا تھا کہ روڈ ایکسیڈنٹ ہوا ہے اور لڑکیوں کو ان کے گھر لے جانا ہے۔“

بارون نے چہرہ موڑ کر میری جانب سوالیہ نگاہوں سے دیکھا۔ میں شادے کی قسمت کا فیصلہ کرنے ہاں اور نہ کی چڑھائی اترائی کے عذاب میں تھا۔ قاتل بھی تھا اور ایک گواہ بھی۔ میں قاتل کو سزائے موت سنانا چاہتا تھا جبکہ ضرورت اسے گواہی کے لیے زندہ رکھنے کی پیل کر رہی تھی۔

”شادے! میں نے کہا: تمہیں بھی فوری طبی امداد کی ضرورت ہے۔ اگر ذہان بند رکھنے کا وعدہ کرو تو ہم تمہیں کسی اسپتال لے جا سکتے ہیں۔“

”میا میری نگاہ کھڑکی کے سردل پر رکھے ٹیلی فون سیٹ پر جا پڑی۔ میں نے اس کی کانبر ڈائل کیا۔ کسی خالقون نے بتایا کہ وہاں موٹے ہوئے ہیں۔ میں بھی ان کے ساتھ رات بھر مصروف رہا تھا۔ وہ ان ڈیوٹی تھے ڈیوٹی ادا کر کے سو گئے تھے لیکن میرے اندر آگ بھڑک رہی تھی۔ میرے فرض نے مجھ سے نیند اور سکون چھین لیا تھا۔ میں نے سلسلہ توڑا اور ڈی ایس پی کا نمبر ٹرائی کیا۔ میں نے اوپر سے نیچے کا سفر شروع کیا تھا لیکن ڈی ایس پی نے نہ صرف بیل دینے بلکہ کال بھی انھوں نے ہی اٹینڈ کی تھی۔ ان کی آواز میں نیند اور بے زاری کا شائبہ تک نہ تھا۔

”خترم سلطان بول رہا ہوں جناب۔“

”ہیلو بوائے! وہ خوش دلی سے بولے۔ میں تمہارے بارے میں ہی سوچ رہا تھا۔ ایک خبر کے لیے ڈی آئی جی تمہیں تلاش کر رہے ہیں۔ کچھ دیر پہلے انھوں نے فون پر بتایا تھا کہ خترم سلطان سے رابطہ نہیں مل رہا ہے۔“

”میں نے ابھی تک پشت بیڈ سے نہیں لگائی جناب۔“

”اس وقت کہاں ہو چوہدری؟“

”اپنے پیارے ساتھی سلو کے قاتل کے فلیٹ سے بول رہا ہوں۔“

”اوہ... اتنی جلدی!۔“

”بلکہ مجھے بہت دیر ہو گئی ہے سر۔ میں نے جواب دیا۔۔۔“

”کاش میں جلدی اس تک پہنچ جاتا۔“

”کیوں غمراہ ہو گیا ہے؟“

”نہیں سر۔ میں نے بتایا۔ لیکن لڑکیاں ہماری دسترس سے دور جا چکی ہیں۔ میں واپس جا رہا ہوں۔ آپ کسی ذمے دار آفیسر کو بھیج کر اسے قتل اور اغوا کے جرم میں اٹھوائیں۔“

”اوہ کیا زخمی ہے؟“

”جی ہاں۔ زبان کھلوانے کے لیے کچھ توڑ پھوڑ کرنا پڑی تھی۔“

”ٹھیک ہے، مجھے ایڈریس کھوادو اور تم میرے گھر چلے آؤ۔ ناشتا میرے ساتھ۔۔۔“

میں نے انھیں ایڈریس لکھوا دیا اور پھر دروازہ باہر سے لوٹ کر کے ہم واپس چل پڑے۔ گراؤنڈ منزل کی ڈکائیں کھل رہی تھیں۔ ایک لڑکے کو ٹرے میں ناشتے کا سامان لیے سیرھیوں کی جانب بڑھتا دیکھ کر بارون رگ گیا تھا۔

”کیا شادے کے لیے ناشتے جا رہے ہو؟“

”جی ہاں صاحب! لڑکے نے جواب دیا۔“

”وہ نہیں ہے۔ تالا لگا ہوا ہے۔ سنا ہے لاہور چل گیا ہے؟“

بارون نے کہا۔

”اچھا جی! لڑکا پٹ گیا۔“

”اب کیا پروگرام ہے چیف؟“ بارون نے کار کا دروازہ کھولتے ہوئے پوچھا۔

”بارون! میں نے پوچھا! ہمارا سلو کس مذہب سے تعلق رکھتا تھا؟“

”قوم کے حوالے سے اسے بد مذہب ہونا چاہیئے۔ ہو سکتا ہے ہندو رہا ہو۔“

”اس کی لاش سفارت خانے کے توسط سے سری لنکا بھجوائی

ہو گئی۔“

”آپ اب کچھ دیر آرام کریں گے سر! بارون نے مؤدب آواز میں کہا۔ میں اور ماسٹر تمام انتظامات دیکھیں گے۔ یہاں لاہور کے لیے بھی کچھ کرنا ہوگا۔“

”کرنا نہیں پیارے لاہور جانا ہوگا؟ میں نے پر زور انداز میں کہا۔ میں شینہ گل کی بازیابی تک کوئی دوسرا کام نہیں کر سکتا۔“

”ڈاکٹر عرفان آغا کی واپسی تک یہیں انتظار کرنا پڑے گا چیف۔“

”ہاں! میں نے چوک کے دائیں بائیں دیکھا۔ ذہن بھر الجھ گیا تھا۔ ڈی ایس پی نے بلایا تھا اور سلو کی لاش بھی اسپتال میں بے کفن پڑی ہماری راہ تک رہی تھی۔

”ڈی ایس پی کے گھر چلو! میں نے خبر سننے کا فیصلہ کرتے ہوئے کہا۔ انھوں نے کسی خبر کا ذکر کیا تھا۔ خبر کا رد بھی ہو سکتی تھی۔ پھر مجھے نہیں تو بارون کو ناشتے کی طلب ضرور ہو گئی۔ چوک پر کھڑے ساجنٹ سے میں نے ڈی ایس پی کے گھر کا پتہ معلوم کیا اور بارون بغلی مٹرکوں اور گلیوں سے ہوتا ہوا دس منٹ میں وہاں لے گیا تھا۔ کار پورچ میں روک کر ہم اتر رہے تھے کہ لان سے صاحب نکل آئے۔ بڑے ہی تپاک سے ملے اور مجھے اپنی باتوں میں لے کر اندر لے گئے تھے۔

ناشتے تک وہ ادھر ادھر کی باتوں سے وہ ہمارا دل بہلاتے رہے۔ مجھے پہلی بار کسی پولیس آفیسر سے محبت کا احساس ہوا تھا۔ میں نے سوچا بھی نہ تھا کہ یونیفارم کے نیچے دھڑکتے دل بھی ہمدرد ہو سکتے ہیں۔ وہ بھی نفسیاتی ٹریٹمنٹ دیتے رہے تھے اور سچ تو یہ ہے کہ ان کی کوشش باتوں نے دل میں اٹھتی ہوئی کو بڑی حد تک دبا دیا تھا۔

ناشتا پُر تکلف ہی نہیں واقف قرار میں بھی تھا۔ شاید ان کے علم میں یہ بات رہی ہوگی کہ ہم رات سے مجھ کو گھوڑوں کی طرح دوڑتے رہے ہیں۔ ہم نے پیٹ بھر کر ناشتایا اور پھر اٹھ کر ڈرائنگ روم میں بیٹھ گئے۔

ٹیلی فون کی گھنٹی کا بڑبڑاہی لگنا یا انھوں نے جھجک کر ریسور اٹھا لیا۔

”ڈی ایس پی بول رہا ہوں... اوہ! ان کے حلق سے دینی دینی چیخ ابھری۔ ٹھیک ہے، لاش سپر صابن اٹھالے جاؤ۔“

”ریسور رکھ کر میری جانب دیکھ کر بولے۔ شادے نے خود کشی کر لی ہے؟“

”ان کی آنکھوں میں الجھن اور شک تیرتے لگا تھا۔“

”شاید نہیں سڑ میں نے پر زور آواز میں کہا: اگر ہم اُسے مارے تو خاموشی سے نکل جاتے۔ میں اُسے بطور گواہ پیش کر سکتا تھا۔“

”خیر چھوڑو! وہ ہاتھ اٹھا کر بولے: سانپ خود میرے یا کوئی ہاتھ اُسے کچل دے، کوئی فرق نہیں پڑتا۔ ہمارے پاس گواہ بہت ہیں۔“

”آپ نے کسی خیر کا ذکر کیا تھا سڑ؟“

”ہاں۔ ملک نواز دیویش ہو گیا ہے۔“

”میکر دل پر بھر پور گھوٹا لگا اور میں بت بنا ڈی ایس پی کا چہرہ تکتا رہ گیا۔“

”پولیس سرگرمی سے چھاپے مار رہی ہے۔ تمام روٹس کی نگرانی کی جا رہی ہے۔“

”مجھے پہلے ہی شک تھا سڑ میں نے کھولتی ہوئی آواز میں کہا: پولیس تو تیسرے درجے کے بد معاش کو بھی چھاپے سے آگاہ کر دیتی ہے۔ وہ تو ایک بین الاقوامی غتہ ہے۔“

”میں تردید یا تصدیق نہیں کروں گا: وہ بولے: عوام کی رائے یہی ہے۔ لیکن ملک نواز کے اور بھی ذرائع ہیں۔ رات جو کچھ بولے وہ بے خبر نہیں رہ سکتا تھا۔ اس کے سامنے آدمی ہلاک نہیں ہوئے ہوں گے۔ ہمارے ہوتے کسی شخص نے خبر پہنچا دی ہوگی۔ اگر کارروائی کسی سڑک پر ہوتی، کسی دوسری جگہ ہوتی تو ملک کا دامن صاف رہتا مگر کڑی گواہ کے اندر ہونے والی کارروائی کو وہ نظر انداز نہیں کر سکتا تھا۔ وہ حالات کا جائزہ لینے انڈر گراؤنڈ ہو گیا ہے۔ ہمیں یہ بیان کر بھی دیتے ہوگی کہ پہلی بار آئی جی صاحب برفنس نفیس کمانڈ کر رہے ہیں۔ جب پولیس کا سربراہ خود باہر نکل آیا ہے تو مفاد پرست بھی اپنے مفادات کو بھول جائیں گے۔“

”شاید ایسا ہی ہوگا۔ میں نے ناخوشگوار لہجے میں کہا: لیکن جو مرتا ہے اُسے ہی جنت دونے کا فیصلہ سننا پڑتا ہے۔ میں خود لاہور جاؤں گا۔ جو آگ میرے سینے میں دھک رہی ہے اس کی پیش کوئی اور محسوس نہیں کر سکتا۔ وہ لڑکی میری پناہ میں تھی۔ وہ کیا سوچتی ہوگی میرے بارے۔۔۔۔“

”اگر وہ جہانگیرہ ہے تو اُسے تمہاری مجبوریوں کو مد نظر رکھنا ہوگا۔“

”نہیں وہ صرف ایک معصوم گھر کی قسم لڑی ہے۔ میں نے بتایا: اُسے تو یہ بھی نہیں معلوم کہ اس کے مرنے والے باپ کا اصل دھند کیا تھا۔“

”جرائم پیشہ لوگ عموماً گھر اور بزنس کو الگ الگ ہی رکھتے ہیں۔“

ڈی ایس پی نے نرم آواز میں کہا: سیلان سیٹھ مال کے لیے سعادت مند تھا۔ ماتحتوں کا بھرد آقا اور سوسائٹی کا محترم تھا۔ ان لوگوں کے کئی روپ اور چہرے ہوتے ہیں۔ حسب ضرورت وہ چہرے بدلتے رہتے ہیں، ملک نواز کا شمار بھی ایسے ہی بچروں میں ہوتا ہے۔ صرف ہم جانتے تھے کہ وہ کیا ہے اس کا دوسرا روپ کیسا ہے۔ وہ عوام کے نزدیک ایک سیاست دان ہے۔ میرا تو خیال ہے کل تک پرائم منسٹر صاحب بھی اس کے دوسرے روپ سے نا آشنا رہے ہوں گے۔“

”مجھے آئی جی سے بات کرنے کی اجازت دیں گے آپ؟“

”کیوں نہیں: ڈی ایس پی نے مزید بیان آواز میں جواب دیا۔“

”لیکن میرا مشورہ ہے پہلے ڈی آئی جی صاحب سے بات کر لو۔ وہ تمہیں کال کرتے رہے ہیں۔“

”بہتر جناب: میں نے کہا اور ہارون نے ٹیلی فون سیٹ اپ لینڈ سے اٹھا کر میسر سامنے رکھ دیا۔“

”کال کسی ملازمہ نے سنی اور اس نے بتایا تھا کہ صاحب آفس کے لیے روانہ ہو چکے ہیں۔ میں نے دس منٹ توقف کیا پھر ان کے آفس کا نمبر ملا یا۔“

”ڈی آئی جی اسپیکنگ: مالوس آواز سنائی دی۔“

”ختم سلطان عرض کر رہا ہوں سڑ۔“

”اوہ۔ میں صبح سے تمہاری تلاش میں ہوں۔ رشیدہ کیسی ہے؟“

”بقول ڈاکٹر خط سڑ سے باہر ہے سڑ۔“

”میں نے ایم ایس صاحب سے خصوصی توہم کی درخواست کی تھی: وہ بولے: ہاں تمہیں بتانا تھا کہ ملک نواز تا حال گرفتار نہیں کیا جاسکا۔ رات سے اب تک اس کے گروہ کے پندرہ آدمی پکڑے جا چکے ہیں۔ ان کی رہنمائی پر ملک گیر کارروائی جاری ہے۔ یہاں جنت گل سے حد کار آبدار ثابت ہوا ہے۔ چند اور گواہوں کو سیل کیا گیا ہے اور کچھ لوگ گرفتار بھی ہوئے ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ جب یہ تین آدمی درخت گرے گا تو دور دور تک پھیلی ہوئی جڑیں بھی متاثر ہوں گی لیکن اوپر کے حکم کے تحت ہم نے فی الحال دائرہ کار پنجاب تک محدود رکھنے کا فیصلہ کیا ہے۔“

”میں اور ہارون لاہور جانے کی اجازت۔۔۔“

”نہیں چوہدری: میری بات کاٹ کر وہ بولے: ابھی یہاں تمہاری ضرورت ہے۔ ہم ذاتی بندوبست سے بالآخر ہر قوم کی خدمت کر رہے ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ خان کی بیٹی جہاں بھی ہوگی محفوظ رہے گی۔ ان حالات میں ملک نواز کوئی حماقت کرنے کی پوزیشن میں نہیں ہے۔ آئی جی صاحب سرگرم عمل ہیں۔“

”سر! میں خود کو برتر تو نہیں سمجھتا لیکن مجھے پولیس کی سرگرمی اور طریقہ کار سے ہمیشہ سے مجھے اختلاف تھا۔ آپ تسلیم کریں گے کہ جاگیر خان یہاں تھا۔ وہ یہاں سے ملک گیر پیمانے پر منشیات کی سپلائی بھی کر رہا تھا لیکن پولیس اور انسداد منشیات کے دیگر اداروں نے گلستان کالونی کا کبھی رخ نہ کیا۔ یہ نہیں کہ سب ہی بدویات اور مفاد پرست ہیں بلکہ محکمہ طریقہ کار سست اور لاغر ہوتا ہے۔ میں خان کی بیٹی کو بھی اسی طرح تلاش کروں گا جس طرح جاگیر خان اور گودام کو تلاش کیا ہے۔“

”مجھے یقین ہے بیٹے: وہ پر شفقت لہجے میں بولے: تم جو کہتے ہو وہی کر دکھاتے ہو۔ لیکن میں تمہیں ذاتی طور پر وہاں جانے کا مشورہ نہیں دوں گا۔ پولیس کو پہلے کوشش کر لینے دو نیز تمہیں آج وزیر داخلہ کے ہمراہ پرائم منسٹر سے ملاقات کرنے جانا ہوگا۔ انھوں نے فہرست دیکھ کر حیرت اور خوشی کا اظہار فرمایا ہے اور اس کا میانی کو سراہتے ہوئے تم سے ملنے کی خواہش ظاہر کی ہے۔“

”کیا میں انعام اور ستائش وصول کرنے کا اہل ہوں سڑ؟“

”کیوں نہیں ختم۔“

”نہیں سڑ: میں نے معذرت خواہانہ انداز میں کہا: میرے کندھوں پر ندامت کا بار گراں ہے میں رنگ باز خان کی روح کا مجرم ہوں۔ میں نے سرخرو سے اور اس کی معصوم بیٹیوں کی حفاظت کا وعدہ کیا تھا۔ ان کی سلامتی کی ضمانت دی تھی۔ مجھے اجازت دیجیے جناب، میں پہلے اس فرض سے سبکدوش ہوں پھر انعام حاصل کروں گا۔“

”شام تک بھی مہلت نہیں دو گے؟“

”میں نے اجازت طلب کی ہے سر! اب ضروری ہے کہ اسی وقت روانگی کا قصد کروں جب آپ اجازت دیں گے۔“

”شکر ہے چوہدری: وہ معنون آواز میں بولے: میں بحیثیت بزرگ مشورہ دوں گا۔ اب گھر جاؤ اور کچھ دیر آرام کر لو۔“

”میں آپ کی محبت اور شفقت کا شکر گزار ہوں محترم: میں معنون لہجے میں بولا: اب تک انسان ہونے کے ناتے مجھے آرام کی شدید ضرورت ہے۔ نیند سے میری آنکھیں جل رہی ہیں اور تھکن سے بدن ٹوٹ رہا ہے۔ میں کسی دھن سے بے آرامی کا شکار ہوں۔ لیکن میں آرام نہیں کر سکتا۔ اپنے آنجنابی ساتھی کی لاش اُس کے وطن بھجوانے کے انتظامات کرنا ہیں۔ رشیدہ اسپتال میں پڑی ہے اور جو ڈاکٹر رشیدہ گل کے ساتھ لاہور گیا ہے اس کی واپسی کا انتظار کرنا ہے۔ کتنے کام ہیں جناب۔“

”یہ تمام کام میسر سپر دکر دیئے۔“



”آپ کی اپنی پیشہ ورانہ ذمے داریاں ہیں جناب: میں نے کہا: اگر آپ نے ختم سلطان کی جگہ سنبھال لی تو آپ کی خالی جگہ کون پُر کرے گا۔ نہیں جناب ہمیں اپنی اپنی جگہ اپنا فرض ادا کرنا ہوگا۔ بہر کیف میں شام تک ادھر ہی رہوں گا۔“

”اگر آرام نہیں کرتے تو دوپہر کا کھانا میرے ساتھ کھا لینا۔“

”وعدہ نہیں سڑ: میں نے معذرت طلب لہجے میں کہا۔“

”اگر فرصت ہوئی تو آ جاؤں گا۔“

”میں نے سلسلہ منقطع کیا اور پھر رنگ باز خان کے گھوکا فون نمبر ملا یا۔ مجھے امینہ گل کی فکر کھائے جا رہی تھی۔ وہ تھینے اور رشیدہ کو نہ پا کر بیگن سے پوچھ رہی ہوگی۔ میں نے اُسے گھر سے سانچے سے بالکل بے خبر رکھا ہوا تھا۔“

”ہیپو! امینہ کی خلاف توقع آواز سن کر لحظہ بھر میرے مُنہ سے آواز نہ نکلی۔ اُسے میں نے بیڈروم تک محدود رہنے کی ہدایت دی تھی۔“

”ہیپو پیارے بی بی: کیا ٹیلی فون سیٹ تمہارے بیڈ میں چلا گیا ہے؟“

”جی ہاں، اگلے یہاں رکھ گئے ہیں۔“ امینہ نے بتایا: اب آپ بتائیں یہ سب لوگوں کو کیا ہوا ہے۔ باتیاں بھی واپس نہیں آئیں۔ آپ صبح سویرے چلے گئے ہیں اور انکل مجھ پر ایک انگریز کا پہرہ بٹھا کر چلے گئے ہیں۔ آپ بتاتے کیوں نہیں، کیا ہوا ہے؟“

”جان برادر! میں نے پیار سے کہا: آپ کے ڈیڈی سرخرو کے ایک حریف نے حملہ کیا تھا۔ خدا کا شکر ہے کہ سب ٹھیک رہا ہے۔ رشیدہ اور رشیدہ گل کے دوران فرار ہو گئی تھیں کیونکہ خطہ

عرفت تھینے کے لیے اندر داخل ہوا تھا۔ وہ دونوں محفوظ پناہ گاہ میں موجود ہیں۔

پھر میں یہاں کیوں ہوں؟

اس لیے کہ وہ فخر آپ کا ہے بے بی جان، ہم دشمن کو یہ تاثر دینا چاہتے ہیں کہ خان مرحوم کی بیٹی غائب ہو گئی ہے۔ پیلیے مان لیا، امینہ لولی، علانکہ بات کچھ اور ہے، خیر چھوڑو۔ جب آپ کہہ رہے ہیں تو ٹھیک ہی ہوئی، آپ کب واپس آئیں گے؟ کسی بھی وقت، اچھا اپنے محافظ کو فون پر بلاؤ۔

چیف، وہ اس کے ساتھ گئے ہیں۔

ہنٹ کا کچھ پتا چلا؟

میں سر ہنٹ اور ہارڈن سپیڈ کو واپس آپ کے پاس؟

ایک ڈاکٹر کا پتہ لٹ کر ڈکنز اور ہارڈن کی ڈیوٹی لگاؤ۔ وہ ڈاکٹر کے بارے میں معلومات حاصل کرے اور پھر دونوں بادی بادی اس کلینک کی نگرانی کریں گے۔

بہتر جواب: کوئٹہ نے جواب دیا: ایڈریس بتائیں۔

میں نے ڈاکٹر عرفان آغا کا ایڈریس اسے بتایا اور سیوریو رکھ کر ہارڈن کو واپسی کا اشارہ کیا۔

ڈی ایس پی راجداری کے موٹر سائیکل کے پھر ہم سے مصافحہ کر کے رک گئے، چھ میٹر تھیں، آخر جو نہیں ہم سنتے کی بات سے نکلے

میں نے ایک شخص کو گیارہ کے عقب میں ہوتے دیکھا۔ ہارڈن نے بھی اسے دیکھ لیا تھا۔ وہ دوڑتا ہوا آگے نکل گیا تھا۔

کوئی گڑبڑ ہے چیف؟ جب میں اپنی کار کے قریب پہنچا

تو ہارڈن واپس آکر بولا: وہ کمپاؤنڈ وال پھلانگ گیا ہے۔ باہر مصروف

فٹ پاتھ ہے اور کوئی جنازہ چلا رہا ہے؟

وہ باتیں کرتے کرتے ایک دم کار پر جھک گیا تھا اور پھر اس

نے عجات میں ہونٹ کھول لیا۔

ادھر دیکھ چیف؟ اس نے انگلی سے اشارہ کیا۔ سگار سٹا

ٹائم بم کار کے انجن کی تاروں سے منسلک تھا۔ ہارڈن نے بڑی

احتیاط سے سٹون ٹیپ کی گرفت سے ٹائم بم نکال لیا اور فوراً

لان کی جانب اچھال دیا۔

نکل چلیے چیف؟ اس نے ہونٹ بند کرتے ہوئے کہا۔

نہیں ہارڈن؟ میں نے انکار کرتے ہوئے کہا: ڈی ایس پی

کو بتانا ضروری ہے: مالی ہماری باتیں سن کر جو نہیں باڑھ کے قریب آیا میں نے اسے روک دیا اور پیچھے ہٹ جانے کا حکم دیا۔ وہ بیچارہ کچھ نہ سمجھتے ہوئے واپس ہٹ گیا تھا۔

میں نے اندر جا کر ڈی ایس پی کی صورت حال سے آگاہ کیا

اور انھوں نے فوراً کسی کو فون پر کال کر لیا تھا۔

ٹھیک ہے، تم لوگ جاؤ: وہ بولے۔ میں ہم بے اثر کردوں

گالیکن محتاط ہو کر جانا جو لوگ اندر داخل ہوئے ہیں وہ باہر بھی

ہوں گے؟

ہارڈن نے ایک بار پھر کار کا تفصیلی جائزہ لیا اور پھر مجھے

یہ ٹھننے کی اجازت دی تھی۔ گیٹ سے نکل کر اس نے دائیں بائیں

دیکھا۔ پھر دائیں ٹرن لیتا ہوا سرنگ پر چڑھ گیا تھا۔

سرنگ پر ٹریفک کا ازدحام نہیں رہا تھا۔ ہارڈن بڑی

مہارت سے گاڑی بجاتا ہوا اور ٹریفک کرتا آگے بڑھتا چلا جا رہا تھا

کہ کالے پہلے چپکی لی، پھر ہچکولے کھانے لگی۔ ہارڈن اس

وقت تیسری دوپہر میں دائیں جانب تھا، اس نے دائیں جانے کے

لیے انڈیکٹر کا بٹن دبایا اور ٹریفک سے راستہ لیتا ہوا آہستہ آہستہ

بائیں سرنگ پر چلا گیا۔

پھر بھی بائیں فٹ پاتھ پر جاتے جاتے کار ایک چوڑے

ایک چلی گئی تھی۔ ہارڈن نے بائیں جانے والی ایک تنگ سرنگ پر

ٹرن لیا اور پندرہ بیس گز چل کر کار سائڈ میں لگا دی۔ اس سرنگ

پر بھی ٹریفک رواں تھا لیکن دشمن نہ تھا۔ جس جگہ کار ٹرنی تھی اس کے

ساتھ تھمتی قائم تھا۔ زمیری میں مالی اور خسریدار گھوم پھر رہے

تھے۔ ہارڈن نے پیچھے اتر کر ٹائروں کا معائنہ کیا: کسی نے دائیں

دھیل کے ٹٹ ڈھیلے کر دیے ہیں۔ خدا کا شکر ہے صرف ایک ہلٹ

پھنسا رہا ہے؟

میں بھی کھٹے دروازے سے اتر کر دھیل پر جھک گیا تھا۔

واقعی صرف ایک ہلٹ پٹ پیسے کو روک رکھا تھا۔ اگر وہ بھی گریبا

تو ہماری کار ٹریفک کے دیوڑ میں ہچکولے کھاتی دوسری گاڑیوں

سے ٹکر کر چکنا چور ہو جاتی۔

اب کیا ہوگا پیارے؟

دوسرے دھیل سے ایک ایک ٹٹ نکال پڑے گا: ہارڈن

ٹول بکس کی جانب بڑھتے ہوئے بولا۔ پھر اس نے ٹول بکس سے

اوزار اور جیک نکال کر سرنگ پر رکھ دیے اور پیچھے پیچھے کاٹ

کھولنے لگا۔ میں کار سے ٹیک لگائے اسے دیکھ رہا تھا اور دل

ہی دل میں شرمندہ ہو رہا تھا کہ میں اس فن میں اتنا ناڈی آنسر

کیوں ہوں۔

اس نے ہونٹ اتر کر میری جانب بڑھایا اور ابھی وہ اگلے

پہیے کی طرف جانے کے لیے نیم استادہ ہوا تھا کہ میری کمر سے

کوئی سخت شے ٹکرائی اور پھر مجھے ہلٹ کر دیکھنے کی ضرورت ہی نہ

رہی تھی کیونکہ ایک نال ہارڈن کی گردن چوتھی نظر آ گئی تھی۔

نیزم سلطان؟ ایک مانوس آواز سن کر میرے جسم میں

سنسنی کی لہر دوڑ گئی تھی۔ میں اپنے دوستوں اور دشمنوں سے

بالمشافہانہ کا قد دیکھ کر مننے کا فیصلہ کیا کرتا ہوں۔ اس حوالے سے

تمہیں خود پر فخر کرنا چاہیے۔ تمہاری ملاقات کے لیے میں بائی اٹر

یہاں آیا ہوں؟

میں نے آہستہ آہستہ چہرہ گھمایا، ایک بوڑھا سینے پر ہاتھ

باندھے مسکرا رہا تھا۔ چار آدمی تھے۔ دو بوڑھے کے دائیں بائیں تھے

اور دو نے مجھے اور ہارڈن کو گور کر رکھا تھا۔

ہارڈن نے رات جو عارضی میک اپ کیا تھا صبح اس کی

ضرورت نہ تھی اس لیے وہ اپنی اصل شکل میں تھا۔ اس نے

بھی ہونٹوں کے زوپ میں بونے ولے کو یقیناً پہچان لیا تھا۔

”ملک صاحب؟“ ہارڈن پانہ انگلی میں کھاتے ہوئے بولا۔

”بزرگوں سے سنا تھا کہ جب سانپ کو اجل پکا رہتی ہے تو وہ

بل سے نکل کر راستے پر آجاتا ہے؟“

بزرگوں نے سچ کہا تھا ہارڈن؟ ملک نواز استہائیر لہجے

میں بولا۔ انھوں نے یہ بھی تو کہا تھا کہ نادان بچوں کو آگ سے

نہیں کھیلنا چاہیے؟

”ملک صاحب؟“ میں نے ٹھوس آواز میں کہا: کیا مذاکرات

سہرا رہی ہوں گے؟

”نہیں پیارے؟ ملک نواز بولا: ہم نے گول میز کانفرنس

کی جگہ منتخب کر لی ہے، بھلا تم جیسے شخص سے مذاکرات سہرا رہے

جاسکتے ہیں؟ اس نے دائیں جانب دیکھا: عبداللہ خان معزز

مہاتوں کو کارڈنگ لے چلو؟

ہارڈن نے میری جانب دیکھا اور میں نے طویل سانس

لے کر اثبات میں گردن ہلا دی تھی۔



ہارون

نے بیکیں چمکا کر غور سے میری آنکھوں میں

دیکھا جیسے اسے یقین ہی نہ رہا تھا کہ

خرم سلطان مصروف سرنگ اور دن کی روشنی میں ایک مجرم کے سامنے

غیر مشروط ہتھیار ڈال رہا ہے۔ اس کی یہ سوچ بلاوجہ نہ تھی چھ

ساتھ قانون، مصروف سرنگ اور دن کی روشنی تھی لیکن وہ شاید بھول

رہا تھا کہ مجرم کون ہے۔ وہ یہ بھی فراموش کر رہا تھا کہ جو کانڈرکٹیاں

جلا کر میدان میں اترتا ہے وہ نفع نقصان اور موت و زندگی کے

تمام جذبے بھی آگ میں جھونک دیتا ہے۔ ملک نواز کوئی تیسرے

دوسرے درجے کا غنڈہ نہ تھا۔ اس کی گرفتاری کا حکم کسی تھلے دار

نے جاری نہیں کیا تھا بلکہ ملک کے سربراہ نے اس کے وارنٹ پر

دستخط کیے تھے۔ پنجاب کی پولیس فورس نے تمام راستوں پر پہرہ بٹھا

دیا تھا اور وہ انہی راستوں میں سے کوئی راستہ خرید کر پھنڈی آن

پہنچا تھا۔

اسے پل پل کی خبر رہی ہوگی، اسے بتایا گیا ہوگا کہ اس کا

گودام سیل ہو چکا ہے اور سربراہ حکومت نے اس کی ذات کا شیش محل

مسکد کرنے کا حکم دے دیا ہے۔ ایسی حالت میں وہ مصلحت اور احتیاط

بہیں برت سکتا تھا۔ وہ مر رہا تھا اور مرتے مرتے اپنے قاتل کا

سینہ چھلنی کرنے سے اسے کوئی طاقت نہ روک سکتی تھی... اور

میں مصروف سرنگ پر ترمیم کرنا خود مرنا چاہتا تھا نہ ہارڈن

جیسے وفادار ساتھی کو مرتے دیکھ سکتا تھا۔

اس نے مذاکرات کا ذکر کیا تھا۔ اگر اسے موت کی سزا دینا

مقصود ہو تو وہ لاہور سے پٹنڈی تک جلتے راستوں کا سفر بھی

اختیار نہ کرتا، کسی بھی گڑھے کو موت کا پروانہ نہ سکتا تھا۔

”ملک صاحب ہماری گاڑی کسی درکشپ تک پہنچا دیجیے گا۔“

میں نے سر ہنڈی کے کھٹے دروازے کو تھپ تھپاتے ہوئے کہا۔ ملک نواز

نے ایک باڈی گاڑ کو اشارہ کیا اور ہارڈن کی کشت پر ایسے ہاتھ پھیرنے

لگا کہ دیکھنے والے یہی سمجھیں کہ کوئی مہربان بزرگ اپنے بیٹے کو شفقت

سے رہا ہے۔

”حیرت انگیز تہہ بلیاں دیکھ رہے ہوں۔“ ملک نواز بولا: ہارڈن تم

ملازمت کا جوا اٹا کر ادھر آئے ہو یا میرا بیٹا خرم سلطان تمہارے

ڈیپارٹمنٹ کو بلا ہے؟

”اتنا پیار اور اپنائیت نہ جتائیں ملک صاحب؟“ میں نے

ہارڈن کو جگہ دیتے ہوئے کہا: ورنہ گلے پر چھری پھیرتے وقت آپ

کے ہاتھ کانپ جائیں گے۔ بہ رضا و طہت چھری چلائے اور بلاشت

کرنے والے اللہ کے مقبول ترین بندے ہوتے ہیں اور ہم کہہ نگار

دنیا دار بندے اتنی کڑی آزمائش سے سرخ رو نہیں ہو سکتے۔
 "اگر اس آزمائش سے گزرنا پڑا تو تم دیکھو گے میرے پیارے
 ملک نواز کا حوصلہ اور ہاتھ کتنے مضبوط ہیں۔ ہاں ہارون تم نے جواب
 نہیں دیا۔ میری حیرت دُور کرو عزیزم اگر خرم سلطان سرکاری یونی
 پر ہے تو مجھے کچھ ترمیم کرنا پڑے گی۔"
 "وفادار یاں خریدنے والے شخص کو ایسا سوال نہیں کرنا چاہیے
 ملک صاحب۔ میں نے ہارون کو مذہب میں مبتلا دیکھ کر ملک
 کو جواب دیا۔ اگر پولیس کے بڑے بڑے آفیسر اپنی وفاداریاں خیریت
 کر سکتے ہیں تو اس بہتی لنگا میں ہارون ہاتھ کیوں نہیں دھو سکتا۔
 ہارون کی خدمات میں نے مستعار لی ہوئی ہیں۔"
 "یقین نہیں آتا انسپکٹر ہارون ہاتھ دھو سکتا ہے۔ ملک نواز
 بڑبڑانے لگا۔ گندے ہاتھوں کو دھویا جاتا ہے جب کہ میں ہارون
 کے ہاتھوں سے واقف ہوں۔"
 "ایک بات بتائیں گے ملک صاحب۔۔۔؟ ہارون لپ لپا۔
 "ہاں بولو۔۔۔" ملک نواز ڈرائیور کو کارا شارت کرنے کا اشارہ
 کرتے ہوئے بولا۔
 "کیا مجھے معلوم نہ تھا کہ ملک نواز کا اصل دھندہ کیا ہے؟
 "سب کو معلوم تھا۔۔۔"
 "تو پھر میرے ہاتھ صاف کیسے رہتے تھے؟ ہارون نے کہا۔
 "جب کہ میرے فرائض میں ایسے شخص کا محاسبہ کرنا شامل تھا لیکن
 میں نے جان بوجھ کر چشم پوشی سے کام لیا ہے۔ یعنی میں اپنے فرائض
 سے غفلت برتنے لگا ہوں جو شخص ملک نواز کے مفادات کی حفاظت
 کرتا رہا ہو وہ بھی بالکل مفت اُسے اگر کوئی خرم سلطان مقول
 معاوضے پر خرید لے تو کسی کو حیرت نہیں ہونی چاہیے۔"
 "کیا لاہور میں بھی تم ساتھ تھے ہارون؟
 "نہیں۔۔۔" ہارون نے گردن ہنسی میں ہلائی۔ "میری ڈیوٹی
 رنگ بازار خان کے گھر کی نگرانی پر تھی لیکن میری ذرا سی کوتاہی نے
 وہاں آپ کو کامیابی سے بھگا کر دیا۔۔۔"
 "زندگی تمہیں وہاں سے ہٹانے گئی تھی ہارون۔ ملک نواز
 بولا۔ "جو شخص وہاں تھا اُس سے زندگی چھین لی گئی۔۔۔ اگر وہ
 لاش تھاری ہوتی تو مجھے دکھ ہوتا۔ میں ماضی کے دفا داروں کو
 فراموش نہیں کیا کرتا۔"
 کار جو پہنی ڈھیری جن آباد کی ایک کوشی کے کپاؤ بند وال میں
 داخل ہوئی تو میری نگاہ چند منٹ اندر پڑی جو برساتی میں کھڑے
 تھے۔ کار کے رکتے ہی انھوں نے فوراً ہمیں گھیرے میں لے لیا۔

پہلے ملک نواز اُترا۔ ایک شخص نے رائفل کے بٹ پر ہاتھ مار کر اُسے فوجی
 طنز کی سلامی دی۔
 "ہمالوں کو سات نمبر میں لے جاؤ اور خدمت کے لیے دس
 آدمی لگا دو۔" ملک نے سلامی دینے والے سے کہا۔ غفلت کی وجہ
 میں نوگرد میں تم پیش کر دے اور دسویں گردن میں خود اتار لوں گا جو
 تھادی گردن ہوگی۔ ہارون نے مجھے کہنی کا ہتھوکا مارا، نہ جلنے وہ
 کیا کہنا چاہتا تھا کہ اُسے باہر گھسیٹ لیا گیا۔ ملک نواز برساتی کے
 ستون سے ٹیک لگنے زیر لب سکرانے لگا۔
 "ملک نواز۔۔۔" ہارون کے حلق سے سرد و غراہٹ اُبھری۔
 "ان لوگوں کو تمیز بھی سکھاتے جانا ورنہ۔۔۔"
 "سوری ہارون۔۔۔" ملک نواز ہنس پڑا۔ یہ اُس اسکول میں
 کبھی دخل نہیں ہوئے جہاں تیز کا درس دیا جاتا ہے۔ دیوہیل
 شخص نے ہارون کی پشت پر سیدھا ہٹ مارا اور ہارون نے
 چشم زدن میں پلٹ کر اُس کی ناک پر سیدھی مک ماری۔ وہ ہچکچلے
 کھٹا ہوا کئی فٹ م پیچھے چلا گیا۔ پھر اس سے قبل کہ ہارون کوئی اور
 قدم اٹھاتا، دس میل اُس کے جسم سے آن لگے۔
 میں نے اتر کر ملک نواز کی آنکھوں میں دیکھا، اُس کی آنکھوں
 میں خون کی لالی کھنڈی ہوئی تھی۔ کیا فیصلہ نہیں کرنا چاہتے ہو
 ملک نواز۔۔۔؟ میں نے دو قدم بڑھا کر اُس سے پوچھا۔
 "نہیں عزیزم۔۔۔" ملک نے نفی میں سر ہلایا۔ "یہ سبھی کارروائی
 ہے۔ بس پیچھے ہٹ جاؤ اور تم شہباز خان اب مزید کوئی بد تمیزی
 نہیں کر دے۔"
 شہباز نے آستین سے ناک سے بہتا خون صاف کیا اور
 گردن جھکا کر ایک طرف ہو گیا۔ ملک نواز نے بڑے دوستانہ انداز
 میں میرے شانے پر پتھری دی اور پھر میرا دایاں ہاتھ تھام کر لان
 کی جانب چل پڑا۔
 "تم لوگ بھی ہاتھوں کو کنٹرول میں رکھنا چوہدری۔ یہ زمین
 میرے لیے گرم ہو چکی ہے۔ میں آج کسی بھی وقت افغانستان
 کی طرف نکل جاؤں گا۔ اس زمین کا مزاج میں جانتا ہوں۔ آج
 انگارے تو وقت بوجھوں گے گزے گا، ٹھنڈی ہوتی چلی جائے گی۔
 مجھ سے پہلے بھی کئی لوگوں کے لیے یہ زمین انگارہ بنی تھی اور
 وہ لوگ آج یہاں پھولوں کی بیج پر سوتے ہیں۔ میں مایوس نہیں
 ہوں۔ بڑے بڑے جابر بادشاہوں کو محاذ سے ہٹنا پڑا ہے۔
 میں پھر اپنی کھوئی ہوئی قوت بحال کر لوں گا۔ ہم سے چند فٹ
 دُور ایک باڈی گارڈ اسٹین گن تانے لگا تھا۔ شاید ملک نے

اشارہ کیا ہوگا۔

میں باتیں بھی سن رہا تھا اور سوچ رہا تھا، ملک اپنے فخر
 سے مجھے کیوں آگاہ کر رہا ہے۔ میں اُس کے مفادات کو تقویت
 دینے کی پوزیشن میں بھی نہ تھا۔ اگر وہ میرے بارے میں کچھ جان
 چکا تھا تو اُسے باور کر لینا چاہیے تھا کہ خرم سلطان کا کٹ مار
 ناقابل فروخت اشیاء میں ہوتا ہے۔ وہ ایسے شخص سے تعاون
 کی امید کر ہی نہیں سکتا تھا جس نے اُس کے بھری بیڑے کو
 تار پڑے غرق کر دیا تھا۔

"ملک جھوٹے سے قبل میں صرف یہ معلوم کرنا چاہتا ہوں
 کہ اس منصوبے کا خالق کون ہے اور کارروائی میں کس کس نے
 حصہ لیا ہے۔ مجھے تھادی موت سے کوئی فائدہ نہیں مل سکتا۔
 ہاں اگر تم زندگی جیسی نعمت کے بدلے مجھے کچھ بتا دو تو میں بدوشی
 لے کر ساتھ جا سکتا ہوں۔ مجھے بتا دو معاملہ کہاں تک اُپر گیا ہے
 تاکہ میں اس حد سے فاصلہ بھی اُسی حساب سے رکھوں۔"

"پہلی بات تو یہ ہے ملک صاحب۔ میں نے ٹھہرے
 بلے میں بولنا شروع کیا۔ میں آپ پر بھروسہ نہیں کر سکتا۔ ہال اگر
 سوئے بازی مشرط اور قیظ دار ہو تو میں تعاون کرنے پر غور
 کر سکتا ہوں۔"

"اپنی بات کی وضاحت کرو چوہدری۔" ملک بولا۔ میں ہر
 قیمت پر تمہارا تعاون خرید لوں گا۔"

"پہلی قسط میں آپ ہارون کو رہا کریں۔ وہ جب بالکل
 بے خطر اور آزاد فضا میں جا کر مجھے اپنی خیریت کی اطلاع دے گا
 تو میں آپ کو منصوبے کے خالق کا نام بتا دوں گا۔"

"مجھے کون سی ضمانت دو گے چوہدری کہ ہارون آزاد ہو کر اُس
 ایجنسی سے رابطہ قائم نہیں کرے گا جو ملک نواز کو زندہ یا مردہ
 گرفتار کرنے کے لیے ملک کے طول و عرض میں سرگرداں ہے۔"

"ایک ضمانت ہے ملک صاحب۔ میں نے بتایا۔ جب تک
 رنگ باز کی بیٹی آپ کی گرفت میں ہے کم از کم میں کوئی ایسی
 طاقت نہیں کر سکتا اور وہ ضمانت بالکل آخری قسط میں وصول کی
 جائے گی۔"

"پہلی قسط تم ادا کر دے چوہدری۔" اُس نے پلٹ کر برساتی کی
 جانب دیکھا۔ "قسط وصول کرنے ہی میں ہارون کو آزاد کر دوں گا۔
 مجھے بتاؤ معاملہ کیا صوف پولیس تک محدود ہے؟"

"ہاں۔۔۔ بلکہ صرف ڈی آئی جی تک۔ میں نے میلی فون پر
 اُسے آئی جی صاحب سے باتیں کرتے سنا تھا۔ انھوں نے ڈی آئی

جی کو ذاتی ذمے داری پر کارروائی کرنے کی اجازت دی تھی۔
 "شکریہ چوہدری۔۔۔" ملک کا سنا ہوا چہرہ ایک دم تن گیا تھا۔
 "بہت اچھی خبر سنائی ہے تم نے، حالانکہ میرے ذرا لے کے مطابق
 کارروائی کی اجازت پر ائم منسٹر صاحب نے دی تھی۔"
 "نہیں ملک صاحب میرے خیال میں آپ کے کسی دست
 راست نے ڈی آئی جی کو خرید لیا ہے۔"

"اگر یہ بات مان لی جائے تو تمہیں کس غلے میں فٹ کیا
 جاسکتا ہے۔" ملک نواز نے میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں اور
 میں ہاتھ دے اور لان کو الگ کرنے والی تنگ پختہ نالی پارکر کے
 آگے بڑھے۔ لان میں چلا گیا۔ میں چاہتا تھا، ملک میرے ساتھ
 باتوں میں مصروف گلاب کی جھاریوں تک چلا جائے لیکن اُس نے ہاتھ
 اٹھا کر مجھے روک دیا۔ اگر تم دہی ہو جو خود کو ظاہر کرتے ہو تو پولیس
 سے گتھ جوڑے تھادی وہ حیثیت میں نہیں کھاتی اور اگر تم ہارون کے
 ڈیپارٹمنٹ کے آدمی ہو تو میرے لیے ڈھال بن سکتے ہو۔ پولیس تم
 جیسے کلرک کو صانع نہیں کر سکتی۔ تم میرے ساتھ چلو گے اور پھر شرائط
 کے ساتھ ہم واپس آئیں گے۔"

"غلط فہمی نہ پھڑیں ملک صاحب۔" میں نے سر نہ ہچے میں
 کہا۔ "جو راستہ میں نے اختیار کیا ہے، وہی مجھے اور آپ کو منزل
 آسان کر سکتا ہے۔ اول تو میرا تعلق پولیس سے وہی ہے جو چور اور
 پولیس کا ہوتا ہے۔ اگر میں پولیس کا آدمی ہوں بھی تو آپ جیسے
 شخص کے ساتھ مجھے نہیں تولا جائے گا۔ آپ صرف ایک رخ پر
 سوچ رہے ہیں۔ بات صرف خفیات کی نہیں جناب عالی، اس
 سازش کی جڑیں سیاست کی زمین میں ہیں۔ اس ڈرے کا بدلتی کار
 آپ کا کوئی سیاسی حریف ہے۔ خفیات کا ذخیرہ پھر وجود
 میں آسکتا ہے لیکن سیاست کی کیاری سے اکھڑا ہوا پودا پھر ہرا
 نہیں ہو سکتا۔"

"تمہارے خیال میں وہ حریف کون ہو سکتا ہے؟
 "آپ معاہدے سے تجاوز کرنے لگے ہیں۔" میں نے نصیحت
 خواہانہ انداز میں کہا۔ "میں پہلی قسط ادا کر چکا ہوں اب آپ کی
 باری ہے۔ ہارون کو واپس جانے دیجیے۔ میں آخری قسط تک آپ
 کے ساتھ رہوں گا۔ دواصل ہارون کی خدمات عدنی اور خفیہ ہیں۔
 مجھ جیسے ادارہ گرد کے لیے کوئی آنکھ رٹنے والی ہے نہ کوئی زبان
 باز پرس کرنے والی۔۔۔ لیکن ہارون کا معاملہ میں کا ہے۔ میں
 نہیں چاہتا، وہ اتنے بڑے نقصان سے دوچار ہو جائے۔ وہ کبھی
 آپ کا بھی وفادار رہا ہے، آج آپ اُس پر احسان کریں گے تو آنے

کریں پھر معاہدہ ہوگا۔

وقت اور ڈیلنگ سب سے بڑا اعتماد اور معاہدہ ہونا چاہیے ملک صاحب۔

"تم کب تک جانے کے لیے تیار ہو سکتے ہو ختم...؟" ملک فہر مجھ کے تسکین کی مانند پھر پھرنے لگا۔ میں نے طبع دکھا کر اس کے اندر کی جھوک سید کر دی تھی۔ وہ بھول گیا تھا کہ اسے تباہ کرنے والا کون ہے۔ مجھ کو اس کی تمام سوچوں کا دھلا موڑ دیا تھا۔ "بھلے آپ صرف ایک بات کا فیصلہ کریں۔ مجھ پر اتنا اعتماد کریں گے کہ میں آزاد رہ کر کچھ ذاتی معاملات نمٹاؤں۔"

"کتنا وقت لو گے...؟"

"کم از کم ایک ہفتہ۔" میں نے بتایا۔ میری عدم موجودگی میں میرے دشمنوں نے میرے باپ کو قتل کر دیا تھا اور میری منیجر اغوا کر لی تھی۔ ایک لڑکی میں بانگ کا لگ سے گھر لایا تھا۔ پھر میری موجودگی میں انھوں نے اس لڑکی کو اٹالیا۔ میری بوڑھی ماں کو پریشان کیا گیا۔ مجھ پر قاتلانہ حملے ہوئے۔ قاتل آزاد ہے اور اس کا بڑا بھائی جیل میں ہے۔ میں اپنے خاندان کو محفوظ پناہ میں دینا چاہتا ہوں۔ ورنہ وہ لوگ پھر شراٹھیزی پھیلا دیں گے۔

"تم میرا دشمن میرے حوالے کر دو۔" ملک فہر پھر سودا بازی پر لوٹ آیا۔ میں اپنی ساکھ بجال کر کے تھامے خاندان کو پناہ کا یقین دل گیا۔

"آپ خیر رگالی کی ابتدا کریں جناب۔ میں ہارون کے لیے بیحد پریشان ہوں۔ وہ ڈیلوں سے غیر حاضر ہے۔"

"میں وعدہ کر چکا ہوں اسے ایک آدھ گھنٹہ میں ہا کر دیا جائے گا۔ مجھے اپنے آدمیوں کو بھی شفٹ کرنا ہے۔ ہارون لاکھ فدا رہی مگر وہ سرکاری آدمی ہے اپنے مفادات کی خاطر کوئی بھی حماقت کر سکتا ہے۔"

فاصلہ باتوں ہی باتوں میں طے ہو گیا اور کارایک سب سے پیش کوٹھی کے پورچ میں جاڑ کی۔ ایک ملازم نے بڑھ کر دروازہ کھولا اور گردن جھکا کر ایک طرف ہو گیا۔ ملک فہر نے باہر نکل کر ڈرائیور کو کوئی ہدایت دی اور میرا ہاتھ تھام کر چلنے لگا۔ برساتی میں ایک نئی کار کھڑی تھی۔ دائیں بائیں مخرانی گیریاں تھیں۔ ہم بائیں کرتے ہوئے گیریز سے برآمدے میں داخل ہوئے ایک خاتون برہنہ پاٹھل رہی تھی۔ اس کی پشت چمڑی جانب تھی۔ سر میں بالوں کی آبشار اس کی پشت پر لہریں مار رہی تھی۔

"مائے نواز...؟" وہ اچانک پلٹ کر جیسی اور دور تری ہوئی

آئی۔ ملک نے اس کے بڑے ہونے دونوں ہاتھ تھام لیے۔ اس کا قد چھ فٹ کے قریب رہا ہو گا۔ ہلکے گلابی رنگ کے چہرے پر نیلے آسمان جیسی آنکھیں اور استخوانی ناک خود غافل اور رنگ نے اسے جاذب نگاہ بنا رکھا تھا۔ وہ واقعی خوبصورت تھی یا میں ہی فطرتاً حسن پرست تھا۔ بہر حال اس کے حسن جہاں سوز نے مجھے خاصا متاثر کیا تھا۔

"ان سے ملو گی...؟" ملک نے میری جانب اشارہ کیا۔

"میرا نیا پارٹنر خرم سلطان چوہدری دنیا کا ذہین اور شاطر نوجوان۔" میگی نے بالوں کو جھٹکا دیا اور قہقہہ مار کر ہاتھ بڑھادیا۔

"شیر کے ساتھ گیدڑ نہیں ہوتے۔ اگر تم تھیلی لغات نہ بھی کراتے تو میں اسے تسلیم کر لیتی۔" اس کا گداز ہاتھ میرے ہاتھ میں آیا تو عجیب سی سنسنی پھرتی ہوئی نکل گئی۔ اگر تم بڑا نہ مانو ملک تو مجھے کہنے دو، تمہارا پارٹنر ایک دھیمہ اور لیڈی کلر شخصیت کا مالک ہے۔ بالخصوص مجھ جیسی باذوق عورتوں کا پسندیدہ شخص۔ اس نے پھر قہقہہ لگایا اور میرا ہاتھ مسلتے ہوئے چلنے لگی۔ وہ ملک کے پہلو سے نکل کر میرے ساتھ چپک گئی تھی۔

"ہاں میگی میں اعتراف کرتا ہوں۔" ملک بولا۔ "لیکن خاصا خطرناک ہے۔ اس کی مثال دال پانی جیسی ہے۔"

"مجھے مت دہلاؤ ملک۔" میگی تقریباً چرخ کر بولی۔ جذبول کا بند بڑے بڑے دریاؤں کو ایک جگہ روک لیتا ہے۔ پانی تو ہاتھ کی روک سے بھی رُک سکتا ہے کیوں خرم سلطان...؟" وہ میری حوت پلٹے ہوئے بولی۔ جواباً میں صرف مسکرا کر رہ گیا تھا۔

"خوش فہمی ہے تمہاری جاں...؟" ملک فہر صوفے پر گرے ہوئے بولا۔ "خرم سلطان شوریدہ سڑ دیل ہے جسے بند کی مٹی نہیں روک سکتی۔ بند بن کر دیکھ لو لیکن فی الحال اسے تمہاری مدد کی ضرورت ہے۔ اپنے ڈاکٹر کو کال کر دو چوہدری نہ جی ہے۔"

"وہ تو میں بھی دیکھ رہی ہوں۔" میگی نے میری خون آلود قمیص کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا اور پھر ٹیلی فون کی جانب بڑھ گئی۔

"ہائی دی سے؟" وہ فون سے فدا ہو کر بولی۔ "تھکے لیے کوئی اچھی خبر نہیں ہے۔ اگر وجہ بتا دو تو میں کچھ کر دوں۔"

"نہیں جاؤ...؟" ملک فہر گہری سانس لے کر صوفے پر پھیل گیا۔ اس بار طوقان ایوان بالائے آٹھ ہے میں چاہتا میرا یہ ٹھکانا بھی ان کی لنگاہوں میں آجائے۔ انسان کے پاس ایک چھت اور ایک دوست تو ہونا چاہیے۔

میگی درمیان میں آکر رُک گئی جیسے فیصلہ نہ کر پار ہی تھی کہ میرے

پہلو میں بیٹھے یا ملک فہر کی دل داری کرے پھر اس نے کندھے اچکائے اور چارے درمیان چپک سے بیٹھ گئی چونکہ درمیان فاصلہ تنگ تھا اس لیے وہ پھنس گئی چنانچہ مجھے ہی سرک کر اس کے لیے جگہ بنانی پڑی کیونکہ انداز سے ہی معلوم ہوتا تھا کہ وہ ملک فہر کی کوئی خاص شے ہے۔ میری پوزیشن ایسی نہ تھی کہ اس خاص شے کے قریب اور مہمک سے ملک کو ناراض کر لیتا۔

"کیا پسند کرو گے؟" میگی بولی۔ پھر میری جانب گردن موڑ کر دیکھنے لگی۔ "ملک کا پسندیدہ مشروب تو میں جانتی ہوں تم بتاؤ۔"

"اگر وہ چائے پانی سے کوئی اونچی چیز ہے تو میں صرف چائے کے لیے زحمت ڈول گا۔"

"اچھا اچھا...؟" وہ اچھل کر اٹھی۔ "تو واقعی تم دوسری قسم کی شے ہو۔" اس نے کپ بورڈ کھول کر دھسکی کی بند بوتل اور گلاس نکال کر تپائی پر رکھا اور باہر نکل گئی۔ ایک منٹ بعد واپس آئی۔ چھوٹی سی برتنے میں برف کے ٹکڑے تھے۔ "ملک... تم اپنی بد آپ کر دو، میں چوہدری کے لیے کافی تیار کر لوں۔ معاف کرنا دیر میرے پاس چائے کا ڈانچ نہیں ہے۔"

ملک نے اپنے لیے ایک گلاس تیار کیا اور سب لینے لگا۔ "تکلف نہیں عزیزیم...؟" وہ مسکرایا۔ "یہ اعصاب کے لیے کیر ہے۔ خاص کر ان حالات میں جب اعصاب چنچ ہے ہوں؟"

"اعصاب کب چنچتے تھے ہیں ملک صاحب؟"

"جب رُوح بے سکون ہو جائے۔"

"اور میرے خیال میں رُوح صرف جرم اور گناہ کے احساس سے متاثر ہوتی ہے۔"

"ہاں...؟" ملک سر ہلانے لگا۔ "جرم اور گناہ؟" پھر وہ ہنس پڑا۔ "جس کی گھٹی میں ہی جرم کا قطرہ پکایا گیا ہو؟"

"نہیں ملک صاحب...؟" میں نے کہا۔ "یہ صرف مفروضے ہیں۔ ہر انسان شعور کی آگہی کے بعد اپنے کردار کا جواب دے ہوتا ہے۔ گھٹی ماں کی موجودگی میں پلائی جاتی ہے اور کوئی ماں اپنے بچے کو جرم اور گناہ گار نہیں بنا سکتی۔ کیا آپ زمانہ طالب علمی میں بھی منشیات کے اسمگلر تھے؟"

"نہیں شک میں صرف طالب علم تھا۔" ملک سب سے بڑھایا۔ اس نے آنکھیں موند لی تھیں۔ "لیکن میری پرورش فقیر حرام سے ہوئی رہی تھی۔ ہمارے ذرائع آمدن حلال نہ تھے تب ہی میں نے گھٹی کا لفظ استعمال کیا تھا۔"

میگی کافی کے دو مگ ٹرے میں لے کر آئی تو چمڑی گفتگو

بدل گئی۔ بلکہ میگی کسی دوسرے کو بات کرنے کا موقع دینے والی عورت نہ تھی۔ پھر ٹیلی فون کی گھنٹی نے ہی اسے زبان کو لگام دینے پر مجبور کیا تھا۔ پہلے تو اس نے چونک کر ٹیلی فون سیٹ کو گھورا پھر مگ سیت اُدھر چلی گئی۔

"ہاں... ٹھیک ہے...؟" اس نے ریسپور کا اشارہ کیا۔ ملک تمہارا کوئی پالتو بول رہا ہے۔ ملک نے آخری ٹھونٹ چہرہ اٹھا کر حلق میں اندر دلا اور گلاس تپائی پر رکھ کر اٹھ گیا۔

"بس ٹھیک ہے تم لوگ فی الفور جگہ چھوڑ دو۔" شام چھ بجے اسی نمبر پر کال کر لیتا۔ اس نے ریسپور دکھا اور مسکراتے ہوئے بولا۔ "تمہاری پہلی دستہ میں نے ہارون کو چھوڑ دیا ہے۔ خیر رگالی کی ابتدا ہو چکی ہے۔ اب تم تعاون کر دو گے عزیزیم...؟"

"تھینک یو سر...؟" میں نے ممنون انداز میں شکر یہ ادا کیا۔

"میری خدمات حاضر ہیں۔" پھر میگی کسی بیگم شیرازی کی ساگرہ کا ذکر لے بیٹھی۔ ملک فہر نے ایک گلاس اور بنایا اور لا تعلقی سے باتیں سننے لگا۔

"ہاتھ روم میڈم...؟" میں نے اُٹھتے ہوئے پوچھا۔ اس کمرے میں ہاتھ روم نہ تھا۔ اس لیے وہ ساتھ دالے کمرے تک ساتھ گئی تھی۔ ملک فہر بغلی دروازہ کھول کر دروازے میں دُک گیا تھا۔ میں نے اندر جا کر دروازہ کھول کر ان کی آڈیشن کا دل پورا کھول دیا۔ پانی خالی بالٹی میں پشور آواز سے گرنے لگا تو میں نے اُسی شور میں ہارون کو کال کر لیا۔

"میں چیف ہارون...؟" ہارون کی منمنائی آواز ابھری۔

"اپنے تعاقب کی رپورٹ دو۔"

"راستہ بالکل صاف اور محفوظ ہے چیف...؟"

"میں سول لائن کے آخری بلاک میں ہوں۔ نمینہ شاید یہاں لائی جائے گی۔ تمام راستے بلاک کر دینا۔ بہر طور نمینہ کو یہاں داخل ہونے سے قبل اڑانا ہوگا۔ تمہاری اد کے رپورٹ کے بعد ہی میں دوسری ہدایات دُول گا۔"

میں نے جھری سے دیکھا۔ ملک فہر جلا گیا تھا۔ البتہ میگی کی آنکھیں پھیلی ہوئی تھیں۔ شاید اس نے میری کوئی سرگوشی سن لی تھی۔ میں نے ہاتھ مٹھ دھویا اور دال سے چہرہ صاف کرتا ہوا باہر آ گیا۔

"ڈونٹ وری چوہدری...؟" وہ منی خیز انداز میں مسکرائی۔ "میں پالتو کتیا نہیں ہوں لیکن تم اس گھر کو یاد رکھو گے۔"

"میں دیواروں کو نہیں خوبصورت چہرے کو یاد رکھا کرتا ہوں۔"

میگی... میرا بھرا بھائی اور فریاد کیا تھا۔ جب بھی مجھے فرصت ملے تو میرے قدموں کا رونا دھری ہو گا۔
"دعا... اس نے گلاب کی پنکھڑی جیسی پھیلی پھیلا دی اور میں نے اپنا نام آؤد ہاتھ پھیلی پر رکھ دیا۔
"اس لم کی گواہی میں وعدہ..."

"تھینک یو ڈیشنگ بوائے" اس نے چہرہ اوپر اٹھایا اور میں اس کے گال کے قائل ڈمپل کو انگلی کی پور سے سہلاتا ہوا آگے نکل گیا میگی کی سرکاری میری پشت سے ٹکرائی مگر میں تیزی سے ملک نواز کی پناہ میں چلا گیا۔ میگی جیسی عورت کا رویہ میرے لیے پہلا تجربہ نہ تھا۔ ایسی ہی ایک بدروح مجھے ان دنوں می جو کے پھول پپ سے خریدے گئی تھی جب میں لوگوں کی کاؤں پر جھانپ پھر کر پیٹ کے دوزخ کے لیے ایندھن جمع کیا کرتا تھا۔ اس کے پاس بھی ایسا ہی قاتل شباب معطر خواب گاہ، خوشنوار ملازم اور بھیڑیے جیسا کتا تھا لیکن میں وہاں سے بھی صاف ہی نکل گیا تھا۔ پھر ایک چر دیل اور بھی سامنے آئی تھی۔ بونے ہی جو کی مجھ سے جس نے نی جو کی عدم موجودگی میں مجھے زبردست لاکر اپنے حسن و شباب کا چارہ ڈالا تھا۔ وہاں بھی خزانے کے راستوں پر ڈوبنے لگے غارتے پھر رہے تھے۔ میں نے کوئی راہ نہ پا کر اس کی کمر توڑ دی تھی اور کتوں کو ہلاک کر کے نکل بھاگا تھا۔ وہ کون سا مقام تھا جہاں شیطان نے میرے قدموں میں لرزش پیدا کرنے کی کوشش نہ کی تھی۔

ایک بات کا احساس باعث تقویت تھا کہ ملک نواز کا ستارہ گردش میں ہے۔ اس کے دیرینہ وفادار، خریدے ہوئے غلام اور زیر کفالت لوگ اس کے خلاف ہو گئے تھے۔ ملک نے جس گھر کا آخری پناہ اور جس عورت کو آخری دوست کہا تھا وہ بھی اس کے نہ تھے۔ میگی جو بھی تھی اس کی وفادار ہرگز نہ تھی وفادار عورت کسی بھی روپ میں غیر مرد کو اتفاقی نگاہوں سے نہیں دیکھتی جب کہ میگی نے واضح طور پر مجھے دعوت دی تھی۔

"ہم کچھ دیر آرام کریں گے میگی، ملک نے اسکرال لیتے ہوئے کہا۔ اس کی آنکھوں میں اتنی حرام کا سرور و سرخی بن چکی تھی جتنی ہمارے لگا تھا۔ تم مجھے معاف کر دو گے چوہدری، تمہاری امانت کی ایسی ایک تمہیں زبردستی رہنا ہو گا۔"

اس نے اٹھ کر کوئی نمبر ڈائل کیا اور ہم آوازیں چند باتیں کر کے ریسیور رکھ دیا۔ نشر اس کے اعصاب پر بری طرح طاری تھا۔ وہ لڑکھڑاتا ہوا پھر صوفے پر گر گیا۔

میں پہلے بھی اعتراف کر چکا ہوں کہ میں کوئی مضبوط ارادہ انسان

کتنی مدت سفر کرنا پڑتا۔ پھر بھی اصل جگہ شاید نہ جاسکتا۔ اس صورت میں ملک نواز بسیار بہنا اور ہم سفر خلاف وقت دوس کا عطیہ ہی تھا۔ پھر میں ذاتی جذبات اور مفادات کی خاطر ایسا موقع کیسے ضائع کر دیتا۔ ٹھیک ہے ٹھیک ہے کئی حوالوں سے مجھے عزیمتی۔ اس کی بازیابی بھی میرے فرائض میں شامل تھی۔ رشیدہ اسپتال میں میری راہ تک رہی تھی۔ لیکن کے پاس میرے گھر والوں کا کوئی پیغام تھا، اس گھر کا جہاں میری پیاری ماں تھی، جہاں دایما سے عزیز زینت تھی۔ ایک قابل رحم بھائی تھا اور عابدہ جیسی امانت تھی لیکن وہ سب کچھ ختم سلطان کی ذات کی چاندنی تھی۔ ذاتی جذبے اور مقاصد تھے۔ جب کہ دوسری جانب پوری قوم ہی نہیں بلکہ انسانیت کی بقا تھی۔ ایک قوی اور انسانی فرض تھا بہت سوچا سمجھا کر ہی میں نے قوی فرض کی ادائیگی کو سب کاموں پر ترجیح دینے کا اہل فیصلہ کیا تھا۔

میگی جو بھی کافی کے برتن سمیٹ کر قدم قدم پر قیامت جگاتی باہر گئی، میں نے ایک دم ایک فیصلہ کرتے ہوئے شراب کی بوتل اٹھائی۔ ملک نواز نے بوجھل میگوں کو مشکل نیم وا کر کے دیکھا اور پھر آنکھیں موند کر بولا پنی او... پنی او... چوہدری سارے غم بھول

نہیں ہوں میرے ارادے میں استحکام کبھی نہیں رہا۔ یہ وجہ رہی ہو گی کہ حالات ہی متزلزل ہوتے تھے اور حالات کا رخ دیکھ کر مجھے قریب نما سوئی بننا پڑتا تھا۔ جب ہاروں کے ساتھ مجھے اس کوٹھی میں لایا گیا تھا تو میں خزاں اور پھر جانے کا ارادہ رکھتا تھا لیکن ملک نواز سے بات کرنے کے بعد میرے ارادے کی دیواریں آپ سے آپ ڈھس گئی تھیں۔ میں سحر زدہ انسان کی طرح ملک نواز کے قریب سے دور نہیں ہونا چاہتا تھا۔ ورنہ میگی کے گھر میں خرابی ہر صورت موجود تھی۔ وہ قابل ہر اُلفت تھی۔ ملک نواز شباب میں غوطہ زن تھا۔ میں اس کی ناک چٹکی میں لے کر مضحکہ اُٹاتا ہوا آرام سے نکل سکتا تھا لیکن ارادہ ہی بدل گیا تھا اور ارادے کی تبدیلی بلا جواز نہ تھی۔ میں ملک نواز کو ہانگ کا ہانگ کے شیشے میں اتارنے میں کامیاب ہوا تھا اور اس کے ساتھ وہاں تک کا سفر کرنا چاہتا تھا جہاں سے زہریلے ناک زہر کی پھیلیاں بھرتے تھے۔ ادھر جانا میرے پگلا میں شامل تھا لیکن مجھے تو قہ نہ تھی کہ اتنی جلدی میرا مہربان خدا اتنا باوقوف دلیر اور رادال ہم سفر عطا فرمائے گا۔ میں اگر اپنے ذرائع کی سواری پر ادھر کا سفر کرتا تو ہر موڑ پر بچانے کتنے اندھے، ناک، بھیڑیے اور دندے میرا راستہ روکتے

جائے گئے۔ میں نے بایں ہاتھ سے اس کی گردن دبوا لی اور جب وہ زچا تو اس کے سینے پر دایاں گھٹا رکھ دیا اور بول والا ہاتھ اوپر لے گیا۔ اس کو بولا ملک نواز میرے حق سے سفاک اپنے گردن مجھاری محبوبہ واپس آئے گی تو اسے صرف تمہارا آواز بھری ہو جب تمہاری محبوبہ واپس آئے گی تو اسے صرف تمہارا بچھا ہوا بیچلے گا۔ ملک نواز کا جسم گھٹنے تلے پھٹک رہا تھا اور اس کی آنکھیں خوف سے ابل آئی تھیں۔ تسلیم کرو ملک! موت تم سے ایک انچ دور ہے اور تمہیں تمہارا کوئی ہمدر نہیں بچا سکتا۔ ملک نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا اور اس کی زبان باہر نکل آئی۔ لیکن میں تمہیں ہلاک نہیں کروں گا ملک نواز میں نے گھٹنا ہٹا لیا اور اس کی گردن چھوڑ دی۔ یہ اپنی وفاداری جتانے کی کارروائی تھی ملک صاحب! میں اگر تمہارا دشمن ہوتا تو تمہیں ہلاک کر کے تمہاری لاش حکومت کے حوالے کر کے بہت بڑا انعام حاصل کرتا لیکن میں نے اپنا مستقبل حکومت سے نہیں تمہاری ذات سے وابستہ کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ اب بھی نگرانی کی ضرورت محسوس کریں گے؟

"بس... اس نے گردن سہلاتے ہوئے بھرائی ہوئی آواز میں کہا تم جیت گئے لڑکے، تم نے ایک پہاڑ کو پاش پاش کر دیا ہے۔ جاؤ چوہدری، جہاں جانا چاہتے ہو جاؤ۔"

"آپ مجھے زیادہ نہیں تو کچھ نہ کہہ جاتے ہیں محترم! میں نے کہا اگر میں جانا چاہتا تو مجھے کئی مواقع ملے تھے میں غنڈوں کے نرسے سے فرار ہوتا رہا ہوں مجھے آگ برساتے ہتھیاروں نے کبھی نہیں روکا مگر میں کہیں جانا نہیں چاہتا ٹھیکے گل کو حاصل کر کے مدام میگی کے ساتھ گھر بھجوا دوں گا اور خود آپ کے سلسلے میں رہوں گا۔"

مجھے... مجھے... "ملک نواز ہانپ کر رہ گیا۔ اپنے حواس میں رہنے دو چوہدری! یہ زمانہ کرامات اور معجزوں کا نہیں ہے تم... تم آخر کیا ہو اور کیا کرنا چاہتے ہو؟"

"یہ میری انتہائی بد قسمتی ہے جناب! میں نے رقت آمیز آوازیں کہا۔ زندگی میں ایک شخص پر بھروسہ کرنا چاہا... ایک کا ہونا چاہا مگر وہی مجھے شاید فرلو اور دراما باز سمجھ رہا ہے۔" میں نے سر دھری اور سر جھکا لیا۔

"نہیں... نہیں... بخدا نہیں! ملک نے جرح کر مجھے ہاتھوں میں بھرا اور میری کلائیوں اور گردن کو بے تحاشا چومنے لگا تو تم... تم... ہاں میں تم مجھے عزیز ہو... بے حد عزیز..."

شاید... لیکن میں باپ نہیں ہوں، میری کوئی اولاد نہیں ہے۔ مجھے شفقت پدیری کا کوئی احساس نہیں ہے۔ ہاں اگر میرا بیٹا ہوتا تو میں اسے... اس کے لیے ایسا ہی محسوس کرتا۔
میں نے چہرہ ہاتھوں میں چھپا لیا اور میرا جسم ہچکیوں کی زد میں آ گیا۔ اسی لمحے میگی اندر داخل ہوئی اور جذباتی منظر دیکھ کر زور سے چلائی۔

"ادھ ملک! کیا... کیا کر دیا تم نے ظالم... کیوں روتا ہے چوہدری...؟" میں نے کمال ہوشیاری سے اپنے ہی تھوک سے ہاتھ آنکھیں اور چہرہ بھگو لیا تھا۔

"یہ... یہ... خوشی کے آنسو ہیں میگی! ملک میرے شلنے سے چہرہ رگڑتے ہوئے بولا میں نے خرم سلطان کو بیٹا کہا ہے اور لپکا یہ رشتہ سہ نہیں سکا، رونے لگا ہے۔"

میں نے اب بھی ہاتھ چہرے سے جدا نہیں کیے تھے دفعتاً مجھے اپنے ہاتھوں پر گداز اور معطر مس محسوس ہوا۔ میگی نے پہلے میرے ہاتھوں کو چہرے سے جدا کیا پھر لہک کر بولی "اے پانگل ہونے ہو، کوئی یوں روتا ہے؟"

"اے اپنے کمرے میں لے جاؤ میگی! ملک نواز نے میرے بالوں میں انگلیاں پھرتے ہوئے کہا اور میری ساری اداکاری ہوا ہو گئی کاش میں کہہ سکتا، کیسے باپ ہو، اپنے بیٹے کو قصائی کے حوالے کر رہے ہو۔"

"چلو اٹھو چوہدری! میگی نے مجھے اٹھانا چاہا ہوں روٹے بچوں کو لوریاں دے کر سنانے کی ماہر ہوں، دیکھنا تم...! "شکریہ مدام! میں نے آستین سے بیگ کا ہوا چہرہ صاف کرتے ہوئے گلوگر آوازیں کہا "میں دن کے وقت سونے کا عادی نہیں ہوں پسلیے کچن میں ہم لچ تیار کریں گے۔ میں صبح سے بھوکا ہوں۔"

"ادھ نہیں جان! میگی ٹھنک اٹھی ہو تمہیں سلا کر میں لچ منٹوں میں تیار کر لوں گی، آؤ صند نہ کرو، تم بھی اپنے میڈروم میں جا کر آرام کرو نواز۔"

"جاؤ خرم! ملک نواز اٹھتے ہوئے بولا "نہ جانے رات کیسی اترے، ہمیں کچھ وقت نیند لے لینی چاہیے۔"

"آپ... آپ مجھے وہ حق دیں گے؟" میں نے ملتھیانہ لہجے میں پوچھا۔
"نہیں حق کی بات کر رہے ہو؟"
"ڈیڈی کہنے کا..."
"ادھ... ادھ...! ملک بھلاتا ہوا مجھ پر جھک آیا ہو کہو"

”فکر یہ ڈیڈ“ میں نے اس کا ہاتھ تمام کرچوم لیا تباب بتائیے ملازم کا آپ سے کیا رشتہ ہے؟“

”تم اسے متی کہہ سکتے ہو بیٹے“

”نہیں...“ میکی ملتی پھاڑ کر چیخی بونان سینس، میرا کوئی بیٹا نہیں ہے، منو خرم چوہدری! داستانیں کسی کی متی نہیں ہوتیں! میں صرف میکی ہوں، ایک عورت بس!“

”میری متی بھی ایک عورت ہے ملازم! میں نے لگا ہی جھکا کر کہا اس لیے میں عورت کو متی ہی سمجھتا ہوں۔ ویسے اگر آپ مجھے یہ متی نہیں دینا چاہتیں تو پھر بھی ڈیڈی کے حوالے سے آپ میرے لیے متی سے کم نہیں!“

”شٹ آپ... تم... تم دونوں ایک دم پاگل ہوؤ اس نے مجھے دھکادیا اور پاؤں سے فرش کوئی ہونٹی باہر نکل گئی۔“

”بے چاری میکی! ملک نواز نے متاسف آوازیں کہا۔“

”واقعی یہ صرف عورت ہے بیٹے۔ ایسی عورت جس کے نزدیک مرد صرف مرد ہی ہوتا ہے، آؤ میرے ساتھ چلو“

”نہیں ڈیڈ! میں نے سرگوشیاں آوازیں کہا تو وہیں سونا نہیں چاہیے اگر میکی صرف عورت ہے تو عورت اپنے جذبہ کی توہین کرنے والوں کو معاف نہیں کیا کرتی“

”یار بیٹے! ملک نواز نے لگا۔“ تم کیا بھلا ہو، درندہ خصلت ایک مفکر ہو۔ تم نے بالکل درست تجزیہ پیش کیا ہے میکی صرف مرد اور اقتدار کی غلام ہے۔ تم بیٹھو میں اسے دام کر آؤں“

بارہ بجے ملک نواز اسے منانے گیا تو میکی دو بجے وہ جب میرے پاس آئے تو ملک نواز کا چہرہ ٹک رہا تھا لیکن میکی پھول دار شلوار قمیص میں ایسی پھلواڑی دکھائی دے رہی تھی جیسے بہاروں نے خوب نوازا ہو۔ اس کے چہرے پر طمانیت کی چاندنی چلی ہوئی تھی۔ وہ پہلے سے کہیں زیادہ نکھری نکھری اور خوبصورت دکھائی دینے لگی تھی۔ میں نے مجھے ہم نے ریڈی میڈ

قسم کا بیچ کیا اور پھر دس منٹ ملک نواز میکی فون پر مختصر مختصر کالیں کرتا رہا تھا۔

میں نے ہاتھ روم میں جا کر ہارون سے رابطہ لایا۔ وہ تو جیسے میری کال کا ہی منتظر تھا۔ ڈاکٹر عرفان آغا واپس آچکا ہے چیف! رابطہ ملے ہی وہ فوراً بولا تھا۔

”اب وہ غیر ضروری ہے، نگرانی ختم کر دو“ میں نے ٹھکانا

ہلچل میں کہا۔

”ہنٹ کو نواز اور ماسٹر سول لائن کے اہم راستوں پر پہرہ دے رہے ہیں! ہارون بتائے لگا! آپ اپنی پوزیشن بتائیں!“

”سوری ہارون! میں کوٹھی کا نمبر نہیں دیکھ سکا۔ ہاں کوٹھی کے پکاؤ والے کے ساتھ تین چیرے کے تناور درخت ہیں اور مشرقی حصے میں ایک خشک دو شاخہ درخت ہے۔“

”میکی ہے چیف! میں دور سے چیرے کے درخت دیکھ رہا ہوں! ہارون نے بتایا تو کیا آپ کو مدد کی ضرورت ہے؟“

”نہیں پیارے میں گھر جیسا سکون محسوس کر رہا ہوں! ناکہ بندی سخت رکھنا اور کامیابی کی رپورٹ دے کر مزید ہدایات لے لینا“

”اور کوئی حکم چیف؟“

”نہیں تم ساتھیوں کی مدد کرو“

”ملک نواز! میکی کو بلاشت دے کر خود سیرخ سحری کی طرح بدترج مذہم ہوتا جا رہا تھا لیکن وہ جونہی آنکھیں بند کرتا میں کوئی بات کر کے اسے بیدار کر دیتا کیونکہ میکی جیسی دودھادی تلوار کی کاٹ سے مجھے بچائے ہوئے تھا۔ میں اس ڈھال کو نیند کی دھند میں غائب کر کے ٹھکی تلوار کا خطرہ مول نہیں لے سکتا تھا۔ میکی آتے جاتے مجھے ایسے ہی دھکتی تھی جیسے بھوکا آوارہ کتا بازار سے گزرتے ہوئے قصاب کی دکان میں ٹنگے گوشت کے پارچے کو دیکھ رہا ہو۔“

چھ بجے شام ملک پھر شغل سے ناشی میں مصروف ہو گیا اس نے معذرت کرتے ہوئے بتایا تھا کہ زخم کے درد کا احساس صرف شراب سے ہی کم ہو رہا ہے، وہ سراپا غم بنا ہوا تھا اس کی حالت بخری بیڑے کے ہارے ہوئے کمانڈر سے کم نہ تھی۔ میکی ڈرک انعام کرنے مارکیٹ کے لیے نکل گئی تھی۔ اس نے مجھے بھی ساتھ لے جانا چاہا تھا مگر ملک نے حالات کے پیش نظر اسے منع کر دیا تھا اگر وہ اجازت دے بھی دیتا تو ڈرلے میں ایسی گنجائش نہ تھی میں معذرت کر دیتا۔

چونکہ میری کامیاب بلکہ نچرل اداکاری نے ملک نواز جیسے کالیں گرگ بارڈل کو متاثر کر دیا تھا، اس لیے وہ میری طرف سے بالکل مطمئن ہو گیا تھا میں غسل کے ہاتھ ہاتھ روم میں بند ہو گیا اور امتیاطی باہر والا دروازہ بھی اندر سے لاک کر دیا تھا۔

اصولاً مجھے یکن سے رابطہ قائم رکھنا تھا میرے بعد وہ قائم مقام کمانڈر تھا لیکن ہارون کی کارکردگی اور شخصیت نے بڑی خاموشی

سے اسے تیسری لائن میں کر دیا تھا کارروائی کی نگرانی عملاً ہارون نے سنبھال رکھی تھی وہ قریب ہی کسی جگہ مستعد اور کال کا منتظر تھا۔

”ماہر بڑے سائیں! اس کی چمکار سنا دی! یوٹن اتفاق سے بالکل سامنے والی کوٹھی میرے سابق چیف کی ہے اور میں دوسری منزل کی کھڑکی سے آپ کو براہ راست دیکھتا ہوں اور خاتون کو سی آف کرتے دیکھ چکا ہوں!“

”گڈ!“ میں نے اسے شاباش دی تو اب آئندہ کی ہدایات نوٹ کر لو۔ ملک نواز کو میں علاقہ غیر میں جانے پر مجبور کرنا چاہتا ہوں۔ پہلے وہ تیار تھا لیکن اب وہ متزلزل سا ہو رہا ہے، تم مجھے بتاؤ گے ہارون کہ ملک نواز کا سیاسی حریف کون ہے؟“

”سیلمان لودھی! ہارون نے بتایا سیلمان ایک صنعت کار ہے ملک نواز سے شکست کھا کر اس نے صنعتی انتخاب ایک دوسرے ضلع سے جیت لیا تھا، ورنہ ہمیشہ نواز سے مقابلہ کرتا اور ہارون ہا ہے کئی بار ان کے گروہ آپس میں ٹکرائے ہیں مگر شہر میں جب نئی حکومت تشکیل ہو رہی تھی تو سیلمان لودھی کا نام بھی وزارت کے لیے تجویز ہوا تھا لیکن ملک نواز لابی نے شدید مخالفت کر کے اس کا نام خارج کر دیا تھا“

”ہارون! تم صوبہ سرحد اور علاقہ غیر کی طرف جانے والے تمام راستوں سے واقف ہو گے؟“

”جی ہاں چیف! اپنے گاؤں کی گلیوں کی طرح“

”کیا بحیثیت گائیڈ تیار ہو؟“

”نہیں! میں نے ممنونیت سے کہا اب غور سے میری بات سنو! میں کیا چاہتا ہوں اور تمہیں اس ڈرلے میں نچرل رنگ بھرنے کے لیے کیا کرنا ہوگا؟“ میں بولتا رہا اور جب بھی بالٹی بھر جاتی میں پانی گرا دیتا۔ کیونکہ ملک نواز ساتھ والے کمرے میں تھا۔ باتوں کی بھین بھناہٹ بھی میرے لیے خطرناک تھی۔

”او۔ کے چیف!“ ہارون بولا۔ ”میرے ذہن میں ہر ایک بات ریکارڈ ہو چکی ہے اگر کوئی ناگوار تبدیلی ہوگئی، تب بھی میں سنبھال لوں گا“

”جوں جوں شام گہری ہو رہی تھی، میری بے چینی میں بھی اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ شہباز، ملک نواز کا غنڈہ تھا۔ گروہ میں نمایاں پوزیشن کا مالک تھا، ایسے گروہوں سے پولیس کے تعلقات بھی رہے ہوں گے۔ اب حالت بدل گئی تھی، جب ملک جیسا با اثر شخص

خروش کی طرح بھاڑیوں میں چھپتا پھر رہا تھا تو اس کے کسی گروہ کے

کی کیا پوزیشن رہ گئی تھی! ٹینٹ کولانے کے لیے وہ کوئی بھی ذریعہ استعمال کرنا مگر ہنگامی حالت میں ہر ذریعہ غیر محفوظ ہی تھا اگر وہ کسی پولیس پارٹی کی نگاہوں میں آ جاتا اور اپنے چیف پر قربان ہونے کا فیصلہ کر لیتا تو پولیس کی اندھی گولیاں ٹینٹ کا ہرگز لحاظ نہ کرتیں دوسری فکر کی وجہ یہ رہی تھی کہ کسی جھڑپ کی صورت میں میرا منصوبہ متاثر ہو سکتا تھا۔ ٹینٹ بذرلیعہ پولیس گھر آ جاتی اور شہباز ملک نواز کی موجودہ پناہ گاہ بتا دیتا تو میرے لیے ڈرلے یا حقیقت کا ساتھ دینے کا فیصلہ مشکل ہو جاتا۔

”میکی نے ڈرلے سے قبل ملک نواز کو تقریباً دھکیل کر ہاتھ روم میں بند کر دیا کیونکہ وہ بار بار منہ کھول کر ہتھائیاں لینے لگا تھا۔ اسے اندر بھیج کر وہ مٹری پھیلیاں لے کر ڈرائنگ روم میں آ گئی۔“

”اسپرین کمن میں ہی چھوڑ آئی تھی۔“

”ادھر صبح آ جاؤ خوبصورت چوہے!“ اس نے شاپنگ بیگ قالین پر الٹ دیا۔

”کیا مجھے جواباً مہربان خالد جان کہنا چاہیے؟“ میں صوفے سے سرک کر قالین پر بیٹھ گیا۔

”متی جان بھی کہو گے تو میری رلے متاثر نہیں ہوگی!“ وہ بڑے رसान سے بولی۔ ”کیونکہ رشتے زبان کے نہیں بلکہ خون اور دل کے ہوتے ہیں۔ ویسے تم مجھ سے گریزاں گریزاں کیوں ہو؟“

”ہاتھی کے منہ سے گنا چھیننے سے لوگ کیوں گریز کیا کرتے ہیں مادام؟“

”بھواس نہیں لڑکے! اس نے چند پھیلیاں میرے منہ پر مار دیں۔“ سیدھی طرح کھل جاؤ کیلشے ہو، ہاتھ روم میں کیے کال کیا تھا تم نے؟ میں نے ٹینٹ کا نام بھی سنا تھا کون ہے تمہاری؟“

”کیا تم پر اعتماد کر لوں گی؟“ میں نے مٹر کا دانہ پچکے ہوئے دریافت کیا۔

”میں کوئی وقفا شعار عورت نہیں ہوں خرم سلطان، ہوش سنبھالو! میری بڑی شین بنادی گئی تھی۔ تمہیں میرا اعتماد خریدنا ہوگا۔ ہر شے کی اپنی قیمت ہوتی ہے، ویسے میں سودے کی کھری رہی ہوں، جتنا متی ہوں اتنی ہی قیمت وصول کرتی ہوں۔“

”بولو تعاون اور اعتماد کی کیا قیمت لگاتی ہو؟“

”جو اب وہ خاموشی سے میرے سراپا کو معنی خیز نگاہوں سے تو لے گی مجھے اپنے بدن پر چوینٹیاں سی رہتی محسوس ہوئیں۔ میں اپنے اندر عجیب سی بے چینی محسوس کرنے لگا۔“

”میں اتنا قیمتی نہیں ہوں میکی! میں اس کی نگاہوں کا

مفہوم سمجھتے ہوئے جلدی سے بولا۔

”یہ میری لنگاہوں“ میری نشہ بسی سے پوچھو کہ تم میرے لیے کیا ہو؟“

”اوہ بیگی! میں نے آنکھیں موند کر سسکاری لی تو میرے ذہن اور عقل کو غار آلودہ نہ کروئیں! ابھی صرف پتھر نہیں بجھے فی الحال بے حس رہنا ہے۔ میں آگے جھک گیا۔ سنو بیگی! ملک نواز مجھے مجبور کر چکا ہے، کچھ مدت پوچھنا بیگی! بس وعدے لے لوں جب بھی اس پنجرے سے آزادی حاصل کروں گا، تمہاری چاندنی سے لطف اندوز ہونے ضرور آؤں گا۔“

”مجھے بتاؤ خرم! اس نے میرا ہاتھ پکڑ لیا تو میں اتنی بے بس نہیں ہوں۔ بولو شاید میں تمہاری مدد کر سکوں۔“

”بیگی خشک تولیہ دو۔ ملک کی آواز پر اس نے میرا گال تھپ تھپایا اور پھر دوڑتی ہوئی باہر نکل گئی مختصر مگر مشکل مرحلہ بخیر و خوبی گزر گیا تو میں نے خدا کا شکر ادا کیا۔“

کھانے کا دور آخری مرحلے میں تھا کہ ٹیلی فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ ”ادھر بیگی! پھر واپس آ کر بولی۔ کوئی انیسٹر ہارون ہیں اور خرم کے لیے کال ہے۔“ ملک نواز نے چونک کر... نینک میل پر پھینکا۔۔۔۔۔۔ اور میری جانب خشونت آمیز لنگاہوں سے دیکھا۔

”کوئی ضروری پیغام ہوگا تو میں نے اٹھتے ہوئے کہا۔ تب ہی ہارون نے اپنے ذرا رخ سے ٹپس کیا ہوگا۔“

”ملک میرے ساتھ ہی ٹیلی فون سیٹ تک گیا تھا۔ ہیلو دوست! پہلے یہ بتاؤ یہ میر کہاں سے لیا تم نے؟“

”میرے اپنے ذرا رخ ہیں جو ہداری صاحب۔“ ہارون نے وہی جواب دیا جو میں چاہتا تھا۔ ملک میرے چہرے سے چہرہ ملائے آواز سن رہا تھا۔ آپ دونوں خطرے میں ہیں سلیڈ پارٹی روانہ ہو چکی ہے۔ اب آپ پھر ذرا رخ پوچھیں گے مجھے معلوم نہیں غالباً کوئی محرم راز ہاتھ لگ گیا ہے اور اس کا نام ہے شہباز! آپ ملک صاحب سے پوچھیے، کیا ایسے شخص کو وہ جانتے ہیں؟“

”سنو ہارون! تم ہماری کیا مدد کر سکتے ہو، تمہاری خدمات کا منہ مانگا انعام ملے گا۔“

”میں جو کچھ کر سکتا تھا کر رہا ہوں جو ہداری۔ میں بے نقاب ہونا نہیں چاہتا۔“

”ہم یہاں سے نکالنا چاہتے ہیں ہارون اور صرف تم ہی باوثوق ضمانت بن سکتے ہو۔ تمہارے پاس سرکاری شناختی کارڈ



ہے۔ ایک انیسٹر کی گاڑی راستے میں چیک ہوئی بھی تو کوئی ذہن شک نہیں کرے گا، انکار نہ کرنا ہارون! یہ ہماری زندگی اور موت کا مسئلہ ہے۔“

”اوہ خرم جو ہداری! آپ نے مجھے عجیب چکر میں پھنسا دیا ہے۔ بہر کیف اگر آپ لوگ ریڈ سے بچ نکلے تو میں اپنی خدمات پیش کروں گا۔ میری گاڑی کا نمبر نوٹ کر لیں میں انتظار کروں گا۔“

”تھینک یو ہارون! اگر زندگی اور وقت نے وفا کی تو ہم آپ جیسے محسن کو یاد رکھیں گے۔“

میں نے ریسیور لکھ کر گہری سانس لی، کیونکہ پردہ ہٹ چکا تھا اور اے کا پہلا منظر شروع ہو گیا تھا، تالیاں بج سکتی تھیں یا گرم گرم گولیاں میرے جسم میں داخل ہو سکتی تھیں البتہ ایک بات کا اضافہ ہوا تھا۔ ہارون نے شہباز کا نام لے کر میرے اندر کھلبلی مچا دی تھی۔ شہباز اگر واقعی گرفت میں آچکا تھا تو میں جانتا جا رہا تھا کہ گرفت والا ہاتھ کس کا ہے اور قیمت کہاں سے لیکن ملک نواز کی موجودگی میں وضاحت کیسے ہوتی۔

”اول... میں کچھ فیصلہ نہیں کر پا رہا جو ہداری! ملک ٹپسنے لگا۔ ہارون کو ہمارے ساتھ اتنی ہمدردی کب پیدا ہوئی ہے۔“

”گت خفی معاف ملک صاحب! میں نے معذرت کی انداز میں بتایا۔ آپ سے نہیں وہ میری ذات کو بچانا چاہتا ہے کہ وہ میرا دوست بھی ہے اور ممنون بھی۔“

”چلو پھر نکل چلیں۔“

”کہاں جائیں گے؟“

”کہیں بھی! ملک مصنوعی دائری اور وگ فٹ کرتے لگا۔ ابھی اطراف میں میرے ٹھکانے اور ہمدرد بہت ہیں۔“

”آپ کے خیال میں کیا ریڈ پارٹی قطار میں مارچ کرتی آ رہی ہوگی؟“

”کیا مطلب؟“ اس نے وگ جاتے ہوئے پلٹ کر پوچھا۔

”مطلب یہ ہے جناب! وہ لوگ تمام راستوں کی ناکہ بندی کر کے ریڈ کریں گے۔“

”اوہ... پھر...! وہ سوالیہ لنگاہوں سے میری جانب گھومتا ہوا بولا۔“

”میں فی الحال صرف یہ جگہ چھوڑتا ہوں کہ کسی بھی قریب ترین کوٹھی پر قبضہ کر کے وقت کا انتظار کریں گے، جب وہ لوگ واپس ملے جائیں گے تو ہم ہارون کی رہنمائی میں پنڈی سے نکل جائیں گے۔“

”ٹھیک ہے جو ہداری! ملک نے رو دینے والے انداز میں ہنس کر کہا۔ کبھی سوچا تک نہ تھا کہ اس طرح جاسوسی ناول کا کردار بننا پڑے گا۔ وہ بیگی کی جانب پلٹ کر بولا۔ جانم! اسے بعد کوئی آئے تو کہہ دینا گاڑی چھوڑ کر واپس چلے گئے تھے۔“

”میری فکر نہ کرو ملک! میں ان سے منٹ لوں گی۔ گاڑی کے کاغذ چھوڑ جانا۔ بیگی کے بات کرنے کا انداز ایسا ہی تھا جیسے کہنا چاہتی ہو، جلدی سے دفع ہو جاؤ۔ مجھے صرف گاڑی کی ضرورت ہے۔ ہم گیٹ تک دوڑتے گئے پھر پھلتے ہوئے ٹرک عبور کی اور سامنے والی گلی میں داخل ہو گئے۔ ہارون نے جس کوٹھی کا نمبر دیا تھا، دوسری طرف جا کر معلوم کرنا تھا کہ راستہ ہے یا باؤنڈری وال پھاندا پڑے گی۔ نمبر تو میں نے گیٹ سے نکلتے ہی دیکھ لیا تھا مگر ڈرائیو میں رنگ بھرنے کے لیے کچھ اداکاری تو کرنا تھی۔

”خرم! میں لڑائی بھڑائی کا آدمی نہیں ہوں، بس میرے حکم پر میرے ماتحت یہ کام کرتے رہے ہیں۔“

”میں بھی ایسا ہی ماتحت ہوں جناب! میں نے کیا وڈوال کو دیکھتے ہوئے جواب دیا۔ گریڈ توڑنا اور تیریاں پٹھانا میری پسندیدہ ہابی ہے۔“

”اگر کوئی بڑی فیملی ہوئی تو؟“

”گھر میں ایک ڈویژن فوج کو بھی قابو کروں گا۔“

”کاش تم اچھے وقت ملے ہوتے۔“ وہ ایک طویل سانس لے کر بولا۔ اس کے بھیج میں حسرت کا تاثر غالب تھا۔

”اچھے وقت صرف ابن الوقت ملا کرتے ہیں ملک جی! میں نے کہا۔ اچھے ہی ہوتے ہیں، جو بڑے وقت میں اور پھر جہان نہیں میں نے تکلفی سے اس کے کاغذ پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

”پچھلی طرف بھی ایک گیٹ تھا جو نیم واقعہ برساتی میں ایک فوس کی کھڑی تھی۔ میں بے جھجک گیٹ سے داخل ہوا اور پانچویں کی بجری کھلتا ہوا بڑھنے لگا۔ ملک نواز میری ایڑیوں پر پیچھے آ رہا تھا۔ برآمدے میں بید کی کرسیوں میں سے ایک پر بائیس ٹیس برس کی ایک خوش رو لڑکی میگوین کے مطالعے میں موصوفی۔ قدموں

کی چاپ سن کر اس نے پلٹ کر دیکھا تو ملک نواز نے میرے شلے پر ہاتھ مارا۔

”یہ... یہ... اوہ...!“

”اسلام علیکم میں...!“

”راہیہ حسن...! بیگی نے اٹھ کر خوش دلی کا مظاہرہ کیا۔ تشریف لے گئے۔“

”کیا حسن صاحب تشریف رکھتے ہیں؟“ میں نے بھی مسکراہٹ کا جواب مسکراتی آنکھوں سے دیا۔

”جی نہیں ڈیڈی ٹور پر ہیں۔“

”اور... اور آئی...! میں نے پوچھا۔ میں آپ کا کون خرم سلطان ہوں، شاید آپ نے میرا نام کبھی سنا ہو۔ امریکہ میں سیٹل ہوں پیسے آئی سے طویل ہے۔“

”تشریف لائے کزن صاحب! راہیہ منی تو جتنے گنا سا بچ اٹھا۔ عجیب اتفاق ہے کہ میں نے کبھی آپ کا ذکر نہیں سنا۔“

”اے ظالم مروادیا تم نے ملک نواز نے میری پسلی پر ٹھوکا دیا۔ یہ فیملی مجھے اچھی طرح جانتی ہے۔ حسن آخر ڈیڈی ڈاکٹر تھے۔“

”یہ تو اور بھی اچھی بات ہے، میں نے شلے اچھلے ہوئے کہا۔“ چلے اصل شکل میں آجلیے ہیں آپ کا امریکہ پلٹ بیٹا ہوں اور ملک نواز نے فوراً وگ اور دائری نوچ کر جیبوں میں ڈال لی۔

”متی! دیکھیے آپ کے کوئی بھانجے، جیتنے قسم کا جہان آیا ہے۔“

”راہیہ نے کچن کے دروازے پر جا کر ہانک لگائی۔ اس کا بوجھ مضحکہ اڑانے والا تھا۔ کچن سے ایک خاتون دوپٹہ درست کرتی ہوئی نکل آئیں۔“

”اوہ...! سلام علیکم بھائی جان! ملک کو دیکھ کر گھر کی آنکھیں حیرت سے پھٹ گئی تھیں۔ راہیہ نے بھی پلٹ کر دیکھا اور پھر اس کا منہ کھل گیا۔

”ارے انکل آپ... لیکن آپ کی... آپ کی...؟“

”یہ ہے میری! ملک نواز نے دائری نکال کر ہاتھ لگایا۔

”چیلے اندر... راضی تم ذرا برتن سنبھال آؤ... یہاں ناہک کی کیا ضرورت تھی؟“

”تمہی بھائی! یہ لمبی داستان ہے۔“ ملک نواز نے جواب دیا۔

”تشریف رکھیں! ڈرائنگ روم میں بیٹج کر خاتون نے مرتش آواز میں کہا۔ ”وہیے خیریت ہے نا؟“

”اوہ پریشانی کی کوئی بات نہیں بھائی! ملک بولنے لگا۔

”سیاسی لوگوں کے ساتھ گڑبڑ چلتی رہتی ہے۔ حکومت مجھے

پابند کرنا چاہتی ہے اور میں فی الحال گرفتار نہیں ہونا چاہتا
بس اتنی سی بات ہے، آپ کو ہم زیادہ دیر زحمت نہیں دیں
گے، جو نبی گاڑی کا انتظام ہوگا، ہم چلے جائیں گے۔
”کمال کرتے ہیں بھائی جان“ خاتون ہاتھ نچا کر بولی۔ زحمت
کیسی راحت کیسے، یہ آپ کا اپنا گھر ہے جن صاحب نہیں
ہیں تو کیا ہوا؟
”شکریہ آپ کی محنت اور اپنائیت کا سہارا ہی مجھے
یہاں لایا ہے۔“
”آپ تھوڑی دیر کے لیے اجازت دیں گے، راضی سے کھانے
کا کپڑا دوں؟“
”ارے نہیں، کھانا تو ہم کھا چکے، کافی چلے گی۔“ ملک نواز
نے اسے روک دیا۔
”ان کی نگرانی کی ضرورت تو نہیں؟“ اس کے باہر نکلتے ہی
میں نے ملک نواز کے کان میں سرگوشی کی۔
”نہیں، پیارے، یہ اپنے لوگ ہیں، یوں سمجھو خریدے ہوئے۔
وہ ہنسنے لگا۔ اب تک باقاعدگی سے پے منٹ کر رہا ہوں۔
حسن ہوتا تو تم دیکھتے پاؤں میں بیٹھتا۔“
”پھر آئیے، اوپر چلیں، کھڑکی سے ریڈ پارٹی کا نظارہ کریں گے۔“
”اے آندو! اجازت لے کر چلتے ہیں۔“
خاتون واپس آئی تو اپنے ساتھ خشک پھل لے آئی وہ
پاؤں میں تو نہ بیٹھی تھی مگر بھیجی جا رہی تھی اور بار بار میری طرف
عجیب نگاہوں سے دیکھ لیتی تھی میں نے کوشش تو کی تھی کہ اس
کی نگاہوں میں ڈوبتی ابھرتی تحریر پڑھ لوں مگر ناکام رہا تھا۔
”ہم اوپر بیٹھیں گے بھائی مجھے اپنے آدمیوں کا انتظار ہے۔“
وہ باہر آئیں گے۔
”شوق سے“ خاتون نے ٹرے اٹھائی اور چماری رہنمائی کرنے
لگی۔ وہ بیڈ روم تھا۔ اندر داخل ہوتے ہی میری ناک سے مالوس
سی خوشبو مگرائی اور میں بن پوچھے بیڈ روم کی مالک کو جان گیا۔ وہ
راہتیہ حسن کا بیڈ روم تھیں اس مخصوص خوشبو سے مالوس اور
آشنا تھا۔ ایسی ہی خوشبو آیدنا اور مارشکی خواب گاہوں
میں بھی محسوس کی تھیں۔
”ہم کرسیاں کھینچ کر کھڑکی کے قریب ہو گئے اور
بے دلی سے خشک فروٹ کے دانے چبانے لگے۔
”کیا شہبازی لاہور گیا تھا؟“ میری آواز پر ملک کے ہاتھ
سے دانہ چھوٹ گیا اور چلتا مڑتا گیا تھا۔ اگر وہی تھا تو اس

کی گرفتاری میرے لیے بھی پریشان کن ہے۔ میں شیتہ کی خبریت
کے لیے بے چین رہوں گا۔“
”سوری چوہدری، ملک نے گہری سانس لی یوں بلبل
ہوں، ہاں اگر تم چاہو تو میں تمہیں نہیں روکوں گا۔“
”میرا یہ مطلب نہیں تھا ملک صاحب!“
”بہر کیف میں اپنا وعدہ نہیں نبھاسکا ہوں ہو سکتا ہے
وہ لڑکی بذریعہ پولیس گھر پہنچادی گئی ہو۔“
”شہباز کے حوالے سے وہ اتنی آسانی سے گھر نہیں جانے
دی جائے گی۔“
”ہاں لیکن جب وہ میرا حوالہ دے گی تو اسے چھوڑ دیا
جائے گا۔“
”میرا خیال اس کے برعکس ہے جناب! پولیس اس کے
ذریعے خرم سلطان کو گھر لے کر کوشش کرے گی۔“
”مجھے بتایا گیا ہے کہ پولیس سے تمہارے تعلقات اچھے ہیں۔“
”جی بہت اچھے۔“ میں اتنا تڑپا ہوا انداز میں ہنسنے لگا۔ ”جیسے دیکھو
اور بتائے ہوتے ہیں پھر ان حالات میں گندم کے ساتھ گھنٹن بھی
پیس دیا جائے گا۔“
”اچانک ایک جیب ٹرن لیتی ہوئی لگی سے نکلی اور گیٹ
کے سامنے رُک گئی۔ چار سادا لباس والے کوڑے، ان میں بیگن
بھی شامل تھیں نے اسے قدامت و حال سے پہچان لیا۔ ایک آدمی
گیٹ پر کھڑا رہا باقی تینوں اندر جا کر بکھر گئے بیگن بہت اچھی اداکاری
دکھا رہا تھا۔
”ہارون نے خود کو بہت بڑے انعام کا مستحق بنا لیا ہے۔“
”ملک جھجھاتی آوازیں کہنے لگا۔ ”جب یہ وقت مل جائے گا
تو میں اسے بلیک چیک دے کر کہوں گا، احسان کی قیمت بھر لو۔“
”میرا خیال ہے جناب محسن اور مزدور کو فی الفور ادائیگی
کرنی چاہیے اگر بات بڑھ گئی تو آپ کے تمام اثاثے بھی منجمد
کیے جاسکتے ہیں۔ اس سے قبل کہ وہ مایوس ہو کر دوسری کارروائی
کریں۔ کم از کم ہارون کو پے منٹ ہو جانی چاہیے۔“
”تم نے درست سوچا ہے خرم، ملک اثبات میں گردن
ہلانے لگا۔ ”کیا ہارون قابل بھروسہ ہے؟“
”کیا اب بھی اس کے بارے میں ایسا سوال کر رہے ہیں؟“
”ٹھیک ہے میں پانچ لاکھ کا چیک ڈول گا۔ اپنا انعام
رکھ کر بتایا رقم مجھے پہنچا دے گا۔ خالی ہاتھ ادھر بھی کوئی نہیں
پہنچانے گا۔ میں ہاتھ پر ہاتھ تو دھرتا نہیں ہے۔ تم اگر میرے

میرے پتے کچھ نہ پڑا تھا۔
”ملک نواز کی سیاست وہاں کام آئی۔ اس نے درمیان
جا کر دونوں پشتوں تقریر کی اور جھگڑا کوئی ناخوشگوار صورت
افتاد کرتے کرتے ٹل گیا لیکن بہت سے لوگ دعوت سے واک
اؤٹ کر گئے تھے اور مجھے بتایا گیا تھا کہ وہاں کی روایات کے تحت
وہاں کی بات ان لوگوں نے رد نہ کی تھی مگر اس ہتک کا بدلہ
لینے کا اعلان کر کے گئے تھے۔“
”پینے کے لیے خوشبودار اور نمکین تھوہ تھا جہاں جب چلے
گئے تو خان جبار خان نے مجلس مشاورت بلائی اور جھگڑے کی وجہ
سے پیدا ہونے والی صورت حال پر تبادلہ خیالات ہوا جس
میں ملک نواز کی رائے بھی شامل تھی سادات بارہ نیچے فرش پر
جب کمرنگانے کی مہلت ملی تو میں بیٹھے ہی سو گیا تھا۔ صبح اذان فجر
کے ساتھ ہی بازار میں زندگی بیدار ہو گئی تھی میں نے پہاڑ جیسے
جبار خان کو رکوع سجود میں دیکھا۔ باقی لوگ قریبی مسجد میں جانے
لگے تو میں بھی ساتھ ہو گیا البتہ ملک نواز کو روٹ بدل کر پھر سو
گیا تھا جب ہم نماز اور دو تین فرلانگ سیر سے فارغ ہو کر لوٹے
تو ملک نواز چیت لیٹا سگریٹ پی رہا تھا۔
”ناشتے کے بعد میری خواہش یہ رہی ملک نواز نے فیکٹری ایریا
دیکھنے کی درخواست دی تھی جسے یہ کہہ کر قبول کر لیا گیا کہ پورے بازار
کی رہنمائی میں صرف وہی کچھ دیکھو گے، جو وہ دکھانا چاہے گا۔ ہم
اپنی بات منوانے کی پوزیشن میں نہ تھے لہذا مجبوراً مشروط طور پر
ہل پڑے۔“
”پہاڑ کا لایا گیا تھا یا وہ قدرتی سرنگ تھی۔ کوئی آدھا کلومیٹر
طویل سرنگ میں جدید مشینری دن رات کام کر رہی تھی۔ پوسٹ
تمام حالت میں ٹرکوں سے ان لوڈ ہوتی اور ریڑھیوں کے ذریعے
اندر لے جاتی جا رہی تھی مجھے گائیڈ نے بتایا کہ پہلے کھڑی فصل
سے اٹیوون کی شکل میں پوسٹ حاصل کیا جاتا تھا مگر اب ایسی
مشین آگئی ہیں جو عرق نکال لیتی ہیں پہلی صورت میں جو مال تیار
ہوتا تھا اس کی رنگت کوشش کے باوجود سیما ہی مائل رہتی تھی
مگر اب معمول کو ریفائن کر کے سیروٹن تیار کر لی جاتی ہے، سیروٹن
جب تیار ہوتی ہے تو اسے تین مرحلوں میں حاصل کیا جاتا ہے
اس طرح تین قسم کی سیروٹن بنائی جاتی ہے۔ ملک نواز نے خلعت
کرتے ہوئے گندم امید، سبزی اور آٹے کی مثال دی تھی۔
آٹے والی قسم کو مسرے دہے والی سیروٹن کہا جاتا ہے اور یہ قسم
چرس سے ہنسی مگر سیروٹن سے کستی فروخت ہوتی ہے، جو

عموماً کیپسولز میں بند کر کے نام نہاد ڈرگ اسٹورز میں پہنچائی
جاتی ہے۔
”طورا باز خان نام اور لباس کے حوالے سے روایتی افغان
تھا لیکن روانی سے اردو اور انگریزی بولتا تھا، وہ جنرل میجر اور
چیف انجینئر کے فرائض سرانجام دے رہا تھا۔ ملک نواز نے اس
کا رویہ محتاط اور افیشل تھا لیکن میں نے اپنے لیے اس کی آنکھوں میں
دوستی اور اپنائیت کی روشنی دیکھی تھی۔ وہ جیب مجھے کچھ بتاتا تو
اس کا بوجھ نرم اور دوستانہ ہوتا۔“
”ہم ہیروئن کو ہر شکل میں تیار کرنے میں کامیاب ہو چکے ہیں۔
ہمارے کلائنٹس چاہتے تھے کہ چرس اور ہیروئن کے استعمال میں
فرق ہونا چاہیے چرس سگریٹ سے تمباکو نکال کر ملائی جاتی ہے
ہم کوشش کر رہے تھے کہ سگریٹ اور بجھل حالت میں ہی مطلوبہ
نتائج دے۔ اب ہم معمول بنا رہے ہیں، جو چھوٹی چھوٹی میوہوں
میں بھر دیا جاتا ہے میوہ سے سگریٹ پر اوپر سے نیچے تک ایک
کیر لگائی جاتی ہے، اس طرح ہیروئن سگریٹ کے اندر جذب ہو
جاتی ہے۔“
”اس نے ایک مشین دکھائی، جو پلاسٹک کی میوہوں میں بنا
رہی تھی۔ میوہ کی شکل لپ اسٹک سے مشابہت رکھتی تھی۔ کچھ میوہوں
ایمنٹ میوہ سے ملتی جلتی تھیں۔“
”اس طرح طورا باز خان بولنے لگا تو نشتے باز کو ہیروئن لکھنے
میں کسی خطبے اور دشواری کا سامنا نہیں کرنا پڑتا۔ لپ اسٹک
میوہوں ہم خواتین کی سہولت کے لیے تیار کرتے ہیں وہ اپنے
پرس میں بڑی آسانی سے رکھ لیتی ہیں۔“
وہ باتیں کر رہا تھا اور میں بظاہر حیرت اور خوشی کے
تاثرات چہرے پر لیے بڑی دلچسپی سے ایک ایک چیز دیکھ رہا
تھا، جبکہ میرا ذہن اور آنکھیں کچھ اور سوچ اور دیکھ رہی تھیں۔
میں آنے والے کل کے بارے میں سوچ رہا تھا اور وہ راستہ دیکھ
رہا تھا جس پر چل کر مجھے ایک بار پھر آنا تھا لیکن سرنگ میں
داخل ہونا اور کسی ملک کے ایٹمی پلانٹ میں داخل ہونا برابر
ہی تھا۔ سرنگ کے مٹھ پر میں نے تین خوشخوار محافظ دیکھے تھے
اور دوسری رکاوٹ یہ تھی کہ فیکٹری دن رات چالو رہتی تھی۔
”ملک نواز کو اس سے کوئی عزم نہ تھی نہ دلچسپی کہ ہیروئن کن
مرحلے سے گزرتی ہے، وہ صرف نمونے حاصل کر رہا تھا اور ویل میجر
سے کاروباری معلومات حاصل کر رہا تھا۔“ خرم، ”ملک نواز نے
مجھے سرگوشیانہ آوازیں پوچھا، کیا باہر کی مارکیٹ میں معمول

کی ڈیمانڈ ہے؟

”بہت زیادہ جناب میں نے جواب دیا تو میں نے بزنس کی ابتدائی ایسی ایک ٹیوب سے کی تھی۔“

”ٹھیک ہے“ وہ گردن اٹھاتی انداز میں ہلاتا ہوا آگے بڑھ گیا۔ ہارون جب آئے گا تو ہم ان سے سارا شک اٹھا لیں گے۔“

میں نے طور بازار کو اپنے مقاصد کے لیے منتخب کر لیا۔ اس کی ذات میں کوئی ایسی ہی بات تھی، جس نے مجھے متاثر کیا تھا۔ میں نے ادھر ادھر سے اس کا تاریخ و جغرافیہ معلوم کیا۔ وہاں بہت سے نوجوان ایسے تھے جو پاکستان اور برطانیہ کی درس گاہوں سے تعلیم حاصل کر چکے تھے۔ ملک نواز فیکٹری کی سیر سے فارغ ہو کر فرید خان کے ساتھ واپس چلا گیا تھا لیکن مجھے طور بازار نے روک لیا تھا۔ اس کا شاندار دفتر ریٹائرنگ روم اور دن بھر بھی تھا۔ دفتر میں چند نوجوان کام میں مصروف تھے۔ وہ مجھے بندروں میں لے گیا۔

”اب بولو دوست کیا پناہ دے گا؟“ وہ جیکٹ بیڈ پر اچھال کر بولا تو لکھت جیکٹ کی طرح اتار پھینکو خرم سلطان! میں اچھے دوستوں کے لیے ترس گیا ہوں ادھر صرف بزنس میں آتے ہیں جو سرگوشیوں میں سوئے کرتے ہیں اور تاریکی میں نکل جاتے ہیں۔ لیکن تمہاری ذات مجھے اُن سے بالکل مختلف لگتی ہے۔ تم نے مجھے متاثر کیا ہے، دوست لیکن صرف اوڑھ کر سے اندر سے پتا نہیں تم کیا ہو تم سے دوجے کے فنڈے یا ملک نواز کے باڈی گارڈ؟ اُس نے زور سے میرے شانے پر ہاتھ مارا وہ شیر کو فطری نہیں ہونا چاہیے ہمارے بزرگ کہا کرتے ہیں قیامت کے دن شیر اپنی قوت سے آگاہ ہوگا اور وہ پچھتاے گا کہ اتنی قوت کے باوجود وہ کمزور انسانوں سے ڈرتا جنگلوں میں بادشاہی کرتا رہے۔ تم بھی شیر ہو خرم سلطان اور میں قیامت سے بہت پہلے تمہیں آگاہ کر رہا ہوں۔ اپنی طاقت سے اپنا شکار کیا کرو۔ گیدڑ کی طرح دوسرے کے شکار کی بڑیوں سے ماس کریدنا تمہیں زیب نہیں دیتا۔“

”شکریہ خان“ میں نے جواب دیا تو میں خود نمائی کا قائل نہیں ہوں لیکن تم نے گیدڑ کہہ کر میرے اندر کے خرم سلطان کو باہر آنے پر مجبور کر دیا ہے۔ میں گیدڑ نہیں ہوں دوست نہ طفیلی ہوں میں ہانگ کا ہانگ کا گریڈ ماسٹر ہوں مجھے تعین ہے ہے تم تیرا کے بدنام شہر میں ضرور لگے ہو گے۔“

”ہاں میں مارکیٹ تلاش کرنے جاتا رہا ہوں۔“
”تو پھر تم نے می بچا اور چنگچی کے نام ضرور سے ہوں گے۔“
”نئے ہی نہیں میں دونوں سے واقف ہوں وہ دونوں میرے خریدار تھے میں یہاں سیٹل ہونے سے پہلے ٹرپ لے کر جایا کرتا تھا مجھے میرے پاس نے برطانیہ میں ایڈمیشن اسی مقصد کے لیے کرایا تھا میں بحیثیت اسٹوڈنٹ کامیاب بزنس کرتا تھا۔“

”آخری بار کب گئے تھے؟“
”شاید ایک برس قبل۔“
”کیا تم یقین کر لو گے خان؟“ میں نے اُس کی آنکھوں میں جھانک کر کہا میں نے اُن دونوں گریڈ ماسٹر کو ہانگ کا ہانگ سے فرار ہونے پر مجبور کر دیا تھا اور وہ دونوں ہی میرے ہاتھوں فلپائن میں موت کے گھاٹ اتر چکے ہیں اور می بچا کا گروہ میرا ماتحت ہو گیا تھا۔“

”اوہ نہیں“ وہ اچھل پڑا۔ ”کیا واقعی؟“ وہ انگریزی میں چیخا۔ ”میرے خدا...! وہ پچھلی پٹی لگا ہوں سے میرا چہرہ تھکے لگا۔“

”ہاں خان یہ سچ ہے۔“
”یقین کر لیا۔ یقین کرنا پڑے گا تم ایسے ہی دکھائی دیتے ہو۔“ وہ پرجوش لہجے میں بولا۔ ”خدا کی قسم میں نے تمہیں دیکھ کر ہی پہچان لیا تھا کہ یہ نوجوان نعل بچہ نہیں ہو سکتا، ہاتھ مارا پیارے۔“ اُس نے زور سے میرے ہاتھ پر ہاتھ مارا۔ ”میرے دوستی قبول کرو۔“

”پورے خلوص کے ساتھ میں نے اُس کا چوڑا ہاتھ منہ سے پکڑتے ہوئے کہا۔“

”اب یہ ہاتھ ایک دوسرے کے محافظ اور مفادات کے ضمانت ہوں گے، دوستی کے نام پر بزنس کی بات نہیں کروں گا میں تم مال لے جاؤ گے، پرافٹ فٹنی فٹنی، بولو منہ میں نے اثبات میں گردن کو جنبش دی تو طور بازار خان نے میرے دونوں ہاتھوں کو پکڑ کر جھٹکا دیا اور پھر مجھے گھٹے لگایا تو میں کوئی عہد نہیں لوں گا خرم سلطان! میں جہاز کو دوستی ہی عہد ہے اور معاہدہ ہے۔“

”شکریہ! میں اس اعتماد کی حفاظت کروں گا۔“
میرے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ وحشی درندوں کے جنگل میں کوئی درندہ مجھ سے مانوس ہو جائے گا۔ ہو سکتا

طور بازار کی کوئی اپنی مصیبت، مجبوری یا کوئی مفاد ہاں ہو لیکن بظاہر اُس نے محنت کا ہی اظہار کیا تھا، جب بھی اور جہاں بھی کوئی درندہ گرویدہ ہوتا ہے تو مجھے بوزھا چنگچی یاد آتا ہے، جس نے میری پیشانی پر روشن ستارہ دیکھ لیا تھا۔ شاید وہی ستارہ ہی میرا معاون تھا ہر مشکل میں روشنی دیتا تھا اور بند دروازے کھولتا تھا۔

دو پہر کا کھانا بھی طور بازار کے ساتھ کھانا پڑا تھا ملک نواز نہ جانے کہاں تھا کیا کر رہا تھا میں نے بھی کسی سے پوچھنا مناسب نہیں سمجھا تھا اور نہ ہی اُس کی طرف سے بلاوا آیا تھا۔ طور بازار نے میری طلب کے مطابق میرے سامنے اعلیٰ رینڈن پیکی کی اور جیکٹ کے ساتھ مجھے اپنے گھر لے گیا۔ پہاڑی کے دامن میں قطار در قطار رہائشی جھونپڑوں کا سلسلہ دور تک پھیلا ہوا تھا۔ باہر سے تو وہ کچی مٹی کا گھر وندہ ہی دکھائی دیتا تھا مگر وال وال کاریٹ اور دیواروں کے ساتھ چمک دار پلاسٹک پیپر چسپاں تھا ایک ہی جنرل تمام گھروں کے لیے تھا یا طور بازار نے یہ سہولت صرف اپنے لیے رکھی تھی۔ جب ہم اندر داخل ہوئے تو رنگین ٹی سوی پر انگریزی فلم چل رہی تھی لیکن ٹی سوی لاؤنج بالکل خالی تھا۔ غالباً قدموں کی چاپ سن کر کوئی اُٹھ کر دوسری جانب چلا گیا تھا میری ناک سے وہی مانوس نہک نکلتی تھی، جو لڑکیوں کی موجودگی کا احساس جگاتی تھی۔

”مند کروں یا دیکھو گے؟“ طور بازار نے ٹی وی کے بیٹن پر ہاتھ رکھ کر پوچھا۔ ”مجھے تمہاری روانگی اور سفر کے انتظامات کے لیے شاید رات تک باہر رہنا ہوگا۔ محافظ موجود رہے گا۔“ میں نے کوئی جواب نہ دیا تھا لیکن اُس نے ٹی وی سیٹ آف کر دیا۔ ”محافظ کو مسلط دیکھ کر کسی غلط فہمی میں نہ مبتلا ہو جانا پیارے، یہاں ایک اور دوست کی امانت ہے، محافظ اُس کی حفاظت کر رہا ہے، تم آزاد ہو لیکن اس کمرے اور باہر تک دوسرے کمرے میں ایک خاتون ہے، شاید وہ تم سے ملنے کی کوشش کرے لیکن تم اُس سے کوئی بات نہیں کرو گے۔“

میں نے آنکھوں کو اثباتی انداز میں چھپکایا اور طور بازار ہنسا ہوا دوسرے کمرے میں چلا گیا۔ محافظ نے جھانک کر دیکھا پھر میری کھیت نگاہوں سے گھبرا کر پیچھے ہٹ گیا۔ طور بازار، کارٹوس کا تھیلا اور ڈبل بیرل گن کے ساتھ باہر آیا تو میں نے شلکی لہجے میں کہا۔

”خان! کیا تمہیں مجھ پر اعتماد ہے؟“ اُس نے استغفامیہ

نگاہوں سے دیکھا اور جھجھاتی آواز میں بولا۔

”کیا بات ہے خرم! یہ بات تم نے کیوں پوچھی؟“

”یہ میرے سوال کا جواب نہیں ہے خان۔“

”میرا جواب ہے۔“ وہ ہولے ہولے چلتا ہوا میرے قریب آ گیا۔ ”مجھے تم پر اعتماد ہے، اب بولو۔“

”پھر محافظ اپنے ساتھ لے جاؤ میں اس امانت کی حفاظت کروں گا تم نے کہا تھا، وہ امانت کی حفاظت پر مامور ہے لیکن وہ مجھے باہر دیکھ رہا ہے، اگر اُسے نہیں ہٹا سکتے تو مجھے ساتھ لے لوں ملک نواز کے پاس رہ جاؤں گا۔“
”سنو پیارے؟“ اُس نے دونوں ہاتھ میرے شانوں پر رکھ دیے۔ ”اندر ایک مغویہ ہے جسے ہنڈی سے لایا گیا ہے، وہ کسی بڑے آدمی کی بیٹی ہے، میں لا لکھ کی اسامی ہے۔“

”اوہ آئی سی۔“ میں نے سیٹی بجاتے والے انداز میں حیرت کا اظہار کیا۔ ”میں لا لکھ کا کمیشن بھی معقول ہوگا؟“

”اوہ نہیں دوست! اُس نے نفی میں ہاتھ لہرایا۔ ”ہم دوستوں سے سودا بازی نہیں کرتے، میں اگر لڑکی والے مطالبہ پورا نہیں کرتے تو پھر میں سودا کروں گا، مجھے لڑکی بے حد پسند آتی ہے۔“

”خان...! میں نے مزید معلومات کے لیے بات بڑھائی۔ ”ادھر لڑکیوں کی مارکیٹ ہے تو ایک دو لڑکیاں میں بھی لا سکتا ہوں۔“

”صرف ایک دو؟“ طور بازار کی ٹکراتی ہوئی آنکھوں میں چمک ابھری۔ ”دوست! مجھے یقین ہے اُس شہر کی تمام لڑکیاں ان آنکھوں میں ڈوب سکتی ہیں۔ لاؤ پیارے یہ جنس ادھر اتنی ہی ناپااب اور مہنگی ہے، جتنی میری وشن ادھر ہے۔ آتے ہوئے وہ جنس اس مارکیٹ میں لے آؤ اور واپسی پر ادھر کی طلب ساتھ لے جاؤ۔“

”یہ بھائی نا بات۔“ میں خوشی سے چہک اٹھا۔ ”اگر راستہ کی دشواریاں آئے نہ آئیں تو میں مطلوبہ جنس بھیڑ بکریوں کی طرح ہانگ کر لاؤں گا۔“

”کوئی دشواری نہیں دوست۔“ طور بازار باوثوق انداز میں بولا۔ ”ہم نے تمام راستے خریدے ہوئے ہیں۔ اچھا تم آرام کرو، محافظ یہاں سے بچاس گز دور رہے گا۔“

جب وہ روانہ ہوا تو اُس کے ساتھ محافظ بھی دروازے سے ہٹ گیا تھا میں نے وقفے وقفے سے کھڑکی سے باہر دیکھ

تھا۔ محافظ واقعی دُور پہل رہا تھا۔ دوسرے کمرے کا بغلی دروازہ بند تھا۔ میں نے کواڑوں پر ہلکی سی دستک دی اور دوسرے لمحے اُدھر چڑیاں بچنے لگیں۔ میں نے کواڑوں پر دباؤ ڈالا اور اُس نے زنجیر اُتار دی... پھر گھر پر ایک دم پیچھے ہٹ گئی۔ بدن کو ایسے سمیٹ لیا، جیسے چھوٹی موٹی کا پودا ہاتھ بڑھتے دیکھ کر اپنے آپ میں سمٹ گیا ہو۔

”گھبرائے نہیں میں؟ میں آپ کا ہم وطن ہی نہیں ہوں شہری بھی ہوں۔“ اُس نے ہلکوں کے جھال اُٹھائے اور میرے بدن پر سرسراہٹوں کا چال سا لہراتا ہوا اُفک اُٹھ گیا۔ سیاہ، روشن اور بڑی بڑی آنکھوں میں ایسا ہی سحر تھا۔ شہزادہ سلیم نے جس انارکلی کی خاطر مغل اعظم سے بغاوت کر دی تھی، وہ کیسی تھی لیکن جوانا کلی میرے سامنے تھی، اُس کا رنگ اور اُنکا انارکلی کی جی جیسی تھی۔ وہ سترہ اٹھارہ برس کی کوئل جیسی لڑکی آنکھوں میں حیرت اور خوشی کے چراغ روشن کیے ایک ہلکے مجھے دیکھے جا رہی تھی۔

”آپ... آپ کا نام خرم سلطان ہے نا؟“ مندر کی گھنٹیوں نے سحر تھرائی آوازیں پوچھا۔

”ہاں میں...“

”عائشہ قادر...“ اُس نے نام بتایا۔

”میں عائشہ قادر میرے کمرے میں آئیں! دھڑک رہی ہوں۔“

”اب بھی نظر رکھیں گے؟“

”کیا باہر محافظ نہیں ہے؟“

”ہے لیکن پچاس گز دُور رہے گا۔“

وہ لڑکی جی دار تھی یا روتے روتے آنسوؤں کے موتے خشک کر چکی تھی۔ میں تو ایک مشکل ترین مرحلے سے گزرتے کی تیاری کر رہا تھا لیکن عائشہ کے مضبوط حوصلے نے مجھے اس مشکل فرض سے بچا لیا تھا، اگر وہ عام لڑکیوں کی طرح رونے لگتی تو خاما وقت اُسے چپ کرانے میں صرف ہو جاتا۔

”یہاں اور کون رہتا ہے؟“

”کوئی بھی نہیں۔“ عائشہ نے بتایا۔ یہ اب میرا قفس ہے، یہاں دو تین بار آتا ہے، خیر خیریت پوچھ لیتا ہے، باہر ایک محافظ دن رات موجود ہوتا ہے۔“

”اگر مناسب خیال کریں تو مختصر الفاظ میں مجھے بتادیں۔“

میں نے کھڑکی سے جھانک کر دیکھتے ہوئے کہا۔ ”میں خود بھی کم و بیش تمہاری پوزیشن میں ہی ہوں لیکن میں کوشش کر سکتا ہوں۔ ہاں“

وعدہ نہیں کروں گا۔“

نعیم خان میرے ابو کا پارٹنر ہے۔ وہ بولنے لگی۔ ”ریڈنگ ایجنسی ابو کے نام ہے اور نعیم خان موبہ سرحد اور قبائلی علاقوں سے ہیں پاور سپلائی کرتا تھا۔ چھ ماہ قبل اُن لوگوں نے مشرق وسطیٰ کی کسی پارٹی کے لیے مین پاور بھرتی کی۔ چار جہاز رڈی پورٹ ہو گئے اور باقی لوگ وہاں جا کر لاپتہ ہو گئے۔ واپس آنے والوں نے معاوضے کی واپسی کا تقاضا کیا، ہوا تو جان نے پورا کر دیا، پھر غیر قانونی بھرتی کرنے کے الزام میں ابو جان گرفتار ہو گئے۔ نعیم خان فرار ہو کر بچ گیا تھا۔ جب بھاری جرمانہ اور گم شدہ لوگوں کے لواحقین کو رقوم واپس کرنے کے بعد رہا ہوئے تو نعیم خان نے اپنے حصے کے لیے دباؤ ڈالنا شروع کر دیا۔ ابو جان بالکل کنگال ہو چکے تھے، کہاں سے کچھ دیتے؟ میں آپ سے کچھ نہیں چھپاؤں گی۔ میں نعیم خان سے محبت کرنے لگی تھی۔ وہ ہمارا فیملی ممبر بن کر آتا، جاتا رہتا تھا۔ دس دن قبل مجھے شاپنگ کے لیے بازار لے گیا اور جب میری آنکھ کھلی تو میں اس قفس میں تھی، بس اتنی سی کہانی ہے۔“

”کیا آپ کے ابو نعیم خان کا مطالبہ پورا کر دیں گے؟“

”وہ تو ایک لاکھ کی پوزیشن میں بھی نہیں ہیں۔“ عائشہ نے بھرائی ہوئی آوازیں کہا۔ ”پانچ لاکھ کہاں سے دیں گے؟“

”مجھے تو بیس لاکھ بتایا گیا ہے۔“

”میرے خیال نعیم اب پانچ لاکھ پر اُتر آیا ہے، کیونکہ وہ بھی اصل صورت حال جانتا ہے۔“

”تو کیا آپ نعیم کے ساتھ رہنا پسند کریں گی؟“

”ہرگز نہیں۔“ وہ دھک کر بولی۔ ”میں تو اُس شیطان کے ساتھ مرنا بھی پسند نہیں کروں گی۔“

”پھر...؟“

”پھر...“ اُس نے جلتی ہوئی گہری سانس لی۔ ”پھر میں تنہا مرجاؤں گی، فرار کا نہیں تو مرنے کا راستہ کھلا ہے۔“ اُس نے گریبان میں ہاتھ ڈال کر چاقو نکال لیا۔ ”نعیم نے ہی بتایا ہے کہ سرکاری سطح پر ملٹی کی کوشش ہو رہی ہے، اگر یہ کار بھی ناکام رہی تو...“

”نہیں عائشہ! بوسہ نہیں، وعدہ کرو، خود کو سنبھالے رہو۔“

”میں کوشش کروں گا، اب نہیں تو یہاں سے نکل کر دوبارہ آؤں گا۔“

”میرے لیے...؟“

”نہیں۔“ میں نے نفی میں گردن ہلاتی۔ ”ایک مجبور باپ

کی خاطر، ایک ہم وطن لڑکی کے لیے۔“

”شکریہ؟“ وہ رو پڑی۔ آہٹ سن کر میں نے کھڑکی سے جھانک کر دیکھا، فرید خان آ رہا تھا اور محافظ اُس سے ہاتھ لہرا کر تکرار کر رہا تھا۔ عائشہ تم جاؤ، میرا محافظ مجھے لینے آ رہا ہے۔ میں پھر آؤں گا، کسی بھی وقت...“

فرید خان میری تلاش میں ہی آیا تھا۔ ملک نواز کا جرنل پیغام تھا۔ بازار میں، ہتھیوں کا ڈار اُتر آ رہا تھا۔ غلیظ مرد اور غریب زرد چہروں کو شکوک بناتے ایک ایک گولی چرس کے لیے دکان دکان پھر رہے تھے، جن کو ساحل مرادل گیا تھا۔ وہ کچی دیواروں سے ٹیک لگائے دھوئیں میں تحلیل ہو رہے تھے۔ ملک نواز مجھے دیکھ کر پکڑتا ہوا دروازے تک چلا آیا۔ وہ بے حد پریشان تھا۔ دو دنوں میں اُس کا گلابی چہرہ دھواں دھواں ہو کر لٹک گیا تھا اور آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے نمودار ہو گئے تھے، بڑھے ہوئے شیو کی کاہی کا جنگل ملک نواز کی اصل عمر اور چہرہ بے نقاب کر گیا تھا۔

”خرم سلطان بد نصیبی ہمارے ساتھ یہاں بھی جلی آئی ہے۔“ وہ جیسے سبکداریاں لینے لگا۔ ”مخالفت کرو وہ خان جبار پر حملہ کرنے والا ہے۔ خان نے ہماری سلامتی کی خاطر ہمیں یہاں سے چلے جانے کی ہدایت کی ہے۔ میں نے اُسے تسلی دیتے ہوئے بتایا ہے کہ خرم سلطان انسانوں کے جنگل کا شیر ہے، ہم کھلے میدان میں اسلحے سے نہیں لڑیں گے بلکہ سیاست اور طاقت سے دشمن کو اُس کے محاذ پر ہی تباہ کر دیں گے۔ میرے بیٹے خان کے لیے نہیں بلکہ اپنی بقاء اور سلامتی کی خاطر تمہیں کچھ کرنا ہوگا۔ ہم میدان جنگ میں لڑنے کی حماقت نہیں کر سکتے۔“

”میں کیا کر سکتا ہوں ملک صاحب؟“ میں نے سنجیدگی سے پوچھا۔ ”یہ مہذب لوگوں کا ضمیر نہیں ہے، پھر میں جلی ہوں؟“

”مہذب لوگ ہی ہمیشہ جاہلوں پر غالب آتے رہتے ہیں...“

”ہو ہد رے؟“ ملک بولا۔ ”یہ لوگ ہلکار کر دشمن کو مارنے کے قائل ہیں جب کہ ہم دشمن کے اندر جا کر پھٹتے ہیں۔“

”ٹھیک ہے مجھے ہدف بنا دیا جائے۔“ میرے اندر کا درندہ اُگر آئی کے رہ گیا۔

”کد...“ اُس نے میرا ہاتھ تھام لیا اور گھسیٹا ہوا اندر لے گیا۔ خان جبار کے گرد کم و بیش چالیس پچاس مسلح افراد جو کس کھڑے تھے۔ فرید خان! جبار خان کو خوش خبری سنا

دو خرم سلطان تنہا دشمن کو تباہ کر دے گا۔“ فرید خان نے ملک نواز کی باتیں پشتو میں دہرائیں اور حاضرین کے درمیان سنسنی پھیلانے لگی، کئی آنکھیں اپنے اندر حیرت کا تاثر چھپاتے میرے سر پر ہاتھ رکھ کر رہ گئیں، پھر جبار خان بولنے لگا۔ وہ ہدایت دینے کے انداز میں نام لے کر کچھ کہہ رہا تھا۔

”خرم سلطان! اپنی پسند کے ہتھیار اور آدمی جن لے۔“

”ایک اسٹین کن چند میگزین کم از کم دس ٹائم بم اور ایک ہلٹ پروف دین۔“ میری ڈیمنڈ ساتھ ساتھ فرید خان ریلے کرتا جا رہا تھا۔ میں آج رات کسی بھی وقت کارروائی کے لیے روانہ ہو سکتا ہوں۔ میں تنہا جاؤں گا اور کوئی شخص میری حفاظت نہیں کرے گا۔ میں اُس گروہ سے گروہی پناہ طلب کروں گا۔“

”گو چھپ کر وار کرنا ہماری روایات کے منافی ہے۔“

فرید خان نے جبار خان کی ترجمانی کرتے ہوئے بتایا۔ ”لیکن وقت کا تقاضا یہ ہے۔ اس لیے خرم سلطان کو شام تک مطلوبہ سامان پہنچا دیا جائے گا۔“

”ملک نواز مجھے ایک طرف لے گیا اور جان لڑانے کی باتیں کرنے لگا۔ لیکن میرے اندر عمل کی مشینری گھر گھر چل رہی تھی۔ میں ملک کی باتوں کی بجائے اپنے لائحہ عمل کے بارے میں سوچیں سلنے میں ڈھال رہا تھا۔

نوجے میں طور باز سے ملاقات کرنے کے یہاں فیکٹری میں داخل ہوا۔ چونکہ محافظ مجھے طور باز کا خاص مہمان سمجھتے تھے اس لیے انھوں نے مسکرا مسکرا کر سلام کیا تھا۔ نوجے کا وقت میں نے سوچ کر رکھا تھا۔ ٹھیک چار بجے آدھے گھنٹے کے لیے تمام کام معطل کر دیا جاتا تھا۔ انسانیت کے قاتل پانچوں غازیں باجماعت ادا کرتے تھے۔ میں نے ظہر کی نماز کے دوران داخل ہونا چاہا تھا لیکن ملک نواز چپکار رہا تھا اور پونے دو بجے کھانا دیا گیا تھا۔

طور باز کے کلرکوں نے بھی خندہ پیشانی سے میرا استقبال کیا اور میں انھیں جوابی مسکراہٹ دیتا ہوا ریٹائرنگ روم میں چلا گیا۔ طور باز ابھی واپس نہیں آیا تھا، پھر جب ٹرننگ میں اذان کی آواز گردش کرنے لگی تو میں نے بھی اُسی بڑے اللہ کا نام لیا اور تھیلہ ایک تکیے کے نیچے رکھ دیا۔ ٹرننگ کے دہانے پر یقیناً محافظ مستعد رہے ہوں گے

مگر اندر چونکہ باغ مرد کام کرتے تھے۔ اس لیے نماز کا بلا واسطہ کر سارے کے سارے فیکٹری کی مسجد میں چلے گئے تھے۔ گرم مشینیں چپ تھیں۔ مجھے ہر مشین عفریت دکھائی دے رہی تھی۔ میں نے دس منٹ میں سب ابراہیمی ادا کر دی۔ ہریت کے پاؤں میں ایک ٹائم بم چھپا دیا۔ یہ میری عقل کا کوئی کارنامہ نہ تھا۔ یہ تو رب عظیم کی طرف سے عطا کردہ نادر موقع تھا، جس طرح اُس نے اپنے پیارے دوست ابراہیم کو بُت خانے میں داخل ہونے کا موقع دیا تھا۔

خان جبار نے اپنی تباہی کا سامان خود اپنے ہاتھوں سے مجھے دیا تھا۔ کل سات بم تھے۔ چھ مشینوں میں فٹ کیے، ایک بچ گیا تو میں نے لحظہ بھر آخری بم کا مصرف سوچا، پھر باور ہاؤس کی طرف چل پڑا۔ ایک بڑے جنرل کے ذریعے برقی روپوری فیکٹری میں روال رکھی جاتی تھی، یہ صوف زیادہ سے زیادہ نقصان پہنچانا تھا، کیونکہ میں اس حقیقت سے آگاہ تھا کہ سانپ کے منہ سے زہر پھوڑ لینا صرف وقتی طور پر اسے بے ضرر بنانا ہوتا ہے، سانپ پھر مٹی چاٹ چاٹ کر تھیلی بھر لیتا ہے۔ میں سانپ کی تحصیل سے سرنج کے ذریعے صرف زہر نکالنے کا بھی قائل نہیں رہا تھا۔ میں نے ہمیشہ سانپ کا سر گچلا تھا لیکن ایسا عمل صرف انسانوں کی آبادی میں دو چار سانپوں کے ساتھ ممکن ہوتا ہے۔ ناگوں کی نگری میں ایک ایک ناگ کا سر گچلنا ممکن نہیں ہو سکتا۔ میں تو ملک لازمی روشنی میں صرف راستے دیکھنے آیا تھا۔ فیکٹری کی تباہی تو صرف وقت اور حالات کی دین تھی، جب وقت نے موقع دیا تھا تو اُسے منافع کرنا کفرانِ نعمت اور فرائض سے روگردانی کے مترادف تھا۔

جنرل آن تھا اور کسے کافر ش بھی دھڑک رہا تھا۔ میں گھٹنوں کے بل جھکا، ٹائم بم سیٹ کر رہا تھا کہ باور ہاؤس کا دروازہ دھڑ سے کھلا، میں پھرتی سے اُٹھا اور گھوما میرے سامنے دفتر کا ایک کلرک تھا اور میرے پاؤں میں فرسش پر ٹائم بم پڑا ہوا تھا۔

اُس کی آنکھوں میں حیرت اور خوف کے ملے جلے تاثرات نمودار ہو گئے تھے۔ اُس نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا ہی تھا کہ میں نے فوری فیصلے کو عمل کی ضرب لگائی، فاصلہ کم ہی تھا، ایک سیکنڈ میں اُسے دبوچ کر میں اندر گھسیٹ لایا

تھا۔ گھٹنا کر پر اور دونوں ہاتھ گردن پر لگے تھے تو دو کڑے بیک آواز جزیرہ کی گھر گھر میں مل کر جھیل ہو گئے۔ میں نے اُس کا پھر کتا ہوا جسم اٹھایا اور خالی جری کینز کے پیچھے اُچھال دیا، پھر میں نے ایک گردوازے سے جھانک کر دیکھا تو ہر طرف ویرانی ہی تھی، صرف اُسے ہی موت لے آئی تھی۔ شاید اُس نے غماریوں میں مجھے نہ پا کر کچھ سوچ لیا ہوگا۔

جب میں ٹھہرتا ہوا سڑنگ کے دہانے سے باہر نکلا تو پہرے داروں نے پھر گردنیں جھکا کر سلامی دی تھی۔ ”برادران“ میں نے ایک نوجوان کے شانے پر ہاتھ رکھ کر غصہ رتی انداز میں کہا: ”مدا فوس پشٹون پو ہے“ وہ ہنستے ہوئے چند قدم میرے ساتھ چلے اور پھر میں نے چاروں سے گرم خوشی سے ہاتھ ملایا۔

باہر گھپ اندھیرا تھا اور میں اندھیرے میں تیز قدم اٹھاتا ہوا طور بازار خان کے گھر کی طرف چل پڑا۔ اسٹین گن کندھے سے لٹک رہی تھی اور دستی بم جیکٹ کی جیبوں میں ڈال لیے تھے۔ گو وہ انسانوں کی آبادی تھی لیکن وہاں کی راتیں اپنے جلو میں ویرانیاں لے کر اترتی تھیں۔ شاید یہی وجہ تھی کہ پوری بستی جنگل کی طرح سنسان اور پھول سنالوں میں ڈوبی ہوئی تھی، مرد مسجدوں میں تھے اور عورتیں گھر میں بند تھیں۔

”اے...“ تاریکی کے حلق سے ایک دھڑا بھری اور میں ٹھٹک گیا۔ وہ رائفل تانے دس قدم دور رک گیا تھا، کچھ بول رہا تھا لیکن میرے پتے صرف آواز پڑ رہی تھی۔ ”برادر...“ طور بازار خان کا ہمان برادر! میں نے اُسے سمجھانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

”نائیں... واپس... خان نائیں واپس...“ وہ قریب آگیا۔ میں نے دیکھا، وہ نیا محافظ تھا۔ دن والا ڈیوٹی چھوڑ گیا تھا۔ شاید دوسرے کو اُس نے بتایا نہ ہوگا کہ طور بازار نے کیا ہدایت دی تھی ”خان نائیں... تم واپس...“ اُس نے نال میرے سینے سے لگادی۔

”خاہ... خاہ...“ میں نے دونوں ہاتھ اٹھا دیے اور اُس نے نال ہٹائی میں نے گرد و پیش کا جائزہ لیا اور دیکھے لمحے اُس کی رائفل میرے سر سے اُترتی پیچھے چلی گئی اور اُس کی چریلی گردن میرے ہاتھوں کے شکنجے میں جکڑ چکی تھی۔ وہ

طاقت و ضرورت تھا لیکن لڑنے کے فن سے یکسر نا بلد تھا۔ اُس نے مجھے بانہوں میں لینے کی کوشش میں ہاتھ بڑھانے لگا، ہاتھ خود بخود ہی گر گئے تھے، کیونکہ میری ٹکڑے اُس کی ناک کا ملیدہ بنا دیا تھا، جب وہ جھول گیا تو میں نے گھسیٹ کر دیوار کے ساتھ ڈال دیا۔

داناؤل نے تجربات اور تجزیوں کے بعد ہی کہا ہوگا کہ روشنی کی ایڑیوں کے ساتھ تاریکی ریگتی ہے... اور آسانی کے تعاقب میں پریشانی لگی رہتی ہے۔ فیکٹری تباہ کرنے کی سہولت بڑی آسانی سے بغل گیر ہوئی تھی لیکن پھر قدم قدم پر رکاوٹ کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا۔ میں نے دستک دی، امید تھی کہ عائشہ مسکراتی ہوئی سامنے آئے گی اور رٹائی کی لوید سن کر وہ کلی کھل جائے گی مگر دروازہ جو نہی کھلا مجھے حیرت نے دو ہتھ مارا اور میں لڑکھڑاتا ہوا دو قدم پیچھے ہٹ گیا۔

سامنے طور بازار خان کھڑا تھا، تعجب کی وجہ پہرے دار کا جھوٹ بھی تھا۔ اُس نے بار بار کہا تھا کہ خان واپس نہیں آیا۔ کیوں اُس نے جھوٹ بولا تھا، کیا اُسے ایسی ہدایت دی گئی تھی؟ طور بازار بھی مجھے سامنے دیکھ کر ساکت سا ہو گیا تھا۔ ”اوہ خان! تم کب واپس آئے؟“ چپ خطرناک ہو گئی تھی۔ اس لیے میں نے ہی پہل کر دی تھی ”محافظ کہہ رہا تھا کہ تم ابھی واپس نہیں آئے“

”سوری خرم سلطان“ وہ ایک طرف ہٹ گیا۔ میں نے اُسے یہی بولا تھا۔ دراصل میرا ایک ہمان آیا ہے، میں نے اندر جا کر دیکھا۔ ایک وجہ نوجوان بغلی دروازے میں کھڑا تھا۔ مجھے دیکھ کر اُس نے پلٹ کر ایک دم دروازہ بند کر دیا۔ اُس کے خوب صورت چہرے پر کبیدگی پھنکار رہی تھی۔

”نیم خان؟“ طور بازار خان بولا اور میرا جسم پھٹک گیا۔ اُس سے ملو میرا ہمان اور دوست خرم سلطان، نیم خان نے ہاتھ بڑھایا، میں نے مسکراہٹ دے کر مصافحہ کیا۔ ابھی اُس کا ہاتھ میری گرفت میں ہی تھا کہ بغلی دروازے پر دھماکا ہوا۔

”خرم! مجھے بچاؤ ان درندوں سے“ عائشہ کی چیخ سنائی دی نیم خان نے پھرتی سے گردن گھمائی اور طور بازار خان کی



توجہ بھی ہٹ گئی۔ میں نے اسی قلیل وقفے کو استعمال کرنے کا فوری فیصلہ کرتے ہوئے دایاں گھٹنا نیم خان کی ٹانگوں کے جوڑ پر پارا اُس کے حلق سے کرناک دھڑا بھری، تب طور بازار نے پلٹ کر دیکھا۔ اُس وقت میری توجہ بھی پھیل چکی تھی، چونکہ مجھے جو کچھ کرنا تھا اُس میں ایک سیکنڈ کی تاخیر بھی مہلک تھی۔ اس لیے میں نے پھلتی کو پوری قوت دی تھی، جب نیم خان گھٹنے موڑتا ہوا گر رہا تھا میں نے اسٹین گن تان لی تھی۔

”خرم سلطان! طور بازار کی آواز شدت حیرت سے بچٹ گئی... یہ... یہ... کیا...؟“ ”سُلو طور بازار خان! میں نے بھڑکتی آواز میں کہا: ”اندر جولا کی ہے وہ میری بہن ہے“ ”اوہ... نہیں...“ وہ اُچھل پڑا۔

”یہ سچ ہے خان اور تم نے مجھے دوست کہا ہے۔ دوستی کا جذبہ ہی میری انگلی روکے ہوئے ہے، ورنہ میں تمام دیواریں

پھاند کیا ہوں اور تمام رکاوٹیں توڑنے کا عزم رکھتا ہوں۔
بے شک میرا نام خرم سلطان ہے اور میں ہانگ کانگ کا
گورنر ماسٹر بھی رہا ہوں لیکن وہاں سے بہن کی جین ہی مجھے
یہاں تک لائی ہے۔

اُس نے پاؤں کی ٹھوکر سے دروازہ کھول دیا اور عائشہ
پھڑکتی ہوئی باہر نکلی اور پھر میرے ہاتھ میں اسٹین گن دیکھ کر
وہ دیوار کے ساتھ لگ کر رونے لگی۔

”عائشہ! یہ کون ہے؟“ طور باز نے پوچھا۔
”میرے بھائی جان“ عائشہ نے یقیناً میری بات سن لی تھی۔
میں نے اُس تک آواز نہ پیا کی خاطر آواز اونچی رکھی تھی۔
”ٹھیک ہے خرم سلطان“ طور باز گہری سانس لے کر بولا۔
”گو یہ ہماری روایات کے منافی ہے۔ یہ میرے دوست کی
امانت تھی لیکن تم نے برتری حاصل کر لی ہے، جنگ کا فیصلہ
بہر صورت تسلیم کرنا پڑتا ہے۔“

”میں فی الفور یہاں سے روانہ ہونا چاہتا ہوں خان۔“
”اوہ نہیں!“ اُس نے خیم خان کی نبض پر انگلیاں رکھتے
ہوئے کہا ”اب جلدی جانے کی ضرورت نہیں رہی خیم خان
مرچکا ہے۔“

”ضرورت ہے خان“ میں نے زور دے کر بتایا۔ ہماری
یورجی ماں بیٹی کی جدائی اور تم میں بہتر مرگ پر منتظر ہے مجھے جانا
ہوگا۔“

”کیا تم مجھے انتظامات کی ہمت دو گے خرم؟“
”سوری خان“ میں نے نفی میں گردن ہلائی۔ میں تم پر
بھی شک کر رہا ہوں مجھے معاف کر دینا۔ ان حالات میں میرے
نزدیک میرا اپنا سایہ بھی مشکوک ہے۔“
”پھر تم کیسے جاؤ گے۔ پاکستان کی سرحد تک کئی چوکیاں ہیں،
ڈاکو ہیں اور دیگر رکاوٹیں ہوں گی، مجھے اجازت دو خرم سلطان
میں کم از کم گاڑی کا انتظام کروں۔“

”میں تمھاری دوستی ضرور آزماؤں گا خان“ میں نے
عائشہ کا ہاتھ تھام لیا۔ ”میں نے پڑھا اور سنا ہے کہ یہاں کے
لوگ دوستی اور دشمنی دونوں میں بڑے پرجوش اور مخلص
ہوتے ہیں۔ تم ہمارے ساتھ چلو گے گاڑی کا انتظام میں خود
کروں گا۔ تم صرف ہمیں دوستی کی پناہ میں رکھو گے۔“
”مجھے اعتماد اور بے اعتمادی کے درمیان نہ ڈالو خرم سلطان
دوست ہو تو دوست بن کر دوستی کے جذبات کو کام کرنے دو۔“

کم از کم خیم خان کی لاش کو تو یہاں سے ہٹانے کی اجازت دے
دو۔ خیم خان ہمارے قبیلے کا ہے اور اس کا قتل میرے گھوڑوں ہوا
ہے اگر اُس کی لاش یہاں سے برآمد ہوئی تو جرگہ مجھے اُس کے
بھائیوں کے حوالے کر دے گا۔“

”کیا اسے یہاں چھپایا نہیں جاسکتا؟“
”بڑے ضدی ہو دوست“ وہ دانت پیس کر بولا۔
”اُداسے یہاں ہی چھپا دیں“ اُس نے لاش اٹھائی... اور
دوسرے کمرے میں چلا گیا۔

پونے گیارہ بجے ہم طور باز کے گھر سے نکلے، عائشہ میرے
شانے سے شانہ ملائے چل رہی تھی جب کہ میں نے درخواست
کر کے طور باز کو چند قدم آگے رکھا تھا۔ اُس کے کندھے پر
بھی رائفل تھی لیکن خانی تمام کارٹوس میں نے قبضے میں کر رکھے
تھے۔ میں ایک ایسے شخص پر بھروسہ نہیں کر سکتا تھا، جس کے
قبیلے کا ایک فرد میں قتل کر چکا تھا۔

طور باز نے وہ پیکٹ بھی اٹھا رکھا تھا، جو اُس نے میرے
پے تیار کیا تھا۔ وہ بار بار دوستی کا حوالہ دے کر بزنس کی باتیں
کرنا رہتا تھا لیکن جانتا تھا کہ وہ جان کے خوف سے تعاون کر
رہا تھا یا واقعی دوستی نبھا رہا تھا۔

گیارہ بجے ہم سنان بازار سے گزرتے ہوئے جب خان
جبار خان کے گودام میں داخل ہوئے تو پھرے دار نے طور باز
خان کو تعظیم دی۔ میں نے عائشہ کو پٹھانوں کے مردانہ لباس میں
نوجوان لڑکے کا روپ دے دیا تھا۔ ویسے بھی وہ اندھیرے
میں رگ گئی تھی۔ جبار خان نے میری ڈیمانڈ پر جب اسلحہ بارود
دیا تھا۔ اُسی وقت اُس نے بلبٹ پروف وین بھی باہر کھڑی کر
دی تھی۔ میں نے وقت کا تعین نہ کیا تھا۔ اس لیے اُسے پیرے دار
کو بتانا چاہیے تھا کہ خرم سلطان کسی بھی وقت وین لے جائے گا۔
پھرے دار نے وین کی طرف اشارہ کر کے کچھ کہا تو طور باز نے
گردن موڑ کر میری طرف دیکھا۔

”میں نے بڑے خان سے وین طلب کی تھی۔“ میں نے
وضاحت کی۔ ”یہ بلبٹ پروف ہے۔“
”ملک نواز کو بھی لے چلو گے؟“

”نہیں دوست“ میں نے جواب دیا۔ ”وہ تو راہداری کی
حیثیت رکھتا تھا۔“
”تم کیا شے ہو خرم؟“ طور باز نے میرے شانے پر تھپکی دی۔
”میں نے تمھیں پہچاننے میں غلطی نہ کی تھی، آؤ چلیں۔“

میں نے فیکٹری کے پہلے دھماکے کا ڈی ٹائم ٹھیک بارہ
بجے کار کھاتھا۔ جب ہم بازار سے نکل کر سڑک پر چڑھے تو گیارہ
بجے کسترہ منٹ ہو چکے تھے۔ میری خواہش پر طور باز خان نے
ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی تھی۔ یہ بھی اندھیرے کا ہی تیر تھا کیونکہ
میں واپسی کے راستوں سے ناواقف بھی تھا اور رات بھی تاریک
تھی لیکن طور باز خان پر بھروسہ ناگزیر ہو گیا تھا۔ میں اگر خود
اسٹیرنگ سنبھال لیتا تب بھی ہر موڑ پر اُس کی رہنمائی درکار ہوتی۔
میں چاہتا تھا کہ جب بارہ بجے دھماکوں کا سلسلہ شروع ہو تو
ہمیں چالیس پچاس میل دور ہونا چاہیے۔ دھماکوں کی آواز
طور باز خان کو بھی چونکا سکتی تھی اور مجھے تعاقب کا بھی خدشہ تھا۔
”رفتار بڑھاتے چلو خان“ میں نے کہا۔ ”میں چاہتا ہوں کہ
رات کی تاریکی میں علاقہ غیر کراس کر جائیں۔“

”یہ بندی کا مال روڈ نہیں پیارے۔“ طور باز نے جواب
دیا۔ ”یہاں تو بعض جگہ دو دو فٹ کے گڑھے بھی ملتے ہیں۔“
وین کے ہچکونے اس کی بات کے گواہ تھے کہ سڑک واقعی بے حد
خراب تھی۔ میں نے وقت دیکھا، بارہ بجنے میں سات منٹ باقی تھے۔
رفتار اور سڑک کی دشواری کے باوجود میرا خیال تھا کہ ہم
فیکٹری سے پچیس میں میل دور ہیں۔ فیکٹری پہاڑ کے اندر تھی۔

اور فاصلہ بھی معقول تھا۔ لہذا مجھے یقین تھا کہ دھماکوں کی آواز
بلٹ پروف وین کے اندر نہ آسکے گی۔ میری نگاہیں گھڑی پر
جبی ہوئی تھیں، ٹھیک بارہ بجے میرے اندر دھماکا ہوا اور میرے
بدن کو پھر پور جھکا لگا۔ جھٹکے کی وجہ واقعی دھماکا ہی تھی، جو
قریب ہی ہوا تھا۔ میں نے شیشے سے چہرہ لگایا، پھر دوسرا
دھماکا ہوا۔ طور باز نے اچھلتی کودتی وین کو ایک دم ہریک
لگائے اور ہم دونوں سیٹوں سے لڑھک گئے۔ اس سے قبل
کہ طور باز دروازہ کھول کر نیچے کود جاتا، میں ساری بات سمجھ
چکا تھا۔ اُس نے میری ناواقفیت اور رات کی تاریکی سے
فائدہ اٹھایا تھا اور گھنٹے سے وین فیکٹری کے گرد دوڑتا رہا تھا۔
میں نے پھرتی سے اسٹین گن کی نال اُس کی گردن سے
لگادی اور اُس کا محو سفر ہاتھ دروازے کے ہینڈل پر جم کر
رہ گیا تھا۔ تم نے دوست بن کر دھوکا دیا ہے طور باز خان۔“
میں نے سرد آواز میں کہا۔ ”لہذا دوستی کا معاہدہ ختم... اور
ختم دار تم ہو۔“ میری آواز دھماکوں میں دب دب کر وین
کے اندر بھر رہی تھی۔

”بل خرم سلطان! وہ بولا۔ اگر تم نے میری دوستی پر

اعتماد کیا ہوتا تو میں بھی دوست بن کر سوچتا۔ تم نے چاہا تھا
کہ طور باز خان کو گولی سے دھمکا لو گے، میں نے تمھیں سبق
دینا چاہا تھا کہ طور باز خان اتنا احمق نہیں ہے۔“
”میں بھی تمھیں سبق دینا چاہوں گا طور باز خان۔“ میں نے
سفاک لہجے میں کہا۔ ”میں تمھارا دیا ہوا سبق یاد رکھوں گا اور
تمھارے جانے والے تمھاری لاش سے عبرت حاصل کریں
گے نیچے اُترو۔“ اُس نے بغیر ہلٹے ایک دم نال پر ہاتھ مارا
اور نیچے جھک گیا۔

میں وین کا وینڈر سکریں اور دیگر نظام ناکارہ نہیں
کرنا چاہتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ میں نے ٹرائیگر سے انگلی ہٹا رکھی تھی۔
میں نے جھپٹ کر اُس کے بال منٹھی میں پکڑے اور دوسرے
ہاتھ کی ٹپک اُس کی گردن کے دائیں حصے پر ماری اور پھر
نیم وا دروازے سے باہر دھکیل دیا، مجھے سیٹ پھلانگنے
اور باہر جانے میں جتنی دیر لگی اُس وقفے میں وہ اٹھ کر زنگ
زیگ میں دوڑنے لگا۔ رات اتنی سیاہ تھی کہ چند قدم دور کچھ
سمجھائی نہ دے رہا تھا۔ میں نے بس اندازاً ہی بھاگتے ہیونے
پر برست مار دیا۔ وہ ڈوبا، پھر ابھرا اور دوسرا برست نزدیک
سے اُسے چھلنی کر گیا تھا۔

اُدھر ہزار گز دور قیامت کا شور تھا، پچنے والے اور جی
لوگ چیختے ہوئے شاید میری طرف ہی آرہے تھے۔ کچھ شور بازار کی
جانب سے اٹھ رہا تھا جس پہاڑی کی سڑنگ میں فیکٹری تھی،
اُسی کے گرد طور باز خان گردش کرتا رہا تھا۔ اُس کا منصوبہ بڑا
شاندار اور مکمل تھا۔ وہ صبح کی روشنی تک مجھے چکر میں رکھنا چاہتا
تھا، اگر میرے رکھے ہوئے ہم نہ پھٹتے تو میں خاموشی سے چکر
کھاتا رہتا اور صبح طور باز خان قبضے لگاتا ہوا مجھے بے بس کر دیتا۔
میں کوڈ کروین پر سوار ہو گیا اور بازار کی طرف سے
آگے لوگوں کے درمیان سے نکلتا چلا گیا، کیونکہ فرار کی کوشش
خودکشی کے مترادف ہوتی۔ میں انجان تھا اور وہ لوگ بیدار ہو
چکے تھے۔ خان جبار کو دھماکوں کا ڈٹے دار تلاش کرنے میں
کوئی وقت نہ لگا ہوگا۔ اُن کے پاس تیز رفتار گاڑیاں تھیں...
فرید خان کی زبانی یہ بھی معلوم ہوا تھا کہ خان جبار کے پاس مانی
پاور ٹرانسمیٹر سیٹ بھی ہے جس کا رابطہ پاکستان تک قائم
ہے۔ وہ ٹرانسمیٹر پر آئے اطلاع کر دیتا اور ہم گھیر لیے جاتے
جب کہ مجھے باہر نکلنے کے لیے کسی ضمانت اور راہ دہی کی
ضرورت تھی۔

”یہ... یہ کیا ہو رہا ہے خرم؟“ عائشہ نے تھرتھراتی آواز سے پوچھا ”کیا ہمارے فرار کی خبر...“

”نہیں عائشہ! میں نے جواب دیا“ بلکہ ہمارے ساتھ دھوکا ہوا ہے۔ ہم ایک گھنٹے سے جہاں سے چلے تھے، وہاں ہی گردش کرتے رہے ہیں۔“

”اوہ... پھر... پھر... وہ خوف زدہ آوازیں بولی۔“

”پھر مقابلے کی دوڑ میری بہن! میں پرسکون بچے میں بولا۔“

”زندگی اور موت کا مقابلہ بہر کیف میدان ہمارے سامنے ہے اور ہم آخری سانس تک مقابلہ کریں گے۔“

ہیڈ لائٹس کی زد میں فرید خان آیا تو میں نے دین اُس کے قریب روک دی ”فرید خان!“ میں نے دروازہ کھول کر اُسے آواز دی اور وہ میری آواز پہچان کر دوڑتا ہوا قریب آگیا۔ اندر جلدی اندر بیٹھ جاؤ آرمی نے پہاڑی گھیر لی ہے۔ وہ کوڈ کر آؤ پر آیا اور میں نے گھسیٹ کر سیٹ پر بٹھا لیا۔

”کیا دھماکے آرمی...“

”ہاں خان میرا خیال ہے کہ فیکٹری تباہ کر دی گئی ہے۔“

میں نے دین کو یوٹرن میں ڈالتے ہوئے بتایا ”بڑی بھاری تعداد میں فوج آئی ہے۔ اس سے قبل کہ اُن کی توجہ بازار اور باہر جانے والے راستوں پر مبذول ہوئے ہمیں یہاں سے نکل جانا چاہیے۔ میں فرار ہو جاتا مگر راستوں سے ناواقف ہوں۔ اس لیے تمہاری تلاش میں آیا تھا۔“

”ملک صاحب تو نہ جانتے کہاں ہوں گے؟“ فرید خان بولکھائی ہوئی آوازیں بولا ”جب دھماکے ہوئے تو وہ بڑے خان کے ساتھ تھے۔“

”فرید خان یہ قیامت کا سماں ہے اگر بچنا چاہتے ہو تو نکل چلو۔“

پھر اُس نے کوئی جواب نہ دیا۔ میں نے حفظ ماتقدم کے طور پر ہیڈ لائٹس بجھا دی تھیں، بس اندازے سے گاڑی ناک سیدھ میں بڑھا رہا تھا۔

”اشاروں کی روشنی جلا لو خرم سلطان“ فرید خان ونڈا سکرین سے چہرہ لگاتے ہوئے بولا ”آگے دائیں بائیں گہرے نالے ہیں۔“

میں نے غصہ بھر کے لیے ہیڈ لائٹس روشن کر کے راستہ دیکھا اور لرز گیا، سامنے دس پندرہ گز دور نالے کا سپاٹ کنارہ تھا، اگر فرید خان کی چھٹی سس اُسے زبان نہ دیتی تو دین گہرے

نالے میں کود جاتی۔ قدرت نے ایک بار پھر بال بال بچا لیا تھا تب ہی مجھے یقین ہو گیا کہ خدا ہماری مدد فرمائے گا۔

”خان! گاڑی تم ڈرائیو کرو“ میں دین روک کر پچھلی سیٹ پر چلا گیا۔ فرید خان نے اشارتی بتایا روشن کر دیں اور دین دائیں ہاتھ موڑ کر چلا دی۔

جس طریقہ کار کو میں نے تجربہ کار بیگن کی رائے اور ذاتی تجربات کی روشنی میں شروع سے اپنایا تھا اور پولیس کے دونوں سربراہوں نے واشگاف الفاظ میں ناپسندیدگی کا اظہار کیا تھا۔ وہی طریقہ کار مجھے سرخرو کر گیا تھا۔ رنگ باز خان اور سیٹھ سلیمان کو تو میں نے باقاعدہ منصوبہ بندی کی مار دی تھی لیکن ملک نواز اپنی سیاسی بصیرت کے ہاتھوں پرٹ گیا تھا۔ اُس نے پہلے مجھے گیدڑ کی موت مارنا چاہا تھا، پھر خود ہی میرے جال میں پھنس گیا، اگر وہ لاہور سے پٹری آنے کی حماقت نہ کرتا تو میں ٹینک گل کی بازیابی کے لیے خود وہاں چلا جاتا، اگر فوری طور پر نہ بھی جاتا تو انتقام کی آگ تو بہ طور اگنی ہی تھی، نہ وہ آتا اور نہ میں اُسے دوسرے جال میں جکڑتا۔

ایک طرح میں ملک نواز کا ممنون تھا کہ اُس نے مجھے اُس جگہ پہنچا دیا تھا جس کی آرزو میرے من کی ہڈیاں ابھی تک یک رہی تھی، مجھے ادھر تو آنا ہی تھا لیکن جس طرح اتفاق کی کڑی سے کڑی ملتی گئی تھی، اس طرح دوسری صورت نہیں شاید ممکن نہ ہوتا۔

معاویہ ایک دھچکے سے رگ گئی میں اپنے خیالات میں ڈوبا ہوا تھا اور عائشہ اُونگھ رہی تھی۔ میں تو سیٹ کی پشت گاہ سے ہتھیلیاں ٹیک کر سنبھل گیا مگر عائشہ کا سر آگے جالک رہا تھا۔ ہیڈ لائٹس کی روشنی میں وہ ٹرک صاف دکھائی دے رہا تھا جو سڑک پر ترچھا کھڑا تھا اور دس بارہ مسلح افراد ٹرک کی اوٹ سے جھانک رہے تھے۔



وہی سامنے تھا، وہی خطرہ جو میرے ساتھ نامور سڑکوں پر دوڑتا آ رہا تھا۔ بڑے خان خٹے آگے پیغام روانہ کر دیا تھا۔ میں جیپ پر روانہ ہوا تھا جبکہ خان نے پیغام ہوا کی بہروں کے ذریعے مجھ سے پہلے پیغام دیا تھا۔ فرید خان نے بریک پر پورا وباؤ ڈالا تھا اس لیے عائشہ سیٹ سے لڑھک گئی تھی۔ میں نے اُسے اٹھایا نہ اُٹھنے دیا۔ وہ اُٹھنے لگی تو میں نے ہاتھ سے اُس کا سر دبا کر بچے کر دیا۔

”فرید خان! یہ کون لوگ ہیں؟“

”میرا خیال ہے کوئی گرو بڑ ہے“ فرید خان نے شیشہ ہٹا کر باہر دیکھا۔

”نہیں فرید خان! میں نے جھپٹ کر اُسے گھسیٹ لیا“ یہ لو اس میں لاکھوں کا مال ہے۔ یہ سب تمہارا لیکن ایک شرط ہے کہ تم تمام ٹکاؤں کو توڑ دو گے۔ جاؤ اُن سے بات کرو۔ اُن سے کہنا کہ بڑے خان نے کوئی پیغام دے کر بھیجا ہے۔ ہم سیٹوں کے نیچے چھپ جائیں گے۔“

فرید خان نے پکیٹ لے کر ہاتھوں میں تولی اور پھر دروازہ کھول کر کود گیا۔ وہ خالی ہاتھ گیا تھا۔ میں نے جھک کر اس کی اسٹین گن اٹھالی۔

”کیا خطرہ ملا نہیں چوہدری؟“ عائشہ تھرتھراتی آواز میں بولی۔

”خاموشی سے لیٹی رہو جان برادر! جب تک میں زندہ ہوں خطرہ تمہاری طرف نہیں دیکھے گا کسی نے راستہ ہلاک کر رکھا ہے۔“

انہوں نے فرید خان کو فوراً ہی گھیرے میں لے لیا۔ ٹرک کی ہیڈ لائٹس روشن کر دی گئی تھیں۔ پہلے فرید خان بولتا رہا اور وہ خاموشی سے سنتے رہے پھر ایک شخص نے دین کی جانب اشارہ کیا فرید خان نے نفی میں سر ہلایا تھا۔ پھر تو جیسے اشاروں کی جنگ شروع ہو گئی تھی۔ فرید خان ایک ہاتھ ہراتا تو دوسرے چار ہاتھ اُٹھ کھڑے ہوتے۔ میں نے تکرار سے ہی اندازہ لگایا تھا کہ اُن لوگوں نے فرید خان کی باتوں پر اعتبار نہیں کیا اور دین کی تلاشی لینا چاہتے ہیں۔ میرا اندازہ درست ہی تھا۔ فرید خان کے سینے پر ایک شخص نے انفل کاٹ مارا اور فرید خان ہچکولے کھاتا ہوا کئی قدم پیچھے ہٹتا چلا گیا۔ اب سوچتے اور انتظار کرنے کا وقت نہیں رہا تھا۔ وہ تعداد میں تو تھے۔ آٹھ نیچے اور ایک ڈرائیوگ سیٹ پر۔ آٹھوں ہی دین کی جانب بڑھنے لگے تو میں نے جھک کر دایاں ہاتھ باہر نکالا ایک برسٹ نے کتنی گولیاں اگلی قصبے میں گن نہ سکا تھا البتہ پانچ آدمی لوکھڑاتے ہوئے زمین بوس ہو گئے تھے۔ دو پہلے جھٹک کر رُکے اور ہلٹ کر دوڑے۔ یقیناً وہ ٹرک کی آڑ لینا چاہتے تھے لیکن موت تو

اُن سے بھی کہیں زیادہ تیز رفتار تھی۔ دوسرا برسٹ اُن کو بھی چاٹ گیا تھا۔ اچانک ہی ٹرک ریورس ہوا اور میں نے تیسرا برسٹ ٹرک کی ونڈا سکرین پر مارا۔ ٹرک وہیں رُک گیا تھا۔

کچھ جسم متحرک تھے۔ ایک گھنٹیوں کے بل اُٹھ رہا تھا۔ دوسرا گھنٹوں کے بل اوندھا ہو کر اُپر اُٹھا۔ اُس نے رائفل سیدھی کی اور گولی دین کی بائیں سے ٹکرائی کہیں نکل گئی۔ میں نے ڈرائیوگر پر دباؤ ڈالا مگر صرف ٹرچ کی آواز نے میرا منہ چڑا دیا۔ میگزین خالی ہو چکا تھا۔ تب ہی میں نے دوسری اسٹین گن دین کے فرش سے اُٹھائی۔ وہ دوسری گولی کے لیے اپنی پکھرتی قوت سمیٹ رہا تھا۔ اُدھر فرید خان جھوٹا ہوا دین کی جانب آئے لگا۔ معاً اُس کی رائفل کا ٹرچ کھوکھلا گیا اگر مجھے ایک سیکنڈ کی دیر ہو جاتی تو فرید خان اُس کے لیے آسان پرف ثابت ہوتا۔

”شکر خرم چوہدری! فرید خان نے سبھی محسوس کر لیا تھا کہ اگر میری طرف سے گولی نہ چلتی تو اُس کی موت یقینی تھی۔ تم نے بروقت میری مدد کی ہے۔“

”ہم ایک ہیں فرید خان!“ میں نے اُسے سنبھال کر اوپر سیٹ پر بٹھاتے ہوئے کہا ”تم نے اُٹھنے میں عجلت سے کام لیا ہے۔“

”ٹرک کے اندر اور کوئی تو نہیں؟“

”نہیں“ فرید خان بولا ”اگر بچا بھی تو ظاہر ہونے کی حماقت نہیں کرے گا۔ بہتر ہو گا کہ ٹائرنا کارہ کر دو۔ میں نے ہلکا سا برسٹ پچھلے ٹائروں پر مارا۔ ٹائر دھماکے سے پھٹ گئے۔

”یہ کون تھے خان؟“

”خان جبار کے گڑگے“ فرید خان نے گھیر بدلتے ہوئے کہا۔

”ایسی تین چوکیاں اور ہیں اور تینوں کو آگاہ کر دیا ہو گا؟“

”کیا خان جبار کو ہمارے فرار کی اطلاع مل گئی ہے؟“

”ہاں چوہدری! میرے ساتھ آدم خان بھی تھا۔ جب میں دین پر سوار ہو رہا تھا تو وہ دیکھ رہا تھا۔ جبار خان نے ہی تمہیں دین دی تھی۔ ایسی دین صرف ایک ہی ہے۔“

”دوسری چوکی کتنی دور ہے خان؟“

”بیس میل“ فرید خان نے بتایا ”کیا تمہارے پاس گولیوں کا اسٹاک ہے؟“

”ہاں کم از کم اتنے آدمیوں کے لیے ہے۔“

”چلو دیکھتے ہیں تقدیر میں کیا کھلا ہے۔“

”سنو خان! اگر ہم اُس چوکی سے کتر کر نکل جائیں تو؟“

”ناممکن“ فرید خان بولا ”تم نے غور نہیں کیا جہاں جیس روکا

گیا تھا وہیں بائیں کوئی راستہ نہیں تھا۔ ایک طرف ٹیکسی تھی اور دوسری طرف برساتی نالہ تمام چوکیاں ایسی جگہ قائم ہیں ہر طرف گاڑی چوکی سے ہی گزرتی ہے۔

”اگر ہم چوکی سے ایک میل ادھر گاڑی چھوڑ کر نکل جائیں تو نزدیک ترین پختہ سڑک تک کتنا فاصلہ طے کرنا پڑے گا؟“
”کم از کم پچاس میل۔ ادھر اور بھی خطرہ ہے۔ شوریدہ سرخو جوان ہم سے لباس بھی چھین لیں گے۔“

دین ناہموار سڑک پر ہچکولے کھاتی دوڑتی رہی تھی۔ عائشہ گزرنے والے حادثے کی وجہ سے ندوس تھی۔ میں نے کئی بار اُسے سونے کا اشارہ بھی کیا تھا۔ باتوں سے اجتناب اس لیے برت رہے تھے کہ فرید خان اُسے ایک ایسا نوخیز لڑکا سمجھ رہا تھا جو میں بطور تحفہ اپنے ساتھ لے جا رہا تھا۔ عائشہ قبائلی مردانہ لباس میں واقعی خوش رو لڑکا ہی دکھائی دے رہی تھی۔

چونکہ فرید خان بھی ہماری ہی طرح جھان تھا۔ اس لیے اُس نے لڑکے کے بارے میں کوئی سوال نہ کیا تھا اگر ادھر کا کوئی شخص ہوتا تو پوچھ لیتا اجنبی صورت لڑکا کہاں سے آیا ہے۔ میں میل کا سفر دین کے لیے زیادہ نہ تھا۔ متحرک روکشی دیکھ کر فرید خان نے دین روک دی۔ ”میزبان ہمارے استقبال کے لیے کھڑے ہیں۔“ اُس نے بتایا۔

”فاصلہ کتنا ہے خان؟“
”شاید ایک میل سے کم۔“

”ایسے کرو تمام بتیاں گل کرو اور اگر اتراتی ہے تو انجن بھی بند کر دو۔“

”کیا کرنا چاہتے ہو؟“
”ہم گاڑی روک کر سڑک سے اتر کر ان کے عقب میں جائیں گے۔ میں نے بتایا۔“ میں رنگ کر نزدیک جاؤں گا۔ اُن کی توجہ کے لیے ایک بار میڈلائٹس روشن کرنا۔ اُن کی توجہ ادھر ہوگی۔ میں دیکھوں گا کتنی گولیاں کارآمد ہو سکتی ہیں۔“

”اگر وہ بکھرے ہونے ہوں تو...؟“
”یہ وقت ہی بتائے گا۔“

فرید خان نے ایک فرلانگ پل کر انجن بھی بند کر دیا تھا۔ چونکہ سڑک پٹی اور کئی پٹی تھی اس لیے دین اچھلتی کودتی شور مچاتی لڑھکنے لگی تھی۔

”بس ایک سیکنڈ کے لیے گاڑی روک لو۔“
فرید خان نے میری ہدایت کے مطابق عمل کیا۔ میں نے روشنی

میں دیکھ لیا تھا۔ وہ لوگ اتراتی میں تھے۔ میں نے عائشہ کو اترنے کا اشارہ کیا۔ وہ بے حد گھبرائی ہوئی تھی۔ میں نے اندھیرے میں اُس کی کلائی پر پتھری دی۔ میں اُسے دین میں تنہا چھوڑنے کا ریسک نہیں لینا چاہتا تھا۔ حالات نہ جانے کیسے ہو جاتے اور مجھے دین میں واپس آنا نصیب نہ ہوتا۔

دین سے اتر کر ہم فرید خان کی رہنمائی میں دائیں جانب اترنے لگے۔ تنگ سی کھائی تھی۔ دوسری طرف سپاٹ چڑھائی تھی۔ میں نے عائشہ کو مضبوطی سے سنبھال رکھا تھا۔ بعض اوقات مجھے اوپر چڑھنے کے لیے ہاتھوں سے بھی کام لینا پڑا تھا۔ دس پندرہ منٹ کے جان گسل سفر کے بعد ہم ٹیکسی کے سر پر چلنے لگے تھے۔

اندازاً آدھی میں نے فرید خان کو روکا۔ عائشہ میرے پیچھے تھی۔ فرید خان رُک گیا لیکن میں اُلجھ گیا تھا۔ چھپن میں ہم ایک دوسرے سے سوال کیا کرتے تھے کہ ایک آدمی کے پاس شیر، بکری اور گھاس ہیں۔ وہ دریا پار کرنا چاہتا ہے۔ کشتی بیک وقت دو چیزوں کا وزن بہا سکتی ہے۔ اگر وہ اپنے ساتھ پہلے پھیرے میں شیر کو لے جاتا ہے تو بکری گھاس کھا جائے گی۔ اگر گھاس لے جائے تو شیر بکری کو کھا جاتا ہے۔ بکری ساتھ لے جائے تو دوسرے پھیرے میں کیا لے جائے گا۔ وہی سوال حقیقت بن کر میرے سامنے تھا۔ اگر فرید خان کو عائشہ کی رکھوالی کے لیے چھوڑنا تو وہ ضرور اُس سے بات کرتا اور جان لیتا کہ پردے میں کون ہے۔ عائشہ کو ساتھ لے جانا بھی خطرناک تھا۔



وہ نازک انعام اور ڈرپوک شہری لڑکی تھی۔ اُس سے توقع نہیں کی جاسکتی تھی کہ اپنی حفاظت خود کرتی۔ جمہوری تھی میں نے اُسے ایک طرف لے جا کر سردی بات سمجھائی۔ ”میں ساتھ چلوں گی جانی جان۔“ عائشہ نے دو ٹوک جواب دیا۔ ”میں آپ کے ساتھ جینا مرنا پسند کر دوں گی۔“ ہم ڈھلان اتر کر اور پتھر لگا کر اُن کے عقب میں جا آجھرے۔ رات تاریک تھی لیکن میری آنکھیں اندھیرے سے خاموشی مانوس ہو چکی تھیں۔ میں نے لیٹ کر جائزہ لیا۔ کالج کی فوجی تربیت کام آتی تھی۔ بتایا گیا تھا کہ اندھیرے میں لیٹ کر ڈرٹک دیکھا اور سُنا جاسکتا ہے۔ سُنانی تو کوئی آواز نہ دی البتہ سڑک کے کنارے کھڑے تین دیوے دکھائی دیئے لگے تھے۔ اُن کے اُس پاس کوئی آڑ نہ تھی۔ میدان میں ہی کوئی چھوٹی گاڑی کھڑی تھی۔ یہ وہی لوگ تھے جنہوں نے جلتے ہوئے روڈ ٹیکس وصول کیا تھا۔ مجھے یاد تھا کہ دوسری چوکی پر میں نے تین آدمی ہی دیکھے تھے۔ ایک ٹیکس وصول

کرتے آیا تھا اور دو دُور کھڑے رہے تھے۔

”تم لوگ خاموشی سے یہاں دیکھ رہو گے۔“ میں نے سرگوشی کی اور روٹنگ کرنے لگا۔ میں تیس گز کا فاصلہ طے کر کے میں نے پھر دیکھ لیا۔ کاجہری رنگہوں سے جائزہ لیا۔ میں یقین کرنا چاہتا تھا کہ صرف تین ہی ہیں کیونکہ کچھ میدان میں مقابلہ کرنے کی پوزیشن ہمارے حق میں تھی۔ وہ لوگ ’پا‘ کے نقصوں کی مانند کھڑے تھے چپ چاپ غائب اُن کو یقین رہا ہو گا کہ شکار نزدیک آ رہا ہے۔ میں نے زمین سے اُٹھ کر ایک گھٹنہ موڑ کر زمین پر ٹیکا اور ڈرائیو دیا۔ تاریک ستارے میں قہقہہ اُٹھا اور نقطہ اچھلتے ہوئے بکھرے اور معدوم ہو گئے۔

میں چپڑ زمین پر لیٹ گیا۔ چار پارچ منٹ گزر گئے۔ کوئی حرکت ہوئی نہ آواز سُنانی دی۔ اندھیرے میں آگے بڑھنا دانش مندری نہ تھی۔ تینوں میں سے کوئی گولی چلانے کے قابل ہو سکتا تھا۔ پہلی چوکی کا تجربہ شاہد تھا کہ یہ لوگ آخری سانس تک انگلی ٹراننگ پر اور نگاہ ڈھن پر رکھتے ہیں۔ میں اُٹھا اور حلق سے آواز نکالی اور ساتھ ہی طویل چھلانگ لگا دی۔ احتیاط ہر کام میں ہر کام موثر و مونس ہوتی ہے۔ گولی غراتی ہوئی کہیں قریب سے گزر گئی۔ میں نے چیخ ماری اور پھر گاڑی پر توجہ مرکوز کر دی۔ فوراً نارنجی چنگاری ٹپکنے ہوئی اور گولی مجھ سے چند فٹ دائیں جانب آجھری ہوئی جگہ آن لگی۔ وہ گاڑی کی آڑ میں تھا اور بلا جرحہ اچھا نشانے باز تھا آواز کا حلق چھیدنے والا۔

میں کھڑکی اور پتھر کی زمین پر بے آواز سانپ کی طرح رینگتا ہوا سڑک پار کر گیا اور پھر میں نے اُسے دیکھ لیا۔ وہ گاڑی کے ساتھ آڑوں بیٹھا جھانک رہا تھا اگر نہ جھانکتا تو مجھے دکھائی نہ دیتا۔ معاً ایک سایہ اور گاڑی کے پس منظر میں اُٹھتا۔ وہ گرتا اُٹھتا جھکا جھکا گاڑی کی طرف آ رہا تھا۔ میں نے اندازہ لگایا کہ تینوں میں سے ایک تھا جو زخمی ہو چکا تھا۔ میں گھنٹیوں کے بل لپٹا اُن کو دیکھتا رہا۔ جب زخمی قریب آیا تو اُس کے ساتھی نے پک کر اُسے سنبھال لیا۔ تب میں نے انگلی کو ہلکا سا دباؤ ڈالنے کا اذن دیا پھر بھی گولیوں کی تڑواہٹ سے خاموشی چھٹ گئی تھی اور وہ دونوں اُچھل کر گرے تھے۔ راستہ صاف ہو گیا تھا۔ میں دوڑنے لگا۔ عائشہ مجھے دیکھتے ہی دوڑی اور بلکتی ہوئی مجھ سے چپٹ گئی۔

”آپ... آپ... زخمی ہیں؟“
”نہیں عاشی میں ٹھیک ہوں۔“
”پھر پھر... آپ جیسے کیوں تھے؟“

”اُن کو سامنے لانے کے لیے۔“ میں نے بتایا۔ جو احتیاط برتی جا رہی تھی میری چیخ اور عائشہ کی محبت نے توڑ دی تھی۔ فرید خان

قریب ہی کھڑا تھا۔

”خرم سلطان! فرید خان رحمہم آواز میں بولا۔ یہ لڑکی کون ہے؟“
”میری بہن! میں نے جواب دیا۔“ اُسے نعیم خان اخوا کر لیا تھا۔“
”اوہ... تو تم لوگ!“

”ہاں خان! ہم اسی مقصد کے لیے ادھر آئے تھے۔“ میں نے کہا۔
”یہ باتیں پھر ہوں گی خان۔ ابھی ہم موت کی وادی میں کھڑے ہیں۔ تم جاؤ اور دین لے آؤ۔ اب راستہ صاف ہے۔“

مجھے خود غرضی پسند نہ تھی لیکن حالات کا تقاضا یہی تھا۔ اگر عائشہ ساتھ نہ ہوتی تو میں فرید خان کو ہر گز چار نہ بناتا۔ میرا مقصد یہ تھا کہ فرید خان سیدھے راستے سے گزرے۔ اگر کوئی اور گھات میں ہے تو سامنے آجائے۔ ایسی صورت میں فرید خان کی موت کی فتنے لاسی مجھ پر ہی عائد ہوتی۔

وہ ہنسا بھی تھا۔ میں نے اُس کی اسٹین گن اپنے قبضے میں کر کے خالی کر دی تھی۔ اُسے میں خالی ہاتھ موت کے منہ میں دھکیل رہا تھا۔ میرا منیر مجھے بھوکے گدھ کی مانند نوچنے لگا تھا لیکن میں سب کچھ سہنے پر مجبور تھا اور جمہوری تھی ایک لڑکی۔

اُس وقت میں نے اطمینان کا سانس لیا جب فرید خان دین چلاتا ہوا واپس آ گیا۔ میں نے عائشہ کو سہارا دے کر سیٹ پر بٹھایا تو فرید خان دھڑکتی آواز میں بولا۔

”جلدی کرو دوست۔ میں نے گاؤں کے لوگوں کو ٹارچوں سے اشارے دیتے دیکھا ہے۔ یہ لوگ نزدیکی گاؤں کے ہی تھے۔ فائرنگ کی آواز سن کر وہ لوگ آ رہے ہیں۔“

”باگ دوڑ تمہارے ہاتھ میں ہے پیارے۔“ میں نے جواب دیا۔ ”میزبان دوست اور رہنما تم ہی ہو۔ میں تو صرف موت سے لڑتا جانتا ہوں۔ جب اشارہ دو گے کوڈ جاؤں گا۔“

”ہاں! میں نے دیکھ لیا ہے۔“ فرید خان بولا۔ ”تم وہ ہو جس سے موت بھی کتر کر نکل جاتی ہے۔ ادھر کتنے لوگ تھے؟“

”صرف چار۔“ میرے جواب پر فرید خان نے قہقہہ لگایا اور بولا۔
”تمہاری آواز میں افسوس ہے کہ چار کیوں تھے۔“

”نہیں خان! میں بھی انسان ہوں اور انسان، انسان کا خون پنی کر خوش نہیں ہوتا۔ میری آواز میں افسوس نہیں دیکھ بے لیکن راستہ انھوں نے روکا تھا۔ وہ نہ مرنے تو ہیں مرنے پر تیار۔“

فرید خان نے کوئی جواب نہ دیا۔ اندھیرے میں ناہموار راستے پر دین اُٹھ کر پھر دسی کی طرح اچھلتی کودتی دوڑ رہی تھی۔ ہم نے سیٹوں کو مضبوطی سے تھام رکھا تھا۔ پھر بھی عائشہ بار بار مجھ سے

نکرا جاتی تھی۔ میں فرید خان کو محتاط رفتار کا مشورہ بھی نہیں دے سکتا تھا حالانکہ مجھ جیسا مضبوط مرد بھی شدید ہچکچولوں سے کرا اور پھیپوں میں تکلیف محسوس کر رہا تھا۔ عائشہ جیسی کوئل روکی جس اذیت سے دوچار تھی مجھے احساس تھا لیکن مجبوری سے وہ بھی آگاہ تھی اس لیے حرف شکایت اُس کی زبان پر نہ آیا تھا۔

”آخری چوکی پر شاید گولی سے کام نہیں چلانا پڑے گا؟“ فرید خان نے بتایا: ”ادھر میرے آٹھ نالوگ ہیں۔“

”تمہارا گاؤں بھی ادھر ہی ہے نا؟“

”ہاں، وہ چوکی میرے ہی گاؤں کی سرحد پر ہے۔“

”اس کا مطلب ہے کہ ہم خطرے میں سے نکل آئے ہیں؟“

”نہیں خرم سلطان۔“ فرید خان بولا: ”اصل خطرہ تو پاکستانی علاقے شروع ہو گا۔ ان دنوں سرحدی پولیس اور ریفرنس سڑکوں پر کھڑی ہے۔ علاقہ غرے آنے والی چیز یا کے پڑوں کی بھی تلاشی لی جاتی ہے۔“

”وہ اپنے لوگ میں فرید خان۔ اپنے لوگوں کے بارے میں یہی سنا ہے کہ وہ مار کر چھاؤں میں پھینکتے ہیں۔ میں پاکستان کی سرزمین ہے اگر مر گیا تو کوئی افسوس نہ ہو گا۔“

”میں تمہارے تحفے کے ساتھ ادھر نہیں جا سکتا۔“

”میں تمہیں مجبور بھی نہیں کروں گا دوست، تم واپس چلے آنا۔“

”میں پہلے گھر جاؤں گا پھر تمہارے گاؤں کے توپچی تک جا سکتا ہوں۔“

”میرا خیال ہے تمہارا گاؤں علاقہ غرے میں تو نہیں؟“

”ہاں، میرا گاؤں پشاور سے صرف پندرہ میل دور ہے۔“

”ٹھیک ہے خان، تم گھر چلے جانا۔“

وہ خاموش ہو گیا تھا لیکن میرے اندر آندھیاں چل رہی تھیں۔

فرید خان میرا دشمن نہ تھا۔ ایک طرح سے اُس نے میرا ساتھ دے کر مجھ پر احسان کیا تھا لیکن میں یہ فراموش نہیں کر سکتا تھا کہ اُس نے

ساتھ خلع صاف اور غیر مشروط نہ دیا تھا۔ اُسے وہ بنڈل لے آیا تھا جس میں لاکھوں کی ہیر و من ہند تھی۔ اگر میں احسان کے بدلے اُسے ہیر و من لے جانے کی اجازت دے دیتا تو اس کا مطلب کاروبار ہی ہوتا۔ میں ہیر و من کے ذریعے اپنی جان بچاتا اور پھر یہی نہہر کتنے انسانوں کی جانیں تلف کر دیتا۔ یہ خود غرضی ہوتی اور اپنے فرائض سے غدار سی۔ فرض کی ادائیگی آسان بھی نہ تھی۔ فرید خان قرض لاکھوں کے لالچ میں تعاون کر رہا تھا اگر میں اُسے انسانیت کا درس دیتا تو وہ

بمیر یا بن جاتا کیونکہ فطرتاً وہ اُسی قبیلے سے تعلق رکھتا تھا جو انسانوں سے نہیں بلکہ دولت سے جنت کرتا ہے۔ وہ بھی منشیات کا بیوپاری تھا۔ اُس میں اور رنگ باز خان میں کوئی فرق نہ تھا۔ رنگ باز نے بھی

مجھے شفقت پر درسی دی تھی۔ اُس کی بیٹی نے میرے دل کی دھڑکنوں کو متاثر کیا تھا پھر بھی میں سارے جذبے رو نہ دتا آگے نکل گیا تھا۔

فرید خان نے ہیڈ لائٹس روشن کرتے ہوئے اس وقت بتایا

”تھاجب سڑک کے درمیان گھرے دو آدمیوں اور دین کا فاصلہ

دس پندرہ قدم تھا۔ دونوں نے دین کو نشانے کی زد میں لے رکھا تھا۔

ایک نوجوان وہی تھا جس نے چٹکی بجا کر روڈ ٹیکس طلب کیا تھا۔

”اے میں فرید خان ہوں۔“ فرید نے باہر جھانک کر پشتوں میں بتایا۔

”نیچے جاؤ فرید خان، اُن سے ادھر ہی بات کرو۔“ میں نے جیب

سے چند نوٹ نکال کر فرید خان کے کندھے سے اُس کی جھولی میں اڑھکا دیے۔

”دین کے اندر اُن کو نہیں آنا چاہیے۔“

فرید خان دروازہ کھول کر اُتر گیا۔ اُسے پہچانتے ہی انھوں نے

بیرل جھکالیے تھے۔ فرید خان نے دونوں سے ہاتھ ملایا اور پھر بائیں کمرے

لگا۔ وہ باتوں کے ساتھ ساتھ ہاتھ بھی اٹھا کر دین کی طرف اشارے

کرنے لگے تھے۔ فرید خان نے دوچار ہارنٹی میں سر ہلایا مگر صورت حال

پہلی چوکی والی ہوتی جا رہی تھی۔

اس سے قبل کہ میں کوئی فیصلہ کرتا فرید خان اُن کو چھوڑ کر

چلت آیا تھا۔

”وہ دین کی تلاشی لینا چاہتے ہیں۔ مال کا پانچ فی صد کمیشن

طلب کر رہے ہیں۔“

”مال تمہارا ہے خان؟“ میں نے کہا: ”ایسے کرواؤ کو کچھ مال دے دو۔“

”نہیں خرم سلطان۔“ وہ ایک دم سچھے ہٹ گیا۔ ”میرے مال

سے تمہارا مال زیادہ قیمتی ہے۔ اگر انھوں نے لوکی دیکھ لی تو فی صد

بھول جائیں گے۔ ادھر عورت ہیر و من سے بھی زیادہ ہینگی ہے۔ تم

پانچ فی صد اُن کو ادا کر دو خرم سلطان۔“

”میرے پاس اتنی رقم نہیں ہے برادر۔“

”اسی اثنا میں وہ بھی قریب آگئے۔ فرید خان ایک آدمی

کو دُور لے گیا۔ میرا خیال تھا کہ وہ ٹمک ٹمکا کی بات کرے گا یہی وجہ

رہی تھی کہ جب اُس نے مجھے آواز دی تو میں نیچے اُتر گیا تھا کیونکہ

بہرہ دوستانہ ہی تھا۔

”لوکی تمہارے حوالے کر دو۔“ اُس نوجوان نے صاف اُردو

میں کہا: ”یہ ہمارا مال ہے۔ جو ادھر آتی ہے وہ ادھر ہی کی ہو جاتی ہے۔“

”ایک شرط پر خان۔“ میں نے سرد آواز میں کہا۔

”ہاں ہاں بولو، تمہارا ہر شرط منظور ہے۔“

”الٹ پل تک مجھے بجھاقت پہنچا دو گے۔“

”کیوں فرید خان! تم یہ شرط پوری کرو گے؟“

”ہاں جیسی۔“ فرید خان نے جواب دیا۔

”فکر یہ فرید خان۔“ میں نے کہا: ”تمہارے ہاں ایک مقولہ ہے

سر سلامت بچکوں کا کال نہیں۔ لوکیاں ہزاروں مل جائیں گی۔ آؤ

فرید خان لڑکی اُن کے حوالے کر دو اور مجھے لے چلو۔“

فرید خان کو شاید حیرت ہوئی ہوگی۔ موت کا کھلائی شاید اتنی

آسانی سے شکست تسلیم نہیں کر رہا تھا۔ وہ کچھ بولا نہیں چپ چاپ

ساتھ چل پڑا تھا۔

میں نے دُعا مانگی تھی صرف سوچا ہی تھا۔ میری سوچ کی لہریں

بھی شاید غالب تھیں۔ فرید خان دو قدم آگے اور وہ دونوں دائیں بائیں

ہو گئے تھے۔ چونکہ معاملہ دوستانہ انداز میں منٹ گیا تھا۔ میں نے کوئی

جیل و جنت کی تھی دُعا امت کے لیے ہاتھ اٹھایا تھا۔ میں نے اپنی نرم

پالیسی اور مطلوب پوزیشن سے مطلوبہ ہدف حاصل کر لیا تھا۔ ورنہ وہ

مجھے سب سے پہلے ہتھاکر دیتے۔ ایٹن گن ایک تھی۔ ایک وقت

میں ایک ہی ہدف کو چھپنی کر سکتی تھی۔ جب کہ وہ دو تھے اور دائیں بائیں

چل رہے تھے۔ تیسرے قدم پر ہی میں نے ایٹن گن تیرجی کر لی۔ پھر

لڑائیگر دبا دیا۔ پھر پور برسٹ قریب ترین جسم میں بیوسٹ ہو گیا اور

اُسی پھرتی سے بائیں والے کو بٹ کی ضرب لگائی۔ مضروب کے حلق سے

کرب ناک دھماکا بلند ہوئی۔ مجھے گولیاں کھانے والے کی فکر نہ رہی

تھی اس لیے تمام تر توجہ اور قوت سے لات گھٹائی اور گردن پر

دایاں ہاتھ مارا۔ تو اتر سے تین شدید ضربوں کو وہ نہ سہارتے ہوئے

مُذ کے بل گر گیا۔ فرید خان: ”میں نے اُسے اچھل کر بھاگتے دیکھ کر چیخ

کر کہا: ”دوستی کو دشمنی نہ بناؤ۔“ ٹمک جاؤ۔ وہ اُن ہی پاؤں پر جم گیا تھا۔

میں نے گھرے ہوئے شخص کی کپٹیوں پر چار پانچ ٹھٹھے

مارے اور اُس کی رائفل اٹھالی۔ فرید خان نہ صرف ٹمک گیا تھا بلکہ

اُس نے مجھے مطمئن کرنے کی خاطر ہاتھ بھی گردن پر رکھ لیے تھے۔ ”مجھے

معاف کر دو خرم سلطان۔“ فرید خان مجھے قریب دیکھ کر گھٹیا لے لگا۔

”میں لاپٹی کتا ہوں۔ میں نے بچان مرد کی فطرت کو ذیل کیا ہے۔“

”کوئی بات نہیں فرید خان۔“ میں نے اُس کے شانے پر چٹکی

دی اور اُس کے ہاتھ نیچے کر دیے۔ ”میں احسان فراموش نہیں ہوں۔

اب تم سے درخواست کروں گا کہ تم گاؤں نہیں جاؤ گے۔ میں تمہیں

الٹ پل سے کچھ دُور واپس کر دوں گا۔ تمہارا مال سب محفوظ رہے

گا۔ میں کسم کا سپیکر ہوں۔“

”تم جو بھی ہو عظیم بہادر اور حیرت انگیز ہو خرم سلطان۔“ فرید خان

جھجھراتی آواز میں بولا: ”میں تم جیسے دوست کی پناہ سے باہر نہیں

ہاؤں گا۔ یہ ایک مسلمان اور بچان مرد کا قول ہے۔“

”فکر یہ فرید خان! میں نے اُس کی کمر کو سہلایا اور وہ

دُراٹو ٹنگ سیٹ پر بیٹھ گیا۔ عائشہ دونوں سیٹوں کے درمیان اکڑوں

بٹھی ہوئی رو رہی تھی۔

”یہ... یہ... سب کچھ میری وجہ سے ہو رہا ہے نا؟“ اُس نے

میرے گھٹنے پر چہرہ رکھ دیا۔

”نہیں عائشہ۔“ میں نے اُس کے بالوں کو سنوارتے ہوئے کہا اور

اُس کے سر پر لٹولی جمادی۔ ”یہ ایک بھائی کی غیرت اور بہت کی آزمائش

ہو رہی ہے۔“

”کاش: وہ ہونٹ چبانے لگی۔“ میرے بھائی بھی ایسے ہی

باغیرت اور بہادر ہوتے۔ جب مجھے اغواء کیا گیا تو میرے دونوں بھائی

گھر میں موجود تھے۔ اُن کی موجودگی میں وہ درندہ... مجھے اٹھا کر لے

گیا تھا۔ وہ گولیوں سے ڈرتے ڈبک گئے تھے۔“

”اب تمہیں کوئی درندہ نہیں ستائے گا۔ عائشہ کم از کم مطمئن

ایک بھائی تو اب ایسا ہے جو درندوں کے دانت توڑ سکتا ہے۔“

”ہاں، مجھے خبر ہے۔ مجھے یقین ہے۔“ اُس نے میرے ہاتھ کو جوم

لیا: ”لیکن وہ بھی نوجوان مرد ہیں۔ وہ کیوں اتنے بزدل اور بغیرت ہیں؟“

”اس لیے عائشہ جان کہ ان کی رگوں میں رزقِ حلال کا خون نہیں

ہے۔ جو والدین حرام کی کمانی کرتے ہیں اُن کی اولاد بزدل اور بے غیرت

ہوتی ہے۔ یہ تمہارے بھائیوں کا قصور نہیں ہے بلکہ اُس ذمے دار

ہاتھ کا قصور ہے جو اُن کی پرورش کرتا رہا ہے۔“

”پھر... پھر... وہ بھڑائی آواز میں بولی۔“ میں بھی بزدل اور...“

”بس اب تم پچھلی سیٹ پر لیٹ جاؤ۔“ میں نے اُس کو تھپتھپاتے

ہوئے کہا: ”اب کوئی خطرہ نہیں رہا۔“

سپیدہ سحر مشرقی افق سے آہستہ آہستہ آنکھ کھول رہا تھا۔

دین، میدانی اور آباد علاقے کی بچنے سڑک پر رواں تھی۔ فرید خان نے

ہونٹ جیسے گوندے چپک لیے تھے۔ وہ تیر چھا بیٹھا ہوا تھا۔ میں خاموشی

سے اُکتانے لگا تھا اور یہ بھی جلنے کی خواہش صبح کی روشنی کی طرح

جاگ رہی تھی کہ ہم کہاں ہیں اور انسانوں کا شہر پشاور کتنے فاصلے پر ہے

اپنے گاؤں کی گلیوں میں چلتے پھرتے پورے گاؤں میں صرف

اپنا گھر خوب صورت اور پیارا لگتا ہے اور جب گاؤں سے دُور نکل کر

جائیں تو گھر کی یاد گاؤں میں ڈھل جاتی ہے۔ میں علاقہ غرے میں تھا تو مجھے

گھر یا دھارا گاؤں۔ اگر یاد تھی تو وطن کی سرزمین یاد تھی۔ جس پر تہذیب

کی روشنی تھی۔ لاقانون زمین پر جا کر ہی قانون پسند انسان کو قانون

کی مالکیت کا احساس ہوتا ہے۔

”ہم چیک پوسٹ کے قریب ہیں خرم سلطان۔“ اچانک فرید خان

”یعنی ہم پاکستان کی حدود میں داخل ہو چکے ہیں۔ میں نے جیج کو پوچھا۔“

”ہاں میں اگر چاہتا تو تمہیں دھوکا دے کر اپنے گاؤں میں داخل ہو جاتا۔“

”تم نے اچھا فیصلہ کیا ہے فریڈ خان۔ میں نے مضبوطی سے جواب دیا۔ اگر تم سے یہ حماقت سرزد ہو جاتی تو تمہارا مشربھی ان لوگوں سے مختلف نہ ہوتا۔“

سرک پر مضبوط رکاوٹ کھڑی تھی اور ایک باوردی جوان رکاوٹ کے ساتھ مستعد کھڑا تھا۔ گو سب کی روشنی آڑی تھی مگر سبھی سنتری نے مارچ کا اشارہ دینا شروع کر دیا تھا۔ فریڈ خان نے سائڈ میں دین روک کر میری جانب دیکھا۔

”میں نیچے جا رہا ہوں۔ میں اُٹھتے ہوئے بولا۔ فریڈ خان نے میرے لیے ڈرائیونگ سیٹ والا دروازہ کھول دیا۔ میں نے نیچے اُتر کر اگرائی لی اور ٹھننے کے انداز میں سنتری کی جانب بڑھنے لگا۔

”جوان! میں تمہارے کانڈر سے ملتا چاہتا ہوں۔ میں نے کہا۔“

”دبھتر میں کمانڈر ہے۔ سنتری نے ایک ایک کر بیدیا۔“

چھوٹے سے کیمین میں لائٹن کی روشنی میں ایک شخص کھلے آگے گڑی پر پاؤں رکھے بیٹھا ہوا تھا۔ مجھے دیکھ کر پہلے اُس نے پاؤں نیچے اتارے پھر کھل چھاڑ دیا۔ وہ سب انیکٹر یا صومیدار تھا۔ میرے سراپا کا جائزہ لے کر مسکرایا اور گڑی کی طرف اشارہ کر کے بولا۔ ”یہ صاحب!“

”شکر یہ صاحب!“ میں گڑی گھسیٹ کر بیٹھ گیا۔ ”میں اُس جگہ کا نام نہیں جانتا شاید کوئی بے نام سی جگہ تھی، جہاں سے میں پاکستانی ریل کی کولایا ہوں۔“ وہ ایک دم سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ تب میں نے ڈی۔ آئی جی کا خصوصی شناختی کارڈ نکال کر اُس کے سامنے رکھ دیا۔

وہ ہٹ بڑا ہوا اٹھا اور پاؤں جوڑ کر کھٹ سے سلیوٹ مار کر بولا۔ ”میرے لیے حکم جاب؟“

”ایک پل تک خود چلیے یا کسی نمائندے کو بھیج دیجئے۔“

”بہت اچھا۔ بہت اچھا۔۔۔“ اُس نے ٹوپی اٹھائی پھر ایک دم رگ گیا۔ ”چالنے پانی صاحب؟“

”ضرور صاحب۔ میں نے گردن ہلائی۔ لیکن یہاں نہیں پشاور چل کر نشتا کریں گے۔“

اُس نے باہر جا کر دل بجائی نہ جانے کن کن کونوں کھدوں

سے آنکھیں ملنے ہوئے چھ سپاہی کھل کر مشینی انداز میں قالن ہو گئے۔ ”آن ڈیوٹی فوجوان بھی الرٹ ہو گیا تھا۔ صومیدار نے پشت میں جلدی جلدی تقریر چھاڑی اور سپہاؤں کے کپڑوں کے بازو ہلاتا میرے سامنے آکر بولا۔ ”تین فوجوان کی گارڈ آپ کے ساتھ جانے کی صاحب!“

”آپ اپنی فہر اور تخطیوں سے آرڈر ایشو کریں گے صاحب!“

”ابھی۔۔۔ ابھی کرتا ہوں۔“ وہ لپک کر اندر گیا اور آرڈر دین حکم نامہ نکھلایا۔ اُس نے تینوں سپاہیوں کے نام بھی لکھے تھے۔ میں نے نائیک رحمت جان کو بلا کر حکم نامہ اُس کے سپرد کر دیا۔

جب وہ دین میں ہوا تو نے تو فریڈ خان کا رنگ اُڑ گیا تھا۔ اُس نے بھی سمجھا ہوگا کہ دین زیر حراست ہیڈ کوارٹر میں سے جانی جا رہی ہے اگر مجھے خطرہ نہ ہوتا کہ مرنا کیا نہ کرتا تو میں اصل صورت حال اُسے نہ بتاتا۔ مجھے خطرہ تھا کہ فریڈ خان اپنی گردن بچانے کی کوئی احمقانہ کوشش کر کے دین اعلیٰ میں نقصان پہنچا دے گا۔

”کیا واقعی تم سرکاری ہو خرم سلطان؟“ اُس نے پوچھا۔

”سرکاری یہ انتظام کر سکتی ہے خان۔ میں نے مسکرا کر جواب دیا۔

”میں دوستی کے نام پر اپنے پیٹے اور فرائض کو پس پشت ڈال رہا ہوں۔“

”ادھا نہیں انیکٹر۔۔۔“ وہ گڑبڑاتا ہوا بولا اور دین لہرائی۔

”سنبل کے فریڈ خان۔ میں نے اُس کی پشت تھپ پٹائی۔

”اگر تھک گئے ہو تو ناٹیک زحمت جان تمہاری جگہ لے سکتا ہے۔ کیوں زحمت جان!“

”جی صاحب بالکل۔“

فریڈ خان نے نفی میں گردن ہلا کر دین کا کنٹرول سنبھال لیا۔

ہم نے ایک ہول میں ناشتا کیا۔ ہول اتنا صاف نہ تھا لیکن دن اور قہوے نے بڑا لطف دیا تھا۔ ہم نے تین تین پیالیاں قہوہ پی لیں۔

اصرار کے باوجود پینٹ رحمت جان نے کی بھی شاید صومیدار نے اُسے ایسا حکم دیا تھا یا اُس نے پٹھانوں کی روایات نبھانی تھی۔ یہ جب خالی تھا تو آنکھیں بھی بند سے نا آشنا دہائی تھیں پھر نہ جانے کب میں سو گیا تھا۔

گورتی بس کے ہارن نے جیسے مجھے جھنجھوڑ دیا تھا۔ میں نے آنکھیں کھول دیں اور سامنے دریا دیکھ کر میرا جسم سنسنے لگا۔ کسی غیبی قوت نے ہی ہارن بجا کر مجھے بیدار کیا تھا، ورنہ پل پر میں اپنے من کے فیصلے کو عملی جامہ پہناتے ہوئے خاصی پریشانی سے دوچار ہو جاتا۔ رگوں بھی واپس جیتا تھا۔ گارڈ کی دھڑکن جگہ روک کر فوراً راستہ چھوڑ

دیا گیا تھا، جو کچھ میں کرنا چاہتا تھا، اگر گارڈ ساتھ نہ ہوتی تو وہی کام چیک پتر تال والے کر دیتے مگر میں جانتا تھا کہ اصل مقصد پورا نہیں ہوگا۔

”گارڈی روکو فریڈ خان! میں پل پار کرنے سے قبل کچھ کاروباری معاملات پر گفتگو کرنی ہے۔“ فریڈ خان نے گارڈی روک کر جب گردن موڑی تو میں اُس کی سرخ اور متورم آنکھیں دیکھ کر حیران رہ گیا۔ ایسی حالت میں وہ محفوظ اور محتاط ڈرائیونگ کیے کرتا رہا تھا۔

”کیسی گفتگو خرم سلطان؟“ اُس کی سرخ آنکھوں میں استعجاب تھا۔

”کیا ہماری دوستی دیرلے کے ادھر ہی رہ جائے گی دوست؟“

اُس نے گردن نفی میں ہلائی اور اترنے لگا۔

”پیکٹ بھی ساتھ لے لو، میں نے اُسے دوسرا جھکا دیا لیکن اُس نے کوئی سوال کیے بغیر پیکٹ سیٹ کے نیچے سے نکال لیا۔ بازار ایک خراب جگہ تھا۔ میں آگے سرک سے اترنے لگا۔ فریڈ خان بھی چپ چاپ اترتا چلا آیا تھا۔ دور اپنی رفتار سے بہرہ رکھتا ہوا کچھ فوجی نمائندے پر کھڑے تھے اور کچھ نہاڑے تھے۔

میں نے جیب سے ساری رقم نکال کر ایک پتھر پر رکھ دی۔

”گنگ بنگ چھ ہزار روپے تھے۔ فریڈ خان نے بھی پیکٹ پتھر پر رکھ دیا اور سوا لاکھ روپے سے میری طرف دیکھنے لگا۔

”فریڈ خان! دوست کے لیے، انسانیت کی خاطر اور قانون کے ناپ کر کیا پتھر بان کر سکتے ہو؟“

”صرف دوستی کی بات کرو خرم سلطان۔“ وہ غرایا۔ میں قوم پرست انسان نہیں ہوں۔“

”چلو دوستی کے نام ہی ہے۔“

”کیا چاہتے ہو؟“

”صرف دوستی اور پائیدار دوستی، جو میں اُس پار ساتھ لے جاؤں اور جو ہمیشہ میرے دل میں زندہ رہے۔“

”یہ بات ہے۔“ اُس نے ہاتھ بڑھایا اور میں نے دونوں ہاتھوں میں اُس کا ہاتھ لے لیا۔ اب بولو فریڈ خان سے کیا طلب کرتے ہو؟

”یہ پیکٹ اٹھا کر دریا میں پھینک دو فریڈ خان۔“

”بس یا کچھ اور بھی؟“

”ابتداء کرو دوست۔“ میں نے کہا اور فریڈ خان نے پیکٹ کو ایسے لگ لگائی جیسے فٹ بال کا کھلاڑی فریڈ لگ لگاتا ہے۔

پیکٹ اُپر اٹھا اور فضا میں قلابازیاں کھاتا ہوا دریا میں جاگرا اور ڈوب گیا۔

”شکر یہ فریڈ خان، میں نے بڑھ کر اُسے گلے سے لگا لیا۔“

”تم نے دوستی کی کال رکھ لی ہے۔ یہ معاوضہ نہیں فریڈ خان۔ بس دوست کی طرف سے مبارک باد ہے۔ اگر تم نے تکلف کیا تو مجھے دکھ ہوگا۔“ میں نے نوٹ اٹھا کر اُس کی جیکٹ کی جیب میں ڈال دیے۔

”مجھے۔۔۔ مجھے۔۔۔“ وہ پہاڑ جیسا شخص رو پڑا۔ خرم سلطان مجھے اپنے ساتھ لے چلو۔ میں ابھی گندہ ہوں مجھے صاف کرنا۔

میں بہت کچھ کھانا چاہتا ہوں خرم۔“

”آج نہیں دوست! تم جذباتی فیصلہ کر رہے ہو۔ کل برسوں۔۔۔“

برسوں بعد جب آنا چاہا تو چلے آنا۔ میں نہیں فون نمبر دے جاؤں گا۔ مجھے ابھی اُدھر جا کر مصروف ہونا ہے۔ سب مجھے معاف کر دینا فریڈ خان میں مجبور ہوں۔“

”بہتر!“ میں بہت جلد اُٹوں گا، سب کچھ چھوڑ کر صرف تمہارے لیے۔“

”چالنے سے قبل ایک اور وعدہ کرتے جاؤ۔“

”کیسا وعدہ؟“

”تم اب منشیات اور کالے ناگ کو ایک جیسا دشمن سمجھو گے۔ یہ دھند اتر کر دو گے۔“

”تم۔۔۔ تم۔۔۔“ اُس کی آواز جھجھکنے لگی۔ ”کیا ہو، کون ہو؟“

”صرف انسان اور انسان کا دوست۔“

”بہتر، وعدہ رہا۔“ وہ تھیل سے سگڑا لود بھیگا ہوا چہرہ صاف کرنے لگا۔ ”تم نے اُس فریڈ خان کو مار دیا ہے، اب فریڈ خان صرف تمہارا سایہ ہے۔ آؤ چلیں۔“

چیک پوسٹ کے اندر گاڑ کا ڈکارتا نائیک زحمت جان گیا تھا۔ نہ جانے اُس نے کیا بتایا تھا۔ ایک طویل قامت انیکٹر دوڑتا ہوا آیا تھا اور بہ اصرار میں رہ کر میں لے گیا۔ چائے سے فارغ ہو کر میں نے ہر سپاہی کو ایک سو اور نائیک کو دو سو روپے زبردستی دیے۔ اُنھوں نے سلیوٹ دیے اور فریڈ خان نے اُنسوں سے میرا شانہ بھگو دیا تھا۔ میں نے ان کو ایک پس پر بٹھایا اور خود دین کے کمر چل پڑا۔

عائشہ کی خوبصورت آنکھوں میں فیند کا خمار تھا لیکن وہ کسی بچی کی طرح خوش تھی۔ اُس کا کملا ہوا حسن اپنے دس کی ہڈیوں اور دہائی کی خوشی نے گلزار کر دیا تھا۔ وہ مندرک رہی تھی گڑی سیدھا اُس کے گھر چلوں مگر میں جذباتی پکڑوں میں نہیں پڑنا چاہتا تھا۔

وہاں جاتا تو وہ لوگ روتے اور میرے گرد جمع ہو جاتے جیسے کیسے سوال کرتے۔ میں ہاں ہوں کرتا رہا تھا پھر جب دین مال روڑے

اُتری تو عائشہ نے میرے ہاتھوں پر ہاتھ رکھ دیا تھا۔
 "میں نہیں جاؤں گی کسی اور کے ساتھ۔ وہ محل لگی۔" خدا کی قسم نہیں جاؤں گی اگر تو بھی لینے آئے تو انکار کروں گی۔
 "پریشان نہ کرو عائشہ میری اپنی کچھ بیوریاں ہیں میں فی الحال منظر عام پر نہیں آنا چاہتا کیا تمہارے والدین ہاتھ پر ہاتھ دھرے خاموش رہتے ہوں گے۔ نہیں جان برادر۔۔۔ اگر میں تمہارے ساتھ گیا تو مجھے سب کو مطمئن کرنا ہوگا اور میرے پاس وقت نہیں ہے ہاں میں اپنی بہن سے وعدہ کر سکتا ہوں کہ پہلی قسمت میں آؤں گا۔ بس اب تم صبر نہیں کرو گی میں تمہیں سیرورینا اسٹاپ پر ڈراپ کر دوں گا۔ یہ کچھ رقم ہے رکھ لو۔"
 اُس نے صرف دس کانوٹ نکال کر باقی رقم پیش بورڈ پر رکھ دی۔

"کیوں ناراض ہو پتے بھائی سے؟"
 "نہیں۔" اُس نے گھوگر آواز میں جواب دیا میں آپ کو مجبور نہیں کروں گی۔ آپ یقیناً بہت بڑے آفیسر ہوں گے آپ کو اپنے مشن کی رپورٹ دینا ہوگی میں صرف آپ کا انتظار کرتی رہوں گی کسی خوشی میں شریک نہیں ہوں گی جب تک آپ نہ آئیں گے۔"
 "میں ضرور آؤں گا، کب؟ یہ حالات پر منحصر ہے تم اپنا فون نمبر دے دو۔"
 اُس نے فون نمبر بتایا اور میں نے دین چوک سے ہو کر ایک ادنیٰ بس کے پیچھے روک دی۔
 "میں ٹیکسی تک ساتھ چلوں گا۔"

"نہیں۔" اُس نے دوپٹہ درست کیا پھر میرے ہاتھ کو تھام کر نیچے جھک گئی۔ آنکھوں سے نگا کر چھوڑ دیا۔ یہ دیکھ کر کوئی بہن اپنے بھائی کو ہر سانس کے ساتھ یاد کر رہی ہے۔
 "تم بھی یقین رکھنا کوئی بھائی اپنی دعاؤں میں یاد کر رہا ہے۔ جاؤ۔۔۔!"

میں نے دروازہ کھولا اور وہ اُتر گئی اور میں نے دین آگے بڑھا دی۔ جب میں بائیں ٹرن لے رہا تھا تو عقب نما آئینے میں وہ دکھائی دی تھی۔ ایک ٹیکسی اُس کے قریب آکر رُک گئی تھی۔
 "میں فون بوقت میں داخل ہو کر دروازہ بند کرنے تک میں فیصلہ نہ کر پایا تھا کہ پہلے کسے کال کروں۔ ہیڈ کوارٹر، اسپتال یا تیسرے محل میں چراغ میرے دل میں روشن تھے۔ پہلے فرض کی نماز ادا کروں۔ روحانی پیاس بجھاؤں یا دل کے تپتے صحرائیں

فرحت انجیز موسم لافل۔
 آنکھیں بند کر کے ڈائل پر انگشت شہادت رکھ دی تھیں۔ جیت گئی تھی۔ آواز مردانہ سن کر غلط بصر میں خاموش رہا تھا۔ پھر یاد کا پرت اُٹا تو میں نے پوچھ لیا۔ کون سا ڈیوٹی تھا۔
 "میں خان کہاں ہیں؟ کون سا میں خرم سلطان ہوں۔"
 "اوہ چیف آپ کہاں سے بول رہے ہیں؟"
 "تمہارے قریب ہوں ٹھیکہ گل کو بلاؤ۔"
 "ابھی ابھی وہ کلر جسے آئی ہیں شاید ڈیوٹی بدل رہی ہوں میں اطلاع بھجواتا ہوں۔"

دو تین منٹ میں کھوئے ہوئے الفاظ تلاش کرتا رہا۔ جب وہ لائن پر آئی تو سارے الفاظ جنگلی ہرن کی طرح پھٹ کر پھرنے لگے۔ میں صرف ہنس کر رہ گیا تھا۔
 "ہیلو۔۔۔ ہیلو۔۔۔ خرم۔۔۔ کیوں نہیں بولتے آپ؟"
 "شرمندگی کے چھالے ہیں زبان پر ٹھیکہ گل۔"

"شرمندگی۔۔۔ کیسی شرمندگی خرم؟" اُس نے استعجاب سے بے میں پوچھا۔ ہاں پچھتاوا کہہ سکتے ہو نہ امت تو مجھے ہونی چاہیے۔ میری وجہ سے آپ کو بہت صدمے ملے ہیں۔ وفادار ساتھی اور رشیدہ باجی! یہ سب کچھ میری وجہ سے ہی ہوا ہے۔
 "چھوڑو میں خان ایسے بتاؤ وہاں کوئی پریشانی تو نہیں ہے۔ پنجبرے کی مینا خوش بھی نہیں رہ سکتی خرم۔" اُس نے جواب دیا۔ وہ ایک آزمائش تھی گزرتی۔ آپ کہاں ہیں۔۔۔ اور کب آئیں گے؟

"ابھی مصروف ہوں، بے حد مصروف ٹھیکہ جان! ہاں کوئی ضروری کام ہو تو بتا دو۔"
 "نہیں، ٹھیک ہے۔" اُس نے گہری سانس لی۔ جب فرصت ملے تو آجایے گا۔" اُس نے ایک دم ریسورڈ رکھ دیا۔ ٹھیکہ جیسی لڑکی اُن جذبول کو زبان نہیں دے سکتی تھی، جو کسی اپنے کو دیکھنے کے لیے بے گل ہوتے ہیں۔ ہاں اُس نے خاموش اٹھا کر دیا تھا۔

پھر میں نے ہیڈ کوارٹر سے رابطہ ملایا۔ گفتنی سبج رہی تھی۔ چوتھی گفتنی کے بعد میں ہاتھ بڑھانے ہی والا تھا کہ ریسورڈ اُٹھا لیا گیا۔

"ہیلو کون؟" بیگن کی کھردری آواز سنائی دی۔
 "میں ہوں ماسٹر! مجھے کل شام سے آج تک رپورٹ دینے سے روک دیا۔" اُن کی بات ایک ہی تھی۔ ہارون نے ایک

بڑے صاحب کی گاڑی نہ صرف پگڑی تھی بلکہ خبر جمع تصویر اخبارات تک پہنچا دی تھی اور بڑے صاحب کو محکمے کے سربراہ نے فی الفور منسل کر دیا تھا اور پولیس اُن کو جہان گھر تک لے جا چکی تھی۔ دوسری خبر بھی اہم ہی تھی۔ اکبر خان ہونٹ چھوڑ کر چلا گیا تھا اور تیسرا حکم تھا میرے لیے کہ پندی آتے ہی وزیر داخلہ کی معرفت پراگم مندر سے مل لوں۔

"میرے گھر سے کوئی مزید اطلاع؟"
 "آپ نے وہ خط ابھی تک نہیں کھولا خرم سلطان؟ ماسٹر نے سرنش کے لیے میں کہا۔" اُن لوگوں کو تمہارا انتظار ہوگا۔"
 "ٹھیک ہے ماسٹر! رشیدہ کی طرف جا رہا ہوں واپسی پر ملاقات ہوگی۔"

"آپ نے بتایا نہیں ادھر سے اتنی جلدی کیسے واپس آگئے ہو؟"

"ملاقات پر رپورٹ دوں گا ماسٹر! میں نے بتایا۔ بڑی پرجوش رپورٹ ہے۔"
 "او۔ کے بولنے میں منظر ہٹا بیگن نے سلسلہ توڑ دیا۔

بیگن نے جس خط کا حوالہ دیا تھا میں اُسے کھولنے اور پڑھنے سے گھبرا رہا تھا، جس طرح بالائق طالب علم کا ڈر پڑھنے سے گھبراہٹ کی وجہ زینت تھی مجھے خدشہ تھا کہ اسی نے بھائی جان کے بارے میں تند و تیز شکایات کی ہوں گی۔ اُس کی ہر شکایت بجا تھی لیکن وہ احمق لڑکی سوچتی نہیں تھی کہ خرم سلطان ہر کھکا مادہ کر سکتا ہے، ہر شکایت کا ازالہ کر سکتا ہے مگر کرم بھائی کے معاملے میں بے بس ہے میں کرم بھی کیا سکتا تھا۔ اُن کے دل و دماغ میں جو کھماں کی جنگ جاری تھی اُسے سو کر کسی ماہر نفسیات کے بس کا بھی روک نہ تھا۔

وہ بہت کچھ جانتے تھے ماضی کا آئینہ اُن کے سامنے تھا۔ وہ ماضی کے آئینے میں طالب و مطلوب کو دیکھ رہے تھے۔ وہ ہی نہیں گاؤں اور برادری کے لوگ بھی حیران تھے کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ زینت کسی اور کی ہو سکتی ہے۔ اس حقیقت کا علم اماں بی کو بھی تھا لیکن حالات نے بساط ہی الٹ دی تھی۔ منزل پر اٹھا کر اُسے پھینک دیا گیا تھا۔ جو نہ تو شریک سفر رہا تھا اور نہ ہی جس نے اُس منزل کے بارے میں کبھی سوچا تھا۔

کرم بھائی شاید حالات سے سمجھوتہ کر لیتے اگر میں مین انٹری دفاتر واپس نہ آجاتا۔ زینت نے بھی کوئی نہ کوئی تو عمل لاس کیا ہوگا جس نے کرم بھائی کو جنگ آلود کاروں بنا دیا تھا۔ وہ بالکل ناکارہ ہو کر رہ گئے تھے۔ یاد دوسری وجہ یہ تھی کہ وہ محض اداکاری کر رہے

تھے اور زینت کو خرم سلطان کی امانت جان کر ایک قاصد پر رُک گئے تھے۔ کچھ بھی تھا، اُن کے درمیان انگارے کی طرح دھک رہا تھا۔ دونوں ہی میرے پرستار تھے لیکن دونوں مجھ سے دور دراز کھڑے رہنے پر مجبور کر دیے گئے تھے۔

اسپتال کی سیڑھیاں چڑھتے تک میرا دھیان حویلی میں گھومتی پھرتی زندہ لاشوں پر رہا تھا۔ دل دکھ گیا تھا اور آنکھیں منانگ ہو گئی تھیں۔ بیٹ پر وف نیو دین میں دیکھنے والوں نے مجھے ملک کا خوش باش نوجوان سمجھا ہوگا جس طرح میں پہلے پہل کو ٹیپوں کی بالکونیوں سے جھانکتے اُچلے اُچلے چہروں کو دیکھ کر اپنی پرانی حویلی پر گڑھا کرتا تھا۔

میدان عمل نے یہ عبرت دی تھی کہ سکون کو ٹیپوں میں نہیں سکون کا اپنا الگ مزاج ہوتا ہے۔ وہ چاہے تو جنگلی نشیوں کو اپنے ہروں تلے دے لیتا ہے۔

دارو کے برآمدے میں ہارون کو ٹہکتا دیکھ کر میرا دل اُچھل کر جیسے ملحق میں پھنس گیا تھا۔ ہارون کی بے قراری بے وجہ نہیں تھی۔ قدموں کی چاپ سن کر اُس نے ٹپٹ کر دیکھا۔ میرے چہرے پر ایک دم ہی بدحواسی اور زبردستی کھنڈ گئی ہوئی، جس نے ہارون کو اور بھی پریشان کر دیا تھا، وہ اپنی جگہ جم گیا تھا۔
 "کیا بات ہے ہارون، رشیدہ کہاں ہے؟" میں نے دُور سے ہی گھبرا کر پوچھ لیا۔

"اُسے آپریشن تھیں لے گئے ہیں، زخم میں پندی کی کوئی کچی پھنس کر رہ گئی تھی۔"
 "خطرناک آپریشن تو نہیں؟"

"نہیں۔ ہارون نے ہاتھ بڑھایا۔ آپ خیریت سے لگے ہیں نا؟"

"ہاں میں تو کامیاب لڑا ہوں میں نے اُس کا ہاتھ تھام لیا۔" میں نے اسٹرینچر ڈالی نمودار ہوئی۔ میں اور ہارون بے اختیارانہ ادھر دیک کر گئے۔ ایک زرس نے ہاتھ اٹھا کر کہا۔ فکر کی کوئی بات نہیں۔ آپ لوگ شام کے وقت آئے گا۔"

میں نے قریب سے گزرتی لڑائی کو بے قرار لگا ہوں سے دیکھ کر رشیدہ کا چہرہ سُستا ہوا تھا اور وہ ہونٹ جن کو دیکھ کر گلاب کی پتھر یوں کا احساں ہوتا تھا۔ پیڑ لگے ہوئے تھے۔

"سیر کیا سر جن فارغ ہیں؟" میں نے ساتھ چلتے چلتے رشیدہ کی پیشانی کو چھوتے ہوئے پوچھا۔

"جی ہاں آپ اُن سے مل لیں۔" زرس نے گویا مہی کے لیے

مشورہ دیا۔ اسے خطرہ رہا ہو گا کہ ہم ہدایت کو پس پشت ڈالتے ہوئے اندر چلے جائیں گے۔

آپریشن تیسرے مٹھکمرے میں تین ڈاکٹر بیٹھے ہوئے تھے۔ میں اجازت لے کر اندر داخل ہوا۔ میرے عجب میں ہارون بھی تھا۔ اُسے دیکھ کر ہی سرجن نے پہچانا تھا۔ میری غیر حاضری میں اسی نے تیمارداری، دل داری اور دیگر مراحل طے کیے تھے۔ وہ فاصلہ جو ایک چاہنے والا مرد برسوں طے نہیں کر سکتا۔ ہارون کو حادثے نے وہ سب کچھ دلوں میں دے دیا تھا۔ وفاداری اور خلوص کا اظہار زبانی اور تحریری وہ تاثر نہیں چھوڑتا جو عمل متبر مقابل کو احساس دلاتا ہے۔ ہارون محنت کے معاملے میں خوش نکت تھا۔ اسے اظہار کا موقع مل گیا تھا۔

گھبرانے کی اب کوئی ضرورت باقی نہیں رہی مگر ہارون ایک مقرر ڈاکٹر نے کہا یہ ہم آپریشن سے قبل بے شک کچھ پریشان تھے۔ سائیکس رپورٹ نے میں اچھا دیا تھا۔ پسلی کی ایک کٹر دل تک چلی گئی تھی۔ ہمیں خطرہ تھا کہ بڑی کی نوک دل میں گھس نہ گئی ہو لیکن خدا کا شکر ہے بول کے ساتھ ترچی ہو کر چپک گئی تھی۔ ڈاکٹر! میں نے مودب آواز سے پوچھا وہ غالباً پہلے بھی ابھرے لیے ہوں گے۔

”جی ہاں ڈاکٹر مسکرانے لگا میں آپ کا مطلب سمجھ رہا ہوں مگر...“

”ختم سلطان“

”ہاں تو مگر خرم سلطان اور اصل بھی وجہ پریشانی تھی پہلی فلموں میں یہ بڑی کسی دوسری جگہ رہی ہوگی۔ مثلاً کسی پسلی کے ساتھ ہی چپکی رہی ہوگی۔ بعد میں جتنے جتنے یا کسی دوسری وجہ سے دل پر جاگری ہوگی، ورنہ ہم پہلے آپریشن میں ہی نکال لیتے۔ ڈاکٹر کی وضاحت اور تسلی نے مجھے مطمئن کر دیا تھا ہارون شاید وہاں ہی ٹھہرا رہتا لیکن میری وجہ سے وہ اپنی محنت کو نذرانہ دینے سے گریز کر گیا تھا کیونکہ ایک بھائی کی موجودگی میں ایسی عبادت نہیں کی جاسکتی تھی۔

وہاں سے نکل کر میں نے اُسے اپنی کارگر داری سنائی۔ اُس نے کسی حیرت کا اظہار کیا اور نہ ہی کوئی سوال پوچھا تھا جیسے اُسے یقین رہا تھا کہ خرم سلطان یہی کچھ کرنے گیا تھا اور کچھ واپس آگیا ہے۔

”شاید یہ میری ہی ناقص سوچ ہوئی۔ اُس نے نہایت ہی پرسکون آواز میں کہا۔ آپ کو فرید خان کو خان مرحوم کا نمبر

نہیں دینا چاہیے تھا۔ میں یہ نہیں کہتا کہ بڑا انسان بڑائی چھوڑ نہیں سکتا لیکن ایک دم بدلنے کے پیچھے کوئی نہ کوئی شدید جو ان یا حادثہ ہوا کرتا ہے۔ کوئی شدید ذہنی جھٹکا ہی انسان کو دوندہ اور دوندے کو انسان بناتا ہے، جبکہ فرید خان کے ساتھ کوئی ایسا حادثہ نہیں ہوا بلکہ اُس کے منہ سے آپ نے نوالہ چھین کر دریا برد کر دیا ہے۔ ہو سکتا ہے اُس نے اُس شخص کے سامنے محض اداکاری کر کے اپنی جان بچائی ہو، جو اُس کی آنکھوں کے سامنے زندہ لگاؤ میں کائنات پھلا ملتا نکل آیا تھا۔

مجھے بھی کچھ ایسا ہی احساس ہوا تھا ہارون! میں نے جواب دیا لیکن میں کچھ جذباتی واقع ہوا ہوں۔ چلو ایک اور تجربہ ہی سہی پیارے۔

”نہیں پیارے بھائی! ہارون نے نفی میں گردن ہلاتی ٹالے تجربات ہمیں اپنی ذات کی حد تک رکھنے ہوں گے۔ خان کی بیٹیاں مقدس اماں ہیں۔ کیا ایک تجربہ کافی نہیں؟

”اس کی تلافی کر لیں گے ہارون! ویسے بھی اُن کا وہاں قیام خطرناک ہو گیا ہے۔ ملک نواز خان نہ صرف ابھی زندہ ہے بلکہ اُس کے بدن پر دوسرا زخم بھی لگا ہے۔ تمہارا کیا خیال ہے وہ وہاں صرف اپنی بوٹیاں نوچنے کے لیے بیٹھا رہے گا۔ نہیں بلادر وہ زلزلے کی طرح نمودار ہو گا۔“

”آپ نے اُسے زندہ کیوں چھوڑا؟“

”میں نے نہیں پیارے! میں نے گہری سانس لی۔ وقت ہی نے اُسے بچا لیا ہے۔ اُس وقت وہ خان جبار کے ساتھ تھا اگرچہ اُسے ضرب لگائے جاتا تو نہ جانے میرے ساتھ کیا ہو جاتا۔ ہاں اگر وہ لڑکی نہ ہوتی تو میں اتنا مجبور نہ ہوتا۔ جیسے بدل کر اُن کی صفوں میں شامل ہو جاتا۔ اندھیرے کی نکل میں چہرہ چھپا کر شاید ملک نواز تک چلا جاتا مگر عائشہ کی سلامتی ملک نواز کی موت سے کہیں زیادہ ضروری تھی۔ ملک کسی دن پھر ہماری زدوں آجائے گا لیکن ایک منصوم لڑکی اگر ضائع ہو جاتی تو میں خود کو کبھی معاف نہ کر پاتا۔“

”یہ تو کارِ نواب تھا! ہارون نے میری حوصلہ افزائی کرتے ہوئے کہا۔ آپ اگر اپنی رپورٹ میں یہ کہتے کہ ایک مجبور لڑکی کو محض فرائض منصبی پر قربان کر دینا پڑا تو مجھے بڑا دکھ ہوتا اور آپ کی ذات کا جو کوہِ بلند میرے اندر کھڑا ہے وہ یقیناً متاثر ہوتا۔“

”عزت افزائی کا شکریہ! میں نے نہیں کر کہا۔ ویسے

تم اگر کسی بادشاہ کے درباری ہوتے تو بڑا عہدہ اور بڑے بڑے اعزاز پالتے۔“

”ذرا نوازی کا شکریہ! ہارون بھی کھسا کر ہنسنے لگا اور کار راگ رنگ ہوٹل کے پارکنگ سٹینڈ میں رگ لگی۔

شیشے کا بڑا دروازہ کھول کر جو نہی، ہم اندر داخل ہوئے کاؤنٹر پر اکبر خان کو دیکھ کر میں نے حوالہ لگا ہوں سے ہارون کی جانب دیکھا کیونکہ اُس نے بھی تین کی اطلاع کی تائید کرتے ہوئے بتایا تھا کہ اکبر خان بغیر اطلاع ہوٹل سے چلا گیا ہے۔

”میں خود حیران ہوں چیف! ہارون نے میری لگا ہوں کا جواب دیا۔ میں ہینڈ لگ کی رپورٹ پر گزشتہ دن کاؤنٹر پر کام کرتا رہا ہوں۔“

اکبر خان کاؤنٹر پر بائیں کہنی کی ٹیبل فون پر کسی سے گفتگو کر رہا تھا۔ ہم دے پاؤں کاؤنٹر پر کہنیاں ٹیک کر کھڑے ہو گئے۔

”میں صرف ملازم ہوں جناب! اکبر بولا۔ ایسا دفادار ملازم جو مالک کے ہر مفاد پر نظر رکھتا ہے پھر ملک کی عدم موجودگی میں یہ ذمے داری کچھ اور بھی بڑھ جایا کرتی ہے۔ جی ہاں میں پہلے بھی عرض کر چکا ہوں کہ میرے مالک اس شہر میں موجود نہیں ہیں۔ خرم سلطان کوں خرم سلطان جناب! یہ ہوٹل رنگ باز خان کا ہے مجھے اُن کے ایک عزیز نے یہ ذمے داری سونپی ہے۔ میں کسی خرم سلطان سے واقف نہیں ہوں اگر اسی کا نام سلطان ہے تو میں بتا چکا ہوں وہ پشاور واپس چلے گئے ہیں۔ مجھے کبھی بھی فون پر شرفِ ملاقات نہ ملے ہیں۔ میں نے ہاتھ بڑھایا تو اکبر خان اچھل پڑا پھر اُس کی آنکھوں اور چہرے کا رنگ بدل گیا تھا۔ میں نے ہونٹوں پر ہانگی رکھ کر ریسیور اُس سے لے لیا۔

”السلام علیکم خرم! یہ اتفاق ہی ہے کہ میں حاضر ہو گیا ہوں اب براؤ کر م پہلے اپنا تعارف کرو لیے پھر بات ہوگی۔“

”جی! درخواست میں دوبارہ کر دوں گا جناب!... کچھ کہانی آواز تھی آپ نووارد ہیں۔ رسم بھی ہے آپ اپنا تعارف کروائیں۔“

”میں رنگ باز خان کا بھانجا شہباز خان ہوں۔ میرا بچہ قد سے پشاور ہی تھا۔ اُدھر وہ کچھ دیر خاموش رہا تو میں نے کھانا شروع کر دیا۔ بولو برادر۔“

”شہباز خان! وہ معنی خیز لہجے میں بولا۔ پٹھان مرد بڑے جی دار اور عزت مند ہوتے ہیں۔“

”شکریہ لالہ۔“

”لیکن تم نے اُس نوجوان کے بارے میں ابھی معلوم نہیں کیا،

جو رنگ باز خان کا وارث بن گیا ہے۔ سننا ہے وہ صرف خان مرحوم کا بڑا بیٹا نہیں تھا لیکن اب اُس کی نوجوان بیٹیوں کے ساتھ رہتا ہے۔ میں خان مرحوم کا دوست ہوں، کیا میرے دوست کی رُوح پرسکون ہوگی؟

”نہیں چاچا! میں نے غرائی آواز میں جواب دیا۔ مجھے... مجھے کسی نے ایسی بات نہیں بتائی۔ بہت بہت شکریہ چاچا صاحب! لیکن میں تنہا اجنبی شہر میں کیا کر سکتا ہوں۔ کیا آپ اپنے مرحوم دوست کی خاطر میری مدد نہیں کریں گے چاچا؟“

”کیوں نہیں لیکن حق دار تم ہو! تم آواز بلند کرو گے تو خان کے ہمدرد تمہاری پشت پر آئیں گے۔ پہلے تم جا کر اُس نوجوان کو طوڑو جہاں بھی ہے اُس سے ملاقات کرو پھر مجھے بتاؤ۔“

”براہ کرم آپ چند منٹ کے لیے ہوٹل تشریف لے آئیے۔ میں گولڈن لگاؤ مجھے مشورہ نہیں مدد دے گا۔“

”نہیں عزیزم! پہلے اُسے تلاش کرو۔ میرا فون فیر کھلو! جب اطلاع دو گے میں چلا آؤں گا۔“ اُس نے ٹھہر ٹھہر کر فون نمبر کھولیا۔

”شکریہ جناب! میں ابھی معلوم کرتا ہوں۔ براہ کرم آپ فون کے قریب ہی رہیے گا۔“

”ہاں ہاں! میں رات دس بجے تک یہاں ہوں۔“

میں نے ہانگی ریسیور کر ڈیل پر رکھ دیا۔ اکبر خان نے ویسروں کو اشارہ کیا جو مجھے دیکھ کر لابی میں ایسے ٹکڑے سے کھڑے تھے، جیسے بکریوں نے جنگلی درندہ دیکھ لیا ہو۔ اشارہ دے کر وہ بولا۔ ایک شخص میری عدم موجودگی میں یہاں بھی پوچھ گچھ کرتا پایا گیا تھا۔

”تم کہاں چلے گئے تھے اکبر خان؟ میں نے ڈانٹ لگائی میں میٹھے لوگوں پر اچلتی نگاہ ڈالتے ہوئے پوچھا۔

”مجھے بڑے صاحب نے بلایا تھا۔ اکبر خان کاؤنٹر سے نکلتے ہوئے بولا۔

”بڑے صاحب! میں نے استنبہامید انداز میں پوچھا۔

”جی ہاں ڈی آئی جی صاحب! اکبر نے اثبات میں گردن ہلاتی۔ آخ میں تشریف لے چلیں چیف۔“

میں ریو الاگ چیمبر پر بیٹھا جہاں کبھی رنگ باز خان بیٹھ کر کھولا کرتا تھا ہارون سامنے بیٹھ گیا۔ اکبر خان قدیاتہ انداز میں کھڑا ہوا تھا۔ میں نے کرسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

”بیٹھ جاؤ اکبر اور مجھے بتاؤ، ٹیلی فون کال کس کی تھی اور بڑے صاحب نے کیوں بلایا تھا؟“

”منظر پھر بدری حوالالت سے فرار ہو گیا ہے۔“ اکبر خان نے

جیسے میز پر ہم بھینک دیا تھا میں اور ہارون دونوں اچھل کر نیم استادہ ہو گئے تھیں جب رنگ باز خان کے گھر اطلاع دینے گیا تو مجھے بتایا گیا کہ کسی نے حملہ کر کے ایک شخص کو ہلاک کر دیا ہے میری بڑی حالت ہو گئی تھی۔ چیف پھر مجھے معلوم ہوا کہ ہلاک ہونے والا شخص غیر ملکی تھا۔ آپ اور ہارون صاحب نہیں تھے۔ میں نے واپس آکر بڑے صاحب کو رپورٹ دی اور انھوں نے مجھے طلب کر لیا۔ وہ بھی بچہ پریشان تھے کہنے لگے کہ اگر خان! میں سادہ لباس والا ہوں تو تعینات کرتا ہوں تم بھی فوراً حویلی میں چلے جاؤ، منظر جو بدی کہیں وقت سے فائدہ نہ اٹھائے۔

”کیا وہ ادھر گیا تھا؟“ میرے حلق سے غراہٹ ابھری۔
”نہیں چیف! اگر خان نے فنی میں سر ہلایا تو میں دو راتیں وہاں رہا ہوں۔ سادہ لباس والے بھی گاڑی اور حویلی کے گرد پھیلے ہوئے ہیں مجھے آپ کی بھائی نے واپس کر دیا ہے۔ حویلی کے اندر وہ اور دوسری خاتون عایدہ بیگم باری باری پہرہ دیتی ہیں۔“
”اور بھائی جان؟“

”وہ... وہ بیمار ہیں چیف! اماں جی بھی ان کی وجہ سے پریشان ہیں اگر حالات بخیر نہ ہوتے، حویلی میں کوئی اور مرد ہوتا تو میں ان کو علاج کے لیے آتا۔ انھوں نے کھانا چھوڑ دیا ہے صرف دودھ کی پیالی پی لیتے ہیں۔“

”ٹھیک ہے بھائی“ میرے گھر میں دکھ کے گولے بننے اور پھوٹنے لگے تھے۔ وہ خاندان، وہ لوگ کتنے خوش اور پرسکون تھے میری وجہ سے وہ کتنے دکھی ہو گئے تھے۔ میری ایک غلطی نے خاندان کا شیرازہ ہی بکھر دیا تھا بنیادی وجہ میری ہی ذات تھی اگر فاروق کو شک نہ ہوتا تو کشتوم کبھی میری توجہ کا مرکز نہ ہوتا تو اس کا دھیان حویلی کی جانب کبھی سفر نہ کرتا۔ اس نے جب دیکھا کہ خرم سلطان باہر چلا گیا ہے اور کرم بھائی ہونے نہ ہونے کے برابر ہیں تو چڑھ دوڑا سمجھے تو یہ بھی اعتراف ہے کہ اباجی کی جان بھی میری ہی طاقت سے ضائع ہوئی تھی۔

میں گری سے اٹھا تو وہ دونوں بھی میرے ساتھ ہی اُسٹے اور ساتھ چل پڑے۔ میرا دماغ جیسے پھٹ رہا تھا اور دل جل رہا تھا۔ میں نے وہ نمبر ڈائل کیا جو نامعلوم شخص نے تھوڑی دیر پہلے دیا تھا۔

”ہاں بول رہا ہوں“ ادھر کوئی بیٹریا نہ آیا۔
”اسلام علیکم بھائی صاحب! میں شہباز خان بول رہا ہوں۔“
”جی چند منٹ قبل ایک صاحب سے بات ہوئی تھی“

”یہ لو بات کرو۔“

”ہیلو جناب۔“

”بول رہا ہوں شہباز خان۔“

”میں نے اگر خان سے معلومات حاصل کی ہیں جناب آپ کی اطلاع کی تائید ہوئی ہے۔ وہ نوجوان خرم سلطان ہے اور میں نے یہ بھی معلوم کر لیا ہے کہ وہ رات وہیں بسر کرتا ہے۔ خان کی بڑی بیٹی نے تصدیق کر دی ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ خان مرحوم نے اُسے ہمارا سر پرست مقرر کیا تھا۔“

”کیا آپ تسلیم کر لیں گے شہباز خان؟“

”نہیں، سرگز نہیں دیکھیں نے پر جوش آواز میں جواب دیا۔ لیکن مجھے آپ کا تعاون چاہیے۔ سنا ہے کہ وہ ادھر کا غنڈہ ہے میں ایک شریف انسان ہوں جناب۔“

”تمہاری مدد کی جائے گی شہباز۔ وہ مضبوط آواز میں بولا۔
”مجھ سے مل لو۔“

”کہاں صاحب؟“

”ہوٹل سے باہر آؤ، ٹیک آؤ سے گھنٹے بعد میری گاڑی کا نمبر نوٹ کر لو۔ تمہیں خود ہاتھ کا اشارہ دینا ہوگا۔“
”آپ خود کیوں نہیں تشریف لے جاتے جناب؟“ میں نے التجائی لہجے میں کہا تو میں تو گھبرا رہا ہوں تھا نہیں کب وہ غنڈہ گھبرانے کی ضرورت نہیں ہے خان، میں آ رہا ہوں۔“

”اوہ شکریہ بہت بہت شکریہ! میں آفس میں آپ کا منتظر رہوں گا جناب۔“

ریسیور رکھ کر میں نے ہارون کو آفس میں چلنے کا اشارہ کیا۔
”اگر خان! تم کا دفتر پر مستعد رہو گے۔ وہ آ رہا ہے۔ کوشش کرو گا کہ چلے جائیں اسے آفس میں لے آنا۔“

میرا دشمن اگر کوئی ایک ہوتا تو میں اندازہ لگاتا۔ میں نے کئی چھتوں کی پھڑوں کو چھڑا تھا، سیٹھ سلیمان اور ملک نواز کے گھر کوئی بھی جوانی کا ردوائی کر سکتا تھا۔ جبار خان کا بھی کوئی رابطہ ہو سکتا تھا۔ وہ جو بھی تھا اسے خرم سلطان درکار تھا۔ منظر جو بدی بھی زنجی ناگ تھا لیکن میرا خیال تھا کہ وہ گاؤں کی سیاست کا ماہر کھلاڑی تھا اسے جو کچھ کرنا تھا گاؤں کی حد تک سہ کر ہی کرنا تھا کیونکہ اس کی ذات اور ساکھ کو جو دھچکا لگا تھا۔ وہ گاؤں میں ہی دوبارہ بحال ہو سکتا تھا۔ شہر میں وہ کچھ بھی کرتا، گاؤں والوں کو خیر نہ ہوتی۔
”کون ہو سکتا ہے چیف؟“ ہارون نے پوچھا۔

”جو بھی ہے ہمارا دوست نہیں ہوگا“ میں نے جواب دیا۔
”میں ایک دشمن کا استقبال کرنا ہوگا۔“
”آپ ساڈم میں چلے جائیں چیف! میں اس سے منٹوں گا۔“

”وہ میرا ہمارے ہارون! ادھر نہیں جانا ہوگا اگر مجھ سے خدمت میں کوئی نہ ہوگی تو اسے تم سنبھال لینا پہلے تو میں ہی اس سے ملاقات کروں گا۔“

”میں نے گاؤں سے درخواست کر کے ڈائننگ ہال خالی کر دیا ہے۔“ اگر تیار کیا گیا کلوڈ کا بورڈ لگا دوں؟
”ہاں، لیکن اسے بھی تو مانا ہے۔“

”ٹھیک ہے جناب میں دس منٹوں سے کہہ دوں گا، وہ نئے آنے والوں سے معذرت کر لیں گے۔ اگر خان پلٹ گیا تو میں نے ریلواری جیب سے نکال کر دروازہ میں رکھ دیا۔ میں نے فیصلہ کیا تھا کہ حتی الوسع ریلواری سے اجتناب کروں گا کیونکہ ہوٹل کی ساکھ اور دن کی روشنی مانع تھی۔ میں اگر خان کو الگ لکھنا چاہتا تھا کیونکہ خان کی بیٹیوں کے لیے صرف ہوٹل ہی ذریعہ معاش رہ گیا تھا۔

”چیف!“ ہارون بول پڑا تو کیا میں لابی میں نہ چلا جاؤں؟
”فائدہ؟“ میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔
”آنے والا اگر ضرورت آتا ہو تو کیا وہ...؟“

”ہاں پیارے ایسا ممکن ہے۔“ میں نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ٹھیک ہے تم کاؤٹری آؤ میں چلے جاؤ۔ اگر خان اسے آفس تک لائے گا پھر تم کاؤٹری پر الٹ رہو گے۔“

وقت دیکھتا ہوں کیا تھا کسی کروٹ میں نہ تھا۔ لحظہ لحظہ بدین پر سر ہاتھ لگاتے ہوئے لگا تو میں نے اگر خان سے آمدن خرم کا گوشوارہ منگوایا۔ میں اپنی توجہ آنے والے لمحات سے ہٹانا چاہتا تھا، ورنہ اعصاب ترخ جاتے اور حوصلے کی فعالیت متاثر ہو جاتی۔
”اس نے ارادہ بدل لیا ہے چیف!“ ہارون نے آکر بتایا۔
”اب اس کا ڈرائیور آ رہا ہے۔“

”اوکے، ہم جائیں گے۔“ میں نے فوری فیصلہ منادیا۔ دشمن کو اندھیرے میں نہیں رہنا چاہیے جو بھی ہے سامنے آئے گا تو بہتر ہوگا۔ ورنہ میں کم از کم دوسری طرف توجہ نہیں دے سکوں گا۔“

”کیا دشمن کے جاں میں جان بوجھ کر بھینٹ دانی نہ دی ہو؟“
”دانش مند انسان ہماری طرح جیسوں میں ریلواریے نہیں پھرتے ہارون۔ ہم دانش مند نہیں ہیں۔ میری بات غور سے سنو! میں اس کے ساتھ جاؤں گا اور تم مجھے کور کرو گے۔“

”گستاخی معاف چیف! ہارون نگاہیں جھک کر نام بچے میں بولا۔ آپ نے مجھے بہت سچا حالیا ہے، اس لیے میں ہر معاملے میں محنت کرنے لگا ہوں۔ میرا مشورہ ہے چیف وہاں بحیثیت شہباز مجھے جانا چاہیے۔ وہ کون ہے اور کیا چاہتا ہے شہباز پر کھل جائے گا پھر ہم سنبھال کر کوئی لاکھ عمل اختیار کر سکیں گے۔ ہم اپنے واضح ٹرانسمیٹر آن رکھیں گے اگر مجھے آپ کی ضرورت ہوئی تو میں تین بار کھانسیوں کا۔ بصورت دیگر آپ صرف ہماری گفتگو سنیں گے۔“

”مشورہ تو معقول ہے۔“ میں نے مسکرا کر کہا۔ میں اکھڑا اور قدرے احمق ہوں مگر ضدی نہیں ہوں، جو بات معقول ہوگی میں ضد نہیں کروں گا۔“

ابھی ہم باتیں ہی کر رہے تھے کہ اگر خان نے اس کام پر ڈرائیور کے بارے میں اطلاع دی۔ ہارون اجازت لے کر باہر نکل گیا۔ میں نے پردہ سر کا کر دیکھا۔ آنے والے تین تھے۔ تینوں کے پیچھے ایک جیسے تھے۔ ان کے چہروں پر ہی ان کا پیشہ تحریر تھا۔ ان کے چہروں پر مندرجہ شدہ زخموں کے نشانات چلا چلا کر اعلان کر رہے تھے کہ وہ پیشہ ور غنڈے ہیں۔ ہارون نے باری باری تینوں سے جھجک جھجک کر ہاتھ ملایا۔ وہ ایک عام نوجوان کی بہترین اداکاری کر رہا تھا۔ ایک شخص نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھا اور دو دائیں بائیں چل پڑے پھر جو بھی ان کی کار گیٹ سے نکلی میں نے بھی اپنی دن کی طرف دوڑ لگا دی۔

مال روڈ پر چونکہ ٹریفک کاٹس تھا اس لیے میں نے فاصلہ کم کر لیا تھا۔ مری اسپتال سے آگے نکل کر بائیں ٹرن کر گئی۔ وہ ذیلی سڑک تھی لیکن وہ غیر معروف نہ تھی۔ زیادہ تر فوجی گاڑیاں چل رہی تھیں۔ کار اسپتال کے ساتھ ساتھ دوڑ رہی تھی۔ دائیں جانب رہائشی علاقہ تھا۔ سڑک پر جگہ جگہ ڈاکٹروں کی رہائش گاہوں کے سامنے بورڈ لگے ہوئے تھے۔ جب وہ مٹری میڈیکل کالج کا رخ کر کے ہوئے پھر میں روڈ پر چڑھے تو مجھے یقین ہونے لگا کہ وہ لوگ محض تعاقب کے امکان کا جائزہ لینے کے لیے طویل راستہ اختیار کر رہے ہیں۔ آہ اسے بازار تک میں نے مناسب فاصلہ رکھا تھا۔ بازاری آخری گلی کے سامنے کار روک کر چاروں اتر پڑے۔ دو باہر نکل کر ایک ہوٹل کی جانب چلے گئے اور ایک ہارون کے ساتھ گلی میں داخل ہو گیا۔ میں نے دائیں جانب والی ذیلی سڑک پر دوڑ ڈال لی اور اترائی اتر کر روک دی اور ایک گلی میں ٹھس گیا۔ اندازہ تھا کہ مجھے کی گلیوں کا آپس میں چونی دامن والا رشتہ ہوتا ہے۔ وہ گلی بھی

شاید اس گلی سے جا ملے گی میں تین گلیاں کر اس کرتا ہوا جب چوتھی گلی میں داخل ہوا تو وہ دونوں دس پندرہ قدم آگے جا رہے تھے۔ میں بھی بٹپنے کے انداز میں پیچھے چل پڑا۔

معاذ اس شخص نے پلٹ کر دیکھا اور میں نے قریب ترین دروازے پر دستک دینے کے لیے ہاتھ بڑھا دیا اس نے پھر پلٹ کر دیکھا تو میں اندر سے آنے والی خاتون خانہ سے باتیں کر رہا تھا میں نے ٹھیک کے دروازے پر غلام حیدر کا نام پڑھ لیا تھا لہذا غلام حیدر سے دیرینہ تعلقات جوڑنے میں کوئی دقت نہ ہوئی تھی۔ بس دعا یہ مانگ رہا تھا کہ میرا دیرینہ دوست اندر موجود نہ ہو۔

”وہ تو ڈیوٹی پر ہیں بھائی جان، خاتون نے بتایا وہ ساڑھے آٹھ تک واپس آتے ہیں۔“

”میں لاہور سے آیا ہوں آپ ان کی...!“

”جی ہاں، حیدر صاحب میرے میاں ہیں، خاتون سے شرمناک رنگاں جھکائیں، اگر آپ ساڑھے آٹھ تک انتظار کر سکیں تو میں ٹھیک کھول دیتی ہوں۔“

”انتظار تو کرنا ہی پڑے گا۔ بھائی ویسے بھی میں کل واپس جا رہا ہوں، میں نے ادب سے کہا اور وہ ایک دم اندر غائب ہو گئی اور پھر جھٹک کا دروازہ کھلنے کی آواز سنانی دی میں نے اپنے شکار کی جانب دیکھا۔ وہ قریب ہی کے ایک مکان کی کال پیل بج رہا تھا اور ہارون نے سر ہر ہاتھ پھیرتے ہوئے مجھے شباشی دے ڈالی تھی۔

ٹھیک میں دو پتنگ اور چار کرسیاں تھیں وہ متوسط گھرانہ بھی نہ تھا کونے میں ایک پرانا ریڈیو رکھا ہوا تھا جس پر پھول دار کپڑے کا غلاف چڑھا ہوا تھا۔ خاتون دروازہ کھول کر پھر صحن میں پئی گئی تھی۔ تھوڑی دیر بعد ایک چار سالہ بچی جگ میں پانی لے آئی تھی میرے لیے اس بچی سے خاندان کی تاریخ جاننا زیادہ مشکل ثابت نہ ہوا پھر اس کے باہر جاتے ہی میں واج ٹرانسپیر پر باتیں سننے لگا۔ گفتگو اردو میں ہو رہی تھی اور ہارون پشادہ کی، ”اردو اور پنجابی میں باتیں کر رہا تھا۔“

”آپ یہاں کیوں نہیں چلے آئے نہ ہارون خان، رنگ باز خان کا ہونٹ مقول آمدنی دے رہا ہے۔“

”اپنا بزنس چھوڑ کر کیسے ادھر آئے گا بھائی؟“

”پھر خان کی بیٹیوں کو لے جائیں ادھر۔“

”وہ نہیں جاتا، بہت زور مارا ہے۔ بڑا مٹدی لڑکی ہے وہ بڑی والی۔“

”اس لیے خان کو کوئی بھرائی ہوئی آواز میں بولا، مجھے صاف

گوئی کے لیے معاف کرنا خرم سلطان کا جادو اس پر کام کر گیا ہے وہ شیطان ایسا ہی ہے۔ اپنی خوبصورتی سے لڑکیوں کو پاگل بنا دیتا ہے اور پچھے دار باتوں سے مردوں کی مت مار دیتا ہے۔“

”آخر وہ ہے کیا بلا؟“

”کہہ رہا ہوں تا شیطان ہے، پیرے درجے کا فریب، بلیک میل اور اسمگلر ہے۔“

”اچھا اب آپ بتائیں آپ کے ساتھ اس نے کیا فریڈ کیا ہے؟“

”ایک نہیں خان، ہمارا تو پورا خاندان اس نے تباہ کر دیا ہے۔ میرے چچا کو قتل کر کے ان کی بیٹی کو لے آیا ہے۔“

”ادھ! قاتل بھی ہے، ادھر میرے خدایا پھر... پھر آپ لوگ پٹ کیوں نہیں کرتا؟“

”ہم پٹ نہیں کیا کرتے خان۔ ہم تو آنکھ کے بدلے آنکھ لیا کرتے ہیں۔“

”ہاں، ہاں ہم بھی اپنے دشمن کو معاف نہیں کرتے، ہارون بولا، اب مطلب کی بات کر دو، اور وہ آج رات ادھر ہو گا۔ بولو مجھے کیا کرنا ہو گا؟“

”آپ اس سے دوستی کریں گے خان۔“

”نہیں... ہم دشمن کو...!“

”میری بات سنو شہباز خان، وہ درندہ ہے۔ اسانی دینا جو صرف انسانی خون پر زندہ ہے ہم اسے مل کر بھی نہیں مار سکتے اگر اسے مارا جا سکتا ہے تو صرف دوستی کے ہتھیار سے یہ کام آپ بہتر طور پر کر سکتے ہیں۔ رات چلنے یا دوڑھ میں بے ہوشی کی دوا ملا دیں جب بے ہوش ہو جائے تو مجھے فون پر اطلاع کر دیں، بس آپ کا کام اور دشمن ختم۔“

”میں دوائی کہاں سے حاصل کر دوں گا؟“

”دوائی ہمارے پاس ہے خان، نور کے خان صاحب کو پیشی دے دو۔“

دس منٹ بعد ہی گلی میں ایڈریوں کی آواز ابھرنے لگی شاید ہارون مجھے سننے کے لیے ایڈریاں فرش پر بجاتا رہا تھا پھر وہ دونوں گور گئے۔ دو منٹ بعد میں بھی خاتون خانہ کو اطلاع کیے بغیر باہر آ گیا چونکہ تعاقب کی ضرورت نہ رہی تھی اس لیے میں وین لے کر بن روڈ پر چڑھا اور ہارون سے بہت پہلے واپس ہونے پہنچ گیا۔

میں اگر درندگی پر ہی اترتا تو بھٹک سے نکل کر ان کو ادھر دیتا۔ یہ رات جو ڈراما وہ کھیلتا چاہتے تھے، اسی طرح ہونے دیتا

اور جب وہ داخل ہوتے تو بھون ڈالتا مگر میں مزید ہنگامے کے حق میں نہ تھا میں نے اندازہ کر لیا تھا کہ ان کا تعلق شاہ زمان گروپ سے ہے اور وہ مجھے زندہ پکڑ کر شاہ زمان کی بیٹی کے بدلے میں معلوم کرنا چاہتے تھے جسے ملک نواز نے اسی طرح خاموشی سے کسی گناہم قبرستان میں پہنچا دیا تھا، جس طرح اس کے باپ کی لاش کو غائب کر دیا گیا تھا لہذا میں نے ڈی آئی جی صاحب کے گھر کا نمبر ڈائل کیا۔ میں یہ ذمہ داری ان کے کندھوں پر ڈال کر خود منظر جو بدری کی جانب توجہ مرکوز کرنا چاہتا تھا۔

”اسلام علیکم سر! میں خرم سلطان بول رہا ہوں۔“

”ادھ... کہاں ہو خرم سلطان مجھے بتایا گیا تھا کہ تم...!“

”جی ہاں سر! میں ایک ناگ کی پیٹاری میں اس کے ساتھ دوڑ تک گیا تھا۔“

”تم بڑے خطرناک تجربے کرنے لگے ہو چو بدری۔“

”خطرہ کہاں نہیں سہا، ہر موڑ پر بلکہ میرے لیے ہر قدم پر خطرہ بھن اٹھائے گھر ا رہا ہے۔“

”تمہارے لیے ایک اور خطرناک خبر ہے اگر وہاں آپ کے ہوتو مجھ سے مل لو۔“

”میں آن ڈیوٹی ہوں سر وہیں نے پاٹ آواز میں جواب دیا، ”اگر اس خطرناک خبر کا تعلق آفیشل ہے تو مجھے ابھی بتا دیجیے میں نے اس وقت بھی آپ کو جو زحمت دی ہے۔ اس کا تعلق ہی میرے فرائض میں شامل ہے۔“

”میں چو بدری منظر کے بارے میں...!“

”نہیں سر! میری آواز میں پھینکا در آئی قبی لا وہ میرا ذاتی معاملہ ہے۔“

”ذاتی کیسی باتیں کرتے ہو پڑے کیا تمہاری ذات تمہارے فرائض سے الگ ہے؟“

”جی ہاں سر بالکل الگ۔ میں بتا رہا ہوں کہ گھر پر چو بدری خرم سلطان کا دشمن ہے، اس ملک کا دشمن نہیں ہے براہ کرم اس ذکر کو نہ چھیڑیے، ورنہ میں بھگ جاؤں گا اور آپ کو مجھ سے شکایت ہو جائے گی میں یہ اطلاع دے رہا ہوں کہ شاہ زمان گروپ کے کچھ آدمی آرنلے بازار کے محلہ میں مقیم ہیں اور انھیں خرم سلطان کی تلاش ہے۔ پھر میں نے اسے ہارون کی ملاقات کے بارے میں بتایا۔“

”اول مکان نمبر؟“

”آپ چھاپے کے بارے کوئی فیصلہ کریں سر! ہارون آنے

والا ہے مکان نمبر اسے معلوم ہے۔“

”ٹھیک ہے لیکن میں دوسرے محلے پر تم سے بات کرنا چاہتا ہوں۔ تمہیں کچھ بتانا چاہوں گا کہ منظر جو بدری کو فرار میں مدد دینے والوں کا کیا حشر ہوا ہے۔“

”مجھے ان لوگوں سے کوئی شکایت نہیں سر! میں نے دیکھی آوازیں کہا، ”آگ، پانی، رحمان، شیطان اور ناگ سب اپنی فطرت سے کام لیتے ہیں۔ ہماری پولیس کی بھی اپنی ایک فطرت ہے، قاتلوں کا حشر بھی شہر ہوتا رہتا ہے لیکن پھر بھی قتل چھاتے ہیں حشر کوئی اہمیت نہیں لکھتا جناب والا جس آدے پر برتن خراب ہو وہاں سے چند برتنوں کو نکال باہر کرنے سے دوسرے برتنوں پر کوئی اثر نہیں پڑتا کیونکہ قصور برتنوں کا نہیں ہوتا بلکہ آدے کا ہوتا ہے جو ان کو پکاتا ہے۔“

”میں بھی اسی آدے کا ایک برتن ہوں چو بدری۔“

”اسی لیے میں آپ کو بھی بری لکھتا ہوں سر۔“

”بری لکھم۔“ وہ ہنس پڑے۔ ”بڑے ظالم ہو خرم سلطان! بھوتے بھی مارتے ہو اور دلاسے بھی دیتے ہو۔ سٹو میرے بچے زندہ نہ کرو چلے آؤ میں تمہارا قیمتی وقت اور جان بچانا چاہتا ہوں منظر کے لیے جو کچھ میں کر چکا ہوں، جو کرنا چاہتا ہوں، صرف وہ سن لو اگر تمہارا اطمینان نہ حاصل کر سکا تو وعدہ رہا تمہیں ذاتی کارروائی کے لیے روکوں گا نہیں۔“

”بہتر جناب! میں رات کسی وقت حاضر ہو جاؤں گا۔“

”کھلنے پر کیوں نہیں؟“

”میرے ساتھ ہارون بھی ہو گا جناب اور ہم رخیہ کو دیکھنے بھی جائیں گے۔ وہ آج ایک اور میجر آپریشن سے گزاری گئی ہے۔“

”اللہ اس بچی پر رحم فرمائے۔ وقت بتاؤ تو میں بھی اسے دیکھ لوں گا۔“

”بہتر سر! جاننے سے قبل میں آپ کو رنگ کر دوں گا۔“

ہارون کوئی پلن کھنٹے بعد ہونٹ میں داخل ہوا اور سیدھا آفس میں چلا آیا تھا۔ میں ادا کر جانے کے ساتھ ہونٹ کی بہتری کے بارے میں باتیں کر رہے تھے۔ اگر خان کی خواہش تھی کہ رہائشی سہولتوں کو پھر سے شروع کیا جائے کیونکہ ڈاننگ ہال بشکل اخراجات پونے کر رہا تھا جب کہ ہمیں خان مرحوم کے گھر کو بھی چلنا تھا۔ لڑکیوں کے تعلیمی اخراجات کا معقول انتظام کرنا تھا۔ میری اپنی مصروفیات اور فتنے دایاں تھیں۔ میں اگر اپنی ماں اور بھائی کے لیے آبائی حویلی میں نہیں رہ سکتا تو رنگ باز خان کے گھر کیسے رہ سکتا تھا اس لیے

میری خواہش تھی کہ مقتول اور پائیدار انتظام کر کے وہاں سے ہٹا دوں۔
 ”رپورٹ دوں چیف، ہارون نے چائے کا سپ لے کر پوچھا۔
 ”گفتگو تو میں سن چکا ہوں، تم یہ بتاؤ، وہاں کل کتنے آدمی ہیں؟“
 ”تین وہ جنہیں آپ دیکھ چکے ہیں اور چوتھا وہ جو مجھ سے میل رہا تھا۔“
 ”کیا مستقل رہائش رکھتے ہیں؟“
 ”ہاں لگتا تو ایسا ہی ہے آباد گھر ہے۔“ ہارون نے بتایا۔
 ”ہو سکتا ہے ان کے کسی دوست کا ہو؟“
 ”تم نے مکان کا نمبر دیکھا تھا؟“
 ”جی ہاں، کیوں؟“
 ”اگر خان تم جیٹ پر مکان نمبر وغیرہ لکھ لو اور بڑے صاحب کو بتا دینا تو میں نے اچھے ہوئے کہا۔ ہم ہیڈ کوارٹر سے ہوتے جوئے اسپتال جائیں گے، صاحب کو اسپتال کا ٹائم سات بجے کا دے دینا۔“
 ”تو اس بار پالیسی بدل لی ہے آپ نے ہارون نے وین کی ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ میرا خیال تھا اتنی سی مناسب وقت ہم خود ان سے ملاقات کریں گے۔“
 ”نہیں پیارے میں ان چھوٹے چھوٹے لوگوں پر وقت اور ازجی مبالغہ کرنا نہیں چاہتا پولیس انہیں کوٹ پیٹ کر چھوڑ دے گی اور وہ بھاگ جائیں گے یہاں سے۔“
 ہارون نے صرف سر کو اتنی جتنی دی اور وین کا این اسٹار کرنے لگا۔ ہیڈ کوارٹر میں صرف بیگ تھا اس کے سینہ بال کسی پولیس اور تم زندہ بیوہ کی طرح بچھے ہوئے تھے۔ انہیں متوہم اور چہرہ لگا ہوا میرے دل پر جیسے گھونسا لگا۔ وہ شیر جیسا مرد دونوں میں پھٹل گیا تھا۔ سلوا کی موت نے اس کی کمر ایسے ہی توڑ دی تھی جیسے کسی بوڑھے کا اکلوتا نوجوان بیٹا مر گیا ہو بے شک وہ مہربان شخص ہیں اپنی اولاد کی طرح چاہتا تھا لیکن ہم اس کے کیا تھے کون تھے؟
 ”انگل! میں نے مشکل اپنی لرزیدہ آواز کو ہیٹ کر کہا۔
 ”آپ تو ہمارے لیے مضبوط، قد آور اور سایہ دار درخت ہیں اگر آپ بچھڑ گئے تو ہمارا کیا ہوگا؟“
 ”تم لوگ میرا دکھ نہیں سمجھ سکتے خرم سلطان۔ وہ بھری بھری آواز میں بولا۔ مجھے کسی فرد کی موت کا کوئی دکھ نہیں ہے لیکن وہ صرف فرد نہیں تھا میرے بچے، وہ ایک خاندان تھا، پڑسکون، خوش حال اور خوبصورت

خاندان، تمہیں نہیں معلوم وہ اپنی ذات میں ایک مضبوط قلعہ تھا ایک ستون تھا۔ ہم ادھر آتے ہوئے پہلے سلوا کے گھر آتے تھے۔ میں اس خاندان سے ملا تھا ایک بوڑھی مہربان ماں اور پانچ بڑیاں، پانچ بہنوں کا قلعہ اور ستون صرف سلوا تھا۔ وہ اپنی بہنوں کو اعلیٰ تعلیم دلوانا چاہتا تھا دو میڈیکل میں تھیں اور تین اسکول لیول پر تھیں۔ میں ان بچیوں کی تحفیں سن رہا ہوں اور اس ماں کی سرد آہیں میرے دل پر تھوڑی طرح برس رہی ہیں۔ وہ کیا سوچ رہی ہوں گی اب کیا کریں گی، کیسے تعلیم جاری رکھیں گی؟“
 ”انگل! میں نے آنکھ کی نوک پر اٹکے قطرے کو انگلی کی پور سے گرتے ہوئے کہا۔ ”جن بہنوں کے پانچ بھائی اور ایک باپ ہو جس ماں کے پانچ بیٹے زندہ ہوں اور آپ جیسا درد مند بھائی ہو، وہ لوگ پریشان نہیں ہو سکتے۔ سلوا بے شک فخر پر تھا وہ ایک خاندان کا بازو تھا لیکن ابی بہت کچھ باقی ہے۔ انگل، ہم ان بہنوں اور اس ماں کو بے شک سلوا نہیں دے سکتے مگر تاہم ایک مستقبل اور حال کو سہارا ضرور دے سکتے ہیں۔ ہمارے فرائض قبول رقم ہے اور اگر ضرورت پڑی تو میں سرکاری سطح پر بھی سلوا کی خدمات کا معاوضہ دلاؤں گا۔ آپ جتنی رقم چاہیں لے کر خود سلوا کے گھر چلے جائیں۔“
 ”شکریہ... بہت بہت شکریہ میرے عظیم بچے۔ بیگن نے تڑپ کر مجھے سینے سے لگالیا۔ پس اب میں خوش ہوں۔ تم نے مجھے نئی زندگی دے دی ہے، میں جاؤں گا مجھے خدا ہوگا خرم سلطان۔“
 ”مزدور انگل! آپ کل ہی جانے کا انتظام کریں۔ میں نے دیکھا ہارون کمر کی پشت گاہ پر چہرہ رکھے خاموش بیٹھا تھا۔ اس کا چہرہ آنسوؤں سے بھیگا ہوا تھا کہتے ہیں مردوں کی آنکھوں میں آنسو اچھے نہیں لگتے لیکن یہ آنسو نہیں تھے یہ توقیت و احترام کے سمندر سے لیے گئے وہ قطرے تھے جو ہم اپنے اس ساتھی کو خراج عقیدت کے طور پر پیش کر رہے تھے جو ہمارا تو نہ تھا لیکن اپنوں سے زیادہ عزیز اور اہم تھا۔
 بیگن نے دروازہ کھول کر ایک خط نکالا اور میرے حوالے کر دیا۔ خط پاکر... میرا حوصلہ پھر جواب دے گیا تھا۔ میں زینت کی تحریر سے بے حد خوف محسوس کرنے لگا تھا اس کے کسی سوال کا جواب میرے پاس نہ تھا اس کے کسی دکھ کا علاج بھی اپنی مشرقی معاشرے نے دریافت نہ کیا تھا۔ ہاں اگر ہم مغرب کے پاسی ہوتے تو وہ کوئی سوال کرتی نہیں اس کے دکھ کا علاج تلاش کرنا، بس ایک لفظ سے وہ اپنے دکھ کا علاج خود کر لیتی۔ ”سودی“ اسے اتنا ہی کہنا تھا اور کرم

بھائی تو پہلے ماں یہ تعاون تھے۔ بہر کیف خط کھونہ ہی پڑا تھا۔
 خرم سلطان!
 آداب نکھوں یا سلام یا دعائیں! سارے رشتے ہی گم کر بیٹھے ہو۔ کس کس رشتے کی کرجیاں دل کے صحن سے چنوں، بے خبر شخص گریزاں مجھ سے ہو اور دکھ سارے خاندان کو دے رہے ہو۔ لاش سے کیسی نفرت، کیسا گریز واپس چلے آؤ خرم سلطان! میرے لیے نہیں ہیں تو وقت کی گردیں دفن ہوں لیکن جو لوگ ابی زندہ ہیں انہیں وقت سے قبل اذیت ناک موت سے بچانے اور کرم نے بھوک بھرنا شروع کر دی ہے۔ ان سے میں نے بات کی ہے۔ میں نے قرآن پاک ہاتھ میں اٹھا کر انہیں یقین دلانے کی کوشش کی ہے کہ میں صرف اس کی ہوں اور اس کی رہوں گی جو میرا مجاز کی خدا ہے لیکن انہیں یقین نہیں آتا۔ وہ اب بھی مجھے خرم سلطان کی امانت سمجھ رہے ہیں۔ آخر خرم! ان سے فیصلہ کرو، ورنہ وہ مر جائیں گے اور ان کی موت ہم دونوں کی گردن پر غم بھر سوار رہے گی۔
 اگر تم نے کوئی فیصلہ نہ کیا اور کرم کو بے یقینی سے نہ نکالا تو پھر ایک فیصلہ میں کروں گی ہاں میرا فیصلہ ناگزیر ہو جائے گا میں تم دونوں کے درمیان سے ہٹ جاؤں گی جب میں نہ رہوں گی تو کیسی امانت اور کیسا جذبہ! تم دونوں بھائی اور حویلی کے وارث نئی زندگی کی بشارتوں کے ساتھ زندہ رہو گے۔ اب تو اماں بی بی بھی مجھے مجرم سمجھنے لگی ہیں۔ کل رات انہوں نے مجھے اپنے کمرے میں بلایا۔ وہاں کرم بیٹھے ہوئے تھے اور اماں بی بی رو رہی تھیں مجھے دیکھ کر کرم خاموشی سے باہر نکل گئے اماں بی نے بہی بار نفرت انجیز نگاہ اور بچے میں مجھ سے بات کی۔
 ”تم اب مجھے کس جرم کی سزا دے رہی ہو۔ زینت! میں نے تمہیں صرف دو دھری نہیں پلایا، ورنہ تم کا وہ کون سا جذبہ ہے جو میں نے تم پر بھجا ورنہ نہیں کیا۔ تم خود سوچو کیوں اس حویلی کے نشان کو ٹھوکر بن مار رہی ہو اگر یہ چراغ نہ ہے

تو تم اندھیروں میں کہاں رہو گی۔ اس چراغ کو بھٹال لو۔ اسے بجھنے سے بچاؤ زینت! وہ شخص جس کی خاطر تم نفرت کی بوٹ بنی کرم کو زہر دے رہی ہو اب وہ تمہارا نہیں بن سکتا، اسے بھول جاؤ اگر کرم کو کچھ ہو گیا تو میں خرم سلطان کو عاق کر دوں گی۔ وہ نالائق شروع ہی سے باغی رہا ہے۔
 یہ تھے وہ الفاظ خرم انہیں سن کر میں جیسے جی مری ہوں، منو خرم! مجھے... مجھے تم سے نفرت ہے تم قابل نفرت ہو جس نے مجھے دیا تو کچھ نہیں لیکن لے سب کچھ لیا ہے۔ آؤ اور ان سب کو بتا دو کہ زینت سب کے لیے مہنگی ہے۔ فقط!۔
 بد نصیب زینت!
 میں نے خط مٹھی میں دیا لیا اور بیگن نے لحظہ بھر میری آنکھوں میں خط کی تحریر پڑھنے کی کوشش کی۔
 ”خیریت تو ہے نا ادھر؟“ چند لمحے بعد وہ میری آنکھوں میں جھلکتے ہوئے بولا۔
 ”ہاں انگل! ان لوگوں نے مجھے ایک خاندانی فیصلے کے لیے طلب کیا ہے۔“
 ”جاؤ ابھی چلے جاؤ بیگن نے مشورہ دیا۔ پھر کسی معاملے میں الجھنے کے تو وقت نہیں ملے گا۔“
 ”کل شام جاؤں گا انگل! میں اٹھ کھڑا ہوا آپ کل پہلے بینک جائیں پھر سفارت خانے سے کاغذات نکل کر واپس۔ آؤ ہارون ہم رشیدہ کو دیکھ آئیں۔“
 ”مجھے رشیدہ کے عزیزوں کی فہرست سے کیوں خارج کر رہے ہو؟“ بیگن نے پوچھا۔
 ”آپ کی طبیعت ٹھیک نہیں انگل! آپ آرام فرمائیں۔“
 ”نہیں! میں چلوں گا، وہ اچھل کر اٹھا اور قد آدم آئینے کے سامنے چلا گیا پھر چند منٹ بعد چاق و چوبند بیگن ہمارے ساتھ چل رہا تھا۔
 جو بھی ہم استقبالیہ روم میں داخل ہوئے ڈیڑھ ڈیڑھ منڈ اندر سے نکل رہی تھی۔ میں دیکھ کر وہ ٹھٹھکی سی گئی۔ کاؤنٹر پر ایک نرس رجسٹر پر جھکی ہوئی تھی۔ ہارون نے انگلی سے کاؤنٹر بجایا تو ڈیوٹی نرس کی بجائے رشیدہ کی نرس بول پڑی۔
 ”آپ ڈاکٹر سجادید سے ملیں جناب! آپ کی مریضہ کی

حالت اچانک بگڑ گئی ہے۔
 ”کیا؟“ ہارون کے حلق سے عجیب و بڑا بھری میں نے
 اس کی پشت پر ہاتھ لگا تو وہ سگڑ سا گیا۔
 ”سسر! میں نے نرم انداز میں پوچھا اب کسی حالت ہے
 اس کی...؟“

”اندر ابز روشن تھی تھوڑی دیر قبل روم میں لائی گئی ہے۔
 نرس بتانے لگی، شاید اس کے دماغ کی کوئی نرس متاثر ہو گئی ہے۔
 ”کیا بے ہوش ہے؟“ ”یگن نے پوچھا۔
 ”نہیں“ نرس نے نفی میں سر ہلایا، ہوش اور بے ہوشی کی
 کوئی درمیانی کیفیت ہے، وہ سنی ہے اور بھتی ہے لیکن دایاں
 حصہ مغلوب ہو گیا ہے۔“

ڈاکٹر سجاد حیدر رفیع کوٹ پہنچا ہوا تھا، وہیں کارڈ وید میں ہی
 مل گیا۔ اس کے ساتھ دو میل نرس بھی تھے۔ وہ مینوں بہت۔
 جلدی میں تھے، میں نے ہاتھ اٹھا کر ڈاکٹر کو روک لیا۔

”سوری سسر!“ ڈاکٹر نے دستانے جیب سے نکال کر میل نرس
 کی جانب بڑھائے، وہیں ایک آپریشن کیس کو دیکھنے جا رہا تھا، اس
 کے ٹانگے کھل گئے ہیں، آپ سریفینہ کو دیکھ لیں لیکن زیادہ باتیں نہ
 کریں، میں پندرہ منٹ بعد آکر آپ کو بتاؤں گا۔“

چونکہ انھیں ادھر ہی جانا تھا، اس لیے میں بھی ان کے ساتھ
 تقریباً دوڑنے لگا، روم نمبر تھری میں جھانک کر ڈیوٹی نرس سے
 ڈاکٹر نے کہا: ”انھیں سریفینہ سے ملنے دیں، وہیں آپ رہا ہوں۔“

میں نے خود کو سنبھال کر عہد کیا تھا کہ حالات جیسے بھی ہوتے
 ہیں ہارون اور یگن کے سامنے حوصلہ برقرار رکھوں گا لیکن جونہی میری
 نگاہ رشیدہ پر پڑی تو وہ میری زندگی کا مشکل ترین لمحہ تھا۔ وہ
 مجھے یوں دکھائی دی تھی جیسے وہ مر چکی ہے اور نرس لا علم ہے۔

میرے منہ کا ذائقہ ایک دم گڑوا ہو گیا تھا اور جسم بے توازن سا
 محسوس ہونے لگا۔ رشیدہ بے حس و حرکت تھی۔ اس کی آنکھوں پر
 پوچھل پلوں کے غلاف گرے ہوئے تھے، اس کے بازو میں
 دو نیکیاں لگی ہوئی تھیں، ایک گلو کوڑکی اور دوسری شاید کوئی دوا
 تھی یا خون کی بوتل تھی۔

”رشیدہ! جان برادر! میں نے جھک کر اسے پکارا اور اس
 کا بے جان اور سرد ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ اس کی بند آنکھوں
 میں ہلکی سی تھمر تھراہٹ پیدا ہوئی، رشیدہ! کیا تم میری
 آواز سن رہی ہو؟“

اس نے تھمر تھرائی آنکھیں کھول دیں۔ اس کے ہونٹ

پھٹ کے اور پہلی بار اس کی زبان سے کوئی ہمہ می آواز ابھری
 اور پھر ڈوب گئی۔ اس نے زبان سے خشک ہونٹ کر کے اور بولنے
 کی کوشش کرنے لگی۔

”لو... لو... بولو جان برادر! دیکھو ہارون اور تمہارے ڈیڈی
 آئے ہیں، رشیدہ کی کھل آنکھوں کا زاویہ دایاں بائیں گھوما اور
 پھر اس کے چہرے پر کرب، ناہنسی پھیل گئی۔

”مم... میں... ٹھیک ہوں، اس نے اٹک اٹک کر بات
 مکمل کی، ”خیر! میرے قریب بیٹھ جاؤ، میں نے ایک دم
 گھٹے ٹیک دیے اور اس پر جھک گیا، میں سمجھ نہیں سکی کیا ہوا۔
 کیوں ہوا، اٹک آدھی ہو گئی ہوں، اس نے بائیں ہاتھ سے چہرے
 کو تھام لیا، کیا میرا چہرہ ٹھیک ہے خیر؟“

”نہیں جان بالکل نا اہل ہے، میں نے جھوٹ بولا تو تم ٹھیک
 ہو جاؤ گی اگر یہاں ڈاکٹر کچھ دکر کے تو ہم دوسرے ڈاکٹر بلا لیں گے۔
 تم فکر نہ کرو جان۔ سائیں نے ملووسی کا جو دم کر دیا ہے، اب
 تو نے ہاتھ پاؤں بھی لگا دیے جاتے ہیں۔“

”میں فکر مند نہیں ہوں، وہ ایک ایک لفظ کو باندھ کر
 بول رہی تھی، میں میں مغلوب ہونے سے گھبراتی ہوں میں تھمر
 نہیں بننا چاہتی اگر ایسا ہو گیا تو مجھے سکس سکس کر موت کا
 انتظار کرنا پڑے گا۔“

اس کی بائیں میرے اندر چھوٹے چھوٹے بول کی طرح چھٹ
 رہی تھیں لیکن میں نے خود کو پر سکون رکھا ہوا تھا اگر میں بگڑ جاتا
 تو رشیدہ کے لیے خطرناک تھا پھر وہ نوجوان جس کی جاہل
 ہلک رہی تھی، وہ کیسے پاؤں پر کھڑا تھا، یگن جس نے شفقت
 پردی کے جذبول کو نہ جانے کتنی مدت بعد جگایا تھا، اس کی حالت
 کیا ہو جاتی۔

”آپ زیادہ باتیں نہ کریں، یگن نے رشیدہ کا بے جان ہوا
 میری گرفت سے چھڑاتے ہوئے معذرتی پیچھے میں کہا: ”اگر باتیں کرنا ہی
 چاہتے ہیں تو اچھے دلوں کی باتیں کریں۔“

اس اثناء میں ڈاکٹر سجاد اندر آ گیا، اس نے جھک کر رشیدہ کی
 پیشانی پر ہاتھ رکھا پھر اس کی بائیں آنکھ کی پلک الٹ کر دیکھنے لگا، میرے
 ساتھ آئے، اس نے میری جانب دیکھ کر کہا: ”مالوسی کی کوئی علامت
 نہیں ہے۔“

ڈاکٹر سجاد وہیں آفس میں بٹھا کر خود باہر نکل گیا۔ ہم ایک دوسرے
 سے نظریں چراتے چپ چاپ بیٹھ رہے تھے۔ ڈاکٹر واپس آیا اس
 کے چہرے پر گہری سنجیدگی ہو رہی تھی۔ اس نے اکیسے لگایا اور اسکرین

کی لائٹ روشن کر دی۔
 ”یہ شریان اچانک ہلاک ہو گئی ہے، اس نے پینسل سے اوپر
 سے نیچے تک ایک سیاہ دھاگے پر نشان لگاتے ہوئے بتایا۔ بالکل
 بے وجہ۔ کم از کم میرے تجربے میں ایسا کبھی نہیں آیا۔ اگر دماغ
 کو چوٹ لگی تھی تو یہ پہلے ظاہر ہوتی لیکن پہلے کے تمام اکیسے صاف
 ہیں۔ اس میں خون جم گیا ہے۔ اگر یہ انجماد عارضی ہے تو ہمیں توقع
 رکھنی چاہیے کہ فالج بھی عارضی ہوگا۔ ہم نے ٹیسٹ لیے ہیں۔ کل
 میڈیکل بورڈ ان پر ڈس کس کرے گا اور پھر ہی کوئی لاعمل اختیار
 کیا جائے گا۔“

میرے منہ سے گہری سانس نکل گئی جسے کسی بھی کہا جا
 سکتا ہے۔ ہارون کے چہرے کا رنگ بھی جلد ہی زرد ہو رہا تھا، البتہ
 یگن سگی بت کی طرح بے حس و حرکت بیٹھا دیوار کو گھور رہا تھا۔

”آپ کی اپنی ذاتی رائے کیا ہے ڈاکٹر؟“ ہارون نے پوچھا۔ تب
 ڈاکٹر کی روش آنکھیں دھواں دھواں سی ہو گئیں۔ وہ لحظہ بھر ہونٹ
 چہلنے کے بعد بولا۔

”سوری سسر ہارون! میں قبل از وقت اپنی رائے نہیں دے
 سکتا۔ میڈیکل میں رائے ٹیسٹ رپورٹ پر قائم ہوتی ہے۔ دیے
 میں ابھی مایوس نہیں ہوں۔ ہاں، اگر ہم انجماد نہ توڑ سکے تو معطر دوسرا
 ہو سکتا ہے۔“

”دوسرے سے مراد...؟“ اچانک یگن بول پڑا: ”دیکھیے ڈاکٹر!
 ہم کوئی غیر ذمے دار اور کم حوصلہ لوگ نہیں ہیں۔ ہم حقائق کی دنیا
 کے لوگ ہیں۔ جو کل آپ کو بتانا ہے اور ہمیں برداشت کرنا ہے وہ
 آج ہی کیوں نہ کریں۔“

”مجھے احساس ہے جناب! ڈاکٹر نے ہمارا دماغ بھی میں جواب
 دیا: ”لیکن میں کہہ چکا ہوں کہ ایسا نہیں ہونا چاہیے تھا۔ دماغ کو
 کوئی ضرب نہیں لگی پھر ایسا کیوں ہوا ہے۔ میں آفس کے ساتھ کہہ
 سکتا ہوں کہ اگر شریان میں خون جاری نہ ہوا تو یہ معذوری مستقل ہو سکتی
 ہے اور مکمل بھی۔“

ہم ویران ویران ابھڑی لگا ہوں سے ایک دوسرے کو دیکھنے لگے،
 جیسے ہم نے ہونے والے کے مسافر ہوں جنھیں بق ووق صحرا میں دھوپ
 کی آگ نے گھیر لیا تھا۔ میری سوجھوں کے پاؤں بھی جل رہے تھے۔ میں
 سوچ رہا تھا کہ رشیدہ اب کبھی میرے شانہ بشانہ نہیں چلے گی۔ وہ
 لکڑھٹتی ہوئی یگن سے میرے پاس نہیں آئے گی۔ وہ زندہ رہے
 گی مگر زندگی اس پر بوجھ بن جائے گی، کتنی بدترین زندگی ہوگی۔ وہ
 اپنی مرضی سے کھجا بھی نہ سکے گی۔

”ڈاکٹر! ہارون کی آواز مجھے واپس لے آئی تھی: ”ہم باری باری
 یہاں رہنا چاہتے ہیں۔ ورنہ ایسی حالت میں وہ گھر لے گی تو اس سے
 باتیں کرنے والا کوئی نہ ہوگا۔ ہم ہی اسے زندگی کی جانب لے جاسکتے ہیں۔“
 ”بے شک“ ڈاکٹر اس کی آنکھوں میں جھانک کر بولا۔ ”مجھے
 یقین ہے کہ دوائے دعا اور ہماری کوشش سے مریضہ کی قوت اڑائی
 زیادہ سودمند ہوگی۔ آپ جائیں اس کا دل بہلائیں۔“

جب ہم واپس گئے تو رشیدہ پر بے ہوشی طاری تھی۔ نرس
 نے بتایا کہ وہ رونے لگی تھی۔ اس لیے اسے نیند کا انجکشن دے کر
 سلا دیا گیا ہے۔ ہم چپ چاپ کھڑے رشیدہ کا زرد چہرہ دیکھتے
 رہے پھر یگن نے باری باری میری اور ہارون کی پشت پر ہاتھ پھیرا
 ہارون نے چہرہ گھما کر آنسو رمال میں جذب کر لیے اور میں صرف
 ہونٹ چپا کر رہ گیا۔ ہم اتنے ہی اداس اور غاموش تھے جیسے کسی
 عزیز ترین ہستی کو گورستان میں چھوڑ کر واپس زندہ دنیا میں جا رہے
 تھے۔ کار پارکنگ شیڈ تک ہم چپ چاپ گئے۔ ہارون نے گھوم کر
 دین کا دروازہ کھولا اور پھر معاً وہ پھرتی سے پلٹ پڑا تھا لیکن اس
 سے کہیں زیادہ تیزی میں نے دکھائی تھی اور وہ پل چھلانگ میں دین
 کی اوٹ میں جا کر اٹھا۔ میں نے صرف رائفل کی جھلک دیکھی تھی جس
 کے ہاتھ میں رائفل تھی وہ میرا دوست، ہرگز نہیں تھلا بیگن اور ہارون
 کے پاؤں وہیں جم گئے تھے۔

”خیرم چوہدری! کھڑکی آواز گونجی: ”تم چاروں طرف سے
 گھرے میں ہو، اپنے ساتھی... کی سلامتی اور اسپتال کے سکون کی
 خاطر ہاتھ اوپھٹا کر سامنے کھڑی نیلی کار میں بیٹھ جاؤ۔“

میں نے گردن موڑ کر دیکھا۔ نیلی کار کی اوٹ سے بھی ایک بیل
 جھانک رہا تھا۔ اسپتال کی بیبولینس کے پیچھے بھی ایک آدمی چھپا
 ہوا تھا۔ اس نے مناسب وقت جگا اور الفاظ استعمال کر کے اپنی ترقی
 تسلیم کر والی تھی۔ میں اگر کوئی بھی کارروائی کرتا تو میرے ساتھی ان
 کی زد میں تھے۔ میں پہلے کھٹنوں کے بل اٹھا پھر گردن پر ہاتھ رکھ کر
 اٹھ کھڑا ہوا۔

”شکریہ چوہدری! پھر مخاطب ایک دم سانسے آ گیا۔ وہ صورت
 اترنا تھا۔ اسے میں نے فوراً زماں کے ساتھ دیکھا تھا بلکہ میرا قرض بھی
 اس پر تھا جسے اٹھانے کی ناکام کوشش میں وہ زخمی بھی ہوا تھا۔ نام بھول
 گیا تھا اس کا لیکن شکل میرے ذہن میں محفوظ تھی: ”تم میں وقت شناسی
 کی بھی خوبی ہے۔ جلو کار میں بیٹھ جاؤ۔“

”سنو دوست! میں نے جبرانی آواز میں کہا: ”ہم اپنی ایک
 جاں بلب عزیزہ کے لیے کوئی ماہر ڈاکٹر تلاش کرنے جا رہے تھے۔ میں

ایک معصوم لڑکی کے نام پر تم سے صرف دو منٹ مانگتا ہوں؟
 "کیا تم واپس اندر جانا چاہتے ہو؟ اُس نے میری ایسی پشیمانی
 "نہیں، صرف اپنے ساتھی کو ایک مشورہ دوں گا۔" میں نے
 ٹھوکر بصرہ مشکل نکل کر جواب دیا۔

"ٹھیک ہے لیکن یاد رکھنا تمہاری کوئی چالاک برداشت نہ کی
 جانے گی۔ میں نہیں چاہتا کہ غیر متعلق لوگ ملوث ہو جائیں۔"
 میں جھوم کر باروں کے قریب چلا گیا۔ لیکن بھی چند قدم اٹھاتا ہوا
 آن ملا تھا۔ میں نے باروں کے شانے پر تپکی دی مطلب یہی تھا کہ اُسے
 پُرسکون رہنے کی تلقین کروں کیونکہ اُس کے حلق سے بھرکتی سانسیں برآمد
 ہو رہی تھیں۔

"گلستان کا لونی" میں نے بات شروع کی تو وہ میرے عقب میں
 آگیا۔ وہاں ڈاکٹر ملک کا کلینک تھا دیکھ چکے ہو، میں سفارش کروں گا رشید
 وہاں بھی جانے۔ کلینک بند بھی ہو تو تم وہاں انتظار کرنا۔
 "اس سے پہلے اگر کوئی ڈاکٹر مل جائے تو باروں ساری بات
 سمجھ گیا تھا۔

"نہیں اور کوئی ڈاکٹر سود مند نہ ہوگا" میں نے حتمی ہجے میں کہا۔
 "میں کوئی ریسک نہیں لینا چاہتا" پھر میں نے پلٹ کر دوسری بات
 باروں کے لیے پوچھی "مادام نورین زمان نے ہی مجھے طلب کیا ہے نا؟"
 "بکواس نہیں؟" اُس نے میرے گریبان پر ہاتھ ڈال دیا لیکن میں جو
 کچھ باروں اور لیگ کو بتانا چاہتا تھا وہ بتا گیا تھا۔ وہ مجھے گھسیٹا ہوا کار
 ٹک سے گیا۔ اس سے قبل کہ وہ باروں اور لیگ کو بھی پابند کرتا وہ دونوں
 بلٹ پروف وین میں بیٹھ گئے تھے۔

"روکو۔ ابھیں رکو" وہ چیخا مگر وین یوٹرن لیتی ہوئی تیر کی طرح
 سنسنائی گیسٹ سے نکل گئی! "بد بخت" اُس نے میری گردن پر رائفل
 کا بٹ مارا تاہم نے حرام زندگی گری دی، ابے لیکن انھیں مادام نورین
 تک نہیں جانے دیا جائے گا۔

میں نے باروں سے پوچھا تھا کہ وقت تھا کہ یہ وہی لوگ ہیں جن
 سے وہ ملاقات کرنے گیا تھا۔ وہ بھی آہد میں چاہتے اور اندھیرے کی
 وجہ سے میں اُن لوگوں کو نہ پہچان سکا تھا جو باروں کو لینے ہوئے میں آئے
 تھے۔ بہر حال اب تو مجھے دھڑی لیا گیا تھا مجھے پھلی سیٹ پر درمیان میں
 بٹھایا گیا تھا۔ اُن کا لیڈ رہائش جانب بٹھا ہوا تھا۔ رائفل پاؤں میں ڈال کر
 دونوں نے لیا لوز نکال لیے تھے۔

"کیا اس وین میں تم ہی تھے چوہدری؟"
 "ہاں، ہم اس وین میں اسپتال آئے تھے۔"
 "میں تعاقب کی بات کر رہا ہوں" اُس نے کڑخت آواز میں کہا۔

ہوئے تم نے ہماری کار کا تعاقب کیا تھا؟

"ہاں" میں شہباز خان پر نگاہ رکھے ہوئے تھا۔ میں نے جواب دیا۔
 "کیا رنگ بازی کوئی بیٹی بیچارہ ہے؟"
 "نہیں، بلکہ اُن کی بیٹیوں کی ٹیوٹر ہے۔" پھر میرا اطمینان اُس
 وقت ٹوٹ گیا جب کار کا رخ چمک لالہ روڈ کی طرف ہو گیا۔ میرا خیال
 تھا کہ وہ اپنے ٹھکانے پر جائیں گے اور کسی بھی وقت پولیس انھیں گھر لے
 گی مگر انھوں نے اُدھر کا رخ نہ کیا تھا۔

"میں نے نورین کے بارے میں پوچھا تھا" میں نے نرم اور مؤدب
 آواز سے پوچھا "شاید آپ کے علم میں نہ ہو کہ ہم نے مشترکہ منصوبے
 پر عمل کر کے ملک نواز کو گھٹے ٹیکے پر مجبور کر دیا ہے۔ میری ہی ایما پر ملازم
 نے جاگیر خان پر جال پھینکا تھا اور اُسے میں لاہور سے لے آتا تھا۔
 مقصد تھا اُسے سیرجی بنانا۔ ہم ملک نواز کے مرکزی گودام پر قبضہ کرنا چاہتے
 تھے جو جاگیر خان کے زیر انتظام یہاں چل رہا تھا۔"

"کیا مادام تمہارے ساتھ نہیں آتی تھیں چوہدری؟"
 "نہیں بلکہ" میں نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے بتانا شروع کیا۔
 "ہمیں ملک نواز کے گروگوں نے گھیر لیا تھا۔ میں جاگیر خان کو لے کر نکل گیا
 تھا۔ بلکہ مادام نے اُن لوگوں کو لہجہ کر ہمیں نکل جانے کا حکم دیا تھا۔ اُن کا
 کہنا تھا کہ ملک نواز کے گروگے اُسے پہچان کر کوئی نقصان نہیں پہنچائیں گے۔"
 "لیکن وہ لاہور میں نہیں ہے۔"

"لاہور میں تو اس وقت ملک نواز بھی نہیں ہیں۔"
 "ہاں" وہ بھی انڈر گرافٹ چلا گیا ہے۔ جی پکڑو دھوکہ پوری ہے؟"
 "پھر ہمیں یقین کرنا پڑے گا کہ مادام بھی اُسی کے ساتھ ہوں گی۔"
 میں نے آگے جھک کر لیڈر کی آنکھوں میں دیکھا "سنو میرے دوست!
 ہماری ذاتی کوئی دشمنی نہیں ہے۔ ہمارے پیشے میں بعض اوقات دشمنیا
 سے بھی متاثر ہو جاتا ہے لیکن ہمارے مفادات چونکہ مشترک ہوتے ہیں
 اس لیے ہم بروٹی خطرے کا مقابلہ ذاتی رنجش سے بالاتر ہو کر کرتے ہیں۔ مادام
 کی عدم موجودگی میں کامیابی پھر ناکامی کے غار میں گر سکتی ہے۔ مجھے کوئی شک
 نہیں۔ میں جانتا ہوں کہ آپ مادام کے وفادار ہیں۔ اس حوالے سے ہمارے
 مفادات ایک ہیں۔ میں جاگیر خان کے توسط سے ملک نواز کی شررگ
 کاٹ چکا ہوں۔ اس وقت مرکزی گودام پر میرا قبضہ ہے لیکن میں ادھر تنہا
 ہوں اور ملک نواز اور جاگیر خان کے آدی شکری کتوں کی طرح میری ٹونگتے
 پھر رہے ہیں۔ تم لوگوں کو اگر مجھ پر اعتماد نہیں تو میں دوستانہ پیش کش کروں
 گا مجھے کسی جگہ باندھ کر پھینک دو، پھر میں رکھوں لیکن گودام سے سال
 شفٹ کرو۔ وہ گودام صرف جاگیر خان کے علم میں تھا اور جاگیر خان کو میں
 نے ہلاک کر دیا ہے۔ اس سے قبل کہ اُس کے آدی ٹونگتے ہوئے گودام

رسانی حاصل کر لیں تم لوگ مال نکال کر لے جاؤ۔ لاکھوں کا نہیں
 روڑوں کی مالیت کا ہے؟"
 "کیا تم گودام کی نشاندہی کرو گے چوہدری؟" اس نے کاٹا تنگل
 پوچھا۔

"ہاں، مادام نورین کے نام پر تعاون ضرور کروں گا؟"
 "یہ کوئی چال تو نہیں دوست؟" اُس نے میری زبان پر ہاتھ مار کر
 پوچھا "تمہاری لائف ہسٹری بے حد خطرناک ہے پیارے میں تمہیں
 قتل آنکھوں سے اوجھل نہیں کر سکتا۔"

"میں صرف دشمن کے لیے خطرناک ہوں دوست" میں نے
 خاک آواز میں کہا "موجب تک مجھے یقین ہے کہ تم مادام کے مفادات
 سے خاص ہوں میں مائل بہ تعاون رہوں گا۔ یقین کرو، اگر مجھے یہ یقین نہ
 ملتا کہ تمہارا تعلق اسی ہستی سے ہے جو میری بزنس پارٹنر ہے تو تمہیں ہسپتال
 سے نکلے ایک قدم بھی ادھر نہ لاسکتے صرف لاشوں کا تبادلہ ہوتا میرے
 لیے ایک ایسا ہتھیار ہے کہ اگر میں چاہوں تو اسی وقت اپنے حق میں
 جیل بدل دوں۔"

"گودام کہاں ہے؟"
 "ایڈریس بتاؤں یا عملی رہنمائی؟"
 "ظاہر ہے تم ساتھ ہی رہو گے؟"
 "پھر تمہیں رات گیارہ بجے تک انتظار کرنا پڑے گا۔ گودام کا
 موقع ایسا ہے کہ ہم گیارہ بجے سے قبل وہاں داخل نہیں ہو سکتے۔
 اُن منزل آتا رہے۔ غالباً ملک نواز کے کسی ملازم کا گھر ہے۔ جب
 وہ جائیں گے تو ہم کیا فائدہ ڈال چھاندر کر اندر جائیں گے۔"

"فصل دادا کار براستر جھنڈا واپس لے چلو" اس نے حکمانہ لہجے
 میں ڈیڑھ گھنٹہ کی اور جب کار ٹیلی گراف آفس کے سامنے سے
 گئی تو مسٹر اسٹیمپ میرے کافوں تک پھیل گئی۔ میں شکار کو رگید نے
 ہال کے نیچے جانے پر رضامند کر لیا تھا۔ وہ لوگ واپس اپنے ٹھکانے
 کی بارہ تھے۔ اب کامیابی کے امکانات روشن ہو گئے تھے۔ اگر
 کل دسے مایوس ہو کر واپس چلے گئے تھے تو میں ان کو گیارہ بجے
 تک کالونی لے جاسکتا تھا۔ جہاں باروں مکمل تیاریوں کے ساتھ
 ہونے پر بہر کفایت میں شکار کو چاروں اطراف سے گھیر چکا تھا۔

"ایک بات بتاؤ گے برادر؟" میں نے مفتوحہ علاقے میں پیش قدمی
 کی رکھتے ہوئے پوچھا "تک ہوا کوئی بزنس لٹریٹ جمانے کے لیے تمام
 دنوں کی سرکوبی ضروری ہوتی ہے جو کسی بھی لحاظ سے باعث خطرہ
 نہیں ہے غاموش ہو کر اپنی بات کا رد عمل اُس کے چہرے پر پڑھا۔
 "جی تو جیسے سن رہا تھا؟" ہم نے ایک بہت بڑے پہاڑ کو سیر کیا

ہے۔ پہاڑ کے محاورن پہاڑی سلسلے بھی پھیلے ہوتے ہیں۔ میں ادھر کے
 تمام سلسلوں کو دیکھ کر پہاڑ پر چڑھتا تھا لیکن دوسری طرف میرے قدم نہیں
 گئے بلکہ کوئی بھی چارسی راہ میں روٹے اٹکا سکتا ہے۔ میرا مطلب مجھ رہے
 ہونا۔۔۔؟

"ہاں، تم یقیناً ملک نواز کے حواریوں کی بات کر رہے ہو؟"
 "بالکل میرے دوست" میں نے سر کو شاتی جنبش دیتے ہوئے
 بات آگے بڑھائی "میں ایسے تمام حواریوں کا صفایا کرنا ہوگا۔ درد وہ لوگ
 پہلے خود مقلدے پر آئیں گے اور شکست کی صورت میں قانون کے قہروں
 کا رخ ہماری طرف پھروں گے۔ مجھے ایسے تمام قابل توجہ لوگوں کی فہرست
 دے دو جو ملک نواز کے لیے کام کرتے ہیں۔"

"میں صرف پنجاب کی حد تک تمہاری مدد کر سکتا ہوں۔"
 "چلو ٹھیک ہے۔ کم از کم ایک ساڈو تو محفوظ ہو سکتی ہے۔"
 "لاہور میں مادام نورین کے مقابلے میں مادام شہناز ملک ہے۔
 امپورٹ ایکسپورٹ کی آڑ میں مال باہر لے جاتی ہے۔ ہیڈ کوارٹر کراچی
 ہے لیکن زیادہ وقت یہاں رہتی ہے۔ گجرات کا امیر یا چوہدری رحیم
 بخش کے پاس ہے۔ غروف اور کھلونوں کی فیکٹری کا مالک ہے۔ سنا
 ہے کھلونوں اور برتنوں میں سرورجن ادھر ادھر چلتی ہے۔ پنڈی تو غالباً
 صاف ہو چکی ہے۔ سیٹھ سلیمان، رنگ باڈخان اور جاگیر خان، ملک نواز
 کے دست راست تھے۔"

"نہیں برادر ابھی کچھ اور ناگ ہوں میں ہوں گے" میں نے کہا۔
 "پنڈی مشیات کا پہلا گروہ ہے۔"
 "اسلام آباد کا ایک شخص راجا شفاعت بیگ ہے۔ ایک دفعہ
 مادام سے ملے گیا تھا لیکن وہ مقامی طور پر کچھ ڈاکٹروں کے ذریعے
 دھندلا کر رہا ہے۔"

گلی کے منہ پر کار روک کر وہ اُترے۔ صرف ڈیڑھ گھنٹہ اندر رہا تھا
 تینوں نے اُتر کر مجھے نرسے میں لے لیا۔ گلی تنگ اور نیم روشن تھی۔ کھلے
 دروازوں اور کھڑکیوں سے آنے والی روشنی نے تاریکی کو کسی قدر
 کم کر دیا تھا۔ میں سر جھکا کر اُن کے درمیان چلنے لگا۔ سجاد حیدر کی بیٹھک
 کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ اس لیے میں نے وہاں سے گزرتے وقت چہرہ
 دوسری طرف پھیر لیا تھا۔ اگر اُس کی بیوی مجھے پہچان لیتی تو سجاد حیدر
 باہر نکل آتا اور میں کوئی وضاحت نہ کر پاتا۔

ایک آدمی جو میرے آگے تھا اُس نے کال بیل پر انگلی رکھی تھی
 کہ کھلے دروازوں نے ایک دم کئی آدمیوں کو اچھال کر گلی میں پھینک دیا
 تھا۔ دائیں بائیں اور سامنے سے دس بارہ مسلح آدمی کودے اور ہمیں
 گھیر لیا گیا۔

"کوئی حرکت نہیں کرو گے" ایک طویل قامت آدمی نے دھاڑ کر اعلان کیا "تم لوگ پولیس کے گھرے میں ہو، کوئی حرکت کیا کرتا۔ انھوں نے چشم زدن میں ہمارے بازو دھڑکڑپٹ سے لگا دیے تھے اندر سے بھی وہ آدمی نکلے تھے۔ اُن کا تعلق بھی اسی پولیس پارٹی سے تھا۔ ہماری جامع تلاشی نے کچھ کھولیاں پہنچادی گئیں اور پھر دروازے کو قفل کر کے سیل کر دیا گیا تھا۔ میں جی بی اُن فخریوں کے درمیان گالیاں پھونک رہا تھا اور دھڑکھاتا گلی سے باہر گیا۔ وہاں کار اور ڈرائیور بھی حراست میں لیے جا چکے تھے۔ حوالات کے پربودار اور گندے کمرے میں دھکیل کر ہمارے ہاتھ آزاد کر دیے گئے تھے۔ کمرے میں سگریٹ کے ڈھویں اور کچے پیاز کی بو ناقابل برداشت تھی۔ میں نے بڑی مشکل سے ابکانی کورو کے رکھا فرش پر سگریٹوں کے ٹوٹے۔ ٹافیوں کے غلاف اور جلی ہوئی مچیس کی تیلیوں کے ٹکڑے بکھرے ہوئے تھے۔ دیواروں کی حالت فرش سے بھی بدتر تھی۔ پولیس کی شان میں منظم قیدیہ تحریر تھی۔ شاید پولیس والے کبھی اندر داخل نہ ہونے ہوں گے۔

"مجھے بھی ساتھ لے ڈوبے تم لوگ ورنہ بندسی پولیس میری گرد کو بھی چھونے کے لیے ترس رہی تھی" میں نے کمرے میں ٹپتے ہوئے متاستف آواز میں کہہ دیا "میں نے کمرے میں چلا گیا۔" میں اپنے تمام ذرائع آزمائش کا دوست۔ میں اس غلیظ کمرے سے تاریک جیل کے کمرے تک نہیں جاسکتا۔ تم یہ بتاؤ کہ یہ لوگ اہم ہیں یا بھرتی کے ہیں؟ "یہ کمرے کے آدمی ہیں چوہدری" اُس نے پُر جوش انداز میں سرگوشی کی "خدا لا مجھے بھی ساتھ لے چلنا میں تاہم تمھارا وفادار رہوں گا؟" "لیکن ایک شرط" میں نے کہا "شرط تو خیر نہیں دوستانہ پیش کش ہے۔ مادام کی واپسی تک تمھیں میرے ساتھ رہنا ہوگا۔ ہم مل کر بزنس کو وسعت دیں گے اور اپنے راستے صاف کریں گے۔ میں معاہدے کے مطابق ففٹی پرنسٹ تمھیں ادا کرتا رہوں گا۔ کیونکہ مادام کی نمائندگی تم کرو گے۔"

"مجھے منظور ہے چوہدری" اُس نے میرا ہاتھ مقام کر مضبوطی سے دبا دیا "خدا کی قسم میں دل کی گہرائیوں سے ساتھ دوں گا۔" پانچ منٹ بھی نہ گزرے تھے کہ ایک اے۔ ایس۔ آئی آیا۔ اُس کے ساتھ دو سپاہی بھی تھے۔ اُس نے سیل کا لاک کھول کر اپنی مخصوص آواز میں ورنی گالی اندر اچھالی اور پھر بولا "انے تم شاید ان کے لیڈر ہو۔" اس کا اشارہ میری جانب ہی تھا "چلو انپکڑ کے پاس۔" میں نے اصل لیڈر کو آنکھ ماری اور باہر نکل گیا۔ انپکڑ کے آفس میں ڈی۔ آئی۔ جی بر نفس نفیس موجود تھے۔ مجھے دیکھ کر اُن کی آنکھیں عینک کے اندر مسکرائیں۔ میں سلام کر کے جرم سائبین کو کھڑا ہو گیا۔

"بیٹھ جاؤ لوگ" انھوں نے رعب دار ہجے میں کہا "تم لوگ باہر جاؤ۔" انپکڑ سمیت وہ لوگ فوراً باہر نکل گئے "یہ کیا ڈرامے کرتے پھر رہے ہو چوہدری؟ مجھے کہہ کر خود..." "گستاخی معاف کر" میں نے ان کی بات کاٹی "میں خود نہیں گیا بلکہ لے جایا گیا تھا۔"

"اوہ" وہ چونک اٹھے "کیسے؟" "ہم رشیدہ کو دیکھ کر باہر نکلے تو یہ لوگ باہر منتظر تھے۔" "کچھ معلوم ہو گا کون ہیں؟" "جی ہاں" میں نے گردن ہلائی "لاہور کے ہیں اور میں نے کچھ اور لوگوں کے نام بھی معلوم کیے ہیں۔ اگر ایک مطلوبہ شخص کو چھوڑ دیا جائے تو تاراج کی طرح میری نمائی ہو سکتا ہے۔"

"نہیں، تم پھر رسک لینے کی پالیسی اختیار کر رہے ہو۔" "رسک کے بغیر مقصد حاصل کہاں ہوتا ہے سر؟" "ٹھیک ہے جاؤ اُسے نکال لاؤ" انھوں نے کال بیل بجانا کر انپکڑ کو اندر بلایا اور میری خواہش پر تینوں کو لائے کا حکم دے دیا۔ ڈی۔ آئی۔ جی نے تمھانے میں میری اصل حیثیت ظاہر نہیں کی تھی۔ اس لیے پولیس کا رویہ میرے ساتھ ویسا ہی تھا جیسا عام فخریوں کے ساتھ ہوتا ہے۔ یہ میرے حق میں بہتر ہی تھا کیونکہ میں نے اپنا پیسہ کوارٹر بندسی میں ہی رکھنا تھا اور انھی سڑکوں گلیوں میں گھومنا تھا۔

تینوں کو برآمدے میں ٹھہر کر انپکڑ نے اندر آکر رپورٹ دی۔ ڈی۔ آئی۔ جی نے پردے کی چھری سے جھانک کر دیکھا۔ میں مطلوبہ آدمی کے ساتھ کھڑا ہو گیا تھا۔ انھوں نے انپکڑ کو اندر بلا کر سرگوشی میں کوئی ہدایت دی۔ پھر جب انپکڑ باہر آیا تو اُس کا رویہ بدلا ہوا تھا۔ "ان دونوں کو حوالات میں" انپکڑ نے کرائے کے غنڈوں کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا "اور انھیں ماش کے کمرے میں لے جاؤ۔" سپاہی اُن دونوں کو ٹھوکر مارے ہوئے لے گئے میرے ساتھی نے میری جانب دیکھا جیسے پوچھ رہا ہو "کیا ماش کی جائے گی یا ٹنگ ٹکا ہو؟" ہے، میں نے آنکھوں ہی آنکھوں میں اُسے سہارا دیا۔ ہمیں آفس کے ساتھ والے کمرے میں لے جا کر چھوڑ دیا گیا۔ مگر صاف ستھرا تھا لیکن قسم کے فرنیچر سے بے نیاز تھا۔ گویا ہمیں اپنا وقت ننگے فرش پر ہی بیٹھ کر گزارنا تھا۔

بارہ بجے جب میں اُس کے ساتھ ہوٹل میں داخل ہوا، انپکڑ نے اُسے دیکھ کر چونک سا گیا۔ غالباً وہ میری تلاش میں ہوٹل میں آتا تھا۔ گا۔ اکبر خان نے بے چون و چرا میرے حکم کی تعمیل کرتے ہوئے ڈبل

روم کھول دیا۔ میں بارون کی وجہ سے کچھ پریشان تھا۔ وہ گلستان ہاؤس میں عیندے لڑتا انتظار کر رہا تھا۔

"معاف کرنا پیارے تمھارا نام بھول گیا ہوں۔" میں نے معذرتی آواز میں بتایا۔

"ہمارے نام وقت کے ساتھ ساتھ بدلتے رہتے ہیں۔ تب کچھ اور نام تھا۔ اب وہ نام بتاؤں گا جو والدین نے رکھا تھا۔ اُس نے اندر کی جیب سے شناختی کارڈ نکال کر میرے سامنے رکھ دیا۔ اُس کا نام عبدالوہاب تھا۔ ایڈریس کے خانے میں فیصل آباد کے ایک پاک کا نام درج تھا۔

"شکر ہے عبدالوہاب تمھارے نام اور اعتماد کو منافع نہیں ہونے دیا جائے گا۔"

"ایک بات بتاؤ گے چوہدری؟ وہ لاناگ بوٹ کے تسمے کھاتے ہوئے بولا۔

"ہاں اب ہمارے درمیان تکلف کی کوئی دیوار نہیں پوچھو۔" "کیا اس کا نام شہباز خان ہے اور... میں نے جہنم لگایا تو وہ پھلا ہونٹ دانتوں میں داب کر خاموش ہو گیا۔ میں نے جیکٹ اتار کر کھوٹی پر لٹکائی اور اُس کے سامنے بیٹھ گیا۔

"نہیں دوست، تم خود کہہ چکے ہو کہ ہم لوگوں کے نام بدلتے رہتے ہیں۔ اُس کا نام بھی بدل گیا تھا جو ہوٹل کا میجر اور میرا آدھی تھا۔ نام والدین والا بارون ہے۔"

"تو تم نے..."

"ہاں پیارے میں نے تم پر جال پھینکا تھا مگر تم اچھے شکاری ثابت ہوئے ہو، مجھے ہی سچا سنا لیا۔ پکارا پروگرام رات والا تھا۔" "مجھے بھی شک سا تھا اس لیے اُس کا تعاقب کیا گیا اور جب مجھے بتایا گیا کہ وہ دین ہوٹل میں کھڑی ہے جو آر۔ اے بازار تک پہنچے آئی دیکھی گئی تھی۔ تب ہی میں نے تمھاری نگرانی شروع کر دی تھی۔"

"چلو حساب برابر ہو گیا پیارے اب ہم دوست ہیں۔ تم آرام کرو میں اکبر خان سے ہوٹل کا حساب کتاب لینا چاہتا ہوں۔"

دوسرے کمرے میں جا کر بارون کو واج ٹرانسمیٹر پر کال کیا۔ ٹرانسمیٹر سے کھانسنے کی آواز سنائی دینے لگی۔ میں وقفے وقفے سے ہیلو بولو کرتا رہا۔ اُسے کوئی مجبوری ہی رہی ہوگی۔

"ایس چیف! بارون آؤ فٹ پاتھ۔"

"فٹ پاتھ سے اٹھو اور جا کر آرام سے بیڈ پر سو جاؤ خطرہ میری نمائی میں ہے۔ اب وقت نہیں جمع ہوٹل پہنچونا شامل کر کریں گے۔"

آنے والے وقت کی منتی میں کیا ہوتا ہے۔ بندہ کتنا ہی دانا اور باخبر کیوں نہ ہو جان ہی نہیں سکتا۔ اگر مجھے خبر ہوتی تو میں ناشتے کی میز پر بارون کا انتظار نہ کرتا۔ اٹھ بجے میں نے سبک کوٹلی فون پیکل کیا۔ وہ بھی موجود نہ تھا۔ ٹینز کو رنگ کر کے آواز بدل کر بارون کے بارے میں پوچھا۔ پھر اسپتال کی طرف دھبیل گیا اور فوراً نمبر فائل کیا۔

"مس! میری عزیزہ روم نمبر تھریٹین میں ہے۔ پلینز چیک کر کے بتائیے کہ وہ کیسی ہے اور اُس کے پاس کون ہے؟" وہ انتظار کرنے کا کہہ کر چلی گئی۔ پھر دو تین منٹ بعد بتانے لگی۔

"مس رشیدہ پہلے سے بہتر ہیں اور اُن کے پاس کوئی نہیں ہے۔"

"تھینک یو مس" رشیدہ کی فکر تو کم ہوئی تھی لیکن میرے ساتھی غائب تھے۔ ایک ذریعہ باقی تھا واج ٹرانسمیٹر کا، وہ بھی آزمایا مگر ہر طرف سے خاموشی نے سب سے منہ چڑایا تھا۔ پریشانی نے منہ کا کافی نقوی خراب کر دیا تھا۔ ناشتا محض عبدالوہاب کی وجہ سے زہر مار گیا۔ کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ لوگ کہاں غائب ہو گئے ہیں۔ عدم موجودگی کی اور بات تھی۔ جب میں موجود تھا تو اُن کو بغیر اجازت کہیں نہیں جانا چاہیے تھا۔

"کوئی مسٹر حسن آپ سے بات کرنا چاہتے ہیں سر" اکبر خان نے کمرے میں آکر بتایا تو میں دوڑتا ہوا... کاؤنٹر پر رکھے ریسیور تک گیا۔

"السلام علیکم سر، میں خرم سلطان پور ہا ہوں۔"

"فرصت ہو تو چند منٹ کے لیے یہاں چلے آؤ۔ تمھارے لیے ایک اہم خبر ہے۔"

"خبر کا عنوان اور ذریعہ انکل؟"

"فون پر نہیں بیٹھے، اُن کی آواز میں اپنا نیت تھی۔" بے بی اور تمھاری آنتی جی تم سے ملنا چاہتی ہیں۔"

"بھڑانکل، میں شام کو کسی وقت خانہ داری دوں گا۔"

"اوہ نہیں خرم، وہ تڑپ کر بولے "ہم کہیں جا رہے ہیں۔ چند دنوں کے لیے۔ اگر معروف ہو تو بس کھڑے کھڑے بات سن کر واپس چلے جانا نہیں نے ہامی بھر کر ریسیور رکھ دیا۔

دین کی رجسٹریشن تھی نہ میرے پاس ڈرائیونگ لائسنس تھا اس لیے میں نے ہوٹل کی پڑائی کار نکال لی اور محتاط رفتار سے معروف ہوٹل پر چلتا سول لائن میں داخل ہوا۔ گیٹ کھلا ہوا تھا۔ میں بارون دیتا ہوا داخل ہوا اور راضیہ کی کار کے ساتھ کار پارک کمرے کے آڑا جس صاحب سیز جیوں پر کھڑے تھے۔ اُن کے ساتھ ایک اجنبی شخص بھی تھا۔

میں نے دونوں سے مصافحہ کیا۔ جس صاحب کا چہرہ اُتر اُتر ہوا

تھا اور آنکھوں میں نیند کا غبار سمجھا ہوا تھا۔ خشک بال بھی چہرے کی طرح پریشان تھے۔ میں نے برآمدے میں بھی گریسوں کی جانب دیکھا۔ میرا خیال تھا وہاں ہی بٹھایا جائے گا لیکن مسٹر حسن نے ہاتھ کے اشارے سے ڈرائنگ روم کی طرف اشارہ کیا۔ اجنبی کی موجودگی سدا رہ تھی۔ دروازے میں حسن صاحب سے پریشانی کی وجہ پوچھ لیتا۔ کیونکہ پریشانی علی حروف میں ان کے چہرے پر جمی ہوئی تھی۔

”ختم سلطان۔“ معافی کی بھرپور سی زبانی آچل کر باہر آئی۔ ”جھاگ جاؤ، اندر دشمن...“ پھر اس کی آواز کنگل جھج میں ڈھل کر ڈوب گئی۔ عین اسی وقت وہ اجنبی شخص عجب سے گڑگڑاتا ہوا پہلے حسن صاحب سے ٹکرایا کیونکہ درمیان میں وہی چل رہے تھے اور راہداری میں ایک طرف گئے تھے اور دیوار کے ساتھ ایک میز پر بیٹھ گئے تھے۔ اُسے درمیان کی رکاوٹ کو گرا کر ہی مجھ تک آنا تھا جس صاحب مجھ سے ٹکرائے اور میں نے پھرتی سے پلٹ کر اڑتے ہوئے شخص کو تھوڑا جھک کر ہاتھوں پر رکھ لیا۔ فاصلہ کم تھا اور وہ شاید بوکھلاہٹ کا بھی شکار ہو گیا تھا۔ سیدھا میری ہتھیلیوں پر آیا تھا۔ میں نے اسے اٹھا کر کھایا اور پھر پوری قوت سے ستون پر اچھال دیا۔

نتیجہ دیکھنے کی گنجائش تھی نہ وقت چنانچہ میں نے فوراً اس کے پیچھے ہی راہداری کی قد آدم جالیوں کی جانب چھلانگ لگائی۔ کیونکہ دونوں اطراف سے میں نے قدموں کی چاپ مہمتری سن لی تھی۔ میں قلابازی کھاتا ہوا نیچے گلاب کی خاردار جھاڑیوں پر گرا اور پھر جھاڑیوں کی آڑ میں چھل گئے لگا۔ ایک منٹ بعد میں کیا فائدہ وال چھلانگ کر دوسری کوٹھی کے لان میں اتر چکا تھا۔ ایک جوڑا لان میں چھل رہا تھا۔ پہلے عورت کی نظر ہی مجھ پر پڑی تھی۔ اس نے مرد کے شانے پر ہاتھ مارا لیکن میں ان سے کڑا ہوا بارہ چھلانگ کر گیتھ سے نکلتا چلا گیا تھا۔ معذرت اور وضاحت شاید ان کے حق میں نہ جاتی۔ میرے تعاقب میں دشمن تھا اگر وہ فائرنگ شروع کر دیتے تو اس کی پھیٹ میں وہ معصوم لوگ بھی آسکتے تھے۔

گیتھ سے نکل کر میں نے مسٹر حسن کے گیتھ کی جانب دیکھا کوئی خطرہ نہ تھا۔ یہی وجہ رہی تھی کہ میں نے عام رفتار کے ساتھ مرک پارکی اور سامنے والی گلی میں گھس گیا۔ دو تین گلیوں کے بعد میں روڈ پر چڑھا تو گہری کی طرف سے ایک خالی رکشا آتا دکھائی دیا۔ میں نے ہاتھ اٹھا کر اسے رکنے کا اشارہ کیا۔

جو کچھ میرے ساتھ بیٹ گیا تھا میرے لیے روز روشن کی طرح عیناں تھا کہ مسٹر حسن کا ذریعہ کون لوگ استعمال کر رہے ہیں۔ خشک و خشن کی بات نہ تھی۔ صرف ملک نواز ہی جانتا تھا کہ ختم سلطان کو کیسے ڈیس کیا جا سکتا ہے۔ اب ہارون کی خاموشی کا سبب بھی معلوم ہو گیا تھا۔ مسٹر حسن

نے پہلے ہارون کو بلایا اور پھر اس سے لاگ رنگ کا نمبر اگلا لیا گیا تھا تاخیر خطرناک تھی۔ کئی زندگیوں داؤ پر لگی ہوئی تھیں اور میں بالکل ہنر تھا۔ تمام ساتھی لپٹا تھے کسی سے رابطہ نہیں مل رہا تھا۔

میں نے ہمیشہ پولیس کی مداخلت سے گریز کیا تھا لیکن پیش کر والے حادثات نے مجھے اسی درکار والی بننے پر مجبور کر دیا تھا۔ میں نے ہوٹل کے سامنے رکشا رکھوایا اور دس روپے کا نوٹ چھینک کر گڈا ایک ایک منٹ خطرے کی طرف بڑھ رہا تھا جیسے ٹائم بم کی منتر کر سوتی مقررہ وقت کی جانب ریگ رہی تھی۔ بکرخان ٹیلی فون پر کسی باتیں کر رہا تھا۔ میں نے جاتے ہی ریسپونڈر اس سے چھین لیا اور کیریل پر پکڑی تھیلی مار کر اس میں پنی کا نمبر ڈال کر لے لگا۔

”میں ختم سلطان بول رہا ہوں سر“ سلسلہ ملتے ہی میں بولا۔ ”وضاحت اور تفصیل کا وقت نہیں۔ آپ جتنی جلدی کر سکتے ہیں چلنے سے باہر جانے والے تمام راستے بلاک کر دیں۔ خاص کر پشاور روڈ۔“ لوگ میرے ساتھی ہارون کو یا اس کے ساتھ کسی خاتون کو پشاور سے جانا چاہتے ہیں۔ ہو سکتا ہے لاہور کا رخ کریں اور دوسری تیز رفتار پارک سول لائن مسٹر حسن کی کوٹھی پر پہنچ دیں۔ جلدی سر بہت جلدی دروازہ نکل جائیں گے۔ میں بھی سول لائن پہنچ رہا ہوں۔“

”اوکے بوائے“ ایس۔ پی بولے۔ ”میں تم سے وہیں ملوں گا“ سلسلہ توڑ کر میں نے نیند مقل کو کال کیا۔ مجھے خطرہ تھا کہ دشمن کوئی پارٹی ادھر بھی نہ پہنچ دی ہو۔ ملک نواز ہی اگر میدان میں تھا تو اسے ٹان کی ٹانگیوں کو نظر انداز نہیں کرنا چاہیے تھا وہ ختم سلطان کی دھکتی رگ پہناتا تھا۔

”یس سر“ کوئی آواز سنائی دی۔ ”ہیلو کونز“ میں ختم سلطان بولے۔ بی بی لوگ کہاں ہیں؟ ”کالج کے لیے تیار ہیں سر“ ”انہیں روک لو کونز اور تم اتر رہنا۔ وہ بھی اندر رہیں گی۔“ ”او۔۔۔ کوئی خطرہ سر؟“

”یعنی تو نہیں ایس امکان ہے۔ البتہ انہیں خطرے کی بابت کچھ بتانا کہہ دینا ختم سلطان آ رہا ہے۔“

”رائٹ سر“ کونز کے حلق سے غراہٹ نکلی۔ ”آپ بے فکر رہیں سر“ ”تھینکس کونز“ مشکوک چڑیا بھی دیکھو تو جھون کر رکھ دو۔“

”ایسا ہی ہوگا چیف“ وہ بولا۔ میں نے تھینک بول کر سلسلہ منقطع کر دیا۔ بکرخان بھی اپنی بے چینی کو دوبارہ ہاتھ

”کیا بات ہے چیف؟ آفراس سے نہ رہا گیا تو وہ پوچھ ہی سکتا ہے۔ اب ہارون کی خاموشی کا سبب بھی معلوم ہو گیا تھا۔ مسٹر حسن

اس نے جھپٹ کر ریوالتور اٹھا لیا۔ ”ادھر ہیڈ ویز کو چھوڑ دو“

دین کا استعمال ناگزیر ہو گیا تھا کوئی گاڑی بھی دستی اور مقابلے کا بھی امکان تھا۔ ہمارے پاس صرف ریوالتور تھے۔ اسلحہ خانے تک جانے کا وقت نہ تھا۔ ”بکرخان“ تم ڈرائیو کرو گے۔ میں نے سائیڈ کا دروازہ کھولتے ہوئے کہا۔ وہ اچھل کر ڈرائیو تک سیٹ پر بیٹھ گیا۔ وہ واقعی مشاق ڈرائیو تھا۔ میں نے اسے سول لائن چلنے کو کہا تھا لیکن ایک کے ہجوم سے دین کسی ناگن کی طرح پھٹکتا رہی بل کھاتی سول لائن جانے والی مرک پر مڑی تو میں نے اطراف کا جائزہ لیا۔ پولیس بھی تک نہیں آئی تھی۔

”بس یہاں روک دو“ دو کوٹھیاں ادھر میں نے دین رکوائی اور ریوالتور لے کر باہر کود گیا۔ میرے پیچھے بکر بھی کود آیا تھا۔

”ٹیکسی“ میں نے ہاتھ اٹھا کر دہائی آوازیں اشارہ دیا۔ بکرخان تم ٹیکسی میں بیٹھ جاؤ۔“

”مجھے کہاں جانا ہے چیف؟“ بکر نے ٹیکسی کی طرف بڑھتے ہوئے پوچھا۔ ”دوسرے اشارے تک تم ٹیکسی کو ادھر ہی روک کے رکھو گے۔ ڈرائیو کو کہہ دینا کہ وقت کا کرارہ ادا کیا جائے گا۔ اس گیتھ سے گاڑی یا کوئی شخص باہر نکلے تو تمہیں اسیا طے صرف تعاقب کرنا ہوگا۔“

جونہی وہ ٹیکسی میں بیٹھا میں دین کو ریوالتور میں لے جاتا ہوا گلی میں چلا گیا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ ان لوگوں کی نگاہ دین پر پڑے۔ گلی میں ایک کار پہلے ہی پارک تھی اور اس پر تریپال پڑا ہوا تھا۔ میں ماہر ڈرائیو نہ تھا۔ خطرہ تھا کہ دین کا سرے مکرانہ جائے۔ اس لیے کئی بار آگے پیچھے ہوتا ہوا میں بمشکل دین دوسری مرک کے کنارے تک لے گیا اور اسے ایک مرک پول کے ساتھ لگا کر دوڑتا ہوا واپس آ گیا۔ جونہی میں گلی سے باہر آیا ٹیکسی اپنی جگہ چھوڑ کر جینڈا بازار کی جانب جاتی دکھائی دی۔ جب اسے نگاہ گئی تو میرا جسم ہارے غصے کے سنسنائے لگا تھا۔ راضیہ حسن کی فوکسی ٹیکسی سے کوئی پیاس گڑا گے جا رہی تھی۔

میں پلٹ کر گلی میں داخل ہوا۔ اسکول جانے والے بچے مجھے حیرت جبری لگا ہوں سے دیکھنے لگے تھے۔ میں دوڑتا ہوا تین بلاک کراس کر کے جب میں روڈ پر پہنچا تو فوکسی ریوالتور کے کراسنگ عبور کر چکی تھی اور ٹیکسی اس کے تعاقب میں اچھلتی کودتی دوڑ رہی تھی۔ میں نے بے بسی سے ادھر ادھر دیکھا۔ کوئی خالی ٹیکسی دکھائی نہ دے رہی تھی۔

عین اسی لمحے میں نے پولیس کار دیکھی۔ ایس۔ پی نے شاید ٹرن لیتے ہی مجھے پہچان لیا تھا۔ اس نے قریب آ کر کار روک لی۔

”وہ... وہ نکل گئے سر“ میں نے بلبلائی آواز میں بتایا۔ ”مسٹر حسن کی فوکسی میں۔ ابھی جینڈا بازار میں ہوں گے۔“

”چلو آؤ“ انھوں نے میرا ہاتھ پکڑ کر گھسیٹ لیا۔ ”فوکسی کا نمبر بتاؤ“ میں نے ذہن پر زور دے کر نمبر بتا دیا۔ انھوں نے فوراً ڈائریس سیٹ آن کیا اور پارٹیوں کو کال کرنے لگے۔ جب پولیس کا بازار سے گزر رہی تھی تو وہ سب پارٹیوں کو فوکسی کا نمبر بتا چکے تھے۔ ”گھبراؤ ہمیں ختم سلطان اب فوکسی پنڈی ایریا سے باہر نہیں جاسکتی۔“

مٹامیری نگاہ ڈیر سی فارم چوک پر جا پڑی۔ وہاں لوگ جمع تھے۔ کچھ دوڑتے ہوئے جاتے حادثہ تک جا رہے تھے۔ شاید کوئی ایکسی ڈینٹ ہو گیا ہے۔ ایس۔ پی نے رائے ظاہر کی۔ ڈرائیو اور دیکھو کیا ہوا ہے؟ میرا دل اٹھانے خدشے سے بیٹھ رہا تھا۔

”کسی نامعلوم شخص نے ایک ٹیکسی پر دستی بم پھینکا ہے جناب“ ڈرائیو نے واپس آ کر رپورٹ دی۔ ”ڈرائیو جگہ پر ہلاک ہو گیا اور سواری زخمی ہے۔“

”میں جا رہا ہوں سر“ وہ میرا آدمی ہے۔ میں نے دروازہ کھولتے ہوئے بتایا اور بھاگتا ہوا ٹیکسی کے قریب پہنچ گیا۔ ٹیکسی کے پرچے اڑ گئے تھے۔ لوگ بکرخان کو اٹھا کر ایک سوڑ کی دین میں رکھ رہے تھے۔

میرا خون رگوں میں اچھلنے لگا تھا۔ بکرخان کا لباس خون آلود تھا۔ ”کیا واقعی یہ اپنا آدمی ہے چوہدری؟“ ایس۔ پی نے میرے شانے پر ہاتھ رکھ کر پوچھا۔ میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

”تم کہاں تھے اس وقت؟“ ٹریفک سپاہی نے جونہی سلیوٹ کیا ایس پی نے ڈپٹ کر سوال کیا۔

”میں ادھر ہی تھا سر“ سپاہی نے جواب دیا۔ ”جب دھماکا ہوا اس وقت کم و بیش چالیس پیاس گاڑیاں زور رہیں تھیں۔ اس لیے کچھ اندازہ نہیں لگا سکا کہ ہم کس نے پھینکا ہے۔“

”جاؤ ان کو بولو معروب کو پولیس اسپتال میں لے جایا جائے۔“ ایس۔ پی پھر میری جانب مڑے۔ ”آؤ واپس چلتے ہیں مسٹر حسن سے شاید کچھ معلوم ہو۔“

میں طویل سانس لے کر ان کے ساتھ چل پڑا۔ سانپ نکل گیا تھا اب بکر پٹنے کا کوئی فائدہ نہ تھا۔ میری شستی اور حد سے بڑھی ہوئی محتاط کارروائی نے انہیں نکل جانے کا موقع دے دیا تھا۔ اگر میں وہیں رگ جاتا تو شاید کچھ کر سکتا۔ کوٹھی پر گہرا سکوت طاری تھا۔ پورے ہوٹل کی گاڑی جو میں جھاگے ہوئے چھوڑ گیا تھا غائب تھی۔ اس لیے کامیابی کے امکانات مزید تاریک ہو گئے تھے۔ پولیس پارٹیوں کو صرف فوکسی کی نشاندہی کی گئی تھی۔ اگر وہ لوگ میری کار میں ہارون کو لے گئے تھے تو بچ سکتے تھے۔ راہداری بھی دیران تھی۔ گریسیاں بھجری ہوئی تھیں۔ ”کوئی اندر ہے؟“ راہداری میں رگ کر ایس پی بلند آواز میں

میاں بوی میں چپقلی ہو چکی تھی۔ جھگڑا بڑھا تو شہر گھر سے باہر دلیز پر بیٹھ گیا۔ اتفاقاً اس کا ایڈوکیٹ دوست اسے یاد آتی سنت سردی میں تم باہر بیٹھے ہوئے ہو۔

اس نے ایک ٹھنڈی سانس لی اور بولا، "میں اندر نہیں بیٹھ سکتا۔"

"کیوں بھئی! کیا آتش دان کا دھواں پریشان کرتا ہے؟" اس نے اذیت میں سر ہلادیا۔

"اندھے سے جوتے، چپقلی ممد کو سنوں کے برائے شروع ہو گئے۔ اس نے بوکھلا کر دروازہ کھولا تو گھر اذیت یا دیر سے گھر کا آتش دان بھی کبھی اتنا زیادہ دھواں دینے لگا ہے۔"



شکریہ بیٹے! "ان کے آنسو نکل آئے۔" اولاد کی محبت انسان کو خود غرض بنا دیتی ہے۔ میں... میں تسلیم کرتا ہوں کہ میں خود غرضی کر رہا ہوں۔

"مجھے احساس ہے، انکل!"

"تم ان سے بیچھا پھڑا کر ٹھیک چاہیے پہل چلے آنا... وہ فون کریں گے۔"

"ٹھیک ہے، انکل! میں آ جاؤں گا۔"

ایس۔ پی صاحب واپس آئے تو ان کا چہرہ اتر ہوا تھا۔ آتے ہی بولے، "ختم سلطان تمہارا اذانتہ صحیح ثابت ہوا ہے... فوکسی ہانی وے پر روک لی گئی ہے۔ اس میں صرف ایک آدمی ہے۔ وہ اردو نہیں جانتا۔"

"کیا اسے ادھر لایا جا رہا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"ہاں، میرے آفس میں لایا جائے گا، چلو چلتے ہیں۔"

مجھے بھی پتہ ونگ کار میں بٹھالیا گیا تھا۔ جاتے جاتے میں نے

حسن صاحب کو پھر تسلی دی۔ انھوں نے خود کو خود غرض کہا تھا لیکن میرے

نزدیک دھڑ ایک ایسا باپ تھا جس کے گناہوں کی سزا، اس کی

اولاد کو ملی تھی۔ وہ اگر غیر متعلق تھا تو ملک نواز اسے کبھی یاد نہ رکھتا۔

ختم سلطان کو کسی اور طریقے سے گھر اجاتا۔ بقول ملک نواز، وہ

بکا ہوا تھا۔ اس کے باوجود مجھے راضیہ حسن کی سلامتی عزیز تھی۔ وہ

میری محبوبہ تو نہ تھی لیکن مجھے ضرور تھی۔ اگر وہ اپنی جان پر کھیل کر مجھے

خطرے سے آگاہ نہ کرتی تو اس کی جگہ میں ان کی گرفت میں ہوتا۔

میں احسان فراموش نہیں تھا میں نے محض طفل تسلی نہ دی تھی...

"شاید نہیں۔ حسن صاحب نے نفی میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔

"میرا خیال ہے کہ میں نے پہلے ایک گاڑی کی آواز سنی تھی۔ پانچ سات منٹ بعد دوسری گاڑی اشارت کی گئی تھی۔"

"آپ اپنی کال کی آواز تو پہچانتے ہوں گے؟"

"ہاں، پہلے ہمدی کار اشارت کی گئی تھی۔"

"تو پھر جس دھیری چوٹ ہوئی ہے، سر آ میں نے کہا۔" غالباً فوکسی

محض میرے خطرے کو فوج دینے کے لیے باہر لے گئے ہوں گے، جب

ٹیکسی اور میں یہاں سے ہٹ گئے ہوں گے تو وہ میری کاریں راضیہ اور

ہارن کو لے کر نکل گئے ہوں گے۔"

"کچھ بھی ہو، وہ بائی روڈ، پنڈی سے باہر نہیں نکل سکتے۔"

"باہی اتر... حسن صاحب بول رہے۔"

"جناب! انسپکٹر اعظم کی کال ہے۔ ایس۔ پی صاحب کا ڈرائیور

پٹرولنگ کار سے نکل کر بولا۔ ایس۔ پی صاحب دوڑتے ہوئے کار

میں داخل ہو گئے۔"

"یہ... یہ... تمہارا ہم پر بڑا احسان ہوگا، ختم سلطان! ایس۔ پی

صاحب کے بھتیجے ہی حسن صاحب گر گرنے لگے۔" میری بیٹی کو بچاؤ

وہ تمہاری محبت میں ماری گئی ہے۔ یہ لوگ احمقانہ کارروائیوں سے

ان کو مشتعل کر دیں گے۔ میں نے کبھی بھی قانون کے ذریعے اغوا

ہونے والوں کو واپس آتے نہیں دیکھا۔ تم مرنو ہو، ختم سلطان! انھیں

وہ ہلاک نہیں کریں گے۔ ملک نواز نے ان لوگوں کو تمہارے لیے

بھجایا ہے۔ کیا ہم پر رحم کرو گے؟"

"ہاں، انکل! یہ میرا وعدہ ہے، میں راضیہ کو ہر حال میں

بلا کر آؤں گا۔"

مسٹر حسن مکمل تھے یا تیرے حوصلہ مند تھے۔ پٹرنگون لہجے میں وہ ایس۔ پی صاحب سے باتیں کرتے ہوئے پورے تھک چلے آئے تھے، البتہ ان کی دیکم ایک عورت اور ماں تھیں۔ جب ہم چلے تو وہ ٹکیے پر اونچی پڑی بلک رہی تھیں۔

"رابطے کا طریقہ کار کیا بتایا ہے، انھوں نے؟" ایس۔ پی صاحب نے سوال کیا۔

"دو یہاں رہیں گے۔ حسن نے بتایا۔" وہ شام چار اور پانچ بجے کے درمیان کال کریں گے۔ وہ ختم چوہدری کے لیے پیغام چھوڑ گئے ہیں اگر اس نے خود کو پیش نہ کیا تو وہ کل رات دس بجے، مسٹر ہارن کا کوئی عفو کاٹ کر پارسل کر دیں گے... پھر ہر رات ایسا ہی کرتے رہیں گے۔"

"اس بات کی کیا ضمانت ہے کہ وہ ختم کو لے کر، ان دونوں کو ہار دیں گے؟"

"ناکامی کی صورت میں وہ میری بیٹی کو اپنے ساتھ لے جائیں گے۔" حسن صاحب نے نفرت آمیز لہجہ میں میری جانب دیکھا۔

"اگر وہ حماقت نہ کرتی تو وہ اسے ہاتھ بھی نہ لگاتے۔"

"کیسی حماقت؟" ایس۔ پی صاحب نے استفہامیہ لہجے میں پوچھا۔

"اس نے چیخ کر ختم کو خطرے سے آگاہ کر دیا تھا۔"

"اوہ... ایس۔ پی صاحب نے میری جانب دیکھا۔ ایسی

عظیم لڑکی کے لیے تم کیا کرو گے؟ چوہدری؟"

"دبی، جو کچھ اس نے کیا ہے، سر! میں نے ٹھوس آواز میں جواب دیا۔ میں خود کو پیش کر دوں گا۔"

"اوہ... نہیں۔ ایس۔ پی صاحب چونک کر بولے۔" یہ تو کوئی صل

نہیں چوہدری! اس طرح کل وہ لوگ کسی اور کو پکڑ لیں گے۔ کیا قانون

اتنا ہی بے بس ہو کر رہ سکتا ہے؟"

"یہ ہمارا ذاتی معاملہ ہے، سر! میں نے کہا۔" براہ کرم، آپ اپنے

قانون کو لے کر تشریف لے جائیں۔ قانون اندھا اور بہرہ ہوتا ہے، سر!

جبکہ ایک بھائی اور ماں باپ، اندھے اور بہرے نہیں ہو سکتے... میں

ہارن کو ضائع نہیں کر سکتا اور نہ ہی یہ لوگ اپنی بیٹی کو قانون کے رحم و کرم

پر چھوڑ سکتے ہیں۔"

"جذبائی نہ ہو، نوجوان! ایس۔ پی صاحب نے میرے شانے پر

تھکی دی۔" پہلے قانون کو اپنی بالادستی منوانے کا موقع دو۔ اگر تم ناکام

ہو گئے تو پھر تم اپنی طاقت آزمائینا۔"

"مسٹر حسن! میں نے خالص کاروباری لہجے میں پوچھا۔ کیا

مب لوگ ایک ساتھ روزانہ ہوئے تھے؟"

بولے۔ کوئی جواب کوئی آواز نہ آئی تو وہ چل پڑے۔ ڈرائنگ روم بھی خالی تھا۔ ڈرائنگ روم کا دروازہ نیم وا تھا۔ میں نے کھول کر دیکھا، میز پر ناشتے کے برتن بکھرے ہوئے تھے۔ ایک میپکن فرش پر پڑا ہوا تھا۔

ہم آگے بڑھنے لگے پھر ایک بند دروازے پر رُک کر ایس۔ پی صاحب نے مجھے دروازہ کھولنے کا اشارہ کیا۔ ان کے ہاتھ میں سر ورس ریو اور دبا ہوا تھا۔ میں نے بہرہ رسانی کی ناک بٹھا کر دروازہ کھول دیا۔

ڈبل بیڈ پر مسٹر حسن اور ان کی بیگم اونٹھے پڑے دکھائی دیے۔ ایس۔ پی نے پہلے جھانک کر دائیں بائیں دیکھا پھر اندر داخل ہو گئے۔

ان کے ہاتھ پاؤں کپڑے کی پٹیوں سے بندھے ہوئے تھے اور

منہ بھی بندھے تھے۔ میں نے جیب سے چاقو نکال کر گتیاں کاٹ دیں اور

ایس۔ پی نے ان کے منہ سے کپڑا نکال لیا۔

"میری بیٹی... میری بیٹی..." مسٹر حسن نے چیخ کر بتایا۔ "وہ... وہ... میری بیٹی کو اٹھا کر لے گئے ہیں۔ خدا آسے بچائے۔"

"صبر... صبر کرو بیگم، حسن صاحب نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں

کہا۔ "ختم سلطان! سب کچھ تمہاری وجہ سے ہوا ہے۔ تم نے ہماری

بیٹی کو اچھا صلہ دیا ہے۔"

"کیا بارون بھی ساتھ تھا؟ میں نے اس کے شکوے کو نظر انداز کرتے ہوئے پوچھا۔

"ہاں، وہ بولا۔" دونوں کو الگ الگ لے جایا گیا ہے۔"

"مسٹر حسن! ایس۔ پی نے ان کا ہاتھ سہلاتے ہوئے کہا۔ "وہ کون لوگ تھے؟"

"علاقہ غیر کے قبائلی تھے جناب۔ حسن صاحب مجھے گھورنے لگے۔

"کون تھے یہ ختم سلطان ہی بتائے گا۔ میری تو ان سے کوئی دشمنی نہ تھی۔"

"سانپ کسی ایک کا دشمن نہیں ہوتا، انکل حسن۔" میں نے اس

کی گھورتی نگاہوں کو جواب دیا۔ "بہتر ہوگا کہ مجھ سے نہ پوچھا جائے کہ

وہ کون تھے اور کس نے بھیجے تھے۔" حسن صاحب نے فوراً ہی اپنی

نگاہوں کا ناز ویر بدل لیا تھا کیونکہ ان کو اپنے گریبان میں چھپا ہوا مسٹر

حسن دکھائی دینے لگا تھا۔

"خاتون! ایس۔ پی بولے۔" ہم نے تمام راستے بند کر دیے ہیں

وہ لوگ باہر نہیں نکل سکیں گے۔ انھوں نے میرا اشارہ چھپتھپایا۔ "ختم

تم بھی آرام کرو۔ اب مجرموں کو تلاش کرنا ہمارا فرض ہے۔"



میں نے جو فیصلہ کیا تھا، وہ اٹل تھا۔

انسپکٹر کے ساتھ جب وہ اندر آیا تو پہلے قدم ہی پر سے بھر پور جھٹکا لگا تھا۔ اُس کی نگاہیں مجھ پر جم کر رہ گئی تھیں۔ میرے لیے تو وہ اجنبی ہی تھا لیکن میں اُس کے لیے اجنبی نہ تھا۔ اُس نے اُس وقت مجھے جتا خان کے ذریعے پر دیکھا ہوگا، جب ملک نواز میری پشت پر ہاتھ رکھے، میری تعریف کر رہا تھا۔ اُس وقت وہاں چالیس پچاس افراد موجود تھے، ان ہی میں وہ شخص بھی رہا ہوگا۔

ایس۔ پی صاحب نے ڈی سی آفس سے ایک پٹھان نوجوان کو بلوایا تھا۔

”تمہارے ساتھی کہاں ہیں؟“ اُس سے پہلا سوال کیا گیا۔
”بے غیرت! پٹھان ہو کر پٹھانوں کی موت کی باتیں نہ کرو۔“
اُس نے جواب دیا جو نوجوان نے اردو میں بتا دیا۔ ایس۔ پی صاحب اُسے اور لحظہ بھر اُس کی نیلی آنکھوں میں جھانکنے کے بعد بولے۔
”ہم پتھروں سے بھی تیل نکال لیا کرتے ہیں۔ ہڈیاں تڑوا کر بولو گے تو کوئی فائدہ نہ ہوگا، تمہیں۔“

”صاحب! ہم کفن ساتھ لائے ہیں۔“ اُن کو جواب دیا گیا۔
”اے میرے حوالے کر دیں، سر!“ میں نے سرو آواز میں کہا۔ ”دیے بھی یہ معاملہ میرے ذمہ وارنٹ کا ہے۔“
”نہیں خرم سلطان!“ ایس۔ پی صاحب بولے۔ ”یہ پولیس کیس ہے۔ کیا میں اپنے اختیارات استعمال کروں، سر؟“
”تم دھکی دے رہے ہو؟“

”نہیں، سر!“ میں نے نفی میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ ”میں صرف قاعدے کی بات کر رہا ہوں۔“
”ٹھیک ہے۔“ وہ مجھے کڑی نگاہوں سے دیکھنے لگے۔ ”میں اپنی فورس ووڈرا کروں گا۔“

”انسپکٹر۔“ میں نے تھکانے لہجے میں کہا۔ ”اس کو دوسرے سرے میں لے جائیں۔“ انسپکٹر نے اجازت طلب نگاہوں سے اپنے چیف کو دیکھا۔ انھوں نے اثبات میں سر ہلا کر میرے حکم کی تائید کر دی۔ حاصل میں ان لوگوں کی وجہ سے، ایس۔ پی صاحب سے اُلجھنا نہیں چاہتا تھا۔ میں اپنی گستاخی کی معافی چاہتا ہوں، سر!“ میں نے نرم اور مدعینہ انداز اختیار کر لیا۔ ”کوئی بڑے صاحب کا منہ بے حد خراب ہو گیا تھا۔ میرا مطلب اپنی اہمیت جتنا اور پولیس کو ڈی گریڈ کرنا نہیں تھا، جناب عالی! آپ بخوبی واقف ہیں کہ ایک حکم کے تحت مجھے بالکل خود مختار بنایا گیا ہے۔ اگر میرا ذمہ وارنٹ سب پر عیاں ہو جائے تو اُس کی افادیت ختم ہو جائے گی۔ اگر اس شخص کو پولیس انٹرویو کر لیتی ہے تو سب کچھ طشت از بام

ہو جائے گا۔ سب جہاں جہاں گئے کہ خرم سلطان کون ہے اور کیوں ہے۔“
”تمہارا مطالبہ درست ہے مگر لہجہ قابل اعتراض تھا، برخود دار!“
ایس۔ پی صاحب قدرے نرم ہو کر بولے۔ ”میں تمہارے ذمہ وارنٹ کی اہمیت جانتا ہوں اور تمہاری ذات کا قد بھی لیکن ہماری بھی کچھ فتنے داری اور وقار ہے۔ میں کیا جواز پیش کر کے اس شخص کو تمہارے حوالے کر دوں؟ جبکہ انسپکٹر اعظم تمہیں نہیں جانتا۔ کیا وہ یہ نہیں سمجھ سکتا کہ صاحب نے سونے بازی کی ہے؟“

”کیا آپ کا گفتنی اداہ الگ نہیں ہے، سر؟“
”ہاں ہے۔ ٹھیک ہے،“ اُسے تمہارے حوالے کر دوں۔ کیا تم ہی لے جاؤ گے؟“

”نہیں، جناب!“ میں نے جواب دیا۔ ”وہ ذمہ دار است، میرے ہیڈ کوارٹر تک لے جایا جائے گا۔ دوسری صورت میں یہ ہو سکتا ہے کہ اُسے حالات میں بند کر دیا جائے، میں اپنے آدمی بھیج دوں گا، وہ اُسے لے جائیں گے۔“

”بہتر ہے۔“ وہ اُسے۔ ”تم اُسے اپنے آدمیوں کے ذریعے ہی منگو لینا۔“

میں وہاں سے نکل کر ٹیکسی کے ذریعے ہیڈ کوارٹر پہنچا تو ہنٹ پاتھ دے پر دوڑتا دکھائی دیا۔ مجھے دیکھ کر وہ رگ گیا۔ ”خیریت، دوست؟“ میں نے بے قراری سے پوچھا۔

”ماشرے کل کیا ہے چیف؟“ اُس نے بتایا۔ ”اُدھر آپ کے گھر کوئی گڑبڑ ہو گئی ہے۔“

میرا دل اچھل کر حلق میں آ گیا اور سانس سینے ہی میں گھٹ کر رہ گئی۔ لحظہ بھر کے لیے میرا جم بے توازن اور بے وزن چل گیا۔

”ہاں وہاں تھا۔“ اُس نے چیف کو رپورٹ دی۔ چیف ہمارے لیے تحریری پر قیام چھوڑ گئے ہیں کہ سب لوگ خرم سلطان کے گھر پہنچیں۔ میں نے آپ کے لیے کوئٹہ سے پوچھا، اُس نے بھی اچھی خبر نہیں دی۔ تب میں تنہا جا رہا تھا چیف! آپ کہاں تھے؟ کیا آپ جانتے ہیں اُدھر کیا گڑبڑ ہوئی ہے؟“

”نہیں۔۔۔“ میری آواز جیسے گہرے کنویں سے ابھری۔ ”اندھ چلو، ہمیں اسٹین گنوں کی ضرورت ہو گئی۔“

نہ جانے مجھ سے کون سی خطا ہو گئی تھی کہ قدرت کی سخت گرفت میں آ گیا تھا۔ سلو جیسا اذکار ساتھی واپس لے لیا گیا تھا، رشید جیسی تابعدار بہن، موت و حیات کی کش مکش میں مبتلا کر دی گئی تھی، ہارون جیسا دوست دشمن کی گرفت میں چلا گیا تھا، راضیہ جیسی مجھ سے میری وجہ سے اغوا کر لی گئی تھی اور اب جو ملی پر کوئی مصیبت نازل کر دی

گئی تھی۔ سب لوگوں کو جو دکھ بے تھے، کیا بنیاد میری ہی ذات نہ تھی ہاں صرف میری وجہ سے ہی سب سزا جھگڑتے رہتے۔ کیا قدرت اس لیے مجھے ملامت ہو گئی تھی کہ میرے ہاتھوں کچھ لوگ ہلاک ہو گئے تھے لیکن میں میدان جہاد میں تھا، جہاد کے دوران قتل ہونے والوں کا خون، مجاہد کے دامن کو داغ دار تو نہیں کیا کرتا۔ پھر کیا وجہ تھی؟ کیوں یہ سب کچھ ہوتا چلا جا رہا تھا؟ شاید اللہ تعالیٰ کو میری آزمائش مقصود تھی۔

”تم ٹیکسی یہاں لے آؤ، ہنٹ!“ میں نے اسلحہ خانے کا دروازہ کھولتے ہوئے کہا۔ ”ہم اسلحہ لے کر سڑکوں پر نہیں چل سکتے۔“

وہ ”یس چیف!“ کہتا ہوا پلٹ گیا۔

میں نے اندر داخل ہو کر دو اسٹین گنیں، فاضل میگزین اور کچھ دستی بم بیگ میں ڈالے۔ ٹیلی فون لاک تھا۔ میں ڈی۔ آئی۔ جی کو اطلاع دے کر جانا چاہتا تھا مگر وہ کراہیں، بند کر گیا تھا۔ یارن کی آواز سن کر باہر نکلا، اسلحہ خانے کو تالا لگایا۔ ہاں، وہ قفل تھا اور آہٹا تھا۔۔۔ اُس نے آتے ہی مجھ سے بیگ اور اسٹین گن لے لی۔

گاؤں میں داخل ہوتے ہی بغیر ٹوچے مجھے معلوم ہو گیا تھا، جو ملی سے اُٹھے دھوئیں نے سب کچھ بتا دیا تھا۔ میں نے دانتوں پر طانت جما کر سب کچھ نگل لیا۔ اگر میں دھواں دیکھ کر بھر جاتا تو وقت کی تیز رفتاری بوجھے بھی دھواں بنا کر فضا میں تحلیل کر دیتی۔

چونکہ ڈرائیو نے تنگ اندھنی گیٹوں میں داخل ہونے سے معذوری ظاہر کی تھی، اس لیے اسکول سے جو ملی تک پیدل ہی چلنا پڑا تھا۔ میرے ساتھ ہارن بھی تھا۔

”توہی میں دلاور کے گھر کے کچھوٹے پہنچا، دلاور دوڑتا ہوا سانسے آ گیا۔ اُس کے دونوں ہاتھ چلے ہوئے تھے اُن پر دوا لگی ہوئی تھی۔ وہ میرے نزدیک آ کر رگ گیا۔“

”بس مجھے اتنا بتا دو، دلاور!“ میں نے دھڑکی آواز میں پوچھا۔ ”گاؤں کا کوئی جانی نقصان تو نہیں ہوا؟“

”نہیں، جوہداری!“ اُس کی آواز میں آنسوؤں کی آمیزش تھی۔ ”صرف کرم بھائی۔۔۔“

میری کینٹین پر خون کی بھر پور ٹھوکری اور اسٹین گن کے بٹ پر میرے ہاتھوں کی گرفت سخت ہو گئی۔ میں نے بولنا چاہا۔۔۔ مگر آواز صرف غراہٹ بن کر ٹھکی جس میں الفاظ و معانی نہ تھے۔ میرا پورا جسم ہر طرف سے لگا تھا۔

”کسی نے غلے والے کمرے کو آگ لگائی اور باہر سے تمام دروازے بند کر گیا تھا۔“ علامت کے باہر پہرہ تھا۔ آپ کا ایک ساتھی بھی

میدان کالج کے طالب علم نے بوڑی درخت کا کان کے مالک سے پوچھا: ”آپ کے پاس کیونکر یہ سب تو تقریباً کس سال پرانی ہو گئی تھی؟“
”دکاندار نے جل کر جواب دیا۔“ ”جناب میرا خیال ہے انسانی جسم کی کمیٹی ہڈی کا اضافہ نہیں ہوا۔“

اندھ موجود تھا۔ میں چلا تو دلاور بھی ساتھ ساتھ چلتے ہوئے بتانے لگا۔ ”پہرے داروں کے بیانات نے گاؤں میں افواہیں پھیلا دی ہیں۔ ایک پہرے دار نے آگ لگنے سے اُدھا گھنٹہ قبل زینت کو جو ملی کے اندر گھومتے پھرتے دیکھا تھا، لوگ کہہ رہے ہیں کہ زینت نے خود آگ لگائی ہے۔“

”بھاس۔۔۔“ میرے حلق سے پھر دہرا ابھری۔
”ہاں، ہم جانتے ہیں یہ جھوٹ ہے۔۔۔ مگر نمبر دار بھی یہی کہہ رہا ہے۔“

”میں۔۔۔ میں اُن لوگوں کی زبانیں کھینچ لوں گا۔“
جو ملی کے باہر ساتوں گاؤں کے لوگ جمع تھے کچھ مجھے جانتے تھے، جو جانتے تھے، وہ میری ماہ میں چلے آئے تھے۔ عجیب سی پہل اور سرگوشیوں کا طوفان اُٹھ کھڑا ہوا تھا۔ میں کس کس سے بتا، کس کس کی بات سننا، کیسے جواب دیتا۔ یہی وجہ رہی تھی کہ میں ملک کی سید میں بڑھتا گیا تھا اور جو لوگ پُرسا دینے، کچھ کہنے، کچھ سننے کے لیے میرے پاس آ گئے تھے، وہ میرے کمرے کی دروازوں سے گھبرا کر پیچھے ہٹنے لگے تھے۔

اندھ بھی تل دھرنے کی جگہ نہ تھی۔ یقیناً ساتوں گاؤں کی عورتیں بھی جو ملی میں آئی ہوئی تھیں۔ بڑے دالان میں گہرا چاہا ہوا تھا۔ شاید اندھ بھی خبر پڑ چکی تھی۔ عورتیں ایڑیاں اُٹھا اُٹھا کر بڑے دروازے کی جانب دیکھ رہی تھیں۔ میں نے پلٹ کر دیکھا، ہنٹ میرے ساتھ لگا ہوا تھا۔ ”دلاور! یہاں کو اپنے ساتھ باہر لے جاؤ۔“ پھر میں نے ہنٹ کو مخاطب کیا۔ ”ہنٹ! اب اسلحہ کی ضرورت نہیں رہی۔ یہ لو، میری گن اور دلاور کے ساتھ باہر پھرو۔“ اُس نے ڈبڈبائی آنکھوں سے میری طرف دیکھا اور پلٹ گیا۔

عورتوں نے میرے لیے ایک تنگ سی دلاز بنا دی تھی۔ دونوں طرف عورتیں سر جھکائے کھڑی تھیں۔ میں اس تنگ دلازلی سے گزرتا

جو نبی واللہ میں داخل ہوا، عابدہ نہ جانے کہاں سے نکل کر چائیک
میرے سامنے آگئی۔

"خرم... خرم..." اس کی آواز جھجھک کر ڈوب گئی۔ میں ناس کے بچے ہالوں اور برآمدہ سر پر دوپٹہ ڈال کر اس کے شانے تھپکے اور آگے بڑھ گیا۔ اماں بی میت کے سر پر گری پر بیٹھی قرآن کریم کی تلاوت کر رہی تھیں۔ دوسرے پاٹے سے زینت لگی بیٹھی تھی۔ اس کے سامنے بھی مقدس کتاب کھلی ہوئی تھی لیکن وہ مجھے دیکھ رہی تھی۔ میں نے جھک کر بھائی جان کے چہرے سے چادر ہٹائی اور پھر میکا کی انداز میں اوپر اٹھ گیا۔ وہاں چہرے کی بجائے ایک بچھا ہوا کوئلہ تھا۔

"ایک اور قرآن لے آؤ۔" اماں بی نے سپاٹ آواز میں کہا۔ "خرم سلطان! رونے والے بہت ہیں۔ رونے کے لیے ایک گھر پڑی ہے۔ میرے بچے کو آنسوؤں اور آہ و بکا کی ضرورت نہیں۔ یہاں میرے قریب بیٹھ کر پڑھو۔"

میری ٹانگوں سے جان بکلی گئی تھی۔ میں گھٹنے موڑ کر اماں بی کے پیروں میں بیٹھ گیا اور پھر میری چمکی بندھ گئی۔ میں اماں بی کی ٹانگوں سے پشاور تار اور میرے کانوں میں کلام الہی کی آواز آتی رہی۔ کسی نے میرے سر پر ہاتھ پھیرا۔ میں نے چہرہ اٹھا کر دیکھا۔ وہ عابدہ کی ماں تھیں۔

"اٹھو، میرے بچے! بھائی کی روح کے لیے قرآن پڑھو۔" انھوں نے میرا جھکنا ہٹا کر دوپٹے سے صاف کیا پھر میری پیشانی پر چوم کر مجھے اٹھانے لگیں۔ عابدہ، قرآن کریم لیے کھڑی تھی۔ میں نے گری پر بیٹھ کر کتاب مقدس کو ہاتھوں میں لے کر بوسہ دیا اور تلاوت کرنے لگا۔ ہونکہ میری تلاش جاری تھی اور کوئی حوصلہ آخر خبر نہ تھی۔ اس لیے جنازے کا وقت چھ بجے شام رکھا گیا تھا۔ چار بجے، اماں بی نے ہی مجھے باہر جاکر انتظامات کی دیکھ بھال کرنے کا حکم دیا تھا۔ جب میں باہر نکلا تو مجھے بتایا گیا کہ نمبردار کی رپورٹ پر پولیس آئی ہے۔ پولیس کے درخت کے نیچے، گریوں اور چارپائیوں پر پولیس گھر بیٹھی ہوئی تھی۔ ایک سب انسپکٹر اور کچھ دوسرے جنمے دار تھے۔ "جوہدری صاحب! سب انسپکٹر بولا۔" مجھے افسوس ہے کہ آپ کے بھائی آپ سے جدا ہو گئے ہیں۔

"شکریہ، انسپکٹر!" میں نے گری پر بیٹھتے ہوئے جواب دیا۔ "اللہ کی رضا ہی تھی۔"

"نمبردار صاحب! انسپکٹر نے لوگوں کی جانب دیکھ کر کہا: سب کو یہاں سے ہٹا دیں۔"

نمبردار نے اٹھ کر تقریر کرنے والے انداز میں کہا۔ "حضرات... پولیس اب ضروری کارروائی کرنا چاہتی ہے۔ براہ کرم! آپ لوگ یہاں سے ہٹ جائیں جس کی ضرورت ہوگی، اسے ہٹالیا جائے گا۔"

"ہاں تو، خرم صاحب! انسپکٹر نے اپنے مخصوص انداز میں کہا۔ آپ اس جلوسے پر روشنی ڈالیں گے؟"

"یہ قدرتی... میرا مطلب ہے، اتفاقیہ حادثہ ہے، انسپکٹر..." میں نے سنبھل کر کہا۔ "نمبردار نے اپنا فرض ادا کیا ہے۔ میں ان کا اور آپ لوگوں کا ممنون ہوں۔"

"کیا واقعی اتفاقیہ حادثہ تھا؟ انسپکٹر نے معنی خیز انداز میں نمبردار کی طرف دیکھا۔

"جی ہاں! ہمارا کوئی دشمن نہیں اور نہ ہی ہمیں کسی پر شک ہے" میں نے سخت آواز میں جواب دیا۔ "نمبردار صاحب نے جلد بازی سے کام لیا ہے ورنہ میں خود حاضری دیتا اور آپ کو زحمت نہ ہوتی۔"

"آپ اپنے مرحوم بھائی اور ان کی بیگم..."

"نہیں، انسپکٹر صاحب! میں نے اس کی بات درمیان سے کھینچ دی۔ اگر ایسا کسی نے کہا ہے تو جھوٹ ہے۔ اقل تو کوئی ایسی بات نہیں تھی، اگر ہوتی بھی تو کوئی بھی بیوی ایک ایسے شوہر کو قتل نہیں کر سکتی جو چند دنوں کا بھانجا ہو۔ کرم بھائی بستر مرگ پر تھے۔"

"اگر آپ کا کوئی دشمن نہیں تو یہ سادہ لباس والے یہاں کیا کرتے ہیں؟ اس نے میری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے سوال کیا۔ "مشرچہدری! گو میں اس تھلنے میں نیا ہوں لیکن پولیس میں بہت پرکھا ہوں۔ میرا مقصد آپ کو پریشان کرنا نہیں۔ میں آپ کی مدد اور قانون کی بالادستی قائم کرنے آیا ہوں۔ اگر آگ چھلے سے نکل کر خود بخود گودام تک چلی گئی تھی تو پھر باہر سے کنڈیاں کون چڑھا گیا تھا؟"

میں نے اس کے سوالوں کا کوئی جواب نہ دیا تو اس کی مونچھوں میں مسکراہٹ کے سپو لیے رہنے لگے۔ "سادہ لباس والے نے تھوڑی دیر پہلے زینت بیگم کو حویلی میں پھنکے دیکھا تھا۔" اس نے مسکراہٹ کو زبان دی۔ "واقعات اور شواہد اصرار ہی اشارہ کرتے ہیں جھجھکاری توجہ دلائی گئی ہے۔ کیا میں زینت بیگم سے چند سوالات کر سکتا ہوں؟"

"ہاں ضرور..." میں نے کہا۔ "لیکن فی الحال نہیں، تدفین کے بعد۔"

"نہیں! جوہدری خرم سلطان! وہ آگے جھک آیا۔ "ہماری چھوٹی کوئی نظر رکھیں۔ اگر ثابت ہو گیا تو پوسٹ مارٹم بھی ضروری ہو جائے گا۔ لہذا میں لاش دفن کرنے کی اجازت نہیں دے گا۔"

میرے اندر سے گڑگڑاہٹ ابھری لیکن وقت کا تقاضا دوسرا تھا ورنہ میں اس کی مسکراتی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہتا کہ تمہارا باپ بھی اجازت دے گا۔

"میرے ساتھ آئیں، انسپکٹر! میں نے اٹھتے ہوئے کہا۔ میں یہ باتیں بعد میں بتا لیکن آپ کے فیصلے نے مجھے مجبور کر دیا ہے۔"

"یہ ضابطے کے خلاف ہے، جناب! نمبردار نے اٹھ کر احتجاج کیا۔ وہ میرے سامنے تھا۔ اچانک نہ جانے مجھے کیا ہو گیا کہ میں نے ایک قدم آگے بڑھ کر سیدھی پھیلی اس کی ناک پر ماری۔ متحیر شخص لڑکھڑاتا ہوا گریوں پر آٹھ گیا۔

"اب اٹھ کر احتجاج کرو۔" میں چٹکارا اور انسپکٹر نے فوراً اپنا ریوڑ نکال لیا۔ "نہیں، انسپکٹر! میں نے ہاتھ اٹھا کر سر دواوا میں کہا۔ "حقائق کا سلسلہ دراز نہ کرو۔ میرے ساتھ آؤ۔" میں نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے گھسیٹ لیا۔

نمبردار کے کچھ حمایتی بڑبڑاتے، کچھ غراتے میری طرف بڑھے جن کو پولیس گارڈوں نے بالکلوں کی زد پر رکھ کر روک لیا۔ نمبردار سید اکبر ہمارا سیاسی مخالف ہی نہ تھا بلکہ دلاور کا چچا بھی تھا اور دلاور خان کا باپ میرے ہاتھوں ہلاک ہوا تھا۔ دلاور کو تو میں نے ڈاکو مشرعی ثبوت سے مطمئن کر دیا تھا لیکن سید اکبر کے دل میں دیرینہ عداوت اور نئی کدورت زندہ تھی اور اس کے لیے انتقام لینے کا یہ سہرا موقع تھا۔ "پہلے یہ دیکھ لو۔" میں نے اپنا مخصوص شناختی کارڈ، انسپکٹر کے سامنے کر دیا۔ "لیکن صرف آنکھیں استعمال کرو گے، زبان آج ہی نہیں ہمیشہ بند رہے گی ورنہ تمہارے کندھے پر لگے ہوئے یہ دو پھول ایسے غائب ہو جائیں گے جیسے حرف غلط کو سیٹ سے مٹا دیا جاتا ہے۔" اس کی اینٹیل خود بخود ہی جڑو گئی تھیں۔ میں نے اس سے کارڈ لے کر حبیب میں رکھ لیا۔

"مم... مجھے معاف کر دیجئے، جناب! اس کا اڑا ہوا جسم ایک دم ڈھیلا پڑ گیا اور مونچھیں سرنگوں ہو گئیں۔ نمبردار نے مجھے مس گائیڈ کیا ہے۔"

"اب سنو، مجھے شک ہی نہیں بلکہ یقین ہے کہ آگ لگنے میں نمبردار سید اکبر کا ہاتھ ہے لیکن یہ صرف تمہاری اطلاع کے لیے ہے... میں رپورٹ نہیں کر رہا ہوں کیونکہ یہ صرف ایک چھوٹی سی گندی پھلی ہے جبکہ میں مگر مجھ تک پہنچنا چاہتا ہوں۔" تھا نے جا کر مجھیں "جوہدری مظفر کیس کا فائل پڑھنا ہوگا۔"

"اوہ... جوہدری مظفر... ہاں جناب! مجھے معلوم ہے۔ کیا وہ آپ ہی ہیں؟"

"ہاں، انسپکٹر! میں نے اثبات میں گردن ہلاتی۔ "بس تم گواہوں کے بیانات دائری میں لکھ لو اور جوہدری مظفر کا نام آنا چاہیے۔"

"کیا میں نمبردار سید اکبر کو گرفتار کر لوں، جناب؟"

"نہیں..." میں نے دقت لہجے میں کہا۔ "اس طرح مگر مجھے گہرائی میں چلا جائے گا۔"

"بہتر، جناب! وہ گردن جھکائے میرے پیچھے پیچھے چلتا ہوا... گریوں تک پہنچا تو لوگ حیران تھے کہ میں نے کیا کیا ماجرا ہو گیا ہے، ایک گرجا برستا بادل دھواں بن کر فضا میں تحلیل ہو گیا ہے۔

میں نے اشارے سے دلاور خان کو بلایا، وہ بھی ان لوگوں میں شامل تھا جو نمبردار کی حمایت میں بڑھے تھے۔ دلاور میری طرف آنے لگا تو ایک سپاہی نے اسے روک لیا۔ "ان کو آنے دو۔" انسپکٹر نے ہاتھ ہلاتے ہوئے حکم دیا۔

دلاور کے چہرے پر کبیدگی ہو رہی تھی۔ اس کے تعلقات گو اپنے چچا سے کشیدہ تھے لیکن سات گاؤں کے لوگوں کی موجودگی میں جو کچھ ہوا تھا، وہ دلاور خان کی برہمی کے لیے کافی تھا۔

"دلاور خان! میں نے مذمت سے کہا۔ "میں تم سے شرمندہ ہوں، مجھے معاف کر دینا۔"

"جوہدری..." اس کی آواز تھر تھرنے لگی۔ "تم نے مجھے بڑی آزمائش میں ڈال دیا ہے، لوگ مجھے طعنے دے رہے ہیں، وہ میرا چچا ہے، خرم سلطان!"

"چلو، میں لوگوں کے سامنے اس سے معافی مانگ لیتا ہوں۔" میں نے دلاور کا بازو پکڑ لیا۔ "تمہاری دوستی مجھے بے حد عزیز ہے، دلاور! تمہارا چچا کون ہے اور اس نے آج کے دن میرے لیے کیا کچھ کیا ہے؟ تم جانتے ہو، پھر بھی میں تمہاری خاطر اس سے معافی مانگ لوں گا۔"

"بس، ٹھیک ہے، خرم! میرا دل صاف ہو گیا ہے۔" دلاور خان نے مجھے مذمت سے بچا لیا ورنہ نمبردار سید اکبر سے معافی مانگنا شکست تسلیم کرنے کے مترادف ہوتا۔

"پھر جاؤ، ان مائل بر شرارت لوگوں کو یہاں سے ہٹا لے جاؤ۔" میں نے کہا تو دلاور نے پلٹ کر انجمن کی طرف دیکھا جو ٹکڑیوں میں بٹے، باتیں کر رہے تھے۔

"ہم یہاں موجود ہیں گے، جناب! انسپکٹر بولا۔ اگر کسی نے شرارت کی تو ہم اپنا فرض ادا کریں گے۔ آپ! امینان سے تدفین کی تیاری کریں۔"

میں تھوڑی دیر تعزیت کرنے والوں کے درمیان بیٹھا رہا... پھر غسل میت کا اعلان ہوا تو میں اندر چلا گیا۔ حسبِ رواج میت کو

غسل بھی دینا تھا اور میں غسل کے شرعی ارکان سے یکسر ناواقف تھا، اس لیے میری مدد دلاؤ کر رہا تھا۔

اس لیے میں مجھے بیگن، کونز اور ہنٹ کہیں دکھائی نہ دیے تھے، انھیں میرے نزدیک ہی رہنا چاہیے تھا میں نے جنازہ اٹھانے وقت بھی ان لوگوں کو تلاش کیا تھا۔

”میرے ساتھی کہاں ہیں دلاور خان؟“

”وہ تینوں قبرستان میں ہیں۔ دلاور نے بتایا۔“ پہلے وہ شہر گئے تھے، پھولوں کی چاندلے لائے۔

نماز جنازہ نہ پڑھنے والوں میں وہ تینوں بھی شامل تھے متوجہوں کی نماز جنازہ پڑھی گئی، موزن عزیمتیں چکر لگا کر قبر دیکھنے آئی تھیں، اس لیے کچھ وقت کے لیے میت کو روک لیا گیا تھا۔ ویسے بھی آخری دیدار کرنے والے بہت تھے۔ تین قطاروں میں لوگ کھڑے ہوئے تھے۔

قریباً چار پارٹیوں نے وقفے وقفے سے دعا مانگی اور تعزیت کی تھی۔ اس طرح قبرستان ہی میں شام گہری ہو گئی تھی۔ انسپکٹر اس کی گارڈ اور ساتھ لباس والے میرے قریب ہی مستعد کھڑے تھے۔

کیونکہ میرا سید گبراہ اس کے حمایتیوں نے نماز جنازہ کا بائیکاٹ کرنے کا اعلان کیا تھا، اس لیے کسی بھی ناخوش گوار کارروائی کا امکان تھا۔ دلاور خان اس میں نے ادھر ادھر دیکھ کر کہا۔ ”میرے ساتھیوں کو بلا لاؤ۔“

دلاور خان، ان کو تلاش کر کے لے آیا۔ اندھیرے کی وجہ سے میں ان کے چہروں کے تاثرات تو نہ دیکھ سکا لیکن جب بیگن بولا۔ تو اس کی آواز میں آنسو گھلے ہوئے تھے۔

”ایسا ہوتا تھا ماسٹر... میں آپ یا کوئی اور اس تحریر کو نہیں بدل سکتا تھا۔ میں نے بھرتی ہوئی آوازیں کہا۔ میں آج رات واپس نہیں جاسکتا۔ میرے گھر والوں کو میری ضرورت ہے۔ آپ سیدھے ایس۔ پی صاحب کے پاس جائیں گے اور ان سے ایک کوئی وصول کریں گے۔ اس سے صرف یہ آگولڈ ہے کہ اس کے ساتھی کہاں ہیں۔ شاید آپ کو معلوم نہیں کہ ملک نوانکے آدمی جو علاقہ غیر سے بھیجے گئے ہیں، بارون اور مسٹر حسن کی بیٹی کو اغوا کر کے لے گئے ہیں۔ ان کا ایک ساتھی، پولیس کسٹی میں ہے۔ وہی امتیہ کی ایک کرن ہے۔ میں شاید کل کسی وقت اس کوں گا۔ آپ لوگ صرف انٹروگیشن تک محدود رہیں گے۔“

”اگر وہ لوگ شہر میں ہوں تو؟“ بیگن نے پوچھا۔

”تو آپ مناسب کارروائی کریں گے۔“

”آپ نے ایک بات پر غور نہیں کیا، چیف؟“ ہارکن جو میرے

بائیں شانے سے لگا چل رہا تھا، بول پڑا۔

”کون سی بات پیارے؟“ میں نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر پوچھا۔

”وہ آپ کو یہاں بٹوانا چاہتا تھا، چیف؟“ ہارکن نام لیے بغیر بولا اور بیگن کو چلتے چلتے جیسے غور کر رہی۔ ”وہ اپنے مقصد میں یہاں تک تو کامیاب ہو گیا ہے لیکن دوسرا قدم وہ کب اٹھائے گا، کچھ کہنا قبل از وقت ہوگا۔ کیا آپ کا یہاں رہنا ناگزیر ہے چیف؟“

”ہاں، دوست! بے حد ضروری ہے۔“ میں نے کہا۔ ”بلکہ دوا ہوا مجھے چالیس دن یہاں بیٹھنا چاہیے۔ چالیس روز تک آخرت کرنے والے آئیں گے لیکن میں کم از کم دن میں تمھارے ساتھ رہا کروں گا اور رات کو لوٹ آیا کروں گا۔“

”پھر تو اس نے کامیاب چال مانی ہے۔“ بیگن بڑبڑایا۔ ”نہیں! چیف! ہم رواجوں کو اور خون نہیں دے سکتے۔ آپ کو ہلکے ساتھ چلنا ہوگا۔ اگر آپ کا یہاں رہنا ضروری ہے تو ہارکن آپ کے ساتھ ہے گا، صرف آج رات۔ کل آپ کو ادھر آنا ہوگا۔“

”میں نے آپ کی بات من لی ہے، ماسٹر! میں نے دہکتی آواز میں کہا۔ ”میں صرف آج رات یہاں اس کا انتظار کروں گا۔ اگر وہ یہاں نہ آیا تو پھر اسے کہیں باہر یا اپنے گھر میں میرا استقبال کرنا ہوگا۔ میں چچا نہیں ہوں دوستو! ادا تم لوگ بھی مجھے جواب دہ نہیں بیٹھے، کاشورہ نہیں دو گے۔ اگر اس بار میں دیک گیا تو وہ باگز بول ہر رات وہاں سے کچھ نہ کچھ لے جانے لگے گا۔ میں اس کے دانت توڑنا چاہتا ہوں۔“

”ہارکن...“ بیگن کی حکیمانہ ابھری۔ ”تم یہاں رہو گے...“

”کہاں بن کر نہیں بلکہ باڈی گارڈ کی فیس داری نبھائو گے۔ ہم پہلے ہی بہت کچھ گنوا چکے ہیں۔“

”نہیں ماسٹر! میں نے بھی کرخت سمجھیں کہا۔“ ہارکن کی ضرورت اُدھر ہے۔ میں پہلے ہی ایک قسمی جان اپنی ذات کی پھینٹ چڑھا چکا ہوں۔ مجھے ہانڈوں کا اسوس نہیں صرف فکر ہے کیونکہ وہ فرائض کی بجائے آدمی کر رہا تھا۔ مجھے تو سلوا کا دکھ ہے اسے میں نے۔“

”نہیں چیف؟“ بیگن میری بات کاٹ کر بولا۔ ”سلوا بھی آن ڈیوٹی تھا۔ رنگ باز خان آپ کا سہرا نہ تھا۔ ہم یہاں ہوں... یا وہاں ہر جگہ آن ڈیوٹی ہوتے ہیں۔ آپ کی ذات سے متعلق ہر شے آپ ہیں اور آپ کی حفاظت ہمارے فرائض میں شامل ہے، آپ ہمارا مرکز ہیں۔ مرکز کی حفاظت فوج ہی کیا کرتی ہے کہ مرکز کی سلامتی فوج کے وجود کی ضامن ہوتی ہے۔ ہم آپ کو نہیں بلکہ اس مشن

کو اور خود کو محفوظ کر رہے ہیں۔ لہذا میرا علم ہے کیونکہ آپ ان ہیوں میں بحیثیت قائم مقام چیف، ہارکن کو حکم دے رہا ہوں۔“

”بہتر ماسٹر! میں نے ہارمنٹے ہوئے کہا۔ بیگن نے وزنی دلائل سے اپنی بات منوالی تھی۔ ”ہارکن میرے ساتھ رہے گا۔ آپ ہنٹ کے ساتھ واپس چلے جائیں۔ اگر کل بھی مجھے فرصت نہ ملی... تو آپ خان کی بیٹیوں کو محتاط راستے سے کسی دوسری محفوظ جگہ منتقل کر دیجیے گا۔ ملک نواز میری بدقسمتی رگ پر نشتر چلانے سے دریغ نہیں کرے گا اور جمع رشیدہ کی صحت کی بڑھت مجھے بذریعہ فوج ٹرانسمیٹر دیں گے۔ ہم اسے اچھی حالت میں نہیں بھجور کر آئے تھے۔ ضرورت محسوس کریں تو اسے کسی بہتر کلینک میں شفٹ کر دیں۔ ہاں اسے اس حادثے کی خبر نہیں ہونی چاہیے۔“

اس کوں تک وہ دونوں میرے ساتھ ساتھ چلتے رہے تھے پھر وہ خاموشی سے الگ ہو گئے تھے۔ مقصد یہی تھا کہ اگر کوئی آنکھ نگران ہے تو اسے یہ تاثر دیا جائے کہ خرم سلطان کے ساتھی رات یہاں ہی قیام کریں گے۔

بیگن نے ہارکن کو باڈی گارڈ مقرر کیا تھا اور میں نے اس کی ضد اور محنت کے سامنے سر بھی خم کر دیا تھا لیکن وہ مغرب زادہ، مشرقی روایات سے ناواقف تھا۔ میں ہارکن کو زمان خانے تک کیسے لے جاسکتا تھا، مجھے ایک غم زدہ ماں کو سہارا دینا تھا، بد نصیب زینت کی اجڑی ہوئی مانگ پر دست شفقت رکھنا تھا، باہر سے پڑے کو آئے ہوئے عزیزوں کے پاس بیٹھنا تھا۔

”ہارکن...“ میں نے مردانے میں پہنچ کر کہا۔ ”تم میری فکر نہ کرنا۔ میں اندر سو گوار خواتین کے پاس جا رہا ہوں۔“

”بہتر چیف!“ ہارکن نے سر جھکا لیا۔

میں بے جان مانگوں پر سنسناتا ہوا جسم اٹھا کر راہداریاں طے کرتا جب اٹل لی کے کمرے میں داخل ہوا تو وہاں پندرہ بیس بزرگ خواتین اماں بی کو گھیرے دری پر بیٹھی ہوئی تھیں۔ کسی کے بتانے پر اماں بی نے چہرہ اٹھا کر میری جانب دیکھا۔ خواتین نے راستہ بنا دیا تھا۔ میں نہ جانے کیسے اُن تک گیا۔ اُن کا دایاں ہاتھ اٹھا۔ میں بچکا اور پھر اُن کی گود میں گر گیا۔ میں ہلک ہلک کر رونے لگا تو ساری خواتین نے جی رونے شروع کر دیا۔ کچھ بزرگ رہی تھیں اور کچھ نے بین شروع کر دیے تھے لیکن اماں بی صرف مجھے تھپک رہی تھیں، ایسے ہی جیسے وہ ہماری کے وہاں عموماً مجھے سنانے کے لیے تھپک کرتی تھیں۔ مجھے بتایا گیا تھا کہ اماں بی نے باجی کی لاش پر بھی اسی طرح سے لور مگر کاٹھا ہوا کیا تھا۔ وہ عورت ہو کر حوصلہ داری تھیں اور میں مرد ہو کر بچھ گیا تھا،

شاید اس لیے کہ مجھ میں احساس جرم سرایت کر گیا تھا۔ تمام مصائب کا ذمے دار میں ہی تو تھا۔ میری ہی وجہ سے بھری پھری ہوئی ویران اور سوگوار ہو گئی تھی۔

”اٹھو، خرم سلطان! اماں بی میرے چہرے پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولیں۔ بد نصیب بہن کے سر پر ہاتھ رکھو۔ وہ بن ماں باپ کی بچی رات سے چپ ہے، اسے رونا چاہیے۔ اسے احساس دلاؤ، خرم سلطان!“

کوئی خاتون میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے دوسرے کمرے میں لے گئیں۔ ادھر بھی کمرہ بھرا ہوا تھا، سب نوجوان لڑکیاں ہی تھیں۔ مجھے دیکھ کر سب کمرے سے نکل گئیں۔ زینت، فرشی دری پر گاؤں کیسے کے پہلے بیٹھی ہوئی تھی۔ اس رات بھی میں نے اسے اسی کمرے میں اسی جگہ بیٹھے دیکھا تھا، جس رات اسے بائیں ہاتھ یا جا رہا تھا۔ اس رات اس کے ہاتھوں پر چندی پچی ہوئی تھی۔ کمرے میں ڈھولک بج رہی تھی اور اس کا سر جھکا ہوا تھا۔

رات بھی تھی، کمرہ اور جگہ وہی تھی، لڑکی بھی وہی تھی لیکن کمرے کی فضا بدلی ہوئی تھی۔ ڈھولک کی تھاپ، ہلکی ہلکی ہنسی... مگر گوشیاں کچھ بھی نہ تھا۔ زینت ویران ویران آنکھوں سے سامنے دیوار کو گھور رہی تھی، اس کے ہاتھ بے جان سے انداز میں گود میں پڑے تھے، کلائیوں سے ٹوڑیاں چھین لی گئی تھیں، ہنسی اور سرگوشیوں کی بجائے کمرے میں سکسیاں گونج رہی تھیں۔

صرف میں تھا، چکیاں لیتی عابدہ تھی اور چپ چاپ بل پتھر زینت تھی۔ میں نے گھبراہٹ سے گولا دو چار بار کوشش کر کے بگن لیا۔

”جانی جان کہاں ہیں زینت؟“ میں گھٹنے موڑ کر اس کے سامنے ڈھکے گیا۔ زینت کی ساکت ہلکیوں میں تھر تھراہٹ پیدا ہوئی۔ ”میں جانی جان سے کچھ کہنے آیا ہوں زینت! تم نے مجھے بلایا تھا، نا؟“

”خرم...“ زینت چیخی اور پھر مجھ سے لپٹ گئی۔ وہ روئی اور اس قدر روئی کہ جب عابدہ نے اسے سنبھال کر الگ کیا تو وہ اس کی ہانہوں میں جھول گئی۔

”ٹھیک ہے، عابدہ!“ میں نے کہا۔ ”اسے آرام کی ضرورت ہے۔“

”ادھ، خرم! یہ بے ہوش ہو گئی ہے۔“ عابدہ نے روتے ہوئے اسے سنبھال کر کہا۔

”نیند بھی ایک قسم کی بے ہوشی ہی ہوتی ہے۔ اسے سونے دو اور تم مجھے بتاؤ، جانی جان ہی کیوں آگ کی لپیٹ میں آئے اور انھیں بچایا کیوں نہیں گیا؟“

”تھیں کسی نے نہیں بتایا، خرم؟“ عابدہ نے آنسو پونچھتے

ہوئے کہا۔

”نہیں مجھے فرصت ہی کہاں تھی؟“

”بہلی دجہ تو ظاہر ہے۔“ عابدہ بولنے لگی۔ ”گودام بھائی جان کے کمرے کے ساتھ تھا۔“

”زینت کہاں تھی؟“

”اُسے کئی دنوں سے اماں بی کے کمرے میں سلایا جا رہا تھا۔۔۔ کیونکہ اماں بی کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی۔“

”کیا تمہارا کمرہ بھی باہر سے بند کر دیا گیا تھا؟“

”نہیں، اگر ایسا ہوتا تو ہم میں سے کوئی زندہ نہ رہتا اور حویلی راکھ بن کر بھائی جانی جان نے زینت کی آواز سنی اور انھوں نے مجھے جگایا۔ میں بندوق لے کر باہر آئی تو گودام سے دھواں اور شعلے اُٹھتے دکھائی دیے۔ میں دوڑتی ہوئی اماں بی کے کمرے کی طرف گئی۔ اندر

زینت بیچ رہی تھی۔ میں نے باہر سے دروازہ کھولا اور ہم دونوں۔۔۔ بھائی جان کے کمرے کی طرف بھاگیں۔ میں نے زور زور سے دروازے پر دستک دی۔ زینت نے اُن کو پکایا۔ اندر سے بھائی جان نے صرف ایک دفعہ کھالتے ہوئے جواب دیا تھا۔ انھوں نے کہا تھا۔

”واپس چلی جاؤ۔ میں سکون کی نیند سونا چاہتا ہوں۔ پھر زینت نے بدو کر اُن سے دروازہ کھولنے کو کہا لیکن انھوں نے چپ سا دھ

لی تھی۔ ہم نے دروازہ توڑنا شروع کر دیا۔ ہماری چیخ و پکار سن کر مردانے سے آپ کا ساتھی بھی اُگیا۔ اُسی نے اپنے جسم کی ٹکڑوں سے دروازہ توڑا تھا۔ پھر جب ہم اندر گئے تو بھائی جان جل چکے تھے۔“

”مجھے بتایا گیا ہے کہ زینت اُگ گئے سے اُدھا گھٹنہ قبل باہر دیکھی گئی تھی۔“

”ہاں، ہم باری باری راؤنڈ لگا رہی تھیں۔“ عابدہ نے زینت کی جانب دیکھا۔ ”جب کوئی باہر آیا تب بھی زینت جاگ رہی تھی۔ اُس نے سوچا کہ کرم ہوں گے، وہ ہمیشہ اُسے باہر نکلنے سے منع کرتے تھے۔“

”کیا بھائی جان واقعی زندگی سے سزا ہو گئے تھے؟“

”ہاں خرم، معاف کرنا، انھوں نے اپنی جان آپلی ہے۔۔۔“ عابدہ نگاہیں جھکا کر بولی۔ ”اگر وہ چاہتے تو باہر نکل آتے۔ ہم نے بہت مشقت سمجھت کی تھی۔“

زینت کے حلق سے خرخراہٹ اُبھری تو عابدہ نے اس کا سر اٹھا کر اپنی گود میں رکھ لیا اور اُس کے گال تھپتھپانے لگی۔۔۔ زینت نے آنکھیں کھول کر حیران نگاہوں سے چاروں طرف دیکھا۔

”جاؤ، عابدہ، پانی لے آؤ۔“ میں نے عابدہ کی آغوش سے زینت کا سر اٹھایا اور اُسے سہارا دے کر بٹھا دیا۔ ”ہم دونوں تو اماں بی سے

بھی کم حوصلہ ثابت ہوئے ہیں۔ وہ بوڑھی ماں ہو کر خرم اور میر کی چٹان بنی ہوئی ہیں۔۔۔ بھائی جان، آج نہیں تو کون ہم سے رخصت ہو جاتے۔ جانے والے جہان کو میزبان کب تک روک سکتے ہیں۔۔۔ پھر زندگی کی سانسیں تو اوپر سے گن گن کر دی جاتی ہیں۔ اُن کو جانا تھا، بس چلے گئے۔“

”کہاں سے بول رہے ہو، خرم سلطان؟“ زینت نے طنز سے لہجے میں کہا۔

”کیا تم نے نہیں کہا تھا کہ وہ ماں بہ سفر ہیں؟“

”کاش، تم چلے آتے۔ زینت سسک کر بولی۔ ”مگر تم آجالتے، خرم، تو ہم اُن کو مٹا لیتے۔ وہ ہم دونوں سے روٹھ گئے تھے، اسی ناراضگی میں چلے گئے۔۔۔ مرنا تو سب کو ہے لیکن جو ناراض ہو کر چلے جائیں، اُن کا دُکھ سوا ہوتا ہے۔“

”نہیں، زینت! میں نے پُر زور انداز میں تردید کرتے ہوئے کہا۔ ”ہم دونوں انھیں بے حد عزیز تھے۔ وہ ہمیں خوش دیکھنا چاہتے تھے۔ وہ ناراض نہیں گئے بلکہ سکون سے گردانہ ہوئے ہیں۔۔۔ میری بات سمجھنے کی کوشش کرو۔“

”تم۔۔۔ تم۔۔۔ وہ دانت پیس کر خرائی۔ تم بھگاس کرتے ہو۔ دفع ہو جاؤ یہاں سے۔“

”آؤ، تمہیں اماں بی نے بلایا ہے۔“ میں نے اُس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ ”تو اُس نے میرا ہاتھ جھٹک دیا اور ہاتھوں میں چہرہ چھپا کر پکڑنے لگی۔ میں اٹھا اور چپ چاپ وہاں سے نکل آیا۔“

رات بارہ بجے، جب سب لوگ سو گئے تو میں اماں بی کے پہلو میں کچھ چارپائی سے سرک کر بیٹھ اُترا۔ دوسری طرف فرشی بستر پر زینت اور عابدہ محو خواب تھیں۔ میں نے جوتے ہاتھ میں اُٹھائے اور گریہ پاجنتا ہوا کمرے سے نکل آیا۔ ہمارے میں پہنچ کر میں نے جوتے پہنے۔ ابھی میں ہمارے کی میز میاں ہی اُتر رہا تھا کہ قدموں کی چاپ سنائی دی۔ پوری حویلی پر سوگوار تاریکی اور سناٹا طاری تھا۔ میں خالی ہاتھ تھا۔ میرا دلور اور گس ہارکن کے پاس تھے۔

اندھیرے میں کوئی چل رہا تھا۔ میں اُسی خاموشی سے۔۔۔ تین میز میاں واپس اوپر چڑھا اور سنگی ستون کی آڑ میں ہو کر اندھیرے میں دیکھنے لگا۔

ایک سایہ مولشی خانے کی طرف سے آہستہ آہستہ آ رہا تھا۔ میرا جسم عجیب سی سنسنی کی آڑ میں آگیا تھا۔ سایہ بڑے ہی محتاط انداز میں رُک رُک کر بڑھ رہا تھا۔

خوں خوں فاصلہ گھٹ رہا تھا، میرا بدن اکڑتا جا رہا تھا۔۔۔ میرا

انداز اس جنگلی دندے جیسا تھا جو گھات لگائے، اپنی طرف بڑھتے شکار کو دیکھ رہا ہو۔ میں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ جوں ہی وہ میری زد میں آئے گا، میں پھلانگ لگا کر اُسے دبوچ لوں گا۔

معا اُس نے رخ بدلا اور مردانہ جھٹے کی جانب چل پڑا۔۔۔ پھر ایک اور سایہ اُبھرا، دونوں ملے اور میری رُکی ہوئی سانس ایسے خارج ہوئی جیسے غبارے کا مٹہ کھل گیا ہو۔ وہ ہارکن اور دلاور تھے جو پہرہ دے رہے تھے۔

”اوہ، چیت! مجھے میز میاں اتنے دیکھ کر ہارکن میری جانب بڑھا۔ آپ آرام کریں۔“

”نہیں، پیاسے آرام نام کی چیز، میرے نصیب کے پیچھے سے آؤ گئی ہے۔“

”ہم جمع تک پہرہ دیں گے، خرم! دلاور بولا۔ ”تم سو جاؤ۔۔۔ میں مسٹر مارکن کی جگہ لیٹے آیا ہوں۔“

”شکریہ دوست!“ میں نے دلاور کا ہاتھ تھام لیا۔ ”تم نے دوستی اور مردانگی کا بھرم زندہ رکھا ہے۔ ہم انشا اللہ! دونوں غاندلوں کے دلوں سے میل دھونے میں کامیاب ہو جائیں گے۔ میں کسی دن تمہیں ساتھ لے کر چچا سید اکبر کے گھر جاؤں گا۔ یہیں اب مل جل کر نئی زندگی کی بنیاد ڈالنی ہوگی۔“

”وہ بوڑھے درخت!“ دلاور بولا۔ ”کب تک کھڑے رہیں گے، خرم! اُن پر وقت ضائع کرنے کا کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ جانتے ہو، چاچا یہاں سے منظر چوہدری کے گاؤں گیا تھا۔“

”کل ہم بھی چلیں گے دلاور! اندھیرے میں میری آواز تھوڑی سی پیدا کرتی ہوئی ابھری۔ ”ہم گاؤں والوں سے منظر چوہدری کا بازو طلب کریں گے۔“

”یہ مطالبہ خرم سلطان کی طرف سے نہیں بلکہ پنڈ چوہدری کی جانب سے ہونا چاہیے۔“

”کیا ایسے چند غیرت مند یہاں ہیں دلاور خان؟“

”ہاں۔۔۔“ دلاور بولا۔ ”اگر نہ بھی ہوئے تو اُن کو غیرت کا انجکشن لگانا پڑے گا۔“

”تھیک ہے، تم کل صبح مولاداد، کرم داد، اشرف اور سکندر کو میرے پاس لے آؤ۔ اگر یہ لوگ ہمارا ساتھ دینے پر رضامند ہو جائیں تو ہم دن کی روشنی میں منظر چوہدری کے گاؤں جائیں گے۔“

”چاچا اکرم داد اپنے بیٹوں کو اجازت نہیں دے گا، خرم۔۔۔“ دلاور نے بتایا۔ ”چاچا اکرم داد کے خلاف ذہنی کیس میں تمہارے آبا جی موقوف لے گواہی دی تھی۔ وہ پچھلے سال ہی سات برس کی سناٹا جھگڑ

کر آیا ہے۔“

”میں پرانی دشمنیاں ختم کرنا چاہتا ہوں دلاور خان!“

”صرف تمہاری سوچ اس معاشرے کو نہیں بدل سکتی۔۔۔ میرے دوست!“

”تم تو بدل گئے ہو، دلاور خان!“

”ہاں، تم نے مجھے بدل دیا ہے۔“

”اسی طرح میں گاؤں کی نوجوان نسل کو بدلنا چاہتا ہوں۔“

”ایک بات بتاؤ گے، خرم؟“

”ہاں، پوچھو۔ تم سے کوئی بات نہیں چھپاؤں گا۔“

”تم شہر میں کیا کرتے ہو اور یہ لوگ کون ہیں؟ سادہ پولیس والے کس کے اشارے پر آتے ہیں اور آج انسپکٹر سجاول بھیگی جلی کیوں بن گیا تھا؟ مجھے بتاؤ، دوست! تم کیا ہو اور تمہاری پشت پر کون سی طاقت ہے؟“

”ضویر بتاؤں گا، دلاور خان! میں نے اُس کے شکستہ پروٹازہ تھپکی دی۔ بلکہ اب میں جب شہر جاؤں گا تو تم بھی میرے ساتھ چلنا پھر تم خود ہی اپنے سوالوں کے جواب پالو گے کہ میں کون ہوں اور میری پشت پر کون ہے۔ یہ ایک طویل کہانی ہے جو بتانے سے شاید تمہاری سمجھ میں نہ آئے۔“

میں چاہتا تھا کہ پہرے میں اُن کا ساتھ دوں مگر اُن دونوں نے بہ امر مجھے واپس بھیج دیا۔ میں تھکا ہوا تھا لیکن گرم سوچوں کی تپتی وادی میں، نرم نرم پروں والی نیند نہیں اُتر سکتی تھی۔ میں بستر پر لیٹا، اُس بنیادی پتھر کو تو تار تار جس نے ساری دیوار میٹھی کر کے رکھ دی تھی۔

اُن لوگوں کی صورتیں، ایک ایک کر کے سامنے آ رہی تھیں، جن پر میری ذات کا ملبہ گرا تھا۔ اُن میں اپنے بھی تھے اور پہلے بھی۔۔۔ آخر کرم بھائی جیسے درویش صفت شخص کو کس جرم کی سزا دی گئی تھی میں نے کلمت کو دیکھنے اور اُس سے باتیں کرنے کا جرم کیا تھا، کرم بھائی نے تو کبھی غیر محرم عورت کی طرف دیکھا بھی نہ تھا۔ وہ اس ٹائپ کے آدمی ہی نہ تھے۔ زینت جیسی معصوم اور پاک دامن لڑکی کو کس خطا کی پاداش میں بھڑیا اُٹھائے گیا تھا۔ اُس نے اُس کی رُوح اُدھیر دی پھر اُسے زبردستی ایک اور کھولتے تالاب میں پھینک دیا گیا۔ اُس کی خطا صرف اتنی تھی کہ وہ اس حویلی کی عزت مانی جاتی تھی جس کا تعلق خرم سلطان سے تھا۔

اُن لوگوں کو اگر مکافات عمل کی اندھی چکی نے پیس ڈالا تھا تو رشیدہ اور ہارون کیوں گرفتار بلا ہو گئے تھے۔ رشیدہ تو دیر تو بہ سے گزر

کر آجیل پانی جیسی صاف و پور ہو گئی تھی۔ باغوں کا سرسبز ریکارڈ
 بے داغ تھا پھر اس نے اپنا شاندار حال اور تابناک مستقبل ترک
 کر کے جہاد فی سبیل اللہ میں شمولیت اختیار کر لی تھی۔
 بس گندہ میں تھا جس طرح گندہ سے برتن میں دودھ جیسی پاک
 شے پڑے ہی گندہ ہو جاتی ہے اسی طرح وہ سارے لوگ میسر
 ذات کے برتن میں قیدی بن گئے تھے لیکن میں اس برتن کو کھینچ کر
 کرتا، کہاں جا کر پاک کرتا؟
 صبح مجھے جہان خواتین کے ساتھ ہی ناشتہ کرنا پڑا تھا۔ کیونکہ
 زینت نے ناشتہ کرنے سے انکار کر دیا تھا اور اماں بی نے اسے منانے
 اور ناشتہ تک لانے کی ذمہ داری مجھے سونپی تھی۔
 باورچی خانے اور خواتین جہانوں کی ذمہ داری عابدہ اور
 اس کی امی نے سنبھال رکھی تھی۔ عابدہ کے پاس خزانے کی چابیاں
 تھیں۔ ماتم دینے والی ہر عورت کا نام اور ماتم جو کیش کی صورت میں
 دیا جاتا ہے عابدہ اماں بی بتاتی، اگر وہ ماتم قبول کرنے کی اجازت
 دیتیں اس خاندان کے سربراہ کا نام ایسی کاپی میں درج ہو جاتا جو
 اسی مقصد کے لیے نہ جانے کب سے خاندان میں چلی آ رہی تھی۔
 یہ رواج ہمارے گاؤں ہی میں نہیں بلکہ کم و بیش پورے
 پنجاب میں چند سہ کی ایک باعزت صورت میں رائج ہے۔ شادی
 اور موت پر رشتے دار حسب توفیق اور رشتہ میں روپے سے ہزار
 دو ہزار لاکھ دیتے ہیں اس طرح خاصی رقم جمع ہو جاتی ہے۔
 دس بچے تک نئے آنے والے جہانوں اور جانے والوں سے
 فرصت نہیں ملتی۔ البتہ میں نے دلاور خان کو گاؤں کے سرکردہ گھرانوں
 کے نوجوانوں کی طرف بھیج دیا اور پارکن کو ہیڈ کوارٹر کے لیے روانہ
 کر دیا تھا۔ لیکن کے لیے نیا حکم بھی دیا تھا کہ فرصت پلے ہی اکبر خان
 کی خبریت سے مطلع کرے۔
 ایک بچے کھانے پر تقریباً ایک سو بیس مرد تھے۔ ان میں
 چاچا کریم داد کے دونوں بیٹے مولاداد، کرم داد اور سکندر بھی شامل
 تھے لیکن وہ میرے ساتھ میزبانی کے فرائض سرانجام دے رہے تھے۔
 یہ غالباً پہلا موقع تھا کہ چاچا کریم داد کے گھرانے کا کوئی فرد بڑی حویلی
 کی کسی تقریب میں شریک ہوا تھا میرے لیے ان کی آمد اور ان کا رویہ
 حوصلہ افزا تھا گاؤں کے کچھ لوگوں کی آنکھوں میں حیرت کے سانپ
 رینگنے لگے تھے اور کچھ پہرے اس تبدیلی پر خوش بھی تھے۔
 جہانوں کو کھانا کھلا کر خدمت کرنے والوں نے ان کو کھانا کھایا۔
 چوہدری مولاداد میرے پہلو میں بیٹھا کرم بھائی کی اچھی باتیں کر
 رہا تھا مولاداد آری میں صوبیدار تھا، کورٹ مارشل کروا کر گھر آ گیا تھا۔

بندہ کھرا اور اکھڑ تھا، فوج میں ایسا شخص کہاں تک سکتا تھا۔ اس کا
 چہرہ بھائی کرم داد بی۔ ڈیو۔ ڈی کا منظور شدہ ٹھیکے دار تھا۔ بڑا ہی
 شہ زور جوان تھا۔ مجھے کلاس اور عمر میں سینئر تھا لیکن میری کبتی
 نیم کا کھانسی رہا تھا۔
 سکندر ایک پولٹری فام چلا رہا تھا۔ باپ کی وسیع جائداد تھی۔
 اس لیے ایت۔ اسے پاس کر کے وہ زمینوں میں لگ گیا تھا۔ جی دار
 لڑکا تھا میں نے دلاور خان کو اپنے گھر میں سوا کی جگہ ٹھکانے
 کا فیصلہ کیا تھا۔ واقعات اور تجربات نے میں پاؤں کی ضرورت ناگزیر
 بنا دی تھی۔ اگر میرے پاس اپنی میں پاؤں چوری تو پولیس کو ہرگز ملوث نہ
 کرتا۔ دوسری وجہ یہ بھی تھی کہ میں نے شہر کی غلطی دہرائی تھی۔ ایک
 وقت کئی خویل محاذ کھول لیے تھے۔ میں پاؤں کی نقصانات سے
 دوچار کرنے لگی تھی۔ میں گئے چنے آدمی ایک محاذ پر لگتا تو خالی محاذ
 سے دشمن اندر گھس آتا۔
 مولاداد اور کرم داد مضبوط نوجوان تھے لیکن بڑبڑ میں ان کو فتنے دار
 گروپ میں شامل نہیں کرنا چاہتا تھا۔ سکندر ہر لحاظ سے موزوں تھا لیکن
 وہ ایک معروف زمیندار اور بزنس میں تھا۔ ایک دلاور خان ہی تھا جو
 ہر اعتبار سے گروپ کے لیے بہتر تھا۔
 جب میں جہانوں کو رخصت کر کے جہان خانے میں داخل ہوا تو
 وہاں وہ چاروں بیٹھے ہوئے تھے۔ میں نے فرما دیا دو نوں بھائیوں اور
 سکندر کا شکریہ ادا کیا۔
 "اب تم نوکری چھوڑ کر حویلی کو بساؤ ختم؟ سکندر نے مشورہ دیا۔
 "ایسا ضرور کرتا، سکندر بھائی امی نے جواب دیا۔ "لیکن ایک
 مجبوری ہے میں ایک فارمن فرم کا نمائندہ تھا اس لیے برسر کا
 معاہدہ کیا ہوا ہے اس فرم کا کروڑوں کا بزنس میری نگرانی میں چل
 رہا ہے۔ میری اخلاقی ذمہ داری ہے۔
 "لیکن کرم بھائی کے بعد زمینوں کی دیکھ بھال کون کرے گا؟
 مولاداد بول پڑا۔
 "میں نے آپ بھائیوں کو اسی سلسلے میں ذمہ داری ہے۔
 میں نے رگ کر بادی باری تینوں کی طرف دیکھا پھر متوازن بھیج
 بسنے لگا۔ "میرے بھائیو! ماضی ہمارے ان بزرگوں کا تھا جو عہد
 کی روشنی اور بدلتے وقت کے تقاضوں سے ہمیشہ محروم رہے ہیں۔
 لیکن حال اور مستقبل اس گاؤں کی تعلیم یافتہ اور نوجوان نسل کے لیے
 آج کسی ملک و قوم کا وجود اس وقت تک برقرار نہیں رہ سکتا جب
 تک اندرونی اور بیرونی اتحاد نہ ہو نہ ہا فرد اور تنہا قوم دیرانے کے
 اس تہذیب و تمدن کی مانند ہوتی ہے جسے ہر وقت طوفان اور بجلی کا

دھڑکا لگا رہتا ہے۔ میں آج کے دن اپنے بڑوں کی خطاؤں اور آپ
 کے بزرگوں کی نیابتوں کا ذکر نہیں کروں گا میں عرض کر چکا ہوں کہ
 ماضی ان کا تھا۔ جیسا بھی تھا وہ ہمارے لیے باعث فخر نہیں ہے۔
 کسی نے ورثے میں اپنی اولاد کو خون آلود چھڑی دی ہے کسی نے
 ترکے میں دشمنی کی آگ بھجوی ہے۔ کیا ہم بھی اس خون آلود چھڑی اور
 آگ کو محفوظ رکھ کر اپنی آنے والی نسل کو تحفہ دیں گے؟ نہیں
 ختم ہو! ہمیں یہ سب کچھ ماضی کی قبریں دفنانا چوگا۔ ماضی کے یہ تحائف
 ہم قبول نہیں کریں گے۔ اگر ہم نے انہیں قبول کر لیا تو پھر یہ ادھار
 آگے جائے گا، ہماری اولاد تک۔
 "مطلب کی بات کرو، چوہدری مولاداد خوش گوار لہجے میں
 بولا۔ یہ سب کچھ ہماری رعایت میں شامل ہے۔ اسی سے ہمارے اندر
 غیرت اور جرات زندہ ہے جس کا کوئی دشمن نہیں رہتا، وہ جا کر قبر
 میں لیٹ جاتا ہے۔
 "میں دوستی دشمنی کی بات نہیں کر رہا، مولاداد چوہدری امی
 نے دوستانہ انداز میں جواب دیا۔ "میں برادری کے اتحاد کی بات کر رہا
 ہوں۔ بیرونی جارحیت کی صورت میں ہمیں ماضی کی تحفوں کو پس
 پشت ڈال کر جارح کا متحد ہو کر مقابلہ کرنا ہوگا۔ ہماری دہستی اور
 دشمنی ہمارا اندرونی معاملہ ہے۔ ہر فرد، گاؤں اور برادری کی اپنی
 عزت ہوتی ہے۔ یہ حویلی چوہدری سلطان کے نام سے نہیں... بلکہ
 چوہدری برادری کی وجہ سے معروف ہے۔ دوسرے گاؤں والے
 جب اس حویلی کی بات کریں گے تو وہ پہلے پنڈ چوہدریوں کا نام
 لیں گے کیا میری بات سمجھ رہے ہیں، آپ لوگ؟
 "ہاں چوہدری! سکندر نے ثابت میں سر ہلایا۔ "یہ احساس
 مجھے لندن شہر میں ہوا تھا۔ وہاں ایک بڑی لڑکی تھی۔ ایک انگریز
 نے اس کا تعارف پاکستانی گرل کہہ کر دیا تھا وہ لندن میں اپنی
 ذات کو نہیں بلکہ پاکستان کو ذلیل کر رہی تھی۔ اسی طرح یہاں کی
 ہر لڑکی بڑی بات، ہماری برادری کے نام سے جانی پہچانی جاتی ہے۔
 جو کچھ یہاں ہوا ہوا ہے کیا یہ پنڈ چوہدریوں کی عزت افزائی
 ہے؟ کیا یہ صرف بڑی حویلی کا معاملہ ہے؟ کیا منظر چوہدری پنڈ چوہدریوں
 کی عزتوں، غیرتوں اور زندگیوں سے کوئی تعلق ہے گا... اور پنڈ
 چوہدریوں کی غیرت سوتی رہے گی؟ متاثراتی بنی ہے گی؟ اس لیے کہ
 منظر چوہدری کے قلم کا ہدف صرف بڑی حویلی ہے۔ یقین کرو دوستو! اگر
 غیرت نے ان ہاتھوں کو نہ لگا تو جب بڑی حویلی آج چلے گی تو پھر پڑا
 بلکہ دوسرے پھیرے بھی اپنی جھوک دیاس مٹانے کے لیے اس گاؤں
 کا رخ کیا کریں گے کہ ان کو یہاں پہنچے تو شکار بنیں اور کھولے

کئے رہتے ہیں۔
 "بات مختصر کرو ختم! مولاداد غصہ کیا۔ "لوگو کیا چاہتے ہو؟
 "میں پنڈ چوہدری کا جواب چوہدری راجو اس گاؤں پر برسائے جا
 رہے ہیں۔
 "منظر چوہدری کا گھر ملنا چاہتے ہو اس کی بہن کو اغوا
 کر دے؟
 "وہوں باتیں نہیں۔ میں نے گہری سانس لے کر کہا۔ "یہ بڑی
 اور ذلیل حرکت ہے۔ اس کی بہن معصوم ہے اور دیواریں بے جان
 ہیں۔ میں منظر چوہدری کو اس کی برادری سے مانگوں گا... وہی ہمدرد
 مجسم ہے۔
 "اگر انہوں نے انکار کر دیا تو؟
 "پھر ہم منظر چوہدری کے مویشیوں اور فائدہ چوہدری کو لاہر
 گھسیٹ لائیں گے، اس کی کھڑی خصلوں کو اجاڑ دیں گے... پھر بھی
 وہ حاضر نہ ہوا تو جس طرح ہم نوروں کا شکار کرتے ہیں، اسی طرح منظر
 چوہدری کے شکار کے لیے پانکال لگائیں گے۔
 "میری بات سنو ختم؟ اگر تمہارا مطلب جگے سے ہے تو جرگہ
 بزرگوں پر مشتمل ہوتا ہے۔ اگر لڑنا چاہتے ہو تو گاؤں کا ہر نوجوان تمہارے
 ساتھ ہوگا۔
 "جرگہ کیا کرے گا؟ میں پھٹ پڑا۔ "وہاں جا کر ان سے درخواست
 کرے گا کہ منظر چوہدری کو روکا جائے۔ نہیں بھائیو! ہم اپنے بزرگوں
 کے کندھوں پر عزت کا بوجھ نہیں رکھیں گے۔
 "ٹھیک ہے جب ہماری ضرورت محسوس کرو تو اطلاع دے
 دینا۔ مولاداد اٹھا تو اس کا بھائی بھی اٹھ کھڑا ہوا۔ میں نے محسوس کیا
 کہ مولاداد اپنے باپ کے نقش قدم پر چل رہا ہے۔ دلاور خان کی وجہ
 سے وہ چلا تو آیا تھا لیکن اس کے دل میں کدھت کی کالک تھی۔ میں
 نے اٹھ کر ان کا شکریہ ادا کیا۔
 سکندر مذہب کے انداز میں کچھ کہنا چاہتا تھا کہ میری کلائی پر
 اشارہ موصول ہوا میں اس سے معذرت کرتا ہوا خدا اٹھ گیا اور دوڑتا
 ہوا مویشی خانے میں داخل ہوا۔ وہاں زینت اور عابدہ مصغلی کر رہی
 ان کو وہاں سے ہٹانے کا کوئی متعلق بہانہ نہ تھا۔ عابدہ تو بہت کچھ
 ہانک کاٹک ہی سے میرے بارے میں اپنے ساتھ لائی تھی۔ زینت
 کی پروا نہیں تھی۔ عابدہ نے استغما یہ نگاہوں سے میری جانب دیکھا۔
 وہ کچھ کہنا چاہ رہی تھی لیکن میں نے ہاتھ اٹھا کر اسے خاموش رہنے
 کا اشارہ کیا اور گھڑی کی چابی باہر نکال کر بولنے لگا۔ "میں ماسٹر...
 چیف ریسوننگ..."

"مستر سن کی بیٹی واپس گھر پہنچ گئی ہے۔" بیگن نے بتایا۔ وہ
 ہارون کے بارے میں لاعلم تھا اسے خاموش دکھا جا رہا ہے۔ اس کا بیان
 ہے کہ وہ ایک مکان میں بند تھی۔ روشن دان کے لئے کھلی آئی تھی۔
 "رشیدہ اور اکبر خان کی کیا رپورٹ ہے؟ میں نے پوچھا۔
 "اکبر خان کی درخواست پر اسے مرہم مٹی کے بعد فارغ کر دیا تھا۔ وہ
 ہوٹل میں ہے۔ رشیدہ کی حالت خاصی سنبھل گئی ہے۔
 "اب بتاؤ، اس شخص نے کیا بتایا ہے؟
 "اسے کچھ معلوم نہیں ہے جیسے اسے بطور چاہہ استعمال کیا
 گیا تھا۔
 "ٹھیک ہے، میں آ رہا ہوں۔ آپ لوگ مسٹر سن کے گھر کی نگرانی
 کریں گے۔ میں چار بجے وہاں پہنچوں گا۔
 "اور کے چیف؟" بیگن بولا۔ "اور کوئی ہدایت؟"
 "بس ٹھیک ہے۔" میں نے چابی واپس گھڑی میں ڈبا دی اور
 حیران گھڑی لڑکوں کی جانب دیکھا۔
 "میں جا رہا ہوں، اچھی لڑکیوں! اماں بی کو خبر نہیں ہونی چاہیے۔
 اگر فرصت ملی تو رات کو آؤں گا۔
 "آج رات، گاؤں کے مرد تعزیت کے لیے آئیں گے، ختم ازینت
 روٹھے ہوئے انداز میں بولی۔ میں جانتی ہوں تمہیں اس حویلی سے
 کوئی دلچسپی ہے نہ ہمدردی... لیکن رسم دنیا کی خاطر تمہیں چند دن وہاں
 رہنا چاہیے تھا۔
 "اور ایک قیمتی زندگی داؤ پر لگی ہوئی ہے، زینت بیگم! میں
 نے گھر سے بچے میں کہا۔ "میری ذمہ داریاں رسم دنیا سے افضل ہیں۔
 میں محض رسم کی خاطر ایک زندگی سے نہیں کھیل سکتا۔
 "جاؤ..." وہ ہاتھ اٹھا کر چیخی۔ "دوسروں کی زندگیاں بچاؤ اور
 اپنوں کو بچھڑیوں کے حوالے کر دو۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ تم اتنے سنگدل
 اور بے غیرت ہو گئے ہو۔
 "کسی عجیب بات تھی، میں اس کی گالیوں پر مسکراتے لگا تھا۔
 اگر وہی بات کسی دوسرے نے کہی ہوتی تو اب تک اس کے دانت حلق
 میں اتر چکے ہوتے لیکن زینت کی گالی نے مجھے بے مزہ نہ کیا تھا۔
 وہ شروع ہی سے مجھ پر حاوی رہی تھی پھر چابی بن کر، اس کے لب و لہجے
 میں کچھ زیادہ ہی ہندی آگئی تھی۔
 "غائبہ خانم! کیا میں ایسا ہی ہوں؟ میں نے مسکراتے پوچھا۔
 "میری سند، آپ کے کام نہیں آئے گی۔ وہ خوب صورتی سے
 بات گول کر گئی۔
 "مجھے سندن کی ضرورت بھی نہیں لیکن اس ہری مرچ کو سمجھا دینا

کہ ختم سلطان ایسا نہیں ہے۔
 زینت منہ موڑ کر دوسری جانب چل پڑی تو میں گہری سانس
 لے کر باہر نکل آیا۔
 حویلی کے مین گیٹ سے مہانوں کی آمد و رفت جاری تھی... کچھ
 لوگ بوجھ بھی تھے۔ میرے دونوں ماموں تو مین گیٹ پر ڈیرہ ڈالے
 بیٹھے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ میں نے باہر جانے کے لیے حویلی کا عقبی دروازہ
 استعمال کیا تھا۔ اصل راستہ چونکہ مظفر چوہدری کے گاؤں کے قریب ہے
 گزرتا تھا، اس لیے میں نے کھیتوں کے راستے نالہ بنو کر کیا۔ میں خوف نہ
 نہ تھا البتہ ضرور ہندی تھی۔ مظفر چوہدری کے حوالے سے مجھے دیکھ کر لوگ
 اٹھتے تھے کہ وہ جا رہا ہے ختم سلطان جسے مظفر چوہدری نے
 زبردست چوٹ لگائی ہے۔
 نالے کے آس پاس مولشی چلنے والے لوگوں نے مجھے نالہ لڑا
 کہتے دیکھا تھا۔ وہاں سے مظفر چوہدری کا گھر فرلانگ بھر بائیں جانب
 تھا۔ میں کھیتوں کے درمیان ہی سے سرک تک جانا چاہتا تھا، جہاں
 لکڑیوں کے ٹال کے قریب سوزو کیوں کا اڈا تھا۔
 جب میں اڈے پر پہنچا تو وہاں کوئی سوزو کی نہ تھی۔ ٹال والا پٹھان
 آہستہ آہستہ چلتا ہوا میرے قریب آ گیا۔ وہ صرف مجھ سے ہی نہیں بلکہ
 علاقے کے ہر فرد سے واقف تھا۔ اُٹ پر ہونے کی وجہ سے گاؤں کی
 ہر گھنٹی بڑی خبر سے باخبر رہتا تھا۔
 "چوہدری صاحب! وہ سوگوار آغا میں بولا۔ "آپ کے بھائی صاحب
 کی موت کا بہت افسوس ہوا۔ جب بھی ادھر آتا تھا، ہماری خیر خیریت
 ضرور پوچھتا تھا۔ ظالم نے مار دیا۔"
 "ظالم بھی ایک دن مر جائے گا خان! میں نے جواب دیا۔
 "ہاں، ویسے تم اکیلے پھر کر دو چوہدری! اس نے ادھر ادھر دیکھا۔
 "چوہدری ابھی ادھر سے گیا ہے۔ اس نے دائرہ رکھ لی ہے۔ اس
 کے ساتھ دو آدمی اور بھی تھا، خطرناک شکلوں والا۔
 "کس طرف گیا ہے؟ میں نے مسناتی آغا میں پوچھا۔
 "گاؤں گیا ہے، جیپ پر، سرخ جیپ تھی۔
 "اسی وقت شہر سے ایک سوزو کی آگئی۔ لوگ اترے... چند آدمی
 میرے گاؤں کے بھی تھے۔ میں نے چلتے چلتے ان سے سلام دعا کی... وہ
 ڈرائیور کے پاس چلا گیا۔
 "شہر چلو، استاد! میں نے گھڑی پر جھک کر کہا۔ "فل تک کروں گا۔
 "پچاس روپے ہوں گے، چوہدری! اس نے جواب دیا۔ "دیے
 یہ میرا آخری پیرا تھا۔ شام کو ادھر سے سواری نہیں مٹی... اور میرے پاس
 پٹرول بھی نہیں ہے۔"

"پھر پچاس پر کیسے چلو گے؟"
 "گھر میں ایک چیری کین بھرا رکھا ہے۔ تم چالے ہو، میں پانچ
 منٹ میں واپس آتا ہوں۔"
 "ایک شرط ہوگی، اگر کوئی اور سوزو کی آگئی تو میں تمہارا انتظار
 نہیں کروں گا۔"
 "ٹھیک ہے، چوہدری! وہ مسکراتے لگا۔ بالے کی گاڑی خراب
 ہے اور عجیب مجھے لگتے ہیں ہلا ہے، وہ اب آخری پیرے پر شام ہی کو
 آئے گا۔ یہ کہہ کر اس نے سوزو کی کو باپ گھیریں ڈالا اور مجھ پر گرد و غبار
 کا ہادل اڑاتا نکل گیا۔ مجبوری تھی، پیدل تھی طویل مسافت سے کرنا عمل
 تھا جبکہ مجھے چار بجے ہر ضرورت میں مسٹر سن کے گھر پہنچنا تھا۔ ان لوگوں
 کو چار بجے رابطہ قائم کرنا تھا۔ میں چاہتا تھا کہ میں خود ان سے بات کروں۔
 وہ واقعی چھ سات منٹ میں واپس آ گیا تھا۔ سوزو کی میں فرنٹ
 سیٹ پر ایک آدمی بیٹھا تھا جو میرے لیے اجنبی تھا۔
 "چوہدری... ڈرائیور بولا۔ "ان کو بھی جانا ہے۔ پچیس روپے
 یہ ادا کریں گے۔ آپ بھی آگے ہی بیٹھ جائیں۔"
 "آپ آئیں، صاحب! فرنٹ سیٹ والا آہستہ ہوئے بولا۔ میں
 اندر بیٹھ چکا تو اس نے معذرت خواہانہ لہجے میں جھک کر کہا۔ "آگے
 بگ تنگ ہے۔ میں پیچھے آرام سے رہوں گا۔ میں نے اثبات میں
 گردن ہلا دی۔
 ابھی سوزو کی دس پندرہ گروڈری گئی تھی کہ عقب سے شیشہ
 ٹوٹنے کی آواز آئی۔ میں نے پھرتی سے پلٹ کر دیکھا۔ ڈرائیور نے بھی
 بریک پر دباؤ ڈال دیا ہوا ڈالتے ہوئے گاڑی روک دی۔ اسی وقت ٹوٹے
 ہوئے شیشے سے رافٹل کی نال میری گردن سے آگئی۔ میں نے دو
 آدمیوں کی جھلک دیکھ لی تھی۔
 "گاڑی اب موٹر ہاؤس ہاؤس کی طرف جائے گی۔" رافٹل پر دراز
 نے خراتے ہوئے کہا۔
 ڈرائیور نے پٹرول کا تو بیانا ہی کیا تھا۔ مجھے دیکھ کر اس نے
 چوہدری کی ہمدردیاں حاصل کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ خان نے بتایا
 تھا کہ مظفر چوہدری نے دائرہ رکھ لی ہے لیکن میں نے جن چہروں کو
 دیکھا تھا وہ صاف تھے۔ مظفر چوہدری اتنا احمق نہ تھا کہ دن کی روشنی
 میں خود واردات کرنے آجاتا۔ اس نے اپنے گھر کے بھیج دیے تھے جو مجھے
 بازی گروں کے محنت میں لے جا کر قید کرنا چاہتے تھے۔ وہ دھوکا مظفر
 چوہدری کے بزرگوں ہی نے اپنی زمین پر بٹائی تھی۔ وہاں تین خاندان
 آباد تھے اور تین گھرانوں کے نوجوان ہمیشہ مظفر کے خاندان کے پروردہ
 باؤی گاڑو رہتے تھے۔ ان میں سے ایک پہلے ہندی میرے ہاتھوں

موت کے گھاٹ اتر گیا تھا۔
 اب میرے سامنے وہی راستے تھے۔ مقابلہ یا خاموشی۔ دوسری
 صورت میں ذلت آمیز موت تھی۔ منظر جو بدری مجھے خیر سگالی
 کے لیے نہیں بلوا رہا تھا۔
 میں نے دایاں ہاتھ لاک لیو پر رکھا اور ایک جھٹکے سے دروازہ
 کھول کر نیچے کڑھک گیا۔ گرتے گرتے میں نے ریو اور نکال لیا تھا جب
 میں اُٹھ رہا تھا تو دھماکا ہوا اور ونڈا سکریں چمکانا چڑھ گئی۔ اس نے
 گولی چلانے میں بڑی دیر کی تھی۔ غالباً سیفٹی کیج مہلنے میں اسے دیر
 ہوئی تھی۔ اُٹتے ہی میں نے اوپر تلے چھ گولیاں، تیرپال پر چلائی تھیں
 ایک آدمی کود کر جوں ہی باہر گڑا، میں نے ساتویں گولی اس کی گردن
 میں پیوست کر دی۔ میں نے نشانہ لیا تھا، نہ ہی وقت تھا۔ بس ہاتھ
 سیدھا کر رکھا تھا۔ وہ اچھل کر ایک قدم آگے گیا اور پھر جھوٹے لگا۔
 آنکھوں فائربم ہو، جب وہ گھٹنے ٹیٹا ہوا زمین بوس ہو رہا تھا۔
 گولی اس کے سر کو چھوئی ہوئی نکل گئی تھی۔
 میں ایک دم پھر ڈوب گیا اور گھٹنوں اور ہاتھوں کے بل چلتا ہوا
 پیچھے گیا پھر اُٹھ کر اندر جھانکا۔ دوسرا آدمی سوزو کی کے فرش پر لوندھا
 پڑا غریب رہا تھا۔ دونوں اپنے انجام کو پہنچ گئے تو میں اُٹھا اور لپک
 کر ڈرائیور کی طرف گیا۔ ڈرائیورنگ سیٹ خالی تھی، وہ جہاں بچا کر فرار
 ہو گیا تھا۔ اگر وہ ڈرائیورنگ سیٹ پر موجود ہوتا تو اسے بھی دھوکے بازی
 کی سزا کم از کم ایک گولی ضرور دے دیتا۔ یہ بھی ایک اچھا اتفاق تھا کہ
 شہر سے آنے والے سات آٹھ منٹ کے وقفے سے گاؤں میں داخل ہو
 گئے تھے۔ قماش صرف خان نے دیکھا ہوگا مگر گواہی سے بچنے کے لیے
 وہ بھی اپنی جھونپڑی میں ڈوب گیا تھا۔
 چابی انگیش میں لگی ہوئی تھی اور انہن دھڑک رہا تھا... میں
 ڈرائیورنگ سیٹ پر چلا بیٹھا اور سوزو کی چکیاں لپٹی ہوئی چل پڑی...
 ونڈا سکریں فائربم تھی اور پیچھے ایک لاش موجود تھی لیکن میں مزید کوئی
 دھمک نہیں لے سکتا تھا۔ مظفر چوہدری نے اپنی کارگزاری کا نتیجہ
 جاننے کے لیے کوئی نہ کوئی انتظام کر رکھا ہوگا۔ اس کی بالائی منزل سے
 اُٹے تک کا علاقہ دکھائی دیتا ہوگا۔
 اگر مجھے کوال چوک پر تعینات پولیس کا خطرہ نہ ہوتا تو میں سوزو کی
 لے جاتا مگر پولیس کو مطمئن کرنے کے لیے وقت کی ضرورت تھی جو میرے
 پاس نہ تھا۔ اس لیے میں نے ہائی وے سے ایک فرلانگ پیچھے شہر
 کے کنارے سوزو کی چھوڑ دی اور چوک سے ٹیکسی پکڑ لی۔
 جب میں مسٹر سن کے گیٹ پر ٹیکسی سے اترا تو پارکن اور بیگن
 نظر آ گئے۔ پارکن کار کے پیچھے لیٹا ہوا تھا اور بیگن گھٹنوں کے بل جھکا ہوا

اُسے اندر سے ہاتھ لگاتے گیت کے سامنے کئے کا اور کوئی جواز بھی تو نہ تھا۔
 میں گیت سے اندر داخل ہو کر ہاتھ دوسے سے گزرتا، سیرتیں
 چڑھ گیا۔ ساتھیوں کی موجودگی نے میرے اندر سے خوف اور احتیاط دور
 کر دیا تھا۔ اُس وقت چار بجے میں دس منٹ باقی تھے۔
 میں فرش پر بیٹھ گیا، ہاتھ لگتے دروازوں سے بھاگتا، جب
 پہلے بیڈ روم کے قریب پہنچا تو اندر سے بیگم حسن نکلتی دکھائی دیں۔
 مجھے اچانک سامنے پا کر وہ خشک گئیں۔ اُن کا گلابی چہرہ ایک دم
 ہی خزاں کی زد میں آ گیا تھا اور خوف اُن کی بڑی بڑی آنکھوں میں
 برف کی طرح جم گیا تھا۔
 "آداب آئی! میں نے جھک کر سلام کیا۔" میں مبارک دینے
 حاضر ہوا ہوں۔
 "کون ہے بیگم؟" اندر سے حسن صاحب نے پوچھا۔ تب میں
 بیگم صاحبہ سے پچھتا کر اس کے داخل ہو گیا۔ حسن صاحب کوئی رسالہ پڑھ
 رہے تھے اور راضیہ حسن نیم دراز تھی۔
 "السلام علیکم! انگل! بیگم میں حسن! رہائی مبارک ہو۔" میں
 نے دونوں کو مخاطب کیا۔ راضیہ صرف مسکرائی تھی جبکہ حسن صاحب بوڑھٹائے
 ہوئے اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔
 "اوہ... تم... چلو، لوہر۔"
 "نہیں! انگل! میں نے بھی ہوئی آواز میں کہا اور دو قدم بڑھ
 کر کرسی پر بیٹھ گیا۔ میں میں راضیہ کی فرما پر کسی کرنے آیا تھا۔ پھر
 آپ نے بھی چلے گئے حاضر ہونے کا حکم دیا تھا۔"
 "آئی سے گیت آؤ۔" حسن صاحب اچانک دہانے۔ یہ
 ... یہ بیڈ روم ہے۔
 "جی ہاں! انگل! میں نے ایمان بھرے پیچھے میں کہا۔ اور
 ٹانگ پر ٹانگ چڑھا لی۔ میں ملک نواز کے ساتھ اسی بیڈ روم میں
 بیٹھا رہا ہوں۔ ہاں! میں حسن! آپ کہانی سنائیں گی؟"
 "سنو، رٹکے؟" حسن صاحب تھیں بھیج کر غرائے۔ میں ایک
 ذمے دار آخیر ہوں۔ یہاں خندہ گردی نہیں چلے گی۔ مجھے اب تھادی
 ضرورت نہیں رہی۔ جاؤ، چلے جاؤ۔"
 "اب ایسی بھی بے مروتی کیا، سر؟" میں نے ٹھہرے ہوئے انداز
 میں کہا۔ "میں میں حسن سے ہاتھ لگنے کے بارے میں پوچھنا چاہتا ہوں کہ
 یہ جب وہاں سے روانہ ہوئیں تو وہ کس حال میں تھے؟"
 "رہا نہیں ہوئی۔" حسن صاحب تیزی سے بولے۔ یہ وہاں
 سے فرار ہوئی ہے۔
 "جیسے مفرد ہی رہی۔" میں نے فن کی بات اڑاتے ہوئے کہا پھر

راضیہ کو مخاطب کیا۔ "آپ نے میرا سوال سن لیا ہے میں حسن! براہ کرم
 جواب دیجیے۔" اُس نے بے بسی سے اپنے باپ کی طرف دیکھا۔ جواب
 آپ کو دینا ہوگا، راضیہ حسن!۔
 "م... میں کچھ نہیں جانتی۔ مجھے کچھ پتا نہیں۔"
 "اس لیے نا، راضیہ حسن! میں نے اُس کی کھلے صحنی آنکھوں
 میں جھلکتے ہوئے کہا۔ آپ اپنے گھر ہی میں کہیں چھپی ہوئی تھیں۔
 مجھ پر اخلاقی اور نفسیاتی دباؤ ڈالنے کے لیے آپ کے ابو جان نے یہ
 ڈراما کھیل دیا تھا۔ پھر میں نے رخ بدل کر حسن صاحب کی طرف سخت
 جنگاہوں سے دیکھا۔ "آپ کا عیب یہ ہے میں حسن صاحب! دیکھئے مجھے
 وہی احساس یہاں لے گیا ہے۔ جائے اُن کو اطلاع کر دیجیے۔"
 "تھادی بہتری اسی میں ہے خرم سلطان! چلے جاؤ۔ ٹیڑھے چلے
 جاؤ۔ وہ مجھ میں ملنے نہیں لو۔"
 "نہیں! سر! میں نے سر کو نفی میں بلایا۔ "آپ مجھے صرف اتنا
 بتا دیجیے کہ وہ لوگ ہارون کو کہاں لے گئے ہیں۔ میں پھر میں ایک
 سیکند بھی یہاں نہیں ٹھہروں گا۔"
 "مجھے کچھ معلوم نہیں۔ اگر تم بھی اُس کے ساتھ جہنم میں گرنا چاہتے
 ہو تو پیچھے رہو۔"
 "نہیں! خرم! میں نے رول اور نکال لیا۔" میں اس ڈرائے
 کو حقیقت کا رنگ دے کر چلاؤں گا۔ اگر آپ نے زبان نہ کھولی... تو
 راضیہ حسن میرے ساتھ جائیں گی۔ ہارون نے یقیناً میرے بارے میں
 آپ کو بتایا ہوگا کہ میری حیثیت کیا ہے اور میں کیا کچھ کر سکتا ہوں۔
 اس وقت راضیہ! آپ کے پاس ہے مزید حفاظت کی ضمانت میں نقل
 گا۔ بتائیے ہارون کہاں ہے؟"
 "مجھ پر تم کرو خرم سلطان! وہ پڑھے۔" میرے پاس زندگی کا
 نکل آتا ایک بیٹی ہی ہے۔ تم اپنے دیگر ذرائع سے کام لے سکتے ہو مجھے
 معاف کر دو۔"
 "نہیں! سر! میں نے رول اور کاؤنٹ پھیرتے ہوئے سر د
 اور فیصلہ کن لہجے میں کہا۔ پہلے میں نے شک کا فائدہ دیتے ہوئے
 آپ کو لبرٹ سے خارج کر دیا تھا لیکن اب آپ کا جرم ثابت ہو چکا
 ہے۔ آپ ہم کاری خزانے ہی کے نہیں بلکہ قوم کے بھی مجرم ہیں۔ آپ
 کا تعلق مشائے کے سنگدلوں سے ہے۔"
 "نہیں... نہ... نہ۔"
 "مخافوش... میرے حق سے دہرا بھری۔ میں راضیہ! آئیے۔
 امید ہے آپ مجھے گستاخی پر مجبور نہیں کریں گی گیت کے سامنے ایک
 کھوکھری ہے جا کر اُس میں بیٹھ جائیے۔"

راضیہ آہستہ سے اٹھی اور سیڑھیں چڑھ کر چل پڑی۔
 "ٹھہرو... بیگم حسن! کاسکتہ ٹوٹ گیا۔" میں بتاتی ہوں۔
 "نہیں! بیگم صاحبہ! معنا ایک طویل القامت شخص کو ذکر اندر آ
 گیا۔ اُس کے ہاتھ میں عجیب ساخت کی ایک چھوٹی سی لافل تھی جس
 کا دھڑ میں ہی تھا۔ "میں چاہتا تھا تم لوگوں کو رحمت نہ دوں اور اسے
 باہر گھیر لوں۔ اب تم اٹھ جاؤ، خرم سلطان!"
 "اٹھ چلوں گا، دوست! گھڑی میں بیٹھ کر دم لو۔" میں نے ٹھہرے
 ہوئے انداز میں چہرہ اُس کی طرف گھماتے ہوئے کہا۔ "اگر یہیں سودا
 ہو جائے تو کیا برا ہے؟"
 "جو اس بند کرو، لوہر! وہ غریبا۔ میں نے اُس کے ب و بے
 ہی سے اندازہ لگالیا تھا کہ وہ پٹھان نہیں ہے بلکہ پنجابی ہے۔ اے
 لڑکی! تم ایک طرف ہو جاؤ۔"
 "م... میں... ہاتھ روم میں... راضیہ کی کپکپاتی ہوئی آواز
 ڈب گئی۔
 "چلی جاؤ۔ وہ لافل نچا کر بولا۔ چلو خرم سلطان! اگر میں تمہیں
 پہچانتا ہوتا تو تمہیں باہر ہی روک لیتا۔ میں یہاں تھا ہاں ہی منتظر تھا۔"
 "میرے ایک سوال کا جواب دو اور مجھے چلو۔" میں نے انگلی
 اٹھا کر کہا۔
 "بکو، جلدی۔"
 معاف فضا میں کوئی شے اُڑتی ہوئی آئی اور اُس کے چہرے سے
 ٹکرائی۔ میں نے اس قلیل وقفے کو نہایت ہی بھرتی اور حاضر دماغی سے
 استعمال کرتے ہوئے، اُس کی ٹانگوں پر فائر ہونک دیا اور خود کرسی سے
 ٹھک کر ایک آہنی کپ بورڈ کی آڑ میں ہو گیا۔ راضیہ حسن نے دوسری
 بار میری زندگی پر احسان کیا تھا۔ اُس نے ہاتھ روم کی جانب جاتے ہوئے
 تکیہ اٹھا کر اُس پر دسے مارا تھا۔
 وہ ڈکرا تا ہوا دروازے سے ٹکرایا اور بیگم حسن نے اُس کی
 لافل اٹھا کر حسن صاحب کی جانب اچھال دی تھی۔ میں تڑپ کر اٹھا
 اور طویل چھلانگ میں اُس کو فٹ ٹانگ لگ لگاتا ہوا، برآمدے کے
 فرش پر پھسلتا چلا گیا۔ فائر کی آواز سن کر ہارکن اور بیگن بھی دوڑتے
 ہوئے اندر آ گئے تھے۔
 اُس کی دائیں لٹن میں شگاف ہوا تھا اور وہ فٹ میٹ پر پڑا۔
 دروازے کے ناکام کوشش کر رہا تھا۔ بیگن اُس کے سر پر کھڑا ہو گیا تھا۔
 جبکہ ہارکن اندر چھانک کر پلٹ گیا تھا۔ میں نے حسن صاحب کی طرف
 دیکھا، وہ لافل کونال کی طرف سے پکٹے میری طرف آرہے تھے۔
 فوجی رو سے اُٹھی لافل پکڑنے کا مطلب دوستی تھا۔ میں نے شکریہ

کہہ کر اُن سے لافل لی اور بیگن کے حوالے کر دی۔
 "ماسٹر... میں نے گیسے ہوئے شخص کے سر کو ہلکی سی ٹھوکر
 مارتے ہوئے سر آواز میں کہا۔ اسے گھسیٹ کر اندر لے چلو۔"
 بیگن نے اشیائی انداز میں سر کو جنبش دی اور اُسے ٹانگوں
 سے پکڑ کر گھسیٹا ہوا اندر لے آیا۔ دروازے اُس کے حق سے کربناک
 کراہیں ابھر کر ڈوب گئیں۔
 "براہ کرم! آپ لوگ دوسرے کمرے میں چلے جائیں۔" میں
 نے حسن صاحب سے کہا۔
 راضیہ نے پلکیں جھپک کر باری باری اپنے والدین کو دیکھا پھر
 میری طرف بڑھ آئی۔ "خرم صاحب! آپ اسے یہاں سے زندہ ہی
 لے جائیں، پلیز۔"
 "جیسے آپ کا حکم! میں حسن! میں نے ممنون لہجے میں کہا اور
 بیگن کو اشارے سے قریب بلایا۔ "اس سے ہارون کا پتا معلوم کرو۔ اگر
 نہ بتائے تو ہاتھ روم کے ٹب میں لے جانا۔ دوسرا فائر نہیں ہونا چاہیے۔
 میں اپنے غمنوں کے ساتھ دوسرے کمرے میں جا رہا ہوں۔"
 "ٹھہرو، خرم چوہدری! وہ ہاتھ اٹھا کر بولا۔ "ہارون کو تا ثبوت
 میں بند کر کے علاقہ غیر میں لے جایا گیا ہے۔ تمہارے لیے بھی یہی
 حکم تھا۔ ملک نواز، تم دونوں کو زندہ یا مردہ، دونوں حالتوں میں
 دیکھنا چاہتا تھا۔"
 "یہ ٹھیک کہتا ہے خرم! حسن صاحب بولے۔ انھوں نے
 چار بجے کا چکر اسی لیے چلایا تھا کہ تم کم از کم چار بجے تک کوئی کارروائی
 نہ کرو اور وہ بکل جائیں۔"
 "میں نے صبح بتا دیا ہے۔ اب تم ایک احسان کرو خرم چوہدری! نا
 زخی نے التجائیہ لہجے میں کہا۔ "میری کمر ٹوٹ چکی ہے اور ایک ٹانگ
 بھی بے کار ہو گئی ہے مجھے اس اذیت ناک زندگی سے غربت
 دلادو۔"
 میں نے پچھلا ہونٹ دانتوں میں دباتے ہوئے بیگن کو اشارہ
 کیا۔ اس سے قبل کہ کوئی بولتا یا راضیہ روکتی، بیگن نے جھک کر اُس
 کی کپٹھی میں گولی آمار دی۔
 مات اٹھ بچے، بیگن اور ہارکن جب اُس کی لاش ٹھکانے
 لگا کر واپس آئے تو میں ڈی۔ آئی۔ جی سے ملاقات کر چکا تھا۔ اُن کو
 منظر چوہدری کی مذموم کارروائیوں سے آگاہ کرتے ہوئے اپنی جوانی
 کا روٹائی بتاتی تھی اور وقت کا جلتا ہوا مسئلہ اُن کے سامنے رکھا تھا۔
 میرے نزدیک اپنی جویلی اور خاندان کی سلامتی سے کہیں زیادہ ہارون
 کی بازیابی مقدس تھی۔

انہوں ہی نے مجھے مشورہ دیا تھا کہ اس سلسلے میں وزیر داخلہ سے بات کی جائے۔ ہم نے فون پر رابطہ قائم کرنے کی کوشش کی تو معلوم ہوا کہ وزیر موصوف کسی فکشن میں ہیں... اور وہ فکشن ایک گراؤنڈ میں ہو رہا ہے۔ مجبوراً مجھے خود جانے کا فیصلہ کرنا پڑا تھا۔

میں اور بیگن جب گراؤنڈ میں داخل ہوئے تو وزیر داخلہ اختتامی تقریر کر رہے تھے۔ ہم ایک کونے میں کھڑے ہو گئے۔ وہاں انتظامیہ ان کے گرد جمع تھی... پھر جب وہ اپنی کار میں بیٹھنے لگے تو میں نے ہاتھ اٹھا کر سلام کیا۔ وہ لوگوں کو ہٹاتے ہوئے میری طرف آئے اور گھٹے لگا کر میری نشست سہلانے لگے۔

"کب واپس آئے ہو؟ مجھے بتایا گیا تھا کہ تم..."

"جی ہاں سر! گیا تھا۔ میں نے ان کی بات قطع کرتے ہوئے کہا..."

"اسی سلسلے میں حاضر ہوا ہوں۔"

"چلو، بیٹھو۔ گھر چل کر باتیں کریں گے۔ انہوں نے بڑے پیار سے کار کی طرف اشارہ کیا۔ میں نے پلٹ کر بیگن کو دیکھا اور کار میں بیٹھ گیا۔ اس نے میرا اشارہ وصول کر لیا تھا۔ راستے میں خان صاحب اور دھڑک رہے ہیں کرتے رہے۔ ڈرائیور کی موجودگی میں ہم اصل موضوع پر گفتگو نہیں کر سکتے تھے۔

بیگن بھی ہمارے ساتھ ہی کوٹھی میں داخل ہوا تھا۔ وزیر داخلہ اسے جانتے تھے جب سیکورٹی گارڈ نے بیگن کو روکا تو خان صاحب نے اسے منع کر دیا اور خود آگے جا کر بیگن کا ہاتھ تھام لیا۔

"ہاں اب بتاؤ، کیا پرابلم ہے اور ہمارے دوست ملک نواز کو کس حال میں چھوڑ آئے ہو؟ اندر بیٹھ کر پہلے انہوں نے چلنے کا آرڈر دیا پھر میں نے روانگی سے واپسی تک انہیں اپنی اور ملک نواز کی کارروائی بتا دی۔

"گڈ... ویل ڈن خرم چوہدری! تمہاری احسان صرف پاکستان ہی پر نہیں بلکہ دنیا کے تمام انسانوں پر ہے۔ فیکٹری تباہ کر کے تم نے ایک بہت بڑا کارنامہ سر انجام دیا ہے۔ میں نے تمہاری تجویز پر ائمہ منسٹر تک پہنچا دی ہے۔ جب تک وہ لوگ پھر فیکٹری لگائیں، اس وقفے میں ہم بہت کچھ کر سکتے ہیں۔ اگر چیف نے تمہاری تجویز کو عملی جامہ پہنانے کی منظوری دے دی تو ہم پوست کی کھڑی فصل کو کھیتوں ہی میں تباہ کر دیں گے۔ دیسے ذاتی طور پر چیف نے تمہاری تجویز کو سراہا تھا لیکن عمل کی راہ میں کچھ سیاسی پیچیدگیاں ہیں۔ بیس قبائل کو نالاغ کرنے کا ریسک لینے سے قبل بہت دور تک سوچنا پڑے گا۔ بہر کیف یہ چوٹ بھی کاری لگی ہے۔"

یہ سب بعد کی باتیں ہیں، سر! میں نے اصل موضوع کی طرف آتے ہوئے کہا: میں سیاسی نہیں عملی آدمی ہوں۔ سیاست انسان کو بزدل بنا دیتی ہے۔ میں اپنے ساتھی ہارون کی بازیابی کے لیے آپ کی مدد حاصل کرنے آیا ہوں۔

"بازیابی... میں سمجھا نہیں۔"

تب میں نے ان کو تفصیل سے ساری بات بتائی اور اس میں راضیہ حسن کی وفاداری، جی داری اور ذہانت کا ذکر نمایاں رکھا تھا۔ یہ سن کر خان صاحب پہلو بدلتے لگے تھے۔ ان کا گلہ جی چہرہ شدت غیظ و غضب سے سرخ انگارے کی طرح دھک اٹھا تھا۔

"بولو... بتاؤ، خرم سلطان! میں کیا کر سکتا ہوں؟" وہ دھڑک کر بولے۔

"میں وہاں جانا چاہتا ہوں سر! لیکن ہائی ریفو کئی دشواریاں ہیں۔ تین چار چوکیاں ہیں۔ اب وہ لوگ راستوں کی خاص نگرانی کریں گے۔ ہارون کو کسی پے لے گئے ہیں کہ میں اس کے پیچھے آؤں گا لیکن میں ان کی توقع کے برعکس، ان کے سروں پر پہنچنا چاہتا ہوں۔"

"لیکن کیسے، میرے بیٹے؟"

"ہائی انڈر سر! میں نے کہا۔ اگر مجھے بیلی کا پٹرل جلے تو میں آج رات ہی وہاں اتر سکتا ہوں۔ میں صرف فیکٹری ہی تباہ کر سکتا تھا۔ میں اس ناگ کا سر کھینچنا چاہتا ہوں جو خود پل بھی نہیں سکتا لیکن اپنا ذہر سخت مند لوگوں میں پھیلا رہا ہے۔ خان جیگر خان اس وقت منشیات کا بادشاہ ہے۔"

"ہوں..."

"لہجہ بھر سوچتے رہنے کے بعد وہ اٹھے اور بیلی فون سیٹ اٹھا کر میرے قریب لے آئے۔ انہوں نے ہولی ایوی ایشن کے سربراہ سے رابطہ طے کیا پھر اس سے چند منٹ پشتوں میں باتیں کرنے کے بعد بیلی کو رکھ کر بتانے لگے: "ان کے پاس زیادہ بندی پر پرواز کرنے والا کوئی بیلی کا پٹر نہیں ہے۔ سچی پرواز اپنے علاقے تک تو محدود ہوگی لیکن علاقہ غیر کی فضا میں وہ لوگ ریسک لینے کو تیار نہیں۔ ہاں پولیٹیکل ایجنٹ کی آڑ میں وہاں اتر سکتا ہے۔"

"اس طرح پھر نہ جانے کتنا فاصلہ باقی ہے؟ سر! میں نے دہلی دہلی آواز میں کہا۔

"تم جذبات سے ہٹ کر سوچو، خرم سلطان! ایک مقاصد کی راہ میں مجاہدوں کی جانیں قربان ہوتی رہتی ہیں۔ ایک فرد کی خاطر..."

"نہیں سر! میں نے جلدی سے ان کی بات کاٹی۔ "وہ فرد نہیں ہے۔ وہ تنظیم کی قوت ہے، وہ جرات اور وفاداری کی علامت ہے... کیا ایسے کارآمد فرد سے ایک بیلی کا پٹر آپ کو محروم ہے؟ اگر ہم اسی طرح ہر فرد

کو نظر انداز کرتے رہے تو کل کوئی راہ و فاقہ قدم نہیں رکھے گا۔ پھر مجھوری بھی کیل ہے، ہم بے بسی کا اظہار کیوں کریں؟"

میں نے شک: ہم بے بس نہیں ہیں۔ وہ طویل سانس لے کر بولے اور پھر پرواز اٹھانے لگے۔ "میں دفعہ منسٹر سے بات کرتا ہوں۔ کیا تم پورا اثوث سے گودنا پسند کرو گے؟"

"میں نوبل کا رزکے لیے بغیر پورا اثوث کے گودنے کا بھی محرم دکھتا ہوں، سر!"

انہوں نے مسکراتے فاش آئینہ نظروں سے میری جانب دیکھا۔ "اسلام علیکم پیارے بھائی! انہوں نے ماؤتھ پیس میں کہا۔ پھر چند سہمی باتیں کرنے کے بعد وہ اصل موضوع کی طرف آتے ہوئے بولے: "چھٹے بھائی! مجھے فیکشنل کاز کے لیے ایک بیلی کا پٹر یا طیارہ چاہیے..."

وزیر سٹن میں ایک اینجٹ آنا رہا ہے۔ جی ہاں بھائی! آج ہی... شکر ہے! ایسور رکھ کر وہ مجھ سے مخاطب ہوئے۔ "جو جائے گا، انتظام... بس اب تم ایمان رکھو۔ اسی وقت ایک ملازم ٹرالی بے انداز گیا۔ چائے کے دوران گفتگو کا موضوع تنظیم کی کارکردگی، افادیت اور دیگر مسائل کے گرد گھومتا رہا۔ ان کا بھی وہی مشورہ تھا جو آئی۔ جی صاحب نے دیا تھا۔ وہ پولیس کے تعاون کو ناگزیر قرار دے رہے تھے جبکہ میری رائے تھی کہ تنظیم کے پاس اپنی مین پاور ہونی چاہیے تاکہ انتظامی امور پر محکموں کا نگرانہ ہو۔

"ٹھیک ہے، تم ادھر سے فارغ ہو کر میرے پاس آؤ۔ ہم مل کر متعلقہ ایجنسیوں سے سلیکشن کریں گے۔ ہارون جیسے جوان ہر ایجنسی میں موجود ہوں گے۔"

"میں نے ایک تجویز پیش کی تھی سر! میں نے کہا۔ تنظیم کے فنڈز سے ایک اصلاحی ادارہ قائم کیا جائے جس میں فنی ماہرین رکھے جائیں، انشیا کے ڈاکٹر ہوں۔ ہم ایسے لوگوں کو اس ادارے میں رکھیں جن کو منشیات نے ناکارہ کر دیا ہے۔ ان کا وہاں جسمانی، ذہنی، روحانی اور معاشرتی تربیت منٹ ہو۔ صرف منشیات کو روک دینے سے مسئلہ حل نہیں ہوگا جناب! بلکہ اس لعنت میں پھنسے ہوئے لوگوں کو بھی نکالنا ضروری ہے۔"

"ایک تجویز میں بھی پیش کرنا چاہتا ہوں، وزیر محترم: بیگن نے انگریزی میں کہا۔

"ضرور، منسٹر بیگن! خان صاحب بولے آپ تو ہمارے لیے بے حد محرم ہیں۔"

"تھینک یو، سر! بیگن شائستہ لہجے میں بولا۔ "کبھی فرصت کے اوقات میں، میں ٹی وی پروگرام بھی دیکھ لیتا ہوں میں نے آج

تک منشیات کے موضوع پر کوئی پروگرام ہوتا نہیں دیکھا۔ ہمارے ہاں اس موضوع پر دستاویزی فلمیں بنائی جاتی ہیں۔ ٹی وی پر روزانہ ایسے درخواست مناظر دکھائے جاتے ہیں کہ لوگوں پر کیکپی طاری ہو جاتی ہے۔

"اچھی تجویز ہے منسٹر بیگن! خان صاحب نے بھی انداز میں گردن ہلا کر بولے۔ میں، منسٹر نادر افشار میمن سے بات کر دیا گا۔ اسی وقت بیلی فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ خان صاحب نے ایسور اٹھا لیا اور چائے کا آخری سہ لے کر بولے۔ "جی فرمائیے... اور، شکر ہے! جی سن رہا ہوں... ہوں، ٹھیک... ایک منٹ۔ وہ ماؤتھ پیس پر تھیل رکھ کر میری جانب مڑے۔ "بیلی کا پٹر تھیں واپس بھی لے گئے گا نا؟ جی ہاں... اور وقت کی قید نہ لگائی جائے۔ وہاں حالات پر منحصر ہوگا۔"

"ایک بیلی کا پٹر ان لمیٹڈ پریڈ کے لیے مقرر کیا جائے گا... ہاں، ہاں... اگر ایسا ہو تو واپس بھی کیا جاسکتا ہے۔ یہ حالات پر منحصر ہے، بھائی صاحب! ٹھیک ہے، میں ان سے رابطہ کرتا ہوں۔"

خان صاحب نے سلسلہ منقطع کر کے میری طرف دیکھا پھر کوئی نمبر ڈائل کیا۔ تیسری کوشش پر بلا طریل گیا۔ "وزیر داخلہ بول رہا ہوں۔ آپ کو دفعہ منسٹر کا حکم مل چکا ہوگا۔ وقت اور دیگر تفصیل جانے والا ہی بتائے گا۔ آپ بیلی کا پٹر تیار کریں۔ وہ کسی بھی وقت وہاں پہنچ سکتا ہے... جی ہاں! بیلی کا پٹر مسٹر جی ہوگا۔ تھینک یو، آفیسر! ایسور رکھ کر وہ اپنے شفاف سر پر ہاتھ پھیرنے لگے۔ "تم دھیال کیمپ رپورٹ کرو گے۔ وہاں تھیں بیلی کا پٹر تیار کیے گا اور اپنی ضروریات کے مطابق چیک کر لینا۔ تھیں ہر شہرت ہائیال جیلے گی۔ میں صرف تمہارے لیے دعا ہی کروں گا۔ کچھ دیا تو پھر تم بند باقی ہو جاؤ گے۔"

"نہیں سر! آپ اپنی دعاؤں کے ساتھ ہدایات بھی فرمائیں۔"

"بس! اپنا خیال رکھنا۔ وہ پیار سے بولے۔ "میں پولیٹیکل ایجنٹ کو بھی انفارم کر دیا ہوں گا۔"

خان صاحب پورے تک ہمارے ساتھ آئے۔ میرا خیال ایک دم گھر کی طرف چلا گیا۔ رات کا وہ کدوہ کرایا تھا۔ اور کسی کو نہیں تو اس ہستی کو میرا انتظار تھا جو زبان سے نفرت کرتی تھی لیکن میں جانتا تھا کہ اس کی اس نفرت میں محبت کی روشنی تھی۔

"کیا آپ کو معلوم ہے، سر! مظفر چوہدری کو حوالات سے فرار کر دیا گیا ہے؟"

"وہ تو ق سے نہ کہو، خرم سلطان! مجرم توجیل سے بھی فرار ہوتے رہتے ہیں۔"

"کیا ہر ایسے کیس میں جیل کا کوئی رکن ملوث نہیں ہوتا؟"

"ہر کس میں نہیں۔ آخر تم اپنی پولیس سے اس قدر دل برداشتہ کیوں ہو؟ وہ دُشمن انداز میں بولے۔ میں تسلیم کرتا ہوں کہ دشمن ہے لیکن کہاں نہیں ہے؟ معاشرے کا ہر چہرہ ہی داغ دار ہے... ہر کیف میں پولیس کے سربراہ سے تفصیل طلب کروں گا۔"

"پولیس کے سربراہ نے میرے گھر کی حفاظت کے لیے سادہ لباس والے تعینات کیے تھے مگر شاید آپ یہ سن کر بھی حیران نہ ہوں گے کہ کل رات ان کی موجودگی میں میرے گھر کو جلا دیا گیا جس میں میرا بھائی بھی لاکھ ہو گیا۔" "اوہ... تم نے پہلے نہیں بتایا۔ وہ چلتے چلتے رک گئے۔ ایسی حالت میں تم باہر جا رہے ہو۔"

"جی ہاں، جناب! میں نے مضبوط آواز میں جواب دیا۔ اس لیے کہ ہارون ابھی زندہ ہے۔ میں مرنے والے بھائی کے سوگ میں زندہ بھائی کو نظر انداز نہیں کر سکتا۔"

"کیا شے ہو خرم سلطان! کیا دل گردہ پایا ہے تم نے؟ انھوں نے میرے شانے پر ہاتھ رکھا۔ ایسے لوگ اس قدر میں کہاں ہوں گے؟ غیر معینہ مدت اور غیر معینی منزل کے لیے روانہ ہونے سے قبل میں اگر اپنے غریب رشتوں سے نہیں مل سکتا تھا تو کم از کم وہ لوگ جو میری روح کے قریب تھے، ان سے ملنا ضروری تھا۔ ان میں سر فرست روحانی شے کی بہن رشیدہ تھی۔ میں نے تو محض اشارہ کیا تھا۔ لیکن تو جیسے پہلے ہی فیصلہ کر چکا تھا۔"

"ڈیوٹی ڈاکٹر سے خصوصی اجازت لینے میں دس منٹ صرف ہوئے تھے۔ کیونکہ ملاقات کا وقت نہ تھا اور آپ کے حکم کی پابندی بھی تھی۔ ڈاکٹر نے ہمارے شناختی کارڈ چیک کیے۔ ہمیں باہر بٹھرنے کا کہہ کر اس نے کسی سے فون پر اجازت طلب کی تھی۔ رشیدہ کو خصوصی کہے میں رکھا گیا تھا۔ جوں ہی ہم اندر داخل ہوئے اس نے چہرہ گما کر دیکھا۔ فیصلہ کم ہوا تو اس نے دلیاں ہاتھ میری جانب بڑھادیا۔ میں نے بھجک کر ہاتھ تھام لیا۔ لیکن اس کی پیشانی چوم لی۔ وہ باپ تھا، وہاں تک پناہ جتا سکتا تھا۔"

"کیا حال ہے جان برادر؟" "بالکل ٹھیک۔" وہ بشارت آواز میں بولی۔ سنبھلے کل کچھ گزر رہی تھی میرے ساتھ۔ ان لوگوں نے بہت جلد مجھے زندہ کے حوالے کر دیا تھا۔ آپ ٹھیکہ امینہ کو ساتھ کیوں نہیں لائے؟ دیکھیے جھوٹ نہیں۔ سچ بتا دیں کوئی نئی گڑبڑ تو نہیں؟"

"نہیں جان! بس پرانی گڑبڑی کے منہ پر چانے مارا پھر رہا ہوں۔" "فیڈی... اس نے چہرہ اٹھا کر بیگن سے پوچھا۔ کیا یہ سچ کہہ رہے ہیں؟"

"ہاں پیاری! بڑے جھوٹ نہیں بولا کرتے۔ بیگن نے اس کے

گال پر تھپکی دی۔ "بس اب جلدی سے فٹ ہو جاؤ۔ بہت کام ہیں، تمہارے لیے۔"

"کیوں؟ ٹھیکہ اچھی یاد چن ثابت نہیں ہوئی؟ اس نے مسکرا کر پوچھا۔ کل آنے کی تو اسے نہانی تربیت دلائی گئی۔ بس چند دن اور... پھر کثیر آن ڈیوٹی ہو جائے گی۔"

"اور کچھ...؟ میں نے وقت دیکھتے ہوئے پوچھا۔" "بہت کچھ۔" وہ ہنس پڑی۔ "لیکن گھر اگر بتاؤں گی۔" "اور کے..." گھبراہٹ میں۔ میں نے اسے تسلی دی اور پلٹ کر دروازے کی طرف چل پڑا۔

"اب کہاں چلوں؟ گیسٹ سے نکل کر بیگن نے پوچھا۔" "خان کے گھر۔ میں نے مختصر سا جواب دیا۔"

"میں ایک بات کہنا چاہتا ہوں، چیف! تم تنہا جاؤ گے۔ میں جانتا ہوں، تم نہیں مانو گے مگر ایک سے دو بہتر ہوتے ہیں۔ مجھے ساتھ لے چلو۔" "مگر خالی کرو گے ماسٹر؟"

"یہاں لڑکے ہیں۔" "نہیں ماسٹر! انھیں ابھر رہی رہتا ہے۔ شام، جسے تم نے گولی ماری تھی، وہ ابھر رہی کا تھا۔ ابھی بھگوانے جرنیل کے بہت سے سپاہی اور عہدے دار اس شہر میں بکھرے ہوئے ہیں۔ منظر چھو بھری کو میں جو ضرب لگا آیا ہوں، وہ اسے چین نہیں لینے دے گی۔"

"اچھا... کونزیا ہنٹ میں سے کسی کو ساتھ لے جاؤ۔" "میرے ساتھ ان ہی کا آئی جانے گا، ماسٹر! میں نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔ مجھے نہیں معلوم، پہلی کا پٹر میں کتنی گنجائش ہوگی۔"

"بیگن نے میرا رویہ غموں کے کچے چپ سادہ لی تھی۔ لیکن میں اپنے ساتھ شکر رکھنے کے حق میں نہ تھا۔ میرا طریقہ کار کچھ جیسا ہوتا تھا۔ چھوٹی سی سرنگ کھود کر جلے مقلوب پر جانکھتا تھا۔ ایسے طریقہ کار کے لیے تنہا انسان ہی اس تنگ سرنگ سے گزر سکتا تھا۔ دوسری وجہ یہ احساس بھی تھا کہ میں ان لوگوں کو خطرے میں ڈال کر مزید کوئی زندگی ضائع نہیں کرنا چاہتا تھا۔ مجھے سوا، ہارون اور رشیدہ کا احساس دکھ مضمر نہیں ہو رہا تھا۔ سوا کی جگہ دلاور مل گیا تھا، ہارون کی خالی اسامی بھی کوئی پر کر سکتا تھا لیکن سوا جیسی تابعداری اور ہارون جیسی وفاداری تو ہر ایک میں نہیں ہو سکتی تھی۔"

"اسی خاموشی میں بیگن نے پوسٹ میں گاڑی روکی تو میں دوسری طرف سے اتر گیا۔ کونزیا آگے میں تھا۔ ہمیں دیکھ کر بچے اتر آئے۔"

"ویلو، ڈیڑھ گھنٹہ میں نے اس کا بڑھا ہوا ہاتھ تھام لیا۔ مہاو ماسٹر کے آؤ۔ تم میرا ہاں ہو۔"

"چیف! کونز بولا۔" "آج بڑی مس کے تعاقب میں ایک مشکوک کار گیٹ تک آئی تھی۔"

"تم نے معلوم نہیں کیا، کہاں تک گئی تھی؟"

"میں گیٹ پر تھا چیف! چھوٹی مس کی نگرانی کر رہا تھا۔ وہ آج نہیں گئی تھیں۔"

"ٹھیک ہے، کوئی انتقام کر لیں گے۔ میں اس کا نشانہ تھپتھپاتا ہوا آگے بڑھ گیا۔" "دونوں بہنیں اسٹیڈی روم میں ہوم ورک کر رہی تھیں۔ میں نے دروازے پر دھک کر خطہ بھر ٹھیکہ کے سر لیا کا دشمن کیلہ وہ میز پر بھجکی مکھ رہی تھی اور اس کی لٹیں کاپی پر محو تھیں۔ اس نے پچھلا ہونٹ سفید اور ہوار دانتوں میں فبار کھا تھا۔"

"میں نے آگلی سے دستک دی۔ اس نے چونک کر چہرہ اٹھایا اور جلدی سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ امینہ نے بھی پلٹ کر دیکھا پھر دوسرے طے چہرہ موز لیا۔ ٹھیکہ کو شاید اس کی یہ مصمصانہ حرکت بڑی لگی تھی۔ اس نے خوشگین نگاہوں سے اسے دیکھا۔"

"مینا! یہ کیلہ تیری ہے؟"

"کیا ہوا، باجی؟ اس نے استغفار آمیز انداز میں پوچھا۔" "کام کرنا کب سے بدتریزی ہو گئی؟"

"خرم آئے ہیں اور تم نے دیکھ بھی لیا ہے؟"

"میں نے کسی کو نہیں دیکھا ہے۔" وہ دوبارہ کاپی پر بھجک گئی۔ "فرض کیا، دیکھ بھی لیا تو کیا ہوا؟ جرنال میں ہوتے ہیں، وہ استقبال نہیں کیا کرتے۔"

"آئی سے اسٹینڈ آپ۔ ٹھیکہ تیز لہجے میں بولی۔"

"چلیے..." وہ ہتھیلیاں ٹیک کر نیم استادہ ہو گئی۔ "آئی اچھے پور آرڈر۔"

"میں نے قدم بڑھا کر امینہ کی آنکھوں پر ہاتھ رکھ دیے۔ وہ ایک دم سیدھی ہو گئی اور میرے ہاتھوں کو نرم نرم آنکھوں سے ٹٹولنے اور سہلانے لگی۔"

"میں بتاؤں، کون ہے؟ جھوٹے بھیا۔ میں نے ہاتھ ہٹا دیے اور وہ ہاتھوں کے ساتھ ہی گھومتی مجھ سے پلٹ گئی۔ "واقعی بھوٹے بھیا ہیں۔"

"بھولے بھالے اور مذہبی بچوں کو بھلانے کے لیے جھوٹے وعدے کرنے ہی پڑتے ہیں مینا! میں نے اس کے دونوں ہاتھ پکڑ کر اپنے گالوں پر دے مارے۔ "لو، تم نے مار لیا۔ اب صلح ہو جانی چاہیے... کیونکہ جھوٹے بھیا کو پھر ایک جھوٹ بولنا ہو گا۔"

"پہلے یہ بتائیں کہ پہرے دار ہم پر کب تک مستط رہیں گے؟ امینہ نے پوچھا۔"

"جب تک تمہارا بھائی مصروف ہے؟"

"آپ ہمیں کچھ بتاتے کیوں نہیں خرم؟ ٹھیکہ تمہاری آواز میں بولی۔"

"یہ کیا ہو رہا ہے؟ کیوں ہو رہا ہے؟ ہمارا تو کوئی دشمن نہ تھا پھر کیا ایک دشمنوں کی یہ فوج کہاں سے آگئی؟"

"دشمن ہوتے ہیں۔ میں نے کڑی گھسیٹ کر بیٹھے ہوئے کہا۔..."

"دشمن تھے لیکن اپنی سرحد کے اندر تھے۔ جنگ کرنے کے لیے دشمن کافی عرصے تک پلاننگ کرتا ہے، جواز بناتا ہے، تپ تپ کرتا ہے۔ آپ کے ابوم حم نے جب جنگ کے آثار دیکھے، دشمن کی نقل و حرکت محسوس کی تب ہی انھوں نے اپنے دفاع کی طرف توجہ دی، اپنی حفاظت کے لیے اپنے وفاداروں کو جمع کیا، ان ہی میں میرا بھی شمار ہوتا ہے۔ یوں سمجھ لو، میں ان کی حفاظت فوج کا سپہ سالار ہوں لیکن ان کی موت دشمن کی گولی سے نہیں بچھی تھی، اس لیے محافظ ان کو نہ بچا سکے۔ وہ چلے گئے تو دشمن نے بڑھ کر ان کے کاروبار پر قابض ہونا چاہا۔ خان کے وفاداروں نے دفاعی جنگ شروع کر دی جو ابھی جاری ہے۔ جو کچھ ہمارا نقصان ہوا، اس کی گواہ تم بھی ہو۔ اب مجھے بتاؤ، اگر میں یہاں چھپا بیٹھا رہوں تو میدان جنگ میں فوج کی کمان کون کرے گا؟ کیا آپ لوگ پسند کریں گی کہ دشمن اپنے ارادوں میں کامیاب ہو جائے؟"

"لیکن دشمنی کی وجہ؟ ٹھیکہ نے ردی آواز میں پوچھا۔" "تو بڑے صلح جو انسان تھے۔"

"شاید کوئی دیرینہ وجہ رہی ہو۔" میں نے جواب دیا۔ "ہو سکتا ہے کاروباری رقابت ہو۔ خان صاحب نے مجھے صرف اتنا ہی بتایا تھا... کہ کچھ لوگ انھیں پریشان کر رہے ہیں۔"

"ابھی تک کوئی سامنے نہیں آیا، بھائی جان؟" امینہ نے پوچھا۔

"کم از کم ایک کو تو پکڑ لیجیے تاکہ پتا چلے کون لوگ ہیں۔"

"سنیے، خرم! ٹھیکہ کو مجھے اچانک کوئی بات یاد آگئی۔ وہ تمام لوگ پنجابی تھے جو مجھے لے گئے تھے۔"

"اور جن کو میں نے ٹریس کیا ہے وہ سب پٹھان ہیں۔"

"نہیں... ٹھیکہ قطعیت سے بولی۔ "ماضی سے ہمارا کوئی تعلق نہیں رہا۔ اسی جان کے انتقال کے بعد ابوجان نے ادھر کا کبھی نام بھی نہیں لیا۔ مائوں ہیں... کیا وہ دشمن ہو سکتے ہیں؟"

"ابھی میں وثوق سے کچھ نہیں کہوں گا، ٹھیکہ جان! میں نے گہری سانس لی۔ "جب میں باہر ہوتا ہوں تو میرا دھیان تم لوگوں میں رہتا ہے میں چاہتا ہوں کہ عائشی طور پر تمہیں یہاں سے شفٹ کر دیا جائے... ایسی

...

جگہ جہاں تم محفوظ رہو، برقعوں میں کلج جاؤ۔ کیا تم تعاون کرو گی؟
 "اگر آپ کے نزدیک ضروری ہے۔" ٹینہ بولی۔ اس طرح آپ
 اطمینان سے کام کر سکتے ہیں تو ہمیں کوئی اعتراض نہیں۔
 "تھینک یو ٹینہ گل! میں نے پیار بھری نظروں سے دیکھا تو
 اُس نے گہرا کر فوراً نگاہیں جھکا لیں۔ جیسا کہ سُرخی، اُس کے کانوں تک
 لالی پھیرتی چلی گئی تھی۔" مینا جان، جو کچھ پتا ہے، تھافٹے آؤ اور
 ٹینہ گل! تم میرے ساتھ ابوجان کے ڈرائنگ روم تک چلو۔ میں آج
 پشاور جا رہا ہوں خان مہم کے روایتی لباس میں۔
 وہ کرسی کھسکا کر اُٹھ کھڑی ہوئی۔ "مینا! تم جاؤ۔ سامن ٹھیک
 ہے، دو چار چپاٹیاں ڈال دو اور پھر قہوہ بھی۔ میں خرم کو ادھر چھوڑ کر
 آتی ہوں۔"
 "نہیں باقی! مجھے باوجود جی خانے میں ڈرنہیں لگتا۔۔۔ امینہ
 معنی خیز نگاہوں سے ہماری طرف دیکھتی ہوئی کمرے سے نکل گئی۔
 "ہاں باقی! ان سے وعدہ لینے کا کوئی فائدہ نہیں۔"
 "سنو! سختی پری! میں نے ہانک لگائی۔ میرے ساتھ ایک
 بزرگ بھی ہیں۔"
 ٹینہ گل نے تین وارڈروپ کھول کر دکھائے۔ ایک مغرب کا
 قدیم اور جدید فیشن بھرا ہوا تھا۔ کوٹ، پتلونس، شرٹس، کٹانیاں اور
 فیلٹ میٹس وغیرہ۔۔۔ میں نے نفی میں سر ہلادیا۔ دوسرا وارڈروپ زنانہ
 تھا، میں اُس میں جھانک کر پیچھے ہٹ گیا۔ تیسرے وارڈروپ میں
 مطلوبہ چیزیں نظر آئیں۔ میں نے میرون کلر کی شلوار، قمیص، نمڈے کی
 جیکٹ اور اسی سے میچ کرتی ہوئی گول ٹوپی نکال لی۔ ٹینہ، شوڈر یک
 سے پشاور کی چپل نکال کر صاف کرنے لگی۔ برش چلانے سے اُس کی
 سیاہ چوڑیاں بچنے لگیں۔ عجیب دل خوش کن کھن کھناہٹ تھی۔۔۔ میں
 اس چمن چمن میں کھوسا گیا۔
 "میں اکثر سوچتی ہوں۔ چمن چمنہٹ کے پس منظر میں اسس
 کی مترنم آواز ابھری۔ "تم کون ہو! کہاں سے آئے ہو؟ اس سوال کا جواب
 تو آج مل گیا لیکن اب ایک نئی سوچ نے جنم لیا ہے۔ کسی دن اچانک
 میز فائر ہو جائے گا، جنگ بندی ہو جائے گی پھر کیا ہوگا؟
 "پھر فرمیں اپنی اپنی برکوں میں واپس چلی جائیں گی۔ میں نے
 ہاتھ روم کی جانب بڑھتے ہوئے کہا۔
 "کمانڈر بھی...؟" اُس نے چہرہ گھا کر پوچھا۔
 "ہاں، کمانڈر بھی چلا جائے گا۔" میں نے اشیات میں سر ہلاتے ہوئے
 جواب دیا۔ "جانتی ہو ٹینہ گل! اس کمانڈر کا بیڈ روم کہاں ہے؟"
 ٹینہ نے بوجھل پلکیں اٹھائیں۔ اُس کی بھوری آنکھوں میں ہلادیا

تھا ایک خاموش، انقباضی، میں ایک قدم اُس کی جانب بڑھ کر کھجکا اور
 اُس کی آنکھوں کو بند کر دیا۔ "یہ دروازے میں آکر کھولیں گا، ابھی بند
 رہے دو۔"
 "بھول نہ جانا، خرم! کہیں یہ ہمیشہ کے لیے بند نہ ہو جائیں۔" وہ
 سسک کر بولی۔ "یہ گھر صرف تمہارے لیے ہے۔۔۔ اور تمہارا ہی منتظر
 رہے گا۔"
 "میں آؤں گا، ٹینہ گل! میں پٹ کر ہاتھ روم کی جانب چل پڑا۔
 "ہر شخص اپنے گھر واپس آتا ہے۔۔۔ لیکن ایک بات کہوں گا، ابھی کسی جلیے
 کو مت پالنا۔ جب کوئی جذبہ، خول جگر کی کر جان ہو جاتا ہے تو اُس کی
 موت، زندگی پر بڑی بھاری ہو جاتی ہے۔ میں آگ اور خون کا کھلاڑی
 ہوں، کھیل کا کیا فیصلہ ہوگا، کوئی نہیں جانتا۔۔۔ لیکن میں جب بھی آیا،
 تمہارے پاس آؤں گا۔ جب آؤں گا تو ہم مل کر جذبول کی اپنی دنیا تعمیر
 کریں گے، اگر نہ آیا تو۔۔۔"
 "بس خرم۔۔۔" اُس نے ہاتھ اٹھا کر سنگتی آوازیں کہا۔ میں پھر
 ہی زندہ رہوں گی، مینا کے لیے۔ اُس کا میرے سوا کون ہے۔ رہی بات
 ہڈیوں کی تو تم انجان نہیں ہو۔ ایسا جذبہ خود بخود پیدا ہو جاتا ہے، بہر کیف،
 شام سے کوئی وعدہ نہیں لوں گی، جب بھی آنا چاہو پچھتے آنا۔۔۔ یہ تمہارا
 اپنا گھر ہے۔
 "کس گھر کی بات کر رہی ہو، ابوجان؟ اس سنگ وحشت والے
 اُمر کی...؟"
 "نہیں... ٹینہ گل نے چہرہ رگڑ کر آنسو صاف کرتے ہوئے بولی۔
 "تمہارا گھر میں ہوں۔"
 "تھینک یو ابوجان! میں نے ہاتھ روم میں داخل ہو کر دروازہ بند کر لیا
 پٹھانوں کے روایتی لباس میں دیکھ کر ٹینہ گل کی آنکھوں میں
 روشنی اور بھی تیز ہو گئی تھی۔ یہ لباس میرے کھلتے ہوئے رنگ... اور
 ڈیل ڈول پر خوب سما تھا۔ امینہ نے زبان سے تعریف کی تھی، بیگن اور
 کونز کی آنکھوں میں بھی سائش آمیز چمک تھی۔
 اُن کی موجودگی ہی میں ٹھنک کی بات ہوئی تھی۔ کونز کی بوٹی
 لگائی گئی تھی کہ وہ صبح پانچ بجے، دونوں لڑکیوں کو بیڈ روم لے جانے
 اور رشیدہ کا بیڈ روم، ان کے حوالے کر دے، لیکن کوگاؤں کے لیے
 تیار کیا تھا۔
 جب میں اور بیگن بیڈ روم میں داخل ہوئے تو گیارہ بجے
 میں پانچ منٹ کم تھے۔ سب سے پہلے میں نے دھیمال کیچمپ سے
 رابطہ طایا۔ "امینہ نہیں تھی کہ اتنی رات گئے کمانڈنگ آفیسر حاضر ہوگا
 مگر پہلی ہی گھنٹی پر اُس نے ریسپونڈ اٹھا لیا تھا۔ اُس کی فٹے داری اور

بیداری نے جی خوش کر دیا۔

"میں خرم سلطان بول رہا ہوں، سر! آپ کو وزیر داخلہ صاحب نے
 پہلی کاپیٹر کے لیے۔۔۔"
 "جی ہاں، پہلی کاپیٹر بالکل تیار ہے۔" کمانڈر نے میری بات کا متے
 ہوئے کہا۔ "میں آپ ہی کا انتظار کر رہا ہوں۔"
 "پانٹ کو ایک سپرٹ اور نڈر ہونا چاہیے، سر! ہم ایک بے حد
 نازک مشن پر جائیں گے۔"
 "مجھے احساس تھا۔" اُس نے جواب دیا۔ "میں نے کیپٹن رضا کو مارک
 کیا ہے۔ براڈین اور ہم جو نوجوان ہے۔ آپ کے ساتھ اور کون ہوگا؟"
 "صرف ایک آدمی، سر! میں نے بتایا۔" پانٹ کے پاس 'سرحد
 سے بارڈر تک کا نقشہ ہونا چاہیے اور خود کار ہتھیار بھی۔"
 "سب کچھ تیار ہے۔ آپ آئیں گے تو کی دیشی دیکھ لیں گے۔"
 "تھینک یو، سر! میں آ رہا ہوں۔" میں نے سلسلہ منقطع کیا اور
 ہنٹ کو ساتھ لے کر قیدی سے ملاقات کرنے چل پڑا۔
 وہ فرش پر کروٹ کے بل سیا ہوا تھا۔ دروازہ کھلنے کی آواز سن
 کر ہڑبڑا کر اُٹھ بیٹھا اور آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے لگا۔ اگر میں پشتو زبان
 سے واقف ہوتا تو اُس سے سب کچھ آگوا لینا میرے لیے مشکل نہ ہوتا۔ وہ
 خوش رو اور مضبوط کاٹھی کا نوجوان تھا۔
 "اس کی تلاش لی، تم لوگوں نے؟" میں نے ہنٹ سے انگریزی
 میں پوچھا۔
 "ہاں۔۔۔" قیدی بول پڑا۔ "نقدی بھی پھین لی گئی ہے۔"
 میں چونک پڑا۔ وہ انگریزی جانتا تھا۔ "نقدی سے واپس کر دو۔"
 میں نے ناراض لہجے میں کہا۔۔۔ تو ہنٹ نے جیب سے چند کرنسی نوٹ اور
 اُس کا شناختی کارڈ نکال کر میرے حوالے کر دیا۔ شناختی کارڈ پر نظر پڑتے
 ہی میں اچھل پڑا۔ شناختی کارڈ پر میں نے راولپنڈی کا نام پڑھ لیا تھا۔۔۔
 محمد یونس، راولپنڈی کے ایک لواحق کاؤں کا باشندہ تھا، میں جے قبائلی
 پٹھان سمجھ رہا تھا، وہ میرے ہی خطے کا رہنے والا تھا۔ میں نے کارڈ پر چپاں
 تصویر پر نظر ڈالی پھر گہری نظر سے محمد یونس کا چہرہ دیکھا۔ واضح ہٹا کر
 اُس کو پہچانا تو داری کی آڑ میں محمد یونس کا اصل چہرہ نظر آ گیا۔
 "یاد رکھا! کمانڈر دیا ہے تم نے؟" میں نے ایک گہری سانس لے کر
 مسکرتے ہوئے کہا۔ "اپنے ہو کر غیروں سے جا ملے ہو۔" میں نے نقدی
 اور شناختی کارڈ، اُس کی طرف بڑھا دیا۔ "یہ لو اور معاف بھی کر دو۔ آؤ،
 دوسرے کمرے میں چلتے ہیں۔"
 "ایک سوال کا جواب دو گے؟" اُس نے خالص پوٹھواری زبان
 میں پوچھا۔

"دوست ہو گے تو تمہارے ہر سوال کا جواب دیا جائے گا۔"
 "کیا تم ہی خرم سلطان ہو؟"
 "ہاں، کیا تم نے ادھر مجھے نہیں دیکھا تھا؟"
 "نہیں... وہ اُنٹھے ہوئے بولا۔ "دشمن ہو کر بے حد پیارے۔"
 اُس نے پوجوش انداز میں ہاتھ ٹرچایا اور میں نے بڑھ کر تس گئے لگا لیا۔
 "اگر مجھے معلوم ہو تاکہ تمہارا تعلق پوٹھوڑا سے ہے تو میں بڑے فخر سے اُن
 لوگوں کو بتانا کہ خرم سلطان میرے خطے پوٹھوڑا کا ہے۔"
 "اب فخر کرو، مجھے بھائی بنا کر۔" میں نے اُس کا ہاتھ تھام لیا۔
 "نہیں، چھوڑ دی! میں قیدی ہوں۔ اگر اب میں نے گردن جھکانی
 تو تم مجھ پر بھروسہ نہیں کرو گے۔ مجھے یہاں سے نکلنا ہے اور دوسری بات
 یہ ہے کہ میں فدا رہی نہیں کر سکتا۔ میں حلف کا پابند ہوں۔"
 "شیطانوں سے کیا گیا حلف کسی پاس داری کا شوق نہیں ہوتا۔
 دوست! میں نے کہا۔
 "واہ... وہ ہنس پڑا۔ "ایک بڑا شیطان ایسی باتیں کر رہا ہے۔
 چھوڑ دی، تم بھی تو وہی ہو۔"
 "کیا میں وہاں بزنس کرنے گیا تھا؟ میں نے اُس کی آنکھوں میں
 آنکھیں ڈال کر پوچھا۔ "میں نے وہاں جو کچھ کیا ہے یا میرے نام سے
 منسوب کیا جا رہا ہے، وہ کسی بڑے شیطان کا کارنامہ ہو سکتا ہے...؟
 نہیں، پیارے! میں شیطان نہیں ہوں... میں خرب، اختلاف سے
 تعلق رکھتا ہوں۔"
 "ملک نواز کا ایک باغی کارکن کون ہو سکتا ہے؟" اُس نے
 طنز پر لہجے میں پوچھا۔ "پھر جو کچھ تم نے کیا، اُس کی تہ میں ایک لڑکی بھی
 ہے۔ تم نے خود باز کے گھر ایک پنجابی لڑکی دیکھی اور دل پار بیٹھے یا
 وقتی جذبہ غالب آ گیا۔ اُسے وہاں سے نکلنے کے لیے دوسروں کی توجہ
 ہٹانا ضروری تھی لہذا تم نے فیکٹری کو آڑا دیا۔ لوگ ادھر دوڑے اور تم
 لڑکی کو نکال لائے۔"
 "چلو، اگر یہی بات ہے تو کیا کسی لڑکی کو اُن دندلوں کے
 نمٹے سے کمانڈر شیطانی کام تھا؟"
 "اب وہ کہاں ہے؟"
 "اپنے گھر۔۔۔ والدین کے پاس۔"
 "کیا واقعی؟" اُس نے بے اعتباری سے پوچھا۔ "تم نے اُسے
 اپنے پاس نہیں رکھا؟"
 "نہیں، بھائی! مجھ سے زیادہ اُس کی ضرورت، اُس کے غم زدہ
 خاندان کو تھی۔"
 "حالانکہ ادھر بنیاد اُس لڑکی کو بنایا گیا ہے۔" وہ کھوٹے کھوٹے

سے لہجے میں ہلکا۔
 "اس کو چھوڑو، یا راکہ وہ کیا سوچتے ہیں۔ میں نے کندھے اچکا کر کہا۔ بات میرے دوست کی کرو جسے تمہارے ساتھی لے گئے ہیں اور میں تمہارے ساتھ بذریعہ پہلی کاپڑائے واپس لانے چلا ہوں۔"
 "پہلی کاپڑا...؟ اس نے چونک کر پوچھا اور میں نے اثبات میں گردن ہلا دی۔ "کیا وہ شخص اتنا اہم ہے یا تم مجھے چمکدے رہے ہو؟"
 "ہاں، پیادے، وہ اتنا ہی قیمتی ہے۔ اب تم سوچ کر بتاؤ، دل سے تعاون کرو گے؟"
 "سوری، خرم سلطان! اس نے دو ٹوک انداز میں جواب دیا۔ اقل تو میں ذیل کلاس نہیں کروں گا۔ بالفرض اگر ایسا کر بھی لیا تو وہاں جا کر میں زندہ نہیں رہ سکتا۔ ادھر قانون کی حکمرانی نہیں ہے، چوہدری! ادھر تو صرف ایک سیکڑ میں گولی فیصلہ کر دیتی ہے۔ ہاں، اگر میں تمہیں قیدی بنا کر پیش کر دوں اور تم اپنی جرات اور ذہانت سے نکل آؤ تو مجھے خوشی ہوگی۔"
 "اگر میں انسانیت اور وطن کے نام پر تم سے تعاون مانگوں تو...؟"
 "اوپنہ... اس کے حلق سے غراہٹ ابھری اور چہرے پر نفرت کے ناگ پھکارنے لگے۔ "کس انسانیت کی بات کر رہے ہو، جو یہاں کے لوگوں میں پائی جاتی ہے جس نے مجھے اس لیے ٹھوکر دیں کہ میری ذات بیچ رہی تھی۔ میں ایک غریب موی کا بیٹا ہو کر رہا ہوں۔ اسے کا امتحان دے رہا تھا، میرے باپ کو اس لیے دن کی روشنی میں قتل کر دیا گیا کہ اس نے ایک بڑے راجا کے میز پر ٹیبلٹ کی حرام زدگی پر احتجاج کیا تھا، میری بہن کو اسکول جاتے ہوئے اس لیے اغوا کر لیا گیا تھا کہ وہ گاؤں کے ایک کین کی خوبصورت بیٹی تھی، مجھے اس لیے چوری کے مقدمے میں تین سال کے لیے جیل بھیج دیا گیا تھا کہ میں نے ایک غیرت مند بھائی بنا چاہا تھا۔ اس کی آواز پھٹ کر بھر بھرنے لگی۔ "کس انسانیت اور وطن کا نام مجھے دو گے؟ بتاؤ، میرے وطن نے مجھے کیا دیا؟ ذلت، ٹھوکر، جھوٹ اور جیل۔"
 "نہیں، چوہدری! میں ایسی انسانیت پر لعنت بھیجتا ہوں۔"
 "سنو، میرے دوست! میں نے بھیجے ہوئے نوجوان کے شانے پر چھلی دی۔ "جراتی کا مقابلہ برائی سے نہیں کیا جاتا۔ آگ، آگ سے نہیں پانی سے بجھائی جاتی ہے۔ وہ بڑا راجا ایک فرد ہے، قوم نہیں ہے... میں تو انہوں کا کہہ گا کہ وہ انسان ہی نہیں ہے۔ ایک فرد کے ظلم کا انتقام پوری قوم سے لے رہے ہو۔ تم نے کبھی سوچا کہ یہ چرس انیون اور ہیروئن کون لوگ استعمال کرتے ہیں... کیا بڑے بڑے چوہدری، ہاک اور راجے؟ نہیں، برادر! وہ لوگ اگر نشہ کرتے ہیں تو غیر ملکی شراہیں پی رہے ہیں، انسانوں کا ہونا چاہتے ہیں۔ چرس اور ہیروئن تو ایسے لوگ استعمال کرتے ہیں جو معاشرے کے ٹھکانے ہوئے ہوتے ہیں... وہ

اپنے دکھوں کو نہ ہریلے دھوئیں میں مدغم کرتے ہیں۔ تم بڑے لوگوں سے نہیں اپنے جیسے دکھی انسانوں سے انتقام لے رہے ہو۔"
 "نٹے کی حد تک شاید ایسا ہی ہو۔" وہ بولا۔ "لیکن میں جو دولت کما کر گھروں میں رکھتا ہوں، اس سے میرا خاندان، ان بڑوں سے انتقام لیتا ہے۔ تمہیں نہیں معلوم، چوہدری! دولت میں کتنی قوت ہے۔ میرے باپ کی رپورٹ پر قانون حرکت میں آجاتا ہے، میرے باپ کے اشارے پر پولیس بڑے بڑے راجوں کو گھسیٹ لے جاتی ہے، گاؤں والوں کے نزدیک میں امریکہ میں بہت بڑا آفیسر ہوں، ہم نے گاؤں کے اکبر باز سفید پوشوں سے زمینیں خریدنی شروع کر دی ہیں، گاؤں میں میری کوٹھی تیرہ مرے پر سر اٹھانے کھڑی ہے، میری بہن گھاری میں کالج جاتی ہے، یہ کس سے انتقام ہوا، چوہدری؟"
 "چلو، اگر تم دولت ہی کے بجائے جو تو اپنے تعاون کی قیمت لگاؤ میں تمہارے ساتھ تمہارے گھر چل کر پے منٹ کروں گا۔"
 "یار! تم مجھے کی کوشش کیوں نہیں کرتے؟ وہ زچ ہو کر بولا۔ "میں سونے کا انڈا دینے والی مرغی کو ذبح نہیں کر سکتا۔ تم ایک بار پے منٹ کر دو گے، اس کے بعد کیا ہوگا؟ اول تو میرے تعاون کو ادھر گولی سے اڑا دیا جائے گا، اگر بچ گیا تو مجھے گاؤں واپس جانا پڑے گا۔" تم رات کی تاریکی میں مجھے فیکٹری ایریا میں چھوڑ کر الگ ہو جانا۔ "نہیں، میں ان لوگوں سے فداکاری نہیں کروں گا، جنہوں نے مجھے فرس سے اٹھا کر عزت، دولت اور شہرت کے عرش پر بٹھایا ہے۔ ہاں، اگر تم چاہو تو میں خان جبار سے معافی دلوا سکتا ہوں۔ وہ تمہاری جرات سے خاصا متاثر ہے مگر تمہیں دو چار ماہ اندر انرویشن رہنا ہوگا۔"
 "کیا یہ تمہارا آخری فیصلہ ہے؟"
 "ہاں، آخری اور اٹل۔"
 "اٹل نہ کہو، محمد یونس! ایک دم میرا الجھ بدل گیا۔ تم نے لوگوں سے میرا نام اور میرا کارنامہ سنا ہوگا۔ تم نہیں جانتے اور لوگ بھی بے خبر ہیں کہ خرم سلطان کیا ہے، جس شخص کے اشارے پر فوج کا پہلی کاپڑ تیار ہو گیا ہے، وہ اپنے اندر کوئی غیر معمولی طاقت رکھتا ہوگا۔ طاقت فیصلوں کے پہاڑ دینہ دینہ کر دیا کرتی ہے۔ میں تمہارا اٹل فیصلہ بدل دوں گا۔" کوشش کر دیکھو، خرم سلطان! وہ شلے اچکا کر بولا۔ "تم تشدد کے حباب آناؤ۔"
 "نہیں، برادر! میں جسمانی تشدد کا قائل نہیں ہوں... میرے پاس روحانی تشدد کے کئی حربے ہیں۔ مثال کے طور پر تمہاری بہن۔" "بھوس بند کرو۔" وہ دباؤ نہ ہوا اچھلا اور میں اس کا منہ کھاکر دیوار سے جا لگا۔

"جی خوش کر دیا، تم نے۔" میں اپنا جڑا سہلانا ہوا بولا۔ "میرے خطہ پٹھان کی مٹی ایسی ہی ہے۔ تم نے اس مٹی کی روایات کی لالچ رکھ لی ہے۔ اگر تم بہن کا نام سن کر گردن جھکا لیتے تو مجھے بڑا دکھ ہوتا۔" "اگر... اگر..." وہ ہلپتے ہوئے غرایا۔ "تم نے اپنی گندی زبان سے پھر یہ نام لیا تو میں تمہاری زبان کھینچ لوں گا۔"
 "جھجوری ہے، دوست! میں نے خون آلود ٹھوک زوال میں جذب کرتے ہوئے کہا۔ "ہاں، تو میں کہہ رہا تھا کہ تمہاری بہن کو..."
 "شٹ اپ... نٹے! وہ پھر بھڑک کر اٹھا لیکن میں نے آزمودہ واڈ سے فدا جھک کر اسے ہاتھوں پر لیا اور پیچھے اچھال دیا۔ "ہنٹ..." میں نے کہا۔ "اس کو روکو، تاکہ میں بات مکمل کر لوں۔" جھٹ نے ریلواری تان لیا۔ "سنو، محمد یونس! میں اپنی روانگی ملتوی کر رہا ہوں اور دو گھنٹے کے اندر اندر تمہاری بہن یہاں ہونگی اور تمہارا سارا خاندان میرے آدھوں کی نگرانی میں ہوگا۔ میں اور تم ہارون کو ہارنے جائیں گے۔ میں تحریری حکم چھوڑ جاؤں گا کہ اگر میں دو دنوں تک ہارون کے ساتھ واپس نہ آؤں تو محمد یونس کی کوٹھی کو آتار قدیم بنادیا جائے اور اس کی بہن کی لاش گاؤں کے کھیتوں میں پھینک دی جائے۔ یہ میرا اٹل فیصلہ ہے جسے تم نہیں بدل سکو گے... جھٹ! اسٹریس کہو، فون کے پہلی کاپڑ اس ماؤنٹ کرواؤ... پھر تیرا فٹنگ گاڑی اور اسپیشل اسکاؤڈ محمد یونس کے گھر روانہ کر دیا جائے۔"
 "ٹھہرو..." وہ ہاتھ اٹھا کر چیخا۔ "تم... مجھے منظور ہے۔"
 "وفاداری کی ضمانت کیا دو گے، برادر؟"
 "میرا خاندان ادھر ہی ہے، تم لوگ دھوکے کی صورت میں اپنی کارروائی پر عمل کر سکتے ہو۔"
 "ٹھیک ہے لیکن اب تم وہاں میرے ساتھ دو گے۔"
 "میں اپنی بہن کی سلامتی کے لیے تمہارا ہر حکم مانوں گا۔"
 "مجھے یقین ہے محمد یونس! میں نے نرم لہجے میں کہا۔ "جب ہم واپس آئیں گے تو تمہارے ساتھ اتنی دولت ہوگی کہ تمہیں اس مرغی کی ضرورت نہیں رہے گی۔ آؤ چلیں۔"
 "لیکن نے جب ہمیں کیمپ کے مین گیٹ پر اتارا تو شناخت کی کارروائی کے بعد ہمیں ایک کیمپن جیپ میں اندر لے گیا۔ میں نے یونس کو کیمپن کی نگرانی میں وینٹک روم میں چھوڑا اور خود کمانڈر کے آفس میں چلا گیا۔ کمانڈر نے اٹھ کر مصافحہ کیا پھر کرسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ "میرا خیال تھا، کوئی فوجی ہوگا۔"
 "فوجی بھی اللہ کا سپاہی ہوتا ہے اور ایک مجاہد بھی اسی منزل کا لہجی ہوتا ہے، سر۔"

"آف کورس... کمانڈر نے سپر وٹ کے نیچے سے ایک تہ کیا ہوا کاغذ نکالا۔ "میں نے نقشہ حاصل کر لیا ہے۔ دیکھ لیں، آپ کا بیوی بچہ سرور کرے گا۔"
 "یہ میرا ساتھی بتائے گا۔" میں نے نقشہ کھول کر دیکھا... "میں پائنٹ آفیسر سے ملنا چاہوں گا۔"
 "وہ پہلی پیڈ پر آپ کو ملے گا۔ ویسے میں نے اسے بریف کر دیا ہے۔" میری درخواست پر کمانڈر نے گھنٹی بجوا کر ایک سپاہی کو بلایا اور اسے وہاں کوالے کا حکم دیا۔ "اگر مناسب ہو تو بتا دیجیے کہ مشن کی نوعیت کیا ہے؟"
 "ایک اہم اہلکار کو اغوا کر لیا گیا ہے۔ اس کی بازیابی مشن ہے۔" "ایسے مشن کے لیے کیا پہلی کاپڑ کا استعمال سودمند ہوگا؟"
 "جی ہاں۔" میں نے کہا۔ "ہم افغانستان کی سرحد پر آکر واپسی کا سفر کریں گے۔ کیونکہ زمینی راستوں پر جگہ جگہ ان کی چوکیاں ہیں۔" یونس کو اندر لایا گیا تو میں نے نقشہ اس کے سامنے پھیلا دیا۔ "تم رہبر ہو گے، برادر! اس لیے وہ جگہ تلاش کر کے پین پوائنٹ کر دے، تاکہ ہم فضا میں جھٹکنے سے بچ جائیں۔"
 "یونس نے ایک ہال پوائنٹ اٹھایا اور نقشے پر جھک گیا۔ پانچ چھ منٹ تک وہ لکیروں پر پینسل پھیرنے کے بعد بولا۔ "یہاں ہے، فضل کالونی۔"
 "فضل کالونی سے تمہاری مراد؟"
 "جہاں آپ کو جانا ہے۔"
 "اب بتاؤ، پہلی کاپڑ کہاں محفوظ لینڈنگ کر سکتا ہے؟" میں نے کہا۔ "ایسی جگہ جہاں کچھ دیر پہلی کاپڑ محفوظ رکھراہ سکے۔" وہ پھر نقشے پر جھک کر دیکھنے لگا۔ "یہاں پہاڑی ہے۔ اس نے ایک جگہ نشان لگاتے ہوئے کہا۔ "پہاڑی کے نیچے نوین لینڈ شروع ہو جاتی ہے۔ مقامی لوگ ادھر صرف اسی وقت جلتے ہیں جب کسی کو افغانستان میں داخل ہونا ہو، ورنہ ادھر خانہ بدوش عارضی کیمپ لگاتے ہیں۔ ہم وہاں کسی دیوان جگہ، سرکنڈوں کے جنگل میں پہلی کاپڑ چھپا سکتے ہیں۔"
 "آؤ، پہلی پیڈ پر چلیں۔ کیمپن کو یہ پوائنٹ بتانے ہوں گے۔" بارہ بج کر پچیس منٹ پر ہم جب فضا میں بند ہوئے تو نیچے شہر کی روشنیاں جاگ رہی تھیں اور شہر کے لوگ نیند کے مزے لوٹ رہے تھے۔ میری آنکھوں میں بھی نیند کی ریت چھنک رہی تھی لیکن میں صرف آنکھیں جھپکاسی سکتا تھا، آنکھ لگانے کی اجازت نہ تھی۔ میں نے معذرت کے ساتھ یونس کے ہاتھ، اس کی پشت پر باندھ دیے تھے۔

انسان عجیب شے ہے۔ ارادہ بدلنے میں دیر نہیں لگاتا۔ اگر فضا میں اس کا ارادہ قلابازی کھا جاتا تو پہلی کا پٹر جیسی حساس سواری میں اچھل کود کی گنجائش نہ تھی۔ بزرگوں نے کہا ہے کہ علاج سے پرہیز بہتر ہوتا ہے۔ علاج میں موت کے امکانات ہوتے ہیں جبکہ پرہیز میں بیماری کے مواقع بہت کم رہ جاتے ہیں۔

کیپٹن رضانہ صرف ایک وجہ نوجوان تھا بلکہ بہت اچھا ہم سفر بھی ثابت ہوا تھا۔ مجھے اس نے اپنے ساتھ والی سیٹ دی تھی۔ حالانکہ اسے بتا دیا گیا تھا کہ ہم ایک خطرناک سفر پر جا رہے ہیں مگر وہ ہمتناش بٹاش نوجوان خوف سے بہت دور چمک رہا تھا اور زندگی کے روشن پہلوؤں کی باتیں کر رہا تھا۔ کیونکہ خاموشی آنے والے نامعلوم لمحات کی یاد دلاتی ہے۔ انسان ہونے کے ناتے ہم اس لمحے سے بے خبر بھی تھے اور لا شعوری طور پر شاید ہم موت سے خوف زدہ بھی رہے ہوں۔ کیپٹن نے ڈانٹوں پر پھر کئی روٹینوں کو دیکھا کچھ کل پڑے چیک کیے۔ معاف پاؤں پر دباؤ سمجھوس ہونے لگا۔ پہلی کا پٹر مزید بلندی کی جانب اٹھنے لگا۔ "اب ہم پشاور کے قریب سے گزر رہے ہیں۔ کیپٹن رضانہ بتایا۔ پھر اس نے نقشہ کھولا تو میں نے جھک کر نیچے دیکھا۔ یوں لگا جیسے ہم تاریکی کے سمندر میں ڈوبے سفر کر رہے ہوں۔ بہت دور بائیں جانب زمین پر بہت سے جگنو چمکتے نظر آ رہے تھے۔ یہ پشاور ہی ہے۔ کیپٹن بولا۔ پہلے ہم پولیٹیکل ایجنٹ کے کنڈیڈینس پر اتریں گے۔"

اندھیرے کی وجہ سے کیپٹن کو خاصی پریشانی کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ وہ پولیٹیکل ایجنٹ کے ریڈیو کواکوشش کے باوجود نقشے اور ڈانٹوں کی مدد سے ٹریس نہیں کر سکا تھا۔ پہلے وہ پہلی کا پٹر کو نیچے لے گیا۔ دو چکر لگا کر پھر اوپر اٹھا۔ تب ہی بائیں جانب خاصے فاصلے پر مارچوں کی سبز روشنیاں جلنے بجھنے لگیں۔

"سبک دینا پڑے گا سر خرم؟" اس نے پہلی کا پٹر کا رخ اسانوں کی جانب موڑتے ہوئے کہا۔

"اگر خیر متعلقہ لوگ ہونے تو؟ میں نے پوچھا۔

"یہ فیصلہ وقت ہی کرے گا۔ میں زیادہ دیر فضا میں نہیں رہ سکتا۔ ایندھن کا خیال رکھنا ہے۔"

میں تن بہ تقدیر فائوش ہو گیا اور پہلی کا پٹر نیچے گرا چلا گیا۔ یونس کوٹ کے بل نیم دروازہ گہری زمین میں ڈبا ہوا تھا۔ جب پہلی کا پٹر زمین پر ٹکا تو وہ اٹھ بیٹھا۔

"کیا مطلوبہ جگہ آگئی ہے؟" اس نے پوچھا۔

"ہاں دوست... میں نے سیٹھی بیلٹ کھولتے ہوئے جواب دیا۔

"لیکن پہلے پڑو ہے۔"

کیپٹن نے انجن بند کر دیا لیکن اوپر کا پٹر پکاھٹھوڑی دیر تک ٹھوتا رہا تھا۔ ہم سرج لائٹ کی زد میں تھے۔ نچتر عمارت چالیس پچاس گز دور تھی اور تین آدمی ہاتھ پاؤں کر رہے تھے۔ پہلی کا پٹر سے باہر آنے کا اشارہ کر رہے تھے۔ پہلے میں اتروں گا کیپٹن! میں نے دیوالوڑ پوسٹر سے نکلتے ہوئے کہا۔ اگر گڑبڑ ہوئی تو میں سرکومین بار کھولوں گا، آپ اور جاؤں گے۔

"مجھے ایسا سبق کسی نے نہیں پڑھایا، دوست! اب ہماری تقدیر کی تحریر ایک ہو گئی ہے۔ آپ جاؤں میں کنوں کا رخ ادھر رکھوں گا۔ ان اشارت سمجھنے کی آواز کے ساتھ ہی آپ نیچے گر جائیں گے۔"

"ختم! مجھے ساتھ لے چلو۔ کسی بھی گڑبڑ میں بہتر طور پر سنبھال لوں گا۔ یونس نے کہا۔

"ابھی نہیں پیدارے! شاید دوست ہی ہوں۔ میں نے پہلی کا پٹر سے چھانگ لگادی۔

ان تینوں میں سے ایک آگے بڑھا تھا۔ وہ پیشانی کی یونیفارم میں لمبوس تھا۔ اس کے ہاتھ میں صرف تارچ تھی جبکہ ادھر کھڑے تھے دو لوگ آدمی مسلح تھے اور ہفت کا نشانہ لیے ہوئے تھے۔

"شناخت..." مجھ سے چند قدم دور رک کر وہ دوستانہ لہجے میں بولا۔

"پاک آدمی! میں نے جواب دیا۔

"خوش آمدید! وہ بولا۔ "تشریف لائیے۔ پی۔ اے صاحب آپ کا انتظار کر رہے ہیں۔"

میں نے آگے بڑھ کر اس سے مصافحہ کیا۔ اور اس کے ساتھ چل پڑا کٹے گیٹ کے اندر بھی نقل و حرکت جاری تھی اور دھڑکی دار سوٹ میں جنوں ایک طویل القامت شخص برآمدے میں کھڑا میری طرف دیکھ رہا تھا۔ اس کے دائیں بائیں دو ایسٹین ٹراؤگٹے کھڑے غرارے تھے۔ اس نے ان دونوں کو ہڑکا اور میری طرف بڑھا۔ تین سیڑھیاں چڑھ کر میں نے مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھایا۔

"مسر خرم سلطان؟" اس نے میرا ہاتھ تھام کر پوچھا۔

"میں مسر! میں نے سرکوشیاں جنیش دی۔ کیا میں جواب پانی لے سے مخاطب ہوں؟"

"ہاں، دوسرے کہاں ہیں؟" ان کے انداز میں گرم جوشی مفقود تھی۔

"ان کو بھی اندر لے آئیں۔ پائلٹ کو داپس جانا ہے۔ میں نے چلنے کا انتظام کر رکھا ہے۔"

میں نے پلٹ کر دیکھا۔ گیٹ پر کھڑے نرمان پہلی کا پٹر کو دیکھ رہے تھے۔ میں نے واپس جا کر کیپٹن رضا کو اوکے کی رپورٹ دی۔ اور یونس کی بندشیں کھول دیں۔

چلنے والی می پرتکف تھی۔ طوعے کے ساتھ ابلے ہوئے اندرے تھے۔ پی۔ اے صاحب اچھے میزبان اور فرض شناس انسان تھے۔ چلنے خود بنا کر دی تھی۔ شہر خیر کر رہے دل نشین انداز میں باتیں کرنے کے فن سے واقف تھے۔ غالباً ایک پولیٹیکل ایجنٹ کے لیے اس فن سے آشنا ہونا ضروری رہا ہو اپنی بات منانے کی صلاحیت بھی رکھتے تھے۔

ممر کر رہے میری بات ہوئی ہے۔ انھوں نے چلنے کا سپ لیتے ہوئے کہا۔ میں نے ان کو مقامی بخوری سے آگاہ کیا ہے اور فیصلہ کیا گیا ہے کہ یہاں سے آگے باقی روتو سفر کیا جائے اور پہلی کا پٹر کو پشاور رپورٹ پر واپس بھیج دیا جائے۔ میں نے بیس کلنڈر سے بھی بات کر لی ہے... ہم بوقت ضرورت شارٹ نوٹس پر پہلی کا پٹر منگوا لیں گے۔ یہاں کے لوگ سرکاری عمل دخل کو اچھی نگاہ سے نہیں دیکھتے... کوئی بھی دور سے فائر کر سکتا ہے۔"

"کیوں ختم صاحب؟ کیپٹن رضانہ پوچھا۔ آپ یونٹس کمانڈر آپ ہیں۔ مجھے آپ کی ہدایات کا پابند کیا گیا ہے۔"

"اور میں پی۔ اے صاحب کی ہدایات کا پابند ہوں۔ میں نے سکرار کو جواب دیا۔ پہلی کا پٹر قوی لمانت ہے... پی۔ اے صاحب کی ہدایات پر عمل کیا جانا چاہیے۔"

"ہم صبح سات بجے یہاں سے روانہ ہوں گے۔ پی۔ اے صاحب بولے۔ میں ساتھ چلوں گا۔ میری گاڑی جانی پہچانی ہے۔ میں علاقے میں اکثر خیر سنگالی دورے کرتا رہتا ہوں۔ مطلوبہ جگہ سے تھوڑی دیر نہیں اُتار دیا جائے گا۔"

"ٹھیک ہے جناب! یونس بول پڑا۔ ہم خان ورازی کی گڑھی میں اتر جائیں گے۔ خان جبار کا حوالہ دے کر کچھ وقت ہم وہاں گزریں گے پھر کسی بھی وقت کاٹنی میں داخل ہو جائیں گے۔"

"مجھے اتنی ہی ذمہ داری سونپی گئی ہے میں وہاں تک پہنچا دوں گا۔ پی۔ اے صاحب اٹھتے ہوئے بولے۔

"کیپٹن! آپ چلے جائیں۔ میں نے کہا تو کیپٹن رضانہ اٹھ کر مجھ سے مصافحہ کیا اور خدا حافظ کہتا ہوا پی۔ اے صاحب کے ساتھ ہانپنکل گیا۔

نندانہ اکرام کی وجہ سے بدن پر طاری کسل مندی دور ہو گئی تھی۔ یونس کا رویہ بھی خوش گوار اور دوستانہ تھا۔ اس لیے میں نے اسے وقت کے حوالے کر کے آزاد ہی رہنے دیا تھا۔ ٹھیک سات بجے ہم دو چرخوں میں روانہ ہوئے۔ ایک چپ میں پی۔ اے صاحب کے ہاڈی گارڈز تھے اور دوسری میں ہم تینوں سوار تھے۔ دوران سفر کسی جگہ کوئی دشواری پیش نہیں آئی تھی۔ وہی پتھر بنی زمین کٹے پٹے ناہولہ راستے، مسلح آنادامنش... اور اونٹوں کی قطاریں دیکھنے میں آئی تھیں۔ پی۔ اے صاحب کی نشان زدہ

چپ کو کسی بھی چوکی پر نہیں بندھا گیا تھا۔

خان ورازی کی گڑھی چند دھوکوں پر مشتمل تھی۔ سرسبز کھیت حد تک ایک پھیلے ہوئے تھے باغات اور چھوٹی چھوٹی نہروں کا جال سا بچھا ہوا تھا، ادھی ساخت کے ٹریٹر کھیتوں میں مصروف کار تھے۔ کچھ ترک ایک باغ کے کنارے کھڑے، انگوڑی ٹوکریاں لٹو کر رہے تھے۔

یونس نے بتایا کہ دوازخان، زردلی یونیورسٹی کا گریجویٹ نوجوان ہے جس نے اپنی زمینوں میں کوئٹہ بلکہ پوری گڑھی کو جدید زراعت سے روشناس کرایا تھا۔

بن دیکھتے ہی مجھے اس نوجوان سے عقیدت سی ہو گئی تھی۔ بوقت واپسی پی۔ اے صاحب نے چند ہدایات دیں۔ ان میں ایک نمایاں ہدایت کردار سے متعلق تھی۔ ان کا خیال ہوا ہوگا... نوجوان لڑکے کوئی جذباتی حرکت نہ کر بیٹھیں۔ انھوں نے سختی سے ہدایت کی تھی کہ نگاہوں کو جھکا کر رکھنا۔ ورنہ یہاں اٹھتی ہوئی نگاہ کو کوئی روکتا نہیں ہے بلکہ وہ بنگاہ فوراً چھید دی جاتی ہے۔

"یہ بھی رکھ لو۔" انھوں نے ایک شارٹ ڈنچ ٹرانسمیٹر دیتے ہوئے کہا۔ اس میں فریکوئنسی سیٹ کر دی گئی ہے۔ جنگلی صورت حال میں رابطہ کر لینا اور اگر وقت ملے تو اپنی خبریت سے بھی آگاہ رکھنا۔ مرکز مجھ سے رابطہ رکھے ہوئے ہے۔"

نہاں میرے لیے بہت بڑا مسئلہ تھا۔ میں خود کو یونس کا دست بند محسوس کرنے لگا تھا۔ وہ اگر میری موجودگی ہی میرے خلاف ہو جاتا تو میں بڑوں اور اندھوں کی طرح چپ چاپ اس کا منہ نہکتا رہتا۔ بیرونی مجموعی تھی۔ میں نے خود کو وقت اور حالات کے دھم دکر کم پر چھوڑ دیا۔

"تم میرے کرن ہو۔" یونس نے ایک نالی پر بیٹھتے ہوئے کہا اور چوتھو چکر پانی پینے لگا۔ میں نے بھی اس کی تقلید میں پانی پیا اور منہ ہاتھ دھو لیا۔ دوازخان کا قبیلہ شاید صدیوں سے جبار خان کا مخالف چلا آ رہا ہے لیکن دوازخان ایک تعلیم یافتہ اور سیاست دان نوجوان ہے۔ اس کی وجہ سے یہ آگ ذب گئی تھی لیکن جس رات بڑے خان نے تمھارے اعزاز میں دعوت عام دی تھی اس رات کسی وجہ سے جب خان بھڑک اٹھا تھا، تب سے دونوں طرف خطرے کی گھنٹیاں بج رہی ہیں... میں دوازخان سے پناہ طلب کر دوں گا۔ اگر پناہ مل گئی تو پھر کوئی لائحہ عمل سوچیں گے۔ بصورت دیگر کچھ بھی ہو سکتا ہے لیکن میں اس کے علاوہ اور کچھ کر بھی نہیں سکتا۔"

"پہلے پناہ حاصل کرو، یونس خان! پھر میں تمھیں گائیڈ لائن دوں گا۔"

"آؤ، وہ سامنے دوازخان کا عمل ہے۔ یونس نے اشارہ کیا۔ میری

بربروں والی ایک وسیع میٹلے رنگ کی عمارت کھڑی تھی۔
میٹلی ناگن کی مانند بل کھاتی کچی شرک سے عمارت کا فاصلہ ایک
میل دیا ہوگا۔ یوں نظریاتی فاصلہ چند سو گز ہی تھا۔ آخری موڑ پر جگہ ہموار
کر کے پارکنگ لٹ بنایا گیا تھا۔ وہاں ایک آف روڈ ٹرک اور ایک روٹی
ساخت کی وین پارک تھی جس کے پیچھے جتے اور غیر معمولی موٹے تھے۔
مین گیٹ بند تھا۔ دائیں بائیں سوراخوں والے برجوں میں سے
ایک برج میں کوئی چیخ کر بولا تھا۔ جابا یونس نے بلند آواز سے کچے بتایا...
تھوڑی دیر بعد کواڑوں میں ایک فرانچ جھری نمودار ہوئی اور اس میں
سے ایک نوجوان رنگ کر باہر آگیا۔ اس نے گہری نظروں سے باری
باری ہم دونوں کا جائزہ لیا۔ اس دوران میں یونس تیز تیز باتیں کرتا رہا تھا...
اس نے جھری کی جانب اشارہ کیا اور ایک طرف ہٹ کر کھڑا ہو گیا۔
"اندر جانے کی پرمیشن تو مل گئی ہے۔" یونس نے میری پشت پر ہاتھ
مکھڑکے بتایا۔ پہلے میں اندر داخل ہوا... پھر یونس اور اس کے بعد نگران
اندر آیا۔

انمازیاسی تھا جیسے ہمیں حراست میں لیا گیا ہو۔ میں جھکے ہوئے
گھوڑے کی مانند گردن جھکائے تھکے تھکے قدموں سے چلنے لگا۔ اصل تھکن
تو اس بے بسی کا احساس تھا جس سے میں دوچار تھا۔ بڑی عمارت سے
میں تیس گز نیچے ایک گول کمرہ تھا، جس کے دروازے کھڑکیاں... اور
روشن دان بھی کھلے تھے۔ ہم ایک دروازے سے اندر داخل ہوئے
تو حیرت سے میری آنکھیں پھیل گئیں۔ وہ ایک دیدہ زیب ڈرائنگ روم
تھا جس کی پردوں سے لے کر فائوسوں تک ہر شے خوش رنگ، جدید
اور خوبصورت تھی۔

پیغام رسائی کا نظام میری سمجھ میں نہیں آیا تھا۔ کیونکہ میں اندر
لانے والا شخص 'ڈرائنگ روم' میں ہی موجود رہا تھا لیکن دو منٹ بعد
ہی ایک حبیبہ نوجوان اندر داخل ہوا۔ یونس جلدی سے اٹھ کھڑا ہوا۔
میں بھی اس کے ساتھ ہی کھڑا ہو گیا۔ فرق صرف اتنا تھا کہ یونس کی گردن
جھک گئی تھی جبکہ میں نے ولے کی نیلی آنکھوں میں جھانک رہا تھا۔
وہ سیدھا میری جانب ہی آیا اور مصلحے کے لیے ہاتھ بٹھایا۔ چونکہ لباس
کے حوالے سے میں بھی پتھان تھا، اس لیے اس نے جو کچھ کہا تھا... وہ
میری سمجھ میں نہیں آیا تھا۔ میں نے اس کا نرم مگر مضبوط ہاتھ گرم جوشی
سے دبایا اور مسکرایا۔ ایک ٹونگا اور کبھی کیا سکتا تھا۔
اس کی نیلی آنکھوں میں لمحہ بھر کے لیے الجھن ابھری پھر وہ یونس
کی طرف متوجہ ہو گیا تھا۔

"خان محترم! یونس ادب سے منمنائی آواز میں بولا۔ "میرا کزن
ہے۔ پشتو نہیں جانتا اور میرا تعلق فضل کالونی سے ہے۔"

نوجوان چونک کر ایک دم پیچھے ہٹ گیا... پھر مجھے شستہ
اردو میں پوچھا۔ "کوئی پیغام لانے ہو، دوست؟"
"نہیں، خان محترم! یونس نے نفی میں گردن ہلائی۔" میں فیکٹری
میں کام کرتا تھا۔ چونکہ کہا جاتا ہے کہ فیکٹری ایک پنجابی نوجوان نے تیار
کی ہے، اس لیے خان جیاد کے نزدیک تمام پنجابی مقدار اور مجرم قرار دیے
گئے ہیں۔ حالانکہ چند پنجابی نوجوان عرصہ دراز سے وہاں خدمات سر انجام
دے رہے تھے۔ اگر میں تنہا ہوتا تو ادھر ادھر چھپ جاتا لیکن یہ میری یا
اس کی بدقسمتی تھی کہ میں اسے بھی بلا چکا تھا۔ یہ زبان نہیں جانتا تھا،
اس لیے وہاں نہیں کھپ سکتا تھا۔ لہذا میں اپنا بھائی اور مستقبل لے کر
خان محترم کے در پر آیا ہوں کیونکہ ہم واپس نہیں جاسکتے... بابر خان
چار قتل کر چکا ہے اور میں جیل کا مفروضہ قیدی ہوں۔
وہ ایک دم میرے قریب آگیا۔
"قتل کی وجہ کیا تھی، دوست؟"

"ہمارے ہاں، نڈنڈن اور زمین پر فساد ہوتے ہیں، خان! میں
نے مضبوط انداز میں جواب دیا۔ ایک بڑے آدمی نے میرے خاندان
کی لڑکی اغوا کر لی تھی۔ میں نے ان کو بھون کر رکھ دیا۔"
"خوب..." اس نے میرے شانے پر زور دار چھکی دی...
"دراز خان کے گھر اور دل کے دروازے تم جیسے غیرت مندوں کے
لیے دن رات کھلے رہتے ہیں... لیکن یہاں ابھی کوئی فیکٹری نہیں
ہے۔ تم لوگوں کو میرے ساتھ مل کر مٹی کو سونا بنانا ہوگا۔ ویسے یہاں
فیکٹری بھی قائم ہوگی مگر اس میں زہر تیار نہیں کیا جائے گا بلکہ فروٹ
کو دیر پا بنانے اور دھڑک لے جانے کے لیے ڈبوں میں محفوظ کیا جائے
گا۔ کیا تم دونوں تعلیم یافتہ ہو؟"

"جی ہاں۔" میں بولا۔ "یونس بھائی، اندر گریجویٹ اور میں فل
گریجویٹ ہوں۔"
"شان دار..." وہ چہک کر بولا پھر ایک دم سنجیدہ ہو گیا۔ "سنو،
دوستو! اگر تم لوگ خان جیاد کے پیچھے ہوئے ہو تو جی میں تمہیں کھل
کھیلے کامیاب کر دوں گا، اب آرام کرو۔"

"شکریہ خان، دراز خان! میں نے جی ہوتی آواز میں کہا۔ آپ
نے مجھے یاس نہیں کیا۔ اگر آپ یوں ہی چپ چاپ ہیں اپنے دھیان
جگہ دے دیتے تو گستاخی معاف، میں آپ کو اس علاقے کا اچھا نوجوان
سمجھتا۔ بے شک، ہم خان جیاد کے اجنٹ ہو سکتے ہیں لیکن نہیں ہیں۔
یونس بھائی شاید حق نمک ادا کرتے ہوئے خاموش رہتے مگر میں نے اس
کا نمک نہیں کھایا۔ گونڈان کے حوالے سے میں پیچھے ہوں لیکن یونس بھائی
کی وسالت سے جو کچھ مجھ تک آیا ہے، میں آپ کے گوش گزار کرنا اپنا

فرض سمجھتا ہوں۔ خان جیاد شرب خون مارنے کا منصوبہ بنا رہا ہے۔
"کیوں یونس خان؟" دراز خان نے بھڑکتے ہوئے لہجے میں پوچھا۔
"تفصیل تم بتاؤ گے۔"

"میں ضرور بتاتا، محترم خان! یونس معذرت خواہ اند آواز میں بولا۔
"میرا بھائی پرجوش نوجوان ہے۔ میں اتنی اہم خبر کی ٹھوس ثبوت کے
ساتھ دینا چاہتا تھا۔ جہاں تک آپ کو بتایا گیا ہے سچ ہے۔ اس بار
خان کے پاس میں ہاروں کی کمی ہے۔ اس کے بہت سے وفادار فیکٹری
کے ساتھ ختم ہو گئے ہیں۔ اس لیے وہ روایات سے ہٹ کر شرب خون
مارنا چاہتا ہے اور ہدف آپ کا گھر ہوگا۔"

"کب...؟" دراز خان بھڑک کر بولا۔ "کب وہ ایسی ذلیل
حرکت کرے گا؟"

"مجھے افسوس ہے، خان! یونس خلاف توقع شان دار جا رہا
تھا۔ ابھی کوئی حتمی فیصلہ نہیں ہوا تھا۔"

"تم..." دراز خان نرم اور دوستانہ لہجے میں بولا۔ "یونس خان!
تم واپس جا کر میری خاطر حتمی خبر لاسکتے ہو؟"
"خطو تو ہے، خان! یونس مردہ سی آواز میں بولا۔ "لیکن میں
جاؤں گا کیونکہ میرا مستقبل اب اس گڑھی کی سلامتی سے منسلک
ہو گیا ہے۔"

"شکریہ، دوست! میں تمہارا ممنون ہوگا۔ وہاں شیر خان کے
گھر چلے جانا۔ وہ آج بھی میرا وفادار دوست ہے۔ اس کی آڑ میں تم
محفوظ رہو گے۔"

"شکریہ خان! یونس بولا۔ "ادھر ابھی میرے بھی ہمدرد موجود
ہیں۔ میں براہ راست زیرِ قباب نہیں ہوں۔ میں نے تو حالات کے تیور
دیکھ کر وفاداری بدلنے کا فیصلہ کیا تھا۔"
"آج یہاں رہو، کل کسی وقت چلے جانا۔" دراز خان نے فیصلہ کن
انداز میں کہا اور باہر نکل گیا۔

اس کے جلتے ہی یونس نے مجھے عجیب نگاہوں سے دیکھا اور
میں نے ہونٹوں پر آنکلی رکھ کر اُسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔ کیونکہ میں
نے دراز خان کا سایہ ساکت ہوتا دیکھ لیا تھا۔ وہ باہر نکل کر دروازے
سے ہٹ کر کھڑا ہو گیا تھا۔ سورج مغرب کی جانب جھک رہا تھا، اس
لیے دراز خان کا سایہ دروازے سے دکھائی دے رہا تھا۔

پھر سایہ متحرک ہو کر غائب ہو گیا۔
میں نے منصوبہ تو یہی بنایا تھا کہ دونوں متحارب قبائل کو لڑا کر اپنا
مقصد حاصل کرنے کی کوشش کروں گا کیونکہ جیاد خان سے اس
کے گھر جاکر تنہا رہنا ممکن نہ تھا۔ اس لڑائی میں ہاروں کی زندگی بھی خطرے

میں پڑ سکتی تھی لیکن میرے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ یونس جس شخص
کی پناہ میں حاضری پڑاؤ کرے گا، وہی متحارب قبیلے کا لیڈر ہوگا...
منزل کا راستہ خود بخود دوسرے سلسلے آگیا تھا... پھر میں نے جرب زبانی
اور یونس نے ہمدکی پاس داری کر کے 'منصوبے' میں نئی زندگی ڈال
دی تھی۔

دوسری صبح جب یونس دراز خان کے مشن پر روانہ ہوا تو اُسے
بہترین گھوڑا دیا گیا تھا اور کالونی تک بہ حفاظت سفر کے لیے اس
کے ساتھ دراز خان نے چار آدمی بھی لگا دیے تھے۔

دن کا بیشتر وقت، میں نے دراز خان کے ساتھ باغ اور کھیتوں
میں گزارا تھا۔ دراز خان 'مردوروں' کے ساتھ خود بھی کام کرتا تھا۔ اس
لیے مجھے بھی اس کے ساتھ کیا ریاں تیار کرنا پڑی تھیں۔ وہ میری دلچسپی
اور کارکردگی سے خاصا متاثر نظر آ رہا تھا۔

شام چار بجے، میں اور دراز خان باتیں کرتے ہوئے جوں ہی
پائیں باغ میں داخل ہوئے، میری آنکھیں چندھیا سی گئیں۔ بجلی کا
شکارا اہرا رہا ہوا، گلاب کی جھاڑی کے پیچھے ڈھب گیا تھا۔

"سودی..." میں نے گھبرا کر ایک دم رخ پھیر لیا۔
"کوئی بات نہیں، بابر خان! دراز خان نے میری پشت پر

مولانا
ذہر نے اور سراج نے کے لیے آپ کو سیلنگ سینٹر
ایڈاکس قریب کپاس جانے کی کوئی ضرورت نہیں

پاکستان میں ہنر و خست کا تہذیبی کارڈ ہوتا ہے مگر وہ
سوی سوانح کی ایک حیات انگیز کتاب

لوگ اور حسن

سید ایوان رہنے کا انسان حل

دن بھر کی سادہ اور آسان ترین مشقوں سے
اپنے جسم و عالمی صبر حسن کے پیمانے پر لانے کا سہل طریقہ

ہر ایک اور مقرر سے نجات حاصل کی کہ جس نے چلہ کھینچے

محبت اور سادگی کے ساتھ
محبت اور سادگی کے ساتھ

احباب ادب • پوسٹ بکس نمبر ۲۱۴ • کراچی ۱۹

ہاتھ رکھا۔ ہم بیسویں صدی کے سائنسی انسان ہیں۔ میرا خاندان پروردہ کرتا ہے لیکن وہ پروردہ جو اخلاق نے دیا رکھا ہے یعنی آنکھ اور نیت کا پروردہ۔ شیریں: ہاں آجیادو یہ ہمارا بھانجہ ہے۔ درازخان نے پیار سے پکارا۔

بھائی کی اوٹ سے وہ سراپا حسن و ناز قیامت جگاتی سلنے لگی اور میں جیہوت سا کھڑا، خالق کائنات کا شاہکار دیکھنے لگا۔ اس کی لابی بوجھل چلیں چلیں، ٹوٹی تھیں اور گلاب کی پتھریاں مانس بہ بہنم تھیں۔

میری بہن شیریں تراب کا بنیو پورٹی میں استاد ہے۔ پکوں کے چھلر تھرتھراتے ہوئے اٹھے اور ساکت ہو گئے۔ یہ بابر خان ہیں فرام پنجاب۔

مجھے کچھ کہنا چاہیے تھا لیکن میری قوت گویائی اس کے سہیے حسن میں گم ہو چکی تھی۔ اس کے ہونٹ بھی کپکپا رہے تھے۔ شاید اس نے بھی بولنا چاہا تھا مگر آواز دونوں کی شوق دید میں جذب ہو گئی تھی۔ اسی وقت بھائیوں سے ایک سفید فٹ بال بچھڑتا ہوا نکلا اور شیریں کے قدموں میں لوٹنے لگا۔ کتنے نے آکر سحر توڑ دیا۔ شیریں نے انکڑوں بیچ کر گتے کو بانہوں میں بھر لیا اور درازخان ہنستا ہوا، میرا ہاتھ تھام کر چل پڑا۔ میں نے خدا کا شکر ادا کیا تھا کہ میرا بھرم بچ گیا۔

شیریں بہت دھکی دھکی درازخان بتانے لگا۔ اس کے منگیتر نے ماسکوں میں مستقل رہائش اختیار کر لی ہے، جبکہ ہم لوگ تعلیم و تربیت اور ٹیکنالوجی کی حد تک ان سے ہنس بول لیتے ہیں مگر اپنا دین اور آزادی فروخت نہیں کرتے۔ وہاں رہنے کا مطلب ہے کہ دین بھی گیا اور آزادی بھی۔

درازخان: میں نے شیریں کے خیال کو جھٹک کر موضوع بدل دیا۔ آپ مسلمان ہیں اور مسلمانوں نے اپنے دین اپنی روایات اور معاشرت کی بقا کے لیے ایک سرزمین حاصل کی ہے، اس کا ہم پاکستان رکھا ہے۔ جہاں تک میں سمجھتا ہوں، آپ پاکستانی ہیں۔

نہیں، بابر خان! درازخان ترمیمی لہجے میں بولا۔ دین کی حد تک تو ہم ایک ہیں لیکن ہماری روایات اور طرز معاشرت میں بہت فرق ہے اور اسی فرق کو قائم رکھنے کے لیے ہمارے اجداد نے انگریزوں کو ناکوں پہنے چھوڑ دیے تھے۔ ہم صرف دینی بھائی ہیں۔

میں کچھ جواب سمجھ ہی رہا تھا کہ اطلاع ملی کہ یونس خان واپس آگیا ہے۔ ہم دوڑتے ہوئے ڈرائنگ روم میں پہنچے۔ یونس کے ساتھ ایک سفید ریش شخص بیٹھا ہوا تھا۔ درازخان نے بڑھ کر بزرگ کی طرف مصلحت سے کیسے ہاتھ بڑھایا۔

یہ بابا و دبیر خان ہیں۔ یونس نے تعارف کرایا۔ میں دسے میں ان کا ملازم تھا۔ میرے مرنے اور حسن مجھ سے ملنے آئے۔ اچھا ہوا میں ادھر تھا۔ آپ نے مجھے جس کام کے لیے بھیجا تھا، اس کا جواب خان بابا و دبیر خان درازخان نے پشتوں میں دبیر بابا سے کوئی سوال کیا تھا اور دبیر بابا نے پشتوں ہی میں جواب دیا تھا جسے سن کر درازخان کا چہرہ غیظ و غضب سے ابھرا ہوا تھا۔

کچھ مجھے بھی بتاؤ، درازخان؟ میں نے پوچھا۔ وہ گیدڑ... درازخان غصہ کیا۔ رات کے اندھیرے میں حملہ کرنا پڑا ہے۔ یہ ان پہاڑوں کی روایات کے منہ پر چڑھتا ہو گا میں اس سے ڈرتا ہوں ہوں۔ میں صرف اپنے آبا و اجداد کی روایات کی پاسبانی کروں گا۔ اُسے اُس کے گھر جا کر سبق دوں گا۔

اچھا فیصلہ ہے۔ میں نے شعلوں کو ہوا دی۔ جنگ دشمن کی زمین ہی پر لڑنی چاہیے۔

دبیر خان! درازخان نے اپنے ایک کارندے کو مخاطب کیا۔ "نقارے پڑوٹ لگاؤ۔ اب ہم کوئی طرہ ضائع نہیں کریں گے۔"

دبیر خان اثبات میں گردن کو خم دے کر ہانپ کر بول گیا۔ "ادھر تیار کیسی ہے بابا؟" درازخان نے اپنی نگوں دبیر خان سے اردو میں سوال کیا۔ دبیر خان نے پشتوں میں جواب دیا اور درازخان دوڑتا ہوا ڈرائنگ روم سے نکل گیا۔

خان بابا سے پانچ ہزار میں معاملہ طے ہوا ہے۔ یونس نے دیکھ لہجے میں مجھے بتایا۔ اب کھانا کیا پروگرام ہے؟

اب ہم کو شمش کریں گے کہ یہ لوگ شام سے پہلے حملہ نہ کریں۔ میرے مشن کی کامیابی کے لیے تاریخی ضروری ہے۔ یونس، دبیر خان کو کھانے لگا اور باہر نقارہ دھا دھم بجنے لگا۔ جب ہم باہر نکلے تو چٹائیں، درخت اور جھاریاں، مسلح افراد اگل رہی تھیں اور درازخان تفصیل پر کھڑا اپنی سپاہ کو دیکھ رہا تھا۔

میرے مشن کا پہلا مرحلہ کامیابی سے گزر رہا تھا اور میں آنے والے طغات کی صف بندی میں مصروف تھا۔

بہتر ہے۔ یونس نے جواب دیا۔ میں بڑے خان کو رپورٹ دینے جاؤں گا تو کسی نہ کسی طرح معلوم کر لوں گا۔ لیکن متحاب پارٹیوں کے درمیان تو فاصلہ ہو گا۔ میں تم سے کیسے بولوں گا؟

جب مقابلہ شروع ہو جائے تو تم طوباز خان کے گھر کی جانب نکلنا۔

درازخان تفصیل پر کھڑا، آنے والوں کو دیکھ رہا تھا۔ تہذیب و تمدن سے بہت دور وہ لوگ نظم و ضبط کا بہترین نمونہ پیش کر رہے تھے۔ کوئی کسی سے نہیں پوچھ رہا تھا کہ بلاوے کا مقصد کیا ہے، جو آنا، صف میں شامل ہو جاؤ۔ قطاروں میں چوہہ، ہندو برس کے لڑکوں سے لے کر ساتھ، متبر برس کے تونمہ بڑے بھی شامل تھے اور درازخان کے اشارے کا انتظار کر رہے تھے۔

کالونی کی مسافت یہاں سے کتنی ہے یونس خان؟ میں نے ڈھلے سورج کو دیکھتے ہوئے پوچھا۔

گھوڑوں کے لیے ایک گھنٹہ۔ یونس نے بتایا۔ میرا خیال ہے، اتنے گھنٹے نہیں ہوں گے۔ پیدل کی سورت میں دو گھنٹے لگ جائیں گے۔ تمہارا پروگرام کیا ہے۔ کہیں لینے کے دینے نہ پڑ جائیں۔ وہ لوگ بھی جواب پھول نہیں برمائیں گے۔

میرا مقصد صرف اپنے ساتھی کو وہاں سے نکالنا ہے۔ میں نے کہا۔ ہاں، اگر کچھ منافع ہو جائے تو حرج نہیں۔

منافع سے مطلب؟

ان کا زیادہ سے زیادہ نقصان... دیکھو نا، اگر کوئی شخص تمہاری کوئی چیز شے لے جاتا ہے تو کیا اس سے دھتے چھین کر، اسے پیار کر دے؟ نہیں، میرے دوست! میں انھیں عبرتناک سزا دینا چاہتا ہوں۔ انھیں یاد رکھنا ہو گا کہ پاکستان میں بھیج کر یا نہیں ہیں جنھیں جب دل چاہا، کان سے پکڑ کر ادھر لے آئے۔

دوسری صورتیں بھی تھیں۔ یونس بولا۔ ان بے گناہ لوگوں کو تہائی کے بکرے بنانا ضروری نہ تھا۔

جنگ میں پھل دار وخت بھی تباہ ہو جاتے ہیں، حالانکہ وہ کسی کے دشمن نہیں ہوتے۔

کیا ہم بھی جنگ میں شریک ہوں گے؟

کیا یہ سوال دانش مندانہ ہے، برادر؟ میں نے طنز پر انداز میں کہا اور یونس نے سر جھکا لیا۔ اگر ہم شریک نہیں ہوں گے تو مقصد تک کیسے جائیں گے؟ میں درازخان سے اجازت لے کر تھیں آگے روانہ کر دوں گا تم پر معلوم کرو گے کہ قیدی کہاں رکھا گیا ہے تاکہ تلاش میں وقت ضائع نہ ہونے پائے۔

بہتر ہے۔ یونس نے جواب دیا۔ میں بڑے خان کو رپورٹ دینے جاؤں گا تو کسی نہ کسی طرح معلوم کر لوں گا۔ لیکن متحاب پارٹیوں کے درمیان تو فاصلہ ہو گا۔ میں تم سے کیسے بولوں گا؟

جب مقابلہ شروع ہو جائے تو تم طوباز خان کے گھر کی جانب نکلنا۔

درازخان آ رہا ہے۔ یونس نے سرگوشی کی۔ میں نے چہرہ گھمایا۔ درازخان شاید میری طرف ہی آ رہا تھا میں نے بھی لان چھوڑ کیا۔ اور بار پھلانگ کر اس کے پاس پہنچ گیا۔ جھادیوں کی آواز میں شیریں کھڑی تھی۔ غالباً تفصیل سے درازخان نے اسے دیکھ لیا تھا۔ میں چند قدم دور ہی رک گیا تو درازخان نے اشارے سے مجھے قریب بلایا۔

تمام بالغ مرد ادھر جائیں گے۔ وہ دھڑکتی آواز میں بولا۔ ہم اس جنگ کو جہاد کا نام دیتے ہیں، حالانکہ یہ جہاد نہیں ہے مگر کوئی محرم ہونا پسند نہیں کرتا۔ چونکہ تم لوگ غیر متعلق ہو، اس لیے تم یہیں رہو گے میری بوڑھی والدہ اور شیریں یہاں ہوں گی۔

اعتماد اور عزت افزائی کا شکریہ خان! میں نے نمٹوں آواز میں کہا۔ لیکن میں یہ فرض ادا کر کے فخر محسوس کروں گا۔ یہاں کوئی بزرگ بھی پاسبانی کے فرائض بہ آسانی سر انجام دے سکتا ہے۔ میدان جنگ میں ایک گولی بھی بعض اوقات فتح و شکست کا فیصلہ کر دیتی ہے۔ میں اپنے محسن خاندان کی گولی کے ساتھ خدمت کرنا پسند کر لوں گا۔

آؤ، دیکھتے ہیں۔ علی بابا شاید یہاں رہنا پسند کر لیں۔ درازخان بولا۔ پھر اس نے اپنی بہن سے پشتوں میں کچھ کہا، اس نے نفی میں گردن ہلا کر جواب دیا۔ درازخان نے میرا ہاتھ تھام لیا۔ شیریں کو کتابوں نے بزدل بنا دیا ہے۔ یہ پہاڑوں کی روایات نہیں جانتی۔ یہاں جینے کا حق صرف طاقت کو دیا جاتا ہے۔ اگر ہم بددلی رکھ کر صرف بیچہ پکڑ لیں تو جبار خان ہماری زمینوں کو سخت کر دے گا۔ پانی اوپر ہی سے آتا ہے۔ اس کا اور ہمارا جھگڑا پانی پر ہے۔ وہ پانی کا لگان طلب کرنے لگا ہے۔ اب کیا ہم پانی بھی خرید کر استعمال کریں؟

میں بھی روایات کے منافی ایک مشورہ دینا چاہتا ہوں، خان! میں نے مدح آمیز میں کہا۔ کتابیں، انسان کو احتیاط، سلامتی، کامیابی اور روشن رستے دکھاتی ہیں۔ آپ احتیاط کا نام بزدلی رکھ سکتے ہیں مگر جنگ اور محنت میں کوئی سیٹ اصول نہیں اپنایا جاسکتا۔ یوں تو کسی کی جان لینا قانون اور اخلاق کے نزدیک ناپسندیدہ فعل ہے۔ مگر ضرورت کنی جانوں کا خون پیتی رہی ہے اور پیتی رہے گی۔ اسی ضرورت کے تحت جو کچھ ہم کرتے ہیں، پہلے ضمیر کو مطمئن کر لیتے ہیں۔ کیا ایسا نہیں ہے، خان؟

بے شک... درازخان نے اثبات میں سر ہلایا۔ ضرورت انسان کو سب کچھ کرنے پر مجبور کر دیتی ہے۔ ہماری ضرورت ہے زندگی اور زندگی کی ضرورت ہے آزادی اور عزت... اور عزت کے لیے ضروری ہے کہ انسان خود نکلیں ہو۔ آج ہماری عزت ہی کو خون کی ضرورت ہے، خون چاہے ہمارا ہو یا دشمن کا، خون ہی سے عزت پامال اور بجالا ہوتی ہے۔

اب تم مشورہ دو، کیا ہم حق نہیں ہیں؟
 جنگ کا فیصلہ کرنے والا ہر فرق پہلے خود کو حق پر تسلیم کرتا ہے،
 غان محترم! میں حق و ناحق کی بات نہیں کروں گا، میں صرف یہ عرض کرنے
 کی اجازت چاہوں گا کہ جوش کو ہوش بھی دیا جائے۔
 کھل کر بات کرو، بابر خان! دراز خان یہ سڑھیاں چڑھے چڑھتے
 رگ گیا۔ ہوش سے تمہاری کیا مراد ہے؟
 "منصوبہ بندی اور جنگی چال" برادر!
 "یعنی ہم پہلے بیٹھ کر منصوبہ بندی کریں؟ دراز خان مڑا یا۔"
 "جی ہاں۔۔۔"
 "ٹھیک ہے۔ وہ قدم بڑھاتے ہوئے بولا۔ میرے ساتھ اوپر چلو۔"
 ہاں، کیا تمہارے ذہن میں کوئی بہتر چال ہے؟
 "کیا آپ نے گوریلا فار کے بارے میں سنا ہے؟"
 "ہاں، کیوں نہیں؟"
 "یقیناً آپ نے اپنے بزرگوں سے سنا ہوگا۔" میں اس کے ساتھ
 سڑھیاں چڑھتے ہوئے بولا۔ "آج اگر یہ علاقہ آزاد ہے جسے ہم علاقہ غیر
 کہتے ہیں تو اس کے پیچھے ایک طویل اور فوجی جدوجہد کی تاریخ ہے۔۔۔
 آپ کے غیر متند بزرگوں نے صف بندی میں انگریزوں اور فوجوں
 کے خلاف جنگ نہیں لڑی بلکہ منصوبہ بندی سے لڑتے رہے ہیں۔۔۔
 جسے جنگی حکمت عملی میں گوریلا جنگ کہا جاتا ہے۔ وہ لوگ رات کی تاریکی
 میں دبے پاؤں شب خون مارا کرتے تھے اور دشمن کی بڑی تعداد کو چند
 گولیوں سے ہنس نہیں کر دیتے تھے۔ میری تجویز ہے کہ آج بھی وہی طریقہ
 اپنایا جائے۔"
 "میں بزرگوں سے ضرور سفارش کروں گا، بابر خان! میں ذاتی طور
 پر تمہاری تجویز کی تائید کرتا ہوں۔"
 "شکریہ، غان محترم!"
 ایک برج سے گزر کر ہم سامنے آئے تو نیچے ایک نیم غنیر لہریں مار رہا
 تھا۔ دس برس سے کم عمر کے بچے، منوں کے بچے، منوں کے بچے تین منوں میں تھرتھرتے
 ہر بچے کے ہاتھ میں بندوق تھی۔۔۔ مجھے ان آزادی کے متوالوں نے بے حد
 متاثر کیا تھا۔
 "علی بابا! دراز خان بلند آواز میں بولا۔ چونکہ نام کے بعد اس نے
 مقامی زبان میں باتیں کی تھیں اس لیے میں صرف یہی دیکھ سکتا تھا۔۔۔ کہ
 قطاروں سے چھ بوزے منوں کے بچے کی طرف دروازے کی طرف بڑھے تھے چھ چند
 باتیں کرنے کے بعد دراز خان میرے ساتھ نیچے اترا۔ بوزے خاموشی سے
 اس کے پیچھے چلتے ہوئے، بڑے کمرے میں آئے اور بیٹھ گئے۔
 "معاف کرنا، بابر خان! دراز خان کا انداز معذرت طلب تھا۔ میرے

بزرگ اردو نہیں جانتے۔ اس لیے ہم تمہاری تجویز پر اپنی زبان میں گفتگو
 کریں گے۔ یہ جرحے کے ارکان ہیں۔ علی بابا عقل، تجربے اور عمر کے سنا
 سے سرفراز ہے۔ اگر ان لوگوں نے تمہاری تجویز کی مخالفت کی۔۔۔ تو میں
 مجبور ہوں گا۔"
 "ان لوگوں کی مدائے میری تجویز سے بہتر ہوگی، غان! لہذا مجھے
 کوئی افسوس نہ ہوگا۔" میرا جواب سن کر دراز خان نے شکریہ ادا کیا اور پھر یقیناً
 میری تجویز ہی ان کے سامنے رکھی تھی۔ علی بابا نے باری باری اپنے ساتھیوں
 کی جانب دیکھا پھر ایک بوزہ ہالونے لگا۔ صلاح مشورے کا انداز بھی ہڈیاں
 تھا۔ ایک بوزہ آواز سے خاموشی سے سنتے پھر دوسرا بولتا۔ تقریباً آدھے
 گھنٹے تک وہ لوگ پر جوش انداز میں باتیں کرتے رہے تھے۔ ان کے جوش
 اور دھمک دار آواز سے میں نے بھی اندازہ لگایا تھا کہ سب کی رائے میری
 تجویز کی مخالفت ہی میں ہے۔
 تاریکی اور شب خون سے جو مقصد میں حاصل کرنا چاہتا تھا، اس
 سے وہ لوگ بے خبر تھے۔ وہ تو صرف اپنی صدیوں سے قائم دائم روایت کا
 دفاع کر رہے تھے۔
 "اُجھ، بابر خان! دراز خان خوش گوار انداز میں بولا۔ میرے بزرگوں
 سے ہو۔ سب نے تمہاری بہترین حکمت عملی کی تعریف کرتے ہوئے منظوری
 دے دی ہے۔ میں اُٹھا اور مؤتب انداز میں سب سے مصافحہ کیا۔ سب
 نے جزاک اللہ کہ میری پشت تھپ تھپائی تھی۔
 "کیا ابھر نگرانی کا معاملہ بھی زیر بحث آیا ہے، غان؟"
 "ہاں۔۔۔" دراز خان نے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بتایا۔
 گھاؤں کی بیس عورتیں نگرانی کے فرائض انجام دیں گی۔ علی بابا کی نظر کمزور
 ہے، انھیں بھی یہاں چھوڑ جائیں گے۔
 جرحے کے ارکان اُٹھ کر باہر چلے گئے۔ تاکہ لوگوں کو روانگی کے پرکار
 سے مطلع کر سکیں کیونکہ روانگی کا پروگرام رات نو بجے تک منطوقی ہو گیا تھا۔
 دراز خان اُٹھ کر جانے لگا تو میں نے پوچھا۔
 "غان! ہتھیار کون سے استعمال ہوں گے؟"
 "ہمارے اچھے نشانہ باز رائفلیں استعمال کرتے ہیں چند اسٹین
 گنیں بھی ہوں گی شاید۔"
 "کچھ دن میں بھی ان کے درمیان بھجکا ہوں، دراز خان! میں نے
 کہا پھر ایک دم بات پلٹ دی، کیونکہ یونس نے میرا تعارف کرتے ہوئے
 مجھے نوادار ظاہر کیا تھا۔ گزشتہ برس بھی میں غان جبار خان کے پاس
 گیا تھا۔ میں نے ان لوگوں کے پاس دستی بم بھی دیکھے تھے۔ ابھی دو تین دن
 قبل کسی نے ان کی فیکٹری بھی بموں سے آرائی ہے۔ اگر جواباً دستی بم
 کیے گئے تو ہمارا نقصان زیادہ ہوگا۔"

کیا تم دستی بم استعمال کر سکتے ہو، بابر خان؟
 "بہت اچھی طرح۔" میں نے جواب دیا۔ "میں نے آدمی میں باقاعدہ
 گویا تربیت حاصل کی ہے۔ اگر میرا کوڈ مشن نہ ہو گیا ہوتا تو آج شاید
 میں کیپٹن ہوتا۔"
 "کوڈ مارشل کیوں ہوا تھا؟ اس نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔
 "میں نے ایک انگریز سارجنٹ کو بٹ مار دیا تھا۔" میں نے فخریہ
 انداز میں بتایا۔
 "اوہ۔۔۔ گڈ۔" دراز خان چہک کر بولا۔ "ٹھیک ہے بابر خان! میرے
 ذاتی اسٹاک میں دستی بم موجود ہیں۔ چلو! اپنے لیے کوئی دوسرا ہتھیار بھی لیں تو۔
 میرے پاس ایک بڑا بندوق بھی ہے۔"
 اس کی خواب گاہ اسلحہ خانے کا کام بھی دے رہی تھی۔ قیمتی۔۔۔ اور نادر
 قسم کی بندوقیں، دیواروں کے ساتھ ٹنگ رہی تھیں۔ ان میں قدیم بندوقیں
 بھی تھیں اور جدید ترین خود کار رائفلیں بھی۔ میں نے سات گزینڈ الگ کیے۔
 باقی کے اسٹراک زنگ آؤڈ تھے اور ایک خود کار رائفل بھی اُٹھائی۔ علی پھلکی
 جونی سی رائفل میں نے پہلی بار دیکھی تھی۔ کوڈ ریو او سے دگنی تھی۔ اُسے
 ایک خطرناک اور دور دراز اور بھی کہا جاسکتا تھا۔ میگزین میں چوبیس رائفڈز
 آتے تھے۔ وہ رائفل دراز خان کی عزت افزائی اور اعلیٰ کی طرف سے تحفہ تھی۔
 البتہ جو مال غنیمت اور چوری کے مال کی کوئی درمیانی شکل تھی۔
 یہ جنگ اور محنت کا کھیل تھا۔ میں حالت جنگ میں تھا۔۔۔ اور
 دراز خان مجھ سے محنت کرنے لگا تھا۔ وہ مجھے دہر مجھ رہا تھا اور میں اسے بطور
 حامی استعمال کر رہا تھا۔ اعتماد اور خود غرضی کی جنگ لڑی جا رہی تھی۔ چونکہ
 جنگ میں سب کچھ رفا ہوتا ہے، اس لیے وہ چوری بھی جانتا ہی تھی۔
 میں نے شب خون کے باوثوق نتائج کا حوالہ دے کر دراز خان کے
 فیصلے پر یونس کو جاسوسی کے لیے دہر خان کے ساتھ پہلے روانہ کر دیا تھا۔
 بونکر یونس کی شہ رگ میری اٹھلی کے نیچے دبلی ہوئی تھی، اس لیے مجھے اس
 کی حال سے کوئی خطرہ نہیں تھا۔ یونس خان مجھ جیسے دشمن کا ایسا وفادار
 قاطع تھا جو اپنے دشمن کی سلامتی اور زندگی کے لیے جان کی بازی لگانے
 سے بھی دریغ نہ کرتا کیونکہ میری سلامتی، اس کے خاندان کی سلامتی کے
 ساتھ مشروط کر دی گئی تھی۔
 رات کا کھانا میں نے دراز خان کی خواب گاہ ہی میں کھلایا۔ ہم کپے گوشت
 کا خوب سا لذائقہ تھا۔ مجھے اُٹھائی بھی آئی تھی لیکن میں نے سانس روک روک
 کر کپڑے سے ساگو گوشت اُدیہ لیا تھا۔ جب شیریں قبوہ لائی تو ہمارے
 منوں میں دان کی پٹیلی تھیں۔ دراز خان نے جلدی جلدی قبوہ حق میں
 اُٹھا اور ڈکارت لیا ہوا بولا۔
 "بابر خان! تم کمر سیدھی کرو۔ میں پیر بابا کی درگاہ پر حاضری دے آؤں۔"

اُس نے رائفل اُٹھائی اور سبز کپڑے کر باہر نکل گیا۔
 میں نے قبوے کا خالی پیاز ٹرے میں رکھا اور دراز خان کے چنگ
 پر جوتوں سمیت دھاری دار کپل اور کھربا لٹ گیا۔ اُسے دس وقت کے
 بارے میں کچھ نہ معلوم ہونے کے باوجود مجھے علم تھا کہ ساحل مڑا ہلے نہ لے
 مگر آرام کا وقت نہیں ملے گا۔ گوہر مقصود حاصل ہونے کی صورت میں
 بھی پیدل سفر کرنا تھا اور اگر ناگہانی کا پتہ لگ جاتا تو بھی درد کے ساتھ فرار
 ضروری تھا۔ یہی وجہ رہی تھی کہ میں نے اس وقت کو اکام کی آغوش میں
 دے دیا تھا۔
 معاً میری سماعت سے قدموں کی سرسراہٹ ٹکرائی جیسے کوئی برف پیا
 اند کیا ہو۔ اس سے قبل کہ میں چہرے سے کپل ہٹاتا، ایک سرگوشی ابھری
 اور میرا ہاتھ بے جان سا چوک رہ گیا۔
 "دراز۔۔۔ دراز غاناں۔۔۔" نرم سانس کپل پر محسوس ہوا پھر مجھ نہیں
 چہرے سے کپل ہٹا، وہ گھٹی گھٹی سی چیخ مادی ہوئی سمٹ گئی۔ میں
 آنکھیں پھاڑے اُسے دیکھا رہ گیا۔ اتنی قد آور، متناسب بدن۔۔۔ اور
 خوش بدو لڑکی پہلے کبھی دیکھنے میں نہیں آئی تھی۔ میری عورت اور اس
 کی مشکل شیریں نے توڑی تھی ورنہ میں یوں ہی ڈوبا ہوتا۔
 "زیلیانا۔" شیریں کی چہکارا ابھری چہرہ وہ، اُس سے پشتوں چند
 باتیں کرنے کے بعد میری جانب دیکھ کر بتانے لگی۔ یہ ہماری کزن زلیانا
 ہے، بھائی جان کی منگیتر۔۔۔ انھیں خدا حافظ کہنے آئی ہے۔
 "آپ کا بھائی واقعی ایک خوش نصیب آدمی ہے جسے علاقے کی
 سرداری، آپ جیسی بہن اور زلیانا جیسی شریک حیات۔۔۔ لیکن پھر زلیانا
 کے کچھ پوچھنے پر میری بات اُدھوری رہ گئی۔ شیریں نے ہنس کر اس کی
 بات کا جواب دیا۔
 "زلیانا، آپ کے بارے میں پوچھ رہی ہے جبکہ میں صرف آپ کا
 نام ہی جانتی ہوں۔"
 "آوارہ گرد! جنیوں کا تعارف نام ہی بچا کرتا ہے۔ میں نے
 اُنھے ہونے کہا۔" میں حالات کے آسمان پر تیز ہوا، بادل کا ٹکڑا ہوں جس
 کی کوئی منزل نہیں ہوتی، ہوائیں جدھرے جائیں۔
 "اگر کوئی زمین پیاسی ہو، وقت کی دھوپ میں جل رہی ہو۔۔۔ تو
 ہر بان بادل کو یونہی گزرتا نہیں دیتا۔" شیریں الٹ الٹ کر الفاظ
 بانڈھ کر بولی۔ میں نے جب کوئی جواب نہ دیا تو اُس نے پلکوں کی چھاروں
 سے جھانک کر دیکھا میں اُسے ہی دیکھ رہا تھا، لگا میں ایک دوسرے میں
 الجھ گئیں۔ کیا بادل کبھیں اور بے ہوش ہوتے ہیں؟
 "کبھی آپ نے آگ کا اُپر اُٹھتا بادل دیکھا ہے، بس شیریں۔۔۔؟"
 اُس کی ساکت پلکیں تھر تھرا کر مجھ پر جم گئیں۔

"شاید نہیں۔ میں نے گہری سانس لی۔" بچوں کے درمیان بیٹے
 ولی بڑی، آگ کی اذیت نہیں جان سکتی۔ میں سمندر کی آغوش سے نکلتے
 والے بادل نہیں ہوں بلکہ آگ کی سسکیوں سے پیدا ہونے والا گرم اور
 گڑا دھواں ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ میں آبادیوں سے گزرتا ہوں اور پھر
 گزرتا ہوں۔ میں نہیں چاہتا کہ میری وجہ سے کسی کی آنکھوں کو نقصان
 پہنچے۔ میں خود جلتا ہوں اور دوسروں سے دور دور رہتا ہوں۔
 "کاش..." شیریں کی آواز میں دکھ کی پیش اور آنسوؤں کی غمی
 گھٹی ہوئی تھی۔ "میں اس شخص میں تحلیل ہونے کا حق رکھتی۔ ایک وعدہ
 کرو گے، بابرخان؟ وہ سرایا التجا بن گئی۔ میں نے چہرے پر معذرت کی
 مذمت طلبی کرتے ہوئے غمی میں گردن ہلا دی۔ "اچھا، وعدہ نہ ہوئی
 ایک درخواست منظور کرو، فلاح کوگوں کے ساتھ واپس چلے آنا۔ تین
 دن جن ہوگا اور میں ان تین دنوں میں تمہیں سمجھنے کی کوشش کروں گی۔"
 "شکریہ، میں شیریں! میں نے قبل ہٹاتے ہوئے کہا۔ آپ نے
 مجھے وعدے کی بری نہیں پہنائی۔ اگر بچا کا رخ موافق دیا تو میں ادھر
 ضرور آؤں گا بصورت دیگر برائے سوچیں گے۔"
 اس نے زلیخا کو کھانے کی ٹرے نکالی اور خود قبوے کے برتن
 سمیت کرشب بخیر کہتی ہوئی نکل گئی۔ میں نیم دراز دیر تک سوچتا رہا تھا
 کہ لڑکیاں ہر جگہ ایک جیسی ہوجیں اور ایک ہی رنگ کے جذبے کیوں
 رکھتی ہیں۔ میری ذات کی راگ میں وہ جنگلیاں کیوں تلاش کرنے لگتی
 ہیں؟ اس تلاش میں وہ اپنی آنکھیاں بھی جلاتی ہیں اور میرا جہرم بھی
 بکھیر دیتی ہیں۔ میں ہڑکی کو اپنی کتاب زندگی کیسے پڑھاتا؟ اتنا وقت
 ہر جگہ کہاں ہوتا تھا۔ لیکن پڑھاتا بھی تو کیا ہوتا؟ کس کس کو میں نے یہ
 کتاب تحفہ بہ حرف پڑھنے کو نہیں دی تھی۔ بارشا اور رشید کے ہوا کسی
 نے بھی مجھے نہیں سمجھا تھا۔ اور تو غیر تھیں، اجنبی تھیں، میرے بچپن کی
 ساتھی ذہنت ہی مجھے نہ سمجھ پاتی تھی۔
 پورے فوجی دراز خان واپس آیا تو علی بابا، اس کے ہمراہ تھے۔۔۔
 "چلو، دوست! وہ بولا۔ بابر لوگ تیار کھڑے ہیں۔ علی بابا نے تھمادی
 شہرت کی خوشبو سب تک پہنچا دی ہے۔ سب تم سے ملنا چاہتے ہیں۔"
 "اللہ حافظ... اللہ حافظ" علی بابا نے میری پشت پر ہاتھ پھیرا۔
 میں نے گریڈنگ کا تھیلا ہاتھ میں لے لیا اور فضل کا سنگ ڈھیلا
 کر کے فضل کندھے پر رکھی۔ دراز خان اور میں شانہ بشانہ چلتے ہوئے
 دروازے سے نکلتے تھے تو باہر سے نقاب پوش عورتوں کا ایک غول دھڑا
 اور پہنے فن کے لیے راستہ چھوڑ دیا۔ وہ پندہ میں رہی ہوں گی لیکن
 سب ہی رافلوں سے مست تھیں۔
 بابر تین قطاروں میں گھڑ سوار منتظر تھے سب نے اپنے اپنے

گھوڑے کی لگام تھام رکھی تھی۔ دراز خان نے کسی سے میرا نام لے کر کچھ
 کہا پھر پلٹ کر بولا۔ "بابرخان، ان لوگوں سے ملو۔"
 میں اس کے ساتھ کسی فوجی کمانڈر کی طرح گردن مارتے، دائیں
 جانب چل پڑا۔ دراز خان نام بتانے لگا اور میں مودب کھڑے ہو جانوں سے
 ہاتھ ملاتا جب آخری آدمی سے فلاح ہوا تو دراز خان نے سوار ہونے کا
 اشارہ دیا پھر دو نوٹ لڑکے، ایک طرف سے دو گھوڑوں کے ساتھ ٹوٹ پڑے
 "اپنے لیے ایک گھوڑا پسند کرو، بابرخان! دراز خان بولا اور میں
 نے اپنے لیے مشکلی گھوڑے کا انتخاب کیا کیونکہ مجھے ادھر تارکی کا حصہ بن
 کر ہارون کو کاش کرنا تھا۔
 ساروں کی روشنی میں قافلہ ہمارے پیچھے تین قطاروں میں
 روانہ ہوا۔ میں اور دراز خان آگے تھے۔ چند فلاگ بکس تو گھوڑوں کی
 ٹاپوں کی آواز تھی، زبردستی ہی کیونکہ آبادی کی زمین ہم آگے آگے تھی
 لیکن جو تہی پہاڑی کے دامن میں داخل ہوئے، پتھر ٹھکنے لگے اور ہوں
 کی آواز کے ساتھ ساتھ گڑے گڑے بھی اٹھنے لگے تھے۔ میں نے پلٹ کر
 دیکھا۔ تنگ راستے کی وجہ سے قطاروں میں نظم و ضبط برقرار نہ رہا تھا۔ میرا
 گھوڑا کچھ بد مزاج اور اکثر تھا۔ بار بار تنگ کرتا اور دائرے میں ناچ کود کر
 پھر آگے چل پڑتا۔
 "یہ تمہیں وہاں پریشان کرے گا، بابرخان! دراز خان بولا۔ گھوڑا
 بدل لو۔"
 اس کی خرمی توڑنے کا وقت نہیں ہے، خان! وہ نہ میں اسے
 رہم کرنا بھی جانتا ہوں۔ میں نے اترتے ہوئے کہا۔ ادھر دراز خان بھی
 اتر پڑا تھا۔
 جب ہم ایک ٹیکری پر چڑھے تو چند میل دور برقی روشنیاں چمکلائی
 دکھائی دیں۔ "وہ کالونی کی روشنی ہے۔" دراز خان نے بتایا۔ ایک تاریف
 کرنا باقی ہے پھر کالونی کی آبادی شروع ہو جائے گی۔
 "آبادی سے بہت کم کوئی راستہ نہیں، خان؟"
 "ہے لیکن وقت زیادہ لگے گا۔" دراز خان بولا۔ "میں کالونی
 کی پہاڑی کا چکر لگانا چاہتا ہوں۔"
 "وقت ہمارے مفاد میں جائے گا، دوست! میں نے کہا۔ لڑنے
 گھوڑوں کو وہ لوگ نظر انداز نہیں کریں گے۔ اگر خان جیتا کو اسطرح
 ہوگی تو ہمارا مقصد فوت ہو جائے گا۔ تیار اور گھات میں چھپے ہوئے
 چند آدمی بھی ہمارے تمام آدمیوں کو بھون سکتے ہیں۔"
 "یار، بابرخان! کہاں تم کہیں نہیں سمجھا لیتے؟"
 "اس لیے خان! کہ اصل کمانڈر کی موجودگی میں ایک آدمی
 سپاہی مکان نہیں سمجھتا کرتا۔ میں نے ٹھہرے ہوئے انداز میں جواب

دیا۔ "ہاں، ہم بھائیوں کی طرح شانہ بشانہ ٹریس گئے۔"
 "میں اہل نہیں ہوں، بابرخان! وہ مدھم آوازیں بولا۔ میں
 لمانڈ اس لیے ہوں کہ میرا جد امجد بھی کمانڈر تھا۔ سوار کی نسل در نسل
 ہمارے خاندان میں چلی آ رہی ہے لیکن میں لڑائی بھڑائی کا آدمی نہیں
 ہوں۔ میں نے غول بہانا نہیں بلکہ سوکھی رگوں میں زندگی دینے کا علم
 حاصل کیا ہے۔ میں مٹی سے سونا بنانے کے عمل سے واقف ہوں۔۔۔
 لیکن میں جانتا ہوں اور دل سے مانتا ہوں کہ یہاں جو مارنے اور مرنے
 کے فن سے ناواقف ہوا اسے جینے کا حق نہیں دیا جاتا۔ گزشتہ ایک
 برس سے میں اس رات کو ٹال رہا تھا۔ خان جیتانے ایک برس قبل
 ہمارے قبیلے کی ایک لڑکی کو اغوا کر دیا تھا۔ میرا قبیلہ جوابی کارروائی
 کرنا چاہتا تھا، جبکہ میں نے بندوبست کر لیا تھا۔ لڑکی واپس لے لی تھی۔ اب پانی
 کا ٹیکس لگایا جا رہا ہے۔ میں شاید اب بھی انتہائی قدم اٹھانے کی حمایت
 نہ کرتا، اگر یونس خان حملے کی خبر نہ دیتا۔ لہذا میرے دوست! میرا جہرم
 اب تمہارے ہاتھ میں ہے، میرے ساتھ رہنا، دندنہ میں نقصان اٹھا
 بیٹھا تو قبیلے کے سامنے آنکھ نہ اٹھا سکوں گا۔"
 میں نے کوئی جواب نہ دیا تھا۔ اس شریف النفس نوجوان کو
 بھڑا سہارا دے کر میں عین اس وقت دھوکا نہیں دینا چاہتا تھا جب
 آگ اور خون کا کھیل پورے شباب پر ہوتا۔ مجھے تو ایسے ہی وقت ان
 سے الگ ہونا اور اپنے بھرن کی طرف رجوع کرنا تھا۔
 رات جوں جوں بھیگ رہی تھی، خشک ہواؤں کی کاٹ ہڈیوں
 تک اترتی محسوس ہو رہی تھی۔ میرے جسم پر آف جیکٹ تھی۔ اگر سفر پیدل
 ہوتا تو جسم گرم ہو جاتا مگر گھوڑے کی پشت پر ساکن بدن برف ہو رہا تھا۔۔۔
 دراز خان نے بھیڑیے کی کھال کا کوٹ پہن رکھا تھا، کانوں تک بھکی ٹوپی
 بھی لٹری کی کھال کی تھی۔
 معا اندھیرے کی چادر، گھوڑے کی ہینہا ہٹ سے جھجھکنے لگی۔
 اسی نے میرا گھوڑا بھی بدک بدک کر چلنے لگا تھا۔ میں نے جھک کر گھوڑے
 کے کانوں پر ہانپاں جما دیں۔ باجی مرحوم نے بتایا تھا کہ گھوڑے کی قوتیں
 بڑی تیز اور حساس ہوتی ہیں۔ اندھیرے میں اگر گھوڑا بدکنے لگے تو اس کی
 کنوٹیوں کے درمیان سے سوار کو دیکھنا چاہیے۔ کنوٹیوں کا رخ خطرے کی
 سمت کی نشان دہی کرتا ہے۔
 کنوٹیاں رخ بدل بدل کر بائیں جانب جھک رہی تھیں۔ میں
 نے تاریکی سے مانوس نگاہوں کو بائیں طرف لگا دیا۔ دو انگارے سے
 بھاری کی اوٹ سے جھانک رہے تھے۔ اگر کوئی شہری ہوتا تو وہ ان
 انگاروں کو شاید جگنو ہی سمجھتا مگر میں نے پہچان لیا تھا۔ بھاری کے پیچھے
 شاید بھیڑ یا چیتا تھا۔ اگر دھڑکنے سے ہوتا تو شک نہ مل جاتا۔ میں نے کندھے

سے داخل آمدنی اور لگام کا اشارہ دے کر گھوڑے کو بائیں طرف موڑ لیا۔
 چونکہ پیچھے آنے والے ساتھ لگے آ رہے تھے، اس لیے میرا گھوڑا قافلے سے
 الگ ہو گیا تھا۔
 "خان... میں نے پیچ کر کہا؟" ساتھیوں کو بتاؤ کہ ایک بھیڑ یا گھات
 میں ہے۔ میں اسے دیکھ رہا ہوں، سب نکل جائیں۔"
 "فائر کیوں نہیں کرتے بابرخان؟ دراز خان نے بھی حلق پھاڑ کر پوچھا۔
 "نہیں، فائر کی آواز نقصان دہ ثابت ہوگی۔ میں نے جواب دیا۔
 دراز خان نے پلٹ کر میری ہدایت ساتھیوں کو دی۔ ایک گھوڑا، میرے
 گھوڑے کے گرد چکر مار رہا تھا۔ سوار کا چہرہ نقاب میں تھا۔
 "تم جاؤ، دوست! میں نے اپنے گھوڑے کو قابو میں کرتے ہوئے کہا۔
 اس نے کوئی جواب دیا نہ گھوڑا ہٹایا تو میں یہی سمجھا کہ وہ میری بات نہیں سمجھ
 پایا ہو گا۔
 "بابرخان! سرگوشی ابھری اور میں نے پھرتی سے گردن موڑ کر
 دیکھا۔ آواز میری جانی پہچانی تھی۔ تم ادھر کے دندنہ اور انسانوں سے
 واقف نہیں ہو۔ انسان سامنے سے لٹک کر حملہ کرتے ہیں مگر دندنہ عقب
 سے جھپٹ پڑتے ہیں۔ تم جو یہی تنہا ہو گئے یہ تم پر جھپٹ پڑے گا۔"
 "میں اسے جھپٹنے کی ہمت ضرور دوں گا، شیریں تراب! میں نے
 بھی سرگوشیاں آوازیں جواب دیا۔ میں ادھر کے دندنہ کو باور کرنا چاہتا
 ہوں کہ ادھر کے انسان چھپ کر حملہ کرنے والے کے ساتھ کیسا سلوک
 کرتے ہیں۔"
 "لیکن ہم گولی کا رسک نہیں لے سکتے، بابرخان!"
 "ہاتھ تو استعمال کر سکتے ہیں نا۔" میں نے جھڑی پر ہانپاں جھپٹتے
 ہوئے کہا۔ کیونکہ دندنہ غائب ہو گیا تھا۔ چند گز ادھر ادھر جھڑیاں تھیں
 پھر میں نے چہرہ گھما کر دیکھا۔ قافلے کی آخری ٹکڑی بھی دس قدم آگے
 نکل گئی تھی۔ "آپ بھی چلیں، خانوں! میں نے مودب لہجے میں کہا۔
 "نہیں۔۔۔" شیریں چلتی آوازیں ابلی۔ "میں نے صرف اتنا جان
 سے اجازت لی ہے۔ اس لیے دراز بھائی سے پوشیدہ رہنا چاہتی ہوں۔
 ہم قدم فاصلہ رکھ کر کالونی تک چلیں گے۔"
 "آپ نے غیر دانش مندانہ قدم اٹھایا ہے، میں شیریں! دراز خان
 مجھے ساتھ رکھنا چاہتے ہیں۔ آپ اگر پوشیدہ رہنا چاہتی ہیں تو لوگوں میں مل
 جائیے۔" معا قریب ترین جھڑی سے گزرا ہٹ ابھری۔ میرا گھوڑا ہینہا اور
 الف ہو گیا۔ ابھی میں خود کو سنبھال ہی رہا تھا کہ شیریں کی پیچ ابھری۔۔۔
 گردن موڑ کر دیکھا تو دل جیسے اچھل کر حلق میں آ گیا۔ گھوڑے کی پشت
 خالی تھی اور شیریں کو دندنہ نے دلوں لیا تھا۔ اندھیرے میں یہ بھی نہیں
 معلوم ہو رہا تھا کہ دندنہ حملہ کر کے نکل گیا ہے یا شیریں کو بھی جھڑیوں میں

گھسیٹ لے گیا ہے۔ میں نے چھلانگ لگائی، اسی وقت ایک سایہ سا اڑتا ہوا، جھاری سے باہر آن کُرا۔ وہ شیریں تھی۔ میں تیزی سے اُس کی طرف بڑھا تو وہ اچھل کر اٹھ کھڑی ہوئی اور بولی۔

"میں نے خجھرے اُسے زخمی کر دیا ہے۔"

"چلیے، در نہ گھوڑے دوڑا کر جائیں گے۔" میں نے ہاتھ بڑھا کر اُس کا ہاتھ تھامنا چاہا تا کہ اُسے ساتھ ساتھ دوڑاتا ہوا ملے جاؤں مگر اُس نے اپنے ہاتھ کی بجائے ایک ہلال نما خجھر میرے ہاتھ میں تھما دیا اور خود مجھ سے کترائی ہوئی دوڑنے لگی۔ دونوں گھوڑے بدکنے کے باوجود، گھوڑوں کے پیچھے ہی گئے تھے۔ چونکہ چند منٹ ہی کا وقت ہوا تھا، اس لیے ہم نے چالیس پچاس قدم کے بعد ہی گھوڑوں کو جالیا تھا۔ سب سے پہلے گھوڑے تھیں دیکھتے ہی رُک گئے تھے۔

میں نے شیریں کو دوڑا اور اپنے گھوڑے کو ایڑ لگا کر دائیں جانب سے آگے نکل گیا۔ درازخان پٹ پٹ کر دیکھ رہا تھا۔ میں اُس کے نزدیک پہنچا تو اُس نے پُرسکون لہجے میں پوچھا۔

"بھیرا سامنے تو نہیں آیا؟"

"نہیں..." میں نے جواب دیا۔... پھر پہاڑی تک ہمارے درمیان کوئی بات نہیں ہوئی تھی۔ گو ہم بستی سے دور دور رہتے لیکن گھٹوں نے آنے والے خطرے کی شاید نوٹنگ کی تھی۔ آوارہ گئے دو رہے تھے اور دکھوائے بھونک رہے تھے۔ سلسلے ڈھلوان پہاڑی تھی اور مجھے شک سرکنڈوں کا جنگل تھا۔ اگر میں پہاڑی کا صلیق چھینڈ گیا ہوتا تو اتنی خاموشی نہ ہوتی، بازار سے فیکٹری تک جانے والی روشن سڑک اب تاریکی میں ڈوبی ہوئی تھی کیونکہ فیکٹری کا بڑا جنرل بھی تباہ ہو گیا تھا، صاف ذاتی جنرل شروں والے گھر روشن تھے۔

"درازخان! میں نے گھوڑے کی راسیں کھینچتے ہوئے کہا: ہمیں حملہ کرتے ہوئے تیزی سے مغرب کی جانب جانا ہوگا۔ جنگ میں فتح و شکست کی طرح ایڈوائس اور ریٹائر کے لیے بھی تیار رہنا پڑتا ہے۔ دباؤ کی صورت میں ہمارا راستہ صاف ہونا چاہیے۔ اگر ہم نے پشت پر پہاڑی رکھی تو ہمارے لیے پیچھے ہٹنا مشکل ہو جائے گا۔"

"جیسے کا طریقہ کیا ہوگا، بابر خان؟ درازخان نے پوچھا۔ کیا ہم ہوائی فائرنگ کرتے ہوئے دوسری طرف بھی جائیں گے؟ میں نہ صرف لا جواب ہو گیا بلکہ درازخان کے سوال نے پریشان بھی کر دیا تھا۔ اگر میرا جواب اثبات میں ہوتا تو کوئی بھی ماہر حرب سوال کر سکتا تھا کہ اگر سمجھتے ہوئے بے خبر دشمن کو ہوائی فائرنگ سے جگانا ہی تھا تو شب خون مار کر صدیوں پرانی روایت کیوں توڑنے کا فیصلہ کیا گیا تھا۔ میں ہانوں کی وجہ سے انھیں یہ مشورہ بھی نہیں دے سکتا تھا کہ بستی کو گھیرے میں لے کر گھروں میں گھس گھس کر

غارت گری کا بازار گرم کیا جائے۔ ہاروں کسی بھی مکان میں بے دست و پا ہو سکتا تھا۔ گولیاں اور انجان دشمن اُسے بھی نقصان پہنچا سکتے تھے۔

"آپ اپنے ساتھیوں سے مشورہ کر لیں، خان! آخر میں بھی انسان ہوں۔ اندازے غلط بھی ہو سکتے ہیں۔ ویسے میری ذاتی رائے اگر رائے... تو میں اجازت کے ساتھ پہل کر دوں گا۔ میں بازار کے درمیان جا کر ہم چھینکوں گا۔ آپ اپنے آدمیوں کے ساتھ ناکہ بندی کر لیں۔ جو نہی لوگ گھر وں سے نہیں، فائرنگ شروع کر دی جائے۔ جب تک وہ لوگ صحت حال نہیں گئے، ان کے آدھے آدمی موت کے گھاٹ اُتر چکے ہوں گے۔"

"پھر تم بھی اندر چھس جاؤ گے، بابر خان!"

"نہیں، میں ہم چھینک کر اُدھر نکل جاؤں گا۔"

"ٹھیک ہے، جاؤ۔ میں ان لوگوں کو چار ٹولیوں میں تقسیم کر کے آگے بڑھاتا ہوں۔"

میں نے گھوڑا آبادی سے فرلانگ بھر دوڑ ہی چھوڑ دیا کیونکہ پتھر ملی زمین پر گھوڑے کی ناہیں رات کے سائے کو اُدھیر رہی تھیں... میرا رخ طورا بازار خان کے گھر کی طرف تھا میں نے یونس کو وہی پوائنٹ بتایا تھا۔ جب تک ہاروں کی کوئی خبر نہ ملتی، میرے لیے دوسری کارروائی مشکل تھی۔ میں بے آواز اور محتاط انداز میں چلتا، بازار میں داخل ہوا۔ گھٹوں نے بازار کے عین درمیان مجھے گھیر لیا لیکن نزدیک کوئی نہ آیا تھا۔ شاید سب ہی آوارہ تھے، دکھوائے گئے، فیسولوں کے اندر بھونک رہے تھے... میں نے رائفل کو ڈنڈے کی طرح پکڑا اور طوابعانہ کے مکان کی جانب دیواروں کے ساتھ ساتھ بڑھنے لگا۔

معا سامنے والی گلی سے دوسرے نکلے، فاصلہ چند گز ہی رہا ہوگا۔ میں نے آگے نکلنے کی انتہائی کوشش کی تھی لیکن انھوں نے نہ صرف راستہ روک لیا تھا بلکہ دوستانہ انداز میں کچھ پوچھا بھی تھا۔ میں گنگ سا کھڑا رہا۔ دوسرے نے ڈپٹ کر پھر کوئی سوال کیا۔ میرے ہاتھ شک و شبہ کی وجہ سے نیچے گرے تھے۔ میں نے سوچا، شاید دوسرا آدمی یونس ہو لیکن اس کے صلیق سے اُبھرنے والی آواز نے میرے ہاتھوں کو آزادی دے دی۔ میں نے پوری قوت سے ہینڈ گرنیڈ کا قبیلہ ایک کے سر پر دے مارا اور دوسرا جو شاید میرے گریبان پر ہاتھ ڈالنے کی نیت سے قریب آ گیا تھا، میں نے اُس کے سینے میں خجھر گھونپ دیا۔ پھر جو نہی وہ دونوں ایک دوسرے سے ٹکراتے ہوئے گرے، میں آگے نکل آیا۔

"خرم..." اندھیرے میں ایک سرگوشی اُبھری۔ "اندرا جھاؤ" میں نے یونس کی آواز پہچان لی۔ اس کے باوجود میں گود کر اندھیرے میں دیوار کے ساتھ چپک گیا۔ یونس ایک مجبوری کا نام تھا، وہ دوست ہرگز نہ تھا۔ "ہاتھ اٹھا کر باہر آؤ، یونس خان! میں نے سر اُٹا دیا میں کہا... اور

وہ ایک دروازے سے نکل کر سامنے آ گیا۔" وقت بے حد کم ہے، جلدی بناؤ، ہاروں کا کچھ پتا چلا؟"

"سودی، خرم سلطان! وہ معذرت خواہانہ انداز میں بولا۔ درازخان کے قبیلے میں کوئی قدر ہے۔ مجھ سے پہلے یہاں حملے کی اطلاع پہنچ گئی تھی۔ کیا حملہ منسوی کر دیا گیا ہے؟"

"میرے سوال کا جواب دو، یونس خان! میرے صلیق سے ایک غراہٹ اُبھری۔"

"یہی جواب ہے، خرم سلطان! حملے کے پیش نظر بڑے خان نے ملک نواز اور ہاروں کو کسی محفوظ جگہ پہنچا دیا ہے۔ جب میں یہاں آیا تو جنگی حالت نافذ ہو چکی تھی۔ یہ لوگ، نالے کے کنارے مورچہ لگائے بیٹھے ہیں۔"

"بڑا خان کہاں ملے گا؟"

"وہ گودام کے ترخانے میں آتا رہا گیا ہے اور گودام پر تین آدمی پہرہ دے رہے ہیں۔"

"چلو، میری رہنمائی کرو، یونس خان! میں نے اپنے لہجے میں نرمی پیدا کرتے ہوئے کہا۔ "درازخان اپنے لوگوں کے ساتھ پہاڑی کے دامن میں میرے اشارے کا منتظر ہے۔"

"اچھا... اُدھر..."

"ہاں، میں اُنھیں اُدھر لے گیا تھا۔ اچھا ہی ہوا ورنہ وہ لوگ بے خبری میں مارے جاتے۔ یہ بتاؤ، تمھاری ادھر کیا پوزیشن ہے؟ کیا تم بھی ایک دوستانہ نگاہوں سے دیکھے جا رہے ہو؟"

"ہاں، کیوں؟" یونس خان چلتے چلتے رُک گیا۔

"تم مجھے پہرے داروں تک لے جاؤ گے۔"

"لیکن وہ مجھے اندر داخل ہونے کی اجازت نہیں دیں گے۔"

"بس، تم قریب لے جانا پھر اُن سے باتیں کرنا، باقی کام میں خود کروں گا۔"

"سنو، خرم سلطان! یونس ملجیانہ آوازیں بولا۔ مجھے ادھر رہنا ہے۔ اگر میں سامنے آ گیا تو..."

"تھکر نہ کرو، یونس خان! میں نے اس کے شانے پر پتھری دی۔ میں پہنچانے والی آنکھ اور بولنے والی زبان خاموش کر دوں گا۔ ویسے اگر تم واپس چھٹا پسند کرو تو میں ہر قسم کی ضمانت دیتا ہوں۔ ادھر اگر تمیں کو ملے تو ادھر پچاس ملیں گے مگر حلال ہوں گے۔ شاید تم نے کبھی نہ سوچا ہوگا کہ جو زیر تیار کیے گئے تم ادھر بھیجتے ہو، وہ تمھاری قوم کی رگوں میں اُترتا ہے۔ قوم جب مغلوب ہوگی تو وطن کی سرزمین پر دوسری قوم مسلط کر دی جائے گی، وہ زمین جس پر تمھارے آباؤ اجداد دفن ہیں اور تمھارا خاندان

رہا پس پذیر ہے۔ تم قوم کے دشمنوں کا ساتھ دے کر دولت کما رہے ہو۔ حالانکہ تم تعلیم یافتہ ہو، تمھیں معلوم ہوگا کہ غدار، قابلِ نفرت انسان ہوتا ہے۔"

"کیا وہاں مجھے ملازمت کرنا ہوگی؟"

"نہیں... اگر تم سچے دل سے توبہ کر لو گے اور قوم کی خدمت کا جذبہ اپنے اندر بیدار کرو گے تو ملک کی خدمت، تمھیں عزت اور دولت بھی دے گی۔"

"کس عزت کا نام لیا، تم نے؟" چوہدری؟ یونس دیکتی آواز میں بولا۔

"وہ عزت جو ادھر نہیں ملتی اور جس کے لیے مجھے یہ ذیل کام کرنا پڑا ہے۔"

"کیا عزت اور دولت لازم و ملزوم ہیں؟"

"ہاں..." یونس کے صلیق سے غراہٹ اُبھری۔ "میرے خاندان کو عزت، دولت ہی دے دی ہے۔"

"ٹھیک ہے، تمھیں دولت کی عزت بھی دی جائے گی۔"

یونس نے ہوکادے کر مجھے خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔ گلی کے موڑ پر کچھ لوگ کھڑے تھے۔ یونس آگے تھا، پندہ میں قدم کا فاصلہ درمیان تھا۔ میرا ہاتھ خجھر کے دستے پر جم گیا اور دُعا کرنے لگا کہ تصادم کی نوبت نہ آئے۔ کالونی میں رہنے والے سب ہی بُرے نہ تھے، میرے ہاتھوں مرنے والے شریف لوگ بھی ہو سکتے تھے۔ کوئی ساعت دُعا کے لیے بڑی دُعا ہوئی ہے۔ یونس خان ایک دم دائیں ہاتھ تنگ لگی میں مُڑ گیا۔ دو منٹ بعد ہم کھلے میدان میں نکل آئے جہاں جبار خان کا گودام تھا۔ دُور ہی سے ایک پہرے دار نے غالباً اپنی زبان میں ہالٹ پکارا۔ جواباً یونس نے فریڈنڈز کہا ہوگا۔ میں نے مظہر کو چہرے پر چڑھالیا۔ گودام کا دروازہ کھلا تھا اور اندر سیڑ میکس کی دم توڑتی مدقوق روشنی تھی... مدھم روشنی کے پیش منظر میں وہ تینوں دروازے پر لٹ دکھائی دے رہے تھے۔ میں چند قدم پیچھے رُک گیا تھا۔ یونس بار بار میری طرف اشارے کر کے انھیں کچھ بتا رہا تھا... پھر اُن میں سے ایک بولتا ہوا اندر چلا گیا تو یونس خان نے واپس آکر بتایا۔

"میں نے انھیں بتایا ہے کہ ملک نواز کے لیے ضروری پیغام ہے۔ وہ بڑے خان کو اطلاع دینے اندر گیا ہے۔ اگر خان نے تمھیں اندر طلب کر لیا تو کیا تم جاؤ گے؟"

"ہاں..." میں نے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ "تم بھی ساتھ چلو گے۔ خان اُدھر نہیں جانتا؟"

"تمھارا کیا خیال ہے، یہ لوگ ہمیں تنہا جانے دیں گے؟"

"دیکھا جانے گا۔" میں نے کندھے اُچکھک کر خجھر، جراب میں اُتر لیا۔ اگر وہ ہتھیار دکھوائے تو خجھر اندر جا سکتا تھا

پانچ منٹ بعد وہ شخص واپس آیا اور اپنے ساتھیوں کو کچھ بتانے لگا۔ پھر یونس کو پکارا گیا۔
 "بابر خان! یونس نے ان کا حکم پہنچاتے ہوئے بتایا۔ تم ہتھیار جمع کرو۔" میں نے داخل اور تھپلا آگے بڑھ کر ان کے حوالے کر دیا۔ "چلو، خان نے تمہیں بتایا ہے۔"

آگے یونس اور مجھے ایک گھمان تھا۔ میں نے چہرہ گھا کر دیکھا، اس نے داخل کندھے سے لٹکا رکھی تھی۔ انداز دوستانہ ہی تھا۔ ترخانے کی سیڑھیاں اتر کر ہم نیچے گئے۔ جس کی بونا قابل برداشت تھی۔ ترخانہ گودام کے نیچے دو تک پھیلا ہوا تھا۔ جبار خان مغربی کونے میں تھا۔ کیروسین لمپ کی روشنی میں وہ پہاڑ، فرشی بستر پر نیم دراز تھا۔ میں نے سیڑھیوں کے اندھیرے سے فائدہ اٹھاتے ہوئے خنجر نکال کر استین میں چھپا لیا تھا۔ کیروسین لمپ کی روشنی اتنے بڑے ترخانے کے لیے ناکافی تھی۔ میں نے وہاں کسی اور کی موجودگی کا جائزہ لیا، جہاں تک نظر گئی، کاٹھ کباڑ ہی دکھائی دیا۔ تب میں پھرتی سے گھوما اور خنجر دستے تک گھمن کے حلق میں گھونپ دیا۔ اس کا منہ کھلا پھر اس کے ہاتھ اوپر اٹھے۔ میں نے اس کے پیٹ پر پاؤں جما کر خنجر ایک جھٹکے سے نکال لیا اور گود کر جبار خان کے سر پر جا کھڑا ہوا۔ اس کا ہاتھ گھمے کے نیچے رینگ گیا تھا۔ میں نے اچھل کر اس کے شلے پر ضرب لگائی۔ وہ ڈکراتا ہوا اونڈھا ہو گیا۔

"یونس خان! میں نے سو آواز میں کہا۔" میری باتوں کو اس تک پہنچاؤ، پہلے میرا نام بتاؤ۔" یونس نے لڑکھاتی آواز میں حکم کی تعمیل کرتے ہوئے میرا نام بتایا۔ جبار خان ایک دم سیدھا ہو گیا۔
 "سنو، خان! ہماری کوئی دشمنی نہیں ہے۔ ہماری جنگ، ملک نواز سے ہے جسے تم نے پناہ دے رکھی ہے۔" یونس خان نے ترجمہ کیا پھر میں بولنے لگا۔ "ملک نواز، حکومت پاکستان کو مطلوب ہے اسے واپس لینا حکومت کا کام ہے، میں مداخلت نہیں کروں گا۔۔۔ مجھے میرا آدمی واپس کر دو۔"

"ہارون کو ملک نواز واپس لے گیا ہے۔" یونس نے خان کا جواب سنایا۔
 "جھوٹ مت بولو، خان! میں نے اس کے گول چہرے پر ٹھوکر ماری۔" وہ شام تک یہاں تھا۔
 "وہ آٹھ بجے یہاں سے روانہ ہوئے ہیں۔" خان جبار نے خنجر تھوک کر بتایا۔

"اب آخری سوال: میں نے ایک گھنٹا اس کے جسم پر رکھا اور ناک میں دو انگلیاں ڈال کر اس کا چہرہ اوپر اٹھایا۔ جبار خان کی

آنکھوں میں خوف کے سائے تیرنے لگے تھے۔ میں نے خنجر والا ہاتھ اس کی آنکھوں کے سامنے لہرایا اور پھر ہاتھ اوپر اٹھنے لگا تو جبار خان کے حلق سے خرخرات اُبھری۔
 "وہ گل جان افغانی کی پناہ میں ہیں۔" یونس نے بتایا۔ "آؤ، میں اس کا گھر جانتا ہوں۔"

میرا اٹھا ہوا ہاتھ نیچے آیا اور خنجر، جبار خان کے کھلمنڈے سے حلق تک ڈوب گیا۔ جب وہ زور سے پھر پھرایا تو میں نے گود کر ابلتے ہوئے خون کے فشار سے اپنے لباس کو بچایا تھا۔
 "شکریہ خرم سلطان! یونس بولا۔" تم نے یہ بہت اچھا فیصلہ کیا ہے، ہند یہ میری زندگی کے لیے خطرہ بن جاتا۔ اب باہر والوں سے منڈنا ہوگا۔"

میں نے خنجر، بید شیت پر رگڑ کر صاف کیا اور کیروسین لمپ اٹھا کر پیٹوں پر اچھال دیا۔ چھانکے کے ساتھ ہی آگ بج کر اٹھی تھی۔۔۔ جبار خان جیسے شیطان کو مٹی میں نہیں بلکہ منشیات کی بدبودار لکھ ہی میں دفن ہونا چاہیے تھا۔

خلیفہ تو فتح باہر کھڑے نگرانوں نے کوئی شکوت نہ ڈالی تھی۔ یونس نے انھیں مطمئن کر دیا ہوگا۔ میری داخل بھی واپس دس دی گئی تھی۔ ہینڈ گرنیڈز کا تھپلا یونس نے اٹھالیا۔ ہم تیز قدم اٹھاتے پھر ایک تادیب گلی میں داخل ہو گئے اور پانچ چھ منٹ گلیوں کے جال میں چلنے کے بعد ایک کھلے میدان میں پہنچ گئے۔ وہ راستہ فیکٹری کی طرف جاتا تھا۔ پہاڑی کے دامن میں دراز خان میرے اشارے کا انتظار کر رہا تھا لیکن اب بسا اصرار پھر بدل چکے تھے، اس لیے پہلی چال نقصان دہ ہی ہو سکتی تھی۔ اگر میں دھماکا کر کے انھیں بلا لیتا تو خان جبار کے آدمی دھماکے کی آواز سن کر ادھر متوجہ ہو جاتے۔۔۔ اور شہر کی گلیوں میں گھسان کی جنگ شروع ہو جاتی جہاں غورتیں، بچے اور بوڑھے بھی جنگ کی آگ میں جل جاتے۔

"گل جان کا گھر کتنی دوس ہے؟" میں نے پوچھا۔
 "پہاڑی کے دوسے سرے پر کو چیلوں کا محلہ ہے۔" یونس نے بتایا۔ "وہ لوگ خانہ بدوش ہیں۔ مال لے کر آتے ہیں اور چلے جاتے ہیں۔ اس لیے چھپکوتوں میں رہتے ہیں۔"

"آؤ، دراز خان کو نئی صورت حال سے آگاہ کر دیا جانے۔" میں نے کہا۔ "جب وہ لوگ آپس میں ٹکرائیں گے تو ہم گل جان کی طرف بکس چلیں گے۔"

یونس نے خاموشی سے قدموں کا رخ بدل لیا۔ میں سوچنے لگا تھا، مجبوری انسان کو کس قدر بے بس کر دیتی ہے۔ اگر یونس کے ہاتھ

مجبوری نے نہ جکڑے ہوتے تو وہ بے چون و چرا میرے اشاروں پر ہرگز نہ چلتا کسی بھی لمحے کو میرے خلاف استعمال کر کے اراد ہو جاتا لیکن اس کی مجبوری اس کی دسترس سے بہت دور تھی۔

وہ لوگ اسی جگہ کھڑے تھے۔ میرے ساتھ دوسرے آدمی کو دیکھ کر چار آدمیوں نے اچانک گھیر لیا تھا۔ میں نے نام بتایا اور یونس نے دراز خان کا قوالہ دیا۔۔۔ ہماری وجہ سے چونکہ پہل سی مچ گئی تھی، اس لیے دراز خان خود ہی چلا آیا تھا۔

یونس خان نے اسے بتایا تو وہ غصے سے ہانپنے لگا تھا لیکن بولا کچھ نہیں۔ البتہ کچھ لوگ جو قریب کھڑے تھے، وہ غصے کا اظہار کرنے لگے تھے۔ دراز خان نے ہاتھ اٹھا کر انھیں جھڑک دیا پھر شکستہ آوازیں بولا: "کیا ہم خاموشی سے واپس چلے جائیں؟"

"نہیں، محترم خان!" میں نے جواب دیا۔ "غدار کوئی ایک ہے، جبکہ وفاداروں کی قوت آپ کے ساتھ ہے۔ حالات پیٹے سے بھی کہیں زیادہ موافق ہیں، آپ اپنے آدمیوں کو دو ٹکڑیوں میں بانٹ لیں، ایک ٹکڑی، گھوڑوں کے ساتھ اسی راستے واپس جانے لگی اور تارے پر بیٹھے دشمن کو لگا کرے گی جبکہ دوسری عقب میں رک کر حملے کا انتظار کرے گی۔ جنوں ہی وہ لوگ ادھر متوجہ ہوں گے، عقب سے ان پر حملہ کر دیا جائے گا۔ یہ جنگی چال جرمن کے مشہور جرنیل روئل کی ہے۔ دشمن دو پاؤں میں گھر کر پس جاتا ہے۔"

"اس طرح ہم دو حصوں میں بٹ جائیں گے۔" دراز خان نے اعتراض اٹھایا۔

"انھیں بھی تو بیک وقت دو محاذوں پر لڑنا پڑے گا۔" میں نے جواب دیا۔ "ایک محاذ ان پر ظاہر ہوگا جبکہ دوسرا اچانک کھلے گا۔ وہ غیر متوقع حملے سے بڑھ کر قوت مدافعت کو بیٹھیں گے۔"

دراز خان نے بے دلی سے میری ہدایت پر عمل شروع کیا تو کچھ نوجوانوں نے احتجاج کیا تھا لیکن دراز خان نے انھیں مطمئن کر دیا تھا۔ ہر آدمی کو ایک گھوڑا خالی پکڑا دیا گیا اور دراز خان پندہ لادھیوں کے ساتھ میری رہنمائی میں چل پڑا تھا۔

"دراز خان۔۔۔" یونس خان یقیناً میری مجبوری محسوس کر رہا تھا تب ہی اس نے میرے لیے گنجائش بنانے کی تدبیر سوچی تھی۔ "اگر بند توڑ دیا جائے تو یہ لوگ نالہ عبور نہ کر سکیں گے۔ جیسے ہم ہوں گے اور آگے ہمارے آدمی اور ناقابل عبور نالہ ہوگا۔"

"ہاں، تجویز تو معقول ہے۔" دراز خان بولا۔ "مگر بند توڑے گا کون؟" میں دراز خان کی سادگی پر دل ہی دل میں ہنسنے لگا۔ وہ واقعی ایک اسکالر تھا جسے کتابوں کے علم نے صرف انسانوں کو صحت مند اور

زندہ رہنے کے گر بکھلے تھے، اس نے فن حرب کی کوئی کتاب نہیں پڑھی تھی۔ اگر یونس خان ایسا مشورہ مجھے دیتا تو میں کبھی قبول نہ کرتا۔ کیونکہ پانی دونوں فریقوں سے یکساں سنوک کرتا۔ نہ یہ لوگ پار جا کر دشمن کا سینہ چھینی کر سکتے تھے اور نہ ہی پار والے نالہ عبور کر کے اپنی فتح کو یقینی بنا سکتے تھے۔ اس طرح تو دشمن پلٹ کر، بے خطر اپنی پوری قوت عقب سے حملہ کرنے والوں پر صرف کر سکتا تھا کیونکہ اُسے آدمی فورس سے لڑنا پڑتا اور وہ لوگ پانی کی وجہ سے اپنے ساتھیوں کو کمک پہنچانے سے قاصر رہتے۔

"میں اور بابر خان دوستی بھول سے بند توڑ آتے ہیں۔" یونس خان نے جواب دیا۔

"کیوں، بابر؟" دراز خان نے میری رائے طلب کی۔ اگر میرے ساتھ مجبوری نہ ہوتی اور اہم مشن درپیش نہ ہوتا تو میں اس سلاہ لوح شخص کو کبھی دھوکا نہ دیتا۔ میں نے ضمیر کی چیخ کو ڈبا کر، یونس کی تجویز کے حق میں جواب دے دیا۔ "ٹھیک ہے، تم دونوں جاؤ۔"

ابھی ہم ٹیکڑی کے مین گیٹ میں داخل بھی نہ ہوئے تھے۔۔۔ کہ مغرب کی جانب سے فائرنگ کی آواز سنائی دی۔ غالباً گلیوں میں پھرنے والوں نے دراز خان کی پادٹی کا راستہ روک لیا تھا۔ یہ سچویشن ہمارے لیے خطرناک تھی۔ اگر باقاعدہ فائرنگ شروع ہو جاتی۔۔۔ تو گل جان افغانی بھی ہوشیار ہو سکتا تھا لیکن چار پانچ فائروں کے بعد خاموشی چھا گئی تھی۔

"کیا ہم بند توڑیں گے، یونس خان؟"
 "نہیں۔۔۔" یونس ہنس پڑا۔ "بند یہاں سے تین چار میل اوپر ہے اور وہاں جبار خان نے پہرہ لگا رکھا ہے۔"
 "پھر دراز خان کو کیا جواب دو گے؟"
 "کیا ہم پھر دراز خان سے ملیں گے؟"

"ہاں، برادر!" میں نے گہری سانس لے کر کہا۔ "ضروری ہے ورنہ ہم پی۔ اے تک کیسے پہنچیں گے۔"

"تمہیں بھی بیساکھیوں کی ضرورت ہوتی ہے خرم سلطان؟" یونس کی آواز میں طنز تھا۔ "جب تم اس لڑکی کو نکال کر لے گئے تھے تو کوئی دراز خان تمہارے ساتھ تھا؟"

"ہاں تھا۔" میں نے کہا۔ "ایک بیساکھی مل گئی تھی۔"
 "اگر تم جیسی کا پڑا دھر رکھتے تو ہم ہارون کو لے کر آسانی سے اُڑ جاتے۔"

"اگر جیسی کا پڑا، ہماری طرح دبے پاؤں چلنے کا اہل ہوتا تو میں ضرور لے آتا۔"

"اب بھی منگو سکتے ہو۔"

"ہاں... لیکن بذریعہ پی۔اے۔ میں نے کہا۔ لیکن میں کوئی رسک نہیں لے سکتا۔ ہم درازخان کی میساکھی ہی استعمال کریں گے۔" اگر وہ یہاں سے سلامت واپس جاسکا تو... یونس خان نے غزائے ہوئے کہا۔ میں نے ایک تیر سے دو شرکار کیے ہیں چوہدری! درازخان کا اصل دشمن یہ قید نہیں بلکہ جبار خان کا بیٹا ضامن حسان ہے۔ درازخان نے ضامن کی بہن سے شادی کی تھی لیکن دوسرے ہی دن وہ طلاق لے کر واپس آگئی تھی کیونکہ شیریں تراب نے ضامن خان سے شادی کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ اگر وہ انکار نہ کرتی تو میرے دن ضامن کی رات جاتی مگر انکار میں کر ضامن کی بہن نے طلاق کا مطالبہ کر دیا تھا۔ اس طرح ضامن خان، درازخان کے خون کا پیاسا ہے۔ میں نے تمہاری وجہ سے پہلے درازخان کو جنگ پر اکسایا اور پھر ضامن خان سے درازخان کے سر کا سودا کر لیا۔ میں نے ہی انھیں اطلاع دی تھی۔ اگر ضامن خان، درازخان کی گردن اتارنے میں کامیاب ہو گیا تو میں اس سے راہداری طلب کروں گا۔"

میرا خون رنگوں میں پھرنے لگا۔ مجھے یونس کی ذلیل حرکت نے توڑ پھوڑ دیا تھا۔ درازخان سے میرا کوئی تعلق نہ تھا لیکن وہ ایک کھرا اور سچا انسان تھا اور میرے مفاد پر اسے قربان کیا گیا تھا۔ اگر مجھے یونس کی ضرورت نہ ہوتی تو میں اس دولت کے پجاری کو چیر پھاڑ دیتا لیکن وہ میرے مشن کا ایک اہم ٹھہرہ تھا، اس لیے میں نے ٹھوکریں مارتے خون کی طلب پوری نہ کی تھی۔

جھگڑوں کا سلسلہ شروع ہونے ہی میرے اندر کا دندہ بیدار ہو کر غزائے لگا تھا۔ یہ میری وہ سرشت تھی جو حالت امن میں گہری نیند میں ڈوبی رہتی تھی۔ بقول لیگن کے، میں ایسی حالت میں پھیر کے کسی غیر خواہجے کی طرح معصوم اور بے ضرر دکھائی دیتا تھا لیکن جو بڑی خطرے کی گھنٹی بجنے لگتی یا خطرے کے زون میں قدم پڑتا تو مجھ پر درندگی اور وحشت طاری ہو جاتی۔ میرے حلق سے غراہٹیں ابھرنے لگتیں... اور ہاتھوں کی انگلیاں ناگوں کی زبانیں بن جاتی تھیں۔

جھگڑوں کا سلسلہ شاید دور تک پھیلا ہوا تھا۔ اندھیرے میں وہ بے ترتیب دھبے ہی دکھائی دے رہی تھیں جس جھگڑے کے سلسلے یونس زکا تھا، اس کی دیواریں مٹی کی اور چھت سرکنڈوں کی تھی۔ کواڑوں کی جگہ نمندے کا پردہ لٹکا ہوا تھا۔ یونس نے دیوار پر ہاتھ مارا اور گل جان کا نام لے کر آواز دی۔ اندر شاید کیروسین لمپ مدھم کیا گیا تھا پھر چھت کی درزوں سے روشنی جھانکنے لگی۔ کسی عورت نے کنبک دار آواز میں پردے سے جھانک کر جواب دیا۔ یونس خان اور اس عورت کے درمیان

مکالموں کا تبادلہ ہوتا رہا تھا اور میں چپ چاپ کھڑا پردے کو گھومتا رہا تھا۔ گل جان، یہاں کے ساتھ غلامیں ہے۔ یونس نے بتایا۔

"خاتون سے تعاون کی درخواست کرو۔" میں نے کہا۔ "بصورت دیگر جبر کا راستہ اختیار کرنا پڑے گا۔"

یونس نے عورت سے کچھ کہا اور اس نے صاف انکار کر دیا۔ تب ہی میں نے چھت پر پردہ ہٹایا اور خیر کی نوک عورت کے سینے پر رکھ دی اور اسے دھکیلتا ہوا اندر لے گیا۔ میں یہ یقین کر لینا چاہتا تھا کہ ہمارے پیچھے کوئی شو نہیں اٹھے گا۔ اندر فرشی بستر پر دو تین برس کا بچہ سویا ہوا تھا، دوسرے بستر پر ایک رائفل پڑی تھی۔

"اس سے کہہ دو اگر اس نے عدم تعاون کا رویہ جاری رکھا تو بچے کو ہلاک کر دیا جائے گا۔" یونس نے میری بات اس تک پہنچائی... تو وہ اچانک تڑپ کر بچے پر جاگری اور ہاتھوں سے یقیناً رحم کی بھیج مگنے لگی تھی۔

یونس نے باز کی طرح چھت مار کر بچہ اس کی ہاتھوں سے چھین لیا۔ وہ بیٹھے بیٹھے غوطے میں، یونس کے پیروں پر جاگری۔ یونس نے اس کے چہرے پر پاؤں کی ہلکی سی ضرب لگائی تو وہ بلبلائی ہوئی میری جانب بڑھی۔ میں نے اس کے بچے ہونے والوں کو منہ می میں جکڑا اور جھٹک دے کر اسے اوپر اٹھا لیا۔ یونس نے کچھ کہا جس کے جواب میں وہ 'غاہ غاہ' کرتی میری گرفت میں پھلنے لگی۔

"ٹھیک ہے، یونس بولا۔ "یہ تعاون پر آمادہ ہے۔"

میں نے اسے آزاد کیا تو وہ چادر اوڑھ کر آگے آگے چل پڑی... میں اس کے ساتھ جڑا رہا تھا... گل جان کی بیوی نے نہیں بلکہ بچے کی ماں نے، ممتا کے ہاتھوں میں جو کچھ فیصلہ کیا تھا، اس پر وہ خلوص نیت کے ساتھ عمل کرتی، یہیں ایک غارتگ لے گئی۔ غار کا دبانہ، سطح زمین سے چند فٹ اونچا تھا اور دبانے سے مدھم مدھم روشنی دکھائی دے رہی تھی۔ یونس کے کہنے پر عورت نے گل جان کو پکارا تو میں نے گھسٹتا ہوا ایک چٹان کی اوٹ میں لے گیا۔

گل جان دوسرے منٹ پر دبانے سے کود آیا تھا۔ اس کے ہاتھ میں رائفل تھی اور اس نے گرج کر یونس خان سے غالباً اپنی عورت کے بارے میں پوچھا تھا۔ تب گل جان نے عورت کو سعدیہ کے نام سے پکارا اور سعدیہ نے جواباً اسے صورت حال بتائی۔ یونس نے بڑھ کر بڑے اطمینان سے گل جان کے ہاتھوں سے رائفل لے لی اور پھر وہ واپس غار میں چلا گیا تھا۔

"کیا کہتا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"منزل ہمارے سامنے آنے والی ہے، چوہدری! یونس نے

بتایا۔" وہ بیوی اور بچے کی زندگیوں کے عوض ہمارے حوالے کرنے پر رضامند ہے۔"

"اور گل نواز...؟"

"پہلے ایک کو آنے دو خرم سلطان! یونس نے بتایا۔" اب ہماری پوزیشن بہتر ہے۔ ملک نواز کو ہم خود تلاش کر لیں گے۔" دو تین منٹ بعد گونے کی آواز سن کر میں نے جھانک کر دیکھا، مارچ کی روشنی میں ہارون کھڑا تھا اور اس کی مشکیں نالوں کی دوری سے کسی نہ تھیں۔

"ہارون... میں نے بھرائی ہوئی آواز میں پکارا۔" ادھر چٹان کی طرف آؤ اور، یونس خان! تم گل جان سے دوسرے آدمی کی بات کرو۔" ہارون دوڑتا ہوا میرے قریب آیا اور میں نے دو فور جذبات سے اسے ہاتھوں میں بھر کر چوم لیا پھر خیر سے دوری کاٹ دی۔ ہارون نے آزاد ہو کر اپنے جذبات کا اظہار کرتے ہوئے مجھے سینے سے لگالیا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ آپ ضرور آئیں گے۔ وہ پکیپاتی آواز میں بولا۔ "یہی بات میں نے ملک نواز کو بتائی تھی اور وہ خوش تھا، جبکہ میں دعائیں مانگ رہا تھا کہ آپ نہ آئیں۔"

"ایسی دعائیں قبول نہیں ہوا کرتیں میرے بھائی! میں نے اس کی پشت تھپتھپائی۔" تم ایک سو جبکہ تمہارے لیے دعائیں کرنے والے بہت ہیں۔"

"گل جان اپنی بیوی مانگ رہا ہے، چوہدری! یونس نے بتایا۔" وہ غار سے باہر نہیں آ رہا۔"

"ملک نواز کے بارے میں کیا کہتا ہے؟ میں نے پوچھا۔"

"ملک نواز یہاں نہیں ہے۔" ہارون نے بتایا۔ "وہ سرشام ہی ہند آدمیوں کے ساتھ کہیں چلا گیا تھا۔"

"اوہ..." میں نے چھنکارتی آواز میں کہا۔ "وہ ناگ پھر کس جگہ میں جا چھپا ہے۔ اس بار میں اس کا سر کھینچنے کا فیصلہ کر چکا تھا۔"

"کوئی بات نہیں چیف! ہارون ہاتھ ہراتے ہوئے بولا۔" اسے ادھر تو رہنا نہیں ہے، وہ اپنے رابٹوں کا انتظار کر رہا ہے۔ اگر اسے مثبت جواب نہ ملا تو وہ براستہ افغانستان بنکاگ جانے کا ارادہ رکھتا ہے۔"

جب یونس نے دوبارہ گل جان کا تقاضا دہرایا تو میں نے سعدیہ کو اشارے سے جانے کی اجازت دے دی۔ جب وہ غار کے دبانے میں داخل ہو گئی تو میں نے یونس خان سے پچھلے کر، اس کے حوالے کر دیا پھر اس کے ساتھ ہی میں اور یونس بھی غار میں اتر گئے۔ گل جان غالی ہاتھ کھڑا تھا۔

دونوں نے چپ چاپ ہاتھ بندھ لیے۔ میں نے ماں اور بچے کا باہمی تعلق پر نظر رکھتے ہوئے سعدیہ کے ہاتھ سامنے باندھے، جبکہ گل جان کے ہاتھ پشت پر کس دیے گئے تھے۔ دونوں نے یقین دلایا تھا کہ وہ ایسی کوئی کارروائی نہیں کریں گے جس سے ہمارے لیے خطرہ ہو۔

جب ہم غار سے نکلے تو کالونی کی طرف سے دھماکوں اور فائرنگ کی آوازیں آرہی تھیں۔ میں نے ہارون کو تفصیل بتائی تو چند لمحوں تک وہ خاموشی سے چلتا رہا پھر میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر بولا۔ "کیا ہماری شراکت ضروری ہے، چیف؟"

"شراکت تو ضروری نہیں۔" میں نے جواب دیا۔ "لیکن درازخان کا سہارا ناگزیر ہے۔ اگر ہم کٹر کر جیں بھی گئے تو پولیٹیکل ایجنٹ تک پہنچنا دشوار ہو جائے گا۔"

"میری وفاداری مشروط ہے۔" یونس بولنے لگا۔ "اس لیے میں، تم سے وفاداری کا اظہار کرتے چھان نہیں لگتا لیکن تمہاری جراتوں نے مجھے بڑا متاثر کیا ہے۔ تم نے مجھے ایک آفر دی تھی، تب میں غفلت نہ تھا لیکن اب میں ایک فیصلہ کر چکا ہوں۔ میں واپس تمہارے ساتھ جاؤں گا اور اپنا مستقبل تمہارے حوالے کر دوں گا۔ پہلے میں تمہاری حفاظت اپنے خاندان کی سلامتی کے لیے کرتا رہا ہوں مگر اب دوسرا جذبہ شامل ہو گیا ہے۔ ہم نے شروع ہی سے درازخان کو غلط مشورے دیے ہیں، حالانکہ دونوں تبدیلیوں کی جنگ نے ہمارے مشن کو کوئی فائدہ نہیں پہنچایا۔ ہارون صاحب کو ہم ان کے بغیر بھی رہا کر دیتے..."

"بہت فائدہ ہوا ہے، یونس خان! میں نے اس کی گفتگو کھٹکتے ہوئے کہا۔ "چونکہ تم بھی اصل مشن کی روح سے ناواقف ہو، اس لیے فائدہ محسوس نہیں کر سکتے۔ ہم نے شیش ناگ کا سر کھینچ دیا ہے اور کتنے ہی ذہریے ناگ اس تصادم کی جھینٹ چڑھ جائیں گے۔ جبار خان کا بھرا ہوا گودام راکٹیں چمکے۔ گودام میں زندگی کی بشارتیں بڑھیں بلکہ موت کی گولیاں تھیں۔ یہ مال انسان کشی کے لیے استعمال ہوتا۔"

"کیا اس طرح منشیات کی پیداوار اور ترسیل بند ہو جائے گی؟" یونس نے طنزیہ آواز میں پوچھا۔ "نہیں، چوہدری! ادھر جبار حسان جیسے کئی شیش ناگ موجود ہیں۔"

"میں جانتا ہوں، بلور! میں نے نرم آواز میں کہا۔ "بند نہیں ہوگی مگر کم ضرور ہو جائے گی۔ اگر ہماری کوشش سے چند انسان بھی کیالی کی وجہ سے بچ گئے تو بڑی بات ہوگی پھر ہماری یہ آخری کوشش نہیں ہے۔ ہم باز کی طرح پٹ پٹ کر ان ناگوں پر چھپتے رہیں گے۔ اگر ہم واپس ایک ناگ اور ایک گودام بھی ختم کرتے رہے تو ایک دن ایسا ضرور آئے گا جب ان لوگوں کو ذاتی استعمال کے لیے بھی محفوظ

دس بارہ گھوڑے خالی تھے کیونکہ دس آدمی ہلاک ہو گئے تھے۔ میرا گھوڑا بھی دوسرے گھوڑوں سے بل گیا تھا لیکن ہم تینوں کو ایک ایک سوار نے اپنے گھوڑے کے ساتھ لگا لیا تھا۔ اس وقت غصے سے میرا بدن ترخنے لگا تھا۔ میں نے دہائی آواز میں دراز خان کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

”دراز خان! ابھی فیصلہ نہیں ہوا ادم ہمیں سروسے رہے ہو۔“
”سزا نہیں، بابر خان! دراز خان نے جواب دیا۔“ یہ بھی ہماری روایات میں سے ایک روایت ہے۔ دشمن کو انصاف گاہ تک یونہی لے جایا جاتا ہے۔ ہم صرف دوست کو اپنا ہتھ اور گھوڑے کی پشت دیا کرتے ہیں، چونکہ تمہاری دوستی مشکوک ہو چکی ہے اس لیے تمہیں پیدل ہی چلنا ہوگا۔“

”تو پھر فیصلہ نہیں کرو، دراز خان!“ میں نے جھٹکا دیا اور سوار ڈکڑا ہوا، گھوڑے سے نیچے آ گیا۔

”کیا چاہتے ہو، بابر خان؟“ دراز خان نے ہاتھ بلند کر کے ساتھیوں کو روکا۔ کئی رائفلس سیدھی ہو گئی تھیں۔ اس کا گھوڑا میرے گرد چکر لے لگا تھا۔ ”ضد نہ کرو، بابر خان!“

”ضد نہیں، خان!“ میں نے صق چھڑا کر کہا۔ ”میں مجرم نہیں ہوں۔“
دراز خان سے میں یہ پوچھنا چاہتا تھا، کیا میں نے اسے کچھ کہا تھا۔
معا ایک شخص اڑتا ہوا، دراز خان کی پشت سے چٹ گیا۔ جب وہ دہرائوں میں لحظہ بھر کے لیے جم گیا تھا، وہ ہارون تھا جو پشتوں میں جھج رہا تھا۔ دراز خان کی گردن اس کے بازو کے شکبے میں جکڑی ہوئی تھی۔ نہ جانے کیسے اس نے خود کو آزاد کر لیا تھا۔

دراز خان نے کچھ کہا اور تمام رائفلس جھک گئیں۔

”ہارون...“ میں اس کے قریب جا کر بولا۔ ”میری جیب میں خنجر ہے، نکال لو۔“ ہارون نے جھک کر فادخ ہاتھ سے خنجر نکالا اور چشم زدوں میں میری بندش کا ثابہا سیدھا ہو گیا۔ میں نے ایک خالی گھوڑا پکڑا اور گود کر سوار ہو گیا۔ ہارون نے پھر دراز خان سے کچھ کہا تھا جس کی تعمیل میں تمام گھڑ سوار آگے آگے چل پڑے تھے۔ میں نے ہاتھ بڑھا کر دراز خان کی رائفل بھی چھین لی تھی۔

”بہادر اور ضدی نوجوان!“ دراز خان بزرگانہ لہجے میں بولا۔ ”تم جو کچھ تھے، وہ فیصلہ ہم کر لیتے لیکن اب تم نے خود کو ہمارے قبیلے کا دشمن بنا لیا ہے۔ شاید میں بھی تمہاری سفارش نہ کر سکوں۔“

”میں نے اپنا حق حاصل کیا ہے، خان! کیا قیدی کو آزادی کا حق نہیں ہوتا؟“

”کیا تم آزاد ہو، بابر خان؟“

”ہاں، خان! میں آزاد ہی نہیں، اس وقت برتری ہوں۔“ میں نے جواب دیا۔ ”تمہاری زندگی میری آنکھی کے اشارے کی محتاج ہے۔“
”میری موت بھی تمہیں یہاں سے نکل جانے کی راہداری نہ دے گی، حق نوجوان! میری زندگی ہی تمہاری سلامتی کی ضامن ہے... اور یہ احساس تم لوگوں کو بھی ہے۔“

”اس خوش فہمی میں نہ رہنا، دراز خان! ہارون بول پڑا۔ تمہاری لاش یونہی میری ہاتھوں میں بیٹھی رہے گی اور ہم جب راستہ پائیں گے تمہاری لاش کو بطور ڈھال استعمال کر لیں گے۔“

ہارون کی بات سن کر ایک کوندا سا میرے ذہن میں لپکا۔ یقیناً ہارون نے مجھے اشارہ دیا تھا، ورنہ میں تو قہر ہو چکا تھا۔ ہارون نے دوسرے انداز میں سوچا تھا کہ اگر دراز خان کے قبیلے میں جا کر بے بسی کی موت مرنا ہے تو کیوں نہ جدوجہد کی راہ میں بہادری کی موت کا سودا کیا جائے۔ دونوں صورتوں میں موت کا فیصلہ مشکوک تھا۔ جگر ہمیں بری بھی کر سکتا تھا اور ہم منزل کی راہ میں محفوظ سفر بھی کر سکتے تھے۔ جب خطرہ دونوں طرف یکساں تھا تو پھر ہم بحیثیت قیدی اپنی قسمت کے فیصلے کا انتظار کیوں کرتے، چنانچہ مجھ کو بھی ہم باغات کے علاقے میں داخل ہوئے، میں نے اپنے فیصلے کو زبان دے دی۔ سامنے دورا تھے... ایک راستہ دراز خان کی قلعہ نما حویلی کو جاتا تھا اور دوسرا ہماری ہماری منزل کی طرف جا رہا تھا۔

”سنو، دراز خان!“ میں نے گھوڑا اس کے ساتھ لگاتے ہوئے سرد آواز میں کہا۔ ”اگر تم دوستانہ انداز برقرار رکھتے تو ہمارا رویہ بھی چارحان نہ ہوتا لیکن تم نے دوستی اپنی روایات پر قربان کر دی ہے۔ لہذا ہم اپنی آزادی اور بقا کا حق استعمال کریں گے۔ ہم مجرم نہیں ہیں مگر تم نے ہمارا مقدمہ جبرگے کے حوالے کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ اس سے قبل کہ ہم بے بسی کی موت مارے جائیں ہم تمہارے فیصلے کو اپنے ساتھ لے جانا چاہتے ہیں ہماری منزل پشاور ہے لیکن تمہیں زیادہ دور نہیں لے جائیں گے... ساتھیوں کو پرسکون رہنے کی ہدایت کرو اور خاموشی سے تعاون کرو۔“

”میری ہدایت نہیں مانی جائے گی، بابر خان! دراز خان بولا۔...“
”ان لوگوں میں منافق بھی شامل ہیں جو دیرپہ میرے مخالف ہیں۔ وہ اس واقعے کو اپنی ناک کا مسئلہ بنا کر، ایسی صورت پیدا کریں گے جس سے ہم تینوں کی زندگیاں خطرے میں پڑ جائیں گی۔ تمہارے نام پر چلنے والی کوئی گولی بھی مجھے چاٹ سکتی ہے۔ میری بات سمجھنے کی کوشش کرو۔ جگر، انصاف کرنے والے بزرگوں پر مشتمل ہے۔ یقین کرو... اگر یونس خان کی گواہی میں سقم ہوا تو تمہیں باعزت بری کر دیا جائے گا۔“
”یونس خان! میرا بھائی نہیں ہے۔“ میں نے بتایا۔ ”وہ بھی

”نہیں...“ میں نے جواب دیا، بلکہ ایک ذلیل دوست ہے۔ اس نے میری لپا پر ایک طرف دراز خان کو، کیا یا ادھر ادھر کر جتار خان کو بھی بتا دیا کہ دراز خان حملہ کرنے آ رہا ہے۔“

”ہم اسے دراز خان کی خدمت میں پیش کر کے اپنی وفاداری اور منزل کی راہداری حاصل کریں گے، چیف!“

”سنو، ہارون!“ میں نے سیر سے کہا۔ ”ادھر میں تمہارا چیف نہیں ہوں۔ ہم بھائی ہیں اور اس ناتے میں تمہارا چھوٹا بھائی ہوں۔ یہ سرکاری زبان ادھر جا کر بولنا۔“

”شکر یہ، خرم!“ ہارون بولا اور جھک کر یونس کو اٹھانے لگا۔ دراز خان کو یقیناً ہمارے بارے میں بتا دیا گیا تھا۔ وہ چند آدمیوں کے ساتھ آمادہ کھائی دیا۔ میں نے دس قدم بڑھ کر اس کا استقبال کیا۔ وہ صرف میرے شانے پر پھینکی دے کر میرے ساتھ چل پڑا تھا۔ اس کی خاموشی سے میرا ماتھا ٹھنکا۔

”میں نے اس غدار کو پہچان لیا ہے، بابر خان! دخت کے نیچے کھڑے ہارون کو دیکھ کر، دراز خان سرد آواز میں بولا۔ ”غدار کی وجہ تم بتاؤ گے، بابر خان!“

”غدار بتاؤں گا، محترم خان!“ میں نے ٹھہری ہوئی آواز میں جواب دیا تو دراز خان ایک دم پلٹ کر میری جانب دیکھنے لگا۔

”ہاں، خان!“
”تو تمہیں معلوم تھا؟“ وہ دھڑک کر بولا۔

”نہیں، معلوم نہ تھا لیکن اب معلوم ہے۔“ میں نے بتایا۔
”جس طرح آپ کو اب معلوم ہوا ہے۔“

”وہ تنگ انسانیت کہاں ہے؟“
”چلیے، خان!“ میں نے کہا۔ ”وہ آپ کے قدموں میں ڈال دیا جائے گا۔“

دراز خان، ہارون کے سامنے جا کر زکا اور پھر اس کے حلق سے عجیب سی آواز نکلی۔

”ہارون! اس شخص کو خان کے قدموں میں رکھ دو۔“ میں نے ڈرامائی لہجے میں کہا اور ہارون نے جھک کر یونس کو دراز خان کے قدموں میں ڈال دیا۔ کاش، مجھے پہلے معلوم ہوتا کہ یونس خان، آپ کے دشمن کا جاسوس ہے۔ اس نے مجھے بھی دھوکا دیا ہے، خان... کیا میں اصل وجہ یہاں بتاؤں، خان؟“

”نہیں...“ دراز خان بولا۔ ”ہم یونس خان کو جبرگے کے سامنے پیش کریں گے۔ اس نے پلٹ کر ایک آدمی کو اشارہ کیا اور اس نے بڑھ کر یونس کو اٹھا لیا۔ ”معاف کرنا، بابر خان! جبرگے کے فیصلے

تک تم بھی زیر حراست رہو گے۔ جانتے ہو، ہم اپنے ساتھ دس لاشیں لائے ہیں۔ دس وفادار ہم سے چھن گئے ہیں۔“

”جنگ کا فیصلہ دیکھا جاتا ہے، محترم خان! لاشیں نہیں گنی جاتیں۔ تاریخ میں فیصلے درج ہوتے ہیں۔“ خان نے میری بات پر گہری سانس لی اور بڑھ کر ہارون سے رائفل لے لی۔

”یہ ہارون ہے، خان!“ اسی نے مجھے یونس خان کا اصل چہرہ دکھایا ہے۔ ”میں نے ہارون کا تعارف کراتے ہوئے کہا۔ ”یہ سازش جتار خان کے بیٹے نے تیار کی تھی۔“

”میرے پاس ناقابل تردید شہادت ہے، بابر خان! دراز خان نے پلٹ کر دیکھا پھر اس نے پشتوں میں دلبر خان کا نام لے کر کسی کو اشارہ کیا۔ ”اگر یہ بات سچ ثابت ہوئی تو مجھے براؤکھ ہوگا۔“

”کیسی شہادت، دراز خان؟“

”تم بھی اس سازش میں شریک ہو۔“ دراز خان نے بتایا۔ ”مجھے ایک ہمدرد نے دلبر اور یونس خان کے بارے میں اس وقت اطلاع دی جب میں بازار میں داخل ہوا، تب ہی میں نے وہ فیصلہ کیا جو عام حالت میں کبھی نہ کرتا۔ میں نے آگ لگا کر ان لوگوں کی توجہ تین محاذوں پر بانٹ دی ورنہ تم لوگ ضرور کامیاب ہو جاتے۔“

دو آدمی دلبر خان کو گھسیٹتے ہوئے لائے، اس کا چہرہ اڑھلن تھا اور پگڑی اس کے گلے میں بندھی ہوئی تھی۔ دراز خان نے اس کی ٹھوٹی کے نیچے ہلکی سی ضرب لگائی۔ اس نے چہرہ اٹھا کر میری جانب دیکھا۔

”نہیں، بابر خان!“ میں یونہی اس کی طرف بڑھا، دراز خان نے میرے سینے پر اٹھا ہاتھ مارا۔ ”یہ میری پناہ میں ہے، تمہیں جو کچھ کہنا ہے، اس کا موقع دیا جائے گا۔ ہم لوگ انصاف کے تحت اسے پوندے کرنے والے ہیں۔“

میں خون کا گھونٹ پی کر پیچھے ہٹ گیا۔ اگر کوئی دوسرا موقع ہوتا اور مجھے یوں سرعام، دراز خان ضرب لگاتا تو میں اس کی گردن توڑ دیتا لیکن حالات میرے حق میں نہ تھے۔ میں اگر کوئی حماقت کر بیٹھتا تو وہ لوگ وہیں انصاف کا تقاضا، گولیوں کی زبان سے پورا کر دیتے۔

”ٹھیک ہے، دراز خان! میں انصاف کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کروں گا۔“ میں نے ہارون کو پرسکون رہنے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”اب پگڑی میرے گلے میں ڈال کر اپنی روایت پوری کرو۔“
دراز خان کے اشارے پر چادر آدمی آگے بڑھے۔ انھوں نے اپنی پگڑیوں سے واقعی میرے اور ہارون کے ہاتھ

ایک منافق اور کینہ پرورش ہے۔ وہ اپنی گردن کے ساتھ میری گردن بھی پھنسی دیکھنا پسند کرے گا۔ اس کی جھوٹی گواہی مان لی جائے گی۔
"پھر خاموشی سے نکل چلو۔ میں خود نہیں کروں گا اور تعاون بھی دوں گا۔" درازخان نے غیر مشروط پیش کش کر دی۔

ہارون نے گھوڑا لوٹ لیا اور دس قدم جاتے آخری گھڑسوار نے اچانک پلٹ کر دیکھا اور پھر دس بارہ گھوڑے چشم زدن میں واپس مڑے اور ہمارا گھبراہٹ کر لیا گیا۔ ہارون نے غالباً کوئی دھمکی دی ہوگی جس کا خاطر خواہ اور فردی اثر ہوا اور وہ لوگ اسی تیزی سے بکھرتے ہوئے دور چلے گئے۔ ہارون نے گھوڑے کو ایڑ لگائی مگر گھوڑا شاید ذیل بوجھ سے اکتایا ہوا تھا، ایک دم اچھلا اور دونوں نیچے گر پڑے۔ میں نے گھوڑے کو چکارا اور فرار ہوتے گھوڑے کو وال سے بچ کر روک لیا لیکن بساط الٹ چکی تھی، ہم بازی ہار گئے تھے۔ جب تک ہارون سنبھلتا، درازخان قلابازی اور کردو لوں سے درختوں میں غائب ہو گیا تھا۔ بگڑتی سچویشن ہارون نے بھی محسوس کرتی تھی۔ وہ اٹھا اور کوکر گھوڑے پر سوار ہو گیا۔

اس سے قبل کہ بکھرتے ہوئے لوگ پلٹ کر دیکھتے یا صورت حال سمجھتے، میں نے گھوڑا کچے راستے پر ڈال دیا اور ہارون نے بھی تقلید کی تھی۔ اگرچہ چاندنی رات ہوتی تو اندھا دھند شروع ہونے والی فائربنگ زکاوٹ بن جاتی۔ گولیوں کا رخ ہماری جانب ہی تھا لیکن وہ لوگ بغیر ہدف کے گولیاں ضائع کر رہے تھے۔

"اور تیز خرم،" ہارون میرے گھوڑے سے رگڑکھا تاہوا آگے نکل کر چنچا۔ "وہ تعاقب میں آ رہے ہیں۔"

"ہائیں ہونا شروع کرو۔" میں نے گھوڑے کو ایڑیوں کی ضرب لگاتے ہوئے کہا اور گھوڑے کو بائیں جانب اشارہ دیا۔ ناہوار زمین کی وجہ سے گھوڑوں کی رفتار میں کمی آئی تھی۔ جب ہم فرلانگ بھر بائیں سمت گئے تو میری سماعت سے گھوڑوں کے ٹاپوں کی آواز نکرائی۔ وہ لوگ سیدھے راستے پر جا رہے تھے۔

آدھا چاند جب مشرقی افق سے نمودار ہوا تو میں نے گرد و نواح کا جائزہ لیا۔ ہم ویرانے میں سفر کر رہے تھے، گھوڑے پلپتے ہوئے چل رہے تھے۔ دور دور تک آبادی کے آثار نہ تھے صرف جنگلی چوپایوں کی آواز سکوت کو توڑ رہی تھی۔

"ہارون..." میں نے مغربی پٹی پر چھلکاتی روشنیوں کو دیکھتے ہوئے پوچھا، "کیا ہمیں آبادی کی طرف جانا چاہیے؟"
"اگر وہ آبادی آزاد علاقے میں ہے تو میں مشورہ نہیں دوں گا۔ ہم کسی نئی آدائش سے دوچار ہو سکتے ہیں۔"
"پھر کیا کیا جائے،" براورہ میں تو راستہ سمجھ چکا ہوں۔ میں نے

کہا: "نہ جانے ہم اپنے اصل راستے سے کتنی دور نکل آئے ہیں۔ اگر انھوں نے یونس سے منزل معلوم کر لی تو وہ راستہ بھی موت کی کھائی ثابت ہوگا۔"

رابطے کی کوئی صورت نہیں؟
"کوشش کر دیکھتا ہوں۔" میں نے ٹرانسمیٹر نکال کر آن کیا اور پولیٹیکل ایجنٹ کو کال کرنے لگا۔ لیکن وہ کوشش برباد اور نہ ہوئی۔ رات کے پچھلے پہر کوئی بیمار یا ہم جیسا مصیبت زدہ ہی بیدار ہو سکتا تھا۔ وہ علاقے کا بادشاہ تھا، میری آواز کیسے سنلے۔ لیکن اور دوسرے ہمدرد لوگ تشارٹ ریج ٹرانسمیٹر کے رابطے سے بہت دور تھے۔ بس اللہ ہی کا سہارا لے لیا تھا۔

فجر کی نماز، ہم نے ایک جوہر کے کنارے ادا کی۔ کچھ میں بکریوں اور دوسرے بڑے جانوروں کے نقش پاشتبختے جن سے کسی آبادی کا پتا چلتا تھا۔ سامنے قدر آدم خاوار جھالوں کا جنگ تھا۔ میں جب دُعا سے فارغ ہوا تو میری نظر دور، لومڑیوں کے ایک غول پر جا پڑی جو یقیناً حصول خوراک کی خاطر جنگل سے باہر نکلی ہوئی گی۔ ہمارے گھوڑے گنویتیاں پھڑکاتے لگے تھے۔

"ذرا ہچانو، خرم سلطان،" ہارون بولا: "کہیں یہ جنگلی کتے نہ ہوں؟"

"میرا خیال ہے، یہ لومڑیاں ہیں۔" میں نے جواب دیا۔
"نہیں، میرے بھائی،" ہارون ٹوٹ پھٹتے ہوئے بولا: "اس خونخوار مخلوق کا شکار ہو چکا ہوں۔ یہ ہماری بوا کر آئے ہیں۔ شاید آپ کو معلوم ہو، لومڑیاں غول کی شکل میں باہر نہیں نکلتیں۔ دیکھیں، یہ ہمیں دھوکا دے کر گھیرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔"

"اگر تمھارا اماندہ درست بھی ہوا تو گھبرانے کی ضرورت نہیں۔ کتے ہیں، کوئی بھیڑیے یا شیر تو نہیں۔"

"اوہ۔" ہارون اچھل کر اٹھا۔ "یہی تو آپ کو غلط فہمی ہے۔ جنگلی کتے ان درندوں سے کہیں زیادہ خطرناک ہوتے ہیں۔ اپنے شکار کا پیچھا اس وقت تک نہیں چھوڑتے، جب تک خود نہ مر جائیں یا شکار کو بے بس نہ کر دیں۔ میلوں دور تک نوچتے کھسکتے، پیچھا کرتے چلے جاتے ہیں۔"

پھر میں اس وقت چونکا، جب کتے جنگل میں داخل ہونے کی بجائے تیزی بڑھنے لگے۔ ایک ٹولی چوکریاں بھرتی ہوئی آگے نکل گئی اور باقی ماندہ رک کر ہماری جانب دیکھنے لگے۔ فاصلہ بیشکل پانچ چھ سو گز ہوا مگر صبح کے دھندلے کی وجہ سے صاف دکھائی نہ دے رہے تھے۔

"میگزین چیک کر لیں۔" ہارون گھوڑوں کی طرف بڑھتے ہوئے بولا: "یقیناً آپ مجھ سے بہتر شوٹر ہیں۔ اگر کتوں نے تعاقب کیا تو

آپ بے دریغ گولیاں نہ چلائیں! بس ایک ایک گولی کیونکہ ہمیں بہت دور تک انھیں روکنا ہوگا۔"

اگر کتے راستہ نہ روکتے تو میرا ارادہ جنگل کو کراس کرنے کا تھا لیکن کتوں نے ارادے کا رخ بدل دیا تھا۔ ہارون نے گھوڑا اترائی میں ڈالا تو ایک کتا بھونکا... پھر تو جیسے قیامت کا خود ہمارے تعاقب میں دوڑنے لگا۔ میں نے اترائی اترنے سے قبل پلٹ کر دیکھا تو میرے روٹے کھڑے ہو گئے۔ دونوں ٹولیاں چمکتی چلتی، گود کا طوفان لیے بڑھتی چلی آرہی تھیں۔ خطرے کا احساس گھوڑوں کو ایڑیاں لگا رہا تھا۔ گھوڑے رات بھر کی تھکن اور نااضگی کو فراموش کر کے اُٹھنے لگے تھے۔ ہارون کا گھوڑا اعلیٰ نس کا تھا یا ڈیو لوک تھا، خاصا فاصلہ لے گیا تھا۔

میں نے راتفل کی نال بغل سے گزار کر ٹرانسمیٹر ڈال دیا... ایک کتا دور سے دوڑتے قلابازی میں گیا اور دوسرے اُسے پھلانگتے بڑھتے چلے آ رہے تھے۔ مقابلہ چار ٹانگوں ہی کا تھا لیکن کتے گھوڑوں سے تیز ثابت ہوئے تھے۔ لحظہ بہ لحظہ فاصلہ گھٹ رہا تھا۔ حتیٰ کہ کتے چند گز کا فاصلہ رکے وائیں بائیں پہنچ گئے۔

"فائر کرو،" ہارون چنچا۔ "دو نہ گھوڑے کا پیٹ پھاڑ دیں گے۔" اس سے قبل کہ میں دائیں بائیں کا فیصلہ کرتا، دو کتے دائیں طرف سے پھانک جھپٹے۔ ایک نے گھوڑے کی اگلی ٹانگ پر دوسرے نے پیٹ پر رنڈ مارا تھا۔ گھوڑا بدک کر ایک دم بائیں جانب ہوتا ہوا اچھلی ٹانگوں پر کھڑا ہو گیا تھا۔ ہارون گھوڑے کو یوٹرن میں گھماتا ہوا میرے قریب آکر چنچا اور میرے ہاتھ سے راتفل جھپٹ کر پھر دور ہوتا چلا گیا۔

اُس نے میں قدم جا کر پھر ٹرن لیا اور فائربنگ شروع کر دی۔ ہر گھوڑا چکر میں ایسے ناچ رہا تھا جیسے شہد کی مکھنوں کے نرغے میں آیا ہوا انسان ناچ کر دیر ہو۔ میری تمام تر توجہ خود کو سنبھالنے پر مرکوز ہو رہی تھی، کیونکہ گھوڑا بار بار دائیں بائیں کود رہا تھا۔ ہارون فائربنگ کے ساتھ چیخ چیخ کر کچھ کہہ رہا تھا لیکن میری قوت سماعت قوت مدافعت میں شامل ہو گئی تھی۔

معاذ گھوڑا اگر ب ناک آواز میں مہنہ بٹا رہا تھا پھر سر کے بل گرتا چلا گیا، میں قلابازی کھاتا ہوا گردن سے پھسٹا پھرتی زمین پر جا کر زمین پر دونوں ہاتھ لگے اور میں فٹ بال کی مانند اوپر اٹھتا چلا گیا۔ ذرا سی غفلت کا نتیجہ نکلتا، اُس کا مجھے احساس تھا۔ ایک کتا اُٹھا ہوا مجھ پر چھپتا۔ میں نے ہاتھوں پر روک کر اُسے پرے اچھال دیا۔ اسی وقت ہارون نے گولی چلائی۔ کتا رولنگ کرتا ہوا اُٹھنے لگا۔ تب میری نگاہ خوں آنود لاشوں پر پڑی، کتوں کی لاشوں کے درمیان میرے گھوڑے کی متحرک لاش تھی جس کی آنکھیں...

بھری ہوئی تھیں۔ دوسرا منظر بھی خوش گوار نہ تھا۔ چند کتے ہارون کے گھوڑے کو نوچتے جا رہے تھے۔ گھوڑا فضا میں دو تیلیاں جھبڑاتا جنگل کی جانب سرپٹ دوڑتا جا رہا تھا۔

"خطرہ ہم سے گھوڑے چھین لے گیا ہے۔" ہارون نے میرے قریب آکر کہا: "وہ دیکھیے، اُس گھوڑے کو بھی گرا لیا گیا ہے۔"

"خدا کی پناہ۔" میری زبان سے جھرجھرائی آواز نکلی۔ یہ بچو کے غصہ پر تھے۔ چلو، دوست! اب تو میرا حوصلہ بھی جواب دے گیا ہے۔ "خطرہ مصروف ہو گیا ہے، خرم،" ہارون بولا۔ "اب گھوڑے کا گوشت چھوڑ کر وہ ہمارا تعاقب نہیں کریں گے۔" اُس نے میگزین نکال لی۔ "اوہ، میرے خدا! صرف ایک گولی بے میگزین میں۔"

"اللہ ہی بہتر مدد کرنے والا ہے، میرے بھائی! میں نے گہنسیاں مہلاتے ہوئے ٹھہری آواز میں کہا: "اگر بوقت فرار یہ راتفل بھی ہمارے ساتھ نہ ہوتی تو ہم خالی ہاتھ کیا کرتے؟"

ہارون نے جھرجھراتے ہوئے، کتوں اور گھوڑے کی لاش کی جانب دیکھا اور پھر آسمان کی طرف چہرہ اٹھا کر بھکی سی ہنسی کے ساتھ بولا: "اب اُسی کے سہارے چلنا ہوگا۔ ویسے آپ نے جذباتی فیصلہ کیا ہے۔ اگر آپ بی۔ اے کی وساطت سے میری رہائی کی کوشش کرتے تو خون خرابہ نہ ہوتا اور نہ ہی ہم بے بسی کا شکار ہوتے۔"

"مجھے یقین ہی میں معلوم ہو گیا تھا کہ اپنے مرنے کے بغیر بہشت نہیں ملتی۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا: "ویسے اگر میں تمھاری جگہ ہوتا تو تم کیا کرتے، ہارون؟"

"یقیناً وہی کچھ، جو آپ نے کیا ہے۔" ہارون بھی مسکراتے لگا۔ "چلیے جو ہوگا، دیکھا جائے گا۔"

دو گھنٹے ہم مسلسل چلتے رہے تھے، تب پہلی آبادی دکھائی دی۔ چالیس پچاس کتے گھرنڈوں کی بستی تھی جو چھوٹی چھوٹی سرسبز پہاڑیوں سے چاروں اطراف سے گھری ہوئی تھی گائیں وادی میں اور بھیڑ بکریاں پہاڑوں پر چرتی دکھائی دے رہی تھیں۔ ہم جس راستے پر چل رہے تھے، اس پر گاڑیوں کی آمدورفت کے واضح آثار تھے۔ چونکہ ہم نے سرکاری بند جیپ پر سفر کیا تھا، اس لیے ہارون کے پوچھنے پر توجہ سے نہ بتا سکا تھا کہ ہم اُسی راستے پر ہیں جو ہمیں پولیٹیکل ایجنٹ تک لے جائے گا۔

ہم بستی سے دو تین فرلانگ باہر سے آگے نکلے تو مرٹرک کے کنارے ایک ٹرک کھڑا دکھائی دیا۔ ٹرک پر خشک گھاس لوڈ تھی اور ڈرائیور آئین پر جھکا ہوا تھا۔

"ہٹ کے بارے میں کیا خیال ہے، ہارون؟" میں نے

معنی خیر انداز میں پوچھا۔

"نیک خیال ہے۔ ہارون بولا۔ لیکن پہلے نیک دامت پائیں گے۔ وہ تیرے قدم اٹھا، ڈرائیور کے عقب میں جاڑ کا۔ ڈرائیور نے سلام کا جواب دیکھے بغیر ہی دیا تھا۔ تب ہارون بھی انجن پر جھک گیا۔

ہارون نے بتایا۔ ٹرک اٹلک ہے، جبکہ ڈرائیور، میٹری کی لیسڈ صاف کر رہا ہے پھر وہ دونوں بحث و تکرار کرنے لگے۔ غالباً ڈرائیور اپنی نااہلی تسلیم کرنے پر تیار نہ تھا۔ ہارون کا انداز نرم اور دوستانہ تھا وہ ڈرائیور سے بگاڑنا نہیں چاہتا ہوگا۔ بخوشی دیر بعد ڈرائیور لا تعلق سا ہو کر نسوار چھانکنے لگا اور ہارون نے اپنی مہارت سے کام لے کر نقص دور کیا اور ڈرائیورنگ سیٹ پر بیٹھ کر انجن اسٹارٹ کر دیا۔ ڈرائیور کی آنکھیں حیرت اور خوشی سے مسکرانے لگیں۔ میں نے دل میں خوشی کا نعرہ لگایا۔ ہارون نے کامیابی حاصل کر لی تھی۔ ٹرک دس پندرہ گز چلا کر ہارون اتر آیا تھا۔ میں صرف گونگے کی طرح دونوں کو دیکھ کر مسکرانے لگا۔ کرخت روڈ ڈرائیور کا چہرہ بھی مائل بہ مسکراہٹ تھا... وہ مسکراتا ہوا جب ڈرائیورنگ سیٹ پر بیٹھا تو ہارون نے مجھے اشارہ کیا۔ ہم دونوں سیکنڈ سیٹ پر بیٹھ گئے۔ ہارون جیسے میرا واقف ہی نہ رہا تھا۔ وہ ڈرائیور سے ہنس ہنس کر باتیں کرتا رہا تھا میرے اونگھتے ذہن کو اچانک ہی جھٹکا لگا۔ میں نے ہارون کو کہنی ماری... سلسلے سینتالیس ڈگری پر جھکا ہوا بورڈ، میری حیرت زدہ نگاہوں کا ہدف تھا۔ ٹرک کی بیس فٹ کی مسافت پر وہ بورڈ تھا میں نے تیر کی سمت جھانک کر دیکھا۔ دائیں ہاتھ دو فرلانگ دور ہمساری منزل بائیں پھیلائے کھڑی تھی۔ میں نے دل ہی دل میں قدرت کی مدد اور رہنمائی کا شکریہ ادا کیا۔ اگر جنگلی کتے ہمارے راستے میں نہ ڈالے جاتے تو ہم اصل منزل سے بہت دور جھٹک جاتے۔

ہارون نے بھی بورڈ دیکھ لیا تھا، اس لیے مجھے بولنے کی ضرورت نہ پیش آئی تھی۔ اس کی درخواست پر ڈرائیور نے بورڈ کے قریب ٹرک روک دیا تھا۔ اتنی خوشی شاید اس شخص کو بھی نہ ہوئی ہوگی جس نے اتفاقاً امریکہ کی سر زمین پر پاؤں رکھا تھا۔ میرے اندر اپنی کامیابی اور منزل کی خوشی ہنس مارنے لگی۔ میری گردن فخر سے تن گئی تھی۔ میں نے درندوں کی گھجھار میں گھس کر ہارون کو حاصل کر لیا تھا۔ فخر کی وجہ وہ معلومات تھیں جن کا تعلق علاقہ غیر سے تھا کہ یہ لوگ یرغمالی کو لاکھوں روپے کے عوض بھی بڑی کوششوں اور سفارشوں کے بعد رہا کرتے ہیں۔ جبکہ میں ان کی بہت سی جانیں اور کروڑوں کا مال ضائع کر کے ہارون کو نکال لایا تھا۔

میں یہ نہیں کہتا کہ خوشی، بالکل ہی عارضی اور ناپائدار جذبے کا

نام ہے۔ میں نے ہلال حرام کی طرح خوشی بھی کئی لوگوں کے چہروں پر سدا بہار دیکھی ہے مگر نصیب اپنا اپنا ہوتا ہے۔ کسی کی جیب میں حرام کا ایک روپیہ چلا جائے تو دس ساٹھ لے کر نکل جاتا ہے۔ میرے نصیب کی جیب بھی ایسی ہی حساس رہی ہے۔ حرام کی کمائی گھر میں داخل کی تو جوبلی کے در و دیوار بھر گئی آگ میں گھر گئے، زینت تپ کر انگارہ بن گئی، پیارا بھائی راکھ ہو گیا۔ مال دکھ کی آگ میں جلنے لگی اور میری ذات چور ہے کا پتھر بن گئی۔

میں گردن اکڑائے خوشی کے چراغ آنکھوں میں روشن کر کے جوبلی بی۔ اے کے بنگلے میں داخل ہوا، ساری اکڑوں جھاگ کی طرح بجتی چلی گئی اور خوشی کے چہرے پر طمانچہ لگا تھا۔ برآمدے میں دراز خان اور یونس بیٹھے ہوئے تھے۔ اگر حبيب کپا ڈنڈے کے اندر نہ ہوتی تو شاید میں خوشیوں کے قدموں کا رخ بدل لیتا مگر وہ لوگ جیب اندر لے آئے تھے۔ فاصلہ دس قدم تھا اور دراز خان نے مجھے دیکھتے ہی رانفل بھی تان لی تھی۔ اگر وہ پرسکون بھی رہتا تو میں چوروں کی طرح اٹے پاؤں نہ بھاگتا۔ میں نے گھبراہٹ کو مسکراہٹ میں چھپاتے ہوئے نہ صرف سلام کیا بلکہ دراز خان کی طرف ہاتھ بھی بڑھایا تھا۔ وہ میری جرات پر ششدر سا ہو کر متذبذب ہو گیا تھا۔

"کوئی بات نہیں دوست!" میں نے ہنس کر کہا۔ حساب دوستاں اسی طرح ہوا کرتا ہے۔ "اُس نے ہاتھ نہیں اٹھایا تھا لیکن میرا ہاتھ اوجھک کر اُس کے ہاتھ تک چلا گیا تھا۔ میں نے تین سیڑھیاں چڑھتے ہوئے گرد و پیش کا جائزہ لے لیا تھا۔ دراز خان کے ساتھ صرف یونس ہی تھا جو نہ صرف نہ ہتا تھا بلکہ مار کھائے ہوئے کتے کی مانند سکڑا سہا ہوا بھی تھا۔

میں نے دائیں ہاتھ سے دراز خان کا ہاتھ دبا یا اور بائیں سے نہایت ہی آرام سے رانفل نکال کر خود کو فاصلے پر کر لیا تھا۔ "نہیں، مستر خرم سلطان! پی۔ اے صاحب بددلتے ہوئے بولے۔ ہم بات چیت کے ذریعے معاملہ طے کر لیں گے۔"

"جی ہاں، جناب!" میں نے رانفل، ہارون کی طرف اچھال دی۔ بات چیت کی راہ ہموار کرنے کے لیے میں نے اپنے دوست کو زحمت دی ہے۔ میں نے خالی کرسی کو پاؤں سے ٹھوکر مار کر ہارون کو بیٹھنے کا اشارہ کیا اور خود کرسی کھسکا تا ہوا دور لے گیا۔

"میری رانفل میرے حوالے کر دو، خرم سلطان!" دراز خان نے سرد آواز میں کہا۔

"ہارون..." میں نے چہرہ گھما کر ہارون کو اشارہ کیا۔ رانفل محترم خان کو پیش کر دو۔"

ہارون نے ایک دم میگزین الگ کی اور رانفل دراز خان کے حوالے کر دی۔ اور کوئی حکم، خان؟

"تم خود کو میرے حوالے کر دو، خرم سلطان!" دراز خان نے جیکٹ کی جیب سے ریلو اور نکال کر تان لیا۔ قبیلہ مجھ سے ان دس جانوں کا حساب طلب کر رہا ہے جو تمہاری وجہ سے ضائع ہوئی ہیں۔ تم نے اپنے مقاصد کے لیے میرے قبیلے کو استعمال کیا ہے۔ میرے مخالفین نے جبر کے کو سب کچھ بتا دیا ہے اور یونس خان نے اعتراف کر لیا ہے کہ تم ہی اے ایسا کرنے پر مجبور کیا تھا میں اپنی اور اپنے خاندان کی سلامتی کے لیے تمہیں قبیلے کے حوالے کرنا چاہتا ہوں۔"

"ہمارے درمیان ایک ایسا ذمے دار شخص موجود ہے جو ہمارا نمائندہ ہے۔ تمہیں اپنا مطالبہ بالواسطہ پیش کرنا ہوگا۔"

"میرا مطالبہ پہلے ہی تسلیم کیا جا چکا ہے۔ دراز خان بولا۔ صرف تمہارا انتظار تھا۔"

"ہاں، خرم سلطان! پی۔ اے صاحب نگاہیں پھرتے ہوئے بولے۔ یہاں کا قانون یہی ہے۔ اگر دراز خان کا بیان درست ہے تو تم مجرم ہو اور مجرم کی پشت پناہی میں نہیں کر سکتا... دوسری بھی ایک مجبوری ہے ان دنوں میرا دس سالہ بیٹا چھٹیاں گزارنے آیا ہوا ہے۔ جو اندر دراز خان کے ایک آدمی کی حراست میں ہے۔ میں بحیثیت پی۔ اے اور باپ مجبور ہوں۔ تمہیں ان کے ساتھ جانا ہوگا۔"

"اگر یہ آپ کا فیصلہ ہے تو میں اعتراض کی پوزیشن میں نہیں رہا، جناب! میں نے ایک ایک لفظ جیا کر کہا۔ لیکن ایک شرط دراز خان کو بھی تسلیم کرنا پڑے گی۔ میں نے جس مقصد کے لیے دراز خان کو دھوکا دیا ہے، اُسے ضائع نہیں ہونے دیا جائے گا۔ میرا مطلب مسٹر ہارون کی سلامتی سے ہے۔"

"مجھے ہارون سے کوئی غرض نہیں۔ دراز خان بولا۔ میں صرف تمہیں لے جاؤں گا۔"

"شکریہ خان! تمہاری اجازت کے ساتھ میں ہارون کو یہاں سے روانہ کر دوں گا۔"

"نہیں، خرم! ہارون بول پڑا۔ میں بے حد تھکا ہوا ہوں۔ آپ جائیں، میں کچھ دیر آرام کر کے جاؤں گا۔"

"تمہاری مرضی۔ میں نے کندھے اچکاتے ہوئے کہا۔ "سر... آپ ہارون کو اندر لے جائیں۔"

"بہتر... پی۔ اے اٹھتے ہوئے بولے۔ دراز خان اکیا تھکے آؤں کو اب باہر بھیج دوں۔"

"ہاں..." دراز خان بولا۔ اب ہم روانہ ہو جائیں گے۔"

مجھے اس سادہ لوح نوجوان پر دم آنے لگا تھا جو قریب اور چالبازی کو سمجھنے سے قاصر تھا۔ اُسی شخص پر وہ پھر بھروسہ کر رہا تھا جس نے ایک بار اُسے دھوکا دیا۔ اگر میری دنیا کا کوئی بدحواس قسم کا بھی شخص ہوتا تو وہ ہارون کو اندر جانے کی اجازت نہ دیتا۔

"میں نے تمہیں بہت بڑا مقام دینے کا فیصلہ کیا تھا، خرم سلطان!" دراز خان شاکل بچے میں بولا۔ "تیریں کو بھی تمہارا اصل چہرہ دیکھ کر بہت دکھ ہوا ہے۔ کاش اتم صرف باہر خان ہی ہوتے۔"

"کیا نام بدلنے سے انسان بھی بدل جاتا ہے؟ خان؟"

"ہاں..." دراز خان نے اثبات میں گردن ہلائی۔ "جب جذبے اور سوچیں بدل جاتی ہیں تو سب کچھ بدل جاتا ہے۔ انسان اور انسان کے درمیان جتنے بھی تعلق اور ناتے ہوتے ہیں، سب جذبوں کی بنیاد پر کھڑے ہوتے ہیں۔"

"میرا خیال ہے کہ جب میں باہر خان تھا، تب بھی آپ بہن، بھائی کے لیے غصے تھا اور خرم سلطان ہوں تو بھی آپ کا دشمن نہیں ہوں اور اگر مجھے موقع دیا گیا تو میں ثابت کر دوں گا کہ نام بدلنے سے انسان نہیں بدلتے۔ تمہارا اصل دشمن، جبار خان کا بیٹا ہے جس نے یونس کو خرید رکھا ہے... ذرا سوچو، خان! مجھے تمہارے گھر کون لے گیا تھا اور کیوں لے گیا تھا؟ مجھے تو پی۔ اے صاحب کا تعاون حاصل تھا۔ میری منزل، کالونی تھی میرا ہدف جبار خان تھا۔ میں تو تمہیں جانتا تھا کہ نہ تھا۔ یہ یونس خان ہی تھا جس نے مجھے تمہارے متعارف کرایا اور پھر دونوں قبیلوں کی دیرینہ رقابتوں کا ذکر کیا اور مشورہ دیا کہ دراز خان کو ادھر لے چلنا کتنا سودمند ہوگا، اس نے مجھے بتایا تھا کہ ہارون کو لڑے بغیر جبار خان سے حاصل کرنا ناممکن ہو گا لیکن تم جانتے ہو کہ وہاں جا کر، میں نے تمہاری مدد کے بغیر ہارون کو حاصل کر لیا تھا۔"

"مُن رہے ہو، یونس خان؟ دراز خان نے خشکیں نگاہوں سے اُسے جھوڑتے ہوئے پوچھا۔

"ہاں، مُن رہا ہوں۔ یونس نے مجھے کھا جانے والی نظروں سے دیکھا۔ لیکن سچ صرف اتنا ہے کہ میں نے تمہیں حملے کے خطرے سے آگاہ کر دیا تھا۔ باقی جتنا کچھ ہوا ہے، وہ خرم سلطان کی ایماء پر ہی ہوا ہے۔ یہ شخص حکومت پاکستان کی طرف سے منشیات کے خلاف کام کر رہا ہے۔ یہ وہی خرم سلطان ہے جس نے جبار خان کی ٹیکسٹری تباہ کی تھی اور اس بار جبار خان کو ہلاک کر آیا ہے۔"

"یقیناً یہ بات اس کے حق میں جلنے لگی۔ دراز خان کی کرخت آواز میں سائنس کی مٹھاس گھل گئی۔ اس نے ہمارے دشمن کو ہلاک کیا ہے۔ میرا قبیلہ بھی منشیات کے ناپاک بزنس کو پسند نہیں کرتا۔ میں

بڑوں سے سفارش کروں گا۔
 "شکریہ دوست! میں نے غمون آواز میں کہا۔" اُس نے مجھے ہاتھ دھمکے لے چلو۔
 "یہ ضرورت باہر حل کر پوری کر لینا۔"
 "کچھ ضروریات انتظار نہیں کرتیں! درازخان! میں اُٹھ کھڑا ہوا تو درازخان اُلجھ گیا۔ کیونکہ اگر وہ مجھے کور کر کے لے جاتا تو یونس تنہا رہ جاتا۔ اُٹھو، یونس خان! تم بھی ساتھ چلو گے۔ اُس نے سیدھا سادا حل تلاش کرتے ہوئے کہا۔ یونس خان اُٹھا اور درازخان نے اُسے آگے جانے کا راستہ دے دیا۔ چونکہ مرکزی کور میں تھا، اس لیے درازخان کی تمام توجہ مجھ پر ہی مرکوز تھی۔ دو قدم گری سے دور ہو کر، اُس نے ریوالور کا رخ میری جانب پھیر لیا تھا۔ میرا اندازہ غلط ہو گیا تھا جو لحظہ میں اپنے مفاد کو دینا چاہتا تھا، وہ اُس نے نہیں دیا تھا۔
 "اے... نہیں، یونس!" میں ہاتھ اٹھا کر چیخا اور درازخان کی گردن غیر ارادی طور پر ابھڑھڑکی۔
 میں جانتا تھا کہ وہ صرف چند سیکنڈ ہی اُدھر دیکھے گا۔ مجھے جو کچھ بھی داؤ پر لگانا تھا، ان ہی چند سیکنڈ میں رسک لینا تھا۔ میں اُڑتا ہوا، دراز خان سے ٹکرایا اور اُسے گراتا ہوا، قلابازی میں آگے نکل گیا۔ میں نے ریوالور پر بھی ہاتھ ڈالنے کی اندھی کوشش کی تھی جو بس رگڑ کھاتی ناگہم رہی تھی۔ جب میں ہاتھوں اور پیروں کے بل فرش کو چھوتا ہوا پلٹا تو درازخان بھی غروب ہو کر طلوع ہونے کی کوشش میں تھا۔
 چونکہ وہ کروٹ کے بل گرا تھا، اس لیے ریوالور والا ہاتھ، اُس کے نیچے تھا۔ میں نے فلائنگ بالک کے لیے جم سکوا اور ابھی میرے پاؤں فرش سے چند انچ ہی اوپر اُٹھے تھے کہ میری سماعت سے دھماکا ٹکرایا لیکن میں کمان سے نکل جانے والا تیر تھا، اپنی مرضی سے ڈک بھی نہ سکتا تھا۔
 میرے دونوں پاؤں ہدف سے ٹکرائے، درازخان کسی جیسے کی طرح ڈکرایا تھا۔ میں فرش پر گر پڑا ہی پھر اُچھلا تب میں نے کرنٹک چیخ مٹی۔ یونس خان چیخا تھا اور درازخان چپ لیٹا ہاتھ پاؤں فرش پر مار رہا تھا، ریوالور گری کے نیچے پڑا ہوا تھا۔ میں نے ریوالور اٹھا کر باری باری دونوں کی طرف دیکھا۔ یونس خان سینے پر ہاتھ رکھے، دیوار سے لگا بانپ رہا تھا اور اُس کی آنکھوں کے جوڑوں سے خون اُبل رہا تھا۔ اُس کی آنکھوں میں دھواں حیرت تیر رہی تھی۔ اُس نے کچھ کہنے کے لیے جوں ہی منہ کھولا، سرخ تے اُچھل کر باہر آئی پھر وہ کھسکا ہوا دیوار کے ساتھ مُنڈ کے بل گر گیا تھا۔
 "درازخان! میں نے ایک گھنٹا موڈ کر فرش پر رکھتے ہوئے کہا۔"

"میں ان چند میزبان لمحات کے نام پر تجھیں معاف کر رہا ہوں۔ اگر تمہاری غیرت گوارہ کرے تو یہ بات شیریں کو بھی بتا دینا کہ جہان نے تم لوگوں کی مہربانی کا صلہ دیا ہے۔ اب جبکہ میں غالب ہوں تو بھی کہہ رہا ہوں کہ میں تم جیسے انسانوں کی دل سے عزت کرتا ہوں۔"
 اسی اتنا ہارون آنا دکھائی دیا۔ اُس کی جگہ پی۔ اے اور ایک سپاہی بچہ تھا۔ انھیں دیکھ کر میں نے یقین کر لیا تھا کہ ہارون بھی اپنے عہد سے کامیاب آیا ہے۔
 "ہارون! میں نے تھکے تھکے انداز میں کہا۔" اسے بھی اندر پہنچا دو۔
 "اے... پی۔ اے! یونس کی لاش دیکھ کر اچھل پڑا۔ تم نے اسے...
 "نہیں، سر! میں نے نفی میں سر ہلایا۔ یہ درازخان کی گولی کا حق دار تھا۔"
 "زبان... پی۔ اے کا لہجہ ایک دم بدل گیا۔ تم نے میرے لیے مشکلات ہی نہیں بلکہ مجھے خطرے کی دوا دی میں دیکھیں دیکھیں۔ یہ کوئی جذب ملک نہیں ہے۔ اب دوا ہی صورتیں ہیں، تم جرگے کا سامنا کرو یا وہ لوگ مجھے جواب دہی کے لیے گھسیٹ لے جائیں۔"
 "نہیں، محترم!" درازخان کرہتا ہوا بولا۔ "میں خرم سلطان کو معاف کر چکا ہوں۔ یہ بہادر دشمن ہے۔ اس نے مجھے معاف کر کے، خود کو برتر اور سچا تسلیم کر لیا ہے، مجھے بہکایا گیا تھا۔ میں اصل واقعہ اپنے بڑوں کو بتاؤں گا۔"
 "شکریہ، درازخان! مجھے تمہارے وعدے پر اعتماد ہے۔ پی۔ اے بولا۔ "میں تمھیں بتانا چاہتا ہوں کہ یہ دونوں نوجوان، بنی نوع انسان کی بھلائی کے لیے کام کر رہے ہیں۔ بحیثیت انسان، دنیا کا ہر انسان اس نوبل کا زین ان کے ہاتھ مضبوط کرنے کا پابند ہے۔ اگر ہارون عام شخص ہوتا تو میں یہاں کی روایات کو ضرور تہ نظر رکھتا لیکن یہ عام شخص نہیں ہے یہ لوگ بے حد قیمتی ہیں۔"
 "کیا عالم خان زندہ ہے؟" درازخان نے اُٹھتے ہوئے پوچھا۔
 "ہاں، اُسے صرف بے ہوش کر دیا گیا ہے۔ پی۔ اے نے جواب دیا۔ "تم دونوں ٹھیک ہونے تک میرے یہاں سہارا۔"
 "اے... درازخان ہنس پڑا۔ "میں تو ٹھیک ہوں خرم سلطان نے میری ہڈیوں کو بھی معاف رکھا ہے۔ میں نے دو قدم آگے بڑھ کر اپنی ہتھیلی پر ریوالور رکھا اور ہتھیلی اُس کے سامنے کر دی۔
 "تھینک یو، مائی فرینڈ!" اُس نے ریوالور پر کھلا ہاتھ رکھ کر کہا۔
 "آج کے اس واقعے کی یادگار کے طور پر اپنے پاس رکھ لو۔"
 "میں نے اُن کو نہیں کیا ہے، خان!"
 "مجھے معلوم ہے۔" وہ مسکراتے ہوئے بولا اور ٹکڑا ہوا گریسی

پر بیٹھ کر سینہ اور پسلیاں ہلانے لگا۔ گو وہ دروسہارنے کی کوشش کر رہا تھا لیکن درد اُس کے چہرے پر نمایاں تھا۔ درد کی شدت نے اُس کا گوارنگ بھی دھواں دھواں کر دیا تھا۔ اگر وہ فائر کر کے میری توجہ نہ ہٹاتا تو میں دوسری ضرب ہڈیاں کو کڑا آنے والی ہی لگاتا۔ اگر سینے کی ہڈیاں کوڑک جاتیں تو پی۔ اے کا رویہ دوسرا ہوتا اور مجھے اپنے ہی آدمی کے لیے کوئی ناخوش گوار فیصلہ کرنا پڑتا۔
 "جناب! آپ ہماری روانگی کا انتظام کریں۔ میں نے کہا۔
 "میں چیف منسٹر کو اپنی نازک پوزیشن سے آگاہ کر چکا ہوں۔ پی۔ اے نے بتایا۔ "دس پندرہ منٹ انتظار کرو۔ اگر کوئی کارروائی نہ ہوئی تو پھر میں اُدھر والوں کو کال کروں گا۔"
 میں منٹ بعد پہلی کاپڑ کی آواز سنائی دی۔ اُس وقت ہم خوش گوار داخل میں چائے پی رہے تھے۔ یونس کی لاش کا تقاضا ہم نے مان لیا تھا۔ درازخان لاش ساتھ لے جا کر اپنی پوزیشن بچانا چاہتا تھا۔ عالم خان کو خندے پانی کے جھینٹے مار کر قبل از وقت ہوش میں لایا گیا تھا۔ درازخان نے اسے کچھ بتا کر مطمئن کر دیا تھا۔ میری درخواست پر وہ لاش لے کر پہلی کاپڑ اترنے سے قبل ہی چلے گئے تھے۔ انھیں بھی آنے والوں سے خطرہ تھا، اس لیے جلدی جلدی چل پڑے تھے۔
 ابھی پنکھا ٹھہرا بھی نہ تھا کہ کیپٹن رضا کوڈ کر نیچے اُترا... اور میری طرف دوڑ آیا۔ دو قدم دور ڈک کر، اُس نے ایڑیاں جوڑ کر سیلوٹ کیا اور میرا ہاتھ ہاتھ تھا کہ جہاں باقی لہجے میں بولا۔ "کامیابی مبارک ہو۔ آپ کو دوبارہ دیکھ کر بے حد مسرت ہوئی ہے، مجھے ابھی خبر نہیں ملی تھی۔"
 "آپ لوگوں کی دعاؤں نے بری خبر کا رخ موڑ دیا ہے، آفسر!" میں نے اُس کا ہاتھ تھپ تھپایا۔ "ان سے ملے، میرے ساتھی ہارون! ہارون نے ہاتھ بڑھایا۔ "اے یہ ہیں، کیپٹن رضا۔"
 دونوں نے ہاتھ ملایا پھر وہ لوگ بھی قریب آکر کھڑے ہو گئے۔ وہ تین تھے، اُن کی یونیفارم ہی سے میں نے اُن کو پہچانا تھا۔ وہ گوریلا فوج کے شیروں جیسے نوجوان تھے۔
 فضا میں اُٹتے ہوئے کیپٹن رضلے بتایا کہ کسی ہنگامی کال پر بروقت کارروائی کے لیے پہلی کاپڑ پشاور میں ہی روک لیا گیا تھا۔ ہارون، گوریلا نوجوانوں کو اپنی حرب زبانی کے جوہر دکھا کر محفوظ کر دیا تھا۔
 "آپ کو ڈپوٹیکانڈر سے ملاقات کرنا ہوگی خرم صاحب! کیپٹن نے پہلی کاپڑ جھکاتے ہوئے کہا۔
 "میں فوجی ہوں، نہ فوجی ڈپوٹی پر تھا۔ میں نے سرد آواز میں جواب دیا۔ "میں بے جواز کسی سے ملنا پسند نہیں کرتا۔"

"کیا فوج، یونیفارم کا نام ہے، دوست؟"
 "لیکن میرا مشن فوجی مداخلت کو برداشت نہیں کر سکتا۔" میں نے کہا۔ "مجھے گناہ دہنا پڑتا ہے۔"
 "شاید اوپر سے کوئی ہدایت دی گئی ہو۔ کیپٹن نے میرا درشت بوجھ سوس کر کے، دوستانہ انداز میں کہا۔ "مجھے یہی ہدایت کی گئی ہے۔ میں پہلی پیڈ پراپ کو اُن کے حوالے کر دوں گا۔"
 پہلی پیڈ پراپ ایک میجر نے بڑھ کر میرا استقبال کیا۔ اس نے سیلوٹ تو نہ کیا تھا لیکن انداز مؤدبانہ ہی تھا۔ کیپٹن رضا اور گوریلا نوجوان ایک ڈانچ کی جانب بڑھ گئے تھے۔ مجھے اور ہارون کو تو اسٹانڈر جیب میں بٹھایا گیا۔ میجر سینڈ میڈ پر بیٹھ گیا۔ جب جیب گریٹ سے نکلی تو میں نے دیکھا، چار فوجی موٹر سائیکلوں پر تیار تھے۔ دو آگے چل پڑے، دو پیچھے آ رہے تھے۔
 جیب بازداروں سے گزرتی، جب ایک بڑے سے گریٹ میں داخل ہوئی تو سنٹری نے سیلوٹ کیا۔ دائیں جانب فوجی گاڑیوں کے قریب جیب رکی تو میجر نے خود اتر کر ہمارے لیے دروازہ کھولا۔ ہم لان کی روش سے گزرتے براکے میں گئے۔ ہر دروازے پر ایک نگراں... چوکس کھڑا تھا۔ میجر نگراںوں سے سیلوٹ لیتا ہوا ایک وزیننگ روم میں داخل ہوا۔
 "تشریف رکھیں۔ میں جنرل صاحب کو اطلاع کرتا ہوں..." میجر نے گداز صوفے کی طرف اشارہ کیا۔ ہارون نے معنی خیز نگاہوں سے میری جانب دیکھا۔
 "معمر کرکڑا ہوں، پیارے! شاباشی ملے گی۔ میں نے مسکرا کر کہا اور ابھی ہم بیٹھنے بھی نہ پائے تھے کہ میجر واپس آنا دکھائی دیا۔
 "خرم سلطان! میجر نے فوجی انداز میں نام پکارا۔ میں نے صرف آنکھوں سے اُس سر کہا اور ہارون چل کر میرے شانے سے جڑ گیا۔ صرف آپ کو جنرل صاحب نے اندر بلایا ہے۔ اس سے قبل کہ میں کچھ کہتا، ہارون پلٹ کر صوفے پر بیٹھ گیا۔ حالانکہ میں اُسے ساتھ لے جانا چاہتا تھا لیکن میری سوچ منفی تھی۔ مجھے کسی غیر نے بلایا تھا، نہ زنیس میں نے شرفِ ملاقات کی دعوت دی تھی، وہ میرے وطن کا ایک معزز جنرل تھا۔
 وزیر پردہ ہٹاتا ہوا میں اندر داخل ہوا۔ سامنے بڑی میز کے پیچھے پروقار انداز میں بیٹھا معمر شخص سراپا متم تھا۔ میرے سلام کے جواب میں جنرل صاحب نے اُنکڑ فوجی مصافحہ کیا۔ انداز بے حد اہلانا تھا۔ اگر فوجی ضابطہ مانع نہ ہوتا تو یقیناً مجھے سینے سے لگایا جاتا۔
 "بیٹھ جاؤ بیٹے!" انھوں نے سامنے گری کی جانب اشارہ کیا۔ "میں بیٹھتا ہوں، تم خوش اور عجیب قسم کی طمانیت محسوس کر رہا

ہوں۔ میرا اندازہ تھا کہ تم بچی عمر کے گھاگ قسم شخص ہو گے۔ تمہارا غائبانہ تعارف ایسا ہی تھا۔ تم جیسے نو عمر بچے سے ایسے کلاناموں کی توقع نہیں کر سکتا۔ کل رات اسلام آباد سے انٹر نیٹ منسٹر نے تمہارے بارے میں بتایا تھا میں نے ہنگامی حالات سے نمٹنے کے لیے گوریلا فورس سے چند نو جوان تیار کر لیے تھے۔

”یہ خان صاحب کی شفقت ہے، ورنہ وہ جانتے ہیں کہ میں حالات سے خود نمٹ لیا کرتا ہوں۔“ میں نے کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ ”یہ منہ اتنا مشکل بھی نہ تھا۔“

”تو کیا کامیاب ہوئے ہو؟“ جنرل صاحب نے آگے جھٹک کر جھجھرتی آواز میں پوچھا۔

”جی ہاں، سر! خدا کے فضل سے۔“ میں نے سر کو اثباتی جنبش دی۔ ”مطلوبہ شخص باہر بیٹھا ہے۔“

”گڈ...“ اُن کا ہاتھ ٹلی فون سیٹ کی جانب بڑھا۔ ”کیا میں اسلام آباد والوں کو خوش خبری سنا دوں؟“

”اس کی ضرورت نہیں، سر!“ میں نے معذرت خواہانہ انداز میں سر کو فنی میں ہلایا۔ ویسے میں اپنے ہیڈ کوارٹر سے... رابطہ ملانا چاہتا ہوں۔“

”خود... غرور۔“ اُنھوں نے اندرونی رابطے کاٹن دیا۔ ”لائن ڈائریکٹ کر دو۔“ پھر اُنھوں نے ٹلی فون سیٹ اٹھا کر میرے سامنے رکھ دیا۔ میں نے اُن سے کوڈ نمبر پوچھا پھر ہیڈ کوارٹر کا نمبر ڈائل کیا۔

تیسری گھنٹی پر کھڑکی آواز سنائی دی۔

”تمہاری آواز کیسی ہے، ماسٹر؟“

”نزلہ، مائی سن! وہی ناماؤس آواز ابھری اور میرے جسم میں سنسنی کی لہریں دوڑنے لگیں۔ ادھر یقیناً بیگنی نہ تھا، اگر وہ نہیں تھا تو ماسٹر کہنے پر اُسے اپنا نام بتانا چاہیے تھا۔ میرے ساتھیوں کی بھی آواز نہ تھی۔“ کہاں سے بول رہے ہو؟“

”سنو، ماسٹر!“ میں نے سرد آواز میں کہا۔ ”میں ادھر ایک مشکل میں پھنس گیا ہوں۔ شاید چند دن اور گناہ پڑے۔ آپ بتائیں، ہسپتال والے دوست کا کیا حال ہے؟“

”ٹھیک ہے، بالکل ٹھیک۔“ وہ کھانسنے لگا۔

”دوسری رپورٹ لوگوں کی دیں، کون کہاں ہے؟ میں اُسے گھر دیتا ہوں۔“ وہ بھی محتاط تھا۔

”سب اپنی اپنی ڈیوٹی مستعدی سے دے رہے ہیں۔“

”نام ماسٹر!“ میں نے تھکنا انداز میں کہا۔ ”مجھے ہر ایک کا نام اور ڈیوٹی بتاؤ۔“

”پھر کال کرنا۔“ میں چپک کر رہا ہوں۔ ”اُس نے ایک دم سلسلہ توڑ دیا۔ مجھے یقین نے پریشان ہی بلکہ ہراساں کر دیا تھا۔ ہیڈ کوارٹر پر کسی نے قبضہ کر لیا تھا اور وہ جو کوئی بھی تھا، میری گھات میں وہاں بیٹھا تھا۔ پہلے تو یہی سوچا کہ خود اُڑنا ہوا چلا جاؤں اور دیکھوں، کون ہے مگر یہ کارروائی احمقانہ ہی ہوتی۔ شکاری کے نگلے ہوئے پھندے میں گردن پھسانا دانش مندی نہ تھی۔

پھر میں نے ٹینڈر گل کا نمبر ڈائل کیا۔ گھنٹی بجتی رہی تھی۔ بہت دیر تک بجتی چلی گئی تھی لیکن ریسور اُنھلنے والا وہاں شاید کوئی نہ تھا۔ حالانکہ میں نے ٹیم دیا تھا کہ لوگوں کو منتقل کرنے کے بعد ہر وقت کوئی نہ کوئی وہاں موجود رہے گا۔

”کیا بات ہے بیٹے؟“ تم کچھ پریشان ہو گئے ہو؟“ جنرل صاحب نے پیار سے پوچھا۔

”کوئی گڑبڑ ہے، سر!“ میں نے بتایا۔ ”کسی ساتھی سے رابطہ نہیں مل رہا۔“

”اگر اجازت دو تو میں بذریعہ ملٹری چیک کر لیتا ہوں۔“

”ابھی نہیں، سر!“ میں نے اسپتال کا نمبر ڈائل کرنا شروع کر دیا۔ استقبال پر کمر کو میں نے رشیدہ کا روم نمبر بتایا۔ حوالہ جنرل صلیب ہی کا دینا پڑا تھا۔ ورنہ شاید وہ مال جاتی۔ اُس نے انتظار کرنے کا کہہ کر خاموشی اختیار کر لی تھی۔ دو منٹ بعد جو خبر اُس نے دی تھی، اُس خبر نے مجھے جھٹک سے اُڑا دیا تھا۔ اُس نے بتایا تھا کہ رشیدہ گزشتہ رات ورنہ کی درخواست پر فاسخ کر دی گئی ہے۔

”سنو، سسٹر!“ میں نے چیخ کر کہا۔ ”ریکارڈ دیکھو اور مجھے بتاؤ درخواست کس کی طرف سے دی گئی تھی۔“

”سوری، سر!“ اُس نے جواب دیا۔ ”آپ میں آفس سے رابطہ قائم کریں۔“

”کوئی زبردست چکر چل گیا تھا۔ میرے تمام آدمی اپنی جگہ سے ہٹ چکے تھے۔ اگر کارروائی کسی دشمن کی طرف سے ہوئی تھی تو اتنی بڑی کارروائی تھی جس نے کچھ بھی نہ چھوڑا تھا۔ حتیٰ کہ اسپتال سے رشیدہ کو بھی نکال لے گیا تھا۔“

”آپ مجھے اجازت دیں گے، سر؟“ میں نے اُنھیں ہونے لگا۔

”میری آواز پییدہ ہی رہی ہوگی، ورنہ جنرل صاحب نہ چوکتے۔ وہ بھی میرے ساتھ ہی اُٹھے تھے۔“ میں بلاناخیر پنڈی پہنچنا چاہتا ہوں۔ براہ کرم، کیپٹن رضا تک پیغام پہنچایا جائے۔“

”خرم سلطان!“ جنرل صاحب مینے گھوم کر میرے قریب آگئے۔ ”میں تمہیں روکنے کا حجاز تو نہیں ہوں لیکن تم سے صرف

ملنا نہ تھا، ہماری بھی ایک پلانٹ تھی۔ مجھے خان صاحب نے کہا تھا... کہ ایسے کام صرف خرم سلطان ہی سرانجام دے سکتا ہے۔“

”سوری، سر!“ میں نے دو ٹوک انکار کر دیا۔ ”میں پہلے اپنے گھر کی خبر لینا چاہتا ہوں۔ اگر ادھر خیریت ہوئی تو پھر حاضر ہو جاؤں گا۔“

”پراہم تو سن لو۔“ جنرل صاحب میرے ساتھ ساتھ چل پڑے۔ ”ہو سکتا ہے تمہیں بھی معذرت کرنا پڑے۔ میرا بیٹا شکار کھیلے گیا تھا اور ابھی تک واپس نہیں آیا۔ اسپتال کے میں نے معلوم کر دیا ہے، وہ بفضل خدا زندہ ہے اور بظاہر اپنی مرضی سے ادھر مقیم ہے... میں کوئی فوجی کارروائی نہیں کر سکتا۔ دیگر تمام کوششیں ناکام ہو چکی ہیں وہ واپس آنا نہیں چاہتا۔ میری پوزیشن ایسی ہے کہ سول اتھارٹی کو بتانا گوارا نہیں۔ میں چاہتا ہوں، تم جاؤ اور اصل وجہ معلوم کرو۔ وہ خود نہیں آنا چاہتا تو کیوں ہو سکتا ہے، اُسے روکا گیا ہو، کوئی پریسٹر اور نف اس پر طاری ہو۔“

”ٹھیک ہے، سر!“ میں نے پردہ ہٹاتے ہوئے جواب دیا۔ ”میں فی الحال وعدہ کرنے کی پوزیشن میں نہیں ہوں۔ اگر میرے حالات نے اجازت دی تو میں بہت جلد آپ سے رابطہ قائم کر دوں گا۔“

”شکریہ بیٹے!“ وہ نمونہ لہجے میں بولے۔ ”میں منتظر رہوں گا۔ تم باہر چلو، میں کیپٹن رضا کو فون پر اطلاع دے رہا ہوں۔“

میں نے یہ سوچ کر جلتی ہوئی گہری سانس لی کہ اس صدمہ کا ہر انسان اندر سے جل رہا ہے۔ کسی کو زندگی ہوس جلتی ہے اور کچھ لوگ زبردستی کی آگ میں جلتے ہیں۔ انسان بھی شاید دھرتی پر رہتے رہتے بہت پرانا ہو گیا ہے، جس طرح بڑھ کر تن اور درخت پرانا ہو کر اندر سے کوکھلا ہو جاتا ہے۔

ہارون نے چونک کر میرے بدلے رنگ اور تنے ہوئے چہرے کو دیکھا لیکن میں نے اُسے کچھ بتانا مناسب نہ سمجھا تھا جس طرح فوجی بتانے اور جاننے سے بڑھتی ہے، اسی طرح دکھ چھپانے سے گھٹ جاتا ہے۔ ہند ہمدردیاں جتنے دلے غم فراموش ہونے ہی نہیں دیتے۔ ہارون کو اپنے دکھ میں شامل کرنے کا وقت تھا نہ فائدہ... اگر کف اُسے معلوم ہوتا ہی تھا پھر کیا ضروری تھا کہ پنڈی تک وہ بھی میری طرح خون جلاتا رہتا۔

جب دھیال کیپٹن سے کیپٹن رضا کا شکریہ ادا کر کے ہم چپکے سے بیٹھے تو میں فیصلے کی صلیب پر ٹٹک گیا تھا۔ میرے سامنے کئی فزیکس اور سوچیں تھیں۔ ہیڈ کوارٹر میں جو بھی کوئی تھا، دن کی روشنی اس کی خراج پوری ممکن تو تھی لیکن خطرے سے خالی نہ تھی۔ خان ایک باز کا گھر خاموش تھا، رشیدہ، اسپتال چھوڑ چکی تھی۔ بغیر کچھ جانے

میں ڈی۔ آئی۔ جی سے ملنا پسند نہیں کرتا تھا۔

مال روڈ پر چڑھتے ہی ڈرائیور نے سوالیہ نگاہوں سے میری جانب دیکھا، اُس لمحے بھی میں اُسی کرب میں مبتلا تھا لیکن اُسے یونہی سڑکوں پر گھمایا بھی نہ جاسکتا تھا۔ اگر اپنی گاڑی چوٹی تو کسی فیصلے تک میں... پنڈی کی سڑکوں کے جال میں الجھا رہا ہو سکتا تھا... مجبوراً ہوٹل راگ رنگ ہی کا رخ کرنا پڑا تھا۔

میں اور ہارون شانہ بہ شانہ سیڑھیاں چڑھتے، مرکزی دروازے سے اندر داخل ہوئے تو میری سانس جیسے سے رگڑ کھاتی ہوئی چل رہی تھی مگر کاؤنٹر پر اکبر خان کو دیکھ کر کچھ سہارا سا ملا، جیسے ڈوبتے کو تنکے کا سہارا مل گیا ہو۔ اکبر خان نے بڑی جان دار مسکراہٹ دی تھی۔ اُس کا چہرہ ہمشاش لبشاش تھا۔ میں نے چہرے ہی سے اندازہ لگایا تھا کہ اگر کوئی بڑی خبر ہوئی تو اکبر کا چہرہ کھلا ہوا نہ ہوتا۔ وہ نہیں دیکھتے ہی آفس کی چابی لے کر کاؤنٹر سے نکل آیا تھا۔ چونکہ ابھی لیمٹ ٹائم نہ تھا اس لیے ڈانٹنگ ہال ویران تھا اور ویٹرز، میزوں کی صفائی کر رہے تھے۔

”ماسٹر کچھ آتا ہے؟“ میں نے کبر سے پوچھا۔

”آفس میں چلیں، جناب!“ اکبر ٹھہرے ہوئے انداز میں بولا اور آگے آگے چل پڑا۔

”آپ کچھ چھپانے کی کوشش کر رہے ہیں، چیف!“ ہارون ہر سرائی آوازیں بولا۔ ”جب آپ جنرل کے آفس سے نکلے تھے، میں نے آپ کے چہرے پر تحریر پڑھ لی تھی۔“

”ہاں، ہارون!“ کچھ ہے جو ابھی اکبر بتائے گا۔“ میں آفس میں داخل ہو گیا۔ اکبر مؤدب انداز میں ایک طرف کھڑا تھا۔ میں نے کرسی سنبھال کر، اُس کی جانب دیکھا۔ ”اب بتاؤ، اکبر خان، ماسٹر کہاں ہے؟“

”جہاں بھی ہے، خیریت ہے۔“ اکبر بولا۔ ”رات دس بجے، وہ لوگ یہاں آئے تھے۔ اُن کے ساتھ خان کی دونوں بیٹیاں اور مس رشیدہ تھیں۔ ماسٹر نے کھڑے کھڑے مجھے کہا کہ چیف کی کال آئے تو اُن کو بتلانا کہ ہیڈ کوارٹر اور خان کے گھر سے دور رہیں... پھر وہ چلے گئے تھے۔“

”ہوں، ٹھیک ہے،“ اکبر خان، ”تم کاؤنٹر پر جاؤ، کوئی اور بات تو نہیں؟“ اکبر فنی میں گردن ہلا کر آفس سے نکل گیا۔

”میری پریشانی کی وجہ جان لی، ہارون! تم نے۔“ میں نے ریسور اُنھاتے ہوئے کہا پھر رابطے کاٹن دیا کہ اکبر خان سے لائن مانگی۔ لائن ڈائریکٹ ہوئی تو میں نے ہیڈ کوارٹر کا نمبر ڈائل کیا۔

”ہیلو، بیگن دس اینڈ۔“ وہی کھڑکی آواز سنائی دی۔ وہ جو

بھی تھا، بھوں پر قادیان تھا لیکن آواز بدلنے کے فن سے نابلد تھا یا اس کی آواز اتنی کھردری اور جھڑی تھی کہ بیگن کے پتے کو بیگن کی آواز دینے سے قاصر تھا۔

"میں پنڈی پہنچ چکا ہوں، ماسٹر!"
"گڈ... وہ چمکا۔ کہاں ہو، لڑکے؟ مجھے تمہاری ضرورت ہے۔"
"اپنے ہوٹل میں ہوں۔ میں نے جواب دیا۔ اگر کوئی کام ہے تو بتا دیجیے۔"

"نہیں کام ہے حد اہم ہے، چلے آؤ۔ وہ بیگن کی نقل اتارنے کی کوشش کر رہا تھا۔ تمام لڑکے باہر ہیں۔"
"بہتر، ماسٹر! لیجئے کہ حاضری دہل گئی۔ میں نے جواب دے کر سلسلہ منقطع کر دیا۔"
"کمال ہے، آپ نے ماسٹر کو ٹریس بھی کر لیا۔ ہارون پر ستائش آواز میں بولا۔"

"نہیں، پیارے! یہ ماسٹر نہیں ہے۔"
"کیا مطلب؟" ہارون استغماہم لہجے میں بولا۔ "تو پھر..."
"میرے لیے جال بچھایا گیا ہے۔" میں نے پھر ریسورڈ اٹھاتے ہوئے بتایا۔ "ابھی چپک ہو جانے کا لفظ نقلی ماسٹر کہاں ہے۔ ویسے مجھے یقین نہیں کہ وہ لوگ اتنے ہی احمق ہوں گے۔ میں نے ڈی۔ آئی۔ جی کانفر ملایا۔ ان کے پی۔ اے نے میرا نام سننے ہی فوراً رابطہ ملا دیا تھا۔"
"ہاں بیٹے جی! ڈی۔ آئی۔ جی کی پیار بھری آواز سنائی دیتی تھی تمہاری کال کا منتظر تھا۔ پوچھو گے نہیں کیسے؟"
"آپ باذرائع آفیسر ہیں، سر! میں نے جواب دیا۔ اور میرے لیے طالب خیر بھی۔"

"پہلے کامیابی کی مبارک قبول کرو پھر شکوہ کروں گا لیکن فون پر نہیں۔ اب تم بتاؤ، کیوں فون کیا ہے؟"
"سر! میں اپنی پارٹی گم کر بیٹھا ہوں۔ میں نے کہا تو انھوں نے قہقہہ لگایا۔"

"پنڈی، مہرے! اظہم نہیں چوہدہدی! میرے آفس میں چلے آؤ۔"
"بہتر، جناب!" میں نے مؤدب آواز میں کہا۔ "کیا آپ یہ بھی جانتے ہیں کہ ہینڈ کوآرٹر میں دوسرا بیگن کتنے ہے؟"
"کیا کہا، دوسرا بیگن؟ وہ چیخ کر بولے۔ وضاحت کرو خرم سلطان! میں نے وضاحت کرتے ہوئے انھیں بتا دیا کہ کوئی شخص خود کو بیگن ظاہر کرتے ہوئے ہینڈ کوآرٹر کی کال وصول کر رہا ہے۔"

"تم وہیں ٹھہرو۔ میں ابھی چپک کروانا ہوں۔" انھوں نے فوراً رابطہ توڑ دیا۔ میں نے اکبر کو کال کیا اور اُسے کھالائیے کا آرڈر دے دیا۔

جھجک بھی چمکی ہوئی تھی اور کچھ خیال یہ بھی تھا کہ اب باہر نکل گیا تو رات جلنے عیالات کے گرم محرم میں آؤٹ کی طرح کھائے پیے بغیر کتنا وقت گزارنا پڑے۔

کھانا کھا کر ابھی ہارون پیالیوں میں چائے انڈیل ہی رہا تھا کہ دو شخص ٹپٹے ہوئے ہال میں داخل ہوئے۔ ہارون نے میرے پاؤں پر پاؤں رکھ کر دیباہ میں نے بھی جوانی اشتاہہ دیا کہ میں بھی دیکھ رہا ہوں... دونوں نے کاؤنٹر کی جانب دیکھا اور پھر پہلی میز پر بیٹھ گئے۔

"آپ کے لیے کال ہے، جناب!" ویر نے میرے قریب آکر بتایا اور کھانے کے برتن تھے میں رکھنے لگا۔
"میری پیالی ادھر لے آؤ۔" ویر نے کہہ کر میں تیز قدم اٹھاتا کاؤنٹر تک گیا۔ اکبر نے ریسورڈ مجھے دے دیا۔
"میلو، کون؟" میں نے خشک آواز میں پوچھا۔
"چیف میں کونز ہوں۔"

"بولتے رہو، دوست! میں نے پہلو بدل لیا تاکہ نووار دسلنے رہیں۔ دونوں میری جانب ہی متوجہ تھے۔ جونہی میرا رخ بدلا... ایک دم ایک دوسرے سے باتیں کرنے لگے۔
"میں سامنے کیسے میں ہوں، چیف! ہوٹل کی مسلسل نگرانی ہو رہی ہے۔ ابھی ابھی دو آدمی اندر گئے ہیں۔ ان کی جگہ دو آدمی باہر کھڑے ہیں۔ ہر گھنٹے بعد یہ لوگ بدل جاتے ہیں۔ میں آپ کو اندر جاتے نہیں دیکھ سکتا تھا۔ اگر ہنٹ الفارم نہ کرتا تو میں اب بھی بے خبر تھا۔"

"ہنٹ کہاں ہے؟"
"وہ ہوٹل ہی میں کہیں ہے، چیف!"
"کیا ماسٹر سے تمہارا رابطہ ہے؟"
"ہیں، چیف! کونز دھڑک کر بولا۔ "دراصل ہمیں آپ کی طبی کال یقین نہ تھا کہ اتنی جلدی ہوگی۔ ہم تو ہوٹل کی نگرانی کر رہے تھے۔ کیا ماسٹر کو اطلاع دوں، چیف؟"

"اوہ، جان نہیں۔" میں نے قہقہہ لگا کر کہا۔ کیونکہ وہ دونوں چمکتے ہوئے تھے۔ میں انھیں یہ تاثر دینا چاہتا تھا کہ ادھر جمہوریہ وٹو بول رہی ہے۔ فی الحال میں مصروف ہوں۔ میرا انتظا رکھنا۔ او۔ کے، جان!"
"کیا اندر گزرتا ہے، چیف؟ کونز نے پوچھا۔ "ماسٹر کا حکم ہے صرف نگرانی کی جائے۔ تعاقب سے منع کیا گیا ہے۔"

"ماسٹر سے کہو، مجھے رنگ کر لیں اور تم نگرانی کرتے رہو۔ میں نے دبی آواز میں کہہ کر ریسورڈ رکھ دیا۔ ابھی میں دو قدم ہی واپس

گیا تھا کہ پھر گھنٹی بجنے لگی۔ میں نے پلٹ کر ریسورڈ اٹھالیا۔
"جی فرمائیے۔"

"ادھر کوئی نہیں ہے، تمام کمرے کھلے ہیں۔ نیلی فون کی تار ٹوٹی ہوئی ہے۔ ڈی۔ آئی۔ جی نے بتایا۔ تار جوڑ کر مجھے اطلاع دی گئی ہے۔ میں نے ایس۔ ڈی۔ نیلی فون کو حکم دے دیا ہے، وہ ٹریس کرے گا کہ اس نمبر کو کہاں سے چوری کیا گیا ہے۔ میرا خیال ہے، کوئی قریب ہی کسی ایسی جگہ ہوگا جہاں سے کوئی پر جگہ رکھی جاسکے۔"
"شکریہ، سر! میں نے کہا۔" میں ساتھیوں کو ٹریس کرنے کے بعد کچھ سوچوں گا۔"

"وقت ملے تو مجھ سے مل لینا۔ تمہارے لیے باؤنڈ لف کے کچھ اور درجی کھل گئے ہیں۔"
"بہتر، سر! میں نے گہری سانس لے کر ریسورڈ رکھ دیا۔ معاً میری چمٹی جس کی خیند ٹوٹ گئی۔ میں پھرتی سے ٹرا لیکن اس نے بڑے آرام سے ریو اور میرے پہلو سے لگا رکھا تھا۔ دوسرا شخص اسٹین گن تلے ہال کے دروازے میں کھڑا تھا۔ ویرز اپنی اپنی جگہ رو بوٹ کی طرح جام تھے جیسے برقی نو منقطع کر دی گئی ہو۔ بس ایک خوشی ہوئی تھی، ہارون ہال سے غائب تھا۔

"خاموشی سے نکل چلو، عزیزم! اس نے زیر لب مسکراتے ہوئے کہا۔
"ورنہ بے گناہ لوگ بھی مارے جائیں گے۔"
"سنو، برادر! میں نے جونوں پر زبلاں پھیری۔ اگر نجد کے سلسلے میں کچھ کہنا چاہتے ہو تو میں یقین دلا سکتا ہوں کہ ابھی ہماری ملاقات نہیں ہوئی۔ بس کبھی کبھی وہ خود نیلی فون کر لیتی ہے۔"
"اُسی نے مجھے بھیجا ہے۔" وہ سکراہٹ تیز کرتے ہوئے بولا۔ تم سے ملنا چاہتی ہے۔"

"نہیں... میں نے ہم کر کہا۔" اس نے تو ایسی کوئی بات نہیں کی میں اُسی سے باتیں کر رہا تھا۔
"بس... اس نے ریو اور کا دباؤ بڑھا کر کہا۔ مذاق ختم میرے ساتھ چلو۔"

"نن... نہیں۔" میں نے ہاتھ اٹھا کر احتجاج کیا۔ "تم مجھے کہیں لے جا کر مار دو گے۔ حالانکہ میں نجد کو جانتا تک نہیں۔ وہ میری ایک عزیزہ کی دوست ہے، ہمارا غائبانہ تعارف ہے۔ میں وعدہ کرتا ہوں کہ آئندہ فون پر یہی بات نہیں کروں گا۔"
"اپنا نام بتاؤ گے دوست! وہ اُلجھ کر بولا۔" ہو سکتا ہے مجھے غلط فہمی لگی ہو۔"
"ہاں ضرور غلط فہمی ہوئی ہے، آپ کو۔ میرا نام جلاوید عارف ہے۔"

"وہ کون ہے جو تمہارے ساتھ تھا؟"

"وہ... وہ... اچھا، آپ خرم چوہدہری کے بارے میں پوچھ رہے ہیں۔"

"وہی مجھے زبردستی یہاں لایا تھا۔" میں نے اس کے شلے سے جھانک کر ہال میں دیکھا۔ "اوہ... وہ تو کہیں چلا گیا ہے مجھے چھنکار۔"
"اپنا شناختی کارڈ دکھاؤ اور یہاں سے دفع ہو جاؤ۔" اس نے ریو اور ہٹا کر حجب میں دکھلایا۔

"بس... بہتر بھائی صاحب! میں نے بوکھلاتے ہوئے ایک حجب میں ہاتھ ڈالا۔ "میں فوراً سے پہلے یہاں سے دفع ہو جاؤں گا اور کبھی اس محسوس ہوٹل میں داخل نہیں ہوں گا۔" اس نے گردن موڑ کر اپنے ساتھی کی جانب دیکھا جو ویرز کو دھمکیاں دے رہا تھا۔ میں نے دایاں پاؤں اس کے جڑے ہوئے کھٹے پر ملا اور ترحمی تھیلی گردن پر کھٹ سے ماری۔ وہ جھول سا گیا۔ میں نے پھرتی سے اس کے دونوں ہاتھ موڑ کر پشت سے لگا لیے اور گھٹنا اس کی کمر پر رکھ دیا۔
"اپنے ساتھی سے کیا کہو گے، برادر؟" میں نے کھٹے کا دباؤ بڑھا کر پوچھا۔ فیصلہ تمہیں ہی کرنا ہوگا۔"
"شیراز... اس نے پھنسی پھنسی آواز میں کہا۔ "گن پھینک کر باہر چلے جاؤ۔"

"نہیں... اکیلا کہاں جائے گا؟ میں نے کہا۔ "گن پھینک کر تیسری میز پر چلے جاؤ، دوست! اس نے پاؤں میں اسٹین گن گرا دی اور اُلٹے قدموں ہٹا ہوا، تیسری میز کی ایک کرسی گھسیٹ کر اگڑوں بیٹھ گیا۔ اکبر خان دوڑتا ہوا کاؤنٹر سے نکلا اور گن اٹھالایا۔ "اکبر خان! مہمان کو چانے پلاؤ۔ آفس میں میرے ساتھ یہ بھائی بیٹھے گا، ادھر بھی چائے بھجوا دینا۔"

"میں اُسے دھکیلتا ہوا، آفس میں لے گیا۔ کرسی پیش کرنے سے قبل میں نے اس کی جیبوں کو ٹونل لیا تھا۔ اب بتاؤ، کیا تم ہی خرم سلطان ہو؟ وہ کرسی پر بیٹھ کر بولا۔
"نام کوئی بھی رکھا جاسکتا ہے پیارے! فیصلہ تو کام کرتا ہے... میں نے جاوید نام لکھا تھا۔ ویسے دوسرے لوگ مجھے خرم سلطان ہی کہتے ہیں۔"

"اس نے بولنے کے لیے منہ کھولا ہی تھا کہ دروازہ کھلا اور ہارون مسکراتا ہوا اندر داخل ہوا۔ "میرا دل کمزور ہے۔ اس لیے لڑائی بھڑائی کا منظر نہیں دیکھ سکتا۔" وہ کرسی اٹھا کر میرے قریب بیٹھ گیا۔
"ویسے ہم لڑے تو نہیں۔" میں نے مسکرا کر کہا۔ "لڑائی شریف لوگوں کے نزدیک کوئی اچھا فعل نہیں ہوتا۔"
"مہمان کا تعارف؟" ہارون نے اس کی طرف دیکھا۔

"ابھی یرم باقی ہے۔" میں نے کہنیاں ٹیک کر جواب دیا: "لیکن تعاف کی ضرورت ہی کیا ہے۔ یہ اپنا کوئی فرضی نام بتادیں گے اور ہم مان لیں گے۔ ہاں، بزنس کی بات ضرور ہوگی۔ کچھ نہ کچھ تو یہ خریدنے آئے ہوں گے۔"

"آپ کے لیے کال ہے جناب! اکبر خان نے جھانک کر کہا اور میں نے بڑا اور ہارون کی طرف اچھال دیا۔ دوسرا آدمی چلے پی رہا تھا اور ایک ویشرنگن سے ہمارے لیے بھی چائے لایا تھا۔"

"ہیلو..." میں نے اکبر سے ریسپورڈ کر مٹا دیا۔

"میں بیگن ہوں، خرم! کیا تم ہیڈ کوارٹر گئے تھے؟"

"نہیں، ماسٹر! میں نے آپ کو پشاور سے کال کیا لیکن جواب نے مجھے پریشان کر دیا تھا۔ کیا معاملہ ہے، ماسٹر؟"

"معاملہ تو ڈی۔ آئی۔ جی ہی جانتا ہے۔ بیگن بولا: "مجھے اُسی نے فی الفور تمام آدمیوں کے ساتھ ہٹ جانے کی ہدایت کی تھی۔"

"ٹھیک ہے، ماسٹر! میں معلوم کروں گا۔ آپ لڑکیوں کا خیال رکھیں۔ رشیدہ تو سردی گرمی دیکھتے ہوئے ہے، دوسری لڑکیاں یقیناً پریشان ہوں گی۔"

"نہیں... ایسی کوئی بات نہیں۔ بہترین تعاون کر رہی ہیں۔"

"ٹھیک ہے، ماسٹر! اور کوئی ہدایت؟"

"اگر فارغ ہو تو آگاہی دیکھ کر چلے آؤ۔ ہنٹ تمہیں یڈ کرنے لگا۔"

"فی الحال، نہیں، ماسٹر! میں نے محنت طلب ہے۔"

جواب دیا: "کچھ پتے ہاتھ لگے ہیں، ابھی پھینٹے نہیں۔ ہو سکتا ہے، کارآمد نکل آئیں۔ دوسری وجہ بھی ہے۔ میں اپنے ساتھ کسی کے قدموں کا رخ محفوظ پناہ گاہ کی طرف نہیں کرنا چاہتا۔ جب راستہ صاف ہو گا تو آؤں گا۔"

"رشیدہ پاس کھڑی اتار دے کر رہی ہے۔ بیگن نے ہنس کر بتایا: "بات کر لو۔"

"سلام علیکم، بھائی صاحب جی! رشیدہ کی چہکار سنا دی۔"

"یشریڈ کی پیشانی پر آنکھوں کی ایک درخواست کو کسی شاعر نے موزوں کیا تھا۔ کیا تو تم سے شعر سنو گے؟"

"تمہارا تحت اللفظ بھی میرے لیے دنیا کا بہترین ترنم ہے، جان بڑا اور!"

"ہارون کیسے ہیں؟" اس کے دل کی دھڑکن کو آواز ملی۔

"وہ اب مجھے بھی بے حد ناز ہے، جان! اگر وہ بہتر نہ ہوتا تو کیا میری آواز میں خوشی ہوتی؟"

"اچھا، اب باتیں نہیں، تشریف لے آئیے۔" وہ شرمائی شرمائی آواز میں بولی: "آپ کی باورچن اب آن ڈیوٹی ہے۔ بولے کیسے تیار کروں؟"

"جو پسند ہو۔ ویسے میں تنہا ہی آؤں گا۔" میں نے ہنسنا شروع کر دیا اور اس نے ریسپورڈ بیگن کو دے دیا۔

"کیا بات کہہ دی، تم نے بیٹے؟" بیگن نے بھی ہنس کر پوچھا۔

"باری بیٹی کچھ نالاض ہو گئی ہے۔"

"میں سفارش اپنے ساتھ لاؤں گا، ماسٹر! اور کے خدا حافظ!"

ہارون اور وہ بڑے خوش گوار اور دوستانہ ماحول میں چلے پی رہے تھے۔ غالباً ہارون نے پہلے سیدھی انگلی سے گھنی نکلنے کا فیصلہ کیا تھا چونکہ ویشرنگن دو پیالیاں چھوڑ گیا تھا، اس لیے دونوں نے میری آمد پر تعظیماً پیالیاں نیچے رکھ دی تھیں۔ میں نے کال بیل بجا کر اپنے لیے پیالی منگوائی۔ ویشرنگن چائے سرو کرنے کے آفس سے نکل گیا تو گہرے سکوت میں ہم سب لینے لگے۔ وہ شخص ہر سب پر چڑھ گیا ہوں سے میری جانب دیکھ لیتا تھا۔

"اب یرم دنیا بھادو، دوست! میں نے آخری سب لے کر پیالی ٹرے میں رکھتے ہوئے دوستانہ لہجے میں کہا: "میں یہی فضا برقرار رکھنا پسند کروں گا۔ تم بھی گھاس کا بزنس نہیں کرتے ہو گے۔"

ایسی تقریب جس طرح منائی جاتی ہے، اس سے تم بے خبر نہ ہو گے۔"

"جو کچھ میں بتاؤں گا، مان لو گے، چوہدری؟ وہ میری آنکھوں میں جھانک کر بولا: "نہیں، مانو گے کیونکہ سچ جھوٹ پر کھنے کی کسوٹی تمہارے پاس نہیں ہے۔ تم وہی کسوٹی استعمال کرو گے جو پوچھ گچھ کے لیے تمہارے ہاں فروج ہے۔ ہو سکتا ہے میں بہت سا خون اور کچھ ہڈیاں ضائع کروانے کے بعد جو کچھ بتاؤں، اُسے تم تسلیم کر لو۔ حالانکہ وہ بھی جھوٹ ہو سکتا ہے۔"

"سنو، میرے فاضل دوست! میں نے تھوس آواز میں کہا...

"کسوٹی میرے پاس ہے، جب تم بولو گے تو تمہاری آنکھوں میں ایک تحریر ابھرے گی اور ایسی تحریریں پڑھنے کا میں ماہر ہوں۔ بولو، میں کوئی سوال پھر زبان سے نہیں کروں گا۔"

"میرا نام فضل کریم ہے اور میں مظفر چوہدری کے لیے کام کر رہا ہوں۔"

"مان لیا۔" میں مسکرانے لگا: "کیا حال ہے چوہدری صاحب کا؟"

"دوسری بات بھی سن لو، چوہدری! وہ ایک دم دپک اٹھا۔"

"میں اس نوجوان کا بھائی ہوں جسے تم سوزوں میں قتل کر چکے ہو۔"

"اگر دوسری بات پڑیں اظہارِ افسوس کروں تو؟"

"مان لیا۔" میں مسکرانے لگا: "کیا حال ہے چوہدری صاحب کا؟"

"دوسری بات بھی سن لو، چوہدری! وہ ایک دم دپک اٹھا۔"

"میں اس نوجوان کا بھائی ہوں جسے تم سوزوں میں قتل کر چکے ہو۔"

"کیا تمہارے افسوس سے میرے دکھ اور نقصان کا ازالہ ہو سکتا ہے؟"

"یقیناً نہیں۔" میں نے گہری سانس لی: "لیکن میرے پاس سوائے افسوس کے کچھ ہے بھی نہیں۔ جن حالات میں مجھے وہ تکلیف دہ قدم اٹھانا پڑا تھا، شاید تمہیں بتایا گیا ہو گا، اگر تم میری جگہ ہوتے تو یقیناً یہی کچھ کرتے۔ اگر میں اُسے نہ مارتا تو وہ مجھے پکڑ کر درندے کے حوالے کر دیتا۔ تم افسوس کی بجائے میری لاش کے گرد قفس کرتے۔"

"بے شک، ہم خوشیاں مناتے۔" وہ بے خوف آواز میں بولا۔

"کیونکہ تمہیں مظفر چوہدری مظفر کے نہیں، پوتے گھول کے دشمن ہو۔"

"کیا سارے لوگ مظفر چوہدری جیسے شیطان ہیں؟"

"نہیں، غیرت مند..." وہ زخمی ناگ کی طرح پھٹکا۔ "تم نے گاؤں کی عزت کو لگا لگا تھا۔ کلثوم ہماری عزت ہے۔"

"سنو، بڑے بھائی، تمہیں غلط بات بتا کر مظفر چوہدری نے اپنے بھائی کی ذلیل حرکت پر پردہ ڈالنے کی کوشش کی ہے۔ کلثوم پاک دامن لڑکی ہے، جس کا نام تم غیرت لے دو، میرے نزدیک بے غیرتی کی انتہا ہے۔ ایک شیطان صفت نوجوان کی ذلیل حرکت کو ایک معصوم لڑکی کی اوٹ میں چھپانے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ کیا تمہیں معلوم نہیں، فاروق چوہدری نے کیا، کیا تھا؟"

"تو تمہارے تعلقات کلثوم سے نہیں ہیں؟" اس نے حیرت سے پوچھا: "پہن تو یہی بتایا گیا تھا۔"

"نہیں، خدا کی قسم نہیں... بے غیرت بھائیوں نے بہن پر یہ ہمت لگائی ہے۔"

"کمال ہے، وہ مردہ آواز میں بولا: "وہ بے چاری شرم کے مارے باہر بھی نہیں نکلتی۔"

"ہاں، وہ اپنے بے غیرت بھائیوں کی غیرت کا سوگ منا رہی ہے۔"

"خاتونوں نے اپنی آگ میں میرا بھائی بھی جھونک دیا ہے۔"

"وہ جڑے کی ہڈیاں بچا کر کھا رہا ہے۔" خدا کی قسم، اب میں اپنے بھائی کے خون کا حساب اُن سے لوں گا۔"

"دیکھو، خدا کو گواہ بنا کر مجھ کو وعدہ نہ کرو۔" میں نے کہا: "اگر تم یہاں سے نکلنا چاہتے ہو تو میری طرف سے تمہیں اجازت ہے کیونکہ میں تمہارا دشمن نہیں ہوں۔ وہ گیدڑ خود سامنے نہیں آتا ہے گناہ لوگوں کو میرے سامنے ظاہر رہا ہے۔"

"تمہاری چوہدری! وہ ہونٹ چباتے ہوئے بولا: "میں بھی سچے دل سے تمہیں معاف کرتا ہوں۔ تم نے میرے بھائی کو قتل نہیں کیا۔"

"میں ڈی۔ آئی۔ جی سے فراغت کے وقت ملنا چاہتا تھا۔ مگر کوئی راہ نہ پا کر ملاقات ناگزیر ہو گئی تھی۔ کیونکہ بیگن بھی اندھیرے میں تھا۔ روشنی کی کرن کے بغیر میں قدموں کو کوئی سمت دینے سے قاصر تھا اور اندھیرے میں تیر چلانے کا فیصلہ کر کے وقت اور زبردستی ہی

بلکہ اُسے قتل کر دیا گیا ہے۔ اُس کا قاتل مظفر چوہدری ہے۔ میں نے مجھ کو اچھا نہیں کیا لیکن میں اُسے ملکا کر قتل نہیں کر سکتا۔ ایک بھائی قتل ہو گیا ہے میں قتل کے جرم میں بھائی پر نہیں پڑھوں گا میرے خاندان کو میری ضرورت ہے۔ ہاں، جب کبھی موقع ملا، تم سن لو گے کہ مظفر چوہدری کو کسی نے قتل کر دیا ہے۔ میرے لائق کوئی خدمت ہو تو بتاؤ، چوہدری! اب ہم دشمن نہیں دوست ہیں۔"

"اگر دوستی کا حق اور کرنا چاہتے ہو تو میں مظفر چوہدری کا موجودہ ٹھکانہ معلوم کرنا چاہوں گا۔"

"وہ ٹھکانے بدلتا رہتا ہے۔ گزشتہ سات برس سے گھر تھا۔ اُس سے پچھلی رات، جیرے میرائی کے پاس تھا، زیادہ تر جیرے کے گھر رہتا ہے۔ اُس کی دھوک، گاؤں سے الگ تھا۔ جیرا اور اُس کے بھائی، باری باری چوکی پہرہ دیتے ہیں۔ اگر تم اپنا ٹھکانہ بتا دو تو میں اُسے نشہ پلا کر تمہیں لے چلوں گا۔"

"اس ہوٹل کا فون نمبر لے جاؤ۔" میں نے دراز سے خان مرحوم کا کارڈ نکال کر اُسے دے دیا۔ جب وہ اٹھا تو میں نے اُس کا رول اور میز پر ڈال دیا۔

"نہیں، خرم! وہ نفی میں سر ہلاتا ہوا چل پڑا۔ "میری نشانی اپنے پاس رکھ لو۔ ہو سکتا ہے میں اپنا وعدہ نہ نبھاسکوں، کم از کم تم اس رول پر سے میرے بھائی کا انتقام لے سکتے ہو۔"

جب اسٹین گن، اکبر خان نے اُس کے ساتھی کو واپس کی تو میں نے بھی گردن جھکا لی تھی۔ میں اپنے اندر عجیب سی طمانیت اور سرشاری محسوس کرنے لگا تھا۔ وہ اپنے جسم سلامت لے گئے تھے لیکن وہ بہت کچھ میرے قدموں میں ڈال گئے تھے۔ دندنگی اور دشمنی وہ ساتھ نہ لے جاسکے تھے۔ یہی میری جیت تھی۔ میں نے دو درندوں کو انسانیت کا روپ دے دیا تھا۔ جب وہ اندر داخل ہوئے تھے تو میرے دم و گمان میں بھی نہ تھا کہ اُن کا تعلق مظفر چوہدری سے ہو گا۔ میرا خیال تھا کہ وہ میرے مشن کے دشمن اور ملک نواز کے سلسلے کی کڑیاں ہوں گے۔ وہی لوگ ہوں گے جن کی وجہ سے بیگن نے اپنا ہیڈ کوارٹر چھوڑ دیا تھا لیکن انہوں نے خود کو ظاہر کر کے مجھے مایوس کر دیا تھا۔ مجھے اپنی ذات کے دشمنوں کی ضرورت تھی نہ تلاش تھی۔ میں تو اُن لوگوں کو ٹریس کرنا چاہتا تھا جو میری عدم موجودگی میں اتنے طاقت ور ہو گئے تھے کہ بیگن جیسے حوصلہ مند شخص کو فرار ہونا پڑا تھا۔

میں ڈی۔ آئی۔ جی سے فراغت کے وقت ملنا چاہتا تھا۔ مگر کوئی راہ نہ پا کر ملاقات ناگزیر ہو گئی تھی۔ کیونکہ بیگن بھی اندھیرے میں تھا۔ روشنی کی کرن کے بغیر میں قدموں کو کوئی سمت دینے سے قاصر تھا اور اندھیرے میں تیر چلانے کا فیصلہ کر کے وقت اور زبردستی ہی

ضائع کر سکتا تھا۔

کونز کہیں سامنے ہی تھا۔ میں نے ہوٹل کے گیٹ سے نکل کر مخصوص استادہ کیا اور واپس اندر چلا گیا۔ دس منٹ بعد وہ ہینڈا ہوا اندر داخل ہوا۔ "نگرانی کی کیا پوزیشن ہے، کونز؟ میں نے پوچھا۔ "چاروں، ایک سوزوکی دین میں بیٹھ کر چلے گئے ہیں، چیف؟ کونز نے متحیرانہ انداز میں بتایا، میں تو منتظر تھا کہ لائیشیں ٹھکانے لگانا پڑیں گی۔"

"کبھی کبھی ایسا بھی ہو جاتا ہے، دوست! میں نے کہا۔ "اچھا، تم ہارون کو لے کر نئے ہیڈ کوارٹر میں چلو۔ میں، ڈی۔ آئی۔ جی صاحب سے ملنے جا رہا ہوں۔ واپسی ہوٹل ہی میں ہوگی۔ تم ہارون کو چھوڑ کر یہاں میرا انتظار کرنا۔"

ڈی۔ آئی۔ جی صاحب نے اطلاع پلٹے ہی ملاقاتی اعلیٰ افسران کو ڈینٹنگ روم میں بھیج دیا اور مجھے لینے دروازے تک چلے آئے تھے۔ ایسے ہی طے تھے جیسے برسوں کے بعد باپ بیٹے سے مل رہا ہو۔ ہاتھوں میں لیے وہ میز تک گئے اور مجھے گہری پرہیزگار خود گھوم کر اپنی گہری پرہیزگاری سے

"سنو، ہمارا دوست بھی بلا؟" وہ فائل ٹرے میں رکھ کر پوچھنے لگے۔ "بے تاج بادشاہ جلا وطنی کی زندگی کیسے گزار رہا ہے؟" میں نے اپنی کارروائی تفصیل سے سنائی۔ "ایک اطلاع یہ بھی ہے کہ وہ سرحد عبور کر گیا ہے۔"

"چلیے، اچھا ہوا، جس کم، میرے وطن کی سرزمین پاک۔" میں نے بے پروائی سے کہا۔ "میرے بس میں ہو تو ایسے تمام لوگوں کو دھکیل کر اپنے ملک کی سرحدوں سے باہر نکال دوں۔ باہر جا کر ایسے لوگ صرف بھیک ہی مانگ سکتے ہیں۔"

"ہاں، دوسرے لوگ شاید۔ لیکن ملک نواز کے ہاتھ بہت دور تک پھیلے ہوئے ہیں۔" ڈی۔ آئی۔ جی صاحب آگے جھک کر بولنے لگے۔ "وہ باہر جا کر بھیک نہیں مانگے گا بلکہ کچھ اور ہاتھوں کو یہاں بھیجے گا جو یہاں اگر ہماری قوم کی خبریں سنیں گے۔ میرا خیال ہے کچھ لوگ آج بھی چکے ہیں۔"

"میں ان ہی لوگوں کے بارے میں آپ سے بات کرنے آیا ہوں، سر! میں نے کہا۔"

"اگر میں ذاتی طور پر کچھ ہوں گا تو ڈرتا ہوں، تم میرا نام بھی اسی فہرست میں درج کر لو گے۔" انھوں نے خاموش ہو کر میری آنکھوں میں جھانکا۔ پھر گہری سانس لے کر نیشٹ گاہ سے لگ کر بولے۔ "نہ جانتے کیوں تمھارے لیے میرے جذبات اور طرح کے ہو گئے ہیں۔"

اگر اس فیصلہ میں میرا سگایا ہوتا تو میں اُسے ہی مشورہ دیتا... کہ میرے بیٹے، زندگی اتنی اذراں نہیں ہے کہ اُسے جذبوں پر قربان کر دیا جائے۔ لیکن تم نہیں سمجھو گے، خرم سلطان! اس لیے کہ تمھارے اندر ابھی خون گرم ہے اور تمھاری آنکھوں نے ابھی کچھ نہیں دیکھا۔ تم نے کتابوں میں انسانیت کا منشور پڑھا ہے نہیں معلوم، جب کوئی سرور مرنے والا ہے تو یہ قوم صرف چند دنوں کے لیے اُسے یاد رکھتی ہے اور تم تو ایسے سرور ہو جسے صرف چند مخصوص لوگ جانتے ہیں۔ خدا خواست ایسا وقت آگیا تو وہ مجبور یوں کی دیوار پھانسی کر تمھارے جنازے میں بھی شرکت نہ کر سکیں گے۔ کیا میں اپنی بات تمھیں سمجھا سکا ہوں؟"

"میں صرف اتنا ہی سمجھ سکا ہوں، جناب! میں نے میز کی شفاف سطح پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ "ایک اعلیٰ آفیسر اپنی کسی مجبوری کو پیار اور ہمدردی کا شوگر کوٹ دے رہا ہے۔ تمہید کی ضرورت نہ تھی، سر! آپ پہلے بھی مجھے اس راہ سے ہٹانے کی نرم نرم کوشش کر چکے ہیں۔ ہاں، پہلے آپ کا رویہ حاکنانہ ہوتا تھا اب اُس رویے کو آپ نے شفقت کی شھاس دے دی ہے۔ آپ صاف صاف بتادیں کہ اب کس کوارٹر سے نئی ہدایات آئی ہیں؟"

"مجھے یقین تھا، میں ڈر رہا تھا کہ تم میری ذات ہی کو رگیدو گے۔ وہ خاموش ہو کر خود کو پرسکون کرنے لگے۔ میری باتوں کی کڑواہٹ ہی ایسی تھی۔ اگر ان کی جگہ کوئی جذباتی آفیسر ہوتا تو ساری کڑواہٹ مجھ پر آلت دیتا لیکن وہ اپنے عہدے کے برعکس نہایت ہی ٹھنڈے مزاج کے حامل تھے۔ بخدا اس بار مجھے اوپر سے ایسی کوئی ہدایت نہیں ملی لیکن میرے اپنے ذرائع ہیں، میں نے تمھارے لیے... اور ملک کی عزت کی خاطر اپنے طور پر کچھ معلوم کیا ہے، اُس کے پیش نظر میں نے کہا تھا بلکہ چاہتا ہوں کہ تم اگر مستقل نہیں تو کم از کم کچھ وقت کے لیے اندر گراؤنڈ چلے جاؤ، اس راہ سے ہٹ جاؤ جس پر درندوں اور خونخوار سانڈوں کے لشکر چل پڑے ہیں۔ اگر تم نے راستہ نہ چھوڑا تو مجھے خطرہ ہی نہیں بلکہ یقین ہے کہ وہ تمھیں روند ڈالیں گے۔"

"آپ اگر مجھے مختصراً اصل بات بتادیں تو فیصلہ کرنے میں آسانی ہوگی، سر!"

"ملک نواز صرف اسمگر ہی نہیں بلکہ وہ ایک جماعت کا لیڈر بھی ہے، اس کی جماعت کے کچھ لوگ ایون اقدار میں ہیں، کچھ اعلیٰ عہدوں پر ہیں اور بے شمار ممتاز برنس مین ہیں۔ اب کل صبح ایک فائبر اسٹار ہوٹل میں ان کی میٹنگ ہے۔ اس میٹنگ کی نعرہ زوال لاہور کی ایک با اثر خاتون شہناز ہے۔ وہ درپردہ ملک نواز

کی شکوہ بتاتی جاتی ہے۔ اُس نے تم سے نمٹنے کی ذمہ داری قبول کر لی ہے۔ دوسرے لوگوں نے اُسے تمام ذرائع سے تعاون دینے کا یقین دلایا ہے۔ شہناز نے ایک پڑوسی ملک کے سفارت خانے سے بھی رابطہ قائم کر لیا ہے۔ اب مودتِ حال یہ ہے، میرے بیٹے! کڑین گروپ میدان میں اُترے ہوئے ہیں۔ شہناز کے گڑ گے... پولیس اور غیر ملکی ایجنٹس... اور ان مینوں کا ہدف صرف تم ہو۔" تو آپ چاہتے ہیں کہ خرم سلطان اس میدان سے بھاگ جائے۔ میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

"لفظ بھاگ جانا، تم نے غلط استعمال کیا ہے، سز بزم، وہ شاکی لہجے میں بولے۔ "معاذے بوقتِ ضرورت پیچھے ہٹنے کو بھاگ جانا نہیں کہا جاتا۔"

"شکریہ، سر! میرے لبوں پر پہلی بار مسکراہٹ ابھری۔ میں آپ کے مشفقانہ مشورے پر ضرور عمل کروں گا۔ میں جنگی چال بدل ڈالوں گا۔"

"میں بھی یہی چاہتا ہوں، بیٹے! وہ خوش ہو گئے۔ بس کچھ دنوں کے لیے اپنی تمام سرگرمیاں ترک کر دو۔ جب وہ تلاش سے مایوس ہو کر لوٹ جائیں تو پھر اپنی پسند کا محاذ کھول لیتا۔"

"آپ کا تعلق پنجاب سے ہے نا، سر؟" میں نے مؤدب انداز میں پوچھا۔

"ہاں... انھوں نے آنکھوں ہی آنکھوں میں اقرار کیا: کیوں؟" "ہمارے ہاں بچے ایک کھیل کھیتے ہیں، لیکن مٹی، مٹی تو ہے لاکھیل جسے پوٹھواریں چھین چھوت کہا جاتا ہے۔ اس کھیل میں ایک بچہ چھپ جاتا ہے اور باقی اُسے تلاش کرتے ہیں۔ وہ سب کی نظروں سے بچتا ہوا مقررہ جگہ کو دور کر چھو لیتا ہے، اس طرح وہ نہایت بازی جیت لیتا ہے۔ میں بھی وہی کھیل کھیلوں گا۔ وہ بچے تلاش کر رہے ہیں اور میں کوشش کروں گا کہ اپنی کمین گاہ سے اس کو مقررہ پوائنٹ چھو کر پھر چھپ جایا کروں، بچوں کا پوائنٹ، کسی دیوار کا حصہ ہوتا ہے، جبکہ میرا پوائنٹ، مادام شہناز کا کوئی نہ کوئی کڑا ہوا کرے گا۔"

"تمھارے بارے میں... وہ ایک دم بھڑک اُٹھے۔ بالکل ٹھیک کہا جاتا ہے، تم خون آشام درندے ہو۔ میں تمھیں سلامتی کی راہ پر لے رہا ہوں اور تم گھوم پھر کر درندگی کی راہ پر چلنا چاہتے ہو۔"

"گستاخی، معاف، جناب عالی! میرا بھج بھی کرخت اور سرد ہو گیا۔ آپ بزدلی اور فرض ناشناسی کی راہ تجویز کر رہے ہیں۔ جو لوگ میدان میں مصروف عمل ہیں، وہ کون ہیں؟ ان کا تعلق کس گروہ



سے ہے اور ان کا مقصد کیا ہے؟ وہ خرم سلطان کو نہیں مارنا چاہتے بلکہ اُس کو شش، اُس مہر اور اُس مشن کو تباہ کرنا چاہتے ہیں جو اس ملک کو منشیات کی لعنت سے پاک کرنے کا عزم رکھتے ہیں۔ موت سے ڈر کر انھیں راستہ دینے کا مطلب یہ ہوگا کہ خرم سلطان نہیں بلکہ حکومت اور قانون کے محافظ بس ہو چکے ہیں۔ خاموشی شکست کا اعتراف ہوگا۔ میں اپنی جان کی خاطر لاکھوں انسانوں کو ان درندوں کے رحم و کرم پر نہیں چھوڑوں گا، سر!

پھر پرائم منسٹر صاحب سے مل لو: ڈی آئی جی نے قدمے نرم لہجے میں مشورہ دیا۔ ان سے درخواست کرو مادام شہناز کوئی الفور گرفتار کر لیا جائے اور اس کے گردہ پر ریڈ کیا جائے۔ ہتھیار مقصد بھی پورا ہو جائے گا اور زندہ بھی رہے گا۔

"کیا کبھی سیاسی جماعت کی مخالفت مول لے میں گئے مرنے؟" متحیر اداروں سے کام لے سکتے ہیں:

"آپ اپنے معتبر اور قابل امتداد ذرائع اگر میرے حوالے کر دیں تو میں شہناز کو بھی خاندان کے پیچھے جانے پر مجبور کر دوں گا، دوہرا

لڑائی میں فورس ناگزیر ہوتی ہے مگر جبکہ میں گوریلا جنگ لڑوں گا۔ آپ کے ذرائع صرف تلاش کریں گے اور میں اندھیرے کی آڑ میں صرف کا حلق چھیدا کر دوں گا؟

”نہیں میرے عزیز۔ وہ طویل سانس لے کر پھر کسی پر پھیل گئے۔ مجھے تو اپنی ذات پر بھی بھروسہ نہیں رہا۔ میرے ذرائع بھی پولیس پر مشتمل ہیں اگر کالا خان ایک سکتا ہے تو کل کوئی بڑا سوداگر منتر خان کو بھی خریدے گا۔ ایسی صورت میں وہ لوگ اندھیرے کے تیر بن سکتے ہیں، تم صرف مجھ تک محدود رہو گے۔ میں انہیں چلاؤں گا اور تم مجھ سے ہدایات لو گے۔“

”بہتر سر میں نے براہِ چوری سر نکھایا تھا کیونکہ مگر مجھ سے ہیر ڈال کر میں حالات کا سمندر عبور نہیں کر سکتا تھا۔ مجھے احساس تھا کہ بالآخر انھوں نے گھیر کر مجھے اپنی ماتحتی میں لے لیا ہے جو مجھے پسند نہ تھی اور نہ ہی میرے مشن میں کسی پولیس آفیسر کی گنجائش تھی۔ شہناز نے اپنا عارضی ہیڈ کوارٹر اسلام آباد میں بنایا ہے۔ وہ بتانے لگے: ”آج شام تک اس کا ٹھکانا معلوم کر لوں گا پھر ہم اس پر نگران آٹھیں بٹھا دیں گے۔“

”میں عارضی ہیڈ کوارٹر ہوٹل میں رکھوں گا۔ میں نے کہا۔ میں اپنے غیر ملکی ساتھیوں کو انڈیا گراؤنڈ بھیج دوں گا۔ صرف ہارون اور رشیدہ کو اپنے ساتھ چلاؤں گا، وہ لوگ زبان اور رنگ کی وجہ سے بہت جلد ننگا ہوں میں آجاتے ہیں۔“

”ان کے لیے ایک تجویز ہے؟“

”وہ لوگ سیار بن کر صوبہ سرحد میں پہلائی کے راستوں کی نگرانی کر سکتے ہیں۔“

”بہترین تجویز ہے سر۔ میں نے تائیدی لبھے میں کہا: اگر ہم ادھر ہی اٹھے رہے تو پہلائی کے راستے پھر کھل جائیں گے۔ کوئٹہ، ہارکن اور منٹ کو ادھر بھیجا جاسکتا ہے اور بیگن یہاں رہ کر ان سے رابطہ رکھے گا۔“

”بس ٹھیک ہے، تم یہ کام کر لو۔ وہ اٹھتے ہوئے بولے۔ مجھے ایک مینگ میں جانا ہے۔ میرے ساتھ چلو تمہیں ڈراپ کر کے نکل جاؤں گا۔“

جب میں ہوٹل میں داخل ہوا ہارون کے بارے میں اکبر نے بتایا کہ اس نے جانے سے انکار کر دیا ہے اور اوپر کمرے میں چلا گیا ہے۔ میں بھی رات کا مارا ہوا تھا آنکھوں میں زیندیل رہی تھی اور بدن بھی دکھ رہا تھا۔ فوری کوئی کام نہ تھا اس لیے اکبر خان سے ایک

کرا کھلو اگر میں بھی سو گیا تھا۔ رات دس بجے باب آنکھ کھلی تو ہسلی نظر ہنٹ پر جا پڑی جو کرسی پر بیٹھا مگر تین کی ورق گردانی کرتے ہوئے نہ جانے کب سے میری بیداری کا انتظار کر رہا تھا۔

”کب آنے ہو پیارے؟ میں نے انگریزی لیتے ہوئے پوچھا۔“

”جنگا لیتے مجھے۔“

”میں آیا نہیں چیف۔ ہنٹ نے جواب دیا: ماسٹر نے میری ڈیوٹی ادھر لگا رکھی ہے۔ ساتھ کمرے میں تھا: میں اس کے بھولے محلے جواب پر ہنس پڑا۔ بیگن نے اس کی ڈیوٹی کمرے میں یقیناً لگائی ہوئی لیکن میں نے اس سے کچھ نہ پوچھا۔ ماسٹر نے آپ کو یاد کیا ہے چیف؟

”ان کا فون نمبر ہے تمہارے پاس؟“

”نہیں، وہاں ابھی شاید فون لگا نہیں۔ ماسٹر نے ٹرانسمیٹر عبادت کی ہے۔“

”ماسٹر کو کال کرو۔ میں جوتے پہننے لگا اور ہنٹ ٹرانسمیٹر پر بیگن کو کال کرنے لگا۔ جب وہ رابطے پر آیا تو ہنٹ نے ٹرانسمیٹر بیٹ تپائی پر سیکر سامنے رکھ دیا۔“

”جو نواز اور ہارکن کہاں ہیں ماسٹر؟ میں نے جھجک کر پوچھا۔“

”یہاں بیچپیوں کی وجہ سے ان کی گنجائش نہ تھی۔ وہ ایک ہوٹل میں مقیم ہیں۔ بیگن نے بتایا۔“

”صبح ٹھینہ وغیرہ کو کالج پہنچا کر آپ تمام ساتھیوں کے ساتھ ہوٹل میں مجھ سے مل لیں۔“

”کیا رشیدہ بھی؟“

”ہاں، اگر وہ فزیکلی فٹ ہے تو؟“

”آپ نہیں آ رہے کیا؟“

”اگر وہاں گنجائش نہیں ہے تو فرش پر سونے سے یہاں کے گولڈسٹر بہتر ہیں انکل۔“

”گنجائش دلوں میں ہوتی چاہیے اور میں دلوث سے کہہ سکتا ہوں تمہارے لیے یہاں سب کے دل گداز ہیں۔“

”ہاں یقین تو مجھے بھی ہے لیکن میں نہیں آسکتا۔ حالات خراب ہیں ماسٹر۔ ہمیں اب لائن آف ایکشن تبدیل کرنا ہوتی، سنا ہے تین شکادی پارٹیاں انسانوں کے جنگل میں ہمیں تلاش کر رہی ہیں۔ ہمارا سابقہ ہیڈ کوارٹر ان کی نگاہوں میں آگیا تھا۔ اس لیے بڑے صاحب نے آپ کو وہاں سے ہٹا دیا ہے۔“

”وہ کون لوگ ہیں چیف؟ بیگن نے پوچش آواز میں

پوچھا: ان کا تعلق کس گروہ سے ہے؟

”وہی لوگ ہیں ماسٹر۔ بس کچھ چہرے بدل گئے ہیں اور یہی ہمارے لیے پریشانی کا سبب ہے۔ ہمیں اب نئے انداز سے پہلے نصاب نوپنے ہوں گے۔ ہو سکتا ہے جو میرا اقتدار پردہ دار بھی ہوں۔“

”کھل کر بات نہیں کرو گے خرم سلطان؟ بیگن کا لہجہ شکی ہونے لگا۔“

”سنو چیف باب میں یہاں آیا تھا تو تمہارے ملک کے سربراہ نے مجھ سے کہا تھا بلکہ وعدہ کیا تھا کہ اگر مجھ کو ان کا بھائی بیٹا بھی ہوگا تو حکومت اسے پناہ نہیں دے گی۔ مجھے بتاؤ میں ان سے ملوں گا۔ انہیں وعدہ نبھانا ہوگا۔ بصورت دیگر میں اپنی حکومت سے مندر کرنے واپس چلا جاؤں گا۔ مجھے ادھر پڑھیاں بجانے نہیں بھیجا گیا تھا میرے ذمے ایک اہم فرض کیا گیا تھا۔ آپ کو ادھر رہنا ہے شاید اس لیے آپ بڑے مگر جموں سے دشمنی پسند نہ کریں۔ مگر میرے ساتھ ایسی کوئی مجبوری نہیں ہے۔ گستاخی ہوگی مگر کہہ دوں کہ اگر آپ کوئی رکاوٹ محسوس کرتے ہیں تو صرف کا نڈر بن جائیں فیڈ ہمارے حوالے کر دیں ہم آپ کی ہدایت پر ہتھ پاؤں کھول کر کام کریں گے۔“

”کچھ مہلت دو ماسٹر۔ میں نے ٹھہرے انداز میں کہا: اگر کسی ایسی مجبوری نے میرا ہتھ جکڑ لیا تو میں الگ ہو جاؤں گا۔“

”بیگن وضاحتیں چاہتا تھا لیکن میں ٹرانسمیٹر پر وضاحت نہیں کر سکتا تھا۔ اسے ابھن میں ہی چھوڑ کر سب میں اور ہنٹ سچے اترے تو پہلی نظر اپنی ذمہ کے شر پر جا پڑی۔ سادری کوٹ اور پریشانی دور ہو گئی، ہارون کے ساتھ فرید خان بیٹھا چائے پی رہا تھا اور اکبر خان مستعدی سے نگرانی کر رہا تھا۔ فرید خان نے انکل پل پر جو بند باقی وعدہ کیا تھا وہ بھاگ میں نہیں بھول گیا تھا۔ ویسے بھی بند باقی فیصلے دیر پا نہیں ہوا کرتے۔ مجھے توقع ہی نہ تھی کہ ایک ایسی اسمگلر اپنا وعدہ ایسا کرے گا۔ میں نے اسے تب تھوڑی دیر کے لیے یاد کیا تھا اور خدا سے مانگا تھا سب ڈی آئی جی نے رسد کا راستہ روکنے کی تجویز پیش کی تھی۔ اس مشن کے لیے فرید خان، نوزل ترین شخص تھا۔“

فرید خان چونکہ ترچھا بیٹھا ہوا تھا اس لیے مجھے نہ دیکھ سکا تھا۔ ہارون نے سب مجھے دیکھ کر تعظیماً کسی چھوڑی تو فرید خان نے چہرہ گھمایا اور پھر وہ اچھل کر اٹھا پیالی سے چائے چھٹک گئی تھی۔ ہارون نے اس کے ہاتھ سے پیالی لے کر میز پر رکھ دی۔ فرید خان پہلے دار فنگی کے عالم میں آگے بڑھا پھر نہ جانے کیوں ایک دم ہلک گیا اور گردن جھکا کر کھڑا ہو گیا۔ میں نے آگے



ایک انتہائی دولت مند لڑکی کی شادی ایک اُسے ہی دولت مند لڑکے سے ہو رہی تھی۔ تقریب کے فوراً بعد فوٹو گرافروں اور رپورٹروں نے نئے جوڑے کو گھیر لیا کسی دل جلے نے یہ سوال بھی کر ڈالا: ”طلاق کے بارے میں کیا خیال ہے آپ کا مسٹر جوائنٹ؟“

”طلاق۔ زندگی میں ایک بار ضرور لینی چاہیے۔ لڑکی نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔“

بڑھ کر جب اسے ہاتھوں میں یا تو تڑپ کر لیٹ گیا۔

”نہیں ٹھہر سکا ادھر بھائی۔ وہ ٹھہرتی ہوئی آواز میں بولا۔ ہم نے کالا جادو کر دیا ہے۔“

”محبت کا جادو کالا نہیں ہوتا فرید خان! میں نے اس کی چوڑی پشت سہلاتے ہوئے جواب دیا۔ میں انھیں بہت یاد کر رہا تھا میری محبت کی طلب ہی تمہیں یہاں کھینچ کر لاتی ہے۔“

”میں نے گھر جا کر اپنی ڈائری دیکھی: وہ بولا: ”بہت حیران ہوا۔ بہت خوش ہوا جو تمہارے بولا تھا وہ رنگ باز خان کا تھا۔ ہم تو ادھر بہت دفعہ آیا، خان سے ہمارا بزنس تھا۔ یہ کیا معاملہ ہے بھائی تم اور خان ایک کیسے ہے؟“

”ایسے ہی جیسے اب فرید خان اور خرم سلطان کا سلسلہ مل کر ایک ہو گیا ہے۔“

”بالکل ایک: فرید خان رہنے لگا۔“

”اکبر! میرے بھائی کے لیے اوپر ایک کمر ٹھیک کرادو۔ میں نے ہارون کو اشارہ کیا اور فرید خان کو ساتھ لے کر انس میں جا بیٹھا۔ اور مادام شہناز کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کے لیے ڈی آئی جی کا نمبر ڈائل کیا۔ نمبر مصروف تھا اس لیے فرید خان سے باتیں کرنے لگا۔ چونکہ مجھے ڈی آئی جی کی تجویز مجھے بڑی پسند آئی تھی اور میں کونزہ ہنٹ اور ہارکن کو ادھر بھیجنے کا فیصلہ کر چکا تھا اس لیے فرید خان کا مادام معلوم کرنا ضروری تھا۔“

”فرید خان کچھ تو میں نے تمہیں بتا دیا تھا اور باقی بتا دوں گا۔ لیکن پہلے میں تمہاری دلی رائے معلوم کرنا چاہوں گا۔ ہم اس جہاد میں اللہ کی خوشنودی پاک وطن کے وقار اور انسانیت کی بھلائی کی خاطر شامل ہونا پسند کر دو گے؟“

”دل و جان سے براہِ سرسبز فرید خان نے سینے پر ہاتھ رکھ کر جواب دیا: ”اگر کوئی کافر کو بولے کہ بھائی جنت میں جانا چاہتے ہو تو وہ کیا بولے گا۔ ہم بھی کافر کے موافق گنہگار آدمی ہے۔ بھائی صاحب

تم نے ضرب نہیں لگائی بس پیار کی مار دی ہے۔ تم جہد ہر اشارہ کرے گا وہاں رکھنے کی طرح تیرا بھائی دوڑے گا۔

ٹیلی فون کی گھنٹی بجنے لگی تو میں نے رسیوور اٹھالیا۔ جی فریڈ نے میں نے آواز بدل کر کہا: یہ رگ رنگ ہو رہی ہے۔

میں ڈی آئی جی بول رہا ہوں اگر خرم سلطان ہیں تو بات کروائیں؟

اسلام علیکم سر: میں نے محبوب اصل آواز میں کہا: میں ٹولی کر رہا تھا۔ آپ کا غیر مصروف تھا۔

ہاں میں جنرل صاحب سے بات کر رہا تھا: انہوں نے بتایا۔

”تمہارے لیے وہ بھی بے حد پریشان ہیں اور مجھے کہہ رہے تھے کہ لڑکے کو کچھ دنوں کے لیے پناہ میں لے لوں۔ وہی بات میں تم سے کر چکا ہوں۔ خیر چھوڑو اس عورت کا ایڈریس نوٹ کر لو۔ اور ایک وعدہ کرو تو ختم احتیاط رہو گے۔ اس نے اپنی کوشی کے گرد نگرانی کا مضبوط انتظام کر رکھا ہے۔ اس کی کوشی کے سامنے سی ڈی اے

کا ایک کیمین ہے جو منہ مانگا معاوضہ دے کر آج حاصل کر لیا گیا ہے وہاں جتنے آدمی ہوں گے وہ کوشی کی نگرانی کریں گے کچھ ٹیفیہ جال بھی بچھائے ہوں گے اس نے۔

میں آپ کی ہدایات پر عمل کروں گا سر میں نے جواب دیا۔

”کیونکہ مجھے اپنی سلامتی ملک کی خاطر عزیز ہے۔“

”یہ شک تمہاری سلامتی قوم کے لیے مفید ہے۔ پھر انہوں نے مجھے کوشی کا محل وقوع اور نمبر بتایا۔ میں نے ٹیبل ڈائری پر تمام کوائف نوٹ کر کے ورق پھاڑ لیا۔

”سر میں نے نتیجہ انداز میں کہا: میں ان ذہریلے تیروں کی نشاندہی جی درخواست کروں گا جو اس وقت حکومت کے ترکش میں اور جن کی ہمدردیاں مادام کے ساتھ ہیں۔ میں مادام کے پیشہ ور خندوں سے نمٹ لوں گا مگر وہ لوگ مجھے پریشان کر سکتے ہیں۔

”ابھی نہیں بیٹے: وہ مندرقی آواز میں بولے: یہ نہ سمجھنا کہ میں ان سے ڈرتا ہوں یا ان کی پشت پناہی کر رہا ہوں۔ دراصل ابھی وہ لوگ گھل کر سامنے نہیں آ رہے۔ انہیں میدان میں آنے دو۔ وہ جوں جوں اپنی شناخت کروائیں گے میں ایک ایک چہرہ تمہارے سامنے کرتا رہوں گا۔

”شکریہ سر: میں نے شکریہ ادا کیا اور انہوں نے دعاؤں کے ساتھ سلسلہ توڑ دیا۔

”کیا ادھر کوئی گروہ بڑھ رہا ہے بھائی؟ فریڈ خان نے پوچھا۔ اگر کوئی خطرہ ہے تو بولو ہم نے بھی کوئی گولی ضائع نہیں ہونے دی۔“

”گروہ بڑا دھرم نہیں فریڈ خان: میں نے بتایا۔ ساری گروہ بڑا دھرم سے آ رہی ہے جہد ملک نواز چھپا بیٹھا ہے۔“

”تو ہم کو بولو تا بھائی؟ فریڈ خان پرجوش لہجے میں بولا۔

”اگر وہ جہد خان کی بغل میں ہو گا تو بھی فریڈ خان کی گولی ضائع نہیں ہوگی۔“

”فریڈ خان: میں نے محبت پاش لگا ہوں سے دیکھتے ہوئے گرم لوہے پر ضرب لگائی: ملک نواز غودا دھرم سے بھی کھسک گیا ہے۔ سرحد عبور کر گیا ہے لیکن اس کے آدمی ادھر سے مل لا رہے ہیں اور مجھے مصروف رکھنے کے لیے یہاں ایک عورت سرگرم ہے تاکہ میں ادھر اچھا رہوں اور ملک نواز دور پیٹھ کر برس کر رہا ہے۔

”ہمارے لیے کام بولو تو تم سلطان: اس نے میز پر ہاتھ مارا۔

”ہم ان کے لیے آگ کی دیوار بن جائے گا۔“

”فریڈ خان: دو دن آرام کرو تم تنہا نہیں ہو گے تمہارا ساتھ میں آدمی لگائے جائیں گے۔“

”نہیں ہم اکیلا ان پر بھاری پڑے گا۔ فریڈ خان کے ساتھ بہت لوگ ہیں۔“

”ٹھیک ہے فریڈ خان: میں نے اس کی گلانی پر تھپکی دی۔

”لیکن ہم کھلے میدان میں سلطان جنگ نہیں کریں گے۔ اس طرح وہ لوگ محتاط ہو کر متبادل راستے تلاش کریں گے۔ میرے پاس تین انجمن ہیں۔ وہ لوگ سیر و تفریح کے لیے ادھر جائیں گے اور تم ان کے گائیڈ بنو گے۔ تم لوگوں کو کیا کرنا ہوگا یہ وقت روانگی بتا دوں گا۔“

صبح نو بجے اکبر خان نے بیگن کی آمد کی اطلاع دی۔ اس وقت فریڈ خان اور ہارون میرے کمرے میں موجود تھے مگر رشیدہ پر وہ دار نہ تھی لیکن کوئی جذبہ فریڈ خان کی موجودگی برداشت نہیں کر رہا تھا۔

”یہ میری بنیادی تربیت ہی ایسی تھی، میرا گھر انہوں میں بھی پردے کے معاملے میں سخت غیر تھا۔ میری ماں کے بارے میں مشہور ہے کہ انہوں نے حویلی سے باہر کبھی قدم نہیں رکھا۔“

”فریڈ خان: میری آواز میں مندرت کا رنگ نمایاں تھا۔

”ایک پارٹی سے ملاقات طے ہے جس کے ساتھ ایک خاتون بھی ہے۔ تم اپنے کمرے میں جاؤ میں فارغ ہو کر تمہارے کمرے میں آ جاؤں گا۔“

فریڈ خان بہت اچھا کہتا ہوا اٹھا اور میں نے بیگن کو اذیت نہ دلایا۔ اس کے ساتھ صرف رشیدہ اور آئی تھی۔ وہ اندر داخل ہوئے تو میں نے آگے بڑھ کر بیگن سے مصافحہ کیا اور رشیدہ کے سر کی طرف ہاتھ بڑھائے مگر رشیدہ نے انہیں راستے ہی میں اچکایا اور میرے ہاتھ اپنی آنکھوں سے لگا کر اس طرح سسکیاں بھرنے لگی

”جیسے کوئی بہن منکوں بعد اپنے بھائی سے مل رہی ہو۔ میری آنکھیں بھی بھیگ گئی تھیں۔ وہ رشتے جو روحانی ہوتے ہیں بعض اوقات خون کے رشتوں سے بھی پیارے ہو جاتے ہیں۔“

ہارون نے اپنی آنکھوں کا بھرم قائم رکھنے کے لیے ہاتھ روم کا سہارا لیا تھا۔ جب وہ باہر آیا تو رشیدہ جذباتی دباؤ سے آزاد ہو چکی تھی

دونوں نے ہم دونوں کے ساتھ انداز میں ادائیگی تھی۔ یہی فرق مجھ میں اور ہارون میں تھا اس نے رشیدہ کو ایک مرد کی نگاہوں سے پسند کیا تھا۔ جبکہ میری سوچ نے نگاہوں کو دوسرا زاویہ دے دیا تھا۔

”تمہیں یاد ہے رشیدہ بیگم: دس پندرہ منٹ ادھر ادھر کی باتوں کے بعد جب رشیدہ حسب عادت زندہ دلی کا مظاہرہ کرنے لگی تو میں مطلب کی طرف متوجہ ہوئے بولا: شروع میں تم نے میرے ساتھ نیلے میں کام کرنے کی خواہش ظاہر کی تھی اور میں نے نال دیا تھا لیکن اب وقت کا تقاضا تمہیں پکارنے لگا ہے۔ کیا تم خود کو نوٹ سمجھتی ہو؟

”جی ہاں: رشیدہ نے اثبات میں آنکھوں کو پچھلایا۔ آپ کے ساتھ تو آگ کے ساتھ دو یا بی بی عبور کر سکتی ہوں۔“

”کبھی تم نے مادام شہناز کا نام سنا تھا؟“

”لاہور والی...؟ رشیدہ نے چونک کر پوچھا۔

”ہاں وہی؟“

”نام ہی نہیں ملاقات بھی رہی ہے۔ وہ جب کبھی ادھر آتی تھی تو سیماں کے ہاں قیام کرتی تھی۔“

”یہ خبر میرے لیے دل خوش کن ہے: میں واقعی خوش ہوا تھا۔

”بلنگ میں آسانی ہو گئی تھی۔“

”اس کی ہمدردی اور پناہ حاصل کر لو گی نا؟“

”پہلے کام بتائیں: رشیدہ مسکراتے ہوئے کہتی تھی۔“

”وہ ملک نواز کا انتقام لینے میدان میں اتر آئی ہے: میں نے اسے تفصیل سے سب کچھ بتا دیا۔ وہ دوران گفتگو بالوں میں اٹھکیاں اٹھاتی رہی تھی۔ جب میں خاموش ہوا تو ہر بار ہجے میں بولی۔۔۔

”ٹھیک ہے۔ میں اسے شیٹے میں اٹار لوں گی لیکن اس تک پہنچانا آپ کا کام ہے۔ اگر میں براہ راست گئی تو وہ کچھ اور بھی سوچ سکتی ہے۔“

”تم آج ماٹھر کے ساتھ لاہور کے لیے روانہ ہو جاؤ: میں نے ایک فوری ٹیلی فون کیا دیتے ہوئے کہا: اس کے برس آفس میں آنا، جب تم پیشی اور سابقہ تعلق کا حوالہ دو گی تو مادام کو تمہارے بارے میں ضرور اطلاع کر دی جائے گی۔ میرا خیال ہے وہ ان حالات

کا نمبر جیسی لڑکی کو فورا بولو گئی؟

”یہ کام فون پر بھی تو ہو سکتا ہے: رشیدہ نے جواب دیا: میں ان سے رابطے کا ذریعہ معلوم کر لوں گی۔“

”کوشش کر دیتے ہیں: میں نے نیم رضامندی سے کہا اور آفس میں ماکروڈی آئی جی کو فون کیا جنرل صاحب نے بھی پہلے ہی مشورہ دیا جو

ان مساویں مجھے دے چکا تھا۔ میں نے اسے بھی دہی جواب دیا جو

”کی آئی جی کو کھانا انہوں نے ہولڈر رکھنے کا کہا پھر تین چار منٹ بعد مجھے میڈم شہناز کے برس مینجر نزاکت علی کا نمبر بتا دیا گیا تھا۔ میں نے نمبر ڈائل کر کے رسیور رشیدہ کے ہاتھ میں دے دیا۔

”اسلام علیکم سر: رشیدہ نے لوج دار آواز میں کہا: میں پنڈی سے رشیدہ بول رہی ہوں۔ سیماں سیٹھ کی پرسنل سیکرٹری، مادام سے بات کر دیتے ہیں... وہ نہیں ہیں... نیٹے سر میں خطرے میں ہوں۔

”وہی ذمہ تعاقب میں ہے جس نے یہاں تباہی مچا رکھی ہے... جی ہاں سر میں اسی خرم پروردی کی بات کر رہی ہوں۔ میرے پاس مادام کے لیے کچھ اہم اطلاعات ہیں اور مجھے ان کی پناہ چاہیے۔ میں کئی دنوں سے ایک ہوٹل میں ڈبکی ہوئی ہوں... شکریہ سر۔“

”رشیدہ نے آنکھ دبا کر اشارہ دیا پھر ٹیبل ڈائری اور قلم کے لیے ہاتھ بڑھالیا۔ ہارون نے۔۔۔ اپنی پاکٹ ڈائری اور قلم اسے دے دیا۔

”ابھی نہیں: مادام کا ٹیلی فون نمبر نوٹ کر کے جب رشیدہ نے استقامی نگاہوں سے دیکھا تو میں اٹھ کھڑا ہوا: میں کاؤنٹر والے

سیٹ پر جا رہا ہوں، تمہارے درمیان ہونے والی گفتگو سنوں گا۔

مگر وہ مشکل سے مشکل شرائط رکھے تب بھی بلا حیل و حجت مان لینا: کاؤنٹر کے سیٹ کا لیبیور کان سے لگایا۔ دوسری گھنٹی پر ادھر سے ایسی آواز ابھری تھی جیسے لوہی کا بھونکتا ہے۔ غائب

مادام کا کوئی باڈی گارڈ رہا ہوگا۔

”مادام سے بات کرنی ہے جناب: رشیدہ نے کوؤب آواز میں کہا۔

”کون ہو تم؟ پھاڑ کھانے والے لہجے میں پوچھا گیا۔

”رشیدہ۔ مادام کو سیٹھ سیماں کا حوالہ دیا جائے جناب: ایک منٹ انتظار کرو: بولنے والے لہجہ قدرے دھیمے ہو گیا تھا۔

”ہیلو رشیدہ: مہتر تم آواز ابھری: کہاں سے بول رہی ہو اور تمہیں میرا نمبر کس نے دیا ہے؟“

”جیسا تو سر صاحب کے پیچھے بھی دوڑتا ہے مادام: رشیدہ نے بھڑکی آواز میں جواب دیا: میں تو سیماں کے بندہ سسل تھو کریں کہا رہی ہوں۔ ہر طرف سے بالوں ہوتی تو معاف کی یاد کرن کی طرح ذہن میں در آئی۔

میں نے آپ کے آفس سے رابطہ قائم کیا وہاں سے یہ نمبر دیا گیا ہے: اچھا اب لو کیا چاہتی ہو؟“

”آپ کی ذات کی چہار دیواری میں پناہ کی درخواست ہے
 مادام: رشیدہ نے سسکی لی: میں سخت خطرے میں ہوں مادام!
 سلیمان کا قاتل میری تلاش میں ہے کیونکہ میں چشم دید گواہ
 ہوں۔ جب سلیمان کو قتل کیا گیا میں سلیمان کے ساتھ تھی۔ مجھے
 بھی وہ ہلاک کر گیا تھا بس ٹھوکر میں باقی تھیں سلیمان کے ساتھ
 نہ جا سکی: رشیدہ کی آواز میں ڈکھ کی سسکیاں رچی ہوئی تھیں
 کس سے خطرہ ہے اس کا نام تو بتاؤ؟ مادام نے پوچھا۔
 ”کیا آپ نہیں جانتیں مادام کہ سلیمان کا قاتل کون ہے؟
 نہیں: مادام بولی: مجھے یہی بتایا گیا تھا کہ کاروباری رقابت
 تھی وہ:“

”مادام وہ... وہ خرم چوہدری تھا ایک درندہ جس نے تمام
 اڈوں پر قبضہ کر لیا ہے۔“
 ”شکریہ لڑکی تم نے سچ بول کر میرا شک رفع کر دیا ہے۔ اچھا
 اپنی پولیشن بتاؤ:“

”میں نہان رنگ باز کے ہوٹل میں ہوں مادام:“
 ”اوہ... لیکن خرم چوہدری...“
 ”یہی تو میں نے نفسیاتی چال چلی ہے مادام: رشیدہ نے
 چپک کر مادام کی بات کاٹ دی۔
 ”تو تم جانتی ہو کہ خرم چوہدری نے خان کے گھر پر قبضہ کر لیا ہے؟“
 ”بالکل مادام: رشیدہ باوثوق بچے میں بولی: ”وہ مجھے شہر کی سڑکوں
 اور گلیوں میں تلاش کر رہا ہے جب کہ میں اس کی ناک کے نیچے محفوظ ہوں
 دراصل وہ ہوٹل میں بہت کم آتا ہے۔“
 ”سچ خطرہ کیا ہے؟“

”گتھی معاف مادام! آپ کا سوال عجیب ہے۔ میں کب
 تک ہوٹل میں رہ سکتی ہوں۔ ذرا فائدہ مند ختم ہو چکے ہیں اور دو سو پچھپے
 ہوٹل کا خرچہ روزانہ آخر تک تک میں برداشت کروں گی۔“
 ”ہاں! یہ تو ہے! مادام بولی: ”اچھا یہ بتاؤ کسی طرح یہ معلوم کر سکتی
 ہوں دونوں وہ کہاں ہے؟“

”جی ہاں لیکن مجھے باہر نکلنا پڑے گا۔“
 ”سنو رشیدہ! تم باہر نکلنا اسے تلاش کرو۔ میرے آدمی تمہاری
 حفاظت کریں گے۔“

”نہن... نہیں مادام: رشیدہ رونے لگی: ”میں ڈرتی ہوں مادام!
 اس نے مجھے دیکھ لیا تو پھر مجھے کوئی طاقت نہ بچا سکے گی۔ وہ ایسا ہی
 خونخوار درندہ ہے مادام۔“
 ”میں ضمانت دیتی ہوں رشیدہ! مادام نے اسے پچکارے

ہوئے کہا: ”جانتی ہو میں یہاں کیوں ہوں۔ میں اُسی درندے کو شکار
 کرنے یہاں آئی ہوں۔ اس سے قبل کہ وہ تمہاری طرف آنکھ اٹھائے
 میرے شکلی اسے گھیر لیں گے۔ تم صرف اسے باہر لاؤ گی۔“
 ”بہتر مادام! مجھے آپ کی ضمانت پر یقین ہے۔“

”اوہ شکریہ! مادام چینی: ”ٹھیک گیارہ بجے میرے آدمی ہوٹل کی
 نگراں شروع کر دیں گے۔ تم مین گیٹ پر رُک کر دائیں بائیں دیکھو گی اور
 سیرف پاتھ پر سیدل چل پڑنا۔ جب تک وہ متوجہ نہیں ہوتا تم ہر روز
 صبح وشام ایسے ہی کرتی رہو گی۔“

”مادام! ایک اور ذریعہ بھی ہے۔ میرا ایک دوست اسے
 جانتا ہے میں اس کے ساتھ جایا کروں گی۔“
 ”مجھے کوئی اعتراض نہیں تم آزاد ہو پس مجھے خرم چوہدری نہیں
 کر دو۔“

”آپ کو تو کوئی خطرہ نہیں؟“
 ”کیا کہنا چاہتی ہو؟“
 ”آج شام کسی وقت میں اپنے دوست سے آپ کی ملاقات
 کروانا چاہتی ہوں۔ آپ اجرت پر اس سے ہر کام لے سکتی ہیں۔“
 ”وہ ہے کون؟“

”سلیمان نے آخری دنوں اسے بطور محافظ رکھا تھا۔ بڑا ہی
 جی دار نوجوان ہے۔“
 ”ٹھیک ہے مل لوں گی۔“ مادام نے رضامندی دے دی: ”تم
 اس کے ساتھ شام سات بجے ہالی ڈسے ان چلی آنا اگر میرے مطلب
 کا ثابت ہوا تو میں اسے وہی حیثیت دے سکتی ہوں۔ مجھے بھی ایسا
 ہی باڈی گارڈ چاہیے۔“

”مجھے یقین ہے مادام وہ آپ کو تھکائے گا۔“
 ”دیکھ لیں گے کیا چیز ہے؟ مادام نے ہنس کر کہا: ”ٹھیک...
 سات بجے میں ہال میں ہوں گی۔“

”شکریہ مادام! رشیدہ نے خدا حافظ کہہ کر رسی پور رکھ دیا۔
 میں بیڑھیاں چلا گئی اور گیارہ گیارہ رشیدہ نے داد طلب نگاہوں
 سے دیکھا۔ میں نے آگے بڑھ کر اس کے شانے کو تھپتھپایا۔ اس نے
 واقعی شاندار کارکردگی کا مظاہرہ کیا تھا۔ میں نے اسے عرف گائیڈ لائن
 دی تھی۔ جتنا کچھ اس نے کیا تھا وہ میرے ذہن میں نہ تھا۔ اس نے منزل
 کا راستہ بے حد آسان اور مختصر کر دیا تھا۔

”فیل ڈن جان برادر! میں نے اس کا شاہد چپک کر تمہیں
 بھرے بچے میں کہا: ”تم نے بین بجا کر ناگن کو بل سے نکلنے پر مجبور کر
 دیا ہے۔ ہارون اسے اپنی پیادہ میں بند کرے گا۔“

”اوہ نہیں! رشیدہ بھڑک اٹھی: ”وہ نوجوان خرم چوہدری
 ہو گا۔“

”نہیں جان تمہارے ساتھ ہارون جائیں گے۔ میں نے
 ضمانت سے کہا: لاہور اور پٹنہ کے بہت سے لوگ اس کے
 ساتھ ہیں کوئی بھی مجھے پہچان سکتا ہے۔“

”میک آپ نہیں کر سکتے آپ! رشیدہ شاکی بچے میں بولی۔
 ”میں نے ویسے ہی نہیں کہہ دیا۔ میرے ذہن میں ایک شاندار منصوبہ
 ہے۔ میں اور آپ اس کے نزدیک رہیں گے اور شکار مارک کریں
 گے۔ اشارہ ہمارا ہو گا اور شکار ہارون کریں گے۔ اس طرح مادام
 اپنے اہم مہروں سے محروم ہوتی چلی جائے گی۔ ہم اس کی بفل میں ہوں
 گے اس لیے شک سے بالاتر رہیں گے۔ جب وہ گھبرا کر اسلام آباد
 چھوڑنا چاہے گی تو اس کے پر بھی کتر دیے جائیں گے۔“

”ارے لڑکی جینے کی باتیں کر! میں نے اسے جھجھوڑ ڈالا: ”کیوں
 مائٹن رہے ہیں بیٹی کی باتیں! چیف تو اسے ہونا چاہیے۔“

”بے شک شاندار اور بے داغ منصوبہ ہے۔ لیکن نے پیار۔
 ”ہری آواز میں کہا: ”تمہاری محبت کا اثر ہے یہ بالکل تمہاری پالیسی
 کے مطابق سوچنے لگی ہے۔ تم سبھی دشمن کی صفوں کے اندر جاکر
 پھنسنے کی پالیسی اختیار کرتے ہو۔“

”ہارون! تم بھی کچھ بولو جھانی: میں نے گم گم بیٹھے ہارون کو
 ہوکا دیا۔

”کیا بولوں چیف؟ ہارون بولا۔ مجھے تو یوں محسوس ہوتا ہے
 جیسے میں اس اسکول میں نرسری کا بچہ ہوں۔“

”اچھا رشیدہ! تم اس بچے کو کوئی اچھی سی کہانی سناؤ۔ بے چارہ
 بچہ گھر سے باہر آیا ہے۔ میں اور مائٹن فریڈ خان سے کچھ معاملہ طے کرنے
 بارے میں بلکہ اسے بازار تک لے جاؤ اور واپس پر میک آپ کا
 سالن لے آنا۔ میں اُٹھا تو لیکن بھی میرے ساتھ اُٹھ کھڑا ہوا۔ رشیدہ
 اور ہارون چپ چاپ سوجھکائے بیٹھے رہے تھے۔

ہارون اور رشیدہ شام چابکے واپس آئے۔ دونوں لہرے
 چہندے تھے۔ ہارون نے رشیدہ کے لیے شاپنگ کی تھی اور رشیدہ
 سائرس کے لیے کئی قسم کے ٹوٹ فریڈ تھے۔ دونوں ایسے ہی خوش
 تھے جیسے دو بچے من پسند کھانے خرید لائے ہوں اور مجھے یہ خوشی
 ملی کہ وہ لڑکی خوش تھی جسے کبھی وقت نہ ٹھوکروں پر رکھا ہوا تھا۔ اسے
 فٹن میں نے وقت کا ہاتھ روک کر دی تھی جو خود خوشی کے لیے تیس رہا تھا۔
 رشیدہ میرے لیے جو کچھ لائی تھی اچھا اچھا رکھا ہی تھی تب
 لیڈر فیضیل ہوٹل کے کمرے سے نکل کر چوٹی میں چلا گیا تھا۔ میں سیل پتھر

ابن صفحہ کے ناول کی رہنمائی کے مقدمات

وہ اکثر بے خیالی میں بڑبڑانے لگتی۔ کمال
 کاش تم... کچھ کمال ہوتے۔ ایک
 گناہ شخصیت... ایک معمولی آدمی۔ پھر خود
 ہی کہتی: ”کیا بھلا ہے... میں کیا ایک
 رہی ہوں۔ وہ کسی ناول کا پلاٹ نہیں تھا کسی
 فلم کی کہانی نہیں تھی۔ جس میں میں نے میٹرک کا
 رول ادا کیا ہو۔ لیکن وہ بے نام سی ادا سی ہرقت
 اس کے ذہن پر چھائی رہتی۔ وہ ذہنی ہونے
 کی کوشش کرتی... بے تحاشہ ہتھیار لگاتی
 کی... لیکن اس کے بعد اس کا دل اور زیادہ
 ڈوبنے لگا۔

ساکھ! بھرتے ٹوٹوں، جڑاؤں، بنیادوں اور دیگر اشیاء کو دیکھنے لگا تھا۔
 بالکل اسی طرح ایک دفعہ زینت میرے لیے کمرے لائی تھی اور چارپائی
 پر بکھر بکھر خوش ہو رہی تھی۔ اسے میں نے کیا صلہ دیا تھا؟ ڈکھی آگ اور
 آنسوؤں کا پانی۔

”کیا بات ہے جھانی جان؟ مجھے گم گم دیکھ کر رشیدہ چوک کر بولی۔
 ”بھگت نہیں جان! میں نے سر دھو کر بھی اور میک آپ کا سامان لے
 کر ایک طرف رکھ دیا! میں دعا کر رہا ہوں کہ خدایمیری بہن کو سدا اسی
 طرح خوش رکھے۔“

”نہیں! وہ میرے قریب آگئی اور آنکھوں میں دیکھنے لگی: ”کوئی
 اور بات ہے۔ آپ کی آنکھیں غناک ہو رہی تھیں اور ڈکھ کا سایہ چہرے
 پر لرز رہا ہے۔ کیا آپ کو یہ سب کچھ اچھا نہیں لگا جیسا کہ اس کی آنکھیں
 اُٹنے لگیں تو میں اس کا سر سہلانے لگا۔

”یہ بات نہیں جان! یہ بات نہیں۔ دراصل میری کوئی بہن نہ تھی
 جو جھانی کے لیے جیتیں بکھرتی۔ یہ خوشی کے آنسوؤں میں بول رہا تھا
 اور رشیدہ اپنے ترچہ سے میری قمیص بگھور رہی تھی! اچھا اب اپنے
 اور ہارون کے ٹوٹ دکھاؤ۔“ میں نے اس کا چہرہ صاف کرتے ہوئے کہا۔
 ”ہارون نے اپنے لیے کوئی چیز نہیں لی! اس نے ایک پیکٹ
 کھولتے ہوئے کہا اور پھر ایک طرف ہٹ گئی۔ میں نے خود ایک ایک
 چیز دیکھی۔ اگر وہ سب کچھ ہارون کی پسند اور خرید تھی تو اس کی محنت اور
 ذوق اعلیٰ تھا۔ دونوں کی خرمندگی کی وجہ سے میں نے پوچھا نہیں کہ کیا
 کس نے خریدا ہے۔

کردی تھی۔

"جمال تم باہر گاڑی میں بیٹھو، مادام نے درشت ہلچے میں کہا۔" میں ان سے کاروباری باتیں کروں گی۔ جمال اٹھا اور شانے اچکاتا ہوا چل پڑا۔ "یہ تم لوگ اتنے وحشی کیوں ہوتے ہو؟ مادام نے میری جانب دیکھ کر زبردست کہا۔" شاید چارے پیٹنے کی چھاپ کا رنگ ہی ہوتا ہے۔ میں نے جواب دیا۔ "لیکن مجھے ایسا آدمی چاہیے جو صرف میرے دشمنوں کے لیے ہتھیاروں درمندی اور عزتیں وحشت کا مظاہرہ کرے۔"

"جی ہاں درمندی اور وحشت صرف دشمنوں سے ہی ہونی چاہیے۔" "گڈ۔ وہ ایک دم کھل اٹھی۔" مجھے ایسا ہی ساتھی چاہیے جو میری ذات کے لیے اہر ریشم کی مانند نرم ظالم اور گداز ہو مگر دشمن کا زرخہ ایسے پھاڑے جیسے حیرت انگیز پرجھپٹتا ہے۔"

"بعض اوقات عادت کی تقسیم مشکل بھی ہو جایا کرتی ہے میڈم۔" میں نے ٹھوس ہلچے میں کہا اور وہ مجھے گھورنے لگی۔

"بابر! رشیدہ رساں سے بولی۔" میری مادام کو مختاری خدمات درکار ہیں۔

"تم جانتی ہو میری فطرت غلامی پسند نہیں کرتی۔ ہاں جزدوقتی خدمات کے لیے حاضر ہوں۔"

"میری خاطر بابر عزیز! رشیدہ سراپا التجا بن گئی۔ تمہیں معلوم ہے بابر مجھے جس قسم کی پناہ کی اشد ضرورت ہے، تم نے معذرت کر دی ہے۔ اب صرف مادام ہی مجھے اپنی پناہ میں لے سکتی ہیں یہ بزنس فور پریس کچھ دنوں کے لیے تم جمال کی جگہ لے لو۔"

"تمہاری خاطر، میں نے طویل سانس لے کر ہاسی جبری۔"

"لیکن شاید میں میڈم کو خوش نہ رکھ سکوں۔" میری اپنی بھی کچھ ذمے داریاں ہیں۔ میرے ساتھیوں کو میری ضرورت ہوگی پسند میری ایک شرط ہوگی۔

"ہاں ہاں بولو،" مادام شہناز بھوکی گھوڑی کی مانند نہہناٹے لگی۔ "میں ہر شرط پر تمہیں حاصل کر لوں گی۔"

"مجھے بوقت ضرورت باہر جانے کی اجازت ہوگی۔"

"اوہ کیوں نہیں؟" مادام بولی "جب ہم گھر میں ہوں گے تو جب چاہو تم چلے جایا کرنا۔"

"رشیدہ! میں نے سمراتی آواز میں کہا۔ تمہیں معلوم ہے نا دوستی اور کاروباری اصول میں الگ الگ رکھتا ہوں۔ میڈم سے

نے سرے اشارہ کیا۔ میں متوازن قدم اٹھاتا ہوا قریب گیا۔ مادام شہناز کی بوکھلاہٹ قابل دید تھی۔

"مادام! رشیدہ بڑے مودبانہ ہلچے میں بولی۔ یہ میرے مس دوست بابر راجا ہیں۔"

"آپ سے مل کر خوشی ہوئی راجا صاحب! مادام نے میرے سراپا کو نگاہوں سے ناپتے ہوئے کہا۔"

"بابر! یہ مادام شہناز ہیں۔ ملک کی ممتاز صنعت کار..."

"نہیں راجا صاحب! شہناز بولی۔ "میں صنعت کار نہیں امپورٹ، ایکسپورٹ کا بزنس ہے۔"

"آپ صنعت کاروں سے اہم ہیں میڈم! میں نے مصنوعی چہرے پر مشکراہٹ کی چامنی بکھرتے ہوئے کہا۔"

"تشریف رکھیے راجا صاحب۔" وہ بچھنے لگی۔ اس نے اپنے ساتھی کو یکسر نظر انداز کر دیا تھا لیکن میں کسی مگرچہ کو ناراض کرنے کا رسک نہیں لینا چاہتا تھا۔ کیونکہ مجھے مادام کے سمندر میں ان ہی چھوٹے بڑے مگرچوں کے ساتھ رہنا تھا۔ اسی لیے میں نے بیٹھنے سے قبل اس نوجوان سے مصافحہ کر لیا تھا اور اس کا بگڑا چہرہ مائل پر مشکراہٹ ہو گیا تھا۔ تب ہی شاید مادام کو اپنی غلطی کا احساس ہوا تھا۔

"یہ میرا بھائی گارڈ جمال ہے، جسے اسلام آباد کی فضا اس لیے راس نہیں آتی کہ اس کی محبوبہ لاہور رہ گئی ہے۔" مادام نے قہقہہ لگایا اور جمال خان نے خرمانی کی اداکاری دکھاتے ہوئے چہرہ جھکا لیا۔

وہ چند قدم دور کھڑا تھا۔ مادام نے چائے لانے کا حکم دیا پھر رشیدہ کو لے کر دوسری میز پر چلی گئی۔ چائے آنے تک دونوں سرگوشیوں کا تبادلہ کرتی رہی تھیں۔ گفتگو کا عنوان میری ہی ذات ہوگی کیونکہ دونوں بابر میری جانب دیکھ رہی تھیں۔

"مادام کب تک ادھر قیام کریں گی؟" میں نے جمال سے پوچھا۔

"غیر معینہ مدت کے لیے راجا صاحب! جمال منہ بنا کر بولا۔

"تو آپ یہاں خوش نہیں ہیں؟"

"ہاں، وجہ مادام بتا چکی ہیں۔" جمال مدھم آواز میں بتانے لگا۔

"دراصل میری منگیتر بیمار ہے۔ ورنہ اُسے ادھر لے آتا۔"

"تو آپ چلے جائیں۔ ملازمت ایک چھوٹے تو دوسری مل جاتی ہے۔ مگر محبوبہ کا کوئی متبادل نہیں ہو تا میں نے اپنی محبوبہ کی خاطر فرانس جیسے ملک کو دوپتی ماری تھی۔"

"کاش میں صرف ملازم ہوتا۔" اس نے گہری سانس لی۔ "آپ میری محبوبہ نہیں سمجھ سکتے دوست۔"

وہ شاید کچھ اور بھی کہتا لیکن مادام کی فالسی نے ہماری زبان خاموش

ایش لڑے سے راکھ کے کمرے وائیں گال پر نشان لگا کر ٹھوک دیا تھا۔ "یہ کیا تمہیری ہے پیاری بیٹی؟ بیگن نے پیار سے رشیدہ کو جھک دیا۔"

"یہ بد تمیزی اور محبت کہلاتی ہے ڈینی۔" رشیدہ نے ہنس کر بتایا۔ "میں اپنے بھائی کو نظر بد سے بچانا چاہتی ہوں۔" جواباً بیگن صرف ہونٹ سکڑ کر رہ گیا تھا۔

تین بجے جب میں اور رشیدہ ہونٹ سے نکلے تو چارے پاس نئے ماڈل کی کار تھی۔ رشیدہ نے خود کو مظلوم اور قابل رحم منوانے کے لیے ٹرانسٹو ہی رہنے دیا تھا۔ ہارون نے باہر جا کر گلیز رپورٹ دی تھی۔ اسی لحاظاً ہارون اور ہونٹ کو نگرانی پر لگادیا تھا۔ جب ہماری کار شکر پڑیاں سے روانہ ہوئی تو ان کی کار تعاقب میں ہی تھی۔ ہونٹ سیاح کے رُوپ میں تھا۔

چار بجے میں دس منٹ باقی تھے۔ میں نے کار ہونٹ کے پارکنگ سٹینڈ میں پارک کی۔ ایک کار چرچاتی ہوئی رُکی۔ اگر میں فوراً دروازہ بند نہ کرتا تو حادثہ یقینی تھا۔ وہ کار اتنی قریب تھی کہ میرے لیے دروازہ کھول کر باہر نکلتا مشکل ہو گیا تھا۔ میں نے ذرا آگے جھک کر وائیں جانب کمرخت لگا ہونٹ سے دیکھا۔ ایک خوش رُو لڑکی اپنی شرارت پر مشکرا رہی تھی۔

"گیٹ بیک۔" میں نے شیشے اُتارتے ہوئے چیخ کر کہا لیکن دروازہ کھول کر باہر نکل کر چلتے چلتے زلفوں کو لہراتی چل پڑی۔ چند قدم جا کر اس نے پلٹ کر دیکھا۔ وہ میری بے بسی پر مشکرا رہی تھی۔ "چلو آؤ۔" میں نے رشیدہ سے کہا۔ "یہ بہنی ہی غلط ہوئی ہے۔"

"آپ مغرب میں رہ کر بھی پینڈو ہی رہے ہیں۔" رشیدہ ہنسنی ہوئی اتر گئی۔ "جدید نسل اسی انداز سے تعارف کرواتے ہے۔"

"لعنت ہے ایسی جدت پر۔" میں جتنی آوازیں بولا۔ "موندی غارت ہو گیا تھا لیکن ہلاکت کا چہرہ بے تاثیر رہی رہا ہو گا۔"

استقبالیہ مسکراہٹوں کے جواب میں گردن اکودے ہم ہاں تھا داخل ہوئے۔ رشیدہ میرے پہلو میں چل رہی تھی۔ ہاں کی چند میز پر مصروف تھیں۔ وہ بڑے مودبانہ کھڑے تھے۔ معاً رشیدہ میرے پہلو سے سنسان ہوتی نکلی۔ اس کا رخ کوٹے کی میز کی طرف تھا۔ ایک نوٹ رنگ عورت سر جھکائے چائے کی پیالی میں شکر گھول رہی تھی۔ اس کے سامنے ایک نوجوان کہنیوں کے بل آگے جھکا ہوا تھا۔

میں سینے پر ہاتھ باندھے اُسی جگہ کھڑا رہا تھا۔ رشیدہ قریب گئی تو عورت نے ایک دم اوپر دیکھا پھر اس کے صین چہرے پر شامانی کی مسکراہٹ بکھرتی چلی گئی تھی۔ پھر دونوں نے میری جانب دیکھا۔ رشیدہ

فرید خان کے ساتھ جویننگ ہوئی تھی، بحث مباحثے کے بعد کلیاب رہی تھی۔ گروہ کو تین حصوں میں تقسیم کیا گیا تھا۔ میں اور رشیدہ مادام شہناز کے ساتھ کونز اور ہارکن، فرید خان کے حوالے کیے گئے تھے بیگن کو ٹینیس، امینہ کی سرپرستی اور تینوں پارٹیوں کے درمیان رابطہ برقرار رکھنا اور ہیڈ کوارٹر کے سربراہ کی حیثیت دی گئی تھی جبکہ ہونٹ اور ہارون کو ان لوگوں کو ٹھکانے لگانے کی ذمہ داری سونپی گئی تھی جن میں میں مارک کرتا۔

فرید خان کو اپنی صوابدید کے مطابق کام کرنے کی اجازت دے دی گئی تھی۔ جلا ملک میں کچھ اجرتی لوگوں کو بھی شامل کیا گیا تھا۔ میں نے فرید خان کو یہ بھی اختیار دے دیا تھا کہ وہ اپنے گاؤں کے ایسے چار نوجوان ماہرانہ اجرت پر بھرتی کر سکتا ہے جو کالونی اور گرد و نواح میں منشیات کے تاجروں پر نگاہ رکھیں اور جب وہ لوگ مال لے کر روانہ ہوں تو فرید خان کو ٹرانسمیٹر پر انعام کر دیا کریں۔ بیگن نے پانچ ٹرانسمیٹر فراہم کرنے کی ذمہ داری قبول کر لی تھی۔

جب میں نے فرید خان سے اسمگلروں کے بارے میں پوچھا تھا تو اس نے دو ٹوک اور پُر جوش انداز میں جواب میں کہا تھا۔ "کوئی وائیں نہیں جائے گا۔ وہ لوگ اپنے ساتھ قطعی آگ لائیں گے اسی آگ میں جلا دیے جائیں گے۔ پوست کی فصل جلد تیار ہو جاتی ہے مگر ایک سمگلر اٹھارہ بیس برس بعد تیار ہوتا ہے۔ ایک بڑا آدمی ختم ہو گا تو اس کی جگہ لینے کے لیے اتنی جلدی کوئی نہیں آئے گا۔ بہنڈا بڑے آدمیوں کا خاتمہ ضروری ہے۔ ہاتھ نہیں ہوں گے تو فصل بھی تیار نہ ہوگی۔"

اس نے درست ہی فیصلہ کیا تھا۔ جب تک پوست کی فصل کاشت کرنے والے اور اس فصل سے زہر کشید کرنے والے ہاتھوں کو علم و ہنر کی روشنی اور متبادل ذرائع نہیں دیے جاتے فصل اگتی رہے گی زہر کشید ہوتا رہے گا اور مفاد پرست مبنی نوع انسان کو تباہ کرے رہیں گے۔ فرید خان کا خیال تھا کہ ترسیل کے ذرائع کٹ جائیں گے تو پیداوار خود بخود ختم ہوتی چلی جائے گی۔

ہارون کے سمر پور تعاون، بیگن کی ہمارت اور رشیدہ کے مشوروں سے مجھے جو نیا چہرہ دیا گیا تھا اس پر میں خود بھی سوچاؤں سے متاثر ہونے لگا تھا۔ رشیدہ نے ایک انگریزی فیشن میگزین سے ڈینش چہرہ پسند کیا تھا۔ تصویر سلفے رکھ کر ہارون اور بیگن نے اس شاہکار چہرے میں اپنے اپنے فن کے رنگ بھی صبرے تھے۔ ان رنگوں میں مشرقی رنگ بھی شامل تھا کیونکہ مجھے بہر حال ایک مشرقی عورت کو متاثر کرنا تھا اور خود کو مشرقی نوجوان ہی ثابت کرنا تھا۔ رشیدہ میرے لیے مرن کلر کی شادو آؤتھس لائی تھی اوپر ہلکی براؤن جیکٹ پہنائی گئی۔ رشیدہ نے

معاوضے کی بات...

"اوہ نہیں جان! رشیدہ لہک کر بولی: "نہیں بابر! میری خاطر تم کوئی مطالبہ نہیں کرو گے۔"

"سوری! میں نے ہاتھ پچایا! میں اصول پرست ہوں یہ معاملہ طے کرنا ضروری ہے۔"

"میں جمال کو دو ہزار دیتی ہوں بولو تم کیا لو گے؟"

"بڑھ! میں ہونٹ سکڑ کر ہنس پڑا! "دو ہزار تو میں صرف گھوڑ کر دیکھنے کے لیتا ہوں میڈم!"

"ٹھیک ہے تین ہزار!"

"بس بابر! رشیدہ تو رخ کر بولی: "ورنہ میں ناراض ہو جاؤں گی!"

"ٹھیک ہے جان! میں نے گہری سانس لے کر کہا: "تمہاری ناراضگی بڑی ظالم ہوتی ہے!"

"شکریہ راجا! اٹھو اب چلیں! "مادام نے طشتری میں پچاس کا نوٹ رکھا اور کھڑی ہو گئی۔"

بابر نکل کر رشیدہ نے داد طلب لگا ہوں سے میری جانب دیکھا میں نے بھی لنگا ہوں کو لنگا ہوں سے ہی بھر پور داد دی تھی۔

رشیدہ نے میری منزل کا راستہ تلاش ہی نہیں کیا تھا بلکہ بے حد آسان کر دیا تھا اور اب قاتلوں کی مرغنہ خود مجھے قاتلوں کی ترنگ تک لے جا رہی تھی۔

رشیدہ، "مادام شہناز کے عقب میں ایسے چل رہی تھی... جیسے ملکہ عالیہ کے پیچھے کوئی کیزر بادب ہاتھ باندھے چل رہی ہو۔ گو یہ سب کچھ مصنوعی تھا، وہ بہت جان دار ادکاری کر رہی تھی لیکن مادام شہناز کے ساتھ رشیدہ کا وہ فدیہ باز انداز مجھے دُشرب کرنے لگا تھا۔ میں نے

چہرہ گھما کر رشیدہ کو اشارہ بھی کیا کہ ہاتھ پاؤں کھول کر اور گردن اٹھا کر چلو مگر اُس نے میرے اشارے کا مفہوم نہ سمجھا تھا۔

مادام نے باہر نکل کر ادھر ادھر دیکھا پھر سیدھی اپنی کار کی جانب چل پڑی۔ اُس کا باڈی گاڑڈ غائب تھا۔ مادام نے کھلے شیشے سے اندر جھانک کر دیکھا اور کاغذ کا ایک پرزہ اٹھا کر پڑھنے لگی۔ میں نے اُس کے دائیں شانے سے جھانک کر دیکھا، چند سطر ہی تحریر تھی۔

"مادام!"

آپ کو یقیناً اب میری ضرورت نہیں ہوگی۔ قبل اس کے کہ میں خالی لفافے کی طرح کسی وقت

ثالی میں اُچھال دیا جاؤں، میں خود ہی نئے لفافے کے لیے جگہ خالی کر رہا ہوں۔

"اجن! "مادام نے کاغذ کی گولی بناتے ہوئے کہا۔

"بس! مادام! میں نے مستعدی سے جواب دیا اور مادام

کا قبضہ جلت رنگ بجاتا ہوا فضا میں ارتعاش جگا گیا۔

"کیا تم اجن ہو؟"

"بس! مادام! میں نے اثبات میں گردن ہلائی۔ "دانش ور دوسروں کے لیے اپنی آزادی اور زندگی وقف نہیں کیا کرتے۔"

ایک اجن ہی نذر ہو سکتا ہے۔

"چلو، ڈرائیونگ سیٹ سنبھالو! "مادام بولی۔ ایک اجن دوسرے اجن کے لیے سیٹ چھوڑ کر چلا گیا ہے۔"

میں نے دروازہ کھولا، جاپانی اگنیشن میں مگی ہوئی تھی۔

"تم بھی آگے بیٹھ جاؤ۔" مادام نے اپنے لیے بچھلی سیٹ کا دروازہ کھولتے ہوئے رشیدہ کو حکم دیا۔ رشیدہ گھوم کر میرے پہلو میں بیٹھ گئی۔ گیٹ سے نکل کر میں نے پلٹ کر مہمانی طلب لگا ہوں سے دیکھا۔ حالانکہ میں اُس کے ٹھکانے سے واقف تھا۔ پہلے

پیر مارکیٹ۔ "مادام بولی۔ "شانگ کرتے ہوئے جائیں گے۔"

پیر مارکیٹ کے پارکنگ پلاٹ میں تین دھرنے کی بھی جگہ نہ تھی۔

"ادھر ہی سائڈ میں لگا دو۔" مادام نے میری پریشانی بھانپ کر کہا۔ "تمہارا ہاتھ ابھی صاف نہیں۔"

"جی ہاں! "مادام! میں نے فٹ پاتھ سے گاڑی لگاتے ہوئے جواب دیا۔ "ہاتھ بے حد مصروف رہتے ہیں، اس لیے اسٹیئرنگ

شانڈ فوار ہی نصیب ہوتا ہے۔"

"ایک اچھے غنڈے کو ہر فن مولا ہونا چاہیے۔" مادام اترتے ہوئے بولی۔ "میری گاڑی عموماً فارغ ہوتی ہے۔ تم فراغت کی گھڑیوں میں ہاتھ پکا کر سکتے ہو۔" میں اترنے لگا تو اُس نے ہاتھ کے اشارے سے روک دیا۔ "گاڑی غلط جگہ کھڑی ہے۔ تم موجود ہو گے تو پولیس خاموش رہے گی۔ ہاں، اگر تمہیں کچھ خریدنا ہے تو بتا دو۔

سگریٹ کا کون سا برانڈ ہے تمہارا؟"

"بابر نان اسموکر ہے، میڈم! رشیدہ نے فخریہ لہجے میں بتایا۔

"اوہ... حیرت ہے۔" مادام نے بغور مجھے دیکھا۔ "واقعی...؟"

"بابر میں بہت سی حیرت انگیز خوبیاں ہیں! "مادام! رشیدہ بولنے لگی۔ "میں تو کبھی کبھی خود حیران ہو جاتی ہوں، یہ ہماری دنیا میں کیسے آگیا ہے۔"

"ٹھیک ہے، دیکھ لیں گے۔" مادام بولی۔ ہاں، بابر! تم تن کے لباس میں آئے ہو۔ آؤ، دو تین سوٹ لے لینا۔"

"شکریہ! "مادام! میں نے بے پروائی دکھائی۔ "بس، ایک

سپینگ سوٹ لے آئیے گا۔ کل کسی وقت میں اپنا سامان لے

آؤں گا۔"

مجھے اُمید نہ تھی کہ اتنی رات گئے، میں ہینڈ کوارٹر سے رابطہ قائم کر سکوں گا چونکہ بیگن کو بالکل ہی گھر کی قسم کی ذمہ داری

سونپ دی گئی تھی اور رشیدہ بھی وہاں سے نکل آئی تھی! اس لیے میں خان کی بے آسرا معصوم بیٹیوں کو نظر انداز نہیں کر سکتا تھا۔

تو اُن کی ذمہ داری میرے سرکاری فرائض میں شامل نہ تھی۔ وہ ایک بُرے باپ کی بیٹیاں تھیں۔ مکافات عمل کا بھی یہی اصول

تھا کہ بڑوں کی لگائی ہوئی آگ میں بچے جلیں لیکن میں اُن کے بارے میں کوئی فیصلہ نہ کر پایا تھا۔ کچھ سوچنے کا وقت ہی نہیں ملا تھا۔

ہلڈا میں نے بیگن کی بجائے ہارون کو کال کیا۔

"لیٹیک، برادر محترم! ہارون کی آواز اتنی صاف تھی کہ میں نے چونک کر ادھر ادھر دیکھا... پھر ہارون کا دبا دبا سا قبضہ سنائی

دیا۔ "ساتھ ڈگری، شمال مغرب میں دیکھیے! چیف! میں بس قدم دور، ڈرگ اسٹور کے ستون کے ساتھ کھڑا ہوں۔"

"کیا تم تعاقب کر رہے ہو؟"

"جی ہاں... بے کاری سے بیگار اچھی کے مصداق!"

"سنو، ہارون! انٹر ویو کا میاب رہا ہے اور فوراً آن ڈیوٹی کر دیا گیا ہوں۔ فی الحال ہم کالی بھیروں کی فہرست مرتب کریں گے۔ اگر فوراً کھیل شروع کر دیا تو بہت سی بھیریں محتاط ہو جائیں گی۔" میں نے کہا۔

"بہتر! چیف! ہارون نے جواب دیا... پھر کچھ لوگ بیڑھیاں ہرختے دکھائی دیے تو ہارون نے ہاتھ نیچے گرا دیا۔ جب وہ اندر چلے گئے تو وہ پھر بولنے لگا۔ "آج ہی دو دوستوں سے ملاقات ہوئی ہے۔

بھروسے اور کام کے لڑکے ہیں۔ اگر اجازت ہو تو اُن کو رکھ لیا جائے۔"

"ٹھیک ہے، رکھ لو... مگر فی الحال انھیں اپنے تک محدود لکھنا۔ میں کچھ وقت نکال کر اُن سے ملوں گا۔"

"شکریہ! چیف! ہارون بولا۔ "برانہ ملنے گا... ایک بات اور

بھی ہے۔ "مادام جس قبائش کی عورت ہے آپ جانتے ہیں، وہاں رنگ رنگ کے لوگ آئیں گے۔ آپ میرا مطلب سمجھ رہے ہیں نا، چیف؟"

"میں پنجاب کی مٹی کا بھائی ہوں! ہارون! تمہاری بات کا

اُن کا جواب ہے۔"

"بس! میں مطمئن رہوں گا، چیف!"

ادب

ادب کا انحطاط قوم کے انحطاط کو ظاہر کرتا ہے، دونوں اپنے زوال آمادہ رجحانات میں ایک ساتھ ملتے ہیں۔ (گوٹے)



ادب قوموں کے خون کی گردش کا پیمانہ ہے ایک ایسا پیمانہ جو اجتماعی اور انفرادی تاریخ ارتقاء کے نسبت و فراز کو اس قدر صیح بتاتا ہے جس قدر کہ دنیا کی کوئی تاریخ نہیں بتا سکتی۔ (قاضی عبدالغفار)

ہارون کو تو جواب دے کریں نے مطمئن کر دیا تھا... لیکن جس خطرے کی طرف اُس نے اشارہ کیا تھا، میرے ذہن میں دور دور تک اُس کا خیال نہ تھا۔ بلاشبہ ہارون نے ایک ایسے خطرے سے آگاہ کیا تھا جو مادام کے سامنے میں رشیدہ جیسی گل اندام لڑکی کے لیے موجود تھا۔

کوئی بھی رنگین مزاج شکاری، "مادام شہناز سے فرمائش کر سکتا تھا اور مادام شہناز کے نزدیک رشیدہ کی حیثیت کال گرل سے زیادہ نہ تھی۔ وہ تو اُس رشیدہ کو جانتی تھی جو رنگین مزاج بیٹھوں کی منظور نظر رہتی تھی۔ اُسے کون بتاتا کہ وہ رشیدہ، رنگ باز خان کے تہ خانے میں سی دفن ہو گئی تھی۔ موجودہ رشیدہ، ایک بھائی کی جڑستی بہن... ایک باپ کی پیاری بیٹی اور پاک خیال لڑکی ہے۔

مادام خالی ہاتھ گردن اٹھائے واپس آئی تھی جبکہ رشیدہ بیٹکوں کے بوجھ سے دھری ہوئی جا رہی تھی۔ کچھ پکیٹ اندازہ کچھ ڈکی میں رکھو! "مادام شہناز نے ڈرائیونگ سیٹ والے دروازے پر تھکی دے کر کہا۔ "اب سرکیں خطرناک حد تک مصروف ہیں۔

دوسری سیٹ پر کھسک جاؤ۔ مجھے ابھی زندگی سے بہت کچھ حاصل کرنا ہے۔ اگر تم مجھے پہلے بتا دیتے تو میں شاید ایسے ہاڑی گاڑ کا انتخاب نہ کرتی۔"

"اتنا بھی انارڈی نہیں ہوں! "مادام! میں نے چابی کھانچا بھن اشارت کر دیا۔ "زندگی نے ابھی مجھے لارے پتے پر رکھا ہے۔ فی الحال مرنا

مجھے بھی پسند نہیں۔ آپ دیکھیں تشریف رکھیں۔"

"میں بات دہرانے کی عادی نہیں، مسٹر بابر! یہ ہے ہوجاؤ۔" اس کا ہجرا ایک دم کرخٹ ہو گیا اور میں بھی جی بن گیا تھا۔

اس کی کوئی یقیناً چودہ مرے پر محیط تھی۔ جوہنی وہ کار کا ہارن بجاتی ہوئی گیسٹ میں داخل ہوئی، ایک نوجوان سیر حیاں پھلا گستاخا، پورچ میں آگیا۔ پہلے اس نے فوجی انداز کا سلام دیا پھر جھک کر دروازہ کھول دیا۔ میں نے اپنے لیے خود ہی دروازہ کھولا تھا۔ دوسری طرف سے رشیدہ بھی نکل آئی تھی۔

"رشیدہ! سلمان اپنی نگرانی میں اندر آؤ۔" مادام نے حکمانہ لہجے میں کہا۔ "آؤ، بابر خان!" سیر حیاں چڑھتے ہوئے وہ رکی اور سرسرائی آوازیں بولی۔ "تم ہر وقت میرے قریب رہو گے، بابر! یہاں سب دوست بن کر آتے ہیں مگر مجھے کسی پر بھروسہ نہیں ہے۔"

"آپ کی آنکھ کا اشارہ کافی ہوگا مادام! میرے حلق سے غراہٹ ابھری۔ مادام شہناز نے چونک کر میرے سر پر ہاتھ رکھا اور پھر مسکراتی ہوئی چل پڑی۔ میں نے پلٹ کر دیکھا۔ رشیدہ ملازم کو نہایت دیتی ہوئی پیچھے پیچھے آ رہی تھی۔

جب میں مادام شہناز کے نقش قدم پر چلتا ہوا اکے میں داخل ہوا تو وہاں زلزلہ سا آگیا تھا اور کئی جھٹکے مجھے بھی محسوس ہوئے تھے۔ کمرے میں سات افراد تھے اور ساتوں ہی مادام کے احترام میں ہڑ ہڑا کر اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔ ان میں سے صرف دو میرے صورت آشنا تھے۔ یہ اخبارات میں بیان کے ساتھ جلوہ گر ہونے والے اعلیٰ سرکاری افراد تھے۔ ان کا تعلق ملک نواز لابی سے تھا ہوجاؤ اور وہ اپنی وفاداری کی حاضری دینے آئے تھے۔

"تشریف رکھیے، صاحبان!" مادام شہناز ہاتھ اٹھا کر بولی لیکن وہ لوگ باادب ہی کھڑے رہے تھے۔ جب شہناز نے سامنے والی سیٹ سنبھال لی تو وہ بیٹھ گئے۔ "کوئی اچھی خبر؟"

"باس بخیریت..." بسنے والا ایک دم گڑبڑا ہوا خاموش ہو گیا۔ اس نے میری جانب دیکھا۔

"اوہ..." مادام مسکراتی۔ "سوئی مجھے تعارف کرانا چاہیے تھا۔ یہ بابر ہے، میرا نیا بادی گاڑو..." آپ لوگ سیماں مرحوم کی پرسنل سیکرٹری میں رشیدہ سے تو واقف ہوں گے، اسی نے دیا ہے۔ میں نے گردن کو خم دے کر سب کو تعظیم دی۔

"مسٹر بابر! آپ پہلے کہاں تھے؟ ایک شخص نے پوچھا۔

"آوارہ بادل کی کوئی ایک مخصوص جگہ نہیں جوتی، جناب! میں نے جواب دیا۔ "ہم لوگ تو بس حالات کی لہروں پر تیرتے رہتے ہیں۔"

"ہاں، مسٹر شجاع، آپ کچھ کہہ رہے تھے۔" مادام شہناز نے اپنے قریب

والے صوفے پر چھکی دے کر مجھے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

"گستاخی تو ہوئی،" مس شہناز! "سرکاری افسر نے معذرت خواہانہ لہجے میں کہا۔ "میں اور میرے ساتھی یقیناً مسٹر بابر سے مطمئن نہیں ہیں۔ بولو کرم، ان کو صرف اپنی ذات کی جفاقت تک محدود رکھیں کچھ سرکاری انجینیاں مصروف ہیں۔"

"سینے، علی صاحب! مادام کی آوازیں ناگن کی سی پچسکار تھی۔

"میری سربراہی! آپ لوگوں نے تسلیم کر لی ہے۔ میں اپنی ذات سے الگ نہیں ہوں۔ باڈی گاڑو کی ذمہ داری سے آپ ضرور واقف ہیں گے۔ رہا سوال کہ یہ کون ہے؟ تو میں کوئی مافول گرل نہیں ہوں۔ میری عمر کا بیشتر وقت ایسے ہی لوگوں میں گزرا ہے۔ رشیدہ، سیٹھ سیماں کی موت کے بعد انڈر گراؤ ٹنڈر رہی ہے۔ ہمارے پاس کا دشمن اس کی تلاش میں ہے۔ یہ وہی لڑکی ہے جس نے اپنی جان پر کھیل کر سیماں سیٹھ کو خرم سلطان کی موجودگی سے آگاہ کیا تھا... پھر وہ پولیس کو زخمی حالت میں ملی اور اسپتال میں اس پر قاتلانہ حملے ہوئے پھر وہ وہاں سے کسی طرح نکل گئی تھی۔ ایسی لڑکی کسی انجینس کی آواز کا نہیں بن سکتی۔ لہذا بابر میرا سایہ ہے۔ اگر آپ لوگ مجھے برداشت کر سکتے ہیں تو میرے سامنے کو بھی تسلیم کرنا پڑے گا۔"

"سوئی، بس! علی اچھل کر اٹھ کھڑا ہوا۔" میں اس مشن سے الگ ہوتا ہوا بولی۔

"بیٹھ جاؤ، علی! مادام کوک کر بولی۔ یہ کوئی قیصر ہاؤس نہیں ہے، یہ ایسا غار ہے جس میں اترنے کا راستہ تو ہے مگر واپسی کے لیے کوئی دروازہ نہیں ہوتا۔"

"کیا آپ مجھے دھمکی دے رہی ہیں، مس شہناز؟"

"ہاں، مسٹر علی! شہناز، اس کی آنکھوں میں جھانک کر بولی۔

"آپ کی علیحدگی، ہمارے مشن ہی کے لیے نہیں بلکہ زندگی کے لیے خطرناک ہو سکتی ہے۔ میں تاہم ہم پر بیٹھ کر، میں پر کوئی دوسری انجی برداشت نہیں کر سکتی، آپ، اگر وہ سے الگ ہو کر کچھ کر سکتے ہیں، وہ کسی سے پوشیدہ نہیں۔"

"میں غدار نہیں ہوں،" مس شہناز، صرف احتجاج کر رہا ہوں۔

"ہماری دنیا میں کسی کو احتجاج کرنے کا حق نہیں دیا جاتا۔ شہناز نے پرس کھوتے ہوئے کہا۔ "باس کا حکم حرف آخر ہوتا ہے۔ ایک اس قانون ہے۔ ڈو آر ڈائی! اب یہ تم پر منحصر ہے کہ جو کچھ کرو یا مرنے کے لیے تیار ہو جاؤ۔"

"آپ ایک ادنیٰ شخص کی خاطر مجھے جیسے سرگرم کارکن کو ممانعت کر رہی ہیں، مس شہناز!"

"میں ایک اصول کو زندگی دے رہی ہوں، مسٹر علی! مادام نے اس پر ایک چھٹا سا رولوا لود مان لیا۔ "بیٹھ جاؤ۔"

علی غصہ بھر ہونٹ کٹنے اور جبروں کی تہیاں پھڑکانے کے بعد صوفے پر گر پڑا۔

"قتیلک یو، علی! مادام نے میری جانب دیکھتے ہوئے کہا۔ آپ مجھے ناخوش گوار فیصلے کی طعانی ازیت سے بچالیا ہے۔ ہاں، مسٹر شجاع! پورٹ دیں۔"

"مجھے ٹرانسمیٹر پر پیغام دیا گیا ہے کہ پاس نہایت ہی خدوش بات سے نکل کر غیرت افغانستان میں داخل ہو گئے ہیں۔ دوسری بھی ہمارے مشن کے لیے اہم ہے۔ خرم سلطان، ان دنوں علاقہ غیر میں ہے۔ وہ یقیناً پاس کی تلاش میں، ادھر گیا ہے۔ منشیات تیار کرنے والی فیکٹری اور ایک کالونی تیار کر چکا ہے۔ دوسرے حملے کے دوران ہی پاس وہاں سے فرار ہوئے تھے۔"

"نوازش..." مادام پر جوش انداز میں بولی اور ایک نوجوان نے گردن خم کر دی۔ "تم اپنے آدمی الٹ پل کے اس پاس لگا دو... خرم سلطان ایک ایسا شیطان ہے جو ایک جگہ ٹپ کر نہیں رہتا۔ اگر پاس کی گیلیبے تو وہ واپس آئے گا۔"

"شناخت کا مسئلہ توں کا توں ہے، مادام! نوازش متمناتی آوازیں بولی۔ "ہمیں سے کوئی بھی اسے نہیں پہچانتا۔ بلکہ مجھے بتایا گیا ہے کہ وہ ایسی کوئی آنکھ زندہ نہیں چھوڑتا جو اسے دیکھ لیتی ہے۔ وہ صرف بس نام اور خوف ہے، مادام! پاس نے بھی جو چہرہ دیکھا ہوگا، وہ اس اعلیٰ چہرہ نہیں رہا ہوگا۔ میں نے سیماں سیٹھ کے ملازموں سے پوچھا ہے۔ کچھ ایسے بھی ہیں جنہوں نے اسے بہت قریب سے دیکھا تھا لیکن ان کا کہنا ہے کہ وہ میک آپ میں تھا۔"

"ذنگ باز کی بیٹیوں کی کیا پورٹ ہے؟" مادام نے پوچھا۔

"وہ بھرا پڑا گھر چھوڑ کر کہیں چلی گئی ہیں۔" نوازش نے بتایا۔ "کالج کے اندر دیکھی جاتی ہیں مگر کوشش کے باوجود معلوم نہیں ہو سکا کہ کب ان کی اور کس رستے سے واپس جاتی ہیں۔"

"جوں... میں دیکھوں گی۔ میرے پاس رشیدہ جیسی آزمودہ کار لڑکی ہے۔ میں کل اسے ادھر لگا دوں گی، کیونکہ ہمارا بنیادی مسئلہ خرم سلطان کی شناخت ہے۔ اس کے بغیر ہم کوئی قدم نہیں اٹھا سکتے۔ مافیا کے مقامی ماسٹر جانسن نے اپنے تعاون کی پیش کش کی ہے۔ ایک ایک آدمی نے بتایا۔

"لیکن میں فی الحال مافیا کے خنجر میں نہیں پھنسننا چاہتی۔"

"مافیا کے اور ہمارے مفادات مشترک ہیں، مادام! ایک اور

شخص نے پہلے ساتھی کو سہارا دیا۔ "بلکہ ہمارے مفادات کی بقا کے لیے مافیا کا تعاون سودمند ہوگا۔ وہ ایک منظم اور بری تنظیم ہے... اول تو خرم سلطان جیسے سر بھرے ان کی گردن کو بھی نہیں چھو سکتے۔ اگر مافیا کے قدم اکھڑ بھی گئے تو اس کے لیے دنیا کی ساری زمین موجود ہے لیکن اگر ہمارا شیرازہ بکھر گیا تو ہم سمندر ہی میں کود سکتے ہیں۔"

"آگ میں کودنے سے پانی میں کودنا بہتر ہوگا۔" مادام شہناز نے سہیدگی سے جواب دیا۔ "تم لوگوں نے شاید صرف مافیا کا نام ہی سنا ہے، اس کے اغراض و مقاصد سے واقف نہ بہت کم لوگ رکھتے ہیں۔ ہم صرف منشیات تک محدود ہیں جبکہ مافیا سیاست کا رخ مورتے، حکومتوں کے تختے اٹھنے، ممتاز شخصیات کو اغوا کرنے اور قتل و غارت کا بازار گرم کرنے کے لیے اپنی طاقت استعمال کرتی ہے۔ شاید کچھ لوگ یہیں بھی غدار کہتے ہوں گے لیکن میں سمجھتی ہوں کہ ہمارا بزنس صرف بے کار انسانوں کو مفلوج کرنا ہے لیکن جو کچھ مافیا کا مقامی ماسٹر جانسن، ہمارے ذریعے کروانا چاہتا ہے، وہی اصل فدا رہی ہے۔ ہم بڑے سہی لیکن اس سرزمین اور اس قوم کو تباہ کرنے کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔"

"اوہ..." نوازش بول پڑا۔ "کیا جانسن سے آپ کی ملاقات ہو چکی ہے؟"

"ہاں، وہ ہمارا جانا پہچانا کردار ہے۔" مادام شہناز نے اشیات میں گردن ہلائی۔ "جانتے ہو، وہ اپنے تعاون کے بدلے کیا چاہے گا؟"

جب کسی نے کوئی جواب نہ دیا تو شہناز بھڑکتی آوازیں بولی۔ "وہ ہمارے صوبوں کے درمیان نفرت کی آگ بجھ کر انا چاہتا ہے۔ مجھے تو یہ بھی یقین نہیں کہ واقعی اس کا تعلق مافیا سے ہوگا۔ وہ ہمارے کسی دشمن کا ایجنٹ بھی ہو سکتا ہے۔"

"اس کا تعلق کسی سے بھی ہو۔" ایک بوڑھا جواؤ نکھ رہا تھا بڑبڑایا۔

"لیکن اس کے ہاتھ بے ہیں۔ جس شخص کی تلاش کا مسئلہ زیر غور ہے، وہ بھلا وہ ہے ہم میں سے کوئی اسے پہچانا تاک نہیں۔ لہذا ہم سب کی متفقہ رائے یہی ہے کہ جانسن سے معاملہ طے کر لیا جائے۔"

"کیا تم لوگ اس کے لیے کام کرنا چاہتے ہو؟" شہناز نے باری باری سب کو گھورتے ہوئے پوچھا۔

"جی ہاں، مادام! علی نے جواب دیا۔ "باس ملاقات سے گھبرا کر، ملک سے فرار ہو چکا ہے۔ حکومت میں جو لوگ پاس کے ہمدست تھے، ہوا کا رخ دیکھ کر وفاداریاں بدل رہے ہیں۔ مجھے سمیت جو چند لوگ اپنے پاؤں پر کھڑے ہیں، اس طوفان کا مقابلہ کب تک کریں گے... پھر ہماری سرکاری چوکیاں بھی ہیں۔ ہم پاس کے انفادار تھے، اس کے مفادات کا خیال رکھا کرتے تھے۔ فیصلہ میں تو ہمارا تجربہ نہ ہونے کے برابر ہے...

اب آپ سلسلے آئی ہیں مگر باس کا گروہ تباہ ہو چکا ہے، گودام سرکاری قبضے میں ہیں۔ کیا آپ اپنے آدمیوں سے ملک گیر بزنس چلا سکیں گی؟

"ظاہر ہے میں تنہا کچھ نہیں کر سکتی۔"

"پھر پہلے گروہ مکمل کریں۔ علی نے طنز یہ بھیجے میں کہا۔" ورنہ یہ چند وفادار بھی آپ کا ساتھ چھوڑ جائیں گے۔"

"ٹھیک ہے۔" شہناز نے شکستہ آواز میں گہری سانس لی: "جانسن تک میرا پیغام پہنچا دو۔ میں اس سے ملنا چاہتی ہوں۔"

"بہتر مادام! ایک شخص پر جوش آوازیں بولا۔ آپ نے وائش مندانہ فیصلہ کیا ہے۔ جانسن اپنے لامحدود ذرائع سے کام لے کر خرم سلطان کو دوسرے سے بچو کر آپ کے سامنے لا بیٹھے گا۔"

"نہیں..." مادام نے سرد آوازیں جواب دیا۔ "اُسے میں اپنے ذرائع سے حاصل کروں گی۔ میں جانسن سے بزنس کے معاملات پر بات کرنا چاہتی ہوں۔ ہاتھی مگر بھی سوا لاکھ کا رہتا ہے۔ باس اپنے ساتھ صرف جانسن لے کر گیا ہے۔ اس کا صرف ایک گودام تباہ ہوا ہے لیکن ہمارے رابطے زندہ ہیں اور کام کر رہے ہیں۔ نوازش تم ساتھیوں کو بتاؤ کہ مال کی موجودہ پوزیشن کیا ہے اور ہمارے رابطے کتنا سال لے کر آئیں گے۔"

"کراچی میں ہمارے تمام گودام بالکل محفوظ ہیں۔ نوازش نے نوٹ بک کھول کر بتایا۔ "جبار خان کی فیکٹری تباہ ہوتے ہی ہم نے متبادل ذرائع سے معاہدہ کر لیا ہے۔"

ایک عورت ٹرائی ڈیکٹی انڈر لائی تو گنگو کا سلسلہ رک گیا تھا۔ چائے پینے کے دوران صرف نوازش ہی نے انتظامی ڈھانچے کے بارے میں باتیں کرتا رہا تھا اور میرے ذہن کی دائری میں نئے ناموں اور نئی راہوں کا اضافہ ہوا تھا۔ نوازش نے بتایا کہ سرکاری آجینسیوں کی مداخلت سے بچنے کے لیے پروانا نوٹ ہی نہیں بدلا گیا بلکہ تمام پورے کردار بھی تبدیل کر دیے گئے ہیں۔ اس نے مادام کو بتایا کہ پہلی کھیپ براستہ کوہاٹ پہلے تدرنگ پہنچائی جائے گی۔ پھر وہاں سے دوسری پارٹی مال وصول کر کے چکوال پنڈی روڈ استعمال کرے گی۔

جب سب لوگ چلے گئے تو مادام شہناز نے برقی ٹیبلن دبا کر رشیدہ کو طلب کیا۔ رشیدہ نے اندر آکر مادام کو گردن جھکا کر تعظیم دی اور مؤدب انداز میں کھڑی ہو گئی۔

"مجھے جاؤ، رشیدہ بیگم! شہناز نے سرد آوازیں کہا۔ رشیدہ شکر یہ ادا کر کے بیٹھ گئی۔ میں نے تمہارے گفت کو بھلتے ہوئے ایک چیلنج قبول کیا ہے۔"

"میں مادام کی ہمیشہ ممنون رہوں گی۔" رشیدہ نے ملائمت سے جواب دیا۔

"میری اطلاع کے مطابق صرف تم واحد لڑکی ہو جو خرم سلطان کو دیکھ چکی ہے اور زندہ ہے۔"

"نہیں، مادام! رشیدہ بولی۔ "باس کے گروہ میں کئی آدمی مرچے ہیں۔ ان میں ایک لڑکی نویدین بھی ہے۔ مجھے سیلمان مرموم نے بتایا تھا کہ خرم سلطان نویدین کے ذریعے باس تک پہنچا تھا۔"

"نہیں، رشیدہ! شہناز نے نفی میں گردن ہلاتی: "میں نے جھوٹ نہیں کہا، جس نے بھی اسے دیکھا وہ زندہ نہیں رہا۔ نویدین اسی ورنڈے کا شکار ہو چکی ہے۔ صرف تم زندہ ہو اور میں بھروسے تعاون سے خرم سلطان کو دیکھنا چاہتی ہوں۔ روایت تو یہی ہے پھر مجھے بھی زندہ نہیں رہنے دیا جائے گا مگر میں اسے دیکھ کر زندہ رہوں گی۔"

"خدا کرے، آپ سلامت رہیں۔" رشیدہ بھڑائی ہوئی آوازیں بولی۔ "کیونکہ آپ کی سلامتی، ہم سب کے لیے ضروری ہے۔ اگر وہ ہراس آنکھ کو چھوڑنے کا غلامی ہے جو اسے دیکھ لیتی ہے تو میں اس فہرست کی آخری لڑکی ہوں۔"

"ہم کل خان کی بڑی بیٹی ٹیمینہ سے ملنے کلن جائیں گی۔ شہناز نے کہا۔ "مجھے ملک لوانے بتایا تھا کہ خرم سلطان جیسے خوشخوار ورنڈے کے دل کا گوشہ ٹیمینہ کے لیے نرم ہو چکا ہے، وہی اب ان کا نگہ ہے۔ ہم ٹیمینہ کی نگہانی کریں گے بلکہ اسے اپنے پاس لے آئیں گے۔ خرم سلطان جہاں بھی ہوگا اپنی محبوبہ کو بچانے دوڑا آئے گا۔"

"گستاخی معاف، مادام!"

"ہاں، ہاں... بولو۔"

"اگر باس جیسا باخراہ و باذرائع شخص ٹیمینہ کو چھو میں گھنٹے میں روک سکا تو ہم..."

"اوہ..." مادام شہناز چونک پڑی۔ "تو تم بہت کچھ جانتی ہو؟"

"جی ہاں، مادام! اس کے لیے میں باہر کی ممنون ہوں۔"

مادام نے میری جانب دیکھا اور میں نے مسکرا کر اثبات میں گردن ہلا دی۔

"بابرا تم اس سلسلے میں میری کچھ مدد کر سکتے ہو؟"

"فی الحال تو آپ کے اشارے پر کسی کے جسم میں روشن دان بنا سکتا ہوں۔"

"اگر تمہیں خرم سلطان کی تلاش پر لگایا جائے تو...؟"

"تو میں اسے گھسیٹ لاؤں گا۔"

"اوہ..." مادام نے قہقہہ لگایا۔ "وہ مردہ جانور نہیں ہے بابرا! کوئی بات نہیں، پہلے اسے مردہ بناؤں گا پھر گھسیٹ لاؤں گا۔"

"کیا تم سنجیدہ ہو؟"

"قتل جیسی واردات غیر سنجیدہ نہیں ہو سکتی، مادام! میں نے ملک بچے میں جواب دیا۔ "لیکن میرا خیال ہے کہ آپ کو خرم سلطان کے کم اندر ان لوگوں سے زیادہ خطوبہ ہے۔"

"گھل گربات کرو، بابرا! مادام نے پیٹو بمل کر کہا۔ "تمہارا تھارہ کن لوگوں کی طرف ہے؟"

"یہی لوگ جو یہاں تھے۔ میں نے بتایا۔ ان کی باتوں سے میں نے یہی نتیجہ اخذ کیا ہے۔ وہ کسی جانسن کو اپنا نیا باس منتخب کر چکے ہیں۔"

"میرا مسئلہ ہے۔" شہناز ترمخ کر بولی۔ "میں مٹی کی مورتی نہیں ہوں۔"

"گستاخی معاف، مادام! میں نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر غور سے بچے میں کہا۔ "اب یہ ہمارا بھی مسئلہ ہے۔ ممکن کا مطلب، کیوں پر کرنا کرنا ہے۔ کم از کم میں آپ کے مسائل سے الگ نہیں رہ سکتا۔ اگر میرا مشورہ قابل عمل ہو تو عرض کروں گا، آپ پہلے جانسن سے بات چلیں اور اسے گروہ کی سربراہی دے دیں۔"

"اسحاقانہ باتیں نہ کرو، مشر! شہناز ترش آوازیں بولی: "میں نے تو ملک نوازی کی برتری کبھی قبول نہیں کی۔ جانسن کے مقاصد، ہمارے مقاصد سے میل نہیں کھاتے۔ وہ ملک میں سیاسی تبدیلی چاہتا ہے، جبکہ ہم صرف بزنس کی حد تک مصروف عمل ہیں۔"

"مجھے بات مکمل کرنے دیں، میڈم! میں نے نرم آوازیں کہا۔...

"جانسن اس پر یقین کرے آپ کے لیے بہت سی آسانیاں فراہم کرے گا۔ آپ جانتی ہیں کہ خرم سلطان بچے نہیں چھوڑتا۔ وہ بڑے دولت مند لوگوں سے کاٹتا ہے۔ جانسن منظر عام پر آکر خرم سلطان کی توجہ اپنی طرف مبذول کرے گا۔ اگر خرم سلطان اسے گرانے میں کامیاب ہو گیا تو ایک دشمن قوم غارت ہو جائے گا اور اگر جانسن سے خرا کر کم نوٹ گیا تو آپ محفوظ ہو جائیں گی۔ دوسری طرف ان لوگوں کی فدا واریاں اور عزائم کھل کر سامنے آجائیں گے۔ آپ جان نہیں گی، کون آپ کا فدا دار ہے اور کون تبدیلی چاہتا ہے۔"

"شکر، مشر! بابرا شہناز کی نگاہوں میں تحسین کی روشنی نمایاں تھی۔ "تمہاری تجویز مجھے پسند آئی... لیکن میری نمایندگی تم کرو گے... ہاں ایک بد فطرت شخص ہے میں اس سے ملنا نہیں چاہتی۔"

"مجھے کوئی اعتراض نہیں۔ آپ نوازش سے ایڈریس معلوم کر لیں۔"

"ٹھیک ہے، میں تمہیں بتاؤں گی۔" مادام شہناز اٹھ کر بغلی دروازے سے دوسرے کمرے میں چلی گئی۔ رشیدہ نے کچھ لوٹنا چاہا لیکن میں نے اشارے سے روک دیا۔

ایک ملازم نے مجھے اور رشیدہ کو کمرے دکھائے۔ ہمارا ہاتھ روم کامن تھا۔ میں نے دروازہ اندر سے بند کر کے سب سے پہلے مشینی جاسوس کو تلاش کیا۔ میری چھٹی جس اور مادام جیسی عورت نے خبردار کیا تھا۔ پلنگ کی پتی کے ساتھ تہایت ہی طاقت ور ٹرانسمیٹر ٹیپ سے چپکایا گیا تھا۔ رشیدہ کے پلنگ میں بھی ویسا ہی جاسوس چھپا ہوا تھا۔

رشیدہ کی زبان بندی کام کر گئی تھی۔ میں نے اسے ٹرانسمیٹر دکھایا پھر اسے ساتھ لے کر ہاتھ روم میں چلا گیا۔ میں اس جاسوسی نظام سے فائدہ اٹھانا چاہتا تھا۔ جرات کسی کی عدم موجودگی میں کی جائے، وہی موثر ہوتی ہے۔ دشمن کو اگر اسی کے ہتھیار سے مارا جائے تو اسے دہرا دکھ ہوتا ہے... چونکہ رشیدہ بھی بنیادی طور پر اسی لڑکی تھی اس لیے میرا منصوبہ سمجھنے میں اسے کوئی دشواری پیش نہ آئی تھی بلکہ میرے منصوبے کے نٹ بوٹ کئے میں اس نے اہم بدل ادا کیا تھا۔

"بابرا! میری میڈم کیسی گئی تھیں؟" کمرے میں آکر رشیدہ نے پوچھا۔

"اگر تمہاری ناراضگی پیش نظر نہ ہوتی تو کہتا، مجھے بے حد متاثر کر گئی ہے۔"

"میں تو تمہاری وحشی فطرت سے خوف زدہ تھی۔ اگر تم مادام کو ناپسند کرتے تو مجھے بڑا دکھ ہوتا۔"

"ایسی بات ہو سکتی تھی، اگر مادام تمہاری ٹیمینہ ہوتیں۔" میں نے شگفتہ آوازیں کہا۔ "جان! مادام تو ایک گریس فل خاتون ہیں، اگر کتہ بھی ہوتا جس کا کوئی احسان تم پر ہوتا تو میں اس کے لیے بھی جان پر کھیل جانے کا فیصلہ کرتا لیکن ایک بات ایسی ہے کہ شاید مادام خود مجھے الگ کر دیں۔"

"نہیں، بابرا! رشیدہ دھڑک کر بولی۔ "تم ایسی کوئی بات نہیں کرو گے۔ تم ہمیشہ یاد رکھو گے، بابرا! کہ صرف مادام کا سایہ ہی مجھے باہر کی دھوپ سے بچا سکتا ہے۔ میں ہی وہ لڑکی ہوں جس نے خرم سلطان کو بہت قریب سے دیکھا ہے اور میں ہی ہوں جس نے اس کی شناخت کا اعلان کیا تھا۔ وہ جانتا ہے کہ اس کو شکار کرنے والی تمام پارٹیاں صرف میرے تعاون ہی سے اسے شکا کر سکتی ہیں۔"

"میری جان! میرے بچے میں عاشق صادق جیسا دلہانہ پن تھا۔ یہی تو میں چاہتا ہوں کہ مادام مجھے صرف ان دیواروں تک



”آپ ایک ممتاز خاتون ہیں، مادام! آپ کی حیثیت سے مافیا کا مقامی سربراہ بھی استفادہ کرے گا۔ امپورٹ ایکسپورٹ کا بزنس اُن کی ضرورت ہے۔“

”اس دلدل سے بچنے کا کوئی راستہ؟“

”موصداً، تدبیر اور دشمن کی چال پر نگاہ رکھ کر آپ محفوظ رہ سکتی ہیں، مادام!“

”ہاں، بابرا! مادام نے اپنی چھٹا چھٹا زلفوں کو جھٹک کر پشت پر پھیلا دیا۔ لیکن میں تنہا مافیا جیسی دہشت پسند اور منظم تنظیم سے مقابلہ نہیں کر سکتی۔ رشیدہ کسی بھی حوالے سے مجھے مزہ نہیں اڑا دینے والی۔ رشیدہ کے نام پر تم سے بھرپور تعاون کی درخواست کروں گی۔“

”ہاں، بابرا! رشیدہ تڑپ کر بولی: ”میرے لیے، میری خوشی اور سلامتی کی خاطر انکار نہ کرنا، بابرا! ہر شخص اپنے اندر آئینہ پالتا ہے، میں خوش بخت ہوں، میں نے دونوں صنفوں کے لیے جو معیاری آئینہ تراشے تھے، وہ مجھے تمہاری اور مادام کی شکل میں مل گئے ہیں۔“

”میں انکار کرنے نہیں چاہتا تھا، رشیدہ! میں نے مسکراتے ہوئے کہا: ”لیکن میری فطرت سے تم بخوبی آگاہ ہو۔ میں، مادام کے سامنے کچھ شراٹھار کھنا چاہتا ہوں۔“

”ہاں، بابرا! بولو۔ مجھے تمہارے تعاون کی خاطر ہر شرط منظور ہے۔“ مادام نے جلدی سے کہا۔

”پہلی اور بڑی شرط اہم ہے۔ آپ کو مجھ پر اعتماد کرنا ہوگا۔“

”میں بائیں ہاتھ کی چھوٹی انگلی پر انگشت شہادت رکھتے ہوئے بولا۔

”اعتماد کے بغیر میں ایک قدم بھی نہیں اٹھا سکتا۔ دوسری شرط ہے،

بھی یہی لوگ تھے۔ نوازش، ان لوگوں کا نمایندہ بن کر میرے پاس گیا تھا۔ میرا تعلق ملک نواز سے مکمل کبھی نہیں رہا۔ ہم ایک تھے لیکن بزنس کے معاملے میں بالکل الگ اور خود مختار تھے۔ میرا اپنا بزنس اور طریقہ کار تھا اور ملک اپنے بزنس کا فائدہ دار تھا۔ اب میں سوچتی ہوں کہ اس بچے میں میرا پاؤں آخر کیوں پھنسایا گیا ہے۔“

”مجھے زیادہ واقفیت نہیں ہے، مادام! میں نے صوفی کی پشت گاہ پر گردن ڈھیلی چھوڑتے ہوئے کہا: ”لیکن یہاں لانے سے قبل رشیدہ نے جتنا کچھ آپ کے بارے میں بتایا تھا، اس سے میں بھی رلنے قائم کر سکا ہوں کہ یہ لوگ ملک نواز کو پسند نہ کرتے تھے۔ خرم سلطان کا ہوا کھڑا کر کے اور اندرون خانہ حکومت کو اس کے خلاف اگسایا گیا ہے۔ مقصد یہ رہا ہوگا کہ ملک نواز اس فیملی سے آؤٹ کر دیا جائے اور مافیا کو اس فیملی میں اتارا جائے۔“

”اس سے تو ایک اور شک ابھرتا ہے۔“ شہناز نے پہلو بدل کر کہا: ”ہو سکتا ہے، خرم سلطان بھی اسی جنگل کا دندہ جو جسے ملک نواز سمیت تمام قابل ذکر لوگوں کو ختم کرنے کے لیے مقرر کیا گیا ہو۔“

”آپ کی ذہانت قابلِ داد ہے، مادام! میں بھی اسی لائن پر سوچ رہا ہوں، ”ورنہ ایک تنہا نوجوان اتنی تباہی نہیں پھیلا سکتا۔ اس کی پشت پر کوئی ایسی طاقت ہے جو اس کے لیے پہلے ناہ ہمار کرتی ہے اور پھر شکار کو بانک کر اُسے چھوڑ دیتی ہے، وہ طاقت... حکومت یا یہ لوگ ہی ہو سکتے ہیں۔“

”اگر ہمارا تجزیہ درست ہے تو کسی وقت بھی خرم سلطان کے ہاتھ میرے نرخرے تک آسکتے ہیں۔“

”میرا خیال آپ سے قدرے مختلف ہے، مادام!“

”وضاحت کرو، بابرا!“ مادام اُٹھتے ہوئے بولی۔ اس نے کبھی بھی ٹانگوں سے اتار دیا تھا۔ ”میں کوئی عام عورت نہیں ہوں... لیکن خرم سلطان کا خوف میری ہڈیوں کو بھی متاثر کرنے لگا ہے۔“

”میرا خیال ہے، پہلے وہ لوگ آپ کو اپنی صف میں شامل کریں گے اور پھر پوری صف کو جانسن کے سامنے پیش کر دیں گے۔ اس سے وہ لوگ دُہرا فائدہ اٹھانا چاہیں گے۔ کل کسی وقت ملک نواز واپس آجاتا ہے اور حکومت بدل جاتی ہے تو آپ کی وجہ سے یہ لوگ محفوظ رہیں گے۔“

”ہاں...“ مادام کی خوبصورت آنکھوں میں سوچ لہریں مارنے لگی۔ ”یقیناً ایسی صورت میں یہ لوگ پھر ملک کو اپنی وفاداری اور مجبوری پیش کر دیں گے۔“

سوچ کی کوئی جھوکی چمکاؤ جب بھی کھلے دریچے سے ذہن میں داخل ہو جاتی تھی تو ذہن کی دیواروں کو بڑی اذیت ناک صورتِ حال کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔

”نہیں، بابر بول رہا ہوں۔“

”معاف کرنا، ڈیر!“ مادام شہناز کی شیریں آواز سنائی دی... ”تمہیں ڈسٹرب کر رہی ہوں۔ پلینز، رشیدہ کے ساتھ میرے بیڈ روم چلے آؤ۔“

”خالی ہاتھ، مادام!“

”اوہ... کوئی خطرہ نہیں ہے۔“ شہناز نے مختصر سا قہقہہ لگایا۔ ”ابھی نیند نہیں آ رہی، سوچا تم لوگوں سے باتیں کر لوں۔“

”حاضر ہو رہا ہوں، مادام!“ میں نے کبل پر سے اچھالتے ہوئے کہا۔ ہمارا بویا آٹا ایک ایک بیج بار آور ثابت ہوا تھا۔ مادام نے یقیناً ہماری باتیں سن لی تھیں۔ گویا گھر سے پانی کی بڑی مچھلی نے کانٹا بگل لیا تھا۔ مچھلی کے شکاری جانتے ہیں کہ جب مچھلی صبح کے ساتھ کانٹا بگل لیتی ہے تو اُسے بالآخر ساحل کی گرم ریت پر آنا ہی پڑتا ہے۔ اچھے شکاری، ڈور کو ڈھیل دے کر پہلے مچھلی کو خوب تھکاتے ہیں، پھر ایک بھر پور جھجکاؤ سے اس کا رشتہ پانی سے منقطع کر دیا کرتے ہیں۔ مجھے بھی دیکھنا تھا، مادام کتنی ڈھیل چاہتی ہے۔

میں نے دستک دے کر رشیدہ کو بھی مادام کے بلاؤ سے آگاہ کر دیا تھا۔

جب ہم کمرے میں داخل ہوئے تو اس نے گلاس سے آخری گھونٹ صحت میں اُنڈیلا اور گھٹ سے گلاس تپانی پر رکھ دیا۔ میرے لیے یہ نیا انکشاف تھا کہ مادام شراب بھی پیتی ہے۔ دراصل سگریٹ اور شراب کے بارے میں، میں ہمیشہ اس غلط فہمی میں مبتلا رہا تھا کہ یہ عیناً شی صرف مرد ہی کرتے ہیں۔

”رشیدہ...“ مادام نے بالوں کو میسرینڈ کی گرفت سے آزاد کرتے ہوئے کہا: ”کپ بورڈ سے دو گلاس نکال لاؤ۔“

”سوری، مادام! رشیدہ مودب انداز میں بولی: ”جو تک بار پسند نہیں کرتا، اس لیے میں نے بھی آپ حیات کا استعمال ترک کر دیا ہے۔“

”اچھا جذبہ ہے۔“ مادام نے گھٹروں پر کبھی پھیلاتے ہوئے کہا: ”کاش مجھے بھی کوئی ایسا ساتھی مل جاتا۔ بیٹھو۔“ میں صوفے پر بیٹھ گیا اور رشیدہ کو کسی پرچم گئی۔ ”بابرا میں نے سوچا ہے کہ اس نتیجے پر پہنچی ہوں کہ ملک نواز کے بعد، اس کے وفادار اپنی اپنی پٹاری کا منہ بند کر چکے ہیں۔ جانتے ہو، مجھے یہاں بلانے والے

خود نہ رکھیں۔ ہم دونوں باہر جا کر خرم سلطان کو قریب آنے کی دعوت دیں۔“

”اوہ... نہیں، بابرا! میں... میں...“

”رشیدہ...“ میں کڑک کر بولا: ”پھر وہی روایتی لڑکی جیسی باتیں کرنے لگی ہو۔ تم جانتی ہو، مجھے ایسی لڑکیوں سے کس قدر نفرت ہے... میں تمہیں رنگ و روپ کی وجہ سے اپنے اندر نہیں لایا تھا بلکہ تمہارے اندر اس لڑکی کو میں نے دیکھا تھا جو میرے خوابوں میں زندہ تھی۔ کیا تم خرم سلطان سے فرتی ہو؟“

”نہیں...“ رشیدہ کھٹی کھٹی آواز میں بولی: ”مجھے اپنی زندگی کا نہیں تمہاری سلاحتی کا خوف ہے۔ باہر میرے ساتھ اگر اس نے تمہیں دیکھ لیا تو وہ یہی سمجھے گا، میں کسی شکاری کے ساتھ ہوں۔“

”اور میں یہی چاہتا ہوں کہ وہ دیکھ لے اور میرے سلسلے آئے۔“ ”تم، مادام کی حفاظت تک ہی محدود کیوں نہیں رہتے بابرا...؟“

”رشیدہ التجا نہیں آدازیں بولی۔

”اس لیے کہ مادام کوئی اچال کوئی خطرہ نہیں۔“ میں نے جواب دیا۔ ”مادام کے گرد سازشوں کا جال بچھانے کی کارروائی ہوگی۔ مادام کے اپنے ہی لوگ جو کسی عورت کے ماتحت نہیں رہنا چاہتے... وہ مادام کو سیاسی شکست دیں گے۔ میں مادام کے جسم کی نہیں بلکہ اس کی ساکھ اور عزت کی حفاظت کرنا چاہتا ہوں۔ اس کے لیے مجھے مادام کے تعاون کو ساتھ لے کر اُن لوگوں کے اندر جانا ہوگا۔“

”کیا وہ لوگ واقعی مادام کی سربراہی کو دل سے قبول نہیں کرتے؟“

”ہاں، جان: وہ لوگ متبادل قیادت کی تلاش میں ہیں... ایسی قیادت جو اُن کے مفادات کی اندرون اور بیرون ملک بہتر حفاظت کر سکے... اور وہ ہے مافیا کا مقامی ماسٹر جانسن! اگر انھوں نے جانسن کو اپنی وفاداریاں سونپ دیں تو ایسی صورت میں مادام کی زندگی خطرے میں ہوگی۔ مافیا والے متنازی طاقت برداشت کرنے کے عادی نہیں ہیں۔ دوسری صورت یہ ہے کہ مادام بھی خود کو مافیا کے حوالے کر دے۔“

”ٹھیک ہے، بابرا! میں مادام کی سلامتی اور مفاد کی خاطر تمہارا ساتھ دوں گی۔“

”اس سلسلے میں ہم کل کسی وقت مادام سے بات کر لیں گے۔“

میں نے جمادی لیتے ہوئے کہا: ”اب تم جاؤ، مجھے نیند آرہی ہے۔“

سانڈیل پر دیکھا، سرخ نیلی فون سیٹ گنگنانے لگا تو میں نے کروٹ بدل کر ریسیور اٹھا لیا۔ ابھی میں نے سونے کے لیے نیند کو وارو کرنے کا عمل شروع ہی کیا تھا کہ یونٹ میں سوچوں کے لیے درجہ کھلا نہیں رکھنا چاہتا تھا۔ میرے ساتھ ماضی کی کئی راتوں کے ترخ تجربات تھے کہ

آزادی۔ یعنی میں اپنی صوابدید پر فیصلہ کر سکوں اور آپ سے صرف منظوری لے لیا کروں گا، تیسری اور آخری شرط ہے رشیدہ کی سلامتی۔

"میں تمہاری تینوں شرائط دل و جان سے قبول کرتی ہوں، بابو! مادام نے بڑے جان دار انداز میں کہا۔ میں تم پر اعتماد کر چکی ہوں۔ تمہیں ہر کارروائی کی پوری آزادی ہوگی لیکن صرف ایک بات کا خیال رکھنا کہ وہ لوگ تمہیں اتھارتی نہ سمجھ لیں، ورنہ انہیں اعتراض کا ایک جواز مل جائے گا۔ رہی رشیدہ، تو میں اسے اپنی جان سے بڑھ کر محفوظ رکھوں گی۔"

"شکریہ مادام! میں نے ممنون نگاہوں سے اس کی آنکھوں میں دیکھا۔ اب آپ مجھے ان لوگوں کے مکمل کوائف بتائیں کہ کون کیا ہے اور گروہ میں اس کی پوزیشن کیا ہے۔ میں ہر ایک کے قد کے لحاظ سے اس کی قبر کھودنا چاہتا ہوں۔"

"صبح، تمہیں فہرست مل جائے گی، مادام نے بتایا۔ میرا مشورہ ہے زیادہ توجہ نوازش اور علی پر مرکوز رکھنا۔ نوازش مالکیت میں اور علی حکومت میں کلیدی حیثیت رکھتا ہے۔"

"کیا نوازش یہاں کا شہری ہے؟"

"نہیں... مادام نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ جس طرح پشاور اور پٹنہ اس بزنس کے ابتدائی اڈے ہیں، اسی طرح کراچی آخری اڈا ہے۔ جو مال اندرون ملک چلانا ہوتا ہے وہ پٹنہ اور لاہور رکھ کر باقی کراچی بھیج دیا جاتا ہے۔ نوازش وہاں فنانس شعبے کا سربراہ ہے۔ کراچی سے اسی فی صد مال بذریعہ سمندر باہر بھیجا جاتا ہے اور اس کی نگرانی نوازش کرتا ہے۔"

"آپ کا مال بھی وہی بھیجتا ہے مادام!"

"ہاں، میں نے ملک کی سفارش پر اسے ہی انجنیسی دے رکھی ہے۔"

"اب رہ گیا مسئلہ ہمارے درمیان معاوضے کا۔"

"اوہ... مادام نے بے قراری سے ہونٹ کاٹ لیا۔ کیا تم تنخواہ پر..."

"سودی مادام! میں نے طنز یہ انداز میں کہا۔ میں ماتحت بن کر شاید ایک دن بھی خوش نہیں رہ سکتا۔ رشیدہ جانتی ہے میں کس قسم کا شخص ہوں۔"

"لیکن فی الحال آمدنی والا تو کوئی کام تمہارے سپرد نہ ہوگا۔"

"میں فی الحال کی بات نہیں کر رہا، مادام! میں نے ٹھوس آواز میں کہا۔ میں اس وقت کی بات کر رہا ہوں جب تمام بزنس پر آپ کا قبضہ ہوگا۔"

"چھر کی بات پھر ہوگی بابو! مادام ہنس پڑی۔ ابھی تو بچی ہیٹ میں ہے اور گندم کیفیت میں ہے۔ لہذا میں تمہیں ابھی سے مادام بنا کر روٹیاں نہیں کھلا سکتی۔ ہاں جب اقتدار میرے ہاتھ میں ہوگا تو تم دیکھو گے، شہناز احسان فراموشی نہیں کرے گی۔ ہاں فی الحال تمہارے تمام اخراجات میں برداشت کروں گی۔ اس نے پرس سے چابی نکال کر رشیدہ کی جانب بڑھائی۔ سیف سے باہر کو دس ہزار روپے دے دو۔"

"نہیں۔ یہ بوجھل رقم ہے، صرف پانچ ہزار۔ میں نے کہا۔ رشیدہ نے سیف کا پور اپٹ کھول دیا۔ وہ اپنے مقصد میں کامیاب رہی تھی۔ میں نے سیف کی مالیت دیکھ لی تھی۔ مادام معقول سرمایہ ساتھ لائی تھی۔ رشیدہ نے ایک گڈی میری جانب اچھالی اور سیف بند کر کے چابی مادام کو دے دی۔"

"ہاں... مادام چابی پرس میں ڈالتے ہوئے کسی خیال کے تحت چونک کر بولی۔ رشیدہ اتم نے باہر کے بارے میں بتایا تھا کہ یہ خرم سلطان کو جانتا ہے۔"

"جی ہاں، مادام! میں نے اندکی گڑگڑاہٹ پر مشکل قابل پاتے ہوئے کہا۔ لیکن اب شاید نہ پہچان سکوں۔ ہم کلچ میں ساتھ تھے۔ وہ مجھ سے ایک اسٹیپ سینئر تھا۔"

"وہ بوڑھا تو نہیں ہو گیا، بابو! مادام ہنسنے ہوئے بولی۔ کل ہم پہلے رنگ بازار خان کی بڑی بیٹی کو اٹانے کی کوشش کریں گے۔ اگر وہ ہمارے ہاتھ آگئی تو خرم جہاں بھی ہوگا، اسے سامنے آنا پڑے گا۔ میں اس غصہ پر غصہ کر دوسری طرف توجہ دوں گی۔"

"ٹھیک ہے، مادام! میں نے گڈی اچھالتے ہوئے کہا۔ ہم الگ الگ محاذوں پر کام کریں گے۔ میں ابتداءً الگ الگ ہونٹ سے کروں گا۔"

"اوکے! مادام نے پھر کیل اوپر کر لیا۔ اب تم لوگ آرام کرو۔ کارپڈور میں آوازہ بلیاں گھوم رہی تھیں۔ میں نے گیٹ کی جانب دیکھا۔ ایک مسلح پہرے دار ہاتھ دے پر تھیل رہا تھا کچھ آدمی بندوق کے شیلڈ تلے بیٹھے تھیں کر رہے تھے۔"

"خرم... رشیدہ نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر سرگوشی کی کہیں نہ کہیں کچھ گڑبڑ ہے۔"

"بتا دو... ورنہ تمام بات اس گڑبڑ کے کانٹوں پر مرکوز ہیں بدلتی رہو گی۔"

"شہناز کے بارے میں مشہور ہے کہ وہ بے کی عورت ہے، جیسے دہلوٹ ہوتے ہیں۔ ملائمت اور شائستگی اسے چھو کر بھی نہیں گزرتی۔"

"میں چار ملاقاتوں میں، میں نے اس کے چہرے پر مسکراہٹ کی ہلکی سی کرن بھی نہیں دیکھی تھی... لیکن اب وہ سرایا مسکراہٹ بنی ہوئی ہے اور قبضے بھی لگاتی ہے۔"

"وقت اور حالات انسان کو بدل دیتے ہیں، جان! میں نے اس کا ہاتھ پہلاتے ہوئے کہا۔"

"ہو سکتا ہے... مگر چھٹی جس بے نکل سی ہے۔ رشیدہ کھوئے کھوئے انداز میں بولی۔ کہیں مادام نے بی چوہے کا کھیل تو شروع نہیں کر رکھا۔"

"اگر وہ بی ہے تو اس بار چوہے اسے غنی کا ناچ نچادیں گے۔ ایک اور خطرہ بھی ہے خرم! رشیدہ بولی۔ تمہیں مجھے دیکھتے ہی لپک کر اٹے گی اور ہو سکتا ہے، مادام کی موجودگی ہی میں تمہاری خیریت دریافت کر بیٹھے۔"

"تم میک آپ میں جاؤ گی۔ جواز خرم سلطان بنالینا۔ میں نے بتایا۔ اگر تمہیں سے تہائی میں ملاقات ہو جائے تو اسے خطرے سے آگاہ کر دینا کہ وہ وقت مقررہ سے پہلے کلچ سے نکل جائے اور دوسری ہدایت تک کلچ نہ آئے۔"

"رشیدہ نے لفظی انداز میں سر ہلایا اور شب بخیر کہتی ہوئی اپنے بیڈروم میں چلی گئی۔ میں نے اپنے کمرے میں آکر فوننگ کی پٹی سے آلہ الگ کیا اور اس کا سیل نکال کر اسے بے جان کر دیا۔ پھر اپنے ٹرانسمیٹر پر پہلے بیگن کو اوکے کی رپورٹ دی پھر ہارون سے رابطہ ملا یا۔ تم صرف سنو گے، براہ راست رابطہ ملے ہی میں نے مدھم آواز میں کہا۔ پہلے یہ بتاؤ، فرید خان کہاں ہے؟"

"ساتھ والے کمرے میں اپنی پارٹی کے ساتھ موجود ہے۔ ہارون نے بتایا۔"

"میں نئی ہدایات اور معلومات کے ساتھ صبح ان سے ملنا چاہتا ہوں۔ دوسری اہم بات، کل مادام اور رشیدہ، کلچ جائیں گی... تم نگرانی کرو گے۔ میں نے ماسٹر کو بھی خطرے سے آگاہ کر دیا ہے۔ کلچ سے فارغ ہو کر تم میرے گاؤں کے ایک نوجوان دلاور تک میرا پیغام پہنچاؤ گے۔ اسے میں نے گروپ کے لیے منتخب کر لیا ہے۔ وہی تمہیں میرے خاندان کی خیریت اور دیگر تفصیلات بتائے گا۔ تم کل شام تک مجھے رپورٹ دو گے۔"

"بہتر... اور کوئی حکم؟"

"ان دونوں یہاں دو اہم اشخاص موجود ہیں۔ کراچی سے نوازش اور دوسرا اقیانامقامی سربراہ جانشن۔ ہو سکتا ہے، ہمیں بہت جلد ان دونوں سے ملنا پڑے۔"

"میرے پاس بھی ایک ضروری اطلاع ہے، چیف! ہارون بولا۔ میں نے اپنے ذرائع مسٹر حسن پر لگا رکھے ہیں۔ یہ بات اب شک و شبہ سے نکل آئی ہے۔ وہ بھی اس دھندے میں ملوث ہے۔ اس کی سرکاری گاڑی اور عہدہ ڈپٹی کے بارے میں مال لیتے ہیں، تمام مال ایک لیبارٹری کے حوالے کر دیا جاتا ہے جو میڈیسنز کے ڈپٹوں اور بوتلوں میں بند کر کے مطلوبہ انجنیسیوں تک پہنچایا جا رہا ہے۔"

"ٹھیک ہے۔ تم ایسی تمام انجنیسیوں کی فہرست تیار کر لو۔"

"ہم، مادام کے پروجیکٹ سے ملٹ کر دوسرا قدم مسٹر حسن کی گردن پر رکھیں گے۔"

"اسے شب بخیر کہہ کر میں نے مادام کے جاسوس کو پھر زندگی دی اور اسے اس کی جگہ چکا دیا۔ ممکن تو تھیں کہ آرائی تھی لیکن نیند کا کہیں دور وقت تک نام و نشان نہ تھا۔ میں بستر پر لیٹنے سے جس نبوت سے خوف زدہ تھا، وہ تو میری تاک میں ہی تھا۔ جو نہیں میں نے تکیے پر سر رکھا، بلاواسطہ نے ذہن کے کوارٹروں پر دستک دے دی۔"

"میں نے بڑی بے بسی سے نجات کا راستہ تلاش کیا لیکن مرتے سانپ کی طرح صرف کروٹیں ہی بدلنے پر قادر تھا۔ یادیں تو خرم و سرور... ہوائوں کی طرح باریک سے روزن سے بھی دوڑتی ہیں۔ میں دروازہ نہ بھی کھولتا تو ان کو اندر آ جاتا تھا۔"

"کتے ہی شناسا چہرے اسکرین پر اٹے سیدھے ٹیرے... اور دہشتناک ابھرے۔ ان میں ایسے چہرے بھی تھے جو محرک آگ میں بھرنوں کی بتاتیں دینے والے تھے، پیارے اور مہربان چہرے... میں ایک ٹنگ سفید چھت کو گھور رہا تھا۔ چہرے ایک دوسرے میں گڈ بھونکنے لگے پھر اسکرین پر صرف دو چہرے رہ گئے۔ ایک چہرہ زینت کا تھا، سوگوار اور باوقار چہرہ اور دوسرا ٹینگ کا چہرہ تھا جیسے صبح دم کنول کا پھول، جھیل کی سطح پر ڈول رہا ہو۔"

"بس یہی دو چہرے فاتح تھے اور ان میں فائنل مقابلہ تھا۔ جس طرح اس بیج کو فیصلہ کرنا مشکل ہو جاتا ہے جس کے سامنے ایسے دو کھلاڑی کھڑے کر دیے جائیں جنہوں نے ایک جیسی کارکردگی کا مظاہرہ کرتے ہوئے ایک ساتھ ویرلوانٹ کو چھو لیا ہو۔"

"پھر نہ جانے کیا ہوا... کس نے ہاتھ بڑھا کر ایک چہرے کو پیچھے کھینچ لیا تھا۔ زینت کا سا ہوا چہرہ آہستہ آہستہ دھڑکتا ہوا دھوئیں میں تحلیل ہو گیا۔"

"نیمین کے چہرے پر ہلکی ہلکی مسکراہٹ تھی۔ وہ کسی ایسے کمانڈر کی طرح مسرور نظر آ رہی تھی جو شکست و ریخت سے ٹکرانا ہوا کامرانی

کے ساحل سے آگیا ہو۔ میری نگاہیں پس منظر میں دھوئیں کی اس
بھٹی بھٹی شیبہ پر مرکوز تھیں جو شکست کی دھند میں ڈوب گئی
تھی کیونکہ وہ شیبہ مجھے کئی حوالوں سے عزیز تھی۔

میں نے حقیقی لرزتی طویل سانس لی۔ شاید وہ سکون کی کوئی
لہر تھی۔ اگر زمین ہارجاتی اور زینت اسکرین پر قابض ہو جاتی تو پھر
ہماری روایات کے ظالم ہاتھ ہمارے درمیان آگ کا دیا حاصل
کر دیتے۔ اس پاد زینت مجھے پکارتی اور میں اپنی صدیوں پرانی
روایات پر پاؤں رکھ دیتا تو انکسارے کفر کے پاؤں سے چٹ جاتے
میری یہ عجوبہ زینت بھی جانتی تھی۔ آج تک ہمارے خاندان کی کسی
بیوہ کی مانگ میں دوبارہ سینہ نہ نہیں چھڑکا گیا تھا۔ بزرگ تو اس
روایت کے خلاف بات تک سنا گوارہ نہیں کرتے تھے۔ نئی نسل میں
کوئی باغی ابھی پیدا ہی نہیں ہوا تھا جو اس ظالمانہ اور غیر اسلامی رزم
کے نیچے ہونے دھاکے توڑ دیتا۔

سنا ہے کہ ہمارے اجداد کا تعلق ایک کفر مند و خاندان سے
تھا۔ شروع شروع میں تو مسلمان عورتیں بھی سنی کی رسم ادا کرنے میں
فخر محسوس کیا کرتی تھیں۔ میرا خیال ہے، گھٹ گھٹ کر مرنے اور
قطرہ قطرہ زہر پینے سے وہ بھڑکتی مٹی آگ بہت تھی جو ایسی عورت
کو گھڑی بھر میں زندگی کی تمام اذیتوں سے نجات دلا دیتی تھی۔ اب
اور تب میں فرق صرف اتنا ہی ہے کہ اس وقت بیوہ دیکھتے الاؤ میں
کو جاتی تھی اور اب آخری سانس تک انگاروں پر چلتی ہے۔

زینت کے گنگے میں تختی لٹکا دی گئی تھی اس کی ڈوری میرے
کے عکس سے بھی مضبوط تھی اس ڈوری کو پھول کی کوئی تہی بھی نہ کاٹ
سکتی تھی۔ بالفاظ دیگر زینت ایک ایسے جہنم میں دھکیل دی گئی
تھی جس سے رہائی صرف موت کا فرشتہ ہی دلا سکتا تھا۔ دنیا کے
سامنے مرد اس کے لیے شجر ممنوعہ تھے۔ اسے اب حویلی کی چار دیواری
کے اندر ہی سلاگ کر جینا تھا۔

میں نے ٹینے کو دیکھتے دیکھتے محسوس کیا جیسے گرم پانی کی گریں
میرے کانوں میں داخل ہو رہی ہوں۔ میں نے کر دھکا بدل کر بھیجا
ہوا چہرہ نیچے پر رکھ دیا تھا۔

صبح دستک پر میری آنکھ کھلی۔ دستک ہاتھ روم کے دروازے
پر دی جا رہی تھی۔ میں نے اٹھ کر رشیدہ کے لیے ہاتھ روم کا دروازہ
کھول دیا۔

"آپ کی آنکھیں..." رشیدہ پریشانی سے بولی۔ "کیا آپ سوئے
نہیں تھے؟"

"سویا ہوں۔" میں نے انگریزی لیتے ہوئے کہا۔ "مگر سونے سے

پہلے بیداری بڑی اذیت ناک تھی۔ وہ کچھ بہتی... مگر میں جلدی
سے باہر نکل آیا۔

میرس پر مدام شہناز ایک بی سے کھیل رہی تھی۔ سورج خاصا
اوپر اچکا تھا۔ سنہری دھوپ میں شہناز کا حسن کچھ اور زیادہ نکھرا
نکھرا لگ رہا تھا۔ اس نے مسکراہٹ دی اور میں نے سر کو خم دے
کر تعظیم سے مسکراہٹ وصول کی۔ چونکہ ہاتھ دھو کر صاف تھا اور
میں نے کئی تک نہیں کی تھی اس لیے میں ان دھوئے منہ سے
شہناز جیسی صاف اور نفیس خاتون سے کوئی بات نہیں کرنا
پا رہتا تھا۔

لان پر جا کر دس منٹ تک میں گہری گہری سانسوں کے
ذریعے تھکا ہوا، پھپھڑوں میں بھر رہا تھا۔ مجھے خدشہ تھا کہ شہناز اور
نہ اتر آئے مگر میرا گریز شاید اس نے بھی محسوس کر لیا تھا۔ وہ میرس
ہی پر ہلکی رہی۔

شہناز نے صرف تلفظاً ہمارا ساتھ دیتے ہوئے ادھی پیل چلنے
لی تھی۔ "راجا صاحب! وہ مودب آواز میں بولی۔ "اب ہم پاد زینت
لہذا میں صرف دوسروں کے سامنے ٹھکانہ رویت اختیار کروں گی۔ کیونکہ
ان لوگوں کو ہمارے لئے منصوبے کی ہوا بھی نہیں لگنی چاہیے۔
"خاتین! میرے لیے ہر روپ میں ہر جگہ قابل احترام رہتی ہیں۔
مادم شہناز! میں نے ٹھیک سے ہونٹ صاف کرتے ہوئے کہا۔

"واقعی تم میں بہت اوصاف ہیں! بابر! شہناز کی نگاہوں
میں متالش کی روشنی چمکی ہوئی تھی۔ "ورنہ میرا خیال تھا کہ تم دوسرے
درجے کے فنڈے ہو گے جس طرح جمال خان تھا۔"

"میرا کوئی درجہ نہیں ہے، مادام! میں وقت کے سانچے میں
ڈھل جانے والا گارا ہوں۔ حسب ضرورت خود کو بدلنے پر قہر رت رکھتا
ہوں کیونکہ بنیادی طور پر میں صرف انسان ہوں۔"

"جو کچھ بھی ہو، بابر! شان دار ہو۔" مادام نے کہا اور رشیدہ
کے ہاتھ میں بھڑکی پیالی پر لرزہ طاری ہو گیا تھا۔ حالانکہ وہ صرف بہن تھی
لیکن مادام کے قدموں کا رخ دیکھ کر وہ ڈر گئی تھی۔ وہ خرم سلطان کی
وحشی فطرت سے آشنا تھی۔ اگر انسان کو ترزو میں تول کر رشیدہ نے
کاروان ہوتا تو میں اپنے تمام تر آٹے دوسرے پڑے میں رکھ کر تمہیں
خرید لیتی۔ اپنی دوست رشیدہ سے معذرت کے ساتھ۔ شہناز نے
چہرہ لگایا۔ "کیوں، رشیدہ! سودا کرو گی؟"

"ہم پہلے ہی بے دام بک چکے ہیں مادام! رشیدہ نے
ذومنی جواب دے کر اسے خاموش کر دیا تھا۔

"خیر! بعد کی بات پہلے آگئی۔" شہناز خود اسی جذباتی لہروں

سے نکل آئی۔ "فراغت کے مشغلے فراغت کے وقت ہی اچھے لگتے
ہیں۔ ہاں، بابر! تم کالج تک ہمارا ساتھ دو گے۔ گاڑی صرف ایک
ہی ہے۔"

"آپ دونوں چلی جائیں۔" میں گری کھسکا کر اٹھ کھڑا ہوا۔ میں
اپنا انتظام خود کروں گا... لیکن جانے سے قبل آپ مجھے بسٹ ضرور
دے دیں۔"

"سوری راجا! وہ معذرت خواہانہ انداز میں بولی۔ "کچھ دن اور
اپنے اعتماد کو میرے اندر راسخ ہونے دو۔"

"کوئی بات نہیں! میں شہناز! میں نے کندھے اچکائے۔ "اگر
وہ اہم نہیں ہے اور مستقبل قریب میں وہ کسی اہمیت کے حامل نہ بنے
تو میں اپنے ذرائع استعمال کروں گا۔ میں کسی فتنہ بازی سے اٹھ کر
ادھر نہیں آیا ہوں۔ گو میرا بنس اور طریقہ کار آپ لوگوں سے الگ رہا
ہے مگر قانون کی دھجیاں میں بھی بکھرتا رہا ہوں۔"

"کیا برائیاں گئے، بابر! شہناز نے میرے کندھے پر آہستہ سے
تھپکی دی۔ "نہیں! پاد زینت! اصول اور احتیاط ہماری دنیا کے لیے بے حد
اہم ہیں۔ کیا تم اپنے ساتھیوں کے کوائف مجھے دے سکتے ہو؟
"کوائف ہی نہیں! مادام شہناز! میں نے پلٹ کر جواب دیا۔
"بوقت ضرورت! میں اپنی فوس آپ کے سپرد کر سکتا ہوں۔"
"شکریہ، راجا! اس نے سر جھکا لیا۔ "میں خود میں ایسی حرکات
نہیں رکھتی۔"

میرے ذہن میں دن بھر کی مصروفیات موجود تھیں۔ شہناز
کے توسط سے صرف چند چہرے اور نام سامنے آئے تھے۔ اگر وہ ان کے
کوائف دے دیتی تو میرے لیے کچھ آسانی ہو جاتی۔ تھوڑے وقت میں
زیادہ فاصلہ طے کر لیا جاتا لیکن وہ وعدہ کر کے معذرت میں ڈوب
گئی تھی۔

میری کار، ہلی ڈے ان کے پارکنگ لٹ میں کھڑی تھی۔
چونکہ ہارون شروع سے تعاقب میں رہا تھا، اس لیے آگاہ رہا ہوگا کہ
کار وہاں سے ہٹانی ہے... پھر بھی میں نے جھانک لینا مناسب سمجھتے
ہوئے ہوٹل کا رخ کیا تھا۔ میری کار وہاں نہ تھی۔

وہاں سے میں نے ایک کار کو لے کر حاصل کی اور راگ رنگ
بہنچ گیا۔ مجھے تعاقب کا کوئی خطرہ نہ تھا۔ کیونکہ میں نے شہناز سے کہہ
دیا تھا کہ ابتدا راگ رنگ سے کروں گا۔

اکبر کاؤنٹر پر کھینیاں ٹیکے، رجسٹر پر جھکا ہوا تھا۔ میں نے
کاؤنٹر بچایا تو اس نے چہرہ اٹھا کر دیکھا اور پھر اس کے چہرے پر
فردیاز مسکراہٹ پھیل گئی۔

"ہارون کہاں ہے؟"
"وہ صبح سویرے نکل گئے ہیں جناب! اکبر خان نے بتایا۔
"دوسرے لوگ آپ کا انتظار کر رہے ہیں۔"
"اور کوئی پیغام؟"

"جی ہاں جناب! اکبر نے دروازے نوٹ بک نکال کر میرے
سلسلے رکھ دی۔ "تین کالیں تھیں۔ پہلی کال گنگنام تھی۔ کسی نے
اطلاع دی تھی کہ بہت جلد ملاقات ہوگی۔ دوسری اطلاع
ڈی۔ آئی۔ جی صاحب نے دی تھی۔ صدر بیرونی تھکنے کی حوالات
میں سوار خان نامی ایک شخص بند ہے جو تمہارے گھر کے چکر لگاتا ہوا
دیکھا گیا تھا اور پھر ہوٹل کی نگرانی کرتا ہوا پایا گیا تھا۔ اگر اس سے ملنا ہو
تو ڈی۔ ایس۔ پی کا حوالہ دے کر مل لو۔"
میرا پیغام لیکن کا تھا۔

"ٹینے کو حالت بے ہوشی میں نیاز میسج سینٹر
میں داخل کیا گیا ہے۔ وہ کالج تک شاپ سے شاہی
کباب ساتھ لائی تھی۔ دس بجے ہم نے کھانا کھلیا۔ گیارہ
بجے اسے پہلی تہ ہوئی۔ چھٹی کو اور مجھے کوئی تکلیف
نہیں ہوئی۔ ڈاکٹر نے زہریلے مادے کا انہما کیا ہے۔
چھٹی کو میں نے کالج چلنے سے روک دیا ہے۔
میں نے انٹاروی سے نیاز میسج سینٹر کا نمبر لیا۔

"دیکھیے، خاتون! رات گیارہ بارہ بجے کے درمیان ایک لڑکی
ٹینے ایڈمٹ ہوئی ہے۔ اس کے ساتھ اگر کوئی ہے تو اسے بلا دیں،
بصورت دیگر ٹینے کی موجودہ پوزیشن بتائیں۔"

"موجودہ پوزیشن..." خاتون کی لرزتی آواز ابھری۔ "آپ پہلے
اپنی پوزیشن بتائیں کہ آپ ٹینے کے کون ہیں؟"
"کیا جواب ضروری ہے، خاتون؟"

"جی ہاں! بے حد ضروری۔ کیونکہ اس مریض کی وجہ سے پوے
سینٹر کا نظام تباہ ہو چکا ہے۔"

"کیا مطلب؟" میں نے چیخ کر پوچھا۔
"ایک پارٹی اسے ایڈمٹ کروا گئی تھی اور دوسری پارٹی،
اسے کسی دوسرے ڈاکٹر تک لے جانے آئی تھی۔ دونوں میں پہلے ہاتھوں
اور پھر فائرنگ کا تبادلہ ہوا۔ چند مریض زخمی ہوئے ہیں اور سینٹر کے
شیٹے نوٹ گئے ہیں۔"

"کیا وہ اسے لے جانے میں کامیاب ہو گئے ہیں؟"
"ہاں، دونوں کو ساتھ لے گئے ہیں۔"

میں نے کھڑی میٹلی مارکر مسلسل توڑا پھر لحظہ بھر گنگ سا کھڑا

سوچتا رہا کہ کیا کروں؟ دل جیسے اچھل کر حلق میں پھنس گیا تھا، خون کی گردش کنپٹیوں پر ٹھوکریں مارنے لگی تھی، چہرہ بھی یقیناً بگڑا تھا۔ وہ نہ ابر کی آنکھوں میں استعجاب اور خوف نہ ہوتا۔ میں نے محسوس کیا کہ میرے تمام تر احساسات منہمک ہوئے جا رہے ہیں۔ میں نے سر کو جھٹک کر گہری گہری سانسوں کا عمل شروع کر دیا۔ مجھے منہمک نہیں ہونا چاہیے تھا۔

میں ہی تھا خرم سلطان، چوہدری جیسے وقت پہلے بھی مہلک ٹھوکریں مار چکا تھا۔ وہ کوئی انہونی بات تھی نہ انوکھی واردات تھی۔ میں یاد رکھتا تھا کہ جنگ میں کوئی بھی حادثہ رونما ہو سکتا ہے۔ "کیا بات ہے چیف؟" ابر کی لڑنی آواز سنائی دی۔ "ماسٹر کا پیغام کس وقت ملا تھا؟" مجھے اپنی ہی آواز اجنبی محسوس ہوئی تھی۔

"ناٹ ڈیوٹی پر تشریف لے چکے ہیں؟" ابر نے بتایا۔ "کیا اسے بلاؤں؟" میں نے اثبات میں گردن ہلائی۔ ابر نے ڈیڑھ گھنٹہ کے لیے والی گھنٹہ بجائی لیکن رات کی شفٹ ہوٹل سے جا چکی تھی۔ اوپر کون کو ہے؟

"مہمان کے ساتھ ہارکن اور کونز ہیں چیف؟" "ان کو بلا لاؤ۔"

تھوڑی دیر بعد فرید خان، ہارکن اور کونز دوڑتے ہوئے آئے اور میرا مودودیکہ کھڑا میں کھڑے ہوئے۔ میں نے ان سے ہتھیاروں کے بارے میں پوچھا۔ تینوں نے اپنی اپنی جیب تفتیش کر اثبات میں جواب دیا۔ ہارکن میری کار پورچ میں چھوڑ گیا تھا۔ ہارکن کو ڈیڑھ گھنٹہ سیٹ پر بٹھا کر میں اس کے ساتھ بیٹھ گیا۔ گرتز کالج میں نے ہارکن کی سوائیہ نگاہوں کو بتایا۔

کاسٹے جو نہی پاجھوٹ آفس کے چوک سے ٹرن لیا میری نگاہ اشارے پر کھڑی ہوئی کار پر جا پڑی۔ ڈرائیونگ سیٹ پر مادام شہناز تھی۔ ایک شک فوری طور پر رفع ہو گیا کہ ٹیڈہ تاحال مادام شہناز تک نہ تو پہنچائی گئی ہے نہ ہی اسے مطلع کیا گیا ہے۔ وہ وہ کالج نہ آتی۔ میں رشیدہ سے نئی قیام گاہ معلوم کرنے آیا تھا۔ جیلڈ سینٹر کی اطلاع اور بیگن کے پیغام میں تصدیق تھا۔ درمیان سے کوئی گڑھی گم تھی۔ ٹک شاپ سے لائے گئے کباب اگر زہرے تھے تو امینہ اور بیگن کیوں محفوظ رہے تھے اور وہ گم شدہ گڑھی امینہ سے معلومات حاصل کر کے ہی تلاش کی جا سکتی تھی۔

"گاڑی ساتھ میں لگا دو ہارکن! میں نے پلٹ کر دیکھتے ہوئے

کہا۔ اشارہ کھینچے ہی شہناز کی کار ٹورن لیتی دکھائی دی۔ میں کال سے نکل کر سامنے جا کھڑا ہوا۔ شہناز نے میرے قریب کار روک دی۔ پیچھے بیٹھ جاؤ، باہر... وہ بولی اچھا ہوا، تم ابھر چلے آئے۔ میں اس ٹک کو باہر لانے کی کوشش کروں گی۔

"خوش گوار دن کا آغاز ہو چکا ہے، مادام! میں نے بشاشیں لے لیے ہیں۔" رشیدہ کی خاطر میرے ذرائع بھی اسی انداز پر کام کر رہے تھے۔ مجھے اطلاع ملی ہے کہ رنگ بازخان کی بیٹی اور خرم سلطان کی بیویہ ٹیڈہ گل نامت ایک جیلڈ سینٹر سے اغوا کر لی گئی ہے۔ "اور...؟" مادام اچھل پڑی۔ لیکن مجھے اطلاع نہیں دی گئی۔

"آپ واپس جائیں، مادام! میں نے کہا۔" ہو سکتا ہے، وہ لوگ آپ سے رابطہ قائم کریں۔ میں اور رشیدہ بھی اپنے طور پر خرم سلطان کی نقل و حرکت پر نگاہ رکھیں گے۔ وہ بھی رات دس بجے ہوٹل میں دیکھا گیا ہے۔ میں نے رشیدہ کو اترنے کا اشارہ کیا۔ وہ ڈیڑھ گھنٹہ کے اترنے لگی تو مادام شہناز نے اس کا بازو پکڑ لیا۔ "نہیں، رشیدہ میرے ساتھ رہے گی۔"

"رشیدہ کو میں بطور چال استعمال کرنا چاہتا ہوں، مادام! میں نے رشیدہ کا دوسرا ہاتھ تھام لیا۔ ہم صدر کے علاقے میں گھومیں گے۔ وہ رشیدہ کو دیکھ کر جھپٹا مارے گا۔"

وہ متنبذ ہی تھی کہ میں نے رشیدہ کو گھسیٹ لیا۔ شہناز کو میری یہ حرکت بُری لگی تھی لیکن وہ سر راہ بس دانت چرس کر رہ گئی تھی۔ اس کی ناراضگی کی بجائے پروا نہیں تھی، حالات ہی بدل گئے تھے۔ میرے علم میں یہ بات بھی تھی کہ کچھ لوگ مادام شہناز کے مخالف ہیں اور وہ موازی گروہ منظم کر رہے ہیں۔ یہ بھی ہو سکتا تھا کہ مادام کو شکست کی ضرب لگانے کے لیے دوسری پارٹی نے مادام کا شکار چھین لیا ہو۔

مادام شہناز نے کار بیگن میں لے جا کر ٹرن لیا میں رشیدہ کے ساتھ اپنی کار سے آگے نکلتا چلا گیا۔ ہارکن نے بھی میری احتیاط کی دیواروں کو بڑا سہارا دیا تھا۔ وہ بھی گاڑی آگے لے گیا تھا۔ شہناز کی کار جو نہی مری روڈ پر اسلام آباد کی جانب خڑی، میں نے ساتھ اٹھا کر ہارکن کو روکنے کا اشارہ کیا۔ فرید خان! میں نے جھک کر کہا۔ تم اپنے ساتھی کو لے کر ہمارے پیچھے آؤ گے۔ کونرا فرید خان اترے تو میں اور رشیدہ بیٹھ گئے۔ تم ماسٹر کا تیا کھانا بناؤ گی۔

"سولی لائن۔" رشیدہ بولی۔ کیا واقعی یہ سچ ہے کہ...

"ہاں... میرے حلق سے جلتی ہوئی غراہٹ ابھری: اس کے ساتھ ماسٹر بھی اغوا ہوا ہے۔" "اور امینہ...؟ رشیدہ کی آواز زندہ گئی۔" "شاید وہ بھی وہاں نہ ہو۔"

رشیدہ کی رہنمائی میں کار ایک گیٹ کے سامنے رکی۔ میں ان کو چھوڑ کر اندر داخل ہوا۔ کوٹھی گہرے سکوت میں ڈوبی ہوئی تھی۔ میں بیٹھیاں چڑھ کر کار پورچ میں دبے پاؤں آگے بڑھتا گیا۔ امینہ ایک موڑ سے سامنے آگئی۔ ایک آپ کے باعث وہ مجھے پہچان نہ سکی تھی پھر میرے بولنے پر ہی وہ میری جانب متوجہ ہوئی تھی... اسے سلامت پا کر خوشی سے میری آنکھیں بھی نمناک ہو گئیں۔

"باہی کو آپ دیکھ آئے ہیں نا؟" اس نے ہلک کر پوچھا۔ "ہاں...؟" آنسوؤں سے تر جھوٹ اسے پر سکون کر گیا تھا۔ اس نے میری بانہوں سے نکل کر مسکراتا شروع کر دیا تھا۔ وہ اب ٹھیک ہیں۔ اندر چلو اور مجھے بتاؤ، کیا ہوا تھا؟ "میرا خیال ہے، باہی کو ہیضہ ہو گیا ہے، کباب باسی تھے، شاید وہ میرے ساتھ چلتی ہوئی بولی۔

"ٹک شاپ سے کباب کون لایا تھا؟" "میں...؟" امینہ نے نام اور متناصف لےجے میں بتایا۔ میں ڈر گئی تھی۔ انکل سے میں نے یہ بات چھپائی تھی۔ وہ بے حد خفا ہو رہے تھے۔

"ٹیڈہ نے سونے سے قبل کچھ کھایا تھا؟" "ہاں، چیونگم۔" امینہ بولی۔ چیونگم فروخت کرنے والے ادارے کی کوئی سیل گرل کالج میں آئی تھی۔ اس نے نمونے کے پیکٹ مفت، لڑکیوں میں تقسیم کیے تھے۔ باہی کو بھی ایک چھوٹا پیکٹ ملا تھا۔

"کیا تم نے بھی کوئی چیونگم کھایا تھا؟" "نہیں...؟" امینہ نے نفی میں گردن ہلائی۔ "جب سے سوڑھے خراب ہوئے ہیں، میں نے سوشلس ترک کر دی تھیں۔" "وہ پیکٹ لے آؤ۔" امینہ نے سائڈ ٹیبل سے پیکٹ اٹھا کر دے دیا۔ میں نے ایک چیونگم نکالا اور پھر دوسرا... چیونگم کی ادھیکل پیکنگ کھول کر دوبارہ گوند سے ہر چیونگم پیک کیا گیا تھا۔ میں نے دوپیس کاغذ میں بیک کر کے جیب میں رکھ لیے۔

کوئی شک نہ رہا تھا، مادام شہناز نے جس ٹک کا ذکر کیا تھا، وہی سیل گرل کا روپ دھار کر اندر پہنچ گئی ہوگی اور ایک پیکٹ

بطور خاص ٹیڈہ گل کے لیے تیار کیا گیا ہوگا۔ ان کا منصوبہ شان دار تھا۔ اگر ٹیڈہ گل کالج میں ہی چیونگم کھا لیتی تو کالج کی انتظامیہ اسے اسپتال لے جاتی اور وہ لوگ اسے وہاں سے بے آسانی اڑا لیتے۔ لیکن ایک سوال کا جواب میرے پاس نہ تھا۔ اگر مادام کے آدمیوں نے ٹیڈہ کا تعاقب کرتے ہوئے، قیام گاہ معلوم کر لی تھی تو پھر انھوں نے کوٹھی پر دھاوا کیوں نہیں بولا۔ اگر کوئی مجبوری تھی تو جب بیگن اسے جیلڈ سینٹر لے جا رہا تھا تو ان لوگوں نے راستے میں مداخلت کیوں نہیں کی تھی؟ بس ایک جواب تھا، شاید نگرانی کرنے والا تنہا رہا ہوگا۔ اس نے بند کوارٹر کو رپورٹ دی ہوگی کہ ٹک فلاں اسپتال میں ایڈمٹ کی گئی ہے۔

امینہ کے لیے کوئی خطرہ نہ تھا۔ مادام شہناز عرف خرم سلطان کی دشمن تھی اور اس نے خرم سلطان کی دکھتی رگ پر انجلی کا دباؤ بڑھایا تھا... پھر بھی اسے تنہا نہیں چھوڑا جا سکتا تھا۔ اگر حالات مجھے پھر مادام کی تابعداری پر مجبور کرتے تو مجھے رشیدہ کی ضرورت ہوتی۔ رشیدہ اگر امینہ کے ساتھ نہ جاتی تو میرے لیے کوئی معقول جواز پیش کرنا مشکل ہو جاتا۔

"تم گھبراؤ گی تو نہیں، بے بی؟" "آپ چلے جائیں گے؟" امینہ نے موٹی موٹی آنکھوں کو گھماتے ہوئے پوچھا۔

"ہاں بے بی! میں باہر اپنا ایک آدی چھوڑ جاؤں گا۔ اگر انکل نہ آئے تو گھبراہٹ نہیں۔ ٹیڈہ کو انکل کی ضرورت ہوگی۔" "رشیدہ باہی کہاں چلی گئی ہیں؟" "ایک ضروری کام کر رہی ہیں، جان! کل پر سوں تک واپس آجائیں گی۔"

اسے تسلی دے کر میں باہر نکلا تو فرید خان بھی آچکا تھا۔ "تم دونوں یہاں چوکس رہو گے۔" میں نے کونز سے کہا۔ بے بی تمہیں پہچانتی ہے۔ وہ اندر تنہا ہے۔ میں اگر مصروف نہ ہوا تو رات یہاں بسر کروں گا۔ بصورت دیگر تم بے بی کو تسلی دیتے رہنا۔ "بہتر چیف! آپ بے فکر ہو کر کام کریں۔" کونز نے جواب دیا۔ جیلڈ سینٹر کی مرمت کی جارہی تھی۔ کام کی نگرانی، سینٹر انچارج خود کر رہا تھا۔ ٹوٹے ہوئے شیشے نکالے جا رہے تھے... اور دوسری پارٹی نے شیشے لگا دی تھی۔ چھوٹے سے پارکنگ شید میں ایک کروڑ لاکھری تھی جس کی باڈی پر گولیوں کے متعدد نمونہ موجود تھے۔

میں نے استقبالیہ کلرک کو اپنی آمد کا مقصد بتایا تو وہ کرسی سے اُٹھ کر اُٹھا۔ "میرے ساتھ آئیے۔ وہ آگے آگے دوڑنے لگا تھا اس لیے مجھ سے پہلے ڈاکٹر کے پاس پہنچ گیا۔ ڈاکٹر نے چونک کر میری جانب دیکھا اور پھر میری طرف بڑھا۔

"ڈاکٹر نیاز احمد۔" اُس نے ہاتھ بڑھاتے ہوئے تعارف کرایا۔

"آئیے آفس میں بیٹھتے ہیں۔" میں خان رنگ باز کا بزنس میجر ہوں۔ میں نے کرسی پر بیٹھتے ہی بولنا شروع کر دیا۔ "میں بزنس ٹوڑ پھٹکا۔ ابھی ابھی مجھے اس ناخوش گوار حادثے کی اطلاع ملی ہے۔"

"ناخوش گوار نہیں، جناب! ڈاکٹر بخت پتے ہوئے بولا۔۔۔"

خوفناک بلکہ غمی حادثہ کیسے میرا ایک زخمی مریض دم توڑ چکا ہے میری عزت اور ساکھ تباہ ہو کر رہ گئی ہے۔

"یہ واقعہ کس وقت ہوا، ڈاکٹر؟"

"چار بجے، صبح۔" ڈاکٹر نے ایک فائل کھول لی۔ "میں نے اپنا بیان پولیس کو دے دیا ہے۔ ایک سیاہ دین سے چھ آدمی اترے۔۔۔"

استقبالیہ کلرک سے اُس نے معویہ کا روم نمبر پوچھا۔ پھر اندر چلے گئے۔ لڑکی کے کمرے میں ایک غیر ملکی مرد تھا، اُس نے فائرنگ شروع کر دی۔

دس منٹ تک دونوں جانب سے فائرنگ کا تبادلہ ہوتا رہا تھا پھر شاید بندوق سے کے دیواروں میں گولیاں نہ رہی ہوں گی۔ بس حملہ آور دونوں کو اُٹھا کر لے گئے۔"

"کیا وہ دونوں زخمی تھے؟"

"نہیں۔" ڈاکٹر نے نفی میں سر ہلایا۔ "عینی گواہوں کا بیان ہے کہ بندوق چل رہا تھا لیکن لڑکی بے ہوش تھی۔ اس نے بے ہوشی کی دوا کھالی تھی، شاید۔"

"آپ نے ٹریٹ منٹ دیا تھا؟"

"ہاں، میں نے اُس کا معدہ واش کیا تھا۔"

"کیا وہ خطرے سے باہر تھی؟"

"ہاں، لیکن اُسے ڈرپ کی ضرورت تھی۔ قے کی وجہ سے پانی کم ہو گیا تھا۔"

"دین کا نمبر تو کسی نے نوٹ کیا ہو گا؟"

"اس رپورٹ میں دین کا نمبر اور آنے والوں کے طے موجود ہیں۔ ڈاکٹر نے ایک فیل اسکیپ کا غد میرے حوالے کر دیا۔ میں نے کاغذ تہ کر کے جیب میں رکھا اور ڈاکٹر کا شکریہ ادا کرتا ہوا باہر نکل آیا۔ دن روشن تھا، سورج چمک رہا تھا لیکن میری منزل کی طرف

جانے والے تمام راستے دبیر و بھند میں ڈوبے ہوئے تھے۔ مادام شہناز نے بھی وہی پرانا اور آلودہ حربہ استعمال کیا تھا جو پرنے زمانے سے

لے کر جدید دور تک استعمال ہوتا رہا ہے۔ سیاسی، ذہنی اور روحانی دباؤ کے لیے کوئی اہم شخصیت، کسی کی محبوب چیز کو ریشمال بنا کر اپنا

مقصد حاصل کیا جاتا رہا ہے۔ وہ لوگ مغلوں پرست تھے اور میں نے اُن کے مفادات کی راہوں میں گڑھے کھود دیے تھے۔ ایسے عمیق گڑھے

تھے کہ ملک نواز خوف زدہ ہو کر سرحد پار کر گیا تھا اور اُس کی قائم مقام نے اپنے تمام ذرائع، گڑھے کھودنے والے ہاتھوں کو توڑنے پر لگا دیے

تھے۔ مادام کو بتایا گیا ہو گا کہ خرم سلطان کی دھتھی رنگ ٹینڈہ کھل ہے۔

مادام شہناز میری مٹھی میں تھی، جس چیز نے مجھے پریشان کر دیا تھا، وہ تھی 'مادام کی بے خبری۔ اگر اسی کے آدمیوں نے ٹینڈہ اور بیگن کو اٹھایا تھا تو سب سے پہلے مادام کو خوش خبری ملنی چاہیے تھی جبکہ

وہ رشیدہ کے ساتھ ٹینڈہ کی تلاش میں جلی آئی تھی۔

اگر وہ کوئی دوسری پارٹی تھی تو اُس کا تعلق کس طاقت سے تھا۔ بہر کیف، 'مادام شہناز ہی تھی۔ اگر کسی متوازی گروہ نے مادام کے شرکار پر چھٹا مار لیا تھا، تب بھی مادام کو متحرک ہونا تھا اور میں اُس

تحریک سے روشنی لے کر ٹینڈہ کی بازیابی کے لیے کچھ کر سکتا تھا۔

دوسرے لوگوں کو، جن میں میں ناختم ثانی انتظار کرنے کی ہریت دے کر، میں رشیدہ کے ساتھ، 'مادام کے پاس واپس پہنچ گیا۔ میں نے

رشیدہ کو ڈنڈے کی ریبرسل کروادی تھی۔ رشیدہ اتنی باصلاحیت اداکارہ تھی کہ مجھے زیادہ محنت نہ کرنی پڑی تھی۔ اُس نے اپنے اندر

سوئی ہوئی ماضی کی رشیدہ کو بیدار کر لیا تھا۔ بعض اوقات وہ مجھ سے بھی ایک ہاتھ آگے کی کارروائی کا مشورہ دے کر مجھے حیرت زدہ کر دیتی تھی۔

'مادام ٹیرس پر قالین بچھائے کسی سے فون پر باتیں کر رہی تھی۔ جب ہم کار پارک کر کے کارڈور میں داخل ہوئے تو اُس نے

نے ریسیور رکھ دیا۔

"کیا خبر لائے ہو، دوستو؟" 'مادام کا انداز بڑا ہی بلشاش تھا۔

"بے حد اہم اور خطرناک خبر ہے، 'مادام! رشیدہ پر پوش آواز میں بتانے لگی۔ ہم ہیلتھ سینٹر سے کنفرم کرنے گئے تھے اور وہاں

خرم سلطان پہلے ہی موجود تھا۔"

"اوہ... 'مادام شہناز اچھل پڑی۔ پھر... پھر...؟"

"وہ میک اپ میں ہے، 'مادام! رشیدہ بولی۔ "لیکن میں نے اُسے پہچان لیا ہے، آنکھوں سے۔ اُس کی آنکھیں منفرہ ہیں، 'مادام!"

"آگے بولو... پھر کیا ہوا؟" 'مادام چیخی۔

"ہم اُسے اپنے تعاقب میں لے آئے ہیں، 'مادام!"

"یہاں تک؟" 'مادام حلق پھاڑ کر چیخی۔ "اوہ، احمق لڑکی! اُس

دروازے کو یہاں نہیں لانا چاہیے تھا۔ اب وہ کہاں ہے؟"

"آگے نکل گیا ہے، 'مادام! رشیدہ نے بتایا۔ "آپ تیاری کر لیں۔ وہ کسی وقت پھر آ سکتا ہے۔ ہمارا مقصد یہی تھا نا، 'مادام... اُسے سامنے لانا۔"

"اندر چلو۔" 'مادام گھبراتے ہوئے لمبے میں بولی۔ "وہ اگر ابھی

اندر آ گیا تو...؟"

"تو میں اُس کی دونوں خوبصورت آنکھیں ہیٹ میں سجا کر

'مادام کو پیش کر دوں گا۔" میں نے ٹھوس اور سفاک لمبے میں کہا۔ اس

بزدل لڑکی نے مجھے روک لیا تھا اور وہیں فیصلہ ہو جاتا۔

"کیا ہم سر رہا اُس پر ہاتھ ڈال کر پولیس کو اپنے چھپے لگالیتے...؟"

رشیدہ نے زرخیز آواز میں جواب دیا۔ "ہم اُسے چار دیواری کے اندر

گھیریں گے۔"

"تم ٹیلی فون اندر لے آؤ۔" 'مادام نے کہا اور رشیدہ نے ٹیلی فون

سیٹ اٹھالیا۔ "بابر، تم باہر سو کس رہنا۔ میں اپنے آدمیوں کو اطلاع دے رہی ہوں۔"

"'مادام، لڑکی کہاں رکھی گئی ہے؟"

"جہاں بھی ہے، خرم سلطان اُس کی گرد کو بھی نہیں چھو سکے گا۔" 'مادام نے جواب دیا۔

'مادام جو بھی اندر داخل ہوئی، میں نے دور لگائی اور اُس کی خواب گاہ کے عقب میں پہنچ گیا۔ مشرقی کھڑکیاں کھلی ہوئی تھیں

اور روشنی پردے ہوا سے سرسرا رہے تھے۔ میں نے جھانک کر دیکھا، رشیدہ ٹیلی فون سیٹ رکھ کر واپس جا رہی تھی اور 'مادام شہناز الماری

کھول رہی تھی۔

اُس نے الماری سے ٹرانسمیٹر سیٹ نکالا اور جو بھی پٹی میں

ایک دم نیچے بیٹھ گیا۔

"ہیلو... ہیلو... 'مادام... شہناز کی آواز سنائی دی... اور

میرے بدن پر سرسراہٹیں لہرانے لگیں۔ وہ خود 'مادام تھی اور کسی اور

'مادام کو کال کر رہی تھی۔ "کاپی، کالنگ یو، 'مادام! بس 'مادام ابے حد

اہم خبر ہے۔ میں نے جس جوتے کا ذکر کیا تھا، وہ خرم سلطان کو اپنے

پہنے لگانے میں کامیاب ہو گیا ہے۔ جی ہاں، 'مادام! بس چند منٹ

پہلے وہ لوگ آئے ہیں اور خرم سلطان آگے نکل گیا ہے... نہیں،

مادام! وہ وحشی اندھیرے کا انتظار نہیں کرے گا۔ اگر وہ اندر آ گیا تو

سب کو چیر پھاڑ ڈالے گا۔ پھر 'مادام! مجھے یہاں سے نکلنے کی اجازت

دیکھے یا میری حفاظت کا معقول انتظام کیا جائے... شکریہ، 'مادام... جلدی بھیج دیجیے۔"

خون شاید میری آنکھوں میں اُتر آیا تھا۔ میں نے دیکھتے چہرے کو

اوپر اٹھایا۔ شہناز، ٹرانسمیٹر واپس الماری میں رکھ رہی تھی۔ اُس نے

خود کو کاپی کہا تھا... وہ اگر خود 'مادام شہناز نہیں تھی تو کس کی کاپی تھی؟

تو کیا اس 'مادام شہناز کی باگ ڈور کسی اور عزت کے ہاتھ میں تھی۔

جب میں دروازہ کھل کر اندر داخل ہوا تو وہ باہر چلنے کے

لیے دروازے کے قریب آچکی تھی۔ میں نے دائیں ہاتھ کی سیدھی ہٹک

اُس کے سینے پر ماری اور وہ لڑکھرائی ہوئی، صوفے سے ٹکر کر فرش

پر دھیر ہو گئی۔ "آواز نہیں، 'مادام! اُس کا کھلا منہ ایسے ہی جام ہو گیا

تھا جیسے اسکرین پر کوئی کردار منہ کھول کر ساکت ہو گیا ہو۔ تم نے

مجھے دھوکا دیا ہے۔ تم اصلی 'مادام شہناز نہیں ہو۔" میں نے اُس کے

پہلے ہوئے پاؤں پر پاؤں رکھ دیا اور اُس کی آنکھیں خوف سے پھٹ

گئیں۔ "بولو، تم کون ہو؟"

"مم... میں... 'مادام..."

"بکو اس نہیں۔" میں نے اُٹھ کر اُس کی پسلیوں پر ہتھوڑ

ماری اور وہ کراہتی ہوئی اُٹھ گئی۔

"بابر... رشیدہ کی بیٹی سنائی دی۔" یہ... یہ کیا ہو رہا ہے؟"

"مکڑا، دھوکے باز لڑکی، تم نے بھی مجھے اندھیرے میں رکھا ہے"

میں نے پٹ کر رشیدہ کو ایک تھپڑ رسید کر دیا۔ وہ لڑکھرائی ہوئی

دیوار کے ساتھ اگڑوں بیٹھ گئی۔ "یہ 'مادام شہناز کی ڈپلی کیٹ ہے۔"

"اوہ، نہیں، بابر! رشیدہ رونے لگی۔ "یہ 'مادام ہے۔"

"اگر یہ 'مادام شہناز ہے تو پھر تم رشیدہ نہیں ہو۔" میری

رشیدہ مجھے کبھی دھوکا نہیں دے سکتی۔ میں نے جھجک کر شہناز کو

بالوں سے پکڑا اور وہ جھپٹتی ہوئی اٹھتی چلی آئی تھی۔ "بولو لگی یا میں

تھا کہ چہرے سے 'مادام شہناز کا روپ نون لوں؟"

"عظرو۔" وہ ہاتھ اٹھا کر بولی۔ "میں سمیرا ہوں۔ 'مادام کی

پرنس میکسٹری... خرم سلطان اور دیگر لوگوں سے رپوش رہنے کے

لیے 'مادام نے میری آڑ لی ہے۔"

"میں تم جیسی تھوڑے کلاس عورت کا ماتحت نہیں رہ سکتا۔ میں

'مادام سے ملنا چاہتا ہوں... مجھے اس کا پتا بتاؤ؟"

"یقین کرو، مجھے نہیں معلوم۔ میں صرف ٹرانسمیٹر پر اُن سے

رابطہ قائم کر سکتی ہوں۔

"ٹھیک ہے۔" میں نے چاقو نکال کر کرکٹ مارا۔ اب جب رابطہ قائم کرو تو اسے بتا دینا کہ تم کان اور ناک سے محروم ہو چکی ہو۔ تم یقین کیوں نہیں کر لیتے؟ اس نے ہاتھوں سے چہرہ چھپا لیا۔ صرف مسٹر علی جانتے ہیں کہ وہ کہاں ہے۔ مادام نے اس کو یہ فتنے داری سونپی تھی۔

"جھوٹ مت بولو، لڑکی! میں نے اس کی ٹھوڑی پر ہلکی سی ہلک لگائی۔ وہ بھی کل یہاں تھیں آنکھیں دکھانے آیا تھا۔" تو پھر یقین کرو۔ وہ اسی لیے مجھے آنکھیں دکھا رہا تھا... کہ میری اصلیت سے صرف وہی واقف ہے۔

"اگر یہ بات سچ ہے تو اسے کل کرو اور بتاؤ کہ باہر کو ضروری پیغام کے ساتھ بھیج رہی ہو۔"

"تم خود بات کرو۔ اس طرح کم از کم میں ان کے عتاب سے محفوظ رہوں گی۔" سمیرا نے اٹھتے ہوئے بتائی آوازیں کہاں تھیں شاید معلوم نہ ہو۔ مادام کے گرجے کس قدر وحشی ہیں۔

"نمبر بتاؤ۔" میں نے ایک فوری خیال کے تحت اس کی بات مان لی۔ اس نے نمبر ڈال کر کہے: "ریسیور میری جانب بڑھا دیا۔ ایک منٹ بعد اصرار سے اس کا سیکرٹری بولا تھا۔"

"صاحب کو بتائیں،" مشجب کا غمازیہ ضروری بات کرنا چاہتا ہے۔ سمیرا کے پیرا نے پوچھے ہونٹوں پر اس کو وہ سی سکراہٹ کھل اٹھی۔

"شکریہ، باہر! اس نے سرگوشیاں انداز میں کہا۔ تم بہت لچھے اور ذہین ہو۔ بہتر متحید استعمال کیا ہے تم نے۔"

"میلو... علی بول رہا ہوں۔" وہ ملاحت سے بولا۔

"السلام علیکم، سر! میں نے اپنا بیوہ نوڈب بناتے ہوئے کہا۔ مشجب کے کلبے جدا ہم پیغام ہے، سر! "

"کھل کر بات کرو۔ لائن محفوظ ہے۔"

"میں مشرجانسن کا تحریری پیغام لایا ہوں، سر! "

"کہاں ہو؟"

"سمیرا کیٹ کے ٹیلی فون بوتھ سے بول رہا ہوں۔" میں نے جواب دیا۔ "مشرجانسن ایک مقامی ہوٹل میں ہیں۔" ترکش کے سامنے تیر میں نے اندھیرے ہی میں چلائے تھے کیونکہ مجھے یہ بھی معلوم تھا کہ جانسن کا بیڈ کوادر کہاں ہے۔

"اوہ! تم میرے ریڈیو فون کا پتا نوٹ کر لو۔ ٹھیک بارہ بجے ملاقات ہوگی۔" اس نے علاقہ اور کوئی کا نمبر بتایا اور پھر سلسلہ

منقطع کر دیا۔ میں نے کلائی موڑ کر وقت دیکھا۔ گیارہ بج کر تائیس منٹ ہوئے تھے۔ میرے پاس آدھا گھنٹہ تھا اور سمیرا کے پیغام کے جواب میں مادام شہناز کے گرجے کسی بھی طے کوئی کو گھیرے میں لے سکتے تھے۔ اگر صرف مجھے باہر جانا ہوتا تو باہر کے حوالے سے شاید مجھے کوئی نہ روکا لیکن اب سمیرا کی موجودگی نام نہم سے بھی زیادہ خطرناک تھی۔ اگر اسے کسی حالت میں پھونسی دیا جاتا تو وہ آنے والوں کی نگاہوں سے اوجھل نہ رہ سکتی تھی۔ سمیرا کی آنکھوں میں پھر خوف در آیا تھا۔ اس کا عیار اور بالغ چہرہ کسی بھی ہوئی معصوم بچی کا چہرہ دکھائی دینے لگا تھا۔ تب ہی میں نے سوچا کہ یہ واقعی مجبور لڑکی ہے جو مادام شہناز کے جال میں جکڑی ہوئی ہے۔

"سمیرا! تم رضا کا رازہ طور پر میرے ساتھ چل سکتی ہو؟" میں نے بڑے ہی طعنے لگے میں کہا۔ "میری جمودی سے تم بخوبی واقف ہو۔"

"ہاں..." اس نے غورک بھل کر جواب دیا۔ "اگر تم بھی مادام کے مخالف گروپ سے تعلق رکھتے ہو تو اب میری سلامتی تمھارے سامنے سے مشروط ہو چکی ہے۔ مادام مجھے ذرا کر دے گی۔"

"رشیدہ..." میں نے ایک فیصلے کو آواز دی۔ "تم سمیرا کو لے کر جہاں سے آئی ہو، اصرار واپس چلی جاؤ۔ اگر سمیرا نے اپنے قول و فعل سے وفاداری کا ثبوت دیا تو اسے ہم اپنے اندر ضم کر لیں گے۔ سب کچھ اسی طرح چھوڑ کر نکل چلو۔ اگر تمھیں مادام تک پہنچنا ضروری ہو تو تم کہہ سکو گی کہ خرم سلطان سے بچنے کی خاطر فرار ناگزیر تھا۔"

سمیرا نے جلدی جلدی چند چوڑے بیگ میں ڈالے اور پس لے کر رشیدہ کے ساتھ چل پڑی۔ میں نے دونوں کو پانی دے پر ڈھاپ کیا اور رشیدہ کو علی کے ٹھکانے سے آگاہ کرنا چاہا اور پوچھنا انت سے ٹرن لے کر فیصل مسجد کے میناروں کو منزل مان کر چل پڑا۔

سمیرا کے ہاتھ میں میں نے جو فیصلہ کیا تھا۔ اس کی تیر میں رشیدہ کی ذات تھی لیکن وقت نے اسے ایک موقع دیا اور اس نے وقت کو بالوں نہ کیا تھا میں نے فیصلے کو دھاکا غذا بھی دی تھی میں دل کی گہرائیوں سے چاہتا تھا۔ ایک اور بڑی لڑکی سلامتی کی روشنی راہوں کو پہچان لے۔

وہ شیطان کی جماعت کی سرگرم رکن تھی اگر وہ دل سے توبہ کر لیتی تو میرے کان کے لیے باعث تقویت بن جاتی ہیں اس گھر کی بچہ دن کو بڑے لوگوں کی لٹکا ڈھانے کے لیے بھی استعمال کر سکتا تھا۔

لفظ چوک پر ایک ٹریفک مار جنٹ کھڑا تھا۔ میں نے اس سے مطلوبہ ایمر یا کی سرک دریافت کی تب ہی مجھے وہ خاتون ایک دم یاد آئی تھی جو فلپائن سے میری ہم سفر تھی۔ اس نے مجھے کوئی کا نمبر بھی دیا تھا۔ اور ملاقات کی درخواست بھی کی تھی لیکن گردش حالات نے میرے ذہن سے سب کچھ چھین لیا تھا۔ اسٹریٹ نمبر چوتیس کے اندر داخل ہو کر میں نے کار کی رفتار کم کر دی اور دائیں بائیں نمبر پڑھنے لگا۔ دائیں ہاتھ ساتویں کوٹھی میری مطلوبہ منزل تھی۔ گیٹ کے بازو پر علی رضا کی نیم پلیٹ منزل کی تصدیق کر رہی تھی۔

میں نے نیم واکسٹ کو کار کی ہلکی سی ٹکر ماری اور کار پابند دے پر بڑھاتا لے گیا۔ پورے میں سیاہ سرکاری کروڑا کھڑی تھی۔ میں نے باہر نکل کر تین چار گہری گہری سانس لے کر انگڑائی لی اور پھر لان میں کھڑے ایک شخص کو دیکھا، وہ لباس اور چہرے سے مالی قسم کی شے نہ تھا۔ میں کوئی اچھا چہرہ شناس نہ تھا، لیکن جرم کے دشت میں اتنے چہروں سے سابقہ رہا تھا کہ بڑے اور اچھے چہرے کی شناخت کر سکتا تھا۔

اس کے چہرے پر بھی خباثت کی خفوں چھاپ ٹپا یاں تھیں اس نے ہاتھ اٹھا کر سلام کیا اور بازو پھانسی کر میرے نزدیک آگیا۔ میں نے اس کی سائڈ پاکیٹ میں ریو اور کا اٹھا کر دیکھ لیا تھا۔ صاحب آپ کا انتظار کر رہے ہیں جناب۔ وہ قد و یا نہ انداز میں بولا۔ تشریف لائے۔ اس کا ساتھ میرے حق میں ہی تھا۔ کچھ سے ہوئے دشمن سے مقابلہ عموماً مشکل ہوتا ہے۔

علی رضا براؤن تھری پیس ٹوٹ میں ملبوس بڑا سمارٹ اور شاندار لگ رہا تھا۔ اس نے آگے بڑھ کر گرم خوشی سے معاف کیا۔ اس کا وہی مصنوعی انداز مجھے جو نکال گیا تھا کیونکہ میں باہر کا چہرہ سامنے لایا تھا اور وہ مجھے اس چہرے کے ساتھ سمیرا کے گھر دیکھ چکا تھا۔ اسے دیکھ کر جو نکالنا چاہیے تھا جب کہ اس کے چہرے پر مسکراہٹ بکھری ہوئی تھی۔

"تشریف رکھیں،" میں نے اسے قدموں ہٹا ہوا صوفے پر بیٹھ گیا۔ "مان ہمارے بھائی جانسن کی صحت کیسی ہے؟" نوجوان لہلہا ہوا میرے پیچھے چلا گیا۔ "پیغام دکھائیے۔"

"مسٹر علی! میں نے اس کی مسکراتی ہوئی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔ عمر کے حوالے سے بے شک میں تمھارے سامنے نادان بچہ ہوں لیکن میرے ساتھ خبر بات ہوئے ہیں میں کون ہوں اور کہاں سے آیا ہوں؟ تم سے پوشیدہ نہیں۔ میں کچھ

جان کہ پہلے حیرت زدہ رہ گیا، پھر سوچا یہ انفارمیشنز کس کے لیے سود مند ہو سکتی ہیں؟ میں سودا کرنے آیا ہوں علی رضا صاحب! "کیسا سودا پیارے؟" "معلومات کا سودا۔"

"بولو! اگر مال میرے حساب کا ہوا تو تمھیں لچھے دام ضرور دوں گا۔"

"آپ جانتے ہیں کل جس عورت سے آپ لوگ ملے تھے، وہ کون ہے؟"

"ہاں اس نے اثبات میں گردن ہلاتی۔ صرف میں اسے جانتا ہوں۔"

"دوسری خبر یہ ہے کہ خرم سلطان اس عورت کو اٹھا کر لے گیا ہے۔"

"اوہ... کب...؟ وہ یوں اچھا جیسے صوفے کے نیچے بم پھٹ گیا ہو۔" سمیرا خان ٹیلی فون لاؤ! سمیرا نے ٹیلی فون سیٹ اس کے قریب رکھ دیا اور علی رضا جب ڈائل کرنے لگا تو میں نے اس کے اندر پیدا ہونے والی تھڑکی کو اس کی لڑکتی، ان انگلی تک آتے دیکھ لیا تھا۔

اس نے ایک منٹ ریسیور کان سے لگائے رکھا، پھر کر ڈیل پر ہاتھ مار کر دوسرا نمبر ڈائل کرنے لگائیں نے وہ نمبر ذہن میں محفوظ کر لیا تھا۔

"علی رضا بول رہا ہوں مادام! اس کی آواز میں خوف کی تھڑکی تھی۔" میرے پاس کچھ ایسی خبریں ہیں جن کو سن کر آپ بھی میری طرح پریشان ہو جائیں گی میں نے شروع میں ہی سمیرا کی شرکت کی مخالفت کی تھی۔ وہ صرف آفس کی لڑکی تھی۔ مادام۔ آپ نے اسے فیملی میں اتار کر شہنشاہی کو نہیں بلکہ گروہ کو خطرے سے دوچار کر دیا ہے۔ میری پوری بات سن لیں میڈم پہلی خبر یہ ہے کہ اس نے جو نیا باڈی گارڈ رکھا تھا۔ اس نے اسے پہچان لیا ہے اور دوسری خبر بھی سن لیجئے سمیرا اغوا ہو چکی ہے اور اغوا کرنے والا خرم سلطان ہے... اوہ نہیں... علی رضا چنچا اور اس نے میری جانب دیکھا۔ میرے پاس آنے والا خرم سلطان نہیں بلکہ سمیرا کا باڈی گارڈ باہر ہے اور وہی خبر لایا ہے۔ میں جیک کر لیتا ہوں۔"

اس نے ریسیور رکھ کر پھر میری طرف دیکھا اور میں نے اس کے چہرے کا بدلتا ہوا رنگ اور غمازیہ مسکراہٹ سے اندازہ لگانے میں دیر نہ کی تھی کہ پالسم پٹنے والا ہے۔

”زمیر! علی رضا ٹھہری آواز میں بولا: ”مہمان سے میں خوشگوار ماحول میں مذاکرات کرنا چاہتا ہوں۔ میں چاہتا ہوں کہ ہتھیار ہمارے درمیان نہیں ہونے چاہیں۔“

”میں مسکراتا ہوا اٹھ اٹھا اور دونوں ہاتھ اوپر اٹھالے۔

”دوستی اور اعتماد کے نام پر مجھے کوئی اعتراض نہ ہوگا سر۔“

”میں نے زمیر کو بھی مسکراہٹ دی۔ ”دوست سائے اگر اپنی تسلی کرو اور پھر باہر چلے جاؤ، تاکہ ہم پر سکون ماحول میں بات کر سکیں۔“

”شکر یہ تو ہوا! علی رضا صوفے پر پھیل گیا۔ ”میں مطمئن ہوں میڈم کی تسلی کے لیے۔“

زمیر بڑے ڈھیلے ڈھالے انداز میں سامنے سے آگے بڑھا اور دونوں ہاتھ دائیں بائیں لے جا کر بھول ہی اُس نے تپکی دی میرے دونوں ہاتھ ایک دم نیچے آئے اور دونوں ہتھیلیوں کے کٹ گردن پر ایسے لگے جیسے شاخ تراشنے والی قیدی کے پھل موٹی شاخ پر گئے ہوں پھر اُس کے گرتے بازوؤں کے نیچے ہاتھ ڈال کر میں نے اُسے تھوڑا اُدھر اٹھا کر پوری قوت سے علی رضا پر اچھال دیا۔

چند سیکنڈ میں اتنی اگھا بچھا ہو گئی تھی کہ مجھے دونوں کو صوفے کے نیچے سے نکالنے میں ایک منٹ لگا تھا۔ زمیر تو ہوش سے بیگانہ ہو چکا تھا۔ اُسے پاؤں کی ٹھوک سے الگ کیا اور علی رضا کو گریبان سے پکڑ کر جب اٹھایا تو وہ سر دی کھانے کتے کی طرح تھر تھرا کر پڑ رہا تھا۔ اُس نے سمیرا کے پاس میں جو بیمارک دیا تھا، وہ اُس پر بھی صادق آیا تھا وہ بھی اُس کا محض بڑا صاحب ہی تھا۔ مرد میدان کی کوئی ٹوپی اُس کے ساتھ نہ تھی۔

”تم... ہم... ہی...“

”ہاں سر! میں نے دھکیل کر اُسے دوسرے صوفے پر بٹلاتے ہوئے سرد آواز میں کہا: ”میں ہی وہ شخص ہوں جس کی تلاش میں تمہاری میڈم کسی چوہیا کی طرح خود بل میں دیگی ہوئی ہے۔“

”میں اُس کا وفادار ہوں نہ گروہ سے کوئی میرا تعلق ہے۔ وہ منانے لگا۔ ”ملک نواز سے صرف دوستی بھاری نہ تھی۔“

”وہ بھی تو دوستی ہی نہ جانے! ادھر آئی ہے۔“

”نہیں۔“ علی رضا تھوڑے گھل کر بولا: ”ملک نواز کی عدم موجودگی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اُس کے بزنس اور گروہ پر گرفت مضبوط کرنا چاہتی ہے۔“

”سٹو سٹری! میں نے ریو اور گھماتے ہوئے کہا: ”تم سرکاری عہدے دار ہو، لیکن میں جانتا ہوں تم جیسے اور بھی بے شمار عہدیدار

اس بلیک بزنس میں حصے دار ہیں تم جیسے افسران کی وجہ سے ملک نواز بے تاج بادشاہ بنا ہوا تھا تم اس دنیا کی روایات سے بھی بخوبی آگاہ ہو۔ یہاں وفاداریاں بدلتی رہتی ہیں جس کا سورج غروب ہو جاتا ہے، وہ مامنی کے اندھیروں میں گم ہو جاتا ہے۔ تم جیسے مفاد پرست صرف چڑھتے سورج کے بھجاری اور فساد ہوتے ہیں یہ دنیا کا بہت پرانا قانون ہے۔ وقت کے ساتھ ساتھ حکومتیں بدلتی رہی ہیں صرف سربراہ بدلتا ہے۔ عمارتیں گڑبیاں اور مشینری وہی رہتی ہے، اگر پہلے کسی کو شک تھا تو اب فور ہو جانا چاہیے، خرم سلطان نے بحیثیت سربراہ اقتدار سنبھال لیا ہے۔“

”مطلب کی بات کرو خرم چوہدری۔“ علی رضا سنبھل کر بولا۔

”مجھ سے کیا چاہتے ہو؟“

”حلف وفاداری۔“

”اعتماد کرو گے؟“

”ہاں سر! میں نے اثبات میں گردن ہلاتی۔ ”میری کھوپڑی اور آنکھوں میں ہر کھکی کٹی کسوٹیاں ہیں۔“

”چلو مجھے آزماؤ۔“ وہ زبردستی مسکرایا۔ ”میں وفاداری کا عہد کرتا ہوں۔“

”شکر یہ سر! میں دو قدم ہٹ کر صوفے پر بیٹھ گیا۔ اب آپ بتائیں گے کہ جانشین کون ذات مند ہے؟“

”وہ سنگاپور پرانے ادھر بچا گیا ہے۔“

”کیا اُس کا تعلق واقعی مافیا سے ہے؟“

”ہاں۔“ علی رضا نے بتایا۔ ”لیکن مہر ز تمام کے تمام پاکستانی ہیں اُن کو ملک نواز کنٹرول کرتا تھا۔ جب اُس کے پاؤں زخمی ہونے لگے تو ہیڈ کوارٹر نے سٹر جانشین کو مدد کے لیے بھیجا۔ مگر اُس کی آمد سے قبل ہی ملک کو اقتدار چھوڑ کر فرار ہونا پڑا۔ اس طرح اب اصولی طور پر کسی پاکستانی کو ہی مسند اقتدار سنبھالنا تھی اس کے لیے مادام شہناز نے پارٹی سے اعتماد کا ووٹ حاصل کیا۔ جب کہ ہیڈ کوارٹر نے جانشین کو ماسٹر کی سند دے دی ہے اب دونوں کے درمیان رتہ کشی شروع ہے۔ پارٹی کے کچھ رکن جانشین کے پڑے میں پھلے گئے ہیں۔“

”کیا جانشین اتنا ہی احمق ہے کہ اُس قوت کو نظر انداز کر گیا ہے جس نے ملک نواز جیسے پہاڑ کو ریزہ ریزہ کر دیا ہے؟“

”فی الحال اُس کی تمام تر توجہ اقتدار کے حصول پر لگی ہوئی ہے۔ وہ پہلے مادام سے اقتدار کا تصفیہ کرنا چاہتا ہے۔“

”اُس کا ہیڈ کوارٹر کہاں ہے سر؟“

”کراچی۔“ علی رضا بولا۔ ”لیکن ان دونوں وہ مادام کے تعاقب میں یہاں آیا ہوا ہے۔“

”آپ مجھے بتائیں گے یا سر؟“

”ہاں لیکن میری سلامتی کی تمہارے پاس کیا ضمانت ہے؟“

”زبان...“

”کیا میں یقین کر لوں؟“

”آپ اپنی صوابدید پر فیصلہ کریں سر۔“

”ٹھیک ہے خرم سلطان۔“ اُس نے گہری سانس لی۔ ”میں مرنے سے بہت ڈرتا ہوں مجھے معلوم ہے تم کون ہو اور تم نے پنڈی اور لاہور کے کتنے تن اور درخت گرائے ہیں۔ تمہارے بارے میں مشہور ہے کہ کوئی دشمن آکھ نہیں دیکھ کر روشن نہیں رہتی۔ اس لیے میں بالکل غیر مشروط طور پر اپنا مستقبل تمہارے ہاتھوں میں دیتا ہوں۔ ہمیں ایک دوسرے پر غیر مشروط طور پر بھروسہ کرنا ہوگا۔“

”پھر آئیے ہم اب مادام شہناز سے کریں گے۔ میں نے ریو اور حبیب میں ڈالتے ہوئے کہا۔

”میری حبیب میں بھی بھرا ہوا ریو اور ہے خرم سلطان۔“

”مجھے یقین ہے اُس کی ہر گولی پر میرے دشمنوں کا نام ہی ہوگا۔ میں نے کندھے اچکاتے ہوئے کہا۔ ”ویسے اگر کسی گولی نے حماقت کرنے کی کوشش کی تو اُس کی مطلوبات میں حیرت انگیز اضافہ ہوگا۔“

”کیا یہ زندہ ہے؟“ اُس نے جھجک کر زمیر کی پیشانی پر ہاتھ رکھا، پھر نفی میں گردن ہلاتا ہوا میرے آگے آگے چل پڑا۔

”علی رضا نے پورچ کے قریب جا کر پہلے میری کار کو دیکھا اور پھر استفہامیہ لگا ہوں سے گردن موڑ کر دیکھنے لگا۔

”کیا آپ سرکاری گاڑی استعمال کرنے سے اجتناب فرماتے گے سر؟“

”ہاں۔“ اُس نے جواب دیا۔ ”حالات کچھ بھی ہو سکتے ہیں میں سرکاری گاڑی کے ساتھ کسی حادثے کا سامنا نہیں کرنا چاہتا۔“

”ٹھیک ہے۔“ میں نے اپنی کار کی چابی اُس کو دے دی۔

”اب یہ بھی آپ کی ہے۔“

”میں خوش فہم نہ تھا۔ وہ شخص جو موم کی ناک ثابت ہوا تھا میرے نزدیک قابل بھروسہ نہ تھا صرف بزدل تما موت کا خوف اُسے بے چل رہا تھا ہر نبے شخص کی طرح وہ بھی مرنے

دوراندیشی

زمینوں کے ایک شخص کو بچوایا وہ بھی بہت ہی ڈھیٹ نکلا اس وقت تک مزاحمت کرتا رہا جب تک زمینوں نے اسے دبوچ نہیں لیا۔ پھر ایک زمین نے اُس کی تلاش کی تو حبیب سے صاف دس روپے نکالے۔ دھت تیرے کی صاف دس روپے کی خاطر اتنی مار کھائی۔ زمینوں کے رخنے نے کہا۔

”میں تو یہ سمجھا تھا کہ تم لوگ یہ کر جوتے میں چھپے ہوئے ایک ہزار روپے چھیننا چاہتے ہو۔ زمین نے جھپک کر جواب دیا۔

سے ڈرتا تھا، پھر جو شخص زمینوں کی پرانی وفاداری ایک ٹھوکر سے بدل دے۔ اُس پر بھروسہ کرنا اپنے پاؤں پر کھارڈی مارنے کے مترادف ہوتا۔

بہر کیف مجھے اتنا یقین تھا کہ جب تک موت کا خوف اُس پر حاوی رہے گا۔ وہ ایک غلام کی طرح میرے اشاروں پر حرکت کرے گا۔ مجھے بھی اُس کی ذات کی وقتی آڈر کار تھی مادام شہناز کو اب میرے لیے اندھیرے میں ڈوبی ہوئی منزل نہ رہی تھی مجھے اُس کا میلی فون نمبر معلوم ہو چکا تھا۔ میں کسی بھی جگہ سے میلی فون ڈائریکٹری سے رہنمائی حاصل کر سکتا تھا۔

لیکن وہ میرے لیے ایک ایسی سرحد تھی جسے میں کارآمد ویزے کے بغیر عبور نہیں کر سکتا تھا۔ علی رضا کی عارضی وفاداری راہداری کا کام دے سکتی تھی۔ میں اُسی پرولنے کو حبیب میں رکھ کر مادام شہناز کی زمین پر پاؤں رکھنا چاہتا تھا۔

”ایک بات بتاؤ گے خرم! علی رضا نے خاموشی توڑتے ہوئے پوچھا۔

”جی فرمائیے۔“

”گروہ میں تمہاری پوزیشن کیا ہے؟“

”میرے ساتھی مجھے چیف کہتے ہیں۔“ میں نے انکسار سے بتایا۔ ”جب کہ میں فی الحال ایک مسافر ہوں۔ کیونکہ منزل ابھی دُور ہے۔ میرا خیال تھا کہ ملتے کی آخری دیوار گر چکی ہے مگر مادام اور جانشین جیسے روڑے ابھی سر اٹھائے کھڑے ہیں۔“

”لیکن ہماری اطلاع کے مطابق تم تنہا ہر جگہ دیکھے گئے

ہو، علی رضا بولنے لگا: "ہمارے مل چیف ہیں دیوار رہ کر اپنے گمروں کو ہی فیلڈیں اُتارتا ہے۔"

"اپنا اپنا طریق کار ہوتا ہے جناب، میں نے ملائمت سے کہا، میں نے بلور اسٹریٹ ایجنٹ اس سفر کا آغاز کیا تھا۔"

"کس کے لیے کام کرتے تھے؟"

"خان رنگ باز کے لیے۔" علی رضا نے ہونٹ دانتوں تلے دبا کر انہیں میں گردن ہلائی لیکن خاموش رہا تھا۔ مرحوم ہی نے مجھے پر موٹ کیا تھا۔ جب ان کی وساطت سے میں بنیادی رابطوں سے ملا تو مجھ پر انکشاف ہوا کہ میں اپنی انرجی اور صلاحیتیں منائے کر رہا ہوں، پھر سلیمان سیٹھ خان مرحوم سے اڑنے لگا اور میں نے اپنے عمن کی خاطر اسے ادھیڑ دیا۔

"اب ملک کے اہم آدمیوں پر یقیناً تمہارا قبضہ ہے۔"

"ہاں! میں نے خنزیر انداز میں کہا۔ خان رنگ باز، سلیمان سیٹھ، نورین اور ملک نواز کے آدمیوں پر میرا تسلط قائم ہو چکا ہے۔ میں جب ملک نواز کے قنات میں علاقہ خیر گیا تو وہاں کے بڑے خان نے بھی ملک نواز کا متبادل مجھے تسلیم کر لیا ہے۔"

"اول! علی رضا نے طویل سانس لی۔ میں کوشش کروں گا میرے عزیز کہ یہاں میرے ساتھی بھی تمہیں تسلیم کر لیں کیونکہ ملک کا سورج اب بھی طلوع نہ ہو گا۔ حکومت بھی اس کے خلاف ہو چکی ہے لہذا ہم جیسے لوگوں کا مستقبل اب تم جیسا نوجوان ہی محفوظ کر سکتا ہے۔"

"شکر ہے جناب۔" میں نے منون لہجے میں کہا۔ میں مادام اور جانشین سے غٹ کر آپ لوگوں سے ایک دوستانہ میٹنگ کروں گا اور آپ سے درخواست کروں گا کہ گروہ میں نمایاں پوزیشن سنبھالیں۔ یہ لہجہ کی باتیں ہیں عزیزم۔ علی رضا اندر کی خوشی دباتے ہوئے بولا: "بہر کیف میں ہر ذمہ داری قبول کر سکتا ہوں۔ ایسی ذمہ داری جو میری سرکاری حیثیت سے میل کھاتی ہو۔"

اس نے معاذ کار دایں طرف گھائی اور ایک گیٹ کے سامنے روک دی۔ دونوں جوان کیاؤنڈ وال کے ساتھ کیا دی بنا رہے تھے۔ دونوں ہاتھ جھارتے ہوئے اٹھے اور کار کے دایں بائیں آکر کھڑے ہو گئے۔ اسی لمحے گیٹ کی کھڑکی میں بھری سی پیدا ہوئی اور پھر بند ہو گئی۔

"اندر اطلاع کرو۔" علی رضا نے ملاقاتی کارڈ دیتے ہوئے کہا۔ ایک نوجوان نے کارڈ لے کر گیٹ بجایا اور کھڑکی سے اندر چلا گیا۔

چند منٹ مجھ پر بڑے گراں گزرتے تھے۔ اس دوران علی رضا بھی بے قراری سے پہلو بدلتا رہتا تھا۔ جو کچھ میں سوچ رہا تھا شاید وہی پریشانی اُسے بھی کاٹ رہی ہوگی۔ مجھے ہر صورت اندر داخل ہونا تھا اور مادام شہناز بدی ہوئی شیرینی تھی اور اُسے اپنے ذرائع سے معلوم ہو چکا تھا کہ کوئی شکاری علی رضا تک پہنچ چکا ہے۔ وہ علی رضا کی آمد پر کچھ بھی سوچ سکتی تھی۔

معاذ گیٹ بے آواز کھلتا چلا گیا اور علی رضا بڑی عجلت کا مظاہرہ کرتے ہوئے کارڈ کھلے گیٹ سے اندر لے گیا تھا۔

پورچ میں چار آدمی بظاہر استقبال کرنے کھڑے تھے۔ ایک شخص نے علی رضا کے لیے بڑھ کر دروازہ کھولا اور اسے ہاتھ اٹھا کر سلام بھی کیا تھا۔ میرا پاؤں جوں ہی زمین پر لگا رہا اور کی سردنالی میری گردن سے لگ گئی تھی۔ تین آدمیوں نے علی رضا کو گھیر لیا تھا۔

"کیا یہ مادام کا حکم ہے؟" علی رضا نے کمرخت آواز سے پوچھا۔

"یہاں ہم لوگ سانس بھی مادام کی اجازت سے لیتے ہیں جناب! ایک ٹھیکے شخص نے جواب دیا۔ رہا داری سے گزار کر ہم ایک دروازے تک لے جائے گئے۔ ایک آدمی ساؤنڈ سے گزر رہا تھا۔

"چلے آؤ مسٹر علی۔" پردے کے پس منظر سے مترنم آواز ابھری۔ علی رضا نے پردہ ہٹایا۔ وہی شخص رہا اور تانے مادام کے عقب میں چوکس کھڑا دکھائی دیا۔ بیٹھ جاؤ۔" مادام نے مجھے گھورتے ہوئے کہا۔ کیا میرا امینڈنگ آرڈر نہیں تھا مسٹر علی کہ تم لوگ مجھ سے بالمشافہ ملاقات نہیں کرو گے؟"

"بالکل تھا مادام۔" علی رضا دھڑک کر بولا۔ لیکن حالات کے تحت ضروریات بدلتی رہتی ہیں۔

"کیا میں واپس چلی جاؤں مسٹر علی؟" مادام نے دہکتی آواز میں پوچھا۔ تم لوگوں کی حماقتوں نے مشن کو تباہ کر دیا ہے۔ تمہارے نقش پا یہاں کوئی اور بھی آ سکتا ہے۔"

"ہم یہی بتانے حاضر ہوئے ہیں مادام۔" میں بول پڑا۔ آپ کا اصل دشمن یہاں داخل ہو چکا ہے۔"

اس نے چونک کر استغیا میرے لگا ہوں سے دیکھا۔ لحظہ بھر وہ گھورتی رہی پھر غراتی آواز میں بولی: "کیا تمہارا استا رہ خرم سلطان کی طرف ہے؟"

"نہیں مادام۔" میں نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے جواب دیا۔ خرم سلطان میرے نزدیک ایک بوکھلایا ہوا پاگل گھیرڈ

ہے، جو بھی اُسے گھیر لیتا ہے اُسے وہ کاٹ کھا لے میرا اشارہ ایک مد مقابل شخص سے ہے جس کے پیچھے ایک بین الاقوامی دہشت گرد تنظیم ہے جسے پاکستان میں خالی گدی سنبھالنے کے لیے بھیجا گیا ہے۔ میں یہی اطلاع دینے آپ تک پہنچایا گیا تھا لیکن وہ لڑکی بزدل اور احمق تھی۔"

"اچھا تعارف کرو دو نوجوان۔" مادام نے سنبھل کر کہا۔ تمہیں کس نے بھیجا تھا؟"

"جو میرا روحانی باپ اور محسن ہے۔" میں نے عقیدت سے سر جھکا لیا۔ میں پنڈی سے ملک نواز کے ساتھ جبار خان تک گیا تھا مادام، آپ میرے بیان کی تصدیق مسٹر حسن سے کر دیتی ہیں۔ وہاں ہی ملک صاحب کو معلوم ہوا تھا کہ جانشین کیا چاہتا ہے۔ ملک صاحب نے یہ ذمہ داری میرے کندھوں پر ڈالی اور میں آپ کو ٹولیس کرتا ہوا غلط لڑکی کے ہاتھوں میں آ گیا۔ میں نے اُسے رپورٹ دی تھی اور آئندہ لائحہ عمل بھی بتایا تھا۔"

"تمہارا نام بابر ہے یا یہ بھی فرضی نام ہے؟"

"حسب ضرورت ہمارے چہرے اور نام بدلتے رہتے ہیں مادام۔" میں نے انگلیاں چنچلتے ہوئے بتایا۔ میں آپ کو ایک مثال دوں گا، خرم سلطان کا نام ان دنوں منشیات کی دنیا میں شیطان کی طرح مشہور ہے۔ وہ تمام ایجنسیاں جو منشیات کی پیداوار اور سپلائی کی ذمہ دار ہیں، خرم سلطان سے رابطہ قائم کرنے کے لیے بے قرار ہیں۔ ملک صاحب نے وقت اور ضرورت کے تحت میرا نام خرم سلطان رکھا اور مجھے جبار خان کی ایجنسی تک لے گئے لیکن یہ عجیب اتفاق تھا کہ وہاں وہ شیطان پہلے سے موجود تھا۔ اس لیے مجھے واپس آنا پڑا اور جبار خان کے بدلتے تیور دیکھ کر ملک صاحب کو سرحد پار کرنے کا فیصلہ کرنا پڑا۔

"ٹھیک ہے بابر۔" مادام شہناز کا تنا ہوا چہرہ ایک دم ڈھیلا ہو کر مائل یہ مسکراہٹ ہو گیا۔ تمہارا بیان ملک کی آخری رپورٹ کے عین مطابق ہے۔ کیا تم جانتے ہو خرم سلطان اور جبار خان کے درمیان آخری راؤنڈ کیسے کھیلا گیا ہے؟"

"سوری مادام! میں نے معذرت خواہانہ انداز میں گردن نفی میں ہلائی۔ حالات بے حد مخدوش ہو گئے تھے۔ مجھے جان بچا کر فرار ہونا پڑا تھا۔"

"خرم سلطان اور جبار خان کے درمیان بھی کسی بات پر ٹھن گئی تھی۔ ملک کی رپورٹ میں بتایا گیا ہے کہ خرم نے جبار خان کی فیکٹری تباہ کر دی ہے۔"

"وہ ایسا ہی پاگل شخص ہے مادام۔" میں نے جواب دیا۔ "کچھ لوگوں کا خیال ہے وہ حکومت کی ایما پر منشیات کے خلاف کام کر رہا ہے۔"

"یہ خیال بھی قریب قیاس ہے۔" مادام بولی۔ "کیونکہ اب تک جتنے بھی لوگ اُس کے قہر کا نشانہ بنے ہیں تمام کے تمام سرکردہ بزنس مین تھے۔"

"میرے ذہن میں ایک منصوبہ ہے مادام۔" میں نے موڑب لہجے میں کہا۔ اگر اس پر عمل کامیاب رہا تو ہم ایک تیرے دو دشمن ختم کر دیں گے۔"

"ہاں بولو۔" مادام کی آنکھوں میں میرے لیے تانش اور لگاؤ کی چمک ابھرنے لگی تھی۔ اگر قابل عمل ہوا تو۔۔۔"

"خرم سلطان کی سابقہ کارروائیوں اور اس کی فطرت کو مد نظر رکھ کر اگر ہم اس کا رخ جانشین کی طرف موڑ دیں تو جو کچھ ہم چاہتے ہیں وہ دونوں کو دیں گے۔ اگر خرم سلطان کامیاب ہو جائے تو پک کا طاقت ور مد مقابل راستے سے ہٹ جائے گا اور اگر جانشین کی تنظیم نے خرم سلطان کا بیٹہ کاٹ دیا تو ہم اس سے بے فکر ہو کر ساری توجہ جانشین پر لگا سکیں گے۔"

"تجویز خوش انداز ہے۔" مادام پر خیال انداز میں بولی۔ "لیکن اُس کا رخ کس طرح موڑا جائے؟"

"بالکل آسان طریقہ ہے۔" میں نے کہا۔ آپ جانشین سے دوستانہ مذاکرات شروع کریں اور پھر ہم یہ تاثر پھیلائیں گے کہ ملک نواز کی جانشینی کے لیے جانشین بہتر شخص ہے خرم کے ذرائع خود بخود اس کے قدموں کا رخ پھیر دیں گے۔"

"کیوں مسٹر علی؟" مادام نے علی رضا سے رائے لیتے ہوئے پوچھا۔ آپ کی رائے کیا ہے؟"

"میں بابر کی تجویز کی حمایت کروں گا۔" علی رضا نے جواب دیا۔ "اور بابر سے درخواست کرتا ہوں کہ جب تک ہم جانشین سے مذاکرات کرتے ہیں یہ خرم سلطان کے خطرے پر نگاہ رکھیں۔"

"اس منصوبے کی تہ میں ایک خبر بھی ہے مادام۔" میں آہستہ آہستہ گیند ڈمی کے قریب لاتے ہوئے بولا۔ "مس سمیرا کے مطابق خرم سلطان کی محبوبہ کو آپ اغوا کرانے میں کامیاب ہو چکی ہیں۔ اگر آپ حفاظت کے لیے لڑکی جانشین کی نگرانی میں دے دیں تو خرم سلطان کو ادھر متوجہ کرنا آسان ہو جائے گا۔"

"یہ خبر اگر سچ ہے تو مجھے یقین ہے جانشین نے اپنی برتری منوانے کے لیے میرا شکار مجھ سے چھین لیا ہے۔"

”اوہ تو کیا وہ آدمی آپ کے نہیں تھے؟“
 ”نہیں، میں ابھی ابتدائی مراحل میں تھی کہ وہ لے اڑا“
 ”یہ اچھا ہوا مادام“ میں نے اندر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”ہماری منزل... کچھ اور آسان ہو گئی ہے۔ آپ جانشین کو اس کامیابی پر مبارکبادیں مادام اور اس خیر سگالی پیغام سے مذاکرات کی ابتدا ہو جائے گی۔“
 ”عبداللہ خان!“ مادام نے گردن موڑ کر ریو اور برادر سے کہا۔ ”ٹیلی فون لے آؤ۔“
 عبداللہ نے ایک ٹیلی فون سیٹ اٹھا کر شہناز کے سامنے چھوٹی تپائی پر رکھ دیا۔ ”تم لوگ جاؤ صرف عبداللہ یہاں رہے گا۔“ اس نے ریسپورڈ اٹھاتے ہوئے کہا اور تینوں نوجوان مستعدی سے باہر نکل گئے۔ کون! سنو میں شہناز بول رہی ہوں مشر جانشین سے بات کر آؤ۔“
 انتظار کا دورانیہ دو منٹ تھا۔ مادام ریسپورڈ بالوں اور گالوں پر پھرتی رہی تھی۔ ”ایوننگ... فائن، مجھے آپ سے شکایت ہے مشر جانشین“ شہناز مشتہ انگریزی بولنے لگی۔ ”شکایت اپنوں سے ہی تو ہوا کرتی ہے۔ بیگانہ پتھر مارے تو کوئی حیرت ہوتی ہے نہ شکوہ۔ دیکھیے سر ہم ایک ہی ذات کے مخلص اور وفادار ہیں اور موجودہ منزل بھی مشترک ہے ہمیں ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑ کر چلنا چاہیے تھا۔ جی ہاں اتفاق کی قوت سے کون واقف نہیں۔ اچھا چھوٹیے، میرا دل آپ کی معذرت سے صاف ہو گیا ہے اور صاف دلی سے ہی آپ کو پہلی کامیابی کی مبارک دے رہی ہوں۔“
 مادام نے مصنوعی قہقہہ لگایا۔ ”انجان بن جائیں تو دوسری بات ہے۔ ویسے مجھے بے حد خوشی ہوئی ہے بلکہ میں کھلے دل سے اپنی ناکامی کا اعتراف بھی کر دوں گی۔ میں تو ابھی اُسے ٹریس ہی کر رہی تھی۔ ایک بات کا خیال رکھیے گا۔ شاید آپ خرم سلطان کو دوسرے تیسرے درجے کا غنڈہ سمجھ رہے ہوں۔ وہ بے حد در اور عیار ہے، جس نے نلک جیسے طاقت ور اور بااثر شخص کو ملک سے باہر نکال دیا ہے۔ وہ کچھ تو ہو گا مشر جانشین... اوں... اوں، گڈ ریکم آپ نے بروقت اور بہت اچھا اٹھایا ہے۔ جب تک لڑکی اس کی دسترس سے دور رہے گی۔ وہ پس ہڑ کانے کتے کی طرح گلیوں میں دوڑتا رہے گا۔“ میں لپک کر اٹھا اور شہناز کے کان میں کہا۔ ”اس سے ملاقات کا وقت طے کر لیں“ شہناز نے فوراً ماتھ پیس پر ہنسی لکھ لی تھی۔

”لڑکی اس نے کراچی کے لیے روانہ کر دی ہے“ شہناز نے بتایا۔
 ”وہ جھوٹ بول رہا ہے مادام“ میں نے کہا۔ ”اس سے روانگی کا ذریعہ پوچھیں۔“
 ”معاف کرنا مشر جانشین، میرا ایک ملاقاتی آرہا ہے۔ ہاں کیا آج کسی جگہ مل بیٹھ سکتے ہیں۔ اوہ شکریہ، میں حاضر ہو جاؤں گی پھر ہم مل کر کوئی لائحہ عمل تیار کریں گے۔“
 ”وہ بہت تیز جا رہا ہے“ ریسپورڈ رکھ کر شہناز متفکر رہے۔
 میں بولی۔ ”غالبا وہ لڑکی کے لیے کچھ لواؤں دو کی پالیسی اختیار کرنا چاہتا ہے۔ اگر اس نے خرم سلطان سے ہاتھ ملالیا تو ہمارے لیے دونوں مل کر نیا محاذ قائم کر سکتے ہیں۔ مافیالوے خرم سلطان جیسے شخص کو نظر انداز نہیں کریں گے۔ وہ اسے بہتر پیش کش سے خرید لیں گے۔“
 ”آپ کا تجزیہ قابلِ داد ہے میڈم“ علی رضا پُرسٹائش آواز میں بولا۔ ”اس سے قبل کہ وہ خرم سلطان سے معاملہ طے کریں آپ کو آگے قدم بڑھا کر جانشین کو اعتماد میں لے لینا چاہیے۔“
 ”مشر باہر تمہارا کیا پروگرام ہے؟“ شہناز نے نرم و ملائم انداز اختیار کرتے ہوئے پوچھا۔
 ”میری منزل آپ ہی مادام“ میں نے فدیہ مان لیا۔ ”میں جواب دیا۔ ڈیڈ نے ہی ہلاکت دی تھی، سو میں نے منزل کے قدموں پر سر جھکا دیا ہے۔ پروگرام آپ دیں گی میں کروں گا۔“
 ”تھینک یو باہر“ مادام خالصتاً محوِ بانہ اداسے بولی۔ ”یہ بتاؤ سمیرا کو کوئی خطوہ تو نہیں؟“
 ”خطرہ محسوس کرتے ہوئے میں نے اسے محفوظ جگہ پہنچا دیا ہے۔“ میں نے بتایا۔ ”وہ خرم سلطان کا نام سن کر ہراساں ہوا ہو گئی تھی۔ وہ میرے آدمیوں کی نگرانی میں ہے۔“
 ”ٹھیک ہے تم شام پانچ بجے میرے ساتھ چلو گے۔“ مادام نے نگاہیں جھکا لیں۔ ”دراصل جانشین عورتوں کے معاملے میں بڑا خطرناک مشہور ہے۔ یہی وجہ رہی ہے کہ میں اس سے گریز کر رہی ہوں۔ تم ساتھ ہو گے تو میں خود کو محفوظ سمجھوں گی۔“
 ”آپ کی حفاظت میرے فرائض میں شامل رہے گی میڈم۔“ میں نے پُر وثوق لہجے میں کہا۔ ”آپ ایک توالے سے میرے لیے بڑی محترم ہیں۔“ اس نے چونک کر آنکھیں پوری کھول دیں اور پھر لائبریری لپکیں تھر تھراتی ہوئی جھک گئیں۔ میں سوچنے لگا۔ عورت ہر روپ میں صرف عورت ہی رہتی ہے۔ چاہئے اور چاہے چلنے کی تمنا کی اور من پسند مرد کے لیے نرم و نازک پھول۔

”مشر علی آپ جاسکتے ہیں۔“ شہناز کی آواز میں مادام کی کھنک بکھر گئی تھی۔ ”اب میں راز میں نہیں رہی۔ آپ شام سات بجے نوازش کے ساتھ آئیے گا۔ ہم جانشین کی ملاقات کی دعوتی میں مینگ کریں گے۔“ علی رضا اٹھا تو میں بھی اٹھ کھڑا ہوا۔ مادام پھر نمبر ڈائل کرنے لگی تھی۔
 ”میں علی رضا صاحب کو دراپ کرتا ہوا رشیدہ اور سمیرا کی طرف جاؤں گا۔ آپ اپنے آدمیوں کو واپس بلا لیں، مادام سمیرا اب میری ذمہ داری میں ہے۔“
 ”تم کچھ ضرورت سے بڑھ کر باخبر ہو باہر“ شہناز چپچپے انداز میں بولی۔
 ”کیا ایسا نہیں میڈم“ میں مسکراتے لگا۔ ”مادام جیسی محتاط عورت ایسی غلطی نہیں کر سکتی۔ مجھے یقین ہے سمیرا اور رشیدہ گھر سے ہوشیار ہیں آپ کی نگاہوں میں رہی ہوں گی۔“
 ”ہاں!“ مادام ہنسنے لگی۔ ”جب تم ان کے ساتھ نکلے تھے تو مجھے اطلاع مل گئی تھی۔ چونکہ وہ مجھے ایک جوڑے کے بارے میں رپورٹ دے چکی تھی اس لیے میں نے صرف نگرانی کا حکم جاری کیا تھا۔“
 ”میں پونے پانچ بجے حاضر ہو جاؤں گا۔“ میں نے چلتے ہوئے بتایا، پھر فٹ پاتھ پر رُک کر میں پلٹ کر بولا۔ ”کیا یہ مناسب نہ ہو گا پہلی ملاقات آپ کا نام اندہ کرے؟“
 ”اصولاً تو ہونا ایسے ہی چاہیے۔“ وہ ڈائل سے کھیلنے ہوئے بڑبڑاتی۔ ”سربراہی مینگ سے پہلے تم لوگ اس محل کو“
 ”آپ کی اجازت ہو تو صرف میں یہ فرض خوش اسلوبی سے ادا کر سکتا ہوں۔“
 ”ٹھیک ہے تم جلدی واپس آجانا میں تمہیں بریف کر دوں گی۔“
 میں نے سر کو ہلکا سا خم دیا اور باہر نکل گیا۔
 بظاہر مادام شہناز کا چہرہ پُر سکون تھا۔ اس کی آنکھوں میں بھی شک کا کوئی سایہ نہ تھا لیکن کوئی چیز میرے ذہن میں گھللا رہی تھی جیسے بیڈ شیٹ کے نیچے کوئی چھوٹا سا کھنک۔
 حساس جلد کو پریشان کر رہا ہو۔ شاید وجہ یہ رہی ہو کہ شہناز جیسی متحدہ عورت بڑے بودے جواز پر یقین کر بیٹھی تھی۔ اگر میں اس کی جگہ ہوتا تو ان حالات میں ایک اجنبی پریلوں آنکھیں بند کر کے اعتماد بھی نہ کرتا۔ اس کے اعتماد میں شاید ملک نواز کی رپورٹ کا قلم ہی تھی جس نے نہ جانے کس انداز میں خرم سلطان

کا ذکر کیا تھا۔
 ”تم بہت کامیاب ایکسپریس ہو برنور دار“ گیٹ سے نکل کر علی رضا بولا۔ ”اور یہ عورت... اس نے آج مجھے بالکل ہی یوں کر دیا ہے۔ جانتے ہو یا نہیں وہ بکھر گئی ہے۔ صرف تمہاری مردانہ وجاہت نے اس کی مت مار کر رکھ دی ہے۔ تم اسے نہیں جانتے یا بڑبڑی شکاری عورت ہے۔ دولت اور جیبہ مرد اس کی کمزوری ہے۔ ملک نواز نے دولت سے اسے رام کر رکھا تھا۔ کیا تم اسے برداشت کر لو گے؟“
 ”مجبوری ہے سر“ میں نے گہری سانس لی۔ ”بڑے مقصد کی خاطر چھوٹے چھوٹے نقصان برداشت کرنے ہی پڑتے ہیں۔“
 ”کیا واقعی تم دونوں کو لڑانا چاہتے ہو؟“
 ”ہر تیسری طاقت کو پہلی پوزیشن حاصل کرنے کے لیے مد مقابل دو طاقتوں کو لڑانا پڑتا ہے سر۔“
 ”بے شک۔“ علی رضا نے تائیدی لہجے میں کہا۔ ”میری غائبی اور تعاون تمہارے ساتھ ہو گا۔“
 ”صرف تعاون سر“ میں نے زیر لب مسکرا کر کہا۔ ”ہم بڑے لوگوں کی دعائیں شرف قبولیت نہیں پاتیں، دعائیں نیکیوں کے لیے نیک لوگ کیا کرتے ہیں۔ کیا شیطان کی دعا قابل قبول ہو سکتی ہے؟“
 ”عاقلاً نہ باتیں بڑے ظالماتہ انداز میں کرتے ہو باہر“ علی رضا بولا۔ ”میں نے تو سنا ہے جب انسان کے اندر احساس گناہ بیدار ہو جاتا ہے تو وہ بُرائی سے توبہ کر لیتا ہے۔ تم کیسے انسان ہو، زاہدوں کی طرح سوچتے ہو اور بڑے کام بھی کرتے ہو۔“
 ”میں صرف حقیقت پسند ہوں جناب۔“ میں نے ٹھوس لہجے میں کہا۔ ”اندھیرے کو روشنی کا نام نہیں دیتا۔ رہا سوال بُرائی کا تو سب جانتے ہیں کہ روشنی میں ٹھوکر نہیں لگتی، اس کے باوجود ضروریات زندگی لوگوں کو اندھیری راہوں کا مسافر بنا دیتی ہیں۔ میں بھی ایسا ہی مسافر ہوں جس کے مقدر میں تاریکی بھری ہوئی ہے۔“
 ”اوہ شاید تمہارے ساتھ کوئی حادثہ چل رہا ہے۔“ علی رضا نے چہرہ گھماتے ہوئے کہا۔ ”مجھے بتاؤ نوجوان، میں بھی بنیادی طور پر بُرا نہیں ہوں۔ مجھے بھی حادثے نے یہ زہر دیا ہے۔“
 ”یہ فرصت کی باتیں ہیں سر“ میں نے جھرتائی ہوئی آواز میں بتایا۔ ”اگر وقت نے ہمیں ایک راستے پر ڈال دیا تو میں اپنا ایک ایک زخم آپ کو ضرور دکھاؤں گا۔“

”ہم سب زخمی ہیں۔ اس کی آواز میں بھی آنسو گھل گئے تھے۔ زخم درد کرتے ہیں تو ہم گھبرا کر دوسروں کو کاٹنے لگتے ہیں، سنا ہے باؤ لا کتا بھی اندر کے درد سے نجات حاصل کرنے لگیوں میں دوڑتا ہے اور لوگوں کو کاٹتا ہے۔“

”ہاں سر!“ میں سنک پڑا۔ ہم بڑے لوگ دراصل بافلے کتے ہی ہیں۔ معصوم لوگوں کو کاٹنے اور معاشرے کے خون میں نہر لیے جراثیم داخل کرنے والے پاگل کتے۔“

علی رضی نے طویل جلتی ہوئی سانس لے کر چپ سا دھلی تھی۔ میں اُسے ڈرا کر تار ہوا سیدھا صدر کے لیے روانہ ہو گیا۔ سمیر اور رشیدہ کا خطرہ دور ہو گیا تھا۔ شہناز نے اپنے گروگوں کو نگرانی تک محدود رکھا تھا، اس لیے میں مطمئن ہو گیا تھا۔ اب صرف جانسن سے ملاقات ذہن میں گردش کر رہی تھی اگر اس نے شہناز کو حقیقت سے آگاہ کیا تھا تو پھر جانسن کے حلق تک ٹیڑھی انگلی ہی داخل کی جاسکتی تھی اور میں بے خبر تھا کہ اس کا حلق میرے لیے قابل حصول ہو گا یا رسانی کی کھٹن منازل سے گزرنا ہو گا۔

جب میں ہول کی لابی میں داخل ہوا تو لہجہ ناظم ختم ہو چکا تھا۔ ڈائننگ ہال میں کچھ لوگ بیٹھے ہوئے تھے۔ ویز جب معمول کھانے کے برتن اور ٹیبل صاف کرنے میں مصروف تھے۔ اکبر نے آنکھوں سے دور رہنے کا اشارہ دیا۔ میں ایک اسٹول گھسیٹ کر کاؤٹر کے قریب بیٹھ گیا۔ میں نے سرسری نگاہوں سے ہال کا جائزہ لیا۔ دونوں جوان مشکوک دکھائی دیے۔ ایک نے نگاہیں بچراتے ہوئے چہرہ اخبار کی اوٹ میں کر لیا اور دوسرا سگریٹ سلگانے لگا تھا۔

پھر اٹھ کر اکبر سے ٹیلی فون استعمال کرنے کی اجازت طلب کی۔ اس نے سیٹ نکال کر اوپر رکھ دیا۔ میں نے ویسے اوٹ ہانگ کر کئی نمبر ڈائل کر لیے۔ اکبر بائیں کھنٹی کے بل کاؤٹر سے ٹیک لگا کر قریب ہو گیا۔

”کیا رپورٹ ہے اکبر خان؟“

”ماسٹر وائس آگئے ہیں۔“ اکبر زیر لب بولا اور میں نے پہلو بدل کر جھکے کو برداشت کیا۔ ان پر تشدد کیا گیا ہے ہارون صاحب اور وہ دونوں روم نمبر ٹریل ٹویں ہیں، مس رشیدہ ایک خاتون کے ساتھ آئی ہیں۔ ان کو بھی ساتھ والا روم دیا گیا ہے۔ باقی ساتھی روم نمبر فور تھری نائن میں ہیں۔ دو آدمی کافی دیر سے ہال میں موجود ہیں۔“

”جسٹر کھول کر مجھے بھی کوئی روم الاٹ کرو۔“ میں نے کہا۔

”میں اوپر جانا چاہتا ہوں۔“

”کیا ان لوگوں کو نظر انداز کیا جائے چیف؟“ اکبر نے رجسٹر کھولتے ہوئے پوچھا۔ یہ یقیناً نگرانی کر رہے ہیں۔ مس رشیدہ کے تعاقب میں آئے تھے۔“

”جھک مار کر خود چلے جائیں گے۔ میں نے دستخط کرنے کے لیے پینسل دیے ہی رجسٹر پر چلائی اور ایک چابی لے کر سٹریٹوں کی طرف بڑھ گیا۔“

دستک پر دروازہ کھلا اور مجھے اپنے سامنے پاکر ہارون کا سٹا ہوا چہرہ ایک دم ایسے کھل اٹھا جیسے خزاں کے مارے درخت کو ہوا نوید بہار سنا گئی ہو۔ اس نے راستہ چھوڑا اور پھر میرے پیچھے دروازہ بند کر دیا۔ سامنے مسبری پر کروٹ کے بل ٹیگن دروازہ تھا۔ وہ صرف پہلو بدل کر رہ گیا تھا۔ اس کا چہرہ کسی ایسے بدعیب بوڑھے کا چہرہ تھا جسے لیٹروں نے نوچ کھسٹ لیا تھا۔

میں جوں ہی اس پر جھکا اس نے چہرہ دوسری طرف ٹوڑ لیا۔ ”مجھے انسو ہے چیف۔“ وہ نحیف آواز میں کراہتے لگا۔

”لیکن شرمندہ نہیں ہوں۔ میں نے آخری گولی تک اُن کا مقابلہ کیا تھا۔“

”میں شکریہ ہی ادا کرنے کیا ہوں ماسٹر۔“ میں نے اس کے بکھرے بالوں کو قہقہہ تھپایا۔ جنگ میں پلڑے جھکتے اٹھتے رہتے ہیں اصل بات جی داری اور مقابلہ ہوتی ہے۔ اگر آپ بہتر ٹھوس کوئس تو مجھے بتادیں ٹیڈ کن باحتقوں میں ہے؟“

”اب تک جتنے بھی باحتقوں سے تمھارا واسطہ رہا ہے، ان سے وہ ہاتھ مضبوط ہیں چیف۔“ وہ ٹھہر ٹھہر کر بتلنے لگا۔

”معاملہ اس لیے بھی سنگین ہے کہ بین الاقوامی دہشت گردوں کی تنظیم مافیا ہمارے خلافت درمیان میں کود پڑی ہے لیکن فی الحال ٹیڈ خطرے سے باہر ہے۔ اس نے مجھے ایک پیغام کے ساتھ، چھوڑا ہے۔“

”کیا جانسن نے پیغام دیا ہے؟“

”نام اور صورت سے میں ناواقف ہوں چیف۔“ بیگن نے جواب دیا۔ وہ لیس پردہ رہا تھا۔ اس نے پہلے مجھ پر دو گز گئے چھوڑے۔ وہ خرم سلطان کی اصلیت معلوم کرنا چاہتے تھے۔ میں پہلی آواز سے آخری بات تک ایک ہی جواب پر قائم رہا کہ خرم سلطان منشیات کی اجارہ دی برقا لیں ہونا چاہتا ہے اور اس نے یہاں کے تمام ممتاز بلیک بزنس میں کاٹ ویسے ہیں۔“

”اب وہ کیا چاہتا ہے؟“

”خرم سلطان سے دوستانہ ملاقات۔“ بیگن نے کٹے پٹے ہونٹوں کو انگلی سے سہلاتے ہوئے بتایا۔ ”میرا خیال ہے وہ بھی تمھاری پالیسی اپنانا چاہتا ہے۔ قریب لاؤ اور بفل سے چھری نکال کر گھونپ دو۔“

”راہیٹے کا ذریعہ؟“

”چار بجے وہ خود کال کرے گا۔“

”آپ کا کیا مشورہ ہے ماسٹر؟“

”پہلے خود کو برتر ثابت کرو چیف۔“ بیگن بولا۔ ”بصورت دیگر وہ اپر جینڈ ہونے کی حیثیت سے فائدہ اٹھانا چاہے گا۔“

”کیا ٹیڈ اسی کوٹھی میں ہے؟“

”کچھ کہہ نہیں سکتا۔ مجھ سے جدا کمرلی گئی تھی۔“

”وہاں کل کتنے آدمی ہیں؟“

”میرے سامنے صرف دو آئے تھے۔“ بیگن نے بتایا۔

”واپسی اندھوں کی طرح ہوتی تھی اس لیے کچھ دیکھ نہیں سکا۔“

پھر میں نے اپنی کارگزاری کی رپورٹ سنائی۔

”دہتر ہو گا آپ پہلے بحیثیت بائیر ما دام کے ساتھ ملاقات کریں۔“ بیگن نے میری رپورٹ سن کر مشورہ دیا۔ ”اس سے کوئی آسانیاں میسر آسکتی ہیں۔ آپ کوٹھی کا محل وقوع، داخل ہونے کا راستہ، مین پاور کا اندازہ اور جانسن کی ذاتی ذہانت سے آگاہ ہوں گے۔ یہ بھی پتا چل جائے گا کہ وہ مادام شہناز کے ساتھ مل کر کیا کرنے کا ارادہ رکھتا ہے۔“

”نعم کیوں خاموش ہو ہارون؟“

”بڑوں کی باتوں میں دخل اندازی بچے نہیں کیا کرتے چیف۔“ ہارون مسکراتے لگا۔ ویسے قدرت ہیں ایک سنبھرا موقع دے رہی ہے۔ جانسن سے دوستی کا مطلب ہو گا کہ ہم مافیا جیسی خطرناک تنظیم کے اندر رسانی حاصل کر لیں گے اور آپ اندر جا کر بلاسٹ ہونے کے ماہر ہیں۔“

”ہاں ہارون، ہم قدرت کے اشاروں پر ہی چلیں گے۔“ میں نے ٹھوس لہجے میں کہا۔ ”ہاں اب تم کوٹھی کی خبریں سننا دیکھو میں میرے اپنے۔“

”مجھے دلاور خان اندر لے گیا تھا۔“ ہارون بولنے لگا۔

”ماں جی کی قدم بوسی کی سعادت بھی نصیب ہوئی۔ باقی تو سب خیریت ہے بس آپ کے لیے سب پریشان ہیں۔ ماں جی کو میں نے مناسب حد تک بتا دیا ہے کہ خرم سلطان ملک و قوم کے لیے

کتنا قیمتی اثاثہ ہے۔ وہ بے حد خوش ہوئیں مگر چوہدری نے راضی نامے کے لیے جرگہ بھیجا تھا لیکن گاؤں کے بزرگوں نے راضی نامے سے صاف انکار کر دیا ہے۔ کلثوم اور فاروق چوہدری بھی ماں جی سے معافی مانگنے آئے تھے مگر ان کو بھی کوٹھی میں داخل ہونے کی اجازت نہیں دی گئی۔ زینت بہن نے آپ کے لیے خط دیا تھا۔ ہارون نے لفافہ نکال کر میرے سامنے رکھ دیا۔ میں نے لفافہ چاک کر کے خط نکال لیا۔ زینت نے لکھا تھا۔

خرم!

سوچتی ہوں کس رشتے کا حوالہ دوں۔ سلام نکھوں یا صرف دُعا؟ سلام کی تمغیں پروا نہیں اور دعائیں میری بے اثر ہو چکی ہیں۔ اگر میسری دُعاؤں میں تاثیر ہوتی، طاقت پر واز رکھتیں تو آج میں گھائل مرغابی کی مانند پانی سے بہت دور تپتے صحرائیں نہ تڑپ رہی ہوتی۔ ہاں خرم! میری دعاؤں اور مجھ سے پر توجہ لیے گئے ہیں۔

جانتے ہو جب کسی گھر کی چہار دیواری کی دیوار گر جاتی ہے تو لوگ صحن میں راستہ بنا لیتے ہیں اور جب کسی عورت کے سر سے عزت کی چادر اتر جاتی ہے تو کیا ہوتا ہے؟ سنو میرے جیالے اور غیرت مند خرم سلطان! آسمان پر کیا ہو رہا ہے میں گنہگار عورت بے خبر ہوں مگر مظفر چوہدری کے گھر اور گاؤں میں ایک اسکیم بن رہی ہے، اس منصوبے کو لے کر جرگہ آیا تھا۔ وہ چاہتے ہیں کہ ہانہ کے بدلے ہانہ لے لی جائے۔ کلثوم کی ہانہ خرم سلطان کے حوالے کر دی جائے اور زینت فاروق چوہدری کے حوالے کر دی جائے۔ کیا کہتے ہو۔ سنا ہے کچھ کلثوم بھی تمھاری دھڑکنوں میں شامل تھی لیکن زینت کون ہے اور کس کے لیے دھڑکنوں کا سفر جاری رکھے ہوئے تھی۔ یہ بات بھی تم جانتے ہو کوئی فیصلہ کرنے سے قبل صرف ایک بار مجھ سے مل لو۔

زینت۔

خط کا ایک ایک نقطہ اور ایک ایک شوشہ نیرے کی آنٹی مانند میرے دل کو چھیدا گیا تھا لیکن میرے لبوں نے قبضے کا کام لیا تھا۔ جس طرح کبھی نرم و نازک انسانی وجود ہوا کی سرسراہٹ

”ناظم الدین روڈ وہ سچاٹ پیسے میں بولی۔“

”سوری میڈم! میں نے انجن اسٹارٹ کرتے ہوئے حضرت خواجہ انداز میں سرفی میں بلایا: اسلام آباد کی سڑکوں سے ہیں نا واقف ہوں۔“ کوئی بات نہیں۔ اس نے دروازہ دھڑکے کھولا اور میں برک کراس کی چوڑی ہوئی سیٹ پر چلا گیا۔ ”پچھلی سیٹ پر تم میرے بادی گاؤ ہو۔“ لیکن دیکھنے والے مجھے دی۔ آئی پٹی اور آپ کو ڈرائیو مجھ سے گئے۔ میں نے نہیں کر کہا اور شہناز نے گھوڑ کر دیکھا پھر ہونٹ سکڑ کر مسکراتے لگی۔

”اگر فرنٹ سیٹ پر بیٹھتا؟“

”تو زن مرید! میں نے جواب دیا اور اس سے ٹھنکتا ہوا قبضہ لگایا۔“

”خاتمہ تجربہ کار ہو۔“

”جی ہاں لیکن نلن مریدی کا کوئی تجربہ نہیں۔“

”تم جیسا مرد... وہ کہتے کہتے خاموش ہو گئی۔“ ”سب نو بار! میں غری نہیں ہونا چاہیے میرا مطلب ہے جب کسی مشن پر ہوں۔“ ”آئندہ احتیاط برتن جانے گی میڈم! میں نے سنجیدگی سے کہا: اور اصل میں کبھی بائیں ہاتھ پر نہیں رہا۔ ماتحتی کے آداب سے ناواقف ہوں۔ پہلے فری لانس رہا پھر ماسٹر بنا اور اب اپنے گروہ کا چیف ہوں۔“

”کیا خرم سلطان کی لہجہ میں سچی تم چیف ہو؟ شہناز چپتی آواز میں بولی۔“

”اگر بھی ملاقات ہوئی تو اس کی فہرست پہنچی پوزیشن فور دیکھو گ! پختی اور لاہور میں تو اس نے کوئی چیف چھوٹا نہیں۔“ ”ان دونوں میں بڑے درجوں کی اہمیت میں تھا۔ اور اصل خرم سلطان نے ہی مجھے پہنے کا موقع فراہم کیا ہے۔ بڑے درخت اس نے صاف کیے تو مجھے دھوپ اور نمی ملنے لگی۔ ورنہ شاید میں کچھ عرصہ اور گنہگار رہتا۔“

”پھر تو وہ تمہارا عین ہوا نا؟“

”ہاں! شیک سماجی انسان میں موت...“ ”اگر وہ اپنا کام سنا سنے آجائے تو کیا کرو گے؟“ ”پہلے شیک اور کروں گا اور پھر اس کے حلق میں گرم گرم گولی اتار دوں گا۔“

”واقعی! اس نے غرائق نگاہوں سے دیکھا۔“

”ملاقات کروائیے اور دیکھ لیجیے۔“

”یعنی احسان اور وقت کے تم قائل نہیں ہو۔“

”ہوں لیکن ناگ اور پھر نیے کی طرف دوڑتی ہاتھ نہیں دیکھا۔“ ”اچھا! اب تو فریق ختم شہناز نے سنہری کڑا گھما کر وقت دیکھ کرے میں گھر کی کاڈی فلٹ تھا۔ میں زبان بند مگر آنکھیں اور کان کھلے رکھنے ہوں گے۔ میں چاہتی ہوں پہلے وہ اپنے جھیلے کی ساری بتیاں نکال کر ہمارے سامنے لائے۔“

”اور پھر ہم ایک ایک جی کو نکال کریں۔“ میں نے اس کی بات ایک کرکٹل کر دی۔

”بالکل! اس نے چہرہ ذرا سا ترچھا کرتے ہوئے کہا: ہرگز نا لحاظ تم بہت اچھا استعمال کر رہے ہو باہر مجھے یہ بات پسند ہے کہ میرا بایاں ہاتھ دہری کچھ سوچے جو دایاں ہاتھ سوچتا ہے۔ دونوں ہاتھوں میں سوچ کی یکسانیت ہی ضرب کی باوقوف ضمانت ہوتی ہے۔“

”لیکن ایک بات کے لیے اگر اس نے زبان دیکھ لی تو میں پہل کرنا ہوگی۔ میں نے پھر کیلے انداز میں کہا: اس کے ہاتھ میں ایک مضبوط موثر ہے۔ رنگ بازخان کی بیٹی۔ وہ جانتا ہے خرم سلطان اسی فکری پارتی کے چھندے میں جھپٹے گا جس کے پاس خان کی بیٹی کا پارہ ہوگا۔ چونکہ آپ اس مشن پر کام کر رہی ہیں اس لیے اس کے پٹے کی موجودگی میں خود کو برتر مان کر بات کرے گا۔ ہمیں سب سے پہلے اس کا مان توڑنا ہوگا۔ اسے باور کرانا ہوگا کہ مادام شہناز رنگین چوڑیاں پہننے والی لڑکی نہیں ہے۔“

”ہر انداز سے تم مجھے متاثر کر رہے ہو باہر! وہ دل نشیں انداز میں بولی: میرے گردپ میں اچھا اضافہ اور رشیدہ کا خوبصورت تحفہ ہو۔ میرا سنے بے دے لفظوں میں تمہارا جغرافیہ بیان کیا تھا میں سمجھتی تھی کوئی خوبصورت نوجوان رشیدہ کا شیدائی ہوگا وہ بڑا ایسی ہی شکاری فطرت لڑکی رہی ہے لیکن اس بار وہ واقعی خود بخود ہوئی ہے۔ کیا واقعی وہ تمہاری...؟“

”نہیں میڈم! میں نے نفی میں گردن ہلائی۔“ ”میں آپ کی تلاش میں تھا۔ لاہور سے آپ نکل آئی تھیں اور یہاں کا ایڈریس کوئی تانتا پر تیار نہ تھا۔ ناگ رنگ میں رشیدہ سے ملاقات ہو گئی اور وہ میری منزل کی راہنما بن گئی۔ ویسے اس نے مجھے متاثر کیا ہے۔ غلط اور مظلوم لڑکی ہے۔“

”بالوں باتوں میں حرکت گیا تھا۔ شہناز نے یقیناً پہلے سے وہ وسیع و عریض کوٹھی دیکھ رکھی ہوگی۔ میں نے اس کا کال بیل کا جین دیا یا اور پھر پھر بول سے دیکھا۔ ایک طویل قامت شخص لائے

ہے ڈگ بھر تا آ گیا تھا۔ اس نے بھی تجری سے جھانک کر دیکھا اور پھر گھٹ کھول کر ایک طرف ہو گیا۔“

”کوڑو پورج میں سائیکل کی بھی گنجائش نہ تھی۔ دو جیپ اور ایک کراسی تریچھی کھڑی تھیں۔ مادام نے ہاتھ دے پری سائیکل میں کار خانائی اور قدرے توقف کے بعد نیچے اتر پڑی۔ شاید وہ چاہتی ہوگی کہ کوئی ملازم اگر دروازہ کھولے کی رسم ادا کرے لیکن طویل قامت شخص بٹ پری مرگ گیا تھا۔“

”خاسا بدتمیز شخص ہے یہ جانسن۔ وہ بڑھاتی ہوئی چل پڑی۔“ ”بدتمیز نہیں میڈم! میں نے چنگاری کو دامن کی ہوائی۔“ وہ اپنی ہیبت جتنا چاہتا ہے۔“

”کیا مطلب؟ مادام غراٹی۔“

”یہی کرے متوقع جہانوں کی کوئی پہوا نہیں۔“ میرا جواب سن کر مادام نے مجھے گرفت لگا ہوں سے گھوڑا اور پھر مڑ کر بنا کر اطراف کا جائزہ لینے لگی۔ میں نے تو گریٹ سے داخل ہوتے ہی اپنے مطلب کا کوڑو دیکھ لیا تھا۔ مغربی حصہ غیر آباد اور بے توجہی کا شکار پتھلا درختوں کا جنگل تھیں۔

”سلام! ایک ستون کی اوٹ سے وہ ایک دم سامنے آ گیا تھا۔ مادام شہناز...!“

”ہاں! سڑک خان کو پورا اسلام پلوڈ شہناز نے حکمانہ آواز میں گلاب دیا۔“

”صاحب گول کمرے میں آپ کا ہی انتظار کر رہے ہیں مادام! دم نے مؤدب لہجے میں بتایا۔“

”تشریف لائیے۔“

”دوسرے نوڑکا پہلا دروازہ گول کمرے کا ہی تھا۔ ملازم نے اس سے دستک دی اور پھر دروازہ کھول کر ایک طرف ہٹ کر کھڑا ہو گیا۔“

”مادام شہناز نے کن آنکھوں سے میری جانب دیکھا اور پھر ہر دوسرے پہرہ چڑھاتی ہوئی اندر داخل ہو گئی۔ وہی گرفت اور فکری پھر اصل مادام کا چہرہ مل گیا ہوگا، ورنہ میرے سامنے تو ایک خوش رنگ اور نرم و نازک میٹھے چہرہ ہی رہا تھا۔“

”خوش آمدید! مادام! وہ جب جھول کر اٹھا تو میرے اندر جانسن کا کوئی پیکر ایسے ہی ٹوٹ گیا تھا جیسے کانٹس سے کاٹج کا مرتبان فرش پر گر گیا ہو۔“



وہ چالیس پینتالیس سالہ ایک توانا مضبوط اور سرفرد وجہ مرد تھا۔ اس کے مردانہ حسن کی حکمرانی آنکھوں کے پاس تھی۔ بھوری اور بڑی بڑی جادو اثر چمک دار آنکھیں، یقیناً وہ غور و خول کا پسندیدہ مرد رہا ہوگا کوئی بھی غور سے اس کی آنکھوں کے سحر سے بے خبر نہیں ہو سکتی تھی۔ وہ دل آویز انداز میں مسکراتا ہوا آگے بڑھا اور مادام نے اپنا ہاتھ آگے بڑھا دیا۔

”اگر مجھے مشرقی روایات کا احساس وہاں نہ ہوتا تو میں مغربی رسم ضرور ادا کرتا! اس نے ہاتھ ملا کر چھوڑ دیا۔“

”میرا دست راست اور بائیں کا رڈ! مادام نے میری جانب اشارہ کیا۔ جانسن نے میرا ہاتھ اپنے بڑے اچھے رنگ میں تہ مقابل سلطان اپنی طاقت کا مظاہرہ کرتے ہوئے میرا ہاتھ اگر زبان نکھٹا تو بیخ اٹھائیں خود کو سہہ کر بیٹھا تھا۔“

”انتخاب اچھا ہے مادام! اس نے بایاں ہاتھ میرے شانے پر رکھ دیا۔“ یقیناً چاب سے لیا ہوگا۔“

”جی ہاں! شہناز نے سپاٹ آواز میں کہا: پنجابی ہے۔“

”میری معلومات میں حیرت ناک اضافہ ہوا تھا کہ جانسن صرف نام کا ہی غیر ملکی تھا۔ اردو... ہم پنجابوں کے بچے میں ہوتا تھا اور رنگ بھی گلابی مال گندمی تھا۔ نیوی بیوٹلوار قمیص نے ایسی ہونے کی مہر ثبت کر دی تھی اگر وہ مجھے کسی دوسری جگہ ملا لیں اسے شاید پٹھواری ہی سمجھتا۔“

”میرے دوست کی طرف سے کوئی تانہ ترین خبر؟“

”نہیں! شہناز بولی: روائی کی خبر کے بعد کوئی اطلاع نہیں ملی۔“ ”میں نے اتھانے ان امریکی اور دوسرے مراکز کو ہدایات دے دی ہیں! جانسن ہٹانے لگا: آپ فکر نہ کیجیے گا۔ اب محفوظ ہاتھوں میں ہوں گے۔“

”فکر نہ کر جانسن! شہناز منجبل کر بولی: مجھے ان کی اتنی فکر نہیں! وہ ہمیشہ اپنی حفاظت آپ کرتے رہے ہیں لیکن ان کی عدم موجودگی میرے لیے پریشان کن ہے۔ شاید آپ کے علم میں نہ ہو۔ ملک صاحب نے مجھے اس لائن سے دور رکھا ہوا تھا۔ میرا اپنا بزنس اور طریقہ کار تھا، لیکن اب میں کئی مسائل سے دو چار ہوں۔“

”مجھے پوری طرح احساس ہے میڈم! جانسن زیر ب مسکرایا لیکن ملک ادا کے وفا داری کی موجودگی میں آپ کو پریشان نہیں ہونا چاہیے! جانسن نے رُک کر میری جانب دیکھا۔ کیا ہم نوجوان کی موجودگی میں مکمل کلمات کر سکتے ہیں؟“

”ہاں! میں بتا چکی ہوں باہر میرا دست راست ہے۔“

”معاف کرنا میڈم! وہ میرے سر پر ہاتھ لگا ہوں میں تو نے لگا دیا۔“

میرے لیے بالکل نیا ہے

"ہونا تو نہیں چاہیے، شہناز بولی، یہ ملک صاحب کا پروردہ ہے لیکن اس سے اسٹریٹ مارک کام لیا جاتا رہا ہے"

"ڈیڈ میچ بہت نیچے سے اُدھر لڑ رہے تھے، میں نے وضاحت کی۔" ہاں تو میں کہہ رہا تھا کہ ملک نواب بھی ہمارا چیت ہے۔ ہم یہ فرض کر رہے ہیں کہ وہ پرنس فور بگ کیس ہے۔ اس لیے اس کی عدم موجودگی میں جس بل کی کام کرنا ہوگا؟

"میں بھی درخواست لائی ہوں، شہناز ایک دم دھڑکی پڑی پڑی گئی، مال کو وہ باہر کی سطح پر باتیں کرنے آئی تھی، کیا آپ ہر سطح پر تعاون کریں گے؟"

"اول وجہ سے میڈم، جانسن فوڈیانا ہے میں بولا، "میں ایک گزارش کروں؟"

"فرمائیے؟"

"ملک نواز کے حوالے اور ہمارے مابین پرنس کا جو معاہدہ ہے ہے آپ میرے لیے ختم ہیں۔ میں درخواست کروں گا کہ آپ واپس اپنے سابق پرنس کو چلائیں، مدراصل یہ لائن آپ جیسی نازک اندام خاتون کے لیے مناسب نہیں ہے۔ شاید آپ کو اندرونِ خلد کی بہت سی باتوں کا علم نہیں ہوگا۔ ملک نواز ہمارا آدمی ہے۔ پرنس میں ہر قسم کی پرمٹ شریک ہیں، ایک معاہدے کی رو سے جب کوئی ہمارا شریک کار کسی بھی وجہ سے اندر گر کر داخل ہوتا ہے تو اپنے اور پارٹنر کے مفادات کی خاطر انتظام ہم سنبھال لیا کرتے ہیں۔ میں واضح کروں میڈم! ملک نواز نے جو بھی ہیرے کوڑھوڑا تو میرے ہیرے کوڑھوڑے نے مجھے فوراً چارج سنبھالنے کا حکم جاری کر دیا تھا۔ اب میں پاکستان میں ملک نواز کا قائم مقام ہوں۔"

"اگر میں ثبوت مانگوں یا انکار کروں تو شہناز نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر پوچھا۔"

"ثبوت؟" جانسن نے نفی میں گردن ہلائی، "میں میڈم! ہر قسم کے لوگوں کو خفیہ دست و پازت نہیں دکھاتے، معاہدے میں آپ کے جوہر کا کوئی ذکر نہیں۔ درہا سوال انکار کا تو ایسی صورت میں میں آپ کو خواہ صورت شوکیں میں سجادوں کا قیمتی گویا کی طرح اور جب ملک نواز اسے گا تو گویا شوکیں سے نکال کر اس کے حوالے کر دوں گا؟"

"کیا تم مجھے دھمکی دے رہے ہو؟" شہناز ہر کئی آواز میں بولی۔ "ہرگز نہیں میڈم شہناز! جانسن کے ہونٹوں پر شیطانی مسکراہٹ نمودار ہوئی، "دھمکی تو مقابلے کی طاقت کو دی جاتی ہے۔ ہم کالج کی چوڑیوں اور پلاسٹک کی گڑیوں کو دھمکیاں نہیں دیا کرتے۔"

"میں جا رہی ہوں جانسن، شہناز اچھل کر اٹھی، "اگر روکنا چاہو تو روک لو"

"میں نہیں روکوں گا میڈم، وہ نرم آواز میں بولی، "روکنے کی ضرورت ہے نہ کوئی وجہ۔ ویسے اگر آپ ناراض ہو کر چلی گئیں تو مجھے افسوس ہوگا۔ کچھ مہربانی کے لیے ادب ہوتے ہیں۔ ایک بیانی جانے تو پی لیتیں۔ ہمارا لوجوان دوست بھی تو ساتھ ہے۔"

"بیشہ جانیں مادام! میں نے اٹھ کر شہناز کا راستہ روک دیا۔" سیر انیٹل ہے میں سڑ جانسن کی بات کو یوں نہیں لینا چاہیے ان کو بتانا چاہیے کہ قائم مقامی کو کن خطرات کا سامنا ہے۔"

"شکر مرطبار،" جانسن دوستانہ انداز میں بولی، "میں نے اپنا مافی الصبیح بیان کیا ہے میں غاصب نہیں بلکہ قائم مقام ہوں۔ اصل ماکم جب بھی آئے گا پھر سابق پرنس پر چڑھاؤں گا۔ مجھے کہنے دیجیے میڈم! آپ کا حق آپ کو ملتا رہے گا۔ اب بتائیے خطرہ کیا ہے؟"

"ایک شخص جس کا نام خرم سلطان بتایا جاتا ہے،" میں نے کہا، "انہیں بہر تلام نے مجھے ہرک دیا، ہم کوئی بات نہیں کریں گے اس سے کہو مجھے اٹھا کر شوکیں تک لے جائے۔"

"مادام پلیز! میں گہری سانس لے کر بولا، "یہ ہمارا اندرونی معاملہ ہے پہلے ہم اپنے مشترکہ خطرناک دشمن سے سخت لینا چاہیے۔"

"کیا اس شخص کا وجود ہے یا شیطاں کی طرح اسے کسی سوجی سمجھی اسکیم کے تحت مشہور کیا گیا ہے؟"

"انہیں سڑ جانسن وہ ہے،" میں نے پرجوش آواز میں کہا، "وہ ہمارے آئیے۔ بے شک اس کے ساتھ کوئی طاقت ہے۔ ورنہ تنہا شخص بڑے بڑے ہارڈل اور درختوں کو جڑوں سے نہ اکھاڑ سکتا۔ وہ خود بخوار درندہ ہے جناب؟"

"ہاں، ہماری ڈائری میں بھی اسے ہی نام دیا گیا ہے،" جانسن بولا، "لیکن ہر جگہ صرف اس کا نام بیگا ہے، کسی کے آج تک اسے دیکھا نہیں ہے۔"

"آپ کی ڈائری میں شاید یہ درج نہ ہوگا جناب! میں نے کہا، "جس جس نے اسے دیکھا وہ کسی کوتانے کے لیے زندہ نہیں رہا۔ اس کی ہسٹریسٹ پر جو بھی آتا ہے وہ اچانک اس کے سامنے نمودار ہوتا ہے اور اس کا زفرہ اُدھر دھڑک چلا جاتا ہے۔ ڈیڈ نے مجھے یہ بتایا تھا۔ وہ ہسٹریسٹ ہے۔ وہ بے حد خوفزدہ تھے جناب؟"

"فکر نہ کرو بہر خان، ہماری ہسٹریسٹ پر بھی جس کا نام چڑھ جاتا ہے اسے دنیا کی کوئی طاقت نہیں بچا سکتی، ہم ساتویں آسمان اور زمین کی انتہا گہرائیوں سے بھی اپنے شکار کو اٹھا لیتے ہیں۔"

جی ہماری ہسٹریسٹ پر ہے اور شاید پاکستان میں ہر گھر سے ہے۔ میں نے اس کے ہیک وارنٹ ہماری کر دیے ہیں؟

"معاف کرنا سڑ جانسن،" شہناز طنز پر انداز میں بولی، "اگر متعدد عظیم اتنی ہی بااثر اور طاقت ور ہوتی تو تم بھی روایتی چہنڈاں لگاتے؟"

"تمہاری غلط فہمی دور کر دی جانے کی میڈم! وہ مسکرائے لگا، "میں نے چہنڈہ نہیں لگایا، بزنس کیا ہے۔ خان کی بیٹی کا ایک ریڑز طالب جامی لگا ہوں میں تھا۔ ہم سپرے کی معقول قیمت وصول کر رہے ہیں۔"

واسکٹ کی جیب میں ریو اور میرے ہاتھ کی گرفت اتنی سخت ہو گئی تھی کہ میری انگلیوں کی پوریں پھٹنے لگی تھیں۔ وہ کچھ بول رہا تھا لیکن میرا دماغ خون اتنا تیز ہو گیا تھا کہ کانوں میں جیسٹ جہاز پرواز کرنے لگے تھے۔

"تمہارے کس بیان کو درست سمجھا جانے جانسن؟" شہناز کی آواز سنائی دی، "تم نے بتایا تھا کہ اسے کراچی کے لیے روانہ کر دیا گیا ہے؟"

"ہاں، خریدار کا تعلق کراچی سے ہی ہے،" جانسن نے جواب دیا، "لڑکی جو بنی سطر کے قابل ہوگی وہ اسے لے جائے گا؟"

"آپ ٹھوکر کھا گئے سر؟" میں نے خود کو جین کر بچا کرنے کے بعد کہا، "خرم سلطان لڑکی کی تلاش میں ہم تک پہنچ چکا ہے۔ عین گن ہے کہ ہمارا تعاقب کرتا ہوا وہ اب باہر کسی آڑ میں چھپا ہوا ہو۔ لڑکی کے لیے وہ اسی طرح آئے گا جس طرح شیر اپنے شکار پر دوبارہ آتا ہے۔ اچھے شکاری ایسے ہی موقع پر شیر کا شکار کرتے ہیں؟"

"اس کے لیے تو لڑکی ہمارے پاس ہے،" جانسن نے میری ہالٹ دی، "اگر تم چاہو تو یہاں سے تمہارے ساتھ ہارڈ لڑکی بھی جاسکتی ہے۔ اس شیر کو تم شکار کر لینا؟"

"اوہ،" شہناز ہنسنے لگی، "قابلاً تم خوفزدہ ہو، فکرنہ کرو، وہ اگر کا تو میرے پاس ہی آئے گا؟"

"خوفزدہ نہیں ہوں میڈم،" جانسن بولا، "دراصل میں یہاں کوئی کارروائی کرنے نہیں آیا، میرا صرف دوستوں سے رابطہ تک محدود رہنا چاہیے۔"

"چلو بہر! مادام نے قدم بڑھاتے ہوئے کہا۔

"خرم سلطان کو نہیں دیکھو گی شہناز بیگم؟"

"کیا مطلب؟" شہناز جھٹکے سے ہلٹ کر بولی، اس کے چہرے انگ زرد ہو گیا تھا۔ جانسن نے قہر بڑھ لگایا۔

"میرا مطلب خرم سلطان کی شبیہ سے تھا۔ میں نے لڑکی کے کانوں سے ایک چہرہ بنایا ہے۔ میرے ساتھ آؤ، میرے ہیڈ روم

میں وہ چہرہ موجود ہے؟

"باہر! تم دیکھ آؤ،" شہناز نے کہا اور میں جانسن کے ساتھ بغلی دروازے کی جانب بڑھنے لگا۔ کمرے میں ایک سٹیل بیڈ تھا جس پر کوئی ریشمی رضائی اوڑھے لیٹا ہوا تھا۔ میں نے استقبالیہ نگاہوں سے جانسن کی طرف دیکھا اور اس نے ہونٹوں پر انگلی رکھ دی، اس نے خاموشی سے ایک کاغذ اٹھایا اور میرے سامنے کر دیا۔ اس چہرے کو دیکھ کر قہر میرے اندر ہی پھوٹ پڑا تھا۔ شبیہ نے نہایت ہی عجیب چہرہ بنوایا تھا۔ جانسن کی سوالیہ نگاہوں کا جواب میں نے دانت نکال کر دیا تھا۔ جب وہ کاغذ واپس رکھنے لگا تو میں نے کمرے کا جائزہ لے لیا۔ قدرت نے میرے لیے دیوار میں ایک آسانی پہنے سے ہی پیدا کر رکھی تھی۔

جب میں واپس گول کمرے میں داخل ہوا تو کراخانی تھا شہناز نے وقت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے خود کو کھلی جگہ پہنچا دیا تھا۔ حالانکہ جانسن جیسے لوگوں کے لیے مصروف بازار بھی کوئی اہمیت نہیں رکھتے تھے لیکن وہ عورت تھی۔ ہم عقل اور تفریح حوصلہ جانسن کی ایک گھڑکی نے اسے خوفزدہ کر دیا تھا۔

"یہ چہرہ مجھ پر جانسن اندر آیا میں نے اس کا مضحکہ اڑایا۔

"کسی نی، بی، کے مریض کا تو ہو سکتا ہے۔ میری اطلاع کے مطابق خرم سلطان ایک صحت مند اور وجہ چہرے کا مالک ہے۔ میں مشورہ دوں گا کہ اگر لڑکی اچھی تک اسلام آباد پر یا میں ہے تو اسے واپس لے آئیں۔ اگر وہ واقعی میرے تو میں خرید لوں گا۔ کیونکہ ڈیڑی کا قرض مجھ پر فرض ہے۔ میں اس لڑکی سے دہر فائدہ اٹھاؤں گا؟"

"میں تمہاری پیش کش پر غور کروں گا باہر خان،" جانسن نے کندھے اچکائے، "بہر کیف مجھے سے بلا بلکہ رکنا میں ملک نواز کے کار کو زندہ رکھنے کا عزم لے کر آیا ہوں۔ یہ عورت اپنی آگ میں جل رہی ہے۔ یہ بات آف دی ریکارڈ ہے؟"

"میں آپ کو مایوس نہیں کروں گا سر،" میں نے ہاتھ بڑھایا۔ عورت اور مرد میں بڑا فرق ہوتا ہے؟

"تھینک یو لو،" اس نے میرا اشارہ تھپتھپایا، "مٹے رہنا، خرم سلطان کے لیے بھی میرا ایک شعبہ کام کر رہا ہے۔ ہم بعض دشمنوں کو زہر سے نہیں بلکہ شہد سے مارا کرتے ہیں؟"

میں نے سر کو قہقہے انداز میں جنبش دی اور باہر نکل گیا۔ شہناز ڈڈائیونگ سیٹ پر موجود تھی۔ میں نے پچھلا دروازہ کھولا اور اس نے کار بیک کر کے تیزی سے ٹرن دیا۔ ٹائروں کے نیچے بھری توپ کچھ گئی تھی اور قریب کھڑے شخص کے چہرے

پہلی کچھ کچھ لگے ہوں گے۔ اس نے قہر آلود نگاہوں سے دیکھا تھا: کیا اب بھی کوئی شک رہ گیا ہے بابرؑ؟ باہر نکل کر توفیقی آوار میں اس نے پوچھا: "ملک کے تمام وفادار یک جہے ہیں تم مشورہ دو بابر! یہی صورت حال میں مجھے کیا کرنا چاہیے؟"

"ایسے کانڈر کے سامنے دورستے ہو کر تے میں میڈم! میں نے جواب دیا: "آخری گولی تک مقابلہ پالپانی۔ یہ آپ جانتی ہیں کہ آپ کے ساتھ میں پاور کتنی ہے؟ کتنے لوگ اب بھی وفادار ہیں؟"

"ہاں! وہ شکستہ پہیے ہیں سسکی۔" مجھے دیکھنا پڑے گا۔ لیکن وہ لوگ یہاں نہیں ہیں پھر میرا اپنا بزنس ہے۔ میں اگر ان کو یہاں لے آئی تو کاروبار تباہ ہو جائے گا۔ بابر خان! اس نے عقب نما آئینے میں میری جانب دیکھا۔ اس کی آنکھیں حسالی کشکولوں کی طرح تھیں۔ "تم میرے لیے کیا کر سکتے ہو؟"

"ہاں عزیز قربان کر سکتا ہوں میڈم!" "اوہ! بابر! وہ پڑ بوش انداز میں بولی۔ "مجھے تمہاری بات نہیں بلکہ تمہارا سہارا چاہیے۔ چنانچہ میں تم میرے لیے ناگور ہوتے جا رہے ہو۔ میں اس جذبے کو ابھی کوئی نام نہیں دینا چاہتی بابر! وہ جذبہ فرصت کے لمحات مانگتا ہے۔ تم میرا چارج سنبھال لو بابر! مجھے اپنی آڑ میں لے لو۔ میں صرف تمہارے سامنے اعتراف کرتی ہوں، میں اس شخص سے خوفزدہ ہوں اس نے کتنی واضح دھمکی دی ہے۔ وہ مجھے نظر بند کرنا چاہتے ہیں۔ تم اپنے گروہ کے ساتھ میدان میں میرے ساتھ چلے آؤ۔ ہم پھر آخری گولی تک ان لوگوں سے جنگ لڑیں گے۔"

"کیا مسٹر نواز شش ہمارا ساتھ دیں گے؟"

"شاید نہیں۔"

"تو پھر؟" میں نے دھمک دار لہجے میں کہا: "مجھے اجازت دیں میں غداروں کی لسٹ تیار کروں اور ایک ایک کو قلم زد کرتا جاؤں۔ میری بہت نوازش ہوگا۔ ہم اس کے زیر انتظام تمام اڈوں پر اپنا تسلط قائم کریں گے۔ یہ ضروری بھی ہے اور جالاق بھی۔ تمام اڈے ڈیل کے ہیں۔ میں نہیں چاہتا شکست کی صورت میں غدار ہمارے ہی ترکشوں کے قہر ہمارے خلاف استعمال کریں۔"

"مجھے کوئی اعتراض نہیں پیارے۔" مادام نے ٹھہر ٹھہر کر بولنا شروع کیا: "لیکن اس طرح ہمیں بیک وقت دو محاذوں پر لڑنا پڑے گا۔" "نہیں میڈم۔" میں نے جواب دیا: "ہم فی الحال جانسن سے چھڑھا رہے ہیں کریں گے۔ پہلے آستین کے سانپوں سے نہیں گے۔"

"سوچ لو بابر! مادام کی دیوار رزرنے لگی! کہیں لینے کے دینے نہ پڑ جائیں۔"

"اگر آپ مجھے یہ اعزاز دے رہی ہیں تو مجھ پر اعتماد کیجیے میں دوسرا فرم سلطان بن کر سمجھوں گا۔ میں ڈیڑی کے احسانات کے تلے دبا ہوا ہوں۔ قدرت نے کچھ بوجھ بکھارنے کا موقع فراہم کیا ہے۔ میں ثابت کرنا چاہتا ہوں مادام کہ وفاداری کیا ہوتی ہے۔ میری خواہش ہے جب میرے محسن و مرئی واپس آئیں تو بزنس میں کافی اضافہ ہو چکا ہو اور میں سرخرو قرار پاؤں۔"

"ٹھیک ہے بابر! وہ فیصلہ کن انداز میں بولی۔ "مجھے رسک لینا پڑے گا۔ ہم آج رات ہی آغاز کر سکتے ہیں۔ نوازش نئی کھیل مجھے دکھانا چاہتا ہے۔ تم ساتھ ہو گے اور میں چہرہ پھیر لوں گی تم میرا مطلب سمجھ گئے ہو بابر؟"

"جی ہاں! مادام! اپوری طرح۔"

"تمہاری زمین پاور کی کیا پوزیشن ہے؟"

"صرف بارہ لیکن بارہ ہزار پر ہجاری۔"

"کیا تم نے ملک صاحب کی موجودگی میں مستوازی گروہ تیار کر رکھا تھا؟"

"جی ہاں! ان کی ہدایت ہی تھی۔" میں نے بتایا: "وہ میری پوزیشن اس انداز میں کر رہے تھے کہ ضرورت کے وقت میں ایک موٹر طاقت ثابت ہو سکوں۔" میں نے گردن موڑ کر دیکھا۔ بارون ٹریلک میں شامل تھا۔ "مجھے کسی جگہ ڈراپ کر دیجیے مادام! وقت بہت خیر ہے اور میرے آدمی بکھرے ہوئے ہوں گے۔ میں آج ہی ان کو کیا کر کے میننگ کرنا چاہتا ہوں۔ آپ نوازش سے سات بجے کا وقت طے کر لیں۔"

"بہتر! اس نے کار سائڈ لنگائی اور میں غدار حافظ کہتا ہوا اڑ گیا۔"

پانچ منٹ بعد ایک کار میرے قریب لگی۔ میں فریٹ ڈور کھول کر بارون کے پہلو میں بیٹھ گیا۔

"وقت شاید آپ کی گرفت میں نہیں رہا بارون! بارون بولا۔

"آپ روادری میں پروگرام بناتے ہیں اور کسی پروگرام پر عمل نہیں ہوتا۔ کیا وجہ ہے؟"

"حالات واقعی غیر یقینی ہیں دوست۔" میں نے بتایا: "میں کچھ سوچتا ہوں اور میرے ساتھ کام کرنے والے کردار وقت پر اپنا کردار سنبھال جاتے ہیں۔ مثلاً پروگرام تھا کہ میں بحیثیت نمایندہ جانسن سے ملاقات کروں گا مگر وہ بھی ساتھ چلی گئی۔ وہ منصوبہ کچھ

لڑتی تھی لیکن جانسن نے اسے بولے ہی نہیں دیکھا کہانی ہر طرف کے رہتی تھی جاری ہے۔" پھر میں نے اسے جانسن اور شہناز کے بیان ہونے والی گفتگو اور سننے پر وگرام کے بارے میں بتایا۔

"اس کا مطلب ہوگا کہ آپ جو چاہتے تھے اس سے کہیں زیادہ حاصل ہووے۔" بارون بولا: "جانسن سے دوستی اور ملک نواز کے بچے اڈوں کی صفائی کیلئے بہت مدد کی کامیابی نہیں؟"

"جانسن کی دوستی نبھانے کے لیے ہمیں بہت کچھ کرنا ہوگا۔ جانسن ایک شخص کا نام نہیں بلکہ وہ بین الاقوامی تنظیم مافیا کا نمایندہ ہے۔ ہم پہلے صرف ایک شخص کی ذات کے اندر داخل ہوتے رہے ہیں لیکن اب ہمیں ایسے غاروں میں اترنا پڑے گا جس کی بجھول لیلیاں ہم سے واپسی کا راستہ چھین سکتی ہیں۔ میں نے ابھی فیصلہ نہیں کیا کیونکہ مافیا سے نمونہ آسان ہے نہ بے ضرر ہوگا۔ اس جنگ کی کچھ کہیں ہم اصل مقصد سے دور نہ چلے جائیں۔"

"ہو سکتا ہے ان کا مقصد بھی منشیات ہی ہو؟"

"یہ تو انداز جانے کے بعد ہی معلوم ہوگا۔"

"بہر کیف! بارون بولا: "ان کا جو بھی مشن ہوگا میں پاکستان کی ہوگا۔ کیونکہ مافیا کوئی رفاہی ادارہ نہیں۔ ہمارا مشن ملک سے لڑائی ختم کرنا ہے۔"

"ہاں لیکن لڑائی میں رشوت تلاوٹ، ذخیرہ اندوزی، کینڈر پوری اور کئی کالے دھندے شامل ہیں جبکہ مجھے صرف منشیات کے خلاف جنگ کرنے کے لیے بھیجا گیا ہے۔ میں محدود ذرائع اور چند سلیکیوں کے ساتھ لڑائیوں کے خلاف کیسے کام کر سکتا ہوں؟"

"غلام کی طرف بلا لے والا پروڈر میں تھا ہی اللہ کی جانب سے اترتا رہا ہے میرے بھائی! آپ کو صرف نیک مقاصد اور اللہ تعالیٰ کی مدد پر یقین رکھنا چاہیے۔"

جو کہ مادام شہناز کے ساتھ مجھے ہی جانتا تھا اس لیے میں سنہارون کو صرف نگرانی تک ہی محدود رہنے کی ہدایت دی تھی۔ مالا کرکین کا مشورہ تھا کہ فل میں پاور کو استعمال کیا جائے لیکن میں بلا وجہ اپنے آدمیوں کو نہ تو سامنے لانا چاہتا تھا اور نہ ہی خطرے میں ڈالنے کے حق میں تھا۔ میں مادام کو زیادہ وقت بھی نہیں دینا چاہتا تھا وہ گھبرانی ہوئی تھی اور پل پل اپنے ارادے بدلنے لگی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ میں پونے سات بجے واپس گیا تھا۔

ڈرائنگ روم میں نوازش بھی موجود تھا۔ مجھے دیکھ کر اس نے استفسار اڑا لگا ہوں سے شہناز کی طرف دیکھا لیکن میں نے بڑھ کر اپنا ہاتھ مصافحے کے لیے بڑھا دیا۔

"قابا تم لوگ پہلے مل چکے ہو شہناز بولی۔

"ہاں! نوازش ناگوار لہجے میں بولا: "اس کے ساتھ ایک لڑکی بھی تھی۔"

"کیا خیال ہے اب چلنا چاہیے؟ شہناز نے اس کی بات سنی ان سنی کرتے ہوئے کہا: بابر! ہم مال چیک کرنے جائیں گے۔"

"بہتر مادام! میں نے سر کو خم دے کر کہا: پارٹی کے ساتھ تمہارے مذاکرات کیسے رہے؟"

"کامیاب! میں نے فوراً جواب دیا: "کل کسی بھی وقت وہ پینٹ کرنے کو تیار ہے۔"

"گڈ! مادام! چکی! نوازش! میں نے تمہیں بتایا تھا نا ایک پارٹی معقول سودا کرنا چاہتی ہے۔"

"اور میں نے نگرانی کی تھی مادام! نوازش گرم آواز میں بولا: "ہم مال باہر لے جائیں گے۔ بات معقول سودے کی نہیں بلکہ جاری رکھ کی ہے۔ چیف نے ہمشیرا کو مقدم رکھا ہے۔"

"کوئی بات نہیں نوازش! مادام نے پروانی سے بولی: "مال اور آجائے گا۔ اس وقت تک راستے سے بھی محفوظ ہو جائیں گے۔"

"راستے سے بھی محفوظ نہیں ہوتے مادام!"

"میں جانتی ہوں نوازش! بس ختم کرو اس بحث کو! اٹھو پلیس!"

مادام نے ترش لہجے میں کہا: "میں اپنی پوزیشن اور ذمے داری کو تم سے بہتر سمجھتی ہوں۔"

سفر نا خوشگوار ماحول میں غاموشی سے طے ہوا تھا۔ میں نوازش کے ساتھ فریٹ سیٹ پر بیٹھا آئے والے لمحات کے تانے بانے میں الجھا ہوا تھا۔ میرے پروگرام میں شہناز کی موت بھی شامل تھی۔ لیکن میں فیصلہ کرتے وقت شاید بھول گیا تھا کہ موت کا وقت مقرر ہوتا ہے اور فیصلہ کرنے کا حق کسی انسان کو نہیں دیا گیا۔ چونکہ قدرت کا ملکہ نے فیصلہ نہیں کیا تھا اس لیے شہناز نے خود ہی نوازش کے بلیک وارنٹ پر دستخط کر کے اپنی گردن پگالی تھی۔ میں حسب روایت گواہ کو بھی ساتھ روانہ کرنے کی پالیسی پر عمل کرنے والا تھا۔ جب شہناز بھی اس کا مددگار میں شریک ہوئی تھی تو اس کی زندگی میرے لیے خطرہ نہ رہی تھی۔

گودام ایک نامکمل کوٹھی میں تھا۔ سات کنال میں پھیلی ہوئی دو منزلہ کوٹھی اسی پلاسٹر کے مرلے سے بھی نہیں گزری تھی۔ وہ کوٹھی کرائے پر حاصل کی گئی تھی یا لاوارث جان کر استعمال کرنے کا فیصلہ کیا گیا تھا۔ ایک سروٹ کوٹھ میں دروازہ لگا ہوا تھا۔ باقی ساری جگہ ناہموار اور جھاڑیوں سے آبی ہوئی تھی۔ ٹیکسی تک کچی مرکز تھی

جو کار کے لیے نامناسب تھی۔
 فوجی فاؤنڈیشن میں ایک کل سینیٹر کی روشنی سے جو راستہ دکھانی
 دے رہا تھا اسی پر ہم پیدل کوٹھی میں داخل ہوئے تھے۔ دانیس بائیں
 بھی قہری کام ہو رہا تھا۔ مزدور لوگ تھوڑوں کے حاضری پوچھوں پر رات
 کا کھانا پکاتے دکھائی دیے تھے اور نزدیک کوئی آبادی نہ تھی۔
 سروٹ کوارٹر کے سامنے بان کی چلپائی پر دو آدمی بیٹھے تھے
 پنی رہے تھے۔ نواز شمس نے آگے بڑھ کر ان سے چند باتیں کیں اور
 ایک آدمی کو وارٹر کی طرف چلا گیا۔
 "آئیے" اندر چلیں۔ نواز شمس نے واپس آکر کہا "میرا ہاں! تم
 باہر ان لوگوں کے ساتھ ٹھہرو گے۔"
 "نہیں" شہنشاہ زبولی "تم جانتے ہو باہر میرا محافظ ہے محافظ
 اور تھیں میں خود سے ملک نہیں رکھا کرتی۔"
 "مادام! نواز شمس کا بوجھ بھی ترش تھا۔ آپ غیروں میں نہیں
 جاتیں۔"
 "کچھ بھی ہو باہر میرے ساتھ جانے گا" شہنشاہ نے فیصلہ کن
 لہجے میں کہا۔ "چلو باہر۔"
 "حمید خان! ہماروں کو اندر لے چلو۔ نواز شمس نے پلٹ کر
 دوسرے آدمی کو آواز دی۔ جب وہ اٹھا تو میرے اندر خطرے
 کا لہر چلنے لگا۔ اس کے ہاتھ میں اسٹین گن تھی۔
 "مادام! ہوشیار خطرہ" میں نے جھک کر گوشہ کی اور شہنشاہ
 نے پرس کندھے سے آئڈلر ہاتھ میں لے لیا۔
 "چلیے" حمید خان نے آتے ہی اسٹین گن سے ہمیں گور کر لیا۔
 "نواز شمس! شہنشاہ کے حلق سے غر بھٹ اُبھری" میں کیا سمجھوں؟
 "جو کچھ آپ سمجھ سکی ہیں مادام" نواز شمس نے ہلکا سا قہقہہ لگایا۔
 "ویسے مجھے اسوں سے بیکس وقت کی وہ آنکھ بدل چکی ہے جس
 کے اشاروں پر ہم لوگ چلتے ہیں۔"
 "معاذام! کام کا ہاتھ دوپٹے سے باہر نکلا اور رخ شعلہ لپک کر
 نواز شمس کی گردن میں غائب ہو گیا۔ حمید خان بھی میری طرح غلط جہر کے
 لیے یقیناً ہونچو چکا رہ گیا ہوگا کیونکہ شعلہ نکل کر نواز شمس کے حلق سے
 عجیب قسم کی دھواں اُبھرتا رہی میں تحلیل ہو گئی تھی۔
 میرا ہاتھ بھی جیب سے تڑپ کر ہی نکلا تھا اور حمید خان کی
 رانوں سے یکے بعد دیگرے ایک سیکانڈ کے وقفے میں دو چنگاریاں
 چمٹ گئی تھیں۔ مادام کے شعلے نے تو قہقہہ لگایا تھا لیکن میرے ریلو اور
 سے خاموش چنگاریاں خاموشی سے اپنی منزل تک گئی تھیں یہ ایک
 بات ہے کہ حمید خان نے اچھل کر گرتے وقت سناٹے کو اتھل پھل

کر دیا تھا۔
 میں نے طویل چھلانگ لگائی اور حمید خان کے ہاتھوں کو
 ضرب لگاتا ہوا سچر پٹا تھا۔ وزوہ گرتے گرتے ہمارے جسم بھی چھید پڑتا
 گن لے کر میں نے کوارٹر کی جانب دوڑ لگائی اور ایک گلی
 پہنچی ہوئی میرے سر کے اوپر سے گز گئی۔ میں نے چپرتی سے دانیس
 جانب اینٹ کے ڈھیر پر خود کو گر لیا اور پھر کروٹ کے بل چھپ سکا اور
 آڑ میں لیٹ گیا۔
 میں نے شہنشاہ کی جانب دیکھا۔ وہ بھی زمین پر پیٹ کے
 بل لیٹی جھاڑیوں کی جانب کسی ناگن کی طرح رہینگئی دکھائی دی۔
 اندر والے شخص کے پاس ریلو اور تھا اور اس نے پوچھا
 میں تو اتر کے ساتھ چار گولیاں ضائع کر دی تھیں پھر ماحول پر برگ آرا
 سکوت طاری ہو گیا تھا۔
 کوارٹر میں اندھیرا تھا اور ریلو اور بدست شخص اندھیرے میں
 دیکھا ہوا تھا۔ میں نے ریت کے ڈھیر سے سر اٹھا لیا اور دھڑکے گئی
 چل گئی۔ گولی کہیں ریت میں ہی پھوست ہوئی تھی۔
 تب میں نے سرک کر دانیس طرف سے اسٹین گن سیدھی کی
 اور کھٹے دروازے میں برست مار دیا۔ ایک کرب ناک چیخ سنائی
 دی۔ وہ اس کی چال بھی ہو سکتی تھی۔ باہر نکلتا اندھیرے میں چھلانگ
 لگانے کے مترادف تھا۔ میں نے واسکٹ اتاری اور اسٹین گن کی
 نوک پر رکھ کر آہستہ آہستہ اُپر اٹھائی۔ کوئی جواب نہ ملا تو میں پہلے
 گھٹنوں کے بل اٹھا پھر اس جگہ سے گولی کی طرح نکلا اور جھاڑیوں
 کے درمیان چلا گیا۔
 دو منٹ دیکھتا رہا پھر رہینگئی ہوا کہ پانڈل ڈال تک گیا۔
 کمپانڈر وال چھوٹے سے اونچی تھی۔ اندر دیکھنا ممکن تھا۔
 "باہر! شہنشاہ کی آواز سنائی دی" نکل آؤ میر گیا ہے۔
 میں دوڑتا ہوا سامنے کی جانب آیا۔ وہ کوارٹر کے دروازے
 میں کھڑی تھی۔ جلدی کرو! نازنگ کی آواز اطراف تک گئی ہوگی۔ وہ
 اندر داخل ہوتے ہوئے بولی۔ میں بھی اس کے پیچھے اندر چلا گیا۔
 کی روشنی میں دیکھا۔ کمرے میں تین کارٹس تھے۔ چھوٹے چھوٹے جیسے
 کے ڈبے ہوتے تھے تیار بیٹھی ہوئی تھیں اور بیل شدہ تھے۔ ہر ڈبے
 کا وزن دو کلو ہوا ہوگا؟ اٹھاؤ اور نکل چلو۔ ایک ڈبہ شہنشاہ نے اٹھا
 لیا اور دو میں نے بغل میں دبلیے۔
 واپسی پر میں نے مزدوروں کو ہر سال اور پریشان حالت میں
 دیکھا تھا۔ جیسے دیکھ کر وہ ایک دم بکھرے ہوئے زیرِ تعمیر کوں میں
 غائب ہو گئے تھے۔

"اوہ باہر! کار میں بیٹھ کر شہنشاہ نے ڈبے کو اپنے سینے سے
 لگایا جیسے مل گم شدہ بچے کی بازیابی پر متاکی تسکین حاصل کر رہی ہو۔
 "اگر تھوڑوں میں میری وٹن ہے تو ہم اس ملک کا تیسواں امیر خاندان بن
 جائیں گے۔"
 "بے شک" میں نے دونوں ڈبے سیدٹ پر اچھال دیے۔
 "لیکن فی الحال ہم اس دولت کو خود سے دور رکھیں گے۔ نواز شمس
 کی ہلاکت اور جانسن کی موجودگی وہ لوگ مضام نہیں کریں گے۔ یقیناً
 جانسن کے اشارے پر آپ کو اس ویران کوٹھی میں دفن کیا جانا تھا۔"
 "سچر... سچر... میں آج ہی مال لے کر لاہور روانہ ہو جاتی ہوں۔"
 "لاہور کوئی غیر آباد جزیرہ نہیں شہنشاہ کیجی" میں نے سرد آواز
 میں کہا۔ "سچر جانسن کے ذرائع لا محدود ہیں کیا اس نے کہا نہیں تھا
 کہ ہم ساتویں آسمان اور زمین کی اتھاہ گہرائیوں سے اپنے شکار کو
 گھسیٹ مالتے ہیں۔ نہیں میڈم! اب جنگ کا آغاز ہو چکا ہے جانسن
 اپنے زخم چاٹنے بیٹھے نہیں جانے گا۔"
 "پھر میں کہاں جاؤں؟ شہنشاہ نے گنگھی گنگھی آواز سے پوچھا۔
 "جہاں آپ محفوظ رہ سکیں۔"
 "لیکن کہاں...؟ وہ روہانسی ہو گئی۔
 "جہاں میں لے جاؤں گا؟
 "کیا تمہارے پاس محفوظ پناہ گاہ ہے؟
 "ہاں میڈم۔"
 "چلو" وہ میری آواز میں بولی اور پھر سیدٹ پر بیٹھ کر ہانپنے
 لگی۔ "اوہ میرے خدا! اگر تم بروقت اشارہ نہ دیتے تو وہ کتاب مجھے
 پھاڑ دیتا۔"
 "میں آپ کا محافظ ہوتا ہوں میڈم۔"
 "تم نے نئی زندگی اور نئی سوچ دی ہے باہر" وہ ممنونیت
 سے بولی۔ "میں فرصت پاتے ہی اس احسان کا انعام دوں گی۔
 بہت اچھا انعام۔"
 "میں مجھے انعام مل گیا" میں نے خوشی کا اظہار کیا۔ "میں آپ
 کے کام آیا اور آپ نے غم سے اس سے بڑھ کر اور کیا
 انعام ہوگا؟"
 "اچھا بتاؤ کیا اب مجھے اندر گراؤنڈ رہنا ہوگا؟"
 "صرف کچھ وقت" میں نے آستے تلی دی۔ "جانسن کا ردِ عمل
 دیکھ کر ہم کوئی فیصلہ کریں گے۔"
 "میں تو باہر آؤں نے ہاتھ میری کلٹی پر رکھ دیا۔ وہ نسوانی ہتھیل
 سے شاید مجھے مارنا چاہتی تھی۔ میری خاطر باہر آج رات جانسن کو بھی

موت کے گھاٹ اتار دو۔ صرف وہی جانتا ہے کہ نواز شمس کہاں اور
 کیوں گیا تھا۔ میں دولت کی پیش کش نہیں کروں گی باہر! اگر تم نے
 مجھے اس درندے سے بچالیا تو میں اپنے تمام اثاثوں اور جذبات
 کے ساتھ خود کو تمہارے حوالے کر دوں گی۔"
 "جہاں فیصلہ کریں میڈم! میں نے بے ہمتی کہا ہاتھ اس سے
 دور کر لیا۔ اس طرح مافیا کے بڑے کوئی بہت بڑا اور فوری فیصلہ کرنے
 پر مجبور ہو جائیں گے۔ جانسن از خود نہیں آیا۔ اسے جیسا گیا ہے اور وہ
 لوگ جانتے ہیں کہ تنظیم کو اقتدار حاصل کرنے کے لیے ملک نواز کی وارث
 کو لایا گیا ہے اسے جہاننا ہوگا۔ جانسن کی ہلاکت اس طوفان کے
 سارے دروازے کھول دے گی جو ابھی بہت دور ہے اور راستے
 تلاش کر رہے ہیں۔ ہم دشمن کو سیاست اور ذہانت سے شکست
 دیں گے۔ آپ کی سلامتی کی میں ضمانت دے رہا ہوں۔ آپ کو نظر عام
 پر تب لایا جائے گا جب خطرے واپس دھکیل دیے جائیں گے۔"
 "میں اس طرح کی زندگی کا تصور بھی نہیں کر سکتی تھی۔ وہ پھر آئی
 آواز میں بولی۔
 "جرم کی دنیا میں بڑے بڑے جاہل گریڈ ماسٹر نظر ضرورت
 کے تحت ڈوبتے اُبھرتے رہتے ہیں۔ کیا ملک نواز نے کبھی تصور کیا
 ہوگا کہ ایک نوخیز نوجوان اُسے رگیدتا ہوا ملک کی سرحدوں سے باہر
 دھکیل دے گا؟"
 "اب مجھے یقین ہو گیا ہے باہر! مادام نے فوجی آواز میں کہا۔
 ختم سلطان کا ہتھ مڑوج کی طرف مائل ہے۔ اس نوجوان کے
 ساتھ کوئی غبی قوت ہے۔ میں اُسے نیست و نابود کرنے کا عزم لے
 کر یہاں آئی تھی اور میرے ہی ہاتھ پاؤں میرے خلاف اور اس کے
 حق میں ہو گئے ہیں۔"
 "بظاہر وہ واقعی مقتدر کا سکندر ہے" میں نے زبان سے
 تو کہہ دیا تھا لیکن دل میں رو پڑا تھا۔
 ہارون چالیس پچاس گز دور پہنچے تھا۔ میں نے مال روڈ پر
 چڑھتے ہی ٹیل لائٹس سے قریب آنے کا اشارہ دیا۔ ایک منٹ بعد
 ٹریفک جھپٹا ہوا وہ میرے برابر آگیا تھا۔
 "میں اگلے ٹرن پر آپ کو اتار دوں گا میڈم! دائیں ہاتھ دیکھیے
 میرا آدمی چل رہا ہے۔ شہنشاہ نے جو تک کر چہرہ دکھایا۔ ہارون کار
 بالکل ساتھ چل رہا تھا۔ "میرا دست راست ہے۔ آپ اس کے
 ساتھ جائیں گی" سچر میں نے بلند آواز میں ہارون کو مخاطب کیا۔
 "مادام! کو محفوظ راستوں سے ہمید کو وارٹر تک پہنچا کر تم میلوڈی چوک
 پر میرا انتظار کرو گے۔"

ہارون نے اثبات میں آنکھیں نہ کھلیں اور آگے نکل گیا۔
شہناز کو میں نے جب فٹ پاتھ پر اتارا تو وہ بے حد
نروس ہو رہی تھی۔ میں اس کے جذبات اور احساسات کو محسوس کر رہا
تھا۔ ایک خوبصورت اور باجائیت عورت حالات کی ٹھوکروں کی زد
میں آگئی تھی۔ کہاں ایک جاہل و خود مختار مادم جو دوسروں پر حکم چلانے
کی عادی تھی اور کہاں کمپری کی حالت کہ وہ تن کے لباس کے ساتھ
بالکل مثالی پاتھ فٹ پاتھ پر کھڑی کسی بہار سے کی محتاج ہو گئی تھی۔
یہ بھی اس کی موت تھی۔ اصلی موت سے کہیں زیادہ اذیت ناک
اور میں اسے اذیت ناک موت سے ہٹانے کے خوش تھا۔ کیونکہ وہ
مرف میری دشمن ہی نہ تھی بلکہ پوری قوم کی دشمن تھی۔ اگر میرے مقاصد
کے لیے اس کی زندگی ضروری نہ ہوتی تو میں نواز شمس کی لاش کے پہلو
میں شہناز کی خوبصورت لاش لٹا دیتا لیکن میرے منصوبے کے لیے
شہناز ضروری تھی۔ میں جانس اور شہناز کے درمیان غلط فہمیوں کی
آگ جلا چکا تھا۔ اب ایک کنارے پر شہناز کو دوسرے پر جانس کو
کھڑا کر کے دونوں قوتوں کا مقابلہ اور تباہی کا دل خوش کن منظر دیکھنا
چاہتا تھا۔ میرے نزدیک دونوں ہی قابلِ گردن زدنی تھے۔ اگر میں ان
کی گردنیں اتار دیتا تو سبے شمار گردنیں دونوں اطراف میری زور سے
پنچ جاتیں۔

حسب توقع لیکن وہاں موجود تھا۔ امین نے مجھے دیکھ کر گلی گلی
آنکھوں کو خشک کرتی مسکراتی ہوئی میرے پہلو میں آگئی تھی اس
نے ٹیبلٹ کے بارے میں پوچھا تو تھا لیکن غصہ نہ کی تھی۔ میں نے رشیدہ
کا حال دے کر اسے مطمئن کر دیا تھا۔

ہم دونوں نے ہاتھ ہاتھوں میں مل کر کھانا تیار کیا۔ ہارون لیگن
کے لیے چونے سے چھوڑا گیا تھا یعنی اسے دے کر گوشت کی بوٹیاں ہم
نے روک کر لی تھیں۔

کھانے سے فارغ ہو کر جب امینہ کافی لائی تو میں نے اسے
پڑھنے کے لیے دوسرے کمرے میں بھیج دیا۔ وہ محسوس ہی روکی ہمارے
ساتھ رہتے رہتے کچھ بدلتے کے باوجود بہت کچھ جان گئی تھی۔ اس
پے مسکراتی ہوئی نکل گئی تھی۔

سیل توڑ کر میں نے پاؤں کی چکی بتھیلی پر رکھ کر لیگن کو دکھایا
اس نے تباہی کا اعلیٰ قسم کی ہیروئن ہے۔ میں چونکہ منشیات کا ماہر تھا نہ
سو اگر اس لیے اعلیٰ اور گھٹیا ہیروئن کی تمیز نہیں کر سکتا تھا۔ میںوں قوتوں
میں ایک ہی قسم کی ہیروئن تھی۔ میں نے لیگن کو کارروائی سے بھی آگاہ
کیا اور جو کچھ کرنے جا رہا تھا اس پر بھی اس سے بات کی تھی۔ اس نے
میرے منصوبے کی تائید کرتے ہوئے حکمانہ انداز میں کہا تھا۔

”جانس کو فی الحال زندہ رہنا چاہیے۔ اگر وہ منظر سے ہٹ
گیا تو ہم کبھی مافیائیک رسائی حاصل نہ کر سکیں گے۔ جانس ہماری نئی
منزل کا سنگ میل بھی ہے اور راہ کا بھی۔ ہم اسے اپنی دوستی اور
وفاداری کا یقین دلائیں گے۔ اس کے گروہ میں شامل ہو کر کچھ کامیاب
کارروائیاں کر کے ان لوگوں کا اعتماد حاصل کریں گے۔ صحت کے
لیے بعض اوقات کڑوی دوا اور آپریشن کے خطرے سے بھی گزرنا
پڑتا ہے۔ اب جانس ہی مستقبل قریب میں منشیات کے کاروبار کا
اجارہ دار ہو گا۔“

گیارہ بجے جب میں دبے پاؤں کا رینڈور سے گزر رہا تھا تو میں
نے دیکھا کہ امینہ قایلین پر کنبیوں کے بل کتاب پڑھ رہی تھی۔
میں نے جب اس پرٹ میں کارروائی دوبارہ بجنے میں سات منٹ
باقی تھے۔ بڑے سماجوں کا یہ یا سکوت میں ڈوبا ہوا تھا۔ لاڈلے
کتے بند گھٹوں کے پیچھے تقریباً سبھوٹ کر خاموش ہو جاتے تھے۔ اگر
کوئی فکڑ پھٹا تو اندھیرے میں قدم قدم پر ٹھوکریں اور آوارہ کتے روتے
لیکن روشنی اسٹریٹ کے فرش پر میرے قدموں کی چاپ ہی تھی۔

احتیاط لازم تھی لیکن کوئی روشنی میں نہانی ہوئی تھی۔ پھر بھی
میں نے پھوپھوٹے ٹرک کر چھوٹا سا پتھر اندر چھپکا اور تیز قدم اٹھاتا
باغ والے حصے کی جانب چلا گیا۔ پانچ فٹ اونچی دیوار چھانڈ کر باغ میں
اگر گید وختوں کے درمیان ٹرک کے اطراف کا جائزہ لیا۔ صرف روشنی
جاگ رہی تھی۔

معا خشک پتھر چھپائے اور میرا ہاتھ جیب میں رینگ گیا
میں ایک تن آور درخت کی آڑ میں تھا۔ پتے بڑبڑا رہے تھے لیکن
کچھ دکھائی نہ دے رہا تھا۔ پھر ایک فٹ اونچا باگڑا دیوار پر چڑھا اور
اور دوسری طرف کود گیا۔ میں نے سینے میں ٹکی ہوئی سانس چھوڑی
یہاں کیفیت کا تاثر چند منٹ تک قائم رہا تھا۔

بنے نے مجھے یہ سمجھا دیا تھا کہ باغ میں خشک پتے ہیں جو
چلنے سے کلاہتے ہیں۔ میں نے دیوار کے ساتھ ساتھ کھڑی تازہ مٹی پر
چلتا شروع کیا۔ نئی نئی کیاریاں بنائی گئی تھیں۔ تین منٹ بعد میں دیوار
کے اس پوائنٹ پر تھا جسے میں نے دن کی روشنی میں مارک کیا تھا کسی
نے روم کو لایا اور کزنڈر کے لیے میرے شکل کا سوراخ کیا تھا۔ پھر اس
سوراخ کو لپٹی دو ڈشبیٹ سے بند کر دیا گیا تھا۔

میں نے ٹھٹھوں کے بل بیٹھ کر شیٹ کے کناروں پر ہاتھ پیر اتوی
خوش ہو گیا۔ شوٹ سلوشن ٹیپ کی عارضی گرفت میں تھی۔ میں
نے نہایت ہی آسانی اور خاموشی سے بوسیدہ ٹیپ کی گرفت سے
شیٹ نکال لی تھی اور اندر کی سبز روشنی میرے چہرے پر پڑنے لگی۔

میں نے جھانک کر اندر دیکھا۔ ڈبل بیڈ پر جانس کروٹ کے
بل لیٹا ہوا تھا۔ اس کا ہاتھ پلنگ کی پٹی سے نیچے لٹک رہا تھا۔ میں
بے آواز رینگ گیا۔
گو جانس کا چہرہ میری جانب تھا لیکن وہ بے سُدھ پڑا خراٹے
نثر کر رہا تھا۔

خراٹوں کے ارتعاش سے کمرے میں چھیلی ہوئی زیر و پا ور
بلب کی روشنی جیسے سکریاں لے رہی تھی۔ پلنگ کے سر ہانے
پلاسٹک کا شاہین اپنے بے جان پنکھ پھیلائے جیسے شکار پر اتر
رہا تھا۔ شاہین کی بوری آنکھیں روشنی میں چمک رہی تھیں اور سرخ
پینٹ میں رنگے ہوئے نوکیلے پنچے اور چونچ دہشت کی کیفیت پیدا
کر رہی تھی۔

نرم نرم روشنی میں جانس بڑی گہری نیند میں ڈوبا ہوا تھا۔
معارضاتی میں جنبش ہوئی اور میں نے سانس روک لی۔ نہانی
ہوئی تو میں مبہوت سا رہ گیا۔ جانس کے پہلو میں کوئی لڑکی تھی تو بچوں
اور خوش رو، خوابیدہ مشن بالوں کے ہانے میں لیوں دکھائی دے رہا
تھا جیسے بلیوں کے درمیان چوڑھویں کے چاند کا چہرہ ہو۔

میں اس خوش منظر اور حسین بے مثال کے حرمیں ساکت،
مبہوت کھڑا تھا کہ دروازے کا لٹو خفیف سی آواز کے ساتھ گھوماؤ
میں ایک دم اس اسٹینڈ کی آڑ میں ہو گیا جس پر شاہین غور واز تھا
کوڑی نہایت آہستگی سے کھٹکے لگے۔ بے آواز جیسے کھولنے
والے ہاتھوں کو اندر آنے کی کوئی جلدی نہ تھی۔

کوڑوں میں جھری غوروار ہوئی۔ پھر جھری چھپتی چلی گئی، جیسے
کوئی ان دیکھا تیر دھار اوزار اسے دو حصوں میں آہستہ آہستہ
چیر رہا تھا۔

پھر ایک ساہ جھری سے اندر رینگ آیا۔ وہ مغربی لباس میں
لبوس تھا اور چہرے کو فلیٹ ہیٹ سے چھپانے کی کوشش کی گئی تھی۔
تقریباً ایک منٹ وہ فٹ میٹ پر کسی سنگی بیت کی طرح
بے حس و حرکت کھڑا رہا تھا۔ پھر بے آواز قدموں سے چلتا وہ پلنگ
کے قریب آیا شاید اس نے کواڑوں کو ایک ہاتھ سے روکے رکھا
تھا۔ جب وہ آگے بڑھا تو خود کار کواڑ پھر بند ہو گئے مگر بند ہونے
کی بجائے سی آواز پیدا ہوئی تھی۔

حسینہ کسمانی اور پھر اس نے سر ہانے سے ذرا اچھڑ کر شاید
دروازے کی جانب ہی دیکھا تھا کہ سانسے کا دایاں ہاتھ اٹھا اور
ایک تیز رفتار نارنجی شعلہ اگل دیا۔

لڑکی کے چہرے پر اچھڑنے والا خوف برف کی مانند جم گیا تھا

اور نووارد کے چہرے پر پہلی بار مسکراہٹ اُسجری۔ وہ تین قدم گھوم
کر جانس پر چھکا لیکن جانس لڑکی کے سپر کے جسم کی دسک سے پہلے
ہی بیدار ہو چکا تھا۔

نووارد نے بائیں ہاتھ کی اٹلی ہیک جانس کو ماری جسے پھرتی
سے جانس نے کٹائی پر روک لیا۔ ”اٹھو مگر سنڈ ماسٹر“ نووارد جب
بولتا تو مجھے یوں غمگسٹ ہوا جیسے عذرت کے حلق سے غر“ ہٹ اُسجری
ہو“ میں نہیں جانتا تم دونوں کا خون وصال کی لذت حاصل کرے۔
”بیٹھ باؤ وحید اور خود کو پُرسکون کرو۔“ جانس نے پھرے اور
بے خوف بچے میں کہا: ”یہ رنگین کھلونے اتنے قیمتی نہیں ہوتے کہ ان
کی قیمت زندگی سے چمکانی جائے۔“

”یہ کھلونا نہیں“ وحید دھڑک کر بولا: ”یہ میری ہونے والی پوی
تھی اور یہ بات صرف تم جانتے تھے۔ ہاں تم، کرنازیہ وہ آخری لڑکی ہے
جسے وحید نے سنجیدگی اور دل کی گہرائیوں سے چاہا ہے۔“

”تم نے بے شک چاہا ہو گا میرے دوست“ جانس ہرکتا ہوا
پتی ٹپک گیا: ”لیکن نازیہ نے بھی تمہاری چاہت کا جواب چاہت سے
اگر دیا ہوتا تو آج یہ میرے پہلو میں دم نہ توڑتی۔ ایسی رنگین گولیوں کے
لیے تم جیسا شخص اپنی زندگی اور شاندار مستقبل ضائع کر دے یہ بڑی
حاجت ہوگی۔ جو بے وفا ہو تا ہے اس کو سزا مل جاتی ہے۔ چلو لٹاری
سے بوتل نکالو۔ ہمیں ایک ایک جام کی ضرورت ہے۔“ جانس کی
بے خوفی نے مجھے الجھن میں ڈال دیا تھا۔ ایک قاتل کی موجودگی میں
وہ کسی وجہ کسی حوصلے کے بل پر ایسی باتیں کر رہا ہو گا۔ ”میں دیکھ رہا
ہوں تمہارے چہرے پر شک اور پیاس کے آثار ہیں تمہیں کون چاہیے
”ہاں میں پیاسا ہوں“ وحید غراہا مگر میری پیاس خراب
سے نہیں بلکہ تمہارے خون سے بجھے گی۔“

”امقانہ باتیں“ جانس نے ہاتھ بچایا۔ ”میرے دوست! خون تو
اور پیاس بڑھادیا کرتا ہے۔ تم جیسے شخص کو ایسی باتیں زیب نہیں
دیتیں۔ اگر خون سے تشنگی مٹتی تو نازیہ کا خون تمہیں پُرسکون کر چکا ہوتا۔“
”لیکن مجھے صرف ایک چیز پُرسکون کر سکتی ہے اور وہ ہے
تمہاری موت“ وحید نے ہاتھ اٹھایا تو جانس نے ہاتھ اٹھا دیا اور بولا:
”مجھ کو سنو! اگر تمہیں نازیہ کا نعم البدل مل جائے کئی گنا خوبصورت
تو تم نے جابر کی زبانی ایک میٹنگ میں یقیناً رنگ بازی جیتی کے
حسن بے مثال کی تعریف سنی ہوگی۔ ہمارے ہاں ہر چیز کی قیمت ہوتی
ہے۔ ہم لوگ ہر شے کا سودا کر لیتے ہیں۔ میں نازیہ کے بدلے تمہیں مشرقی
حسن کا شاہکار دوں گا۔ وہ لڑکی میرے قبضے میں ہے۔ تم اسے دیکھ کر
نازیہ کا دکھ یقیناً بھول جاؤ گے۔“

"میں سوداگر کتنا بڑا ہوں مگر میری آفریادہ تھیں ناگوار گزرے۔"
 "نہیں زندگی کے بدلے میں سب کچھ قبول کر سکتا ہوں۔"
 "اپنی بہن جین کا سودا کرو گے؟"
 "نہیں آپ جانشین کی دہائی سے کمرے کی ہر شے پر تفریحی پیدا ہو گئی۔"
 "تو سچ سزا کے لیے تیار ہو جاؤ۔" وحید نے دوبارہ ہاتھ اٹھایا۔
 اور میرے اندر صدمہ پھوٹ گئی۔ اسے بچاؤ، اگر یہ مر گیا تو شین تک جانے والا راستہ کم کر بیٹھو گے۔
 میں نے ہاتھ کھینچ دی اور وحید کی دائیں کٹی پر گول سا نشان اُبھر آیا اور وہ آنکھیں پھاڑے گھٹنوں کے بل گرا اور پھر اونچا ہو گیا۔
 لحاظ سے میرے میں گہرے سکوت طاری رہا تھا۔
 جانشین نے دائیں بائیں دیکھا اور پھر زیر لب بڑبڑایا۔
 "میں مجبوروں کا قائل نہیں ہوں۔ بے شک خدا ہے لیکن خدا ریلواری استعمال نہیں کر سکتا۔ میں ان دیکھے ہاتھ کا شکر یہ ادا کرتا ہوں۔
 سامنے آؤ میرے دشمن اور جانشین کا شکر یہ انعام قبول کرو۔"
 میں نے چہرے پر ہلکے سا مسکرائی اور اسٹینڈ کی آواز سے نکل کر جانشین کے سامنے چلا گیا۔ اس نے اسی ٹیبلٹ کے انداز میں میرے سر پر اچھا لکھا۔ اس کے چہرے پر دوستانہ مسکراہٹ اُبھر گئی۔ اس نے ہلٹ کر لڑکی کا خون آلود چہرہ رضائی سے دھوا پ دیا۔
 "کون ہو دوست؟"
 "ایک سوداگر۔ میں نے کھراڑی آواز میں جواب دیا۔ ایسا سوداگر جو پندرہ سال کی خاطر کسی دوسرے سوداگر کو درمیان میں برداشت نہیں کرتا۔"
 "بہت تعارف پھر لڑکی کی بات ہوگی۔ اس نے ہاتھ رضائی سے نکالتے ہوئے کہا۔
 "میں خرم سلطان کا ایک ادنیٰ ساتھی ہوں۔"
 "اوہ خوب۔ وہ کچل اٹھا۔" میں تو اس کا منتظر تھا۔
 "وہ چھوٹے بچوں کی دکانوں اور چھوٹے سودوں کی خاطر خود نہیں جانتا۔"
 "دوستی کا بند باندھ کر لڑکی کا پیغام چھوٹا نہیں ہوتا دوست۔ اس نے سلیپر میں پاؤں چھینا۔ اور پتنگ سے اُتر آیا۔ بہر کیف میں خرم سلطان کے ادنیٰ ساتھی کو الہامہ خوش آمدید کہتا ہوں۔
 وہ چند قدم چل کر صوفے پر بیٹھ گیا۔
 "بیٹھ جاؤ پیارے اور مجھے اجازت دو کہ حق میں زانی ادا کروں۔"
 "فکر نہ کرو جانشین۔ میں اُٹھ کر آؤں گا۔ تم اسٹینڈ سے صوفے پر اتر کر بیٹھو۔ ہم جب آن دیوٹی ہوتے ہیں تو صرف دیوٹی کی جالاستے

میں۔ میرے چہرے نے دوستی کا پیغام دیا ہے اور اپنی چیز واپس طلب کی ہے۔"
 "میں بھی اصول پرست ہوں۔ وہ مسکرائے لگا۔" مقبول زمین کا ٹکڑا ہوا کوئی انسانی وجود ہو۔ پہلے مذاکرات ہوتے ہیں اور پھر سربراہ کچھ لیتے اور کچھ دیتے ہیں۔ خرم سلطان کی امانت بالکل محفوظ ہے اور میں امانت اسی کو دینا چاہتا ہوں۔"
 "ایک اطلاع اور بھی ہے۔ آپ کی پانچواں شہزادہ خرم سلطان کی یہاں ہے۔"
 "ابھی اطلاع ہے۔ خرم سلطان کا شکر یہ ادا کر دینا۔"
 "تمہارے تمام جہازوں کا جواب تب دیا جائے گا جب لڑکی ہمارے حوالے کر دو گے۔ میں نے پُرسوزی میں کہا۔" خرم سلطان بلیک میٹنگ اور دباؤ پختہ نہیں کرتا۔"
 "اگر میں دھونس قبول نہ کروں تو؟"
 "تو... میں نے ریلواری سیدھا کر لیا۔" میں تمہاری لاشیں خرم سلطان کے لیے لے جانے پر مجبور ہو جاؤں گا۔"
 "نہیں۔ وہ ہنسنے لگا۔" تم نے گرو دشمن کی گولی سے مجھے بچایا ہے تو ابی گولی کا حاکم کرنے کی اجازت بھی نہیں دو گے۔ تم جانتے ہو جانشین کی موت کیا رنگ لائے گی۔ لڑکی میرے ایک پیچھے یا صفت ماتحت کی نگرانی میں ہے۔ میرے بعد وہ پھر یا ہر خوف سے آزاد ہو جائے گا اور لڑکی لے کر پولوش ہو جائے گا۔ ہاں اگرچہ تو گولی چلا سکتے ہو۔"
 میں دانت پیس کر رہ گیا اور وہ ہنسنے لگا تھا۔
 "سنو جانشین۔ میں اُٹھ کر اٹھا۔" میں خالی ہاتھ واپس نہیں جاؤں گا۔ یہی خرم سلطان کا حکم ہے۔ لڑکی۔ اگر نہیں تو تم..."
 "کوئی اور شرط؟"
 "نہیں، اٹھو۔" میں نے آگے بڑھ کر ریلواری اس کی کٹنی پر دھک دیا۔
 "یقین کرو جانشین۔ مجھے یہ حکم ہے۔ لڑکی، جانشین یا اس کی لاش۔ اب تینوں میں سے کون جائے گا یہ فیصلہ تم کرو گے۔"
 "چلو۔ وہ اٹھا اور خاموشی سے چل پڑا۔
 "نہیں۔ میں نے اس کی پیچھے پر ضرب لگائی۔" اس سوداگر کے راستے۔
 وہ گھوم کر سوداگر کی جانب بڑھنے لگا۔ میں اس کے ساتھ لگا چل رہا تھا۔ وہ جھکا اور پھر ترقی کی مانند سوداگر سے باہر نکل گیا۔ ایک انسان سے ایسی چھتری اور کارروائی کی توقع میرے دہم و گمان میں بھی دیتی تھی۔ میں نے بھی چھتری کا مظاہرہ کیا تھا لیکن جب میں باہر نکلا تو جانشین غائب ہو چکا تھا۔

جانشین نے یقیناً خالی ہاتھ رہا ہوگا، ورنہ وہ کوبرے کی طرح پلٹ کر ضرور وار کرتا۔ وہ وار کرنے کی پوزیشن میں ہی تھا۔ سوداگر سے پہلے وہ نکل گیا تھا۔ مجھ سے بھی حماقت ہی ہوئی تھی، اگر وہ خالی بھی تھا تو ساڈھ میں رک کر کوئی واؤ آواز ماسکتا تھا۔ کیونکہ مجھے تو ہر حال جھک کر ہی باہر جانا پڑا۔ کوئین نے بھی جانے میں ویسی پھرتی کا مظاہرہ کیا تھا، لیکن وقت نے اسے زبردست بنا دیا تھا۔ اگر میں اس کی جگہ ہوتا تو خالی ہاتھوں سے ہی اسے اسی وقت چھاپ لینے کا فیصلہ کرتا، جب وہ سوداگر سے باہر آ کر ہوتا۔
 وہ خوف کو خاطر میں لانے والوں میں سے نہ تھا۔ کوئی خیال ہی اسے وہاں سے ہٹانے کا نہیں تھا۔ میں نے لحظہ بھر طرف کا جائزہ لیا اور پھر دیوار کی اوٹ میں چلا گیا۔ کھلی بند بہت بن کر سوچنا دانش مندی نہ تھی۔ میری سماعت سے انجن کی سرسراہٹ مگرانی میں دیوار کے ساتھ چپک کر دوڑنے لگا۔ لان میں بھی خود رو جھارڑیوں کا راج تھا۔ پورچ اور میزے درمیان میں ایسی بے شمار چھوٹی بڑی جھاڑیاں حامل تھیں اور ایک کار گیٹ سے نکل رہی تھی۔ جانشین فرار ہو گیا تھا۔
 میں نے گہری سانس لی اور جھاڑیوں میں داخل ہو گیا۔ میں حیران تھا کہ وہ لوگ کہاں چلے گئے تھے۔ جنھوں نے مجھے مادام شہناز کے ساتھ جانشین تک پہنچایا تھا اور تو اسٹریٹ بیگن سے پوچھ گچھ کرتے رہے تھے۔ اگر وہ ہوتے تو جانشین ہرگز میرے سی کی حالت میں فرار نہ ہوتا۔
 میں جھاڑیوں کے درمیان رک گیا اور آہٹ لینے لگا۔ کوئی پیرنگ آسا سکوت طاری تھا، اگر کمرے میں ہونے والی کارروائی کسی کی خواہش سماعت پر نہ رہتی تھی تو کم از کم کار کے انجن کا شور سن کر کسی نہ کسی کو باہر آنا چاہیے تھا، لیکن لگتا تھا کہ جیسے کوئی پرستار نے کار راج ہو۔ ایک سوال میرے اندر گردش کرتے کرتے خود بخود قہم گیا تھا۔ سوال تھا کیا شین گل یہاں ہو سکتی ہے؟ جواب آسان تھا، اگر وہ یہاں ہوتی تو اس کی نگرانی پر بھی کوئی مامور ہوتا۔ تہ خانے کا سوال خارج از امکان اس لیے تھا کہ کوئی جانشین کی ایماء پر نہ نوازی گئی تھی اور عام کوٹھیوں میں بے جواز تہ خانے نہیں بنائے جاتے۔
 جوں ہی جواب نے مجھے مطمئن کیا میں چل پڑا تھا،

وہاں رکنے کا کوئی فائدہ نہ تھا۔ جانشین بلاشبہ مگر مجھ تھا لیکن وہ ٹھیک ضرب کھا کر تہ میں ڈوبا تھا۔ اس کے سامنے ابھی شہناز تھی، اسے ابھی خرم سلطان سے معاملات طے کرنے تھے۔ وہ کوئی عام غنڈہ نہ تھا کہ اتنی سی جھڑپ پر گھبرا کر شہر چھوڑ دیتا۔ مجھے یقین تھا وہ اپنے مقاصد کی تکمیل تک اسلام آباد نہیں چھوڑے گا۔
 جانشین کو ڈھیل دینے کی بڑی وجہ یہ بھی تھی کہ میں اس کی گود میں بیٹھ کر یہ اندازہ لگانا چاہتا تھا کہ نیا فرعون اپنے ساتھ کتنے شیطان اور کیسے شیطانی منصوبے لے کر پاکستان میں اُتر رہے ہیں اگر اسے مار دیا جاتا تو کتنی نقصانات ہوتے مافیائے بڑے محتاط ہو جاتے اور جانشین سے بھی بڑا شیطان بھیج دیتے، جانشین سامنے آچکا تھا۔ جب کہ دوسرا آنے والا خود کو چھپانے اور بچانے کے معقول انتظامات کے ساتھ آتا اور اسے ٹریس کرنے کے لیے مجھے نیا سفر شروع کرنا پڑتا، ورنہ میں بڑوں کو ڈھیل دینے کے مزید برائی پھیلانے کے حق میں کبھی نہ رہتا تھا۔ شاید تجربات میری ٹوئیں آہستہ آہستہ بتدریج تبدیلیاں کرنے لگے تھے۔
 ایک کامیابی تو بالکل غیر متوقع طور پر ہی پکے ہوئے پھل کی طرح میری چھوٹی میں آن گئی تھی۔ مادام شہناز ایک مشن لے کر آئی تھی اور خود اسی مشن کے جال میں پھنس گئی تھی۔ یہ تو میرے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ قاتل گروہ کی مادام اسی کے چنگل میں اتنی آسانی سے آجائے گی جس کے لیے وہ لاہور سے لاؤشکر لے کر آئی تھی۔
 اس میں ہر کمال نہ تھا۔ اس حالات ہی ایسے رخ مٹرتے چلے گئے تھے کہ پہلے نقلی مادام زیر دام چلی گئی پھر اصلی مادام نے شکار سے پوچھا تھا، میں واپس کہاں جاؤں؟ میں نے اسے اپنی کھوہ کا ہی راستہ دکھانا تھا۔ میرے لیے وہ محفوظ سرمایہ بن گئی تھی۔ اچھا سرمایہ جسے بوقت ضرورت استعمال کیا جاسکتا تھا۔
 گیٹ سے نکل کر میں نے طرہوں کو وراج ٹرانسمیٹر پر کال کیا۔ پہلے انجن کی آواز سنائی دی اور پھر طرہوں کی بھرائی ہوئی مدھم مدھم سی آواز آئی۔ شاید فاصلہ زیادہ تھا یا اس نے تمام شیشے چڑھائے ہوئے تھے۔
 "پوزیشن بتاؤ پیارے۔"
 "زیر پوزیشن۔" طرہوں نے بتایا۔ میرے سامنے

ایک پاگل خطرناک رفتار سے جا رہا ہے۔ وہ پشاور لٹک روڈ پر چڑھ گیا ہے۔

”تھینک یو ہارون! احتیاط سے تعاقب جاری رکھو۔“

”ہے کون...؟“

”جانسن! میں نے بتایا۔ اگر وہ تعاقب سے آگاہ ہو چکا ہے تو شاید تمہیں رات بھر دوڑنے کا۔ اگر وہ ہنڈی ایریا سے باہر چلا جائے تو تم واپس چلے آؤ گے۔“

”اگر ریجن میں آجائے تو اس کی کار کی ٹانگیں نہ توڑ دوں چیت۔“

”نہیں! میں نے جواب دیا! میں نے اسے کنکر مار کر خود اڑایا ہے۔ دیکھنا یہ ہے کہ اس کا دوسرا گھونسل کہاں ہے؟ ہارون میری توقعات سے کہیں اوپر کی شے ثابت ہوا تھا۔ مجھے تو فہمت ہی نہ ملی تھی کہ اس سے مکمل تعارف حاصل کر سکتا۔ وہ کس خاندان کا روشن چراغ تھا اور کس نیک بخت ماں کا بیٹا تھا؟ لیکن یقین ہو چلا تھا کہ اس کا تعلق اچھے درخت سے ہے۔ وہ میرا دایاں بازو ہی نہیں بلکہ ہم زاد بن گیا تھا۔ میں ہدایت نہ بھی دوں تو بھی میری پشت پر ہی موجود رہتا تھا۔

میں جانسن کی طرف سے مطمئن ہو گیا تھا۔ ہارون جیسا شخص اس کے تعاقب میں تھا۔ میں جانتا تھا کہ ہارون اس کا دوسرا ٹھکانہ معلوم کرے گا یا اسے ہنڈی کی سرحد سے باہر دھکیل کر واپس آئے گا۔ میں نے ٹرانسمیٹر کی جانی دبا کر آسمان کی طرف دیکھا۔ مارگلہ کی پہاڑیوں پر کالی ٹھٹھا سے بجلی کے کوندے لپک رہے تھے اور میرے قریب کھڑے یوٹیلیٹی کے درخت بھی ہونے لگے۔ معا میرے تارکے ذہن میں ایک سوچ کا کوندا پیکا اور میرے قدموں کی رفتار تیز ہو گئی۔ جو کام میں کرنا چاہتا تھا اور نہ کر سکا تھا، وہی کام اگر کوئی دوسرا متحمل کر دیتا تو جانسن کو پوٹ کا احساس شدید ہو جاتا اور میرا شک بھی رفع ہو سکتا تھا۔

سپر مارکیٹ میں ٹیلی فون بوقت تلاش کرنے میں شاید پریشانی اٹھانا پڑتی، مگر ڈرگ اسٹور کے مالک نے میری رہنمائی کر کے ممکنہ پریشانی سے بچا لیا تھا۔ وہ اپنا اسٹور لاک کر کے بیڑھیاں اتر رہا تھا۔ تب ہی میں نے کار کے دروازے سے جھانک کر اس سے پوچھ لیا تھا۔

سنگہ ڈال کر میں نے امیر جنسی کا نمبر ڈائل کیا۔

”ہیلو! میں امیر جنسی! فوراً جواب دیا گیا۔“

”پہلے اپنا نام یا پٹی نمبر بتائیے! اس نے بلا توقف عہدہ اور پٹی نمبر بتا دیا۔ ”شکریہ آفیسر! اب قلم کاغذ منجلیے اور میرا پیغام نوٹ کیجیے۔“ پھر میں جانسن کی کوٹھی کا نمبر اور ایریا لکھوانے لگا اور وہ میں سر میں سر کرتا ہوا پیغام نوٹ کرتا رہا۔

”کیا آپ اپنا نام ظاہر نہیں کریں گے؟“ پیغام نوٹ کر کے وہ بڑے مہذبانہ انداز میں بولا۔

”کیا یہ ضروری ہے آفیسر؟ میں نے بھی نرم آواز سے پوچھا۔“

”نہیں سر! وہ بولا۔ لیکن بعض اوقات ہمیں محض پریشان کیا جاتا ہے۔“

”پریشان کرنے والا خود کو اس ملک کا سربراہ کہہ دے تو کیا آپ یقین کر لیں گے؟“

”کوئی بات نہیں سر! وہ ہنس پڑا۔ اور میں اسے شب بخیر کہہ کر کار میں بیٹھ گیا۔

بظاہر میں نے اپنے پاؤں پر کھپاڑی ماری تھی پولس کارروائی کے بعد جانسن کی واپسی ناممکن ہو جاتی، جانسن روپوش ہو جاتا تو شینگل کی بازیابی کا خواب بھی بکھر سکتا تھا، لیکن جانسن کی مجبوری میری منجھی میں تھی۔ مادام کشن کو توڑے بغیر وہ ملک فنانس جگہ نہیں لے سکتا تھا۔ میں مادام کو بطور چارہ استعمال کر کے جانسن کو پھر ٹریس کر سکتا تھا۔

ہوٹل میں صرف اکبر میرا منتظر تھا۔ میں نے فرد آفڈا رشیدہ سمیرا اور مادام شہناز کے بارے میں پوچھا۔

اکبر نے بتایا کہ مادام نے دونوں ٹریکوں سے پھر دیر کے بے ملاقات کی تھی اور پھر اس نے لاہور اپنے منجھ سے بات کی تھی۔ میں ذہن سے سب کچھ نکال کر لیٹ گیا، جب میرا ذہن خالی ہو تو میں بے حد گہری اور پرسکون نیند کی آسائش حاصل کر لیتا ہوں۔

صبح اذان کی آواز پر بیدار ہوا اور میں نے غیر جاننے کی طرح شرمندہ شرمندہ خدا کے دربار میں حاضری دی۔ سارے استاد تو مہربان نہیں ہوتے، غیر حاضر کو مزا نہ دیں تو سزائیں ضرور کرتے ہیں۔ مگر اللہ تعالیٰ بڑے ہی مہربان ہیں۔ مجھ جیسے گنہگار اور عادی غیر حاضر کو بھی سزا

کر کے سکون کی دولت عطا فرماتے ہیں۔ نماز سے فارغ ہوا تو میرا دل سکون سے لبالب بھرا ہوا تھا۔ گوبھے معلوم تھا یہ سکون سورج کی پہلی کرن کے ساتھ بھاپ بن کر اڑ جائے گا۔

ابھی سورج طلوع بھی نہ ہوا تھا کہ ہارون کا وجہ اور مسکراتا ہوا چہرہ دستک دے کر میرے کمرے میں طلوع ہو گیا۔ وہ مجھے دیکھ کر اخلاقاً مسکرایا تھا یا کسی کامرانی کی روشنی اس کے چہرے پر نکھری ہوئی تھی۔ وہ بے حد خوش اور شگفتہ مزاج دکھائی دے رہا تھا۔

”مجھے اکبر نے بتایا کہ ابھی آپ نے ناشتا نہیں کیا؟“

وہ میرے سامنے بیٹھ کر بولا۔ ”میں رات جب آیا تو آپ سو چکے تھے۔“

”ہاں میں جلدی ہو گیا تھا! میں انگریزی لیتے ہوئے بولا۔“

”ناشتے سے قبل ابھی خبر ہو جائے تو...“

”ابھی خبر کا راستہ آپ نے روک دیا تھا! ہارون بولا۔“

”ورنہ اس وقت جانسن کو ٹرے میں سجا کر پیش کرتا! نہیں پیارے! ابھی وہ رورسٹ نہیں ہوا۔“

”وہ مجھے واقعی تھکانا چاہتا تھا! ہارون بتانے لگا۔“

”دو گھنٹے ہنڈی کی ویران سڑکوں پر گھماتا رہا، پھر آدمی امیڈیم چوک پر رُک گیا اور کار سے نیچے اُترا، ہاتھ گردن پر باندھ کر میرے قریب آکر بولا کہ میں تھک گیا ہوں۔ اب کسی جگہ آرام کرنا چاہتا ہوں، اگر تمہیں صرف میرا ٹھکانہ معلوم کرنے کی ہدایت ملی ہے تو واپس چلے جاؤ! میں انٹرکان میں ٹھہروں گا اور کل دن بھر آرام کروں گا۔“

”بہت بہت شکریہ جناب! میں نے ممنون لہجے میں بتایا۔ ایک سو روپے کا معاوضہ واقعی رات بھر کے لیے معقول نہیں ہوتا۔ اب تو بیڑوں بھی بہت تھوڑا رہ گیا ہے۔“

”میں اُمق ہوں نہ تم معاوضے کے آدمی دکھائی دیتے ہو! وہ طنز یہ انداز میں ہنس پڑا۔ بہر کیف میں ابھی کچھ دن رہوں گا یہاں... اور تم لوگوں سے پھر ملاقات ہوگی فی الحال میں سونا چاہتا ہوں۔“

”تمہارا کیا خیال ہے۔ وہ واقعی انٹرکان میں گیا ہوگا؟“

”نہیں! ہارون نے سر ہلایا۔ وہ پارکنگ سٹیڈنک گیا تھا! میں اس وقت مال روڈ پر تھا، پھر میں نے کار فیملی سڑک پر کھڑی کی اور اسے دیکھنے لگا۔ وہ کار چھوڑ کر

دوسری گاڑیوں کی آڑ میں چلتا ہوا کپاؤنڈ وال پھانڈ گیا تھا۔ اب سے پانچ منٹ تک وہ فلیش مین میں مقیم تھا۔

”آؤ نیچے چلتے ہیں! میں اچھل کر اٹھا، لوگ ناشتے کے لیے ڈائننگ ہال میں آ رہے تھے۔ اکبر خان بیروں کو ہدایات دے رہا تھا۔ میں نے کاؤنٹر پر جا کر خاموشی سے اسلام آباد امیر جنسی کا نمبر ڈائل کیا۔

”اسلام! علیکم جناب! کیا نارٹ ڈیوٹی آفیسر موجود ہیں؟“

”جی فرمائیے! غالباً آپ ہی نے...“

”جی ہاں! میں اس کا مطلب سمجھ گیا تھا۔ ضرورت تو نہ تھی لیکن انسانی فطرت ہی ایسی ہوتی ہے! اب تو آپ کو آجانا چاہیے جناب! کیوں ایک رات میں ہماری پولس کا رویہ اور قانون بدل گیا ہے؟“

”اچھا کیا پوچھنا ہے؟ وہ ایک دم اکھڑ سا گیا۔“

”وہاں سے کیا ملا؟“

”چار عدد دلاشیں اور کچھ...“

”اوہ... چار...“ میری سانس کو جیسے ٹھوکر لگی۔ بد کیا سب مردوں کی؟

”نہیں! ایک لڑکی بھی ہے۔“

”اور کوئی زندہ گرفتار بھی ہوا کیا؟“

”نہیں! آفیسر نے بتایا۔ ہم نے پوری کوٹھی کا چپہ چپہ چھان مارا ہے۔“

”شکریہ آفیسر! میں نے فوراً ریسور رکھ دیا، جو بات رات سے اٹک اٹک کر پریشان کرتی رہی تھی اس کی وجہ سمجھ میں آ گئی تھی۔ وہ شخص جو جانسن کا رقیب تھا۔ اس نے داخل ہونے کی راہ میں آنے والے دونوں نمبروں کو قتل کر دیا تھا۔ پولیس کو دو دلاشیں خواب گاہ سے ملی ہوں گی اور دو باہر پڑی ہوں گی۔ یہی وجہ رہی تھی کہ کوٹھی پر سکوت طاری تھا اور شاید جانسن نے محافطوں کی حالت دیکھ کر ہی راہ فرار اختیار کی تھی۔

”ہارون روم نمبر تو بتاؤ! میں نے فلیش مین کا نمبر ملاتے ہوئے کہا۔ میں اسے خوش خبری سنانا چاہتا ہوں۔“

”ہارون نے روم نمبر اور کسی جون میکھ کا نام بتایا اور میں نے وہی نام و نمبر استقبالیہ کو بتا دیا۔

”ایک منٹ سر! استقبالیہ لیڈی کلرک کی مترجم آواز

ابھی۔ جی ہاں فرمائیے روم میں موجود ہیں؟
 اگر جاگ رہے ہوں تو بات کرو دیجیے! استقبالی کلرک
 نے پس سرکہ کر کے کانبر ملا دیا۔
 "ہیلو، جون بول رہا ہوں۔" جانسن کی جانی پہچانی آواز
 سنائی دی۔
 "گڈ مارننگ سٹر جون! میں نے بھی آواز دہا کر کہا۔ آپ
 کا نیا روم خرم سلطان بول رہا ہوں؟"
 "اوہ... تو رات تمہارا آدمی تھا؟"
 "ہاں سٹر جون! میسرے میں اپنے دوستوں کا اسی طرح
 خیال رکھتا ہوں؟"
 "اب کیا چاہتے ہو؟"
 "تم نے دیا ہی کیا ہے جانسن؟"
 "سٹو خرم سلطان تم جانتے ہو میں وقتی طور پر پریشانی
 میں گھر گیا ہوں؟"
 "کیا تم لوگ بھی پریشانی کا لفظ استعمال کیا کرتے ہو؟"
 "وقتی پیاسے؟" اس نے کھوکھلا قبہ بگایا۔ میری
 مدد کرو گے خرم سلطان؟"
 "کیا بشرط جانسن؟"
 "نہیں، بولو کیا چاہتے ہو؟"
 "دوستی اور صرف دوستی انکل؟"
 "دیکھو لڑکے! وہ عزتاً نہیں دیکھ رہے ہوں جس سے
 تم جیسے نوجوان کھیل سکیں۔ گیند اوچٹان میں ہو فرق ہوتا ہے
 وہ تمہیں معلوم ہوگا۔ میں بزنس کا قائل ہوں، مگر ہر بڑی کی سطح
 پر، اگر تم غالب ہو کر بات کرو گے تو تمہیں دو منٹ بعد
 یہاں جانسن کی گرد بھی نہیں ملے گی۔"
 "میں اگر چاہتا تو تمہاری لاش یا تم اس وقت میرے
 قدموں میں پڑے ہوتے جانسن! کیا تمہیں معلوم ہو چکا ہے
 کہ تمہاری قیام گاہ سے پولیس چار لاشیں اٹھا لائی ہے؟"
 "پولیس کو تم نے ہی بھیجا ہوگا؟"
 "اگر تم ایسا سمجھتے ہو تو میں انکار نہیں کروں گا۔"
 "تو کیا ایسا نہیں؟"
 "ہاں انکل! بھیرے شکاریوں کے خبر نہیں ہوا کرتے؟"
 "شکاریوں کے! بس میرا خیال تھا۔ ملن اب بتاؤ تھان
 کی شرط کیا ہے تمہاری؟"
 "دوستی کی پیش کش تم ٹھکرانے کے ہو۔ اب صرف شرط

ہی ہوگی اور وہ ہے قیمن کی داپسی۔
 "لڑکی کے بدلے مجھے کیا دو گے؟"
 "تحفظ کی ضمانت؟"
 "پھر تمہیں مجھ پر اعتماد کرنا ہوگا خرم سلطان! تمہیں میرا
 پیغام مل چکا ہے میں اس پریشانی سے قبل بھی تم سے
 ملاقات کرنا چاہتا تھا، مجھے اوپر سے اسی ہدایت کے ساتھ
 روانہ کیا گیا تھا میرے بڑوں کو تمہاری ضرورت ہے۔ میں
 ان کا پیغام تمہارے حوالے کرنا چاہتا ہوں چلے آؤ، ہم
 دوستانہ ماحول میں باقی معاملات طے کریں گے۔"
 "ٹھیک ہے میں آ رہا ہوں۔ یہ کہہ میں نے جھگڑے سے
 ریسپور رکھ دیا اور آنکھیں موند کر آنکھوں سے باتوں میں
 لگ گئی کہنے لگا۔ جن لوگوں کی زندگی میدانی علاقے سے گزرتے
 والے دریائی مانند سست رو، خاموش اور عموماً گزری رہی
 ہو، وہ شاید ہی ایسی باتوں پر یقین کریں، کبھی میرا خیال
 بھی یہی ہوا کرتا تھا کہ حادثے کی طرح حسن اتفاق بھی شاذ و
 نادر ہی انسانی زندگی سے ٹکراتا ہے، مگر پہاڑی ندی جیسی
 تند و تیز اور ہنگامہ پرور زندگی گزرتے والے لوگ جانتے
 ہوں گے کہ ایسی تیز و زندگی حوادث اور اتفاقات سے
 قدم قدم پر گمراہی ہے۔ کبھی ٹکرا کر خود آئینے کی طرح کچھ یوں
 میں بکھر جاتی ہے اور کبھی رکاوٹ اور غائب کو پاش پاش
 کرتی آگے نکل جاتی ہے۔ میں نے جس پالیسی یا طریقہ کار کو
 شروع میں ہی اپنا لیا تھا اس نے مجھے مایوس نہ کیا تھا۔
 میں کسی شخص کے کی طرح تدابیر کے ٹوٹنے والوں سے نرم اور
 سخت زمین ٹھکرتا ہوا متر مقابل کے اندر جا کر پیٹ پھاڑ
 کر باہر نکل آتا تھا۔ ملک نواز جیسے محتاط، با اثر اور رنگ باران
 نے بھی مجھے اس وقت محسوس کیا تھا، جب میں اس کے دل
 میں دانت کاڑ چکا تھا، جب کہ باقی لوگ تو بھر بھری زمین
 ہی ثابت ہوتے تھے۔ میری خون رنگ داستان حیات
 پڑھنے والے جانتے ہوں گے کہ ہر بار حالات نے میرا
 ساتھ دیا تھا میں نے ہمیشہ حالات کے تحت ہی روپ
 بدلے ہیں اور ہر جگہ متر مقابل سے اپنی اہمیت منوائی ہے
 ہر ایک نے مجھے اپنے مفادات کی آبیاری کے لیے ناگزیر
 مان کر ہی مجھے راستہ دیا ہے۔ حتیٰ کہ مظفر چوہدری جیسا جاہل
 شخص بھی مجھے ٹوٹنے لگا۔ اسی کی ایماء پر گاؤں کے ہر رنگ
 وہ تجر بڑا لائے تھے۔ بالفاظ دیگر مظفر چوہدری اپنی پختہ

روم سلطان کے پاؤں میں گرلے پر تیار ہو گیا تھا۔
 جانسن کو میں ذاتی طور پر نہیں جانتا تھا۔ عقل طاقت اور
 زندگی کے حوالوں سے وہ کیا تھا؟ میں اس سے لاعلم تھا، لیکن
 اس گروہ سے اس کا تعلق تھا۔ اسے پوری طرح آپاؤ دنیا جانتی
 اور مانتی تھی۔ جرم کی دنیا میں طاقت کا سرچشمہ گروہ کا گزندہ اسٹر
 ہوتا ہے۔ اسی کے قد کاٹھ اور طاقت پر اس کے گروہوں کی
 حاکم تسلیم کی جاتی ہے۔ بلنگ کانگ اور فلپائن میں میرا کچھ
 وقت تربیت اور باقی عرصہ بھاگ دوڑ میں گزرا تھا۔ میں
 نے وہاں مافیا کا نام سنا تھا اور تھا، لیکن براہ راست تصادم
 و نوبت نہ آئی تھی۔ اس لیے میں مافیا کے طریقہ کار سے
 واقف تھا۔ یہی وجہ تھی کہ میں نے ملاقات کی ہامی بھر
 لی تھی، مگر سوچ جاؤں نہ جاؤں کے درمیان دوڑنے لگی
 تھی، اگر جانسن بھی میرے جیسا ہی شکاری ہوتا، اس کا طریقہ
 کار بھی وہی ہوتا تو پھر حیت اس کی ہوتی تو جو چھٹ کر
 بدل کر جاتا۔
 "ناشتا آفس میں کریں گے یا اوپر؟" اکبر خان نے
 دروازے پر پوچھا۔
 "اوپر نہ جائیے؟" میں نے سر کو جھٹک کر جواب دیا۔ "میں
 ہمارے فلپائن میں جا رہے ہیں؟" میں نے اس کے رجسٹر پر
 دم مگر لکھ کر اس کے سامنے رکھ دیا۔ اس نے سر کو اٹھاتی
 نظر دے کر رجسٹر بند کر دیا۔ "ہمارے فلپائن میں کچھ لڑائی نہیں؟"
 "نہیں چیف! ہمارے فلپائن نے جیب پر ہاتھ رکھ کر تھی
 مگر بلایا یہ اکبر خان! تم جہان نواہن کا خاص خیال رکھو گے
 کے لیے جو بھی کال آئے تم نوٹ کرو گے؟"
 "بھتر جناب! اکبر خان بولایا اگر کوئی باہر جانا چاہے
 تو؟" ہمارے فلپائن نے جواب طلب نگاہوں سے میری
 جانب دیکھا۔
 "وہ ہماری جہان ہیں اکبر خان! میں نے کہا یہ ہاں، اگر
 ان جانا چاہے تو میں اطلاع کر دینا؟"
 دوست نما دشمن کو جہاں دشمن پر کارگر وار کرنے کی
 راستہ ہوتی ہے، وہاں اس راہ میں کئی دشواریاں اور جھڑپیں
 شامل ہوتی ہیں۔ مادام شہناز میری دشمن تھی، لیکن جن
 بات میں وہ میری بنیاد میں چلی آئی تھی، ان کا تعلق ہی تھا
 مافیا کے طریقے میں دوست تانہ رو تیر برقرار رکھوں۔ اگر وہ
 جانا چاہتی تو اسے روکنے کا میرے پاس کوئی جواز نہ

تھا۔ میری اس مجبوری سے فائدہ اٹھا کر وہ گاؤں کی چڑیا
 بھی بن سکتی تھی۔
 فلپائن میں کے پار کانگ شیمڈ میں تل دھرنے کی جگہ نہ
 تھی۔ کچھ کاریں پانچ سو سے پر آڑی ترچھی پارک تھیں۔ ہمارے
 نے بھی بے ترتیب کاروں کے درمیان ایک خالی جگہ
 دیکھ کر کار پارک کر دی اور انجن بند کر کے میری جانب
 استقبالیہ نگاہوں سے دیکھنے لگا۔
 "میں چاہتا ہوں جانسن کو تم بھی قریب سے دیکھ لو؟"
 میں نے اس کی نگاہوں کے سوال کا جواب دیا۔ اگر وہ میرا
 ہاتھ سہہ گیا تو مستقبل کی کارروائیوں میں تم فعال کردار ادا
 کرو گے؟"
 ہمارے فلپائن نے خاموشی سے دروازے لاک کیے اور میرے
 ساتھ چل پڑا۔ لیڈی کلرک نے استقبالیہ مسکراہٹ دی
 اور میں بھی جوانی مسکراہٹ دیتا ہوا کار پڈور میں داخل ہو
 گیا۔ بٹون کی گردش اچانک ہی کچھ تیز ہو گئی تھی، لیکن میں
 مطمئن تھا کہ میری چھٹی جوتی کی گھنٹی بالکل خاموش تھی۔ میں
 نے طویل سانس لے کر انگلی سے دروازہ ہچکایا۔
 "میں کم ان! اندر سے بھرتی ہوئی آواز سنائی دی۔
 میں نے ناب گھٹا کر دروازہ کھول دیا کمرے کا بیرونی حصہ
 خلل تھا۔ ہم نے ابھی دو قدم ہی بڑھائے تھے کہ بیڈ روم
 سے جانسن نکل آیا۔
 "ہیلو بوائے! وہ والہانہ انداز میں آگے بڑھا... اور
 دونوں ہاتھوں میں میرا ہاتھ دبوچ کر بوجھ جھٹکے دینے
 لگا۔ اس نے اپنی جسمانی قوت کا مظاہرہ نہیں کیا تھا۔ اس
 لیے میں نے بھی ہاتھ کو نرم ہی رہنے دیا تھا۔ تمہیں سامنے
 پا کر میں بے حد خوش ہوں خرم سلطان؟"
 "میرا ہم زاد ہمارے فلپائن میں نے ہمارے فلپائن کی جانب اشارہ
 کیا۔ دونوں نے ایک ایک قدم بڑھایا اور ہاتھ ملائے کی
 رسم ادا کر دی۔
 "بیٹھو پیارے دوستو! وہ ہونٹوں پر مسکراہٹ سجھا
 کر بولایا۔ میں انسانوں کے جھگڑے کا شکاری ہوں اور ایک
 بچے شکاری کی طرح بچے شکاریوں کا قدر دان ہوں؟"
 ہمارے فلپائن نے کونے والی کرسی کا انتخاب کیا اور میں جانسن
 کے سامنے والی نشست پر بیٹھ گیا۔ ہمارے فلپائن کا مقصد یہی رہا
 ہوگا کہ اگر جانسن کچھ کرنے کی طاقت کر بیٹھتا تو آسانی سے

دونوں کو کور نہیں کر سکتا تھا۔

”ناشتا لو گے نا؟“ جانسن نے دوستانہ لہجے میں پوچھا۔
”ہاں انکل“ میں نے بھی اپنا تیت بھرے انداز میں جواب دیا۔ اُس نے اُنکڑ کر روم سردس کو آدرا دیا اور سگار چباتا ہوا بیٹھ گیا۔

”بالآخر میں صبح آدمی کو پانے میں کامیاب ہو ہی گیا۔“
”میرا خیال ہے“ میں نے اُس کی نیلی سحر انگیز آنکھوں میں جھانک کر کہا۔ ”جہاں سے ہم نے بات چھوڑی تھی وہاں سے شروع کی جائے۔ ہم لوگ وقت کی سنگی کے ہمیشہ شاکی رہتے ہیں۔“

”لیکن میرا خیال ہے“ وہ سگار کو شعلہ دیتے ہوئے بولا۔ ”بات آغاز سے شروع ہونی چاہیے۔“
”مجھے کوئی اعتراض نہیں سٹر جانسن۔“

”شکر یہ دوست“ وہ دھواں اُگل کر سنسنے لگا۔ ”میں نام سے بکرا جانا پسند کرتا ہوں۔ چچا بھتیجے والا رشتہ یہ احساس دلانے لگتا ہے جیسے میں واقعی بوڑھا ہو رہا ہوں۔ تو میں بات شروع کروں گا، تمہاری زندگی کے سابقہ حوالے سے میں نے چونک کر دیکھا۔ اُس نے آنکھیں موند لی تھیں۔ ”مردہ گھوڑوں کا ذکر مناسب نہ ہوگا، وہ اچھے نامور گھوڑے تھے۔ لیکن... ریس میں ہار گئے اور ہم لوگ ہارے ہوئے گھوڑوں کو زندہ بھی ہوں تو کوئی اہمیت نہیں دیتے۔ کیا تمہارے ذہن میں کچھ نام ابھر رہے ہیں؟“

”بات جاری رکھیں سٹر جانسن۔“ میں ناگوار لہجے میں کہا۔ ”میں بے شمار نامور گھوڑوں کو ریس کورس میں شکست دے چکا ہوں۔ میں اپنی فتوحات کو نہیں بلکہ شکست کو یاد رکھا کرتا ہوں۔ فتوحات انسان کو خوش فہم بنا دیتی ہیں۔“

”اچھا اصول ہے“ اُس نے بند آنکھوں کی جھریوں سے میری جانب دیکھا۔ ”زندہ لوگوں میں سے کس کا حوالہ لیتا ہوں؟“
”مادام ہوزی یا ایڈنا؟“ اُس نے ایک دم پوری آنکھیں کھول کر میرے چہرے پر زلزلے کا جھٹکا دیکھا۔ ”میں عقیدے کے لحاظ سے خدا پرست ہوں۔ میرا عقیدہ ہے کہ ہر چہرہ موت کی طرح وقت مقررہ پر ہی سامنے آتا ہے، اگر یہ بات نہ ہوتی تو ہماری ملاقات ہانگ کانگ میں ہو جاتی یا پھر فلپائن میں تم سامنے چلے آتے۔ یہ بھی عجیب اتفاق ہی ہے کہ اس وقت بھی تم سے رابطہ قائم کرنے کا حکم مجھے ہی دیا

گیا تھا۔ میں بنکاک سے ہانگ کانگ میں داخل ہوا تو تم فلپائن کے لیے روانہ ہو چکے تھے۔ ابھی میں دوسرے حکم کا منتظر تھا کہ دونوں گرینڈ ماسٹر بھی اُدھر چلے گئے، پھر مجھے کہا گیا کہ فلپائن میں کھیلے جانے والے فیصلہ کن رائفنڈ کا انتظار کرو۔ جانسن نے گہرا کش لے کر دھواں منہ اور ناک سے چھوڑا۔

”پھر حیرت انگیز اطلاعات کا سلسلہ شروع ہو گیا، اگر ہم چاہتے تو مداخلت کر کے تمہاری مدد کر سکتے تھے لیکن ہمارے چیف نے چپ سادھ لی تھی۔ یقیناً وہ خوش تھا۔ کیونکہ اُس کا کام تم خوش اسلوبی سے پایہ تکمیل کی طرف تیزی سے لے جا رہے تھے۔ جی تو اور جنگ جی دونوں ہی ہٹ ہٹ پر تھے۔ اُن کی وجہ سے ہماری تنظیم کو ہانگ کانگ میں قدم جما نے میں مشکلات کا سامنا تھا، پھر جب ہیڈ کوارٹر سے مجھے حکم ملا کہ فارح خرم سلطان کو تنظیم کے بڑوں نے اپنے لیے فٹ قرار دے دیا ہے تو میں فلپائن گیا، میں اُس جوتے کے تعاقب میں گیا تھا، لیکن قدرت کو منظور نہ تھا۔ وقت معین نہ تھا۔ لہذا میں ایک حادثے میں زخمی ہو کر پابندی لگ گیا۔ جب میں اسپتال سے فارغ ہوا تو مادام سعدیہ تمہارا سودا گری کر چکی تھی۔ اس طرح ہم تمہیں وہاں روکنے سے قاصر رہے تھے۔“

”تو کیا آپ کو صرف میری خاطر ادھر بھیجا گیا ہے؟“
”نہیں“ جانسن نے صاف گوئی سے انکار کر دیا۔ ”ملک فلپائن اور ہمارے درمیان جو معاہدہ تھا اس کی رو سے مافیا کی سرگرمی کو نہیں بھیج سکتی تھی۔ ملک نواز بڑی خوش اسلوبی... اور دیانت داری سے ہمارے مفادات کا خیال رکھتا تھا۔ اس کے باوجود ہمارا ایک سینئر نمائندہ یہاں ہر وقت موجود رہتا تھا، جو ہیڈ کوارٹر کو ملک نواز کی کارروائیوں کی رپورٹ دے گا۔ دارمقا۔ ہیڈ کوارٹر ملک نواز کی رپورٹ اور اپنے نمائندے کی رپورٹ کا موازنہ کرتا تھا۔ کسی رپورٹ میں بے پستی یا خرم سلطان کا نام پڑھا گیا تو وہاں پھیل جی جی تھی۔ رپورٹ میں یہ خدشہ ظاہر کیا گیا تھا، اگر خرم سلطان کے قتل نہ روکے گئے تو وہ ملک نواز کو بھی ادھیڑ کر مافیا کے کاڈو نقصان پہنچائے گا۔ بظاہر ہیڈ کوارٹر نے یہ فیصلہ کیا کہ ملک کو بچایا جائے، مگر اندرون خانہ فیصلہ دوسرا ہوا تھا اور اسی دوسرے فیصلے پر مجھے بھیجا گیا کہ خرم سلطان کے لیے اسے تمام رکاوٹیں صاف کی جائیں تاکہ وہ ملک نواز کو بھارت

پر قابض ہو جائے۔ ہمیں چونکہ ملک نواز کی پشت پناہ حکومت اور رنج دہتا دکھائی دے رہا ہے۔ اس لیے ہمیں غیر جانبدار دنیا بھون درکار ہے۔“

”بلاتشبہ آپ کے ذرائع اور معلومات حیرت انگیز ہیں سٹر جانسن۔“ میں نے پرستاش لہجے میں کہا، تو جانسن مسکراتے ہوئے لیکن آپ کے نمائندے نے یہ اہم بات رپورٹ میں نہیں لکھی۔ خرم سلطان ایسا وحشی گھوڑا ہے جس کی پشت کسی کاٹھی اور نہیں کسی لگام سے مانوس نہیں ہے۔“

”ہاں رپورٹ میں یہ ذکر نہیں تھا“ جانسن زیر پر ب مسکرا کر لے لگا۔ ”لیکن ہیڈ کوارٹر میں جو کچھ سوئٹز کالما دماغ ہر وقت مروف رہتے ہیں۔ اُن سے تمہاری ذات کا کوئی گوشہ اوچھل رہا ہوگا۔ یہی وجہ ہے کہ مجھے کاٹھی اور لگام کے بغیر صرف رستی کے پیغام کے ساتھ بھیجا گیا ہے۔ تمہاری لائف ہسٹری فائل جو میرے حوالے کیا گیا ہے۔ اُس میں درج ہے... کہ سلطان پاگل درندہ اور جنگلی گھوڑا ہے۔ وہ جب اپنے کار پر چھٹا ہے تو اُسے چیر بھاڑ دیتا ہے اور اُسے ہمیشہ مار دیکھا گیا ہے۔“

”کیا آپ کے بڑوں کے ذہن صرف دوستی سے مطمئن رہا ہے؟“

”ہاں لیکن دوستی کے کچھ تقاضوں کے ساتھ۔“
”یعنی تقاضا سوار ہوگا اور مجھے اپنی پشت وقف کرنا ہو گی؟“

”نہیں“ جانسن ہاتھ بچا کر بولا۔ ”مجھے وضاحت کی اجازت خرم سلطان۔“

”وضاحت سے قبل سُن لو سٹر جانسن۔“ میں نے دہکتی ہوئی آواز میں کہا۔ ”میں کسی بھی شرط کو اپنی پشت پر برداشت نہیں کر سکتا۔“

”دوستی کی شرط بھی نہیں؟“ جانسن کا لہجہ التجائیہ تھا۔ ”تم ستان کی حد تک بالکل آزاد اور خود مختار رہو گے۔“
”یہ آزادی ملک نواز کو بھی حاصل رہی ہوگی۔“

”اوہ... نہیں دوست۔“ جانسن زور دے کر بولا۔ ”وہ آزاد تھا اور آزادی کی قیمت باقاعدگی سے ادا کرتا تھا، لیکن اُسے ساتھ ایسی کوئی پابندی نہیں ہوگی۔ ہم تمہارے بزنس پر بھی طلب نہیں کریں گے۔“

”پھر میری دوستی مافیا کے مفادات کے لیے کیوں

ضروری ہے؟“

”ہمارے کچھ مفادات ہیں“ جانسن نرم آواز میں بولا۔ ”مثلاً منشیات کا نوٹ اور حصول۔ ہم صرف یہ چاہیں گے کہ رہا داری کا کام دو، لیکن ہم مال یہاں فروخت نہیں کریں گے۔ کچھ دیگر مفادات بھی ہیں جن کا ذکر فی الحال مناسب نہیں۔ ہم صرف تعاون کے خواستگار ہوں گے اور اُس تعاون کا معقول معاوضہ بھی دیں گے۔ جب کہ تم اپنے معاملات میں خود مختار رہو گے۔ ہم ایک پیسہ بھی طلب نہیں کریں گے۔“

”فیصلے کے لیے کتنی مہلت دو گے؟“
”جب تم چاہو جواب دے دینا۔“
”شکر یہ“ میں نے ہارون کی طرف دیکھا۔ اُس نے میری تائید میں سر جھٹکا لیا تھا۔

”اب میں اپنی ذات کی طرف آتا ہوں۔“ اُس نے مجھے ہونے سگار کو ہونٹوں میں نچاتے ہوئے کہا۔ ”تمہارے جواب میں یہاں رہنا چاہوں گا۔ جب کہ تمہاری پولیس میری تلاش میں ہوگی۔“

”آپ کو پورا تحفظ فراہم کیا جائے گا سٹر جانسن۔“ میں نے باوثوق انداز میں جواب دیا۔ ”یونکہ قانون اور قانون کے محافظوں سے مجھے بھی کوئی ہمدردی نہیں ہے۔ ہم بڑے لوگ صرف قانون کے ساتھ جنگ کرتے وقت گروہی اختلافات کو بالائے طاق رکھ دیتے ہیں۔“

”میں تمہاری ضمانت پر اعتماد کروں گا خرم سلطان۔“ وہ پیار بھری نگاہوں سے دیکھنے لگا۔ ”تم ایک بہادر نوجوان ہو اور بہادری کی ایک صفت یہ بھی ہے کہ پیٹھ پر دان نہیں کرتی۔“

”کیا اب میں اپنی ذات کی بات کروں؟“
”ہاں۔“ اُس نے ہونٹ دانتوں تلے دبایا۔ ”مگر مجھے افسوس ہوگا خرم سلطان، تیرے کان سے نکل چکا ہے۔ اب اُسے منزل سے ہی اٹھایا اور واپس لایا جا سکتا ہے۔“

”تو کیا وہ...؟“
”ہاں دوست۔“ وہ دھیرے سے بولا۔ ”لو کی خطرے کے پیش نظر کراچی کے لیے روانہ کر دی گئی ہے۔“

”سفر کا ذریعہ؟“ میرے حلق سے سفاک غراہٹ ابھری۔
”تو کیا تم...؟“
”میں نے سفر کا ذریعہ پوچھا ہے۔“ میں نے کوڑک کر کہا۔
”اگے میری فتمے داری ہوگی۔“

”سوری دیری سوری دوست یہ وہ مہذرت خواہد
لےجے میں بولا۔

”کواس نہیں“ میرا دماغ بھک سے اڑ گیا تھا۔ میں
اچھل کر اُس پر چھٹا اور اُس نے جھکائی دے کر چہرہ ہچکایا
اور میرے پیٹ پر سیدھی ہک ماری میرے گھٹنے پہلے
بیجان ہونے، پھر دہرے ہوتے چلے گئے۔ پیٹ کے اندر
جیسے کوئی آتش گیر مادہ دھماکے سے پھٹ گیا تھا، پوٹ سے
کہیں زیادہ مدد اور درد اُس شرمندگی کا تھا، ایک ہلکی سی
ضرب نے میری رُوح کو گھائل کر دیا تھا۔ حیرت سے میری
آنکھیں پھٹ سی گئیں اور زبان مفلوج ہو گئی۔ وہ ضرب
میرے تجربے میں حیرت ناک اضافہ ہی تھی، بالکل ہلکی سی
ضرب نے مجھ جیسے سخت جان کو گھٹنے ٹیکنے پر مجبور کر دیا تھا۔
جانسن بلاشبہ ماہر کھلاڑی تھا۔

میری کھلی آنکھیں دیکھ رہی تھیں، جانسن میرا شانہ
تھپ تھپا رہا تھا، پھر میں نے اُس کی کنبی پر ریو اور
کی نال بھی تھپی دیکھی تب ہی میرے اندر دُوبی ہوئی آواز
ایک چیخ بن کر ابھری تھی۔ پیچھے ہٹ جاؤ ہارون، میری
دہاڑ سن کر نال غائب ہو گئی تھی۔

”مجھے افسوس نہیں خرم سلطان! جب میں نے سر جھٹک
کر اُٹھنا چاہا تو جانسن نے مجھے سہارا دینے ہوئے کہا: ”میں
نے اپنا حق استعمال کیا ہے اور مجھے کو سرزنش کی ہے۔
بیٹھ جاؤ اور میری مجبوری سمجھنے کی کوشش کرو۔ میں نے اُسے
صرف حکم دیا تھا کہ فی الفور لڑکی کو کراچی پہنچا دیا جائے۔ میں
نے اُسے ذریعہ بتایا نہ اُس نے کوئی سوال کیا تھا۔ دراصل
ہمارے ہاں صرف حکم سنا جاتا ہے۔ حکم سن کر سوال کرنے
والی زبان کو کاٹ دیا جاتا ہے۔ لہذا ہمارے ماتحت صرف
حکم سننے ہیں اور تعمیل کرتے ہیں۔“

”تم بھی سن لو جانسن! میری آواز میں شکستگی نمایاں
تھی۔ جب تک لڑکی میرے حوالے نہیں کی جاتی، میں کسی
فیصلے کو زبان نہیں دوں گا، اگر تم یہ چاہتے ہو کہ لڑکی کو زیر
حراست رکھ کر مجھ سے کچھ متواو گئے تو یہ تمہاری خوش فہمی
ہوگی۔ لڑکی میرے پاس امانت تھی اور ہم لوگ جتنے اچھے
این ہوتے ہیں، وہ تم بھی جانتے ہو۔“

”ابھی بہت کچھ ہمارے درمیان ہے پیارے بہت
کچھ۔ وہ معنی خیز لہجے میں بولا۔

”میرا جواب تم سن چکے ہو، میں نے ناگوار آواز میں کہا۔
اُسی وقت دستک ہوئی تو آواز میرے اندر گھٹ کر رہ گئی،
پھر ویٹر جانسن کی اجازت پر ناشتے کے ساتھ داخل ہوا
اور جانسن نے ہارون کو قریب آنے کا اشارہ کیا۔

”اُس عورت کا بھی تعقیب ہو جانا چاہیے۔“ وہ بیٹکے جائے
ہی جانسن بولا۔ وہ ملک نواز کی جانشینی کے خواب دیکھ رہی
ہے، اگر وہ اہل ہوتی تو ہم خاموشی سے توثیق کر دیتے، بلکہ
اُس سے پورا تعاون کیا جاتا، لیکن وہ ایک عیاش عورت
ہے اور پورے ملک میں بکھرے ہوئے بزنس اور نوٹے
ہوئے گروہ کو سنبھالنے کی اہل نہیں ہے۔ دوسری وجہ یہی
ہے۔ وہ نجی محفلوں میں مافیا کو برا بھلا کہتی رہی ہے، وہ
خود کو محبت وطن سمجھتی ہے۔ ہم ایسی کمزور اور مخالف نظریات
رکھنے والی عورت کے ماتحتوں میں اپنے مفادات نہیں
سونپ سکتے۔“

”میرے نزدیک اُس کی اہمیت پلاسٹک کی گڑیا
جیسی ہے۔ میں نے سلاش پر جام نکاتے ہوئے بتایا۔ میں
اپنی انرجی گڑیوں پر ضائع نہیں کروں گا۔“
”ہاں گویا“ جانسن بولا۔ ”ریشمی اور نازک سی گڑیا۔
سنو خرم سلطان! وہ گڑیا مجھے چاہیے۔ میں ایسی گڑیوں سے
اپنی تنہائیوں کو رنگ اور انگ دینے کا عادی ہوں۔
ویسے اگر تم اُسے اپنے لیے رکھنا چاہو تو مجھے کوئی اعتراض
نہ ہوگا۔“

”نہیں! میں نے نوالہ چہاتے ہوئے سرنفی میں ہلایا۔
”میں گڑیوں سے دل پہلانے والا چچہ نہیں ہوں لیکن میری
کی واپسی پہلی شرط ہے۔“
”وہ تو ہوگی، لیکن کچھ ٹہلت دو گے۔“
”سنو جانسن! تم جگہ بتا دو۔ میں اُسے خود واپس ملو
لوں گا۔“

”دوستی کے بعد پیارے! وہ نرم آواز میں بولا۔
”فی الحال نہیں۔ ہاں میں ناشتے کے بعد پیغام دے دوں گا۔
یونہی وہ پیچھے گی واپس کر دی جائے گی۔“ ابھی وہ اپنی
بات مکمل بھی نہ کر پایا تھا کہ ٹیلی فون کی گھنٹی گنگنائے گئی وہ
وہ اپنی بات اور سوری چھوڑ کر اندر چلا گیا۔

”باگڑ بلا ہے! ہارون نے سرگوشیاں آواز میں کہا۔
”ہاں! میں نے اثبات میں گردن ہلائی۔ لیکن اس

بلرچو ہے اُسے نیا تجربہ دیں گے۔“
”اچھا فائبر بھی ہے۔“

”ہم اس سے یہ فن بھی حاصل کریں گے دوست۔“
”خرم سلطان! جانسن نے آواز دی۔ ”تمہارے لیے
کال ہے۔“

میں بیک کر اُٹھا اور لائے لائے ڈگ بھرتا ہوا بیڈ روم
میں داخل ہوا۔ جانسن نے میری جانب ریسیور بڑھا دیا۔
”اکبر خان ہوں چیف۔“ دوسری جانب سے اکبر خان
کی مانوس آواز گونجی۔ ”آپ نے مجھے کیا ہدایت دی تھی؟“
”کیا مہمان جانا چاہتے ہیں؟“
”جی ہاں! اکبر نے میری آواز پہچان کر بتایا۔ ”دونوں جا
رہی ہیں۔“
”دونوں کون؟“

”مادام اور رشیدہ کے ساتھ آنے والی! اکبر نے جواب
دیا۔ ”اُن کے کہنے پر میں نے آدمی ٹیکسی کے لیے بھیج دیا ہے،
مگر وہ اُس وقت ٹیکسی لائے گا، جب اُسے میری طرف سے
اشارہ ملے گا۔“

”ٹیکس آ رہا ہوں! میں نے بے پروائی کا مظاہرہ
کرتے ہوئے ریسیور رکھ دیا۔ ”میرے مہمان واپس جانا چاہتے
ہیں! انہیں خدا حافظ کہنے جا رہا ہوں۔“

”میں تمہیں روکوں گا نہیں دوست! جانسن میرے
ساتھ چل پڑا۔ ظاہر ہے ناشتے سے مہمانوں کو خدا حافظ کہنا
زیادہ ضروری ہے۔ وہ کارڈ ور کے سرے تک ہمارے
ساتھ آیا، پھر باری باری دونوں سے ہاتھ ملا کر اُس نے بلند
آواز سے گڈ بائی کہا اور واپس پلٹ گیا تھا۔

ایک موقع پریشانی لاحق ہو گئی۔ مادام کو روک کر میں
مستقبل کے منصوبے کا شیرازہ بکھیرنے کا رسک نہیں لے
سکتا تھا۔ وہ عورت جیسے بہانوں سے پہلنے والی بھی نہ تھی،
جبر کا مطلب تھا صرف مادام شہناز، جب کہ میں اُس
خوش رنگ تیریری کی آواز اور خوشبو کے جال میں اندھیرے
کے جنگل میں چھپے اور بکھرے ہوئے موٹے تازے تیتروں
کا شکار کرنے کا منصوبہ ترتیب دے چکا تھا۔

”تم جی پی، او کے سامنے اتر جاؤ گے ہارون! میں نے
کہا۔ ”پھر ٹیکسی میں ہوٹل کے سامنے انتظار کرو گے۔“ مادام
شہناز شاید بدگ گئی ہے، وہ اپنی سیکرٹری کے ساتھ اُڑنا

چاہتی ہے، اگر وہ لاہور کے لیے روانہ ہو رہی ہے تو پھر اُسے
جانے دیں گے اور اگر پٹنئی اسلام آباد میں کسی جگہ جا رہی ہے
تو تم نگرانی کرو گے۔“

اُس نے کارپس اسٹاپ پر روک دی اور خاموشی
سے اتر گیا۔ میں نے اسٹیننگ وکیل سنبھالا اور ٹریفک میں
شامل ہو گیا۔ میرا ذہن بہت الجھا ہوا تھا، میں محسوس کر رہا
تھا کہ ہٹلر کی طرح میں نے بھی غلط منصوبہ بندی کرتے ہوئے
ایک وقت کئی محاذ کھول لیے ہیں، لیکن میں کیا کرتا ہوں جس
محاذ کو ذیل دیتا وہی ہاتھ سے نکل جاتا۔ علی رضا کو نظر انداز
کرنا تو وہ قبل از وقت میرا چہرہ بے نقاب کر کے مادام
شہناز، نواز شس اور جانسن کو ہوشیار کر دیتا، پھر وہ
سامنے مل کر میرے خلاف متحدہ محاذ قائم کر لیتے۔ میں نے
اپنی دانست میں سب کو پہلے توڑا اور پھر اُن کو ایک
دوسرے سے بدظن اور دور کر دیا تھا۔

میں پارکنگ شیلڈ سے متوازی قدم اُٹھاتا ہوا اندر
گیا، اگر مادام شہناز کا فونٹر پھر ہوتی تو مجھے غمگینت میں دیکھ
کر کچھ بھی سوچ سکتی تھی۔ میں اُسے یہ تاثر نہیں دینا چاہتا تھا
کہ میں اُس کی روانگی کی اطلاع پاکر دوڑتا ہوا آیا ہوں،
لیکن کا فونٹر پھر صرف اکبر خان ہی تھا، میں نے اندر داخل ہو
کر دائیں بائیں دیکھا، ہال میں گا ہک ہی تھے اور ویٹرشینی
انداز میں متحرک تھے۔

”وہ اوپر ہی ہیں! اکبر خان نے مجھے بدحواس دیکھ کر
بتایا۔ روانگی کی اطلاع دینے سے قبل مادام نے علی رضا
اور لیاقت خان کو ٹیلی فون کیا تھا، وہ خود نیچے آئی تھی اور
اُس نے مجھے آفس میں جانے سے روک دیا تھا۔ لیاقت خان
کی باتیں سن کر اُس کے چہرے کا رنگ ایک دم بدل گیا
اور اُس کی آنکھوں خوف سے پھیل گئی تھیں۔“

”کیا تم نے لیاقت خان کا منہ ذہن نشین کر لیا تھا؟“
”جی ہاں چیف! اُس نے ایک چٹ میرے سامنے
رکھ دی، چٹ اٹھا کر میں نے جیب میں رکھ لی اور منبر
داخل کرنے لگا۔

”ہلو...“ آواز ایسی تھی جیسے کتا بھونکا ہو۔ ”ہلو کون ہے؟“
”مادام کا ایک وفادار! میں نے گھٹی گھٹی آواز میں کہا۔
”مادام کا تعاقب ہو رہا ہے۔“
”تم بھی اُس کے ساتھ جہنم میں کیوں نہیں چلے گئے؟“

وہ دھاڑنے لگا یہ اُسے میں نے محتاط رہنے کا مشورہ دیا تھا۔
وہ اپنے ساتھ میری گردن بھی گھولنے لگی۔
”خطرہ کیا ہے جناب؟“ میں نے بازدارانہ لہجے میں پوچھا
”مادام بے حد گھبرائی ہوئی...“
”تم کہاں سے بول رہے ہو؟“
”مم... میں... ایک بوتھ سے بول رہا ہوں۔“
”بلکواس؟“ اُس نے فوراً سلسلہ توڑ دیا۔
”میں نے گہری سانس لی۔ مچھلی کا ناسٹونگھ کرتہ میں چلی
گئی تھی پھر علی رضا کا نمبر ڈائل کیا۔
”جی فرمائیے؟“ شیش میں اور ترنم ریزہ آواز ابھری۔
”میں نواز شش بول رہا ہوں، بس...“
”میں سیگم علی ہوں۔“
”اوہ... السلام علیکم بھائی، علی کہاں ہیں؟“
”وہ آفس کے لیے تیار ہو رہے ہیں۔ ہولڈ کیجیے۔“
”ہیلو علی اسپیکنگ؟“ ایک منٹ بعد علی کی مائوس
آواز سنائی دی۔
”السلام علیکم سر... نام کی ضرورت تو نہیں۔“
”نہیں تمہا ت کرو۔“
”یہ لیاقت خان کون ذات شریف ہیں؟“
”سنو لڑکے؟“ وہ غرایا۔ ”آہستہ آہستہ، کیا سمجھے؟ تیز چلو
گے تو زیر دام پرندے بھی اُڑنے لگیں گے۔ صرف مجھ تک
ہی محدود رہو۔“
”آپ خود مجھے پھیلا رہے ہیں سر۔“ میں نے چُھتی سی
آواز میں کہا۔
”کیا مطلب؟“
”ابھی چند منٹ قبل لیاقت نے مادام کو شاید بتا دیا
ہے کہ اُس کا میزبان کون ہے؟“
”لیاقت کے اپنے بھی ذرائع ہیں برہنہ دار۔“
”میں یقین کر لوں، آپ نے اُسے میرا نام نہیں بتایا؟“
”میں پاگل نہیں ہوں۔“
”تذکرہ سر۔“ پھر ملاقات کب ہوگی؟“
”شاہ کو کسی وقت کال کر لینا؟“ اُس نے بھی کھٹ سے
سلسلہ منقطع کر دیا تھا۔
ایڈیل سمجھنے کی آواز سن کر میں نے گردن موڑ کر دیکھا
مادام شبناز سنبھل سنبھل کر سیڑھیاں اتر رہی تھی۔ اُس

کے پیچھے سمیرا سسکڑی بھی ہوئی اتر ہی تھی۔ تم فوراً اُپر جاؤ اور رشیدہ کو دیکھو۔ میرا ماتھا ٹھنکنے لگا۔ اکبر خان سر کو خم دیتا ہوا کاؤنٹر سے نکل گیا، لیکن شہناز نے اُسے دوسری میٹھی پر ہی روک لیا تھا۔

اکبر خان کی نگاہوں کا تعاقب کرتی ہوئی اُس کی نگاہ ٹوٹی ہوئی مجھ پر پڑی۔ وہ بد بدلتی ہوئی میرے قریب چلی آئی میں نے ہاتھ سینے پر باندھے اور گردن جھکا کر اُسے تعظیم دی۔

”میں رات بہت دیر سے واپس آیا تھا، آپ کو ڈسٹرب کرنے کی جسارت نہ کر سکا“

”کوئی بات نہیں باہر! اُس نے خود کو سیٹ کر سنبھالتے ہوئے خوش دلی کا مظاہرہ کیا۔ اچھا ہوا ملاقات ہو گئی۔ میں نواز کے کچھ دوستوں سے ملنے جا رہی ہوں“

”ضرور جائیے مادام“ میں نے مؤدب انداز میں جواب دیا۔ لیکن اس یقین کے ساتھ نہیں کہ وہ اب بھی نواز کے دوست... اور آپ کے وفادار ہیں۔“

”وہی تو اُزمانے جا رہی ہوں“ وہ میرے اور قریب ہو گئی۔ اتنی قریب کہ اُس کے سر پاکی مہکتی حدت سے میرا جسم سرسرنے لگا تھا۔ ہمیں ان ہی لوگوں میں سے چھانٹی کر کے اپنے لیے نئی فورس قائم کرنی ہو گئی“

”میں ساتھ چلوں مادام!“

”نہیں میں ٹیکسی کے ذریعے جاؤں گی، میرے ساتھ سمیرا ہوگی۔“

”واپسی کب تک ہوگی؟“

”میں اپنے لیے نئی قیام گاہ تلاش کروں گی۔ ہوٹل ہم جیسے لوگوں کے لیے موزوں جگہ نہیں۔“

”جیسے آپ کی مرضی مادام۔“

”تم حاضر رہنا، میں کسی بھی وقت واپس آ سکتی ہوں یا تمہیں کال کر سکتی ہوں!“

اُسی لمحے ویڑنے ادب کے ساتھ قریب آ کر اطلاع دی کہ ٹیکسی باہر کھڑی ہے۔ مادام نے چہرہ ٹھٹھا کر سمیرا کو چلنے کا اشارہ کیا اور سمیرا نے گزرتے گزرتے ایک ٹوٹی کاؤنٹر پر اُچھالی جو اُبھکتی ہوئی اندر جا گری۔ مادام نے پلٹ کر دیکھا اور نہیں ہڑبڑاتا ہوا اُس کے پیچھے چل پڑا۔ اُن کو ٹیکسی میں بٹھا کر میں نے دروازہ بند کیا اور ہاتھ اُٹھا کر سلام دیا۔ مادام نے بھی جواباً ہاتھ اُٹھا کر سلام کا جواب دیا تھا اور

واپس جا کر سمیرا کا پیغام تلاش کیا۔ سو روپے کے نوٹ پر پیغام تحریر کیا گیا تھا۔ یقیناً اسے کاغذ نہ ملا ہوگا، یا اس نے ہاتھ روم میں بند ہو کر لکھا ہوگا۔

”ڈیئر بابرا!

اگر مادام کو بھر تک لانا تھا تو پھر مجھے کہیں اپنے ساتھ لائے ہو۔ مادام کا رویہ اچانک ہی بدل گیا ہے۔ وہ جانشن سے کوئی معاہدہ کرنے جا رہی ہے اور مجھے ساتھ لے جانا چاہتی ہے۔ میں کوشش کر رہی ہوں گی، تمہیں ہر بات سے آگاہ رکھا جائے گا۔ میں اب صرف تمہارے ساتھ وابستہ رہنا چاہتی ہوں۔ پلیز... میری حفاظت کا خیال رکھنا۔“

سمیرا کی تحریر نے ایک خدشے کو کسی قدر کم کر دیا تھا۔ مادام شہنشاہ اپنے کسی منصوبے پر ہی عمل کرنے لگی ہوگی، اس سے میری اصلیت معلوم ہو چکی ہوتی تو وہ اپنی سیکرٹری کو بھی خطرے سے آگاہ کر دیتی۔ اکبر خان نے اگر بتایا کہ رشیدہ غیریت پس مگر ملنا چاہتی ہیں۔ میں اوپر گیا تو اسے دروازے پر ہی اپنا منتظر پایا۔

”وہ چلی گئیں؟“ اس نے لرزتی آواز سے پوچھا۔ ”تم نے بول جانے دیا ہے خرم؟“

”اس لیے جان کہ میں چاہتا ہوں کہ وہ کانٹاپیٹ میں لیے سمندر میں تیرتی پھرے اور جب تھک جائے تو میرے قاتل پر آکر ٹرے اور تھنڈی ہو جائے۔“

”مجھے یقین ہے کہ وہ میرے ساتھ چلتے ہوئے بولی۔“

”ہاں، مگر تم نے خرم۔ وہ اب واپس نہیں آئے گی۔“

”کہاں جائے گی؟“ میں صوفے پر بیٹھ گیا اور رشیدہ بھی اسے ساتھ لگ کر بیٹھ گئی۔ ”جانشن میری منہ می میں بند ہے۔“

”رنا ٹوٹ چکا ہے اور نواز شش ہلاک کر دیا گیا ہے،“

”ہاں پائل رکھے گئے؟“

”اوہ...“ وہ چونک کر بولی۔ ”تو تم نے سب کو اتنی جلدی توڑ لیا ہے؟“

”اگر وہ میری پناہ میں رہتی تو میں اس کی ایک خوبی سے اسے معاف کر دیتا۔ وہ بُری ہونے کے باوجود وطن کی وفادار ہے۔ جانشن سے دور رہنے کی یہی وجہ ہے۔ ایسے لوگ جن کے دل میں وطن کی محبت ہوتی ہے۔“

وہ روشنی کی ایک کرن کے محتاج ہوتے ہیں۔ میں وہی کرن اُسے دیتا۔“

”اگر وہ واپس نہ آئی تو...؟“

”اگر اُس نے متصادم پالیسی اختیار نہ کی تو میں اُسے ایپورٹ ایکسپورٹ کی حد تک نہیں چھیڑوں گا۔“

”نواز شمس کو...؟“

”ہم دونوں نے ویس نے اُس کی بات پوری کرتے ہوئے کل شام کی کارروائی بتائی۔“

”پھر وہ پاگل عورت چلی گئی، رشیدہ بولی۔ جب کہ اُسے معلوم ہو چکا ہے کہ ملک نواز کے ساتھی وفاداری بدل چکے ہیں۔“

”کچھ سوچ کر ہی گئی ہوگی۔“ میں نے اُسٹے ہونے بتایا۔

”تم اسینہ کے پاس چلی جاؤ۔“

”ٹیڈی چلے گئے ہیں۔“ رشیدہ نے بتایا۔ ”کیا تمہیں نہیں معلوم؟“ میں نے نفی میں سر ہلایا اور باہر نکل آیا۔

رشیدہ بھی میرے ساتھ ہی نکل آئی تھی۔ میں اپنے کمرے میں گیا اور تختوں سمیت بیڈ پریٹ کر اٹکھیں موند لیں۔ رشیدہ کے گرم اور گداز ہاتھ کالمس پیشانی پر طمانیت اور سکون کے خوشبودار اٹکے دینے لگا۔ وہ ہولے ہولے میرا سر دبانے لگی تھی۔ میرے بہن میں دن بھر کی مصروفیات گردش کر رہی تھیں۔ جاسن سے چرملاقات کا کوئی جواز نہ تھا۔ ضرورت، جب تک شینہ کی دلچسپی ہوتی میں مذاکرات کو آگے بڑھانے کے حق میں نہیں تھا۔ میں شک کر کوئی معاہدہ یا وعدہ نہیں کرنا چاہتا تھا۔ جب کہ شینہ کی نیابتی تک میری پوزیشن بے حد کمزور تھی۔ علی رضوانے شام کا وقت دیا تھا اور مادام شہناز میرے ہاتھوں سے پچسل کر پھر ہرے پانی میں چلی گئی تھی۔ ہارون اُس کے تعاقب میں تھا۔ دن بھر مجھے بے کار ہی رہنا تھا۔ لہذا میں نے مگر جانے کا فیصلہ کر لیا۔

”سجانی جان۔“ رشیدہ کی پیار بھری آواز شنائی دی۔

”اول۔“ سرور کی رسے میری آواز بھرائی۔

”آپ کچھ دن آرام کیوں نہیں کرتے۔ یہاں نہیں ادھر میں پھر رہی ہوں تنگ آپ کے چہرے تک آگئی ہے۔“

”ہاں، جان برادر۔“ میں نے اس کا ہاتھ تھام کر آنکھوں سے آنسو دھوئے کہا۔ ”میں واقعی تنگ گیا ہوں مگر آرام جس پر نہیں قائم ہے وہ میری زندگی کی شاخ سے اڑ گیا ہے۔ اگر ہارون مارا نہ دے تو میں کسی بھی موڑ پر لڑھکھڑا سکتا ہوں۔ وہ شخص میری

توقعات سے بڑھ کر کام کر رہا ہے۔ میں یہاں بیٹا ہوا ہوں اور وہ مادام کا تعاقب کر رہا ہے۔

"ہم سب آپ کو زیادہ سے زیادہ آرام دینا چاہتے ہیں۔ وہ بتانے لگی۔ میں نے ہارون سے کہا تھا کہ خرم بھائی مشین بن گئے ہیں ان کے پاس اپنی ذات، اپنے گھر اور اپنے چاہنے والوں کے لیے فرصت کا ایک لمحہ بھی نہیں۔ دیکھیے بھائی جان آپ سربراہ ہیں۔ جس طرح گروہ کا جیت صرف ذہن استعمال کرتا ہے اور فیملی میں اس کے ماتحت کام کرتے ہیں آپ بھی اپنا ہیڈ کوارٹر قائم کریں اور فرائض ماتحتوں میں تقسیم کر دیں یہی دنیا کے تمام اداروں کا اصول ہے۔"

"میں ایسا ضرور کر دوں گا۔ اس وقت جیب میں پاور چپ ضرورت ہوگی۔ فی الحال بیگین، ہارون اور تم ہوا اور کام خطرناک ہی نہیں بلکہ تین محاذوں پر پھیل گیا ہے۔ پھر میرا طریقہ کار گروہ کے سربراہوں سے مختلف ہے۔ وہ سوچتے ہیں پلاننگ کرتے ہیں اور شکار پر اپنے شکاری چھوڑ دیتے ہیں۔ جب کہ میں شکار کے کانوں میں دوستی کے گیت ڈالتا ہوں۔ اس لیے میں دھڑل پر انحصار نہیں کرتا۔"

"آپ کب تک تہنادر وڑیں گے میرے بھائی؟ رشیدہ کی آواز سب نے سنی تھی۔ آپ کی سلامتی کم از کم تین لوگوں کی ضمانت ہے۔ دوسرے لوگ آپ کی کمی صرف محسوس کریں گے جب کہ ہم آپ کے سامنے سے نکل کر مل جائیں گی۔"

"اللہ کی مدد مانگا کرو رشیدہ، وہی بچانے والا ہے۔"

"آپ کے لیے کال ہے چیف، اکبر خان نے باہر سے بتایا۔ کافر نے چونکہ ادائیگی کرنے والے کھڑے تھے اس لیے میں آفس میں چلا گیا۔ اکبر خان نے لائن دی تو میں نے نرم اور شائستہ آواز میں کہا۔

"جی فرمائیے۔"

"کیا میں خرم چوہدری سے مخاطب ہوں؟ وہ آواز اور لہجہ میرے لیے اجنبی ہی تھی۔

"جی ہاں، میں خرم چوہدری ہی بول رہا ہوں۔"

"میں ریٹائرڈ کیپٹن غلام سرور چوہدری بول رہا ہوں۔ کبھی نام نہاد میرا۔"

"خرم جناب، میں نے معذرت طلب کی ہے میں جواب دیا۔ یہ میری بد نصیبی ہے۔ پہلی بار سن رہا ہوں؟"

"سنو بہر دور۔ وہ حکمانہ انداز میں بولا۔ میں فاروق اور

منظر کا ماحول ہوں اور تم سے ملنا چاہتا ہوں۔"

میں نے دانتوں پر دانت جھکا کر اندر سے اٹھنے والی زوردار دباؤ کو کچل دیا تھا۔ دونوں نام میرے لیے ہم کے فیوض تھے لیکن میں سرور چوہدری کو دیکھنا چاہتا تھا۔ اسے قریب آنے کا موقع دینا چاہتا تھا۔ اگر میں بھی کی طرح پھٹ جاتا تو وہ قہقہہ لگا کر چند باتیں اور سنا دیتا اور پھر بھی میرے سامنے نہ آتا۔

"میں جانتا ہوں عزیزم، جب اسے کوئی جواب نہ ملتا تو وہ فوجی ہوئی آواز میں بولنے لگا۔ مجھے تمہارے جذبات واضح تھے۔ کامیاب پورا احساس ہے لیکن میں تمہیں جانا چاہتا ہوں کہ آگ ہم سب کو کاٹے ہوئے ہیں اور روٹیاں دوسرے لوگ پکارتے ہیں۔"

"ٹھیک ہے کیپٹن، آپ جانتے ہیں میں کہاں ہوں چلے آئیں، میں نے جسم کی ہر تھڑا ہٹ پر قابو پاتے ہوئے کہا۔ اگر۔۔۔ نہیں۔۔۔ وہ پرجوش آواز میں بول پڑا۔ اب اگر مگر کی کوئی گنجائش نہیں رہی۔ میں دونوں خانہ دلوں کی بہتری کے لیے آگ کے ساتھ سمندر بھی عبور کر سکتا ہوں۔ اقول تو میں ڈرنے والا نہیں ہوں۔ میں جنگ عظیم دوم کے دوران چھ ماہ برما کے جنگلوں میں تنہا سہکتا رہا ہوں۔ اگر کوئی خطرہ ہوتا تو مجھے میں غل میں نہ لاتا۔ تم جس بلب کے بیٹے ہو اسے میں جانتا ہوں۔ کم از کم تم اس کے نام اور خون کا احترام ضرور کرو گے۔"

"میں منتظر ہوں گا چوہدری صاحب، میں بولا۔ اس نے ٹھیکہ ادا کر کے سلسلہ منقطع کر دیا۔ میں نے ریمپور رکھ کر اکبر خان کو دیگر بیانات کے ساتھ جانے کی بھی ہدایت دی اور ریلوے جیب سے نکال کر آستین کی مخصوص جیب میں لٹکا دیا۔ کیپٹن سرور چوہدری کے ساتھ کوئی طوفان بھی اندر آ سکتا تھا اسی لمحے میری نگاہوں میں زینت کا جھینگا ہوا چہرہ، ابا جان کی خون آلود لاش، اکبر بھائی کا جلا ہوا جسم اور اماں بی کا ملول چہرہ گھومنے لگا۔ ہر چہرے پر ایک ہی سوال تھا۔ وہی سوال جو اتر پورٹ پر قدم رکھتے ہی استقبال کرنے والے اجنبی لوگوں کے درمیان سے نکل کر میرے سامنے آن کھڑا ہوا تھا اور جواب میں میں نے اسی رات خونی ڈراما کھیل لیا تھا۔

کیا واقعی زینت کی عزت کا دیدہ وامن، چھینے ہوئے شہناگ، اور خون میں نہانے ہوئے اماں کا کوئی نعم البدل اور کوئی معاوضہ تھا۔ جو معاوضہ اور نعم البدل گاؤں کے بڑوں نے تجویز کیا تھا۔ وہ میں قبول کر کے زندہ رہنے کا حق دار تھا بلکہ میں اسے والی نسل وہ داغ جو حکم مادر اور خون پدر سے آئے

منا وہ کسی پانی کسی صابن سے صاف ہو سکتا تھا۔ کیا زینت اتنی ہی خاموشی سے بزرگوں کا فیصلہ قبول کر سکتی جتنی خاموشی سے اس نے اماں بی کے حکم کی تعمیل کی تھی۔ سوال ایک تھا لیکن وہ کئی صفحات پر پھیلا ہوا تھا اور ہر جزو اپنی جگہ ایک مشکل سوال تھا۔

قدموں کی چاپ سن کر میں نے چہرہ گھمایا۔ اکبر خان کے ساتھ ایک طویل قلمت شخص گردن اٹھانے فوجی انداز میں قدم اٹھاتا ہوا آ رہا تھا۔ وہ ڈیل ڈول اور چال ہی سے مضبوطی سے روکھائی دے رہا تھا۔

"السلام علیکم۔ وہ دروازے سے داخل ہوتے ہی کھٹک دار آواز میں بولا۔ میں نے اٹھ کر بغیر مسکرائے اپنے ہاتھ کو آگے بڑھا دیا۔ اکبر خان دروازہ بند کر کے پیچھے ہٹ گیا تھا۔ میں بھی صورت آشنا نہیں ہوں۔ حالانکہ میں نے ایک دفتر تمہیں کبھی دیکھا تھا۔"

"تشریف رکھئے۔ میں نے سپاٹ لیجے میں کرسی کی طرف اشارہ کیا۔ وقت بہت کچھ بدل دیتا ہے۔ وہ اس ختم چھدی کو کیسے پہچانتا جس نے اپنے چہرے پر بار بار کام مصنوعی چہرہ سما دیا تھا۔"

"ہاں وقت۔ وہ کرسی پر بڑے ٹھہرے اور پڑے وقار انداز میں ٹھک کر بڑبڑایا۔ لیکن داناؤں کا قول ہے کہ وقت کو سوار نہیں بلکہ سواری بنایا جانے۔"

"دانا پہلے زمانوں میں ابھی ابھی باتیں کر کے چلے گئے ہیں چوہدری صاحب، میں نے اس کی روشن آنکھوں میں جھانک کر کہا۔ یہ دور دوسرا ہے۔"

"ہاں دوسرا اور ناخالص۔ وہ گہری سانس لے کر کرسی کی پشت گاہ سے ٹپک گیا۔ کچھ پوچھو گے چوہدری؟"

"نہیں۔ میں ضبط کے باوجود بکھرے لگا۔ سوال و جواب کا وقت بہت پیچھے رہ گیا ہے۔"

"جو کچھ بچا ہے اسے تو ہم بچا سکتے ہیں۔"

"میرے پاس تو کچھ بھی نہیں بچا کیپٹن، کچھ بھی نہیں۔"

"ایک شخص کی غلطی کی سزا دو خانہ دلوں کے بے شہد افراد کو نہیں ملنی چاہیے۔ وہ آگے جھک کر صالخانہ لہجے میں بولا۔ ہمارا دین معفو و درگزر کو پسند فرماتا ہے۔ جو ایسا نہ کرے اس کے لیے اسلام نے انتخاب بھی رکھ لیے، آٹھک کے بدلے آٹھک۔ بیٹی فاندان کی عزت کی علامت ہوتی ہے۔ تمہاری بہن

کی عزت کے بدلے مظلوم چوہدری اپنی بہن دیشہ پر تیار ہے۔ کیا یہ دین کی رو سے بہتر فیصلہ نہیں چوہدری؟"

"کیا مجھے مظلوم چوہدری کی بہن کو گھسیٹ کر لانے کی اجازت ہوگی کیپٹن؟"

"جب اسے تمہارے قدموں میں ڈال دیا جائے گا تو یہ تم پر منحصر ہوگا خرم چوہدری کہ تم اسے ایک مرد کی طرح گھر لاؤ یا درندے کی مانند گھسیٹ لے جاؤ۔"

"کیا یہ فیصلہ غیر مشروط ہے چوہدری؟"

"نہیں۔ کیپٹن سرور بولا۔ ہم اپنی عزت کو اپنی بنیاد میں لینا چاہیں گے۔"

"سنو چوہدری، میں نے کڑک کر کہا۔ اگر تم جہان نہ دیتے تو میں اپنا جواب تمہارے جسم میں چھپنی جتنے سوراخوں کی صورت میں دیتا، چلے جاؤ۔"

"دیکھنے کی کوشش کرو خرم سلطان، وہ کمال ضبط کا مظاہر کر رہا تھا۔ کچھ حادثے جان لیا ہوتے ہیں۔ لواحقین رو دھو کر چُپ ہو جاتے ہیں۔ کچھ حادثے بالکل بے ضرر ہوتے ہیں اور کچھ ایسے ہوتے ہیں کہ ان کے اثرات بعد میں رونما ہوتے ہیں۔ تم بچے نہیں ہو۔ دونوں گاؤں جانتے ہیں کل کیا جواب دو گے۔ اس بیٹے۔۔۔"

"خاموش۔ میرے حلق سے دباؤ ابھری اور دوسرے لمحے چوہدری سرور کا گریبان میرے ہاتھ میں تھا اور پھر میں نے اسے اوپر اٹھایا۔ پھر نہ جانے مجھے کیا ہوا تھا۔ میں اسے چھوڑ کر دونوں ہاتھوں سے چہرہ چھپا کر رو پڑا تھا۔"

"سب ٹھیک۔۔۔ اس نے جونہی میرے شانے پر ہاتھ رکھا، میں چھٹکارا ہوا مٹرا اور چوہدری ہاتھ کی ضرب کھا کر میرے ٹکڑا ہوا فرش پر ہاتھوں اور گھٹنوں کے بل اونڈھا ہو گیا۔ میری دہائیں کرا گئے لمحے اکبر خان اندر آ گیا۔"

"اسے باہر چھوڑ دو اکبر خان، اکبر خان نے اسے گردن سے پکڑ کر اٹھایا۔ اس سے قبل کہ وہ اسے گھسیٹ کر لے جاتا اس نے ہاتھ اٹھا کر اسے روک دیا۔"

"راستہ چھوڑ دو لڑکے، میں خود چلا جاؤں گا۔ اکبر نے میری جانب دیکھا اور میرا اشارہ پا کر ایک طرف ہٹ گیا۔ میں غیر مشروط پیش کش کے بارے میں ان سے بات کروان کا فہم میں صرف اس آگ کو بچانا چاہتا ہوں۔ جو اب میں اسے خونخوار نگاہوں سے گھورنے لگا اور وہ خلا حافظ کہتا ہوا باہر نکل

گیا تھا۔

”یہ کون ہے چیف؟“ اکبر خان نے رویا اور جیب میں رکھ کر پوچھا۔
”کسی کا پیغام نہ تھا اکبر خان“ میں نے بتایا یہ اسی لیے ٹریاں بچا کر لے گیا ہے۔“

غلام سرور چوہدری نے مجھے ہلا کر رکھ دیا تھا۔ اُس نے بات کا پانچ ایسا مالا تھا کہ روح بھی چیخ اٹھی تھی۔ میرے اندر دبا ہوا دکھتا احساس جگا گیا تھا جسے میں نے اپنی بے پناہ مصروفیات میں دفن کر رکھا تھا۔ اُس نے ٹھیک ہی کہا تھا۔ کل برادری اور چاروں گاؤں کے لوگ نوزائیدہ بچے کی ولدیت کے خانے میں کس کا نام پڑھیں گے۔ کیا اکرم چوہدری کا نام اس خانے میں لکھا جائے گا۔ اگر نہیں تو زینت کس کے بچے کو دو وہ پلے گی۔

کلانی پر ہلکا سا دباؤ تھا تو میں سوچوں کی دہکتی وادی سے نکل آیا۔ واج ٹرانسمیٹر کا نچا سا بلب اسپارک کر رہا تھا۔ میں نے چابی باہر نکال کر کلانی موڑی۔

”ایلو چیف، ایلو چیف، ہارون کا لنگ۔ مادام جانسن کی کوٹھی میں پولیس دیکھ کر آگے نکل گئی ہے۔“

”تعاقب جاری رکھو اور جہاں جہاں جائے پتہ نوٹ کر لینا“ اُس نے اوکے چیف کہہ کر سلسلہ منقطع کر دیا اور میں مردہ قدموں سے زینت طے کرتا ہوا رشیدہ کے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔ اُس نے بھی واج ٹرانسمیٹر پر ہارون کا پیغام سن لیا تھا۔ میں نے اُسے بتایا کہ پیغام میں بھی سس چکا ہوں۔

دن کا آغاز کچھ حوصلہ افزا نہیں ہوا تھا۔ تمام اہم معاملات تھے لیکن ہر کارندہ فانی اور پوری ہی رہی تھی۔ جانسن سے ملاقات فیصلہ کن مرحلے میں داخل ہو کر ٹوٹ گئی تھی۔ مادام شہناز جال توڑ کر نکل گئی تھی اور چوہدری غلام سرور میرے منہ پر جوتا مار گیا تھا۔ میں خود کو ایسا بے نصیب جاکي سمجھنے لگا تھا جس کا گھوڑا خشک پوائنٹ سے چند قدم دور چھو کر کھا گیا تھا۔ دونوں کی باگ دوڑ کا نتیجہ صفر ہو گیا تھا۔ جو کچھ حاصل کیا تھا دیکھتے ہی دیکھتے چھن گیا تھا۔

میں دل گرفتگی کے عالم میں تھکے تھکے قدموں سے بیڑیاں اتر رہا تھا اور رشیدہ ریڈنگ پر کہنیاں ٹپکے ہاتھوں کے پیلے میں سوگوار چہرہ لیے دیکھ رہی تھی۔ میں نے جوہزی آخری بیڑی جھبڑی ایک اسمارٹ اور خوش پوش لوجوان کاؤنٹر اسٹول سے

اُچھل کر اٹھ کھڑا ہوا اور میرا اٹھا ہوا قدم ٹھٹک کر گر گیا کیونکہ اس کی تیز نگاہوں کا ہدف میں ہی تھا۔ اکبر خان بظاہر مصروف دکھائی دے رہا تھا لیکن اُس کے اندر کی بیقراری صاف عیاں تھی۔ میں نے ایک لمحے کے لیے اگلے قدم کے بارے میں سوچا اور سر جھٹک کر آفس میں داخل ہو گیا پھر جوہزی میں نے اپنی سیٹ سنبھالی انظر کام کا شرح بلب روشن ہو گیا۔ میں نے جھجک کر ریسپور اٹھایا۔

”یہ کون ہے اکبر خان؟“ میں نے سر دہلے میں پوچھا۔
”سرکاری آفیسر ہے چیف“ اکبر خان نے سرگوشی میں بتلایا
”میں نے کارڈ دیکھ کر آپ کی موجودگی کا اعتراف کیا تھا“
اس سے قبل کہ میں کچھ پوچھتا وہ دستک دے کر فٹ سیٹ تک آ گیا۔ میں نے خشونت آمیز نگاہوں سے دیکھا جواباً اُس نے سر جھٹکا کر مسکراہٹ دی۔

”سر! آپ کے لیے سیکرٹ لیئر“ اُس نے اندر کی جیب سے سفید لٹاؤ نکال کر ادب سے ٹیبل پر رکھ دیا۔ خط کی پشت پر مرنج سیل لگی ہوئی تھی۔ پیشانی پر سرکار کی مہر اور ٹاپ سیکرٹ کے الفاظ رقم تھے۔

”سٹ ناخت“ میرے حلق سے غراہٹ اٹھی اور اُس نے نفاختی کارڈ بھی اُسی مؤہمانہ انداز میں لفافے کے اوپر رکھ دیا۔ میں نے ایک نگاہ کارڈ پر ڈالی اور سر کے اشارے سے بیٹھنے کو کہا۔ وہ شکر یہ ادا کرتا ہوا بیٹھ گیا۔ میں نے لفافہ چاک کیا۔ فل اسکیپ کا قند پر چند سطر ٹائپ تھیں۔

”آپ فی الفور خط بلا حامل کے ساتھ وزارت داخلہ میں چلے آئیں۔ دستخط وزیر داخلہ۔“

”میرے لیے کیا حکم ہے سر؟“ اُس نے مؤدب انداز میں پوچھا۔ یقیناً اُسے خط کا مضمون نہیں بتایا گیا ہوگا۔ اُس کا ہوا انداز بتا رہا تھا کہ اُسے صرف یہی بتایا گیا ہوگا کہ ایک اہم شخص کو خط پہنچانا ہے۔

”کیا آپ گاڑی لائے ہیں؟“
”نہیں سر“ اُس نے جواب دیا۔ ”مجھے عام ذرائع استعمال کرنے کا حکم دیا گیا تھا۔“

”آپ کو دو منٹ انتظار کرنا ہوگا۔“ میں نے کہا۔ ”گاؤنٹر پر چلیے۔“

میں نے اکبر خان کو ڈی۔آئی جی کا منبر ملانے کا کہا۔ میں اطلاع دینے کا پابند نہ تھا لیکن جس غلوں اور شفقت کا وہ

انہما کرتے تھے اس کا تقاضا ہی تھا کہ اُن کو مطلع کر دیا جائے اکبر خان نے لائن کلیر ہونے کا اشارہ کیا تو میں نے ریسپور اٹھا کر نہایت ہی ادب سے کہا۔

”السلام علیکم آپ کی مصروفیات میں خلل ہوا ہوں۔“
”تم یقیناً کوئی لطیفہ نہیں سناؤ گے مرم سلطان؟“ ڈنی۔
آئی۔ جی نے خوشگوار آواز میں جواب دیا۔ ہاں بولو کیا کر رہے ہو؟
”اپنا خون جلارہا تھا سر۔“

”خیریت“
”تفصیل ملاقات پر سناؤں گا سر“ میں نے کہا۔ ”فی الحال صرف اطلاع حاضر ہوا ہوں۔ ابھی ابھی مجھے وزارت داخلہ کا رجسٹر کال لیٹر ملا ہے۔“

”اوہ آئی سی۔ وہ بولے۔“ رات ایک نکشی میں ہم دیر تک باتیں کرتے رہے تھے۔ باتوں کا عنوان تم ہی تھے۔ ان کے پاس کچھ اہم اطلاعات ہیں اور اس سلسلے میں ان کی ملاقات صدر دفتر سے ہو چکی ہے۔ وہ تم سے مشورہ لینا چاہتے ہیں۔
”نیل چار ہا ہوں سر۔“

”میری تمام تر نیک خواہشات اور دعاؤں کے ساتھ“ وہ پیار بھرے لہجے میں بولے۔ ”اگر ضرورت محسوس کرو تو شام کسی وقت مل لینا۔“

”کوئٹہ شکر کروں گا سر۔“
”خدا تمہاری ہر کوشش کامیاب فرمائے۔“ ڈی۔آئی۔ جی نے کہا اور پھر لائن خاموش ہو گئی۔

سرکاری کار ہارون لے گیا تھا۔ میں نے خان مرحوم کی جیب کی چابی اکبر خان سے لے لی اور پیغام بر کو اپنے ساتھ لے لیا۔ وہ کچھ زیادہ ہی بامقوت شخص تھا۔ سیٹ پر ایسے بیٹھا تھا جیسے کوئی دیہاتی نئی ٹویلی بلیٹن پہلی بار غاوند کے پہلو میں بیٹھی ہو۔ ایسے شخص سے فری ہونا میں نے بھی مناسب نہ سمجھا اور تمام سفر خاموشی سے کٹ گیا۔ اُس نے قصوں پر رنگ شید میں گاڑی پارک کر دانی اور باہر نکل کر پھرتی سے میرے لیے دروازہ کھول دیا۔ ٹوٹ کے لیے کچھ انتظار کرنا پڑا تھا۔ کچھ دوسرے لوگ بھی مسکرت تھے۔ جب لفٹ نے بنا نہیں پہنچا تو آفیسر نے دوسروں کو روک دیا اور میرے ساتھ اندر داخل ہو گیا جانی بیچانی کار بڈور سے گزرتے ہم وزیر داخلہ کے پرسنل سیکرٹری کے ٹیبل پر رُکے۔ آفیسر نے خود اندر رہا بلط قائم کیا تھا۔

”سر! معزز مہمان میرے ساتھ ہیں بہتر سر۔“ اُس نے ریسپور رکھ کر مجھ سے کہا۔ ”پچلیے سر۔“

صبر و روایت بڑے صاحب کسی فائل پر جھکے خود کو مصروف رکھے ہوئے تھے۔ گنداز قالین کی وجہ سے قدموں کی چاپ تو محفوظ تھی لیکن دروازہ کھٹکنے کی ہلکی سی جبر چاہت پر بھی انہوں نے چہرہ اوپر نہ اٹھایا تھا۔ شاید بڑے لوگوں کی تربیت میں یہ بات شامل ہوتی ہوگی کہ جب ملاقاتی آنے تو لے منتظر دکھائی نہ دو مگر میرے سلام کرنے پر انہوں نے سر اٹھایا تھا مگر اُن کا چہرہ بے جرم مگر پورے جھٹکے سے اتھل چھل ہو گیا تھا وہ ایک ملک مجھے گھورتے رہے تھے۔

”سر! شہاب! آپ نے غلط آدمی کو زحمت دی ہے۔“
”ہجے میں غصہ تھا لیکن انداز نہایت ملائم تھا۔“
”نہیں... نہیں سر...“ شہاب ہلکا کر رہ گیا۔ ”مجھے...“

مجھے ان تک ہی پہنچا گیا تھا۔
”سر! شہاب! آپ نے چہرہ گھٹا کر کہا۔“ آپ جانیں۔
وہ بے چارہ تھوک نکل کر رحم طلب لگا ہوں سے وزیر صاحب کو دیکھنے لگا۔ تب ہی خان صاحب کے گول چہرے پر مسکراہٹ کھل اٹھی۔

”ہاں تم جاؤ۔“ انہوں نے میری آواز سے مجھے پہچان لیا تھا۔ ”بیٹھو ہاڑی گر۔“ جوہزی آفیسر باہر نکلا وہ ہنستے ہوئے بولے۔
”مجھے پہلے ہی سمجھ لینا چاہیے تھا کہ ایسے شخص کو کوئی روپ ہڈ لے پڑتے ہیں۔“

”مجبوریاً تو انسان کو سالم نگل لیتی ہیں سر۔“ میں نے کڑی سنبھال کر کہا۔ ”ان دونوں میں ایک ڈرلے میں ڈبل رول ادا کر رہا ہوں۔“

”آج کل کس کی گود میں لوریاں سُن رہے ہو؟“
میں نے پوری تفصیل کے ساتھ واقعات ان کو بتائے وہ قلم دانہوں تلے دبائے حیرت اور شوق سے آدھا گھڑ صرف مجھے سنتے رہے تھے۔

”اس کا مطلب ہے۔“ وہ آگے جھک کر بولے۔ ”متم کو متی ذرائع سے بھی تیز اور موثر ذرائع رکھتے ہو۔ میں نے یہی کچھ بتانے کے لیے تمہیں بلایا ہے۔ ہمارے ذرائع ملک نواز پر کڑی نظر رکھے ہوئے تھے۔ ہمیں جب معلوم ہوا کہ وہ ملک سے فرار ہو گیا ہے تو یہ امر قابلِ توجہ تھا کہ اُس کی جگہ کون سنبھالے گا۔ ہماری لسٹ میں صرف شہناز نامی ایک عورت تھی۔ چند

دن پہلے مجھے بتایا گیا کہ شہناز لاہور سے اسلام آباد منتقل ہو گئی ہے۔ تعارضی رپورٹ کے مطابق وہ اصل شہناز تھی جس پر ہم لگا رہے تھے۔ کل مجھے رپورٹ دی گئی کہ شہناز راگ رنگ ہوٹل میں داخل ہوتے دیکھی گئی ہے۔ میری تشویش قدرتی تھی۔ میری معلومات کے مطابق ان دنوں ممتاز اہلکار اور وہی ہوٹل ہے۔ میں نے ڈی۔ آئی۔ جی سے بھی اپنی پریشانی کا ذکر کیا تھا۔ ان کا جواب تھا کہ یہ بھی ختم سلطان کی کوئی جال ہوگی کہ شکاری خود شکار کے دام میں چلا گیا ہے۔ اہمی میں شہناز کے معاملے میں ہی اُبھا ہوا تھا کہ سنگاپور سے انٹرپول کے چیف کا پیغام ملا کہ مافیا کا ایک سرگرم رکن جاسن پاکستان کے شہر کراچی میں داخل ہو چکا ہے۔ انھوں نے گہری سانس لی۔ یہ بھی میری پریشانی بیٹے۔ کچھ دنوں سے کراچی کی رپورٹیں اچھی نہیں ہیں۔ یوں لگتا ہے جیسے کراچی کو کچھ شیطانی طاقتیں دوسرا ہانگ کانگ بنانے میں مصروف عمل ہیں۔ کیا تمہیں اس کی ضرورت اور وجہ معلوم ہے؟

میں نے نفی میں سر ہلایا۔

"ایک معاہدے کی رُو سے ہانگ کانگ چین کے حوالے کیا جا رہا ہے۔ وہ ہولے ہولے بولتے لگے۔ "ساری دنیا باقی ہے کہ ماضی کی وہ قوم جو دنیا بھر میں منشیات کے معاملے میں بدنام اور سر فہرست تھی آج نشے سے شدید نفرت کرتی ہے اس لیے مفاد پرست گروہ پریشان ہیں۔ جو نہی چین انتظامی امور سنبھالے گا۔ سب سے پہلے قدم کے طور پر مفاد پرستوں اور بُرے لوگوں کی خبر لی جائے گی۔ اسی لیے شیطانیوں کی نگاہیں کراچی پر لگی ہوئی ہیں۔"

"کیا ایسی مذموم سوچ عمل کا رُوب دھار سکتی ہے؟"

"اگر محبت وطن لوگ بیدار نہ ہوتے اور غدار وطن صرف کار رہے تو ایسا ہو سکتا ہے۔"

"نہیں جناب۔ میں نے قطعیت سے کہا: بچند قدار پوری قوم کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔"

وہ ہونٹ چبانے لگے۔ دُکھ کا دھواں اُن کے چہرے سے اُٹھ رہا تھا۔ انھوں نے یونک اُتار کر آنکھوں کی نمی کو زوال میں جذب کیا۔ قوم کے درد نے اُس شخص کو کتنا دکھی کر دیا تھا اگر وہ بروقت رومال استعمال نہ کرتے تو شاید درد اُن کی آنکھوں سے اُبل پڑتا۔

"میرے بچے۔ وہ سسک کر بولے۔ ایک چھوٹا سا

سورخ جہاز کو غرق کر دیتا ہے اور سورخ ایک ہاتھ کی کارستانی سے پیدا ہوتا ہے۔ میں تمہیں سارے پروگرام میں پشت ڈالنے اور کراچی جانے کا مشورہ دینے والا تھا لیکن میں خطوط پر تم پہلے چل رہے ہو وہی بہتر ہیں۔ بس تمام تر توجہ جاسن پر مرکوز رکھنا۔ شہناز ایک عورت ہے اور پھر تم اس کی بنیادوں میں ٹائم بمرکھ چکے ہو لیکن جاسن ایک طاقت ور مگر چھپے ہوئے ہے۔ وہ کسی بھی وقت ہمارے جہاز کو ٹھکڑا کر سکتا ہے۔"

"جاسن کی ذات کوئی مسئلہ نہیں؟ میں نے بتایا اگر اُس کی موت بنیادی مسئلے کے لیے ضروری ہوتی تو میں اُسے کل ہی موت کے گھاٹ اتار دیتا۔ جرم کی دُنیا میں فرد کی کوئی اہمیت نہیں ہوتی۔ اگر جاسن ہٹ گیا تو اُس کی جگہ کیل کانٹوں سے لیس ہو کر کوئی دُسن بھیج دیا جائے گا۔ میرے نزدیک وہ تخریر زیادہ اہم ہے جس پر جاسن کھڑا ہے اور وہ ہیں یہاں کے مفاد پرست لوگ۔ کوئی بھی طاقت مقامی تعاون کے بغیر قدم نہیں بٹا سکتی۔ میری کوشش ہے کہ مقامی رابطے منقطع کر دوں۔ جاسن خود بخود اسی طرح مچ جائے گا جس طرح تیل پمپڑ جانے پر چرائی بچھ جاتا ہے۔"

"کیا ہوٹل میں تم محفوظ ہو؟"

"کوئی ابھی بلڈنگ مل رہی ہے نہ ہی ضرورت۔"

"ہمارے پاس ایک بلڈنگ ہے؟ وزیر داخلہ نے ریسپورڈ اُٹھاتے ہوئے کہا۔ "ایسے ہی ایک ادارے کے لیے بنوائی گئی تھی لیکن وہ ادارہ دوسرے شہر میں منتقل ہو گیا ہے۔ میرا خیال ہے دیکھ لو۔ لیکن میں نے کوئی جواب نہ دیا۔ انھوں نے کوئی نمبر مانگا اور پھر چونک کر بوجھنے لگے۔ "ہاں، تمہارے فاقی مسائل کیسے ہیں۔ میں نے ڈی۔ آئی۔ جی سے کہا تھا اُن کی حفاظت کا وہ خیال رکھیں گے۔ ہم نہیں چاہتے تم فاقی پریشانی میں الجھ جاؤ۔"

"جب تک مظفر چوہدری آزاد گھوم رہا ہے خطرہ تو رہے گا۔ ہمیں نے بتایا۔ اُسے پہلے فرار ہونے کی ہرولت دی گئی اب وہ اپنے گاؤں کے اطراف میں مقیم ہے۔"

"میں اب خود دیکھوں گا۔" انھوں نے فیمل ڈائری پر ہاتھ رکھا۔ "اسپیشل ایگیشن کے غیر کام نہیں بنے گا۔ تم اپنی ذاتی پریشانی کو میرے پیر و کر دو بیٹے۔ شرٹ بلب روشن ہوا تو انھوں نے ریسپورڈ اُٹھالیا۔ "کرماتی، زہرو ہاؤس کی کیا پوزیشن ہے؟ چیک کیا گیا پوری استعمال کے لیے بلانا تیار ہو سکتا ہے۔ شکر یہ کرماتی

ہلنے آپ فوراً میرے پاس آئیں۔"

"میرا چیف سکیورٹی آفیسر آرہا ہے۔ اس کے ساتھ بلڈنگ دیکھ لو اور اپنی ضروریات کے مطابق اُسے فوری اُتھال کے لیے اپنی ہدایات کے تحت تیار کروالو۔"

"بہتر سر۔ میں نے ممنون اور مژدب انداز میں کہا۔ "بھئی اسی بلڈنگ درکار ہے جس میں رہائشی سہولتیں بھی ہوں۔"

"میرا خیال ہے تعارضی تمام ضروریات پوری ہو سکتی ہیں۔"

ہندو منٹ بعد ایک باق وچو بند نوجوان اجازت لے کر اندر داخل ہوا۔ اُس کے انداز سمجھ کے ہوئے چیتے کی مانند تھے۔ جس طرح قصائی ہر حلال جانور کو ایک ہی مقصد کے تحت دیکھتا ہے بالکل اسی طرح میں نے اُس شخص کا ہاتھ لیا تھا۔ ہارون کی طرح وہ بھی مجھے پسند آیا تھا۔

"کرماتی، وزیر داخلہ کا اہر بے حد شفیق تھا۔" یہ نوجوان ملک کے لیے ایک اہم معین پر کام کر رہا ہے۔ اس کا شمار دی آئی بی میں سر فہرست نہیں تو تیسرے نمبر پر ہو گا۔ تمہارے لیے بس اتنا ہی تعارف بہت ہے۔ اس کے ساتھ جاؤ اور زہرو ہاؤس کے معاملے کے بعد تم اس کی ہدایات پر عمل کرو گے اب کسی معاملے میں میری اجازت کی ضرورت نہیں ہوگی۔"

"بہتر سر۔ کرماتی نے میرے سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ "میں ہر حکم کی تعمیل کروں گا۔ کیسے سر؟"

"سر کرماتی، میں نے متبتم انداز میں کہا۔ "آپ صرف دو منٹ باہر ٹھہریں گے۔ اُس نے سر کو تھپتھپایا انداز میں ہلایا اور پلٹ کر چل پڑا۔ اس کے نگاہوں سے اوجھل ہوتے ہی میں وزیر داخلہ کی جانب متوجہ ہوا۔ "کرماتی کی کارکردگی کے بارے میں کچھ بتائیں گے سر؟"

"اُلو۔" وہ زہرو ہاؤس کے لیے "تم اچھے جو شہناز ہو خرم سلطان۔ کرماتی میں وہ تمام خصوصیات ہیں جو کسی سیکرٹ ایجنٹ میں ضروری ہوتی ہیں۔ یہ شخص آزمودہ کار سیکرٹ ایجنٹ ہے۔ بہت ہی زیرک، شارپ اور قابلِ اعتماد بھی ہے اسے آن ڈیویشن تمہارے حوالے کیا جا سکتا ہے۔"

"بہت بہت فکریہ سر۔ میں نے اُٹھتے ہوئے کہا۔ "میں زہرو ہاؤس میں کرماتی کے ساتھ داخل ہونا چاہوں گا۔"

وزیر داخلہ نے ٹین دبا کر اپنے سیکرٹری کو کال کیا۔ "ہاہر کرماتی ہیں ان کے لیے آرڈر کا ڈرافٹ لے لو۔ سیکرٹری نے ڈرافٹ شارٹ ہینڈ میں لکھا اور باہر نکل گیا۔

جب کرماتی لوٹ میں بند میرے ساتھ ڈوب رہا تھا تو اُس کی بڑی بڑی آنکھوں میں حیرت لہریں مار رہی تھی۔ وہ دُلاڑ سے ٹیک لگائے بار بار سوالیہ نگاہوں سے مجھے دیکھ رہا تھا۔ اُس کی حیرانگی بچائی تھی۔ اُسے زہرو ہاؤس دکھانے کے لیے بلایا گیا تھا لیکن صبح وہ جا رہا تھا تو اُس کے ہاتھ میں ڈرافٹ آرڈر تھا دیا گیا تھا۔

واپسی کا سفر بھی خاموش ہی رہا تھا کیونکہ کرماتی اپنی کار میں لیڈ کرتا ہوا زہرو ہاؤس تک گیا تھا۔ زہرو ہاؤس کی عمارت میری توقعات سے کہیں بڑی، جامع اور محفوظ ترین تھی۔ تین کمرے ساؤنڈ پروف تھے۔ پوری عمارت کے نیچے دو خانوں کا جمل بچھا ہوا تھا۔ تھانے کا مین دروازہ خود کار تھا جس کا بٹن ایک اور کمرے میں تھا۔ بالائی منزل رہائش کے لیے موزوں تھی۔

"ٹیلی فون کیبل؟ میں نے تمام کمروں اور تہ خانوں کا معاشرہ کرنے کے بعد پوچھا۔

"یس سر، موجود ہیں۔ دس منٹ کے نوٹس میں تین سیٹ کام کر سکتے ہیں۔ کرماتی نے مستعدی سے جواب دیا۔

"ایک لائن ایسی ہے جس کا تعلق خفیہ ہے۔ شاید کسی خاص فرد تک محدود ہو۔"

"آپ اس بلڈنگ کو رہائش اور دیگر سرکاری ضروریات کے لیے کتنے دنوں میں مکمل کر سکتے ہیں؟"

"آج شام سات بجے تک سر۔"

"کم از کم دس افراد کی رہائش، خوراک اور دیگر لوازمات درکار ہوں گے۔"

"ہو جائیں گے سر۔"

"کیا آپ سرکاری وسائل استعمال کریں گے؟"

"میں سمجھا نہیں سر۔" اُس نے استفہامید لگا ہوں سے مجھے دیکھا۔

"اخراجات کی بات کر رہا ہوں دوست۔"

"ظاہر ہے سر۔ وہ پہلی بار شکر ایا۔ "زہرو ہاؤس سرکاری عمارت ہے۔ یہاں رہنے والے بھی سرکاری اہل کاری ہوں گے۔ اس لیے تمام اخراجات سرکاری برداشت کرے گی۔"

"نہیں کرماتی صاب۔" میں نے نرمی سے کہا۔ "ہم اپنے وسائل سے کام لیں گے۔"

"جیسے آپ، ہم دیں گے سر۔"

"آپ کا اپنی نئی ذمے داریوں پر کوئی اعتراض تو نہیں؟"

”اے! اس تو نہیں سمجھتا کہ وہ انگلیاں چٹھانے لگا“ لیکن حیرت سے کہہ بیٹا۔ وہ بھی اس لیے کہ میں اپنی نئی ذمے داریوں سے واقف ہوں۔“

”بس قوم کی خدمت“ میں نے جواب دیا: ”آئیے چلیں“

”بس خدمت ہوتی ہے۔ انداز اور سادگی خدمت کی رت کے مطابق بدلتی رہتی ہیں۔ اس خدمت میں ایک لازمی ہے۔ سادہ داری اور وطن سے الٹ جنت“

”یہ سارا مجھے کچھ قریب لگایا گیا ہے“ وہ آہستہ آہستہ کھٹنے میں نے جس نازک اور مقدس پیشے کی تربیت حاصل ہے اس میں یہی سبق بار بار یاد کرایا جاتا تھا۔

جب اخراجات کا خیال میرے ذہن میں ابھرا تھا تب میری انگلیاں میری آہنی اناری پر جا پڑی تھیں۔ میرے ذمے کے مطابق ایک لگ بھگ ایک لاکھ کے کڑی ٹھہرے۔ گزشتہ دن میرا سب کچھ کھلا چھوڑ کر میرے ساتھ سے نکل گئی تھی۔ پھر حالات نے مجھے اتنی فرصت ہی دی تھی کہ میں ادھر جاتا۔ ادھر جانے کی دھم میں ایک اور خیال تھا کہ شاید مادام شہناز در بندہ کا کراؤ ادھر کچھ دیر سٹننے لگتی ہو۔ چونکہ میں وہاں میرا کچھ ساتھ رہ چکا تھا اگر وہاں بڑھتی تو میں خبر گیری کا جواز پیش کر سکتا تھا۔

کریانی کو میں نے پورے میں ہی رہنے کا اشارہ کیا اور دوپہر کے انداز میں اندر چلا گیا۔ سب کچھ اسی حالت میں تھا جی میں نے فرش پر بیٹھیاں بجا میں روٹھل خاموش ہی رہا تو نیکو دم میں داخل ہو گیا۔ میرا لکے سلیم پلنگ کے نیچے اونڈھے ہوئے تھے۔ میں نے تکیہ اٹھایا نیچے صرف کمرے کی چابی تھی۔

”کی چابی کے وہاں ملنے کی توقع عبث ہی تھی۔ میں کوئی ماہر شکن نہ تھا۔ میرے پاس تالا کھولنے کا آسان طریقہ ایک ہی تھا۔ لہذا لہو اور کی نال کی ہول پر رکھ کر ٹرائیگر دبا دیا۔ دھماکے سے کمرے میں گونج پیدا ہو کر دیواروں میں جذب ہو گئی تھی۔

کرنسی نوٹوں کے بندل دیکھ کر مجھے رتی بھر خوشی نہ ہوئی تھی۔ یہ وجہ یہ ہی ہو کہ نوٹوں سے میرا ذاتی مفاد وابستہ تھا نہ کوئی بی بی تھی۔ جس طرح بیمار کڑوی دوا پیتا ہے اس طرح میں نے کے خلاف میں نوٹ بھرنے شروع کر دیے۔

معا ایک آواز میری سماعت سے ٹکرانی اور ساتھ ہی غلاف دھواں اٹھنے لگا۔ میں نے پھرتی سے گردن گھمائی اور سانس میں دیکھ گئی۔ فٹ میٹ پر میرا کاسا باقی باڈی گاڑو جمال

ٹانگیں پھیلائے کھڑا کینہ توڑ نگاہوں سے مجھے گھور رہا تھا۔

”گوئی تمھاری کھو پڑی میں بھی سو رنج کر سکتی تھی۔ وہ رلیو اور لہراتا ہوا قدم آگے بڑھا۔ لیکن میں ہمیشہ لوگوں سے محبت کرنے والا ہوں۔ دوسری وجہ یہ بھی ہے کہ میں تمھارا ممنون ہوں۔ میں صبح سے جھک مارتا رہا ہوں۔ اگر مجھے معلوم ہوتا کہ دولت کی دیوی کہاں ہے تو اس وقت تمھیں اپنی جھک پر مذمت ہوتی لہذا ہم دونوں ایک دوسرے کے دشمن ہیں“

”یہ تو ہے“ میں نے اس کی تائید میں گردن ہلاتی: ”میٹھو دوست، میں تمھیں ضائع ہونے والی گوئی کا مواضع ضرور دہل گا“

”معاوضہ؟“ وہ ہنسنے لگا: ”کیوں مذاق کر رہے ہو؟“

”مذاق نہیں جمال خان“ میں نے بقایا گڈیاں اٹھاتے ہوئے کہا: ”واقعی میں تمھیں معاوضہ دوں گا“

”معاوضہ نہیں پیارے“ وہ اور نزدیک آگیا: ”حقہ کہو، فقہی فقہی، یہ بھی تمھارے احسان کو مد نظر رکھ کر رہو۔“ اس نے کو دکر میری پسلیوں پر لات ماری اور میرے ہاتھ سے تھیلا پھین لیا: ”اب بولو، اپنے احسان کا بدلہ کیا لو گے؟“

”اب تم غلط لفظ بول گئے ہو“ میں نے کراہتے ہوئے کہا۔

”مجھے فقہی منظور ہے“

”لیکن اب مجھے منظور نہیں“ وہ دو قدم پیچھے ہٹ گیا۔

”دیکھو اندر کتنی گڈیاں باقی ہیں“ میں نے اناری کا پٹیکھول دیا۔

”تین“ وہ جھانک کر بولا: ”تیس ہزار، دو گڈیاں چھوڑ دو، دس ہزار لے کر یہاں سے دفع ہو جاؤ ورنہ مادام تمھاری لاش دیکھ کر ڈر جائے گی“

”نہیں“ میں نے حلق پھاڑ کر دہرائی آواز میں کہا۔ میرا مقصد باہر کھڑے کرمانی تک آواز پہنچانا تھا۔ یہ اس کا امتحان، بھی تھا: ”تم ساری رقم نہیں لے جا سکتے“

”اچھا“ وہ تسخیرانہ لہجے میں بولا: ”وہ کیوں دوست، کیا مجھے یہ دولت استعمال کرنے کا حق نہیں، جب کہ مجھے ضرورت بھی ہے“

میری حساس سماعت سے قدموں کی ہلچل سنائی دینی لگی۔

”کیا تم واقعی مجھے گوئی مارنے میں سنجیدہ ہو؟“ میں نے بلند آواز سے پوچھا۔

”ہاں!“ وہ بولا: ”میں اس دولت کی خاطر اپنے باپ کو بھی گوئی مارنے میں سنجیدہ ہو سکتا ہوں“

میں نے رلیو اور کی نال کو جھانکتے دیکھا، پھر ایک مدہم

سادہ ہوا نما شعلہ نال سے پھوٹا اور جمال خان کراہتا ہوا اچھلا گوئی نے وہی ہاتھ چاٹ لیا تھا جس میں اس نے تھیلا پھرا ہوا تھا۔

میں اپنی جگہ سے اچھلا اور جمال خان میری فلائنگ لگ کی ضرب کھا کر ڈکڑا ہوا کرسی سے ٹکرایا اور پھر تپائی پر اونڈھا گر گیا۔

”میں جا رہا ہوں جمال خان“ میں نے تھیلا اٹھا کر کہا۔

”تمھارے لیے دس ہزار کی ایک گڈی چھوڑے جا رہا ہوں۔ میرا خیال ہے یہ اس گوئی کا معقول معاوضہ ہے“

میں دوڑتا ہوا باہر نکلا۔ کرمانی ایک طرف موزب کھڑا تھا: ”شکر یہ کرمانی“ میں نے اس کے شانے پر پھٹکی دی۔

”آؤ چلیں“

”سرا“ وہ متذنب آواز میں بولا اور میں کا کا دروازہ کھولتے کھولتے رک گیا: ”میں کچھ الجھ گیا ہوں۔ کیا یہ ڈاکے کی کوئی قسم تھی؟“

”ہاں کرمانی صاحب“ میں نے اثبات میں جواب دے کر اسے جھونچکا کر دیا: ”جس طرح کسی ایجنٹ کو دشمن کے علاقے میں اپنی ضروریات کی خاطر ڈاکے ڈالنے پڑتے ہیں۔ یہ بھی وہی قسم ہے۔ اگر انجمن باقی ہے تو ضرورت کے وقت دُور کر لیجیے گا۔ اب ہمیں یہاں سے نکل جانا چاہیے۔ میرا خیال ہے صدر سے آپ سامان خریدیں“

”تھینک یو سر“ وہ اپنی کاری جانب بڑھ گیا: ”اب معاملہ صاف ہو گیا ہے۔ سامان کے لیے میں اپنے ذاتی ذرائع استعمال کرنے کی اجازت چاہوں گا“

”پھر یہ تھیلا رکھ لیجیے“ میں نے تھیلا پلاٹ سے اٹھاتے ہوئے کہا۔

”پے منٹ بعد میں ہوگی سر“ وہ ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ کر بولا: ”وہیے میں جانے ڈیوٹی دیکھنے آپ کے ساتھ جاؤں گا“

میں نے جواب دیے بغیر کار یوٹرن میں ڈالی۔ مجھے راستہ دینے کے لیے کرمانی کو اپنی گاڑی کو آگے کرنا پڑا تھا پھر وہ بھی میرے پیچھے کار موٹرنے لگا۔ ہائی وے پر چڑھ کر میں نے ٹرانسمیٹر آن کیا اور ہارون کو کال کرنے لگا۔ تیسری کال پر باریک کی نسواری آواز سنائی دی۔ وہ رشیدہ ہی تھی۔ میرے لبوں پر بے اختیار سی مسکراہٹ کھل اٹھی۔ سب ٹھیک ہے میں ہارون کو کال کر رہا ہوں“

”مداخلت کی معافی کے ساتھ ہارون حاضر ہے“ ہارون کی

بشاش آواز ٹرانسمیٹر وایج سے ابھری۔

”سنہری بیڑیا کہاں ہے؟“

”ایک گھونٹے میں بیٹھ چکی ہے اور میں باہر ٹائمر کے کچے پھٹے نٹ ڈھیلے کر رہا ہوں“

”کھوٹری کا خیال رکھنا“ میں نے کہا: ”وہ تعاقب سے آگاہ ہو چکی ہوگی“

”اللہ مالک ہے جناب... اوہ... وہ واپس آ رہی ہے گیٹ سے نکل کر دائیں بائیں دیکھ رہی ہے اور ایک ٹیکسی والا شکار کی طرف چھٹ پڑا ہے“ ہارون اچھے کمینڈر کی مانند بول رہا تھا: ”لڑکی نے ہاتھ اٹھایا اور ٹیکسی روک گئی ہے“

”تم ڈھیلے نٹ کس لو۔ خدا حافظ“

ٹرانسمیٹر آن کر کے میں نے عقب نما آئینے میں دیکھا۔ کرمانی چند فٹ پیچھے آ رہا تھا۔ مجھے وہ نوجوان نہ جانے کیوں اتنا اچھا لگ رہا تھا۔ مروانہ جاسٹوں کے علاوہ بھی اس میں کچھ تھا جس نے مجھے متاثر کیا تھا۔

وزیر داخل نے جس مقصد کے لیے طلب کیا تھا اس پر پہلے ہی میں چل رہا تھا لہذا ایک طرح ملاقات بے مقصد ہی رہتی مگر کرمانی کی دریافت اور وزیر ہاؤس کا عطیہ دونوں میرے کار کے لیے خوش گوار اضافہ تھا۔ مجھے ان دونوں کرمانی جیسے وحید اور کارکن نوجوانوں کی شدید ضرورت تھی اور میرے ساتھی بہتر مرکز نہ ہونے کی وجہ سے بکھرے ہوئے تھے۔

ہوٹل کے پارکنگ شیف میں گاڑیاں پارک کر کے ہم اندر داخل ہوئے۔ میں ابھر خان کو ایک مخصوص اشارہ دیتا ہوا ڈاننگ ہال میں داخل ہو گیا اور کونے والی میز پر جا بیٹھا۔

”آپ نے کھانا تو نہیں کھایا ہوگا؟“

”نہیں“ کرمانی نے جواب دیا: ”میں چھٹی کے بعد گھر جا کر کھانا کھانے کا عادی ہوں“

”آج سے“ میں نے ٹیبل بجا کر ایک میٹر کو متوجہ کیا۔

”اپنی تمام سابقہ عادات کا ٹائم ٹیبل بدل لیجیے۔ آپ کا دامن جس شخص کے دامن کے ساتھ باندھا گیا ہے اسے بعض اوقات کھانے پینے کی مہلت ہی نہیں ملتی۔ میں اپنے ساتھیوں سے کہا کرتا ہوں جب موقع ملے تو اونٹ کی طرح راشن پانی کو دامن میں جمع کر لیا کرو“ میٹر نے قریب آکر سر کو خم دے کر پوچھا تھا۔

”جگن“ میں نے اسے مختصر آؤر دیا: ”ہاں تو کرمانی بھائی

میرا کوئی تعارف نہیں۔ میں صرف میں ہوں۔ نام بھی نہیں رکھتا چہرہ اور نام بدلتے رہتے ہیں۔ چند روز قبل میرا نام اور چہرہ اور تھا لیکن میں اپنے ساتھیوں کے چہرے نام بخاندانی پس منظر اور ذاتی پسند ناپسند یاد رکھتا ضروری سمجھتا ہوں۔ جس طرح ایک ماں کو اپنے ایک ایک بچے کے بارے میں معلومات ہوتی ہیں۔ ”میرا نام بلال کرمانی ہے۔“ کرمانی دونوں ہاتھ نیسل پر رکھ کر بولا۔ ”ابو مرحوم قانون دان تھے۔ اُمّی حیات ہیں، ایک چھوٹی بہن ہے۔“

”خاندان کی مالی پوزیشن؟“

”اللہ تعالیٰ کا کرم شاید جدا مجد سے جاری و ساری ہے؟“ وہ نگاہیں جھکا کر بتلنے لگا۔ ”اگرچہ دن رات صرف کرتے رہیں تو جمع شدہ دولت اور آمدنی دو تین لاکھوں کے لیے چل سکتی ہے۔“

”شکریہ بلال“ میں نے کہا۔ ”در اصل میرے خیال میں بھوکا اور ضرورت مند انسان جلدی بک جاتا ہے۔“

”گستاخی معاف مہر۔“ وہ معذرت خواہانہ لہجے میں بولا۔

”میرے ساتھ بھی زندگی کے تلخ و شیریں تجربات ہیں۔ میں نے کروڑوں ہزاروں میں بکتے دیکھے ہیں اور تہی دست کو ہار پھول ٹھکانے دیکھا ہے۔ اصل شے انسان کی مالی پوزیشن نہیں بلکہ ضمیر کی طاقت ہے۔ صحت مند ضمیر فقیری میں امیری کے ذائقے محسوس کرتے ہیں اور مردہ اور بیمار ضمیر امیری میں گد اگری کرتے ہیں۔“

ویر کے آنے کی وجہ سے گفتگو کا سلسلہ رک گیا تھا پھر کھانے کے احترام میں ہم دونوں نے خاموشی اختیار کر لی۔ وہ خوش خوراک بھی تھا۔ تکلف بالا نے طاق رکھ کر اس نے ڈٹ کر کھانا کھایا تھا۔ جب ویر خالی برتن اٹھانے آیا تو میں نے کافی کے لیے کہہ دیا۔ اندر کوئی باورچی تھا جسے میں نہیں جانتا تھا۔ اس کی تعریف خان مرحوم بھی کیا کرتا تھا۔ خاندانی خال خال تھا۔ کافی اتنی مزے دار بناتا تھا کہ ذائقہ ایک کے سرور آگیا تھا۔

”مہر! کافی کا سب سے کم کرمانی ہونے سے بولا۔ میں آپ کا نام نہیں پوچھوں گا، لیکن کام کے بارے میں گزارش کروں گا، کیونکہ مجھے کام کرنا ہو گا اور میں ذہنی طور پر اس کام کے لیے تیار رہنا چاہتا ہوں۔“

”آپ نے کبھی ملک نواز کا نام سنا ہے کرمانی صاحب؟“

”پلیز؟“ وہ دوسرے والے انداز میں بولا۔ میں صاحب تھا لیکن آپ سے وابستہ ہو کر صرف کارکن رہ گیا ہوں میں نے تکلف

نہیں ہونا چاہتا، صرف یہ پسند کروں گا مجھے اپنا وقار و رت اور ماتحت سمجھیں۔“

”میرا سوال یا دہرے آپ کو؟“ میں نے سنجیدگی سے برقرار رکھتے ہوئے پوچھا۔

”جی ہاں! ملک نواز ایک سیاست دان تھا اور سیاست کی آڑ میں وہ کچھ کرتا تھا جو ایک اچھے شہری کو نہیں کرنا چاہیے۔“

”اگر میں کہوں کہ مجھے اس کی جگہ لایا گیا ہے۔“

”میں یقین نہیں کروں گا۔“ وہ مسکراتے لگا اور جس نے یقین ہو گیا میں واپس چلا جاؤں گا۔“

”یہ جانتے ہوئے کو آپ کا پاس کیا چاہتا ہے؟“

”جی ہاں۔“ وہ بے دھڑک بولا۔ ”باس مجھ سے سروں چھین سکتا ہے، مگر۔۔۔“

”نہیں کرمانی پیارے۔“ میں نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔ ”یہ آپ کی غلط فہمی ہے۔ حکومت کی کرسی میں بڑی طاقت ہوتی ہے۔ کرسی اپنے مفادات سے نکلنے والوں کو معاف نہیں کرتی۔ آپ سے صرف سروں ہی نہیں بہت کچھ چھینا جاسکتا ہے۔ یہ ایسا فارہ ہے جس میں اترنے والا اپنی مرضی سے باہر نہیں نکل سکتا۔“

”تو کیا واقعی آپ۔۔۔“

”ہاں کرمانی۔“ میں نے گہری سانس لے کر کافی حلق میں اندلی۔ ”مجھے اوپر سے یہ فرض سونپا گیا ہے۔“

”میں۔۔۔ میں۔۔۔ کیسے یقین کر لوں کہ خان صاحب بجا شخص بھی ملک نواز کا آدمی ہے۔ نہیں دوست، میں بہت کم جانتا ہوں۔ ایک ایک چہرے سے واقف ہوں مگر ان چہروں میں وزیر داخلہ صاحب کا چہرہ نہیں ہے۔“

”کچھ لوگ بہت گہرائی میں ڈوبے رہتے ہیں دوست۔“

”اگر میں مزید ایک قدم بھی تعاون سے انکار کروں تو؟“

”تو میں تمہیں واپس بھیج دوں گا۔“ میں نے بے پروائی سے جواب دیا۔ لیکن مجھے شک ہے کہ تم کل صبح کا سوچ دیکھو۔“

”تو میں جا رہا ہوں۔“ وہ اچھل کر اٹھا۔ زندگی کو سوجا دکھانے والے تم لوگ نہیں ہو۔ یہی بات اس بوڑھے شیطان تک پہنچا دینا۔“

”شکریہ بلال کرمانی۔“ میں نے اس کا ہاتھ نرمی سے تھام لیا تو اس نے جھک کر میرا ہاتھ نیسل پر دے مارا۔ اگرچہ وہ نہیں ہو جو ظاہر کرے مجھے ہو تو خدا کی قسم بہت اچھے اداکار ہوا اور

وہی ہو تو۔۔۔ میں تمہاری عظمت اور تمہاری عظیم ماں کو سلام کرتا ہوں۔ بیٹھ جاؤ میرے بھائی۔“

”نہیں۔“ وہ غصہ کرتا ہوا پیچھے ہٹ گیا۔ ”میں تم شیطانوں کے ساتھ ایک قدم بھی نہیں چل سکتا۔“

”سنو عزیزم۔“ میں نے گھڑی آواز میں کہا۔ ”تم جانتے ہو کہ ایران اقتدار میں کچھ لوگ ملک نواز کے مفادات کی قربانی کرتے رہے ہیں اور اب انڈیا نڈی قیادت کے لیے بھاگ دوڑ کر رہے ہیں۔ کیا بلال کرمانی بھی ان میں سے نہیں ہو سکتا تھا۔ جب علی رضا جیسا ذہنی دار افسر اسی صف میں شامل ہے میں اپنے مشن اور اپنی مختصری جماعت کو خطرے میں ڈالنے کا رسک نہیں لے سکتا تھا اس لیے تمہارا امتحان ضروری تھا میں کیا ہوں، میرا مشن کیا ہے۔ اب بلال سے نہیں بلکہ عمل کے میدان میں اس سچائی کو دیکھ لینا۔ بس مجھے یہی کہنا ہے۔ اب اگر تم ماننا چاہتے ہو تو چلے جاؤ۔“

”ٹھیک ہے جناب۔“ وہ مضبوط آواز میں بولا۔ ”میں نہیں ہوں۔ ہم ایک دوسرے کو اب عمل کی کسوٹی پر آزمائیں گے۔“

”شکریہ کرمانی۔“ میں نے گھڑی پر وقت دیکھا۔ دو بجنے میں چند منٹ باقی تھے۔

”کیا ہم کل زیر دہاؤس میں منتقل ہو سکتے ہیں؟“

”میں کوشش کروں گا۔“ وہ بھی بھی آواز میں بولا۔ ”آپ سے رابطہ۔۔۔۔۔“

”فی الحال میرا ہیڈ کوارٹر ہی ہوٹل ہے۔ کیا تمہاری گھڑی صرف وقت بتاتی ہے؟“

”نہیں۔“ اس کے لبوں پر وہی دہی مسکراہٹ کھینچنے لگی۔

”آواز بھی سناتی ہے۔“

”تو پھر فریکوئنسی ایڈجسٹ کر لو۔“ میں نے اسے فریکوئنسی بتائی اور اس نے گھڑی اتار کر فریکوئنسی ایڈجسٹ کر لی۔

”ملازم پیشہ لوگوں کے بارے میں کیا حکم ہے؟“

”فی الحال ہم اپنی مدد آپ کریں گے۔“ میں نے بتایا۔

”گھڑی جماعت میں کچھ خواتین بھی ہیں اس لیے کچھ معاملات وہ سنبھال لیں گی۔“

”اب میں اجازت چاہوں گا۔“ وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ میں بھی اس کے ساتھ ہی ڈانٹنگ ہال سے نکلا تھا۔ ابھی ہم ہاتھ ملانے ہی جا رہے تھے کہ میری نگاہ شیشے کے دروازے پر پڑی شہناز اور کمراسٹر ہیاں چڑھ رہی تھیں۔

”ان عورتوں کو گزرتے گزرتے نگاہوں میں بٹھالے جانا کرمانی۔“ میں نے کہا اور کرمانی سے الگ ہو کر کاؤنٹر کی جانب بڑھ گیا۔

فرش پر ایڑیوں کی ٹپک ٹپک سن کو میں نے کون موڑ کر دیکھا اور ہڑبڑاتا ہوا شہناز کی جانب دوڑا۔ اس نے سر کے اشارے سے میری تعلیم قبول کرتے ہوئے باہر چلنے کا اشارہ کیا۔ سمیرا نے آنکھوں اور جھٹکوں سے کوئی بات سمجھنا چاہی مگر میں کچھ نہ سمجھ سکا تھا پھر سیر ہیاں چڑھتے ہوئے بھی اس نے ریلنگ تھپتھپاتی شہناز ساتھ تھی اور وہ لڑکی خاموش خاموش باتیں کر رہی تھی۔

شہناز نے اندر داخل ہو کر پہلے پرس بیڈ پر اچھالا پھر سائیڈ ٹیبل پر بیٹھ کر چیل اتارنے لگی۔ سمیرا نے جھک کر ہوائی چیل اٹھائی اور شہناز کو پہنلے لگی۔

”جانسن کے ساتھ کچھ گڑبڑ ہے باہر۔“ شہناز پر جوش آواز سے بولی۔ ”کوئی بی بی پولیس کا پیرہ ہے۔“

”آپ نے میاں محمد صاحب کا کلام پڑھا ہے مادام؟ میں نے زیر لب مسکرا کر پوچھا۔

”کون میاں محمد صاحب؟ اس کا لہجہ استغیا میرے تھا۔“

”صوفی شاعر میڈم۔“ سمیرا بول پڑی۔ ”شہرہ آفاق کتاب سیف الملوک کے مصنف ہیں۔“

”ہاں کتاب کا نام کہیں پڑھا تھا۔“

”دشمن کے بارے میں میاں صاحب فرماتے ہیں۔“ میں نے کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

”دشمن مرے تے خوشی نہ کریے کل سجنل دی مرحباںں“

”لیکن ان کا دشمن یقیناً جانسن جیسا سفاک قاتل نہ ہوا ہو گا۔ اس لیے ہم جانسن کی گود بڑ پر خوشی کا اظہار کر سکتے ہیں۔ پولیس کا مطلب یہ ہے کہ دشمن مر گیا ہے یا اس نے کسی انسان کو مار دیا ہے۔“

”مجھے صحیح الفاظ میں چاہیے باہر۔“ وہ بالوں کا جڑا کھولتے ہوئے بولی۔ ”اگر وہ مر گیا ہے تو میں اس کے ماتم کی خوشی میں جشن مناؤں گی لیکن وہ اگر گرفتار ہو گیا ہے تو میرے لیے بھی خطرہ ہو سکتا ہے۔ وہ اپنی گردن کے ساتھ میری گردن بھی پھسلانے کی کوشش کرے گا۔“

”کیا آپ غیر قانونی طور پر اسلام آباد میں داخل ہوئی مادام؟“

”کیا مطلب؟“

”مامام! میں ایک دم موڈ ہو گیا۔ آپ اس ملک کی ایک معزز خاتون ہیں۔ آپ کا اپنا جائزہ نہیں ہے۔ اسلام آباد آنا کوئی جرم نہیں ہے۔“

”اوہ بابو! وہ بالوں کو کچھرا کر لولی۔“ ملک نواز کے حوالے سے میرا نام بھی جانا پہچانا ہے، اب حالات بدل چکے ہیں۔ یہاں ملک نواز کے دوست اور دشمن ہیں۔ اب دوست مرنے پھیرنے لگے ہیں۔ ان حالات میں دشمن کا رگڑا کر سکتے ہیں۔ تم خود جاؤ یا اپنے ذرائع استعمال کرو۔ مجھے صحیح صورت حال چاہیے۔“

”بہتر مامام! میں نے مستعدی سے جواب دیا۔ آپ کے حکم کی تعمیل ہوگی۔“

”میڈم! سمیرا بے قراری سے پہلو بدلتے لگی۔ وہ... دوسری بات۔“

میں چلتے چلتے پلٹ کر کھڑا ہو گیا اور باری باری دونوں کی جانب دیکھا۔ دوسری بات کیا ہے مامام؟

”اوہ! شہناز نے گھوڑے کو سمیرا کی طرف دیکھا۔ کوئی خاص بات نہیں۔“

”عام ہی یہی مامام! میں پھر کرسی پر جم گیا۔ ہمارے درمیان کوئی بات مخفی نہیں رہنی چاہیے۔ چھوٹی چھوٹی باتیں اندر پھیلتی رہتی ہیں۔“

”کیا تم یہاں سے باہر گئے تھے بابو؟“ شہناز نے پوچھا۔

”جی ہاں، گیا تھا۔ میں نے اثبات میں گردن ہلاتی۔“

”کہاں؟“

”اسلام آباد۔“ میں نے بتایا۔ اچھی اور بری خبریں لایا ہوں۔

”دونوں سنا دو۔“ شہناز نے معنی خیز نگاہوں سے سمیرا کی طرف دیکھا۔

”ثبوت کے ساتھ۔“ میں اچھل کر اٹھا اور باہر چلا گیا۔

مجھے یقین ہو گیا تھا کہ دوسری بات کیا ہو سکتی ہے۔ وہ سمیرا کے ٹھکانے پر گئی ہوں گی اور وہاں ٹوٹا ہوا سیف یا زخمی جمال کو دیکھ آئی ہوں گی۔ میں تھیلے کے ساتھ واپس آیا تو شہناز ہاتھ روم سے نکل رہی تھی۔

”آپ کی امانت مس سمیرا! میں نے تھیلہ سائیڈ ٹیبل پر رکھ دیا۔ اگر میں بروقت نہ جاتا تو آپ کا بادی کا ڈھکے رنگ جاتا۔“

”تم...؟“ شہناز چیخ اٹھی۔ ”تم کیا چیز ہو، کتنے ڈپ ہیں تمہارے؟“

”میڈم! سمیرا نے تھیلے میں جھانک کر تھر تھرائی آواز

میں کہا۔ سب تجھوٹے ہیں میڈم، جمال نے بھی اپنا جرم پھیلانے کے لیے جھوٹ بولا تھا اور...“

”خاموش! شہناز ہاتھ اٹھا کر لولی۔ ٹھیک سے باہر تم جانسن کے باسے میں معلومات حاصل کرو۔“

”بہتر مامام! میں اٹھا اور دروازہ کھول کر باہر نکل گیا۔

دو لٹی کشتی پھر قدرے متوازن ہو گئی تھی۔ شہناز جو کچھ سوچ کر لیتی تھی ناکام رہتی تھی ورنہ پھر تباہی کے بچنے کے لیے وہاں نہ آتی۔

میں نے رشیدہ کو ساتھ لیا۔ باہر جانا ہی تھا۔ اس دفعہ میں ماسٹر بیگن اور امین سے مل لینا چاہتا تھا۔ بیگن کو سابقہ کارڈ ملی اور آئندہ پروگرام سے آگاہ کرنا بھی ضروری تھا ورنہ وہ خود کو عضو معطل سمجھنے لگتا۔ ویسے میں نے ان غیر ملکی لوگوں کو کلی میلان سے غیر محسوس طور پر دور کر دیا تھا۔ وہ بہت اچھے اور وفادار لوگ تھے لیکن مشرقی ماحول میں فٹ نہیں ہو پاتے تھے۔

چار بجے واپس آیا تو پتا چلا دونوں ابھی تک سوئی ہوئی ہیں۔ میں بھی گھڑی پر آرام کرنے بیڈ پر لیٹا ہی تھا کہ دس بجے ٹیلی فون کال کا پیغام دیا۔ میری کتاب زندگی کا وہ صفحہ پلٹ گیا تھا جس پر میرے سچے کا آرام و سکون درج تھا۔

”ہیلو بابو! بول رہا ہوں۔“ میں نے احتیاطاً موجود چہرے کا نام بتایا۔

”علی بول رہا ہوں جو بدری۔“ میں نے کوئی جواب نہ دیا تو پھر بولا۔ تمہارے لیے دل خوش کن خبریں ہیں۔ تم نے ڈیڑھ گھنٹہ سے میڈنگ کی خواہش کا اظہار کیا تھا۔ جو لوگ مست مذہب تھے تمہاری شاندار کارروائی نے ان کو بھی ہلا کر رکھ دیا ہے۔ پہلے وہ ٹال مٹول سے کام لے رہے تھے اور اب وہ خود بے قرار ہیں۔ اچھا موقع ہے پیارے آؤ اور میدان مار لو۔ وہ لوگ بے حد خوف زدہ ہیں۔ بس تم ہاتھ بڑھاؤ گے تو سب لوگ جھجک کر بیٹ کر لیں گے۔ میں چاہتا ہوں آج حلف و فاداری کی تقریب ہو جانی چاہیے۔“

”یہ سب آپ کی کوششوں کا ثمر ہے جناب۔“ میں نے انکار نہ کیا۔

”جیسے میں جواب دیا۔ جب اور جہاں حکم ہو گا حاضر ہو جاؤں گا۔“

”اسی جگہ جہاں کل ہماری ملاقات ہوئی تھی چلے آؤ، میں ان لوگوں کو کال کر رہا ہوں۔“

”بہتر جناب! میں نے موویا نہ انداز میں کہا۔ آدمی ہوں۔“

”سیور رکھ کر میں پلٹا تو ہارون اندر آتا دکھائی دیا۔ اس کے ساتھ دو طویل قامت اور وجیہ نوجوان تھے۔ ایک کوٹ بٹون

میں اور دوسرا شلوار قمیض میں ملبوس تھا۔ میں کاؤنٹر سے ایک لنگائے پر شوق نگاہوں سے ان کو دیکھنے لگا۔

”السلام علیکم جیفین! ہارون نے سر جھکا کر سلام کیا۔ یہ میرے کلاس فیلو اور بچپن کے دوست ہیں۔ ایک نوجوان نے مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھایا۔ سجاد احمد! میں نے گرم جوشی سے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ وہ پیچھے ہٹا تو دوسرا آگے بڑھا۔ سبھے نعیم حیدر کہتے ہیں۔“

”ہارون! دو دستوں کو ہال میں لے چلو۔“ میں نے کہا۔ میں ایک کال کر کے آتا ہوں۔“

”بہتر جیفین! ہارون ان کے سامنے فرومایہ انداز اختیار کیے ہوئے تھا۔

میرے پاس چونکہ کوئی کاشی فون نمبر نہ تھا اس لیے اسے راج ٹرانسمیٹر پر ہی کال کیا جاسکتا تھا اور کاؤنٹر پر لیا کر نامیاب تھا۔ لہذا مجھے دفتر میں جانا پڑا تھا۔ پانچ منٹ کی مسلسل کوشش کے بعد شور کے درمیان سے کوئی کی آواز سنائی دی تھی کہ ہاں ہاں ہاں ہاں۔“

”نمبر مارکیٹ کے ایک جنرل اسٹور میں سر۔“

”ایک ایڈریس نوٹ کر لو۔ میں کچھ لوگوں سے ملنے جا رہا ہوں۔ حالات بظاہر ٹھیک ہیں مگر حفظاً مقدم کی پالیسی بہر طور بہتر ہوتی ہے۔ میرا ایک اور ساتھی بھی آس پاس ہو گا۔ تم ٹھیک چوبیس بجے وہاں نمکرائی کرو گے۔ ٹرانسمیٹر آن رکھنا اور اپنی صوابدید پر بوقت ضرورت کارروائی کرو گے۔ تیاری کے ساتھ آنا، کوئی سوال؟“

”نہیں سر! کوئی نے جواب دیا۔ مجھے صرف حکم سننے اور نیک کی تربیت دی گئی ہے۔“

”باہر جا کر میں نے ویٹر کو جانے کا آرڈر دیا اور ہال کی جانب بھاگ گیا۔ ہارون نے دو دستوں کے ساتھ کونے میں بیٹھا انھیں پتہ چلا تھا اور وہ بڑے انہماک سے سن رہے تھے میں قریب لیا تو تینوں نے اٹھ کر تعظیم کی دم ادا کی۔

”سر میں نے انھیں بتا دیا ہے کہ ہمارا مشن کیلئے ہارون نے بتایا۔ دونوں بالکل رضا کارانہ طور پر کار خیر میں حصہ لینے کا نرم رکھتے ہیں لیکن پارٹ ٹائم۔“

”میں نے دونوں کی جانب استفسار نہ لگا ہوں سے دیکھا۔

”یہ ہماری مجبوری ہے سر۔“ سجاد بولا۔ میں ایڈووکیٹ ہوں اور نعیم بزنس میں ہے۔“

”سنو دوستو! میں نے نرم آواز میں بولنا شروع کیا۔ ہر عبادت کے لیے مخصوص وقت اور جگہ کا نہ تقاضہ ہوتے ہیں۔

نماز کے لیے تمام مصروفیات اور مجبوریوں کو بالائے طاق رکھنا پڑتا ہے۔ حج کے لیے طویل مدت کے لیے گھر اور تمام کام چھوڑنے پڑتے ہیں۔ اسی طرح جس عبادت کے لیے ہم نے خود کو وقف کیا ہے، اس کے لیے کوئی وقت مقرر نہیں۔ دن رات کا ایک ایک لمحہ الٹ رہنا پڑ سکتا ہے۔ تم میں سے جو دوست یہ قربانی دے سکتا ہے، اس کے لیے میں صرف ممنون ہوں گا کیونکہ یہ میرا ذاتی کام نہیں ہے۔ تم لوگ مجھ پر نہیں بلکہ اپنی قوم پر احسان کرو گے۔“

”ٹھیک ہے سر۔“ سجاد فیصلہ کن لہجے میں بولا۔ میں قوم کی فلاح کے لیے خود کو فدا کرنا چاہتا ہوں۔“

”مجھے کچھ مہلت دے کر دیکھا۔“ نعیم نے معذرت طلب نگاہوں سے میری جانب دیکھا۔ ”در اصل میرا کوئی پانچ نمبر نہیں ہے۔“

”آپ جب فرصت پائیں چلے آئیے گا۔“ میں نے کہا۔ آپ جیسے محب وطن نوجوانوں کے لیے یہ دروازہ ہر وقت کھلا رہے گا۔ میں نہیں چاہتا آپ یہاں ہوں اور آپ کا دھیان بزنس میں الجھا ہوا ہو۔ ذہن صاف کر کے آئیے گا۔“

”بہت بہت شکریہ سر۔“ نعیم نے کہا۔ میں اپنے چھوٹے بھائی کو نمکرائی کر دوں گا۔“

”مستر سجاد آپ کب تک واپس آئیں گے؟“

”بس سر! گیا ہوں۔“ سجاد بولا۔ ”چند کیسز ہیں مٹا کر بالکل فائز ہو جاؤں گا۔“

”بہتر ہو گا آپ فائز ہو کر تشریف لائیں۔“ پھر چلے سے فائز ہو کر وہ رخصت ہوئے تو میں نے ہارون کو وزیر داخلہ کی ملاقات اور کوئی کی دریافت کے بارے میں بتایا۔ اس نے اپنی رپورٹ دی۔ شہناز، جانسن کے دروازے سے ملبوس ہو کر لیاقت خان سے مل گئی۔ لیاقت خان پر اپنی ڈیلیوری ہو کر تھا اور بااثر شخص مانا جاتا تھا۔ اس کی رسائی اور تک تھی۔

”وہ واپس آگئی ہے۔“ میں نے اس کی رپورٹ سن کر کہا۔

”اگر لیاقت خان نے اسے کچھ بتایا ہوتا تو ہرگز خرم سلطان کے پاس ڈیلا واپس آنے کی جرات نہ کرتی۔ بہر کیف شہناز جیسا خوسے گی ہم نمٹ لیں گے۔ احمق ہی عورت ہے۔ مجھے اگر خطرہ ہے تو علی رضا سے ہے۔ وہ استین کا سانپ ثابت ہو سکتا ہے۔ جو شخص اتنی جلدی وفاداری بدلنے کا عادی ہو، اس پر اعتماد نہیں کیا جاسکتا۔ اس نے مجھے بلایا ہے۔ وہ دوسرے ساتھیوں سے متعارف کرانا چاہتا ہے۔“

”کیا آپ جائیں گے؟“

ہاں دوست میں نے جواب دیا۔ میں محض وہم سے خوف زدہ ہو کر ملک تو ان کے گروہ کو نظر انداز نہیں کر سکتا۔ اگر علی رضا خلیفہ ہو تو اس کا مطلب ہوگا وہ تمام جیسے سامنے آجائیں گے جو اپنی کرپا کی آڑ میں غلامی کر رہے ہیں میں ایک ایک کالی بھیڑ کو اپنی کرپوں سے گھسیٹ لوں گا یہ لوگ غنڈوں کی بھی بدتر ہیں جیسے پر شرافت کا ٹھپہ لگائے تو م کو دونوں ہاتھوں سے کوٹ رہے ہیں۔

آپ کو تسرہاں کال کرنا چاہیے تھا۔ ہاں شکی لہجے میں بولا آپ چیف ہیں ان کو چل کر آنا چاہیے تھا۔

مخض مند میں ہوں ہاں ہاں میں نے کہا۔ مجھے اگر بے شخص کا گریبان پونے کے لیے چالیہ کی چوٹی پر لایا جاتے تو میں وہاں بھی جاؤں گا۔ گندگی کو صاف کرنے کے لیے ہاتھوں کو جھکا تا پڑتا ہے میں اندر جاؤں گا میں نے کرمانی کی ڈیوٹی بھی لگادی ہے ذہین اور فعال نوجوان ہے تم بھی مجھے کور کرو گے۔

وہ تو کمزور لگا آپ نہیں کہتے تب بھی میں آپ کی پشت پر حاضر رہتا ہوں۔

بھائی بوجھتے۔ میں نے محبت آمیز لگا ہوں سے اُسے دکھا۔

اب میں اور ہر جاؤں گا شہناز کو بھی رپورٹ دینی ہے تم رشیدہ کی غیرت معلوم کر لو بے جاری ہمارے ساتھ ماری ماری پھر رہی ہے۔

ان کو ماسٹر کے پاس کیوں نہیں بھجوتے آپ۔

وہ خود مجھ سے دور نہیں رہنا چاہتی۔ میں اٹھا تو ہاں بھی اٹھ کھڑا ہوا۔

دشک کے جواب میں دودانہ سمیرا نے کھولا اس کی آنکھوں میں کئی تین دن کے لال لال گوروں سے تیر رہے تھے اور بال بکھرے ہوئے تھے۔ اگر اُسے میرے ساتھ رہنا ہوتا تو میں کرمانی، سجاد اور عجم جیسے خوب رو تو جو ان کے درمیان اُسے رکھنے کا فیصلہ کرتے وقت بہت کچھ سوچتا، اس کا بھرا بھرا سراپا اور خوش رنگ چہرہ کسی بھی نوجوان کی دھڑکنوں کو متاثر کر سکتا تھا۔

میں ہنستا کرتے کرتے سوچتی تھی۔ اُس نے دل ربا لہجے میں کہا۔

سمیرا انتظار کرنے والے عمو بھوکے بھی رہتے ہیں۔ میں نے اس کے شلے پر ہاتھ رکھا تو وہ سمٹ گئی۔ مادام کہاں ہیں؟

منسل کر رہی ہیں۔ وہ میرے ساتھ ساتھ چلتے گئی۔ باہر!

مجھے دایس بھیجا جا رہا ہے۔ تم مجھے روک لو۔

لاہور دور تو نہیں سمیرا! میں نے بھی سرگوشیاں آواز میں جوا بیا۔

وعدہ کرو باہر تم ادھر آگے۔ اُس نے اچانک گھوم کر میرے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں تھام لیے ہر میں۔ میں تجھیں.....

اس جذبے کو زبان نہ دو میرا۔ میں نے ہاتھ چھڑ لیے۔ میں سمجھ رہا ہوں لیکن فی الحال وعدہ کرنے کی پوزیشن میں نہیں ہوں۔

کیا رشیدہ رکاوٹ ہے؟

نہیں۔ میں نے اُسے قریب آنے سے روک دیا۔ میری مصروفیات۔ اسی لمحے ہاتھ کا دواڑہ کھلا اور شہناز ہاتھ ساڑن مائل میں نیم عریاں نمودار ہوئی پھر ایک دم پیچھے ہٹ گئی۔

میں یہ نہیں کہوں گا کہ وہ جو شعلہ سا لپکا تھا اُس سے میری آنکھیں چندھیا گئی تھیں۔ ہاں پوسے جسم میں ایک لہر سرسرا رہی تھی نکل گئی تھی جسے عجیب قسم کی شرمندگی نے معدوم کر دیا تھا۔ سمیرا نے پہلے گھور کر دیکھا اور مجھے سکڑتا سمٹا دیکھ کر مسکرائے گئی تھی۔

متم واقعی نرالی شے ہو یا میر۔ اُس نے مدہم آواز میں کہا۔ ایک بل میں یوں لگتا ہے کہ جیسے تم کھلی کتاب ہو اور پھر دوسرے بل میں ہونے لگتا ہے لحظہ بھر پہلے والا باہر کہیں غائب ہو گیا ہے۔

میں لگا نہیں جھکا تے قالین کے پھول گنتا رہا تھا کہ شہناز اُن ڈریس میں باہر نکل آئی وہی تولیہ اُس نے بالوں پر لپیٹ رکھا تھا۔

کیا خبر لائے ہو باہر؟

پولیس کو وہاں سے چار لاشیں ملی ہیں۔ میں نے بتایا کہ شہناز بیٹھے بیٹھے اٹھ کھڑی ہوئی۔ لیکن ان میں جانس کی لاش نہیں ہے۔

اوہ۔ اس نے رکی ہوئی سانس پھوڑ دی۔ تو کیا وہ فرار ہو گیا ہے؟

پولیس کا بھی خیال ہے مادام۔

تم کھانا کیا خیال ہے؟

میں کیا کہہ سکتا ہوں مادام بچاؤں مرنے والے اس کے اپنے آدمی تھے۔ میں نے رُک رُک کر بتایا۔ یعنی ملک لوان کے وفادار جو چڑھتے سورج کی پوجا کرنے لگے تھے۔

کیا یہ چارے حق میں ہوتے نہیں باہر۔

بلاشبہ مادام۔ میں نے چونک کر کہا۔ آپ بے حد حق ہیں مادام، میرا خیال ادھر نہیں گیا تھا، اب لوگ وفاداری بے لے سے پہلے ان لوگوں کے شر سے بھی سوچیں گے۔

لوازش بھی اُسی کے کھلنے میں ڈال دیا جائے گا۔ شہناز خوش تھی۔ کیوں باہر تم پولیس کو لوازش کی طرف متوجہ کر کے دو گنا مٹائی فون کر دو۔ وہ خود دوڑیں گے۔

مادام! میں نہیں پڑا۔ آپ کو شاید یاد نہیں رہا میری دیکھ رہے تھے اور وہ جگہ جگہ میں نہیں تھی پولیس رات کو ہی پہنچ گئی ہوتی۔

اوہ۔ وہ کچھ یاد کر کے پھل پڑی۔ حادثات نے تو میری مت لاری ہے۔ ایک اہم بات بھول گئی تھی آج رات دس بجے میرا ایک آدمی اُسی جگہ مال لے کر آیا ہے اُسے معلوم نہیں کہ وہ جگہ اب خالی ہو چکی ہے۔ پروگرام کے مطابق وہ آئے گا۔ تم مال وصول کرنے جاؤ گے۔

کیا وہ ایک اجنبی کو مال دے دے گا؟

ہاں دے گا، میں تجھیں کوڈ بناؤں گی۔ شہناز نے اٹھ کر پرس اٹھایا۔ پروگرام کے مطابق اسے تین گھنٹوں میں لانی ہے میں۔ میں اس کے حادثے سے ابھی سنبھل نہیں سکی ہوں۔ وہ نہ خود چلی جاتی؟ اُس نے پرس کی پاکٹ سے کچھ نکالا۔ تم اُسے یہ دکھاؤ گے۔

میں نے تھیلی پر رکھ کر دیکھا وہ پوسٹ کا سنہری دھاتی پتا تھا۔ یہ کیا تھیں ملک نے کبھی نہیں بتایا ہماری شناخت کا یہ نشان ہے۔

ڈیڑی نے بتایا تو تھا مگر شاید میں پہلی بار دیکھ رہا ہوں۔

میں نے پتا جیب میں رکھ لیا اور شہناز نے کن آنکھوں سے سمیرا کی جانب دیکھا اور دونوں نے مسکراہٹ کا تبادلہ کیا۔

شکر ہے باہر۔ وہ پرس اچھالتی ہوئی بولی۔ تم نے مجھے پریشانی سے بچا لیا ہے۔

جب میں علی رضا کی طرف ہمارا ہاتھ تو ڈوبتے سورج کی نہری کروں نے شکر پڑیاں کو زرد کر رکھا تھا اس اچانک ہی دل کسی بچے کی طرح ہلک اٹھا تھا کہ شکوہ پڑیاں کی چوٹی پر جا کر اطراف میں پھیلے رنگ و نور کو دیکھوں مگر میں بچے سے بھی کہیں زیادہ بے بس تھا اتنی سی خواہش بھی پوری کرنے پر قادر نہ تھا۔ میں نے دل کو تھپک تھپک کر دھرایا تھا کہ دوران عبادت ایسی خواہشات عبادت میں نفل ہلک تو اب کم کر دیتی ہیں۔

گیٹ کھٹکا جوتا تھا اور ایک زرد دبوڑھا پوریج میں کھڑا دکھائی دیا۔ اُسی نے لپک کر دواڑہ کھولا تھا۔ پوریج میں تین کاریں اور ایک مشینوشی دین پارک تھیں بوڑھا تھکے ہوئے گھوڑے کی مانند میرے آگے آگے چل پڑا تھا۔ احترا م میں بھی سست روی سے بیڑھیا پڑھ کر اوپر گیا۔

پہلو ہارنے۔ ایک دواڑے سے علی رضا نکل کر دانگی سے آگے بڑھا اور پھر مجھے ایسے بانہوں میں بھر لیا جیسے برسوں بعد ملاقات ہوئی تھی۔ تمہارے لیے کچھ آنکھیں لے کل ہیں چلو اندر۔ میں نے نیم وا دواڑے کو پاؤں کی ٹھوک سے کھولا اور ابھی ایک قدم فٹ میٹ تک گیا ہی تھا کہ پشت پر زوردار دھماکا ہوا اور میں اڑکھڑاتا

بھول ہارنے۔ ایک دواڑے سے علی رضا نکل کر دانگی سے آگے بڑھا اور پھر مجھے ایسے بانہوں میں بھر لیا جیسے برسوں بعد ملاقات ہوئی تھی۔ تمہارے لیے کچھ آنکھیں لے کل ہیں چلو اندر۔ میں نے نیم وا دواڑے کو پاؤں کی ٹھوک سے کھولا اور ابھی ایک قدم فٹ میٹ تک گیا ہی تھا کہ پشت پر زوردار دھماکا ہوا اور میں اڑکھڑاتا

بھول ہارنے۔ ایک دواڑے سے علی رضا نکل کر دانگی سے آگے بڑھا اور پھر مجھے ایسے بانہوں میں بھر لیا جیسے برسوں بعد ملاقات ہوئی تھی۔ تمہارے لیے کچھ آنکھیں لے کل ہیں چلو اندر۔ میں نے نیم وا دواڑے کو پاؤں کی ٹھوک سے کھولا اور ابھی ایک قدم فٹ میٹ تک گیا ہی تھا کہ پشت پر زوردار دھماکا ہوا اور میں اڑکھڑاتا

بھول ہارنے۔ ایک دواڑے سے علی رضا نکل کر دانگی سے آگے بڑھا اور پھر مجھے ایسے بانہوں میں بھر لیا جیسے برسوں بعد ملاقات ہوئی تھی۔ تمہارے لیے کچھ آنکھیں لے کل ہیں چلو اندر۔ میں نے نیم وا دواڑے کو پاؤں کی ٹھوک سے کھولا اور ابھی ایک قدم فٹ میٹ تک گیا ہی تھا کہ پشت پر زوردار دھماکا ہوا اور میں اڑکھڑاتا

بھول ہارنے۔ ایک دواڑے سے علی رضا نکل کر دانگی سے آگے بڑھا اور پھر مجھے ایسے بانہوں میں بھر لیا جیسے برسوں بعد ملاقات ہوئی تھی۔ تمہارے لیے کچھ آنکھیں لے کل ہیں چلو اندر۔ میں نے نیم وا دواڑے کو پاؤں کی ٹھوک سے کھولا اور ابھی ایک قدم فٹ میٹ تک گیا ہی تھا کہ پشت پر زوردار دھماکا ہوا اور میں اڑکھڑاتا

بھٹی جس نے مجھے بعد از وقت ہوشیار کیا تھا میں قلابازی کھاتا ہوا جب پاؤں پر کھڑا ہوا تو ایک شخص اُس جگہ آن گرا تھا جہاں سے میں قلابازی میں گیا تھا۔ اس نے یقیناً مجھ پر فٹانگ ایک لگائی تھی۔

دعا آدمی دواڑے کے دائیں بائیں دیوار سے ٹیک لگائے کھڑے تھے دونوں دیوار اور بردار تھے۔ جبریل تو چپ چاپ تھ لیکن اُن کی آنکھوں سے شعلہ نکل رہے تھے علی رضا فٹ میٹ پر کھڑا مجھے گھور رہا تھا۔

یہ سزا تمہارے اُس اصول سے انحراف کی ہے خرم سلطان! علی رضا بولا! میں نے سنا تھا جس نے بھی تھیں دیکھا وہ کسی کو کچھ بتانے کے لیے زندہ نہیں رہا۔ میں یقیناً واحد خوش نصیب ہوں جس نے تھیں دیکھا اور زندہ رہا۔

بچوں سے غلطیاں ہو ہی جایا کرتی ہیں بڑے بھائی۔ میں نے اُس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔ ہر غلطی کی تلافی ہی ہوتی ہے۔ میں اپنی غلطی تسلیم کرتے ہوئے تلافی کروں گا۔

اور یہاں تو کھیل شروع ہو چکا ہے۔ دائیں جانب سے آواز سنائی دی چونکہ آواز سماعت کو مالا س لگی تھی اس لیے میں نے چونک کر دائیں طرف چہرہ گھمایا دواڑے میں شہاب کھڑا تھا وزیر داغدار کا پٹھی۔

ان کو پہچانتے ہو۔ خرم سلطان۔ علی رضا نے پوچھا۔

ہاں۔ میں نے اثبات میں گردن ہلائی۔ شیطانوں کے گروہ کا ایک رکن ہے۔

سانپ کی جب موت آتی ہے تو بیل سے نکل کر راستے میں بیٹھتا ہے۔ علی رضا بولنے لگا۔

تم نے حد محتاط اور بہت بڑے شاطر ہو۔ تم نے مجھے بھی چکر سے دیا تھا اگر شہاب تمہاری اصلیت نہ جان لیتے تو نہ جانے اور کتنے لوگ تمہارے جال میں پھنس جاتے تم حکومت کے خفیہ ادارے اسناد و نشیات کے سربراہ ہو خرم سلطان۔ کاش تجھیں ملک نواز پہچان لیتا۔

مجھے تو حکومت بھی نہیں پہچان سکتی میرے دوستو۔ میں نے بے پردہی سے کہا۔ میں ڈبل گیم کھیل رہا ہوں میں نے چند روز قبل ہی حکومت کو اپنی خدمات پیش کی تھیں کیوں کہ مجھے اپنے ضمن اور سرپرست کی جگہ حاصل کرنا تھی۔

یہ کیوں کسی اور کو سنانا۔ شہاب گرجتا ہوا

یہ کیوں کسی اور کو سنانا۔ شہاب گرجتا ہوا

یہ کیوں کسی اور کو سنانا۔ شہاب گرجتا ہوا



کو چشم نظر رکھ کر ہمیشہ خود کو پولیس کی نگاہوں سے دور رکھتا تھا وہ تمام کوششیں بے کار ہو کر رہ جاتیں۔

کرمانی نے زیادہ وقت نہ لگایا تھا چند منٹ بعد ہی میں نے پولیس کو واپس جاتے ہوئے دیکھا کرمانی اُس وقت تک وہاں کھڑا رہا جب تک جیپ گیٹ سے نہ نکل گئی۔ جب وہ واپس آیا تو میں نے اسٹین گن اُس کے حوالے کر دی۔ کامیابی کے باوجود اُس کے چہرے پر گہری سنجیدگی طاری تھی۔ ہارون گو اُس سے واقف نہ تھا لیکن آتا تو جانتا تھا کہ اُس کا شمار بھی دوستوں میں ہونا چاہیے یہی وجہ رہی تھی کہ ہارون کے ہونٹوں پر دوستانہ مسکراہٹ تھی۔

”مجھے مجبور اپنے ڈی کارڈ کو استعمال کرنا پڑا ہے“ کرمانی نے معذرت خواہانہ لہجے میں بات شروع کی۔ ”میں نے انیسٹر کو بتایا ہے کہ ہم ایک مشن کے لیے آدھریک کر رہے تھے۔“

”حقیک یو کرمانی!“ میں نے بھی آفیشل لہجے میں کہا اور تھارے ڈی کارڈ سے کہیں زیادہ ہمارے اسل مشن کو خفیہ رہنا چاہیے۔“

”اب لاشوں کو ہٹانا ضروری ہو گیا ہے“ کرمانی بولا۔ ”آپ ہمیں میں ان لوگوں سے کام لے لوں گا۔“

”آپ کے ذمے ابھی بہت کام باقی ہے میں نے ہارون کے شاترے پر ہاتھ رکھا“ ہارون یہاں سے لاشیں ہٹائے گا۔“

”ٹھیک ہے“ ہارون نے مستعدی سے جواب دیا۔

”کیا جو کچھ اور جتنا کچھ ہوا ایسا ہی ہونا چاہیے تھا سر...؟“

کرمانی نے پوچھا۔

”نہیں!“ میں نے نفی میں گردن ہلائی۔ ”میں اتنی جلدی فیصلہ کرنے کے حق میں نہ تھا۔ زندگی بہر حال بڑی قیمتی ہوتی ہے لیکن

کرمانی شہر سے نکل جانے کا وعدہ کریں تو معاف کر دیے جائیں گے۔“

”ہم کراچی سے تعلق رکھتے ہیں جناب۔“ ایک منمناتا ہوا بولا۔

”وعدہ کرتے ہیں یہاں سے میرے کراچی کے لیے روانہ ہو جائیں گے۔“

”اگر ہم اپنی نگرانی میں روانہ کوں تو تمہیں کوئی اعتراض تو نہ ہو گا دوستو۔“ کراچی کا نام سن کر میں نے اُن کو رد کرنے کا فیصلہ کرتے ہوئے پوچھا۔

اس نے نفی میں سر ہلایا میں نے جھجک کر شہاب اور علی رضا کو دیکھا دونوں غداری کی سزا کا عذاب سہم کر ٹھنڈے ہو چکے تھے۔

”میں نے کوئی غلطی تو نہیں کی باس۔“ کرمانی نے پوچھا۔

”نہیں دوست۔“ میں نے پرستائش لہجے میں جواب دیا۔ ”تھوڑا

کوجب بھی صفائی کے لیے ڈھیل دی گئی سوائے نقصان اور نلامت کے کچھ نہیں ملا۔“ غدار کی شاید تو یہ بھی منظور نہیں ہوتی۔ قدرت کو آزمائش مطلوب تھی، یا ہماری ہی کوتاہی اور بے احتیاطی کا خمیازہ

تھا جو ہماری ہم باہر نکلے ایک پولیس جیپ سرخ آنکھ بھپکانی گیٹ سے داخل ہوئی اور ہمیں دیکھ کر چرچرائی ہوئی ہاتھ دے پر رگ گئی۔

کرمانی نے میری جانب استفسار مہم لگا ہوں سے دیکھا میں نے ہاتھ اٹھا کر اسے انتظار کرنے کا اشارہ دے دیا جیپ سے چار آدمی

کو دے اور دوڑتے ہوئے باڑھ کی آڑ میں چلے گئے۔

”خبردار۔“ ایک آواز ابھری۔ ”تم لوگ ہماری زد میں ہو، ہتھیار بھینک کر ہاتھ گردن پر رکھ لو۔“

”کرمانی!“ میں نے کہا۔ ”گن بھینک دو اور اپنی شناخت کے ساتھ معاملہ نمٹانے آگے جاؤ۔“

کرمانی نے جھجک کر گن زمین پر رکھ دی اور ہاتھ گردن پر رکھ کر چل پڑا۔

پولیس کی آمد کا کوئی جواز سمجھ میں نہ آ رہا تھا۔ ملی فون سیٹ اسی کمرے میں تھا جو

افسوں نے میرے لیے چوہے دال کے طور پر چٹا تھا اگر اُن کے کسی ساتھی نے اطلاع دی ہوتی تو بھی پولیس چند منٹوں میں وہاں

نہیں آ سکتی تھی۔ اب ایک ہی بات قرین قیاس تھی کہ معمول کے مطابق گشت کرنے والی پولیس فائزنگ کی آواز سن کر صورت حال

معلوم کرنے آتی ہوگی۔ بہر حال وجہ کچھ بھی تھی اب ہماری پوزیشن خطرے میں گھر گئی تھی۔ اندر شہاب اور علی رضا جیسے آفسرز کی لاشیں

نہیں اور ہمارے ساتھ اُن کے ساتھی بھی تھے۔ پولیس اگر اندر پہنچ جاتی تو پھر ہمارے چہرے بے نقاب ہو جاتے۔ میں نے جس خطرے

شاید وہ میرے سکوت سے الجھ گیا تھا پھر وہ چپچپے بیٹھنے لگا اُس کا ارادہ اس کی آنکھوں میں تحریر تھا وہ فلائنگ بالک کے لیے فاصلہ

لینے جا رہا تھا پھر وہ سکڑا اور دیکھتے ہی دیکھتے اوپر اٹھا اور میں سب میں ڈوب گیا وہ تیرتا ہوا اوپر سے گزرتا جب ترچھا کرتے گئے سبھل

کر پاؤں پر کھڑا ہوا میں نے بڑے آرام سے اچھل کر اس کی ٹریپر دولتی مار دی۔ وہ ڈکڑا ہوا دیوار کی طرف گیا دوسرے ساتھی نے

اُسے سنبھال کر ایک طرف اچھال دیا اور خود کو دکر میرے سامنے آ گیا اس کا انداز نکتے بازی کا تھا ایک ہاتھ چہرے کی ڈھال بنا کر دوسرے

سے اُس نے میرے چہرے کو ہدف بنایا، میں نے دونوں کلاشیاں جوڑ کر ٹمکا روک لیا۔ تب ہی اس کا بایاں ہاتھ ٹمک بنا ہوا میرے

پریٹ کی جانب لپکا میں نے دونوں جڑے ہوئے ہاتھوں کو نیچے کیا ٹمک کہنیوں پر لگی۔

وہ ضرب لگا کر نیچے ہٹ جاتا جب کہ میں فاصلہ اپنے حق میں کرنا چاہتا تھا تیسری ضرب کے لیے وہ کود کر آگے بڑھا میری

دائیں ٹانگ داشرہ بنائی ہوئی اٹھی اگر وہ ٹھکنا نہ تو ضرب شاید پسلیوں پر لگتی مگر وہ ایک دم خود کو بچانے جھک گیا تھا اس لیے

میرا پاؤں اس کی کھوپڑی سے ٹکرایا تھا ضرب کھا کر وہ بائیں پہلو گر جا چلا گیا۔

میں پاؤں جوڑ کر اوپر اٹھا اور اس کے چہرے پر مانتا ہوا دور جا کھڑا ہوا۔ شہاب تپائی پر اکثر زوں بیٹھا ہوا تھا میں اُسے اور

علی رضا کو تماشا شای جان کر بھول گیا تھا اس نے بائیں ہاتھ سے ریولور میری پشت سے لگا دیا۔

”بس خرم سلطان۔“ وہ غرایا۔ ”علی رضا تمہاری اجازت اور تعاون کے ساتھ میں اس نم کونا کارہ کر رہا ہوں جو ہماری بنیاد

کے نیچے ٹک چلا آیا ہے۔“

”ہاں۔“ علی رضا چہری سانس لے کر اٹھا۔ ”یہ ضروری ہے ورنہ کل ہم نہ ہوں گے۔“

معاذ شہادت کمرے میں گونجی اور شہاب اُلٹ گیا۔ علی رضا نے ابلتی آنکھوں سے ترپتے ہوئے ساتھی کو دیکھا اور پھر وہ بھی منہ کے

نیل اور دھا ہو گیا دوسرے لوگ جہاں تھے وہیں مل چھپ رہے تھے کرمانی اسٹین گن تانے فاجحہ انداز میں داخل ہوا، قدموں کی چاپ سن

کر میں نے تیزی سے گردن گھمائی یعنی دوزانے سے ہارون نکل رہا تھا ”ان کے لیے کیا حکم ہے باس۔“ کرمانی نے علی رضا کے

گروں کی جانب گن سے اشارہ کیا۔

”یہ حکم کے غلام ہیں۔“ میں نے جواب دیا۔ ”اگر زبان بند رکھ

آیا اور اس کا اٹھا ہوا ہاتھ ایک کڑا کے سے نیچے گرا تھا۔

میں نے سائیڈ کٹ مار کر اُس کا بازو کہنی سے توڑ دیا تھا۔

”آرام سے میری بات سنو سر شہاب۔“ میری آواز میں زندگی

عود کر آئی تھی۔ ”بازو کی جگہ تمہاری گردن بھی ڈھلک سکتی تھی میں

تم جیسے جوہوں کے سامنے کوئی فصاحت نہیں کروں گا۔ میں اپنے

مرئی کی ہدایت پر کام کر رہا ہوں کیا تم لوگوں کو معلوم نہیں کہ ملک

توازن نے اپنے بھلے کو تربیت کے لیے پہلے بیرون ملک بھیجا اور

پھر علی تربیت کے لیے اُسے پیٹری زون دیا تھا۔“

”یہ۔ یہ۔ جھوٹا ہے۔“ شہاب بازو تھام کر دہاڑا۔ ”اشرف

اسے گولی مارو۔ ٹانگ پر۔“

معاذ فائر ہوا اور میں اپنی جگہ سے اچھل کر دو فٹ دور جا کھڑا

ہوا تھا۔ گولی نہ جانے کدھر گئی تھی۔

”ٹھہرو اشرف خان۔“ علی رضا ہاتھ اٹھا کر درمیان میں آ گیا

”گولی ٹانگ میں نہیں اس کی کھوپڑی میں ماری جائے گی مگر اس سے

بہت کچھ پوچھ کر۔“ ”سبح سح بتاؤ لڑکے تم کلن ہو۔“ علی رضا نے

میرے گریبان پر ہاتھ ڈالا اور میں نے اُس کی ٹانگوں کے جوڑے میں

گھٹنا مار دیا۔ وہ کراہتا ہوا جھجک گیا شہاب کے حلق سے قہقہے

اُبلنے لگے۔

”اور کچھ پوچھو علی۔“ وہ قہقہہ لگا کر بولا۔ ”کیا تمہیں میری رپورٹ

پر یقین نہیں آیا۔“

اشرف نباد۔ ”علی رضا زمین پر بیٹھ کر بولا۔“ ہاتھوں سے

اس کے کس کس تل توڑ دو۔ میں اس کے حلق سے اگلا کر ہی چھوڑ دگا۔

دونوں نے ریولور اپنی اپنی جیب میں لڑھکاتے اور فھر کتے

ہوئے دائیں بائیں بکھر گئے، تیسرے شخص نے علی رضا کو اٹھا کر

صوفے پر رکھ دیا تھا۔

میں چپ چاپ ہاتھ سینے پر باندھے اُن بازی گروں کے

کرتب دیکھ رہا تھا وہ شاید مجھے پہلے مرعوب کرنا چاہتے تھے۔ ایک

ٹھکرتا ہوا میرے عقب میں چلا گیا اور دوسرا سامنے سے بڑھنے لگا اُس

کا انداز کبڑی کے کھلاڑی جیسا تھا۔ بدن آگے جھکا کر وہ میری آنکھوں

میں آنکھیں ڈالنے بڑھ رہا تھا۔

میں نے برق رفتاری سے پلٹ کر دیکھا اور ادھر سے مطمئن

ہو گیا عقب والا دیوار کے ساتھ لگ کر کھڑا ہو گیا تھا سامنے والا

بڑھتے بڑھتے آگے گیا تھا میں اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالنے چپ

تھا۔ دست بدست لڑائی میں صرف مد مقابل کی آنکھیں ہی اس کے

ارادوں کی غماز ہوتی ہیں اُس کی آنکھوں میں ابھرنے لگی۔

یہ ان باتوں کا وقت نہیں ہے۔

”نہیں جیت، اگر ایسا نہ ہوتا تو یقیناً وہ کچھ ہو جاتا، جس کے بارے میں ہم سوچ بھی نہیں سکتے۔ ہارون کی آواز دھڑکنے لگی۔ اگر کرمانی بروقت فیصلہ نہ کرتے تو وہ آج آپ کو گولی مار دیتا۔“

”میں نے کوئی سرزنش تو نہیں کی مگر ہارون! میں نے ٹھوس آوازیں جواب دیا ہیں، میں صرف ان لوگوں کو ایک اور موقع دینا چاہتا تھا، یہ لوگ بوکھلاہٹ کا شکار تھے ایسے اور بھی ہوں گے، اُکھڑے ہوئے پودے کسی اچھی زمین میں پھر لگ سکتے ہیں، میری یہی کوشش تھی کہ ملک نواز کے لوگوں کو نئی زمین دیں۔“

”میں اپنی کالک جائب میں پڑا۔ ہارون نے چند قدم ساتھ چل کر دھیمی آواز میں پوچھا اور میں نے اُسے علی رضا کے آدمیوں کو ساتھ لے جانے کی اجازت دے دی۔ ہمیشہ کی طرح میری رُوح پر ایک ناقابلِ بیان اداسی اور دکھ سا طاری ہو گیا تھا میرے ہاتھوں یا میری وجہ سے جب بھی زندگی کا کوئی بھرپور چراغ بجھ جاتا تو سوگوار کی دہیز دھند میرے ذہن پر چھا جاتی تھی، مجھے مرنے والوں کا اتنا افسوس نہیں ہوتا تھا جتنا اس خیال سے کہ محسوس ہونے لگتا تھا کہ مرنے والے کی ماں، بہن، بیوی بچے اور کچھ ایسے لوگ ہوں گے جن کی کفالت وہ کرتا تھا۔ ان ہی لوگوں کے نقصان پر میرا دل دکھ گیا تھا۔“

”اسی دل گرفتگی کے زیر اثر جب میں ہوٹل کی بالائی منزل پر پہنچا تو میرا دل کسی سے ملنے اور باتیں کرنے کو نہیں چاہ رہا تھا۔ لیکن دل کی چاہت ملتی کب ہے۔ انسان سونا چاہتا ہے اور حالات نیند منشی میں بند کر کے انسان کی آنکھوں کو بیداری کی اذیت دے جاتے ہیں۔ میں ابھی اپنے کمرے کی جانب دو قدم بھی نہ چلا تھا کہ شہناز زلزلے آگئی تھی۔ وہ رشیدہ کے کمرے سے نکلی تھی مجھے دیکھ کر وہ والہانہ انداز میں دوڑتی ہوئی میرے قریب چلی آئی تھی۔ مجبوراً میں نے اُسے سوگوار سی مسکراہٹ سے تعظیم دی۔“

”ادھ باہر! یوں بغیر ہتھکڑی نہ چلے جایا کرو، وہ میرا ہاتھ تھام کر شاکی مگر پیار سے بولی: ”اب تو وہ کیا شعر ہے، تیرے دامن سے میرا دامن باندھا ہے، بیٹی تم تو ناگزیر شہنشاہ بن گئے ہو۔“

”یہ آپ کی ذرہ نوازی ہے میڈم!“ میں نے دھیرے سے ہاتھ پھیر لیا۔ ”آئیے اندر چل کر باتیں کریں گے۔“

”یہ تم اتنے اداس کیوں ہو؟“

”مجھے خوشی راس نہیں آتی میڈم!“ میں نے کواڑ کھولتے ہوئے

دکھی آوازیں جواب دیا: ”آپ سے مل کر جو خوشی اور راحت کا انجانا احساس ہوا تھا، اُسے شاید کسی کی نظر لگ گئی ہے۔“

”کیا کسی سے لڑکھاتے ہو؟“

”ہاں میڈم! ایک رقیب سے جھڑپ ہوئی ہے۔“

”رقیب...“ وہ کسی پر گرتے ہوئے بولی: ”ادھ آئی سی! رشیدہ کا کوئی چاہنے والا ہر گز ہوگا۔“

”نہیں میڈم!“ میں نے بوٹ کے تسمے کھولتے ہوئے بتایا: ”بلکہ وہ آپ کا کوئی چاہنے والا تھا۔“

”کیا!“ وہ چیخ کر اٹھی: ”کون تھا؟“

”بتانا نہیں میڈم!“ میں نے بوٹ اتار کر ایک طرف اچھال دیے۔ ”وہ ایک دم سامنے آگیا تھا۔ پوچھنے لگا، مادام شہناز کہاں ہے؟ میں نے جب اس نام سے لاعلمی کا اظہار کیا تو پھر گیا۔“

”پھر... پھر...!“

”پھر کیا میں نے اوپر اٹھایا اور سر کے بل دے مارا۔“

”یعنی مار دیا اُسے؟“ شہناز نے گریبان پر گولیا: ”لیکن تھا کون؟“

”یہ کام تو میں نے سوال جواب کرنے والے فرشتوں پر چھوڑ دیا ہے کہ وہ اپنی زبان میں اُسے پوچھ لیں۔“

”وہ کوئی میرا ہمدرد بھی تو ہو سکتا تھا۔“

”ہمدردوں کے انداز جارحانہ نہیں ہوا کرتے میڈم!“ میں نے اُس کے ہاتھ پر ہتھکی ہلکی سی ضرب لگائی اور اُس نے بوکھلا کر گریبان چھوڑ دیا۔ ”میرا خیال ہے جالسن نے اپنا کام شروع کر دیا ہے۔“

”اور تم صرف ایک کتے کو مار کر چلے آئے ہو۔“ وہ تنہے پھر کانے لگی۔

”جو کتنا راستہ روکتا ہے، اُسے ہی تو پتھر مارا جاتا ہے میڈم!“

”میں نے مونہ اُتارتے ہوئے بے پروائی سے کہا: ”اگر زیادہ ہوتے تو مجھے پھیر لیتے اور میں اُن کو پچکاڑتا ہوا یہاں لے آتا۔“

”جالسن احمق نہیں ہے۔“ شہناز پھر قہقہے آوازیں بولی: ”اُس نے ایک کو سامنے کیا ہوگا اور دوسرے تمھاری نگرانی تک محدود ہے۔“

”ہوں گے اور اب وہ باہر کھڑے ہوں گے۔“

”اگر وہ احمق نہیں تو باہر بھی ذہین رکھتا ہے میں نے ادھر کتے ہوئے آنکھیں کھلی رکھی تھیں۔“

”نہیں ڈیر!“ وہ مجھے اکھڑتا دیکھ کر ایک دم گھٹیل گئی اور میرے ساتھ بھڑک کر بیٹھتے ہوئے بولی: ”میرا مطلب یہ نہ تھا، چھوڑو اُسے میں بھی کانچ کی چوڑی نہیں ہوں، میں یہ بتانا چاہتی تھی کہ ہم کل یہاں سے نکل چلیں گے، رشیدہ سے بھی میں نے کہہ دیا ہے کہ ہم

واپس جائیں گے۔“

”ٹھیک ہے میڈم، میں نے جیب ٹٹولتے ہوئے کہا: ”بہن میں کہا: لیکن رشیدہ نہیں جانتی، آپ نے ہماری خدمات صرف پنڈی اسلام آباد کے لیے مستعار لی تھیں۔“

”میں نے تعادلاً انتخاب اپنے لیے کیا تھا بار!“ اُس نے میرے شانے پر ٹھوڑی انگنا چاچی مگر میں سیلبر تلاش کرنے کے لیے جھجک گیا پھر اُکھڑا ہوا: ”مجھے تمھاری ضرورت ہے بار!“

”شکریہ میڈم!“ میں نے ٹریش لہجہ اختیار کر لیا کیونکہ وہ شاطرانہ نسوانی ہتھیاروں سے کام لینے لگی تھی، اگر میں فدیہانہ رویہ اختیار کرتا تو صورت حال ناخوش گوار ہو سکتی تھی۔ شہناز مجھے اپنے حُسن کے رنگین جال میں بکھڑنے کی پالیسی پر عمل کرنے لگی تھی۔

”واقعی تم لوگ میرے ساتھ نہیں جانا چاہتے؟“

”ہاں میڈم!“ میں نے فیصلہ کن انداز میں بتایا: ”میری اپنی جمجھوریاں ہیں، کچھ دتے داریاں ہیں، میں فی الحال پنڈی چھوڑنے کی پوزیشن میں نہیں ہوں۔“

”میں تمھیں جمجھورتو نہیں کر سکتی، وہ ہونٹ چبلنے لگی: ”تم نے مجھے متاثر کیا ہے بار، ملک کے بعد... میں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ اس خلا کو تم...!“

”آپ کے لیے کال ہے سر!“ اکبر کھلے دروازے سے جھانک کر بولا: ”میں نے دل میں اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کیا، جس نے مجھے ایک خوش رُوح جادوگر بنی سے بچا لیا تھا۔“ کال نہیں چیت: ”میرٹھیوں پر اکبر نے سرگوشی میں بتایا: ”ایک روٹی آپ سے ملنا چاہتی ہے، شاید گاؤں سے آئی ہے۔“ میری ٹانگوں سے جان نکل گئی اور بدن پر سرسراہٹیں بھرنے لگی تھیں۔

”جو نہی میں نے اُس کا دروازہ کھولا وہ اچھل کر کھڑی ہو گئی اور میں بل پتھر سا ہو گیا، وہ فاروق چوہدری کی بہن کلثوم تھی اور اُس کی بڑی بڑی سیاہ آنکھیں میرے چہرے پر لگی ہوئی تھیں میں نے دُھندلی دُھندلی نگاہوں سے اُس کے گداز ہونٹوں کی لرزش دیکھی لی تھی پہلے تو وہ کچھ بولنے کی ناکام کوشش کرتی رہی لیکن پھر ناکام ہو کر رہ پڑی۔

”بیٹھ جائیں محترمہ!“ میں نے میرے کاسہ ہارے کر کرسی تک سفر طے کرتے ہوئے کہا۔

”مجھے... مجھے خرم سلطان چوہدری تک پہنچایے پلیر!“ وہ گلوگر بھیجی ہوئی ”میں خطرے میں ہوں۔“

”بیٹھ جائے بس کلثوم!“ میں نے کرسی پر گرتے ہوئے کہا: ”ادھ بتاؤ

آپ کو کس سے خطرہ ہے؟“

”کیا چوہدری صاحب موجود نہیں ہیں؟“ اُس نے کھڑکی کے شیشے سے باہر دیکھ کر پوچھا۔

”میں ہی وہ بدبخت چوہدری ہوں!“

”ادھ... نن... نہیں...!“ وہ لاکھڑائی ہوئی دیوار سے جا لگی

”آپ... آپ...!“

”ہاں کلثوم! اس چہرے کے نیچے خرم سلطان کا چہرہ چھپا ہوا ہے۔“

”ادھ میرے خدا...!“ وہ قدم بڑھا کر میرے کمرے آگئی: ”خرم، خدا! مجھے یہاں سے لے چلو، میرے تعاقب میں میرے بھائی کے دو کتے ہیں۔“

”کیا تم میرے لیے یہاں آئی ہو؟“

”ہاں، میں وہ آگ بچانے آئی ہوں خرم، جو آپ کی حویلی سے ہماری حویلی تک دیوار بن گئی ہے، میں بہت کچھ بتانے آئی ہوں، لیکن یہاں نہیں پہلے مجھے کسی محفوظ جگہ لے چلو۔“

”میرے ساتھ آؤ!“ میں نے کہا اور وہ میرے ساتھ افس سے نکل آئی: ”تم اوپر چلو، وہ میٹر جیول کی جانب ڈر سی تو میں کاؤٹر تک چلا گیا۔ اکبر کو ضروری ہدایات دے کر میں میٹر جیول پر چڑھا اوپر گیا، کلثوم کا ریلوے دریں کھڑی تھی۔

”میں اُسے ایک فوری خیال کے تحت رشیدہ کے کمرے میں لے گیا، مادام شہناز اور اکبر کو میں کوئی ایسا تاثر نہیں دینا چاہتا تھا، جس سے میرے کردار پر انگشت فانی ہو سکتی۔ رشیدہ بیڈ پر نیم دراز کوئی میگزین پڑھ رہی تھی۔ دروازہ نیم دھاتا پھر بھی میں نے دستک دے کر اندر جانے کی اجازت طلب کی تھی میرے ساتھ کلثوم کو دیکھ کر رشیدہ کا چہرہ ایک سوال بن گیا تھا۔

”یہ کلثوم ہے؟“ فاروق چوہدری کی بہن! ”رشیدہ طلب کر اٹھی اور کلثوم نے آگے بڑھ کر ہاتھ رکھا دیا۔“

”اور یہ میری بہن رشیدہ بیگم ہے۔ دونوں نے گرم جوشی سے ہاتھ ملائے: ”اب آنے کا مقصد بتاؤ۔“ کلثوم نے میری جانب دیکھ کر رشیدہ کی طرف دیکھا میں بتا چکا ہوں یہ میری بہن ہے۔“

”بہن بات سن لیجیے، میں کشتیاں جلا آئی ہوں، کلثوم نے چلو! اُتار کر دوپٹہ اوڑھتے ہوئے بتایا: ”کل آپ سے ایک بزرگ منٹے گئے تھے اُنھوں نے مجھے بتایا ہے کہ آپ کو میری ضرورت ہے۔“

”اگر میں یہ بتاؤں کہ وہ بزرگ ہمارا دشمن ہے تو میں نے نرم آواز میں جواب دیا: ”اُس نے شعلوں کو بھڑکایا ہے تو میں اپنے فیصلے پر پشیمانی ہوئی، گفتگو میں اُس نے تعادلاً نام لیا تھا لیکن یہ جھوٹ ہے

کہیں نے اسے اپنی ضرورت کا پیغام دیا تھا۔

”تو واقعی آپ نے مجھے نہیں بلایا؟“

”نہیں، آخر کیوں میں تمہیں بلاتا؟“

”پہلے کوئی بات نہیں۔“ وہ گہری سانس لے کر بولی۔ ”میں ہی اعتراف کرتی ہوں مجھے آپ کی ضرورت تھی، چند روز قبل منظر بھائی نے مجھ سے ایک تجویز کے بارے میں پوچھا لیکن بعد میں مجھے پتا چلا کہ وہ تجویز آپ نے مسترد کر دی ہے، میں پوچھنا چاہتی ہوں آپ نے تجویز کو نہیں مجھے کیوں مسترد کیا ہے؟“

”اس لیے کہ قیمت تمہاری لگائی تھی، وہ کسی بھی غیرت مند کے لیے قابل قبول نہیں ہو سکتی۔“

”اگر قیمت کا مطالبہ واپس لے لیا جائے تو...؟“

”تو یہ ایک دوسری صورت ہوگی اور اس کا فیصلہ میری ماں کر سکتی ہے۔“

”یعنی آپ کو کوئی اعتراض نہیں ہے؟“

”میں اپنی ماں کے فیصلے کو قبول کرنے کا پابند ہوں۔“

”اب اہم بات بھی سن لیجیے، کل رات کسی وقت فاروق بھائی گاؤں کے نوجوانوں کے ساتھ حویلی جا رہا ہے، پہلے وہ آپ کی ماں سے اپنی امانت مانگے گا، انکار کی صورت میں زمین باجی کو جبراً اٹھا لیا جائے گا۔“

”اڈوں۔“ میری ناک سے جلتی ہوئی ہنکار ابھری۔ ”تمہیں اس لیے یہاں آنے کے لیے راستہ دیا گیا ہے کہ فاروق اور گاؤں کے نوجوانوں کو ایک معقول جواز مل جائے۔“

”ہو سکتا ہے سبھی دھبہ رہی ہو۔“ کلثوم بولی۔ ”میں نے فاروق بھائی کو بتا دیا تھا کہ اب میں ایسے بے غیرت بھائیوں کے ساتھ نہیں رہ سکتی۔“

”اور کوئی بات؟“ میرا دل بڑا ناگوار دیکھ کر رشیدہ نے آنکھوں کے اشارے سے پُرسکون رہنے کی درخواست کی تھی۔

”میں واپس جاؤں گی، وہ آٹھ گھنٹہ کی ہوئی ہے، اب مجھے احساس ہوا ہے کہ مجھے ایک سوچے بچے منصوبے کے تحت گھر چھوڑنے کی ترغیب اور سہولت دی گئی ہے۔“

”کیا وہ لوگ تمہارے ساتھ جائیں گے؟“ میں نے پوچھا۔ ”اگر نہیں تو تمہیں کچھ وقت انتظار کرنا ہوگا، میں تمہاری داپسی کا انتظام کروں گا۔“

”شکر ہے خرم۔“ وہ چل پڑی۔ ”میں جس طرح آئی تھی اسی طرح چلی بھی جاؤں گا، بھائی کئے ہی بے غیرت کیوں نہ ہوں، وہ مجھے تنہا نہیں چھوڑ سکتے، وہ آدمی بظاہر تعاقب کر رہے تھے لیکن اب مجھے یقین ہو گیا ہے کہ ان کو میری حفاظت پر مامور کیا گیا ہوگا۔“

رشیدہ بھی ساتھ ہی راٹری ڈھنگ گئی تھی۔ کلثوم نے رشیدہ سے ہاتھ ملایا اور مجھے خدا حافظ کہتی ہوئی باہر نکل گئی۔

میرے ذہن کی دھواں دھواں دیواروں سے سوچوں کی چنگولیں نکلنے لگی تھیں۔ میرے تمام دشمن بے غیرت اور پرے درجے کے کینے ثابت ہو رہے تھے۔ مادام شہناز، علی رضا اور جیسے لوگ اگر بے غیرت اور کینے تھے تو کوئی تعجب کی بات نہ تھی، وہ تو میرے نزدیک انسانیت کی مسخ شدہ صورتیں تھیں، وہ ظاہر و باطن اور پیشے کے لحاظ سے بُرے لوگ تھے مگر فاروق اور منظر جو ہمدردی کی بے غیرتی نے مجھے دکھائی نہ دیا تھا بلکہ اندر سے آبلے پڑ گئے تھے۔ میرے دس کی مٹی کی کسی اتنی بے غیرت نہ ہوئی تھی، میرے گاؤں کے پانی میں کینگی کے جراثیم بھی نہ تھے پھر فاروق اور منظر کیسے بھائی تھے، جنہوں نے اپنی خواہشات اور مفادات پر معصوم بہن کو قربان کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ مجھے یقین تھا وہ سب یقیناً ان کی بہن نے گئی تھی کہ اسے ایک منصوبے کے تحت گھر سے نکلنے کی ترغیب دی گئی تھی۔ میں بُت کی طرح گنگ اور بے حس و حرکت کھڑا کلثوم کو دیکھ رہا تھا، وہ پوری تک تیز قدموں سے گئی تھی پھر پلٹ کر اس نے دیکھا اور واپس مٹی آئی۔

”اُسے واپس لے جاؤ رشیدہ، میں نے کہا کہ اُسے ملکہ اُس کا چلا جانا ہی سب کے مفاد میں ہے۔“

”خرم۔“ رشیدہ بولی۔ ”ہم اُسے روک کر ان لوگوں سے بہتر پوزیشن میں بات کر سکتے ہیں۔“

”نہیں۔“ میں نے بھرپور جواب دیا۔ ”میں اپنے دامن پر اتنا گندہ داغ نہیں لگانا چاہتا۔“

”صاف کرنا خرم۔“ وہ پہلی سیر میں پر رُک کر بولی۔ ”میں ایک مزدوری بات بتانا بھول گئی تھی، کل رات نو بجے قاسم چاچا کے گھر فاروق اور اُس کے دوست بزرگوں کی حمایت حاصل کرنے جائیں گے اس سے قبل کہ وہ گاؤں کے بڑوں کی تائید حاصل کریں، آپ اپنے گاؤں کے چند بڑوں کو قاسم چاچا کے گھر بھیج دیں تاکہ تعداد کی نوبت نہ آنے پائے۔“

میں نے صرف اثبات میں گردن ہلائی اور رشیدہ باہر نکل گئی۔ وہ خرم اور رسم جو مجھے ادا کرتی تھی اُسے رشیدہ نے محسوس کر لیا تھا، وہ کیسٹ تک اُس کے ساتھ گئی تھی۔ میرے پاس کوئی فارغ ساتھی نہ تھا اگر ہوتا بھی تو ان حالات میں کسی کو رسم کے نام پر قربان کرنے کا فیصلہ نہ کرتا۔ کلثوم کی دوسری اطلاع نے میری سوچوں کا دھیرہ بدل دیا تھا۔ میری سوچ غلط تھی یا درست اس کا فیصلہ میں نے وقت پر چھوڑ دیا تھا۔ کلثوم خود نہ آئی تھی اُسے سارا میں شامل کیا گیا تھا اور اُسے ماضی کے ایک حوالے سے بھیجا گیا تھا، اور نہ ایک دیہاتی لڑکی اتنی جرات نہیں کر سکتی تھی۔

رشیدہ ابھی پوری سے دور رہی تھی کہ میں دوڑتا ہوا کارنگ گیا وہ بھی تیزی سے میری جانب بڑھی تھی۔ میں نے کار دیورس گیر میں ڈالی اور پھر میرے اندک اضطراب شاید بہتوں تک سرایت کر گیا تھا۔... یا انارٹی پن تھا۔ لہجے میں چھلانگ لگائی اور ہار کھینچی ہوئی لان میں داخل ہو گئی۔

”کیا بات ہے بھائی جان؟“ رشیدہ باز پھلانگ کر میرے قریب آ کر نشوونما میں بیٹھ گئی۔

”بیٹھو! میں نے فرنیٹ ڈور کھول لیا اور وہ اُچھل کر سیٹ پر بیٹھ گئی۔ میں اس لڑکی کو چیک کرنا چاہتا ہوں۔“

”یہ فیصلہ بعد از وقت ہے میرے بھائی۔“ رشیدہ نے بتلایا۔ ”اُس کے لیے ایک پرانی جیب باہر کھڑی تھی لیکن لڑکی میری وجہ سے گے نکل گئی اور جیب اُس کے تعاقب میں ماتی میں دیکھ آئی ہوں، کیا اب بھی شک کی کوئی رعایت اُسے دی جا سکتی ہے؟“

”نہیں۔“ میں نے کار بڑھاتے ہوئے کہا۔ ”اگر وہ دوسری اطلاع دینے واپس نہ آتی تو میں اُسے صرف ایک مذہباتی اور مخلص لڑکی ہی سمجھتا۔“

”ہم اوپر پہنچے تو شہناز کا ریڈیو میں ٹپل رہی تھی۔ رشیدہ بھیگی ہٹی کی طرح سکڑی سمٹی اُس کے سامنے کھڑی ہو گئی لیکن شہناز نے اُس کی جانب دیکھا، تب ہی دوسرے کمرے سے سمیرا نکل آئی، اُس نے بال درست کرنے کے بہانے مجھے کوئی اشارہ دیا اور پھر کافہ کی گولی گلی کی طرف اُچھا دی۔ میں اُسی وقت شہناز نے ایک دم پلٹ کر دیکھا، شاید میری نگاہوں میں ابھرتی حیرت نے اُسے محسوس کر لیا ہوگا۔ اُس وقت کافہ کی گولی سفر میں ہی تھی۔“

”رشیدہ...“ شہناز نے حکماً آواز میں کہا۔ ”مجھے سے وہ پُرزہ اٹھا لاؤ۔“ لیکن اس سے قبل کہ رشیدہ حرکت میں آتی، سمیرا چیل کی طرح گلی پر چھٹی اور گولی اٹھا کر منہ میں ڈال کر نکل گئی۔

”اندھلی جاؤ۔“ شہناز نے کرخت آواز میں کہا۔ ”ہاں بارہا تمہیں یاد ہے نا میں چلتا ہے؟“

”صرف میرے لیے حکم تھا میڈم! میں نے گزٹ کی طرح رنگ بدلتی اُس شاعر خورت کو جواب دیا جس کا بگڑا ہوا چہرہ حیرت انگیز طور پر ایک دم پھول کی طرح شگفتہ ہو گیا تھا۔“

”ہاں، لیکن اب پروگرام میں تبدیلی ہو چکی ہے، ڈراما سیر، میرا رابطہ قائم ہو گیا تھا، میں نے پارٹی کو دوسری جگہ ٹھکانا ہے، وہ جگہ خطرناک بھی ہو سکتی ہے۔“

”میں تیار ہوں میڈم۔“ میری نگاہوں کا زاویہ پھر بدل گیا تھا سمیرا نے اندر جاتے ہوئے ہاتھ پیچھے کر کے انگلیوں کو نفی میں ہلایا

تھا، غالباً وہ مجھے شہناز کے ساتھ جانے سے روکنا چاہتی تھی اگر اس کا تحریری پیغام مل جاتا تو شاید میں کوئی فیصلہ نہ کر سکتا مگر صرف روکنے سے میں روکنا نہیں چاہتا تھا کیونکہ شہناز کے وہ ہرے بھی دیکھنا چاہتا تھا، جو پہلائی پر مقرر تھے، میرے لیے وہ لوگ دوسروں سے کہیں زیادہ اہم تھے۔ دوسری وجہ یہ بھی تھی کہ بقول مادام کے، وہ ملک نواز کی عدم موجودگی میں پہلی بار زیادہ مقدار میں مال لایا ہے تھے مجھے اُن ناگوں کی ہتھیلیوں سے وہ نہر نکالنا تھا، جو معصوم انسانوں کے لیے لایا جا رہا تھا۔

”کم آن بار! شہناز خوش گوار آواز میں بولی۔ ”میں اب چلتا چاہیے، رشیدہ! اس ہنگام سے کہو جس حالت میں ہے پی آئے۔“

اس سے قبل کہ رشیدہ اندر جاتی، سمیرا دوپٹہ لہرائی ہوئی نکل آئی۔ ”آپ پلیس میڈم، میں نے کہا کہ صرف مجھے پھینک دیں۔“

”جلدی کرو۔“ شہناز نے چٹکی بجاتی ہوئی رشیدہ ہلکے سا ہاتھ سے ”بابر سے پوچھیے میڈم، رشیدہ نے مؤدب لہجے میں جواب دیا۔“

”میں تو بابر کے اشاروں پر ناپختہ والی گڑیا ہوں۔“

”نہیں جان! میں نے پلٹ کر کہا تو تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں ہے آرام کرو۔“

”رشیدہ میرا پرس سمجھا لیتا، سمیرا بولی لیکن رشیدہ اُسے جواب دینے بغیر میرے پیچھے کمرے میں چلی آئی تھی۔“

میں نے ڈارٹ پستول الماری سے نکال کر جیب میں رکھا اور رشیدہ میرے پُرتے اور موزے نکالتے ہوئے مدھم سڑوں میں بولنے لگی۔ ”سمیرا کچھ بتانا چاہتی ہے خرم، مادام کو کسی نہ کسی طرح ایک دو منٹ کے لیے ادھر ادھر کریں، میں اُس سے معلوم کر لوں گی۔“

”ہری آپ بولنے۔“ شہناز دروازے کے درمیان آن کھڑی ہوئی۔

میرا خیال تھا کہ سمیرا کے پاس کوئی خاص اطلاع نہ ہوگی، وہ محض اپنی ہمدردیاں جتا کر میری توجہ حاصل کرنے کی پالیسی پر گامزن تھی پھر بھی میں چاہتا تھا کہ جانے سے قبل سمیرا کی بات سن لوں مگر شہناز ایسا کوئی موقع دینے کے موڈ میں نہ تھی۔ میں پہلے بھی بتا چکا ہوں کہ مجھے ہر جگہ اور اطلاع سے کہیں زیادہ اُن لوگوں کی ضرورت تھی۔ تنگ نوازی بھری ہوئی فوج نے کمانڈر کے گرد جمع ہونے لگی تھی۔ میں فاتح کمانڈر تھا اور یہ میرا فرض تھا کہ مشتر قوت کو یکجا ہونے کے تمام راستے اور ذرائع بند کر دوں، میں نے سمیرا کی خوبصورت اور روشن آنکھوں میں بے نام سی بے قراری اور خوف کے سائے لرزے دیکھے تھے لیکن شہناز کی موجودگی ہمارے درمیان ناقابل عبور رکاوٹ تھی جسے وہ خوف کی وجہ سے توڑ نہ سکتی تھی اور میرے قدم احتیاطی کی نیچروں میں جکڑے ہوئے تھے۔ وہ کچھ کہنا چاہ رہی تھی اور میں سننا چاہتا تھا مگر وہ کچھ نہ کہہ سکی اور میں

نہ نہ سکا تھا اور اسی کش مکش میں جب کارمال روڈ پر چڑھی تو شہناز نے میری کلائی پر پتکی دی۔ میں نے چہرہ گھا کر سپاٹ لگا ہوں سے دیکھا، وہ سراپا مسکراہٹ بنی میری آنکھوں میں دیکھنے لگی، عین اسی وقت دائیں پہلو کی پسلی پر اشارہ دیا وہ محسوس ہوا اور میرا جی پا کر کھل کر قہقہہ لگاؤں۔ اپنی بے بسی اور وقت کے مذاق پر واقعی قہقہہ لگانا چاہیے تھا، دونوں عورتیں اپنے اپنے مفاد کی کڑا ہی لڑنے لگیں۔

میں نے بائیں ہاتھ کو نیچے گرایا اور مسکراتی نگاہوں کے ساتھ اس کو اٹھانے کی اداکاری کرتے ہوئے شہناز کو مصروف رکھا۔ سیرانے میرے ہاتھ کی پشت پر کراس کا نشانہ بنایا تھا میرا خیال ماہو پھر کوئی تحریری پیغام دینا چاہتی ہے مگر اس نے صرف نفی کا سہارا لیا اور اشارہ دیا تھا یہ قہقہہ شہناز کے ساتھ جانے سے روکنا چاہتی تھی مگر میں بہر صورت شہناز کے ساتھ جانے کا فیصلہ کر چکا تھا۔

”بابر! شہناز بولی“ ہمیں ڈھیری حسن آباد تک جانا ہو گا۔

”بہتر مادام!“ میں نے جواب دیا۔ ”آپ رہنمائی کریں گی۔“

حفظ ماتقدم کے طور پر میں نے داغ ٹرانسپیرنٹ آن کر دیا تھا، میں جتنا تھا کہ ہارون اور رشیدہ اگر چاہیں تو جلدی گنت گویں شامل ہو سکتی تھیں۔ حالانکہ میں نے ان دونوں کو ایسی کوئی نہایت نہ دی تھی لیکن میں جتنا تھا کہ ٹرانسپیرنٹ آن ہونے کا اشارہ پا کر وہ اپنی تمام مصروفیات میں پشت ڈال کر ہماری جانب متوجہ ہو جائیں گے۔ لالہ زار کا لونی کوئی بات نہ ہوئی تھی پھر شہناز نے راہنمائی شروع کر دی تھی۔

وہ دو منزلہ عمارت گزرا اسکول کے گیٹ کے سامنے واقع تھی، گیٹ پر ایک چوکیدار چلم نوشی میں مصروف تھا چونکہ گیٹ کھلا ہوا تھا اس لیے چوکیدار اپنی جگہ سے ہلکا نہ تھا، پورے سے بہت ہی ہوشیار اور سائیکل کو دیوار کے ساتھ کھڑا کیا گیا تھا بغیر پیٹ اگر عام ہو جاتی تو شاید وہ میرے ذہن میں محفوظ نہ رہتی۔ عمرانی شکل کی ہر پیٹ تھی اس لیے یاد رہی تھی، دوبار کار کو اور ٹیک کرتی اس وقت گیٹ میں داخل ہوئی تھی، جب میں چوک کراس کر رہا تھا اس مطلب یہی تھا کہ شہناز کو وہی موٹر سائیکل گائیڈ کرتی آئی تھی۔

غیر راج کاشٹر اوپر اٹھا ہوا تھا۔ اندر ایک سیاہ دین جیک آپ تھی دو آدمی کام میں مصروف تھے شہناز نے نیچے آ کر کاپی کار کی باڈی بجائی۔

میرے ایک نوجوان ہاتھ صاف کرتا ہوا باہر نکل آیا۔

”کیا سجاد صاحب موجود ہیں؟“ شہناز نے اس کے سلام کو نظر انداز کرتے ہوئے تنکنا نہ ہیچ میں پوچھا۔

”ہم باہر کے آدمی ہیں“ نوجوان نے جواب دیا۔

”بھاگ جاؤ“ سیرا کی سرگوشی میں چنچ تھی، اتنا کہ کردہ باہر نکل گئی کیونکہ شہناز جواب پا کر ہماری جانب متوجہ ہو گئی تھی۔ انسان کتنا ہی اپنے مقاصد کا وفادار اور مگر کتنا سخت کیوں نہ ہو، بشریت تو اس کا ساتھ نہیں چھوڑتی، سیرانے تو قدم اول سے اشاروں کنایوں سے باور کرانے کی کوشش کی تھی مگر میرے سر پر وفاداری اور کچھ کر دکھانے کا بصوت سوار تھا۔ مگر آخر کو آدمی تھا، موت کا خوف دل کے کسی تار یک گوشے میں چھپا رہتا تھا جب اس نے اترتے اترتے آخری وارنگ دی تو میرا ہاتھ جیسا ارادہ متزلزل ہونے لگا تھا بچتا دے کا احساس مجھے دور رہے پر گھسیٹ لے گیا تھا میرے پاس تلانی کا وقت تھا، میں واپس جانے کی پوزیشن میں ہی تھا۔ شہناز اور سیرا باہر تھیں اور میں ڈرائیونگ سیٹ پر تھا اگر گاڑی بیک میں لے جاتا تو کون مجھے روک سکتا تھا

میرا ہاتھ بالکل غیر اراداتی گھیر کی جانب چلا گیا اور میں نے بیک گئیر لگا بھی لیا تھا کہ میری سماعت سے گٹ بند ہونے کی آواز نکلتی۔ میں نے گردن گھما کر دیکھا چوکیدار گیٹ کو تالا لگا رہا تھا اور اس کے قریب دو مسلح آدمی کھڑے تھے۔ چہرہ واپس آیا تو حیرت کا دوسرا جھٹکا لگا گیاراج میں جو لوگ کام کر رہے تھے ان کے ہاتھوں میں بھی دیو اور تھے۔ مادام شہناز اور سیرا اندر جانے کے لیے چند قدم دوڑ جا رہی تھیں۔

میرے ہاتھ اسٹیئرنگ وھیل پر جم گئے اور اندر خطرے کی گھنٹیاں بجنے لگیں لیکن سب کچھ بعد از موت واویلے کے مترادف تھا، مجھے چاروں اطراف سے گھیر لیا گیا تھا۔

”نیچے آؤ پیارے“ ایک نوجوان نے مکرراتے ہوئے اشارہ کیا۔ میرے ذہن کا میٹر تیزی سے گردش کرنے لگا۔ میرے ڈارٹ لیستوں میں ایک درجن ہینک سٹیٹیاں تھیں لیکن سوال صرف یہ تھا کہ میرے مقابل مجھے کتنا موقع دیں گے۔ انھوں نے فاصلہ بھی اپنے حق میں رکھا ہوا تھا۔ دو آدمی گاڑی کے قریب تھے، ایک گیاراج کے اندر تھا جبکہ تین گیٹ پر تھے اور عمارت کا صرف سامنے کا حصہ قابل عبور تھا دائیں بائیں دوسری عمارتوں کی دیواریں تھیں۔

معا میری نگاہ میٹر جیوں پر جا پڑی اور پھر میں نے اترنے کا فیصلہ کر لیا تھا میٹر جیوں پر مافیا کا مقامی سربراہ جاسن کھڑا تھا۔ مجھے یہ خوش فہمی ہرگز نہ تھی کہ وہ میرا دوست تھا لیکن ماضی قریب کے واقعات اور ملاقات نے مجھے بڑا سہارا دیا تھا، وہ اگر میرا دوست نہ تھا تو مادام شہناز کا بھی بہی خواہ نہ تھا میں نے سوچا تھا

کہ جاسن نے بڑی گہری چال چل کر شہناز کو گھیر لیا ہے۔

میں نے دروازہ کھولا تو دیو اور دیوار دو قدم پیچھے ہٹ گیا۔ میں اسے دوستانہ مسکراہٹ دیتا ہوا چل پڑا۔ بھری پر چلنے کی آواز سے اندازہ ہوا تھا کہ دونوں میرے پیچھے پیچھے چل رہے تھے۔ شہناز نے آخری سیرس سے پیٹ کر دیکھا اور پھر جاسن سے ہاتھ ملاتی ہوئی کارڈیوڈ میں غائب ہو گئی تھی۔

”ہیلو بولنے“ جاسن خوش گو اور بے میں بولا تو مجھے یقین نہیں تھا کہ تم آؤ گے۔“

”میں ایسا ہی ہوں مسٹر جاسن“ میں نے اس کا بڑھا ہوا ہاتھ تھام لیا۔ ”حیرتیں میرے ساتھ سفر کرتی رہتی ہیں یہی وجہ ہے کہ میں آپ کو یہاں موجود پا کر حیرت زدہ نہیں ہوا۔“

”تم لوگ باہر رہو گے“ جاسن نے میرا ہاتھ بغل میں دیتے ہوئے کہا اور وہ دونوں ایڈریل کے بل گھوم کر دائیں بائیں برآمدے کے ساتھ ساتھ چل پڑے۔ ”ہاں تو میں کہہ رہا تھا مافی ڈیڑھ واقعی مجھے توقع نہ تھی۔“

”بے وجہی“ میں نے ہنسنے لگا جیسے خالی ڈیا لڑھک رہا ہو میری ہنسی مصنوعی اور کھوکھلی تھی۔ ”میں مادام کا باڈی گاڑ رہوں، جہاں بھی وہ جائیں گی مجھے جانا پڑے گا۔“

”اوہ!“ جاسن نے غصہ سا قہقہہ لگایا میں مجھول گیا تھا۔

”اس نے بند کواڑوں کو پاؤں کی ٹھوک لگائی اور مجھے ساتھ لیے اندر داخل ہو گیا۔ کمرے میں بوسیدہ فرنیچر اور پھٹا ہوا بے رنگ قالین بچھا ہوا تھا۔ پھولوں پر گرد کی دبیز تہ جمی ہوئی تھی مشرقی دیوار پر خون کے پائسرخ روشنائی کے دھبے لگے دکھائی دے رہے تھے۔

”بیٹھو یہاں“ جاسن نے بظاہر بے تکلفی سے مجھے دھکا دیا۔ ”میں نے ایک ڈراما تیار کیا ہے، اسکرپٹ بھی میرا ہے اور ڈائریکشن بھی میں ہی دوں گا۔“

”اگر مگر وہی کردار مادام کو دیا جائے تو...؟“

”بالکل بالکل“ جاسن میری بات کاٹ کر ہاتھ بچا کر بولا۔ ”تم ریڈنگ رول ادا کرو گے۔“

بغلی دروازے کا میلہ پردہ ہٹا، اندر آئے والوں میں شہناز لگے تھی، اس کے پیچھے چار آدمی تھے، چاروں اچھے فائٹر تھے یا نہیں لیکن ان کے چہروں پر غصہ، گردی کی چھاپ نمایاں تھی اور چاروں خیر ملکی تھے۔

شہناز نے ایک کرسی اٹھائی اور کونے میں جا کر بیٹھ گئی۔

”کیا سب کردار تیار ہیں جیک؟“ جاسن نے اس کے لیے میں پوچھا۔

طویل قامت نوجوان نے اثبات میں آنکھیں پچائیں۔

نادر عظیم حماقت - مصنف ابن صفی

اس بے بسی اور خود فراموشی کی مدت خواہ کتنی ہی طویل رہی ہو... بالآخر شہناز کی روحا کی نفی اور اسے ایسا محسوس ہوا تھا جیسے وہ اپنی کوشش کے بغیر ہوا میں تیرا چلا جا رہا ہو۔ یہی نہیں بلکہ شاعری والی ”سراپا درد“ کی ترکیب بھی اسی وقت سمجھ میں آئی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے پورے وجود کو عجیب طرح کی اذیت نے جکڑ رکھا ہو۔

”میڈم! میرے پاس دقت کم ہے میں زیادہ دیر ڈرے سے لطف اندوز نہیں ہو سکتا۔“

”میرا کام ختم ہو چکا ہے جاسن!“ شہناز سپاٹ آواز میں بولی۔

”اب آگے تم جاؤ گے۔“

”ہاں آگے تو مجھے ہی جانا ہے جاسن کے حلق سے غراہٹ ابھری۔

”غبرون کو اندر لے آؤ۔“

ایک شخص نے ٹرن لیا اور اندر چلا گیا میں دانتوں پر دانت جملے گرد آلود دیوار پر نگاہیں جملے بیٹھا ہوا تھا جیسے دیہاتی پردہ اسکرین پر اُبھرنے والی تصویر کا منتظر ہوتا ہے۔

جب تصویر ابھری تو میں اُسچل کر کھڑا ہوتے ہوئے پھر گر گیا تھا۔ اندر آئے والا منظر جو مددی تھا اگر وہ لوگ منظر جو مددی کی جانب متوجہ نہ ہوتے تو میرے چہرے کا بھرم ٹوٹ جاتا جب انھوں نے میری طرف دیکھا تو میں پتی پتی کا بُت بن چکا تھا۔ منظر جو مددی نے سر سرھا لگا ہوں سے مجھے دیکھا اور پھر جاسن کو سوالیہ نگاہوں سے دیکھنے لگا۔

”کیا کہتے ہو دوست؟“ جاسن نے اردو میں پوچھا تو منظر جو مددی کی مونچیں مسکرا اٹھیں۔ ”اس نے کندھے اُچکا کر گہری سانس لی۔“

”اگر یہی نوجوان دکھانا مقصود تھا تو میں کہوں گا آپ لوگ غلط آدمی کو لے آئے ہیں! منظر جو مددی نے طنز یہ انداز میں کہا میں نے صرف مادام شہناز کو چونکتے دیکھا تھا جب کہ جاسن کے خوش رنگ چہرے پر مسکراہٹ رقص کرنے لگی تھی۔

”ہماری معزز میں شہناز کو بڑا ناز تھا خود پر جاسن تعجب آمیز آواز میں بولا۔ ”حالا کہ میں نے کہہ دیا تھا کہ خرم سلطان جیسا شاعر شخص یوں نامزدی نوجوانوں کے روپ میں نہیں رہ سکتا۔“

”مجھے!“ شہناز دھڑک کر بولی۔ ”مسٹر جاسن مجھے سرکاری ذرائع

سے معلوم ہوا ہے۔

”وہ سب ذرائع اس شخص کے تابع ہیں میڈم۔“ جانس بولا۔
حکومت اُسے کو ترجیح دینے کے لیے سب کچھ کر رہی ہے حکومت
کے ذرائع نے پہلے تمہیں ٹریس کیا ہوگا اور پھر تمہیں غلط راستوں
پر چلانے کے لیے خرم سلطان کی ڈپٹی کیٹ تیار کی ہوگی صرف نام
کی مدد تک، وہ اس چہرے کو منظر عام پر نہیں لانا چاہتے، تمہاری
مرح میں بھی دھوکا کھا گیا تھا اگر مجھے ہیڈ کوارٹر سے حقائق نہ ملتے تو
میں بھی مار کھا جاتا۔ تمہیں یہ جان کر حیرت ہوگی کہ خرم سلطان انٹرنل
ادارے کا سربراہ بنا کر ادھر بھیجا گیا ہے۔ مادام سعدیہ کے توسط
سے حکومت امریکہ نے اُس کی خدمات حاصل کی تھیں، ایسا شخص
تمہارا باڈی گارڈ درخشیدہ جیسی بڑی کوریجسٹ نہیں ہو سکتا۔“
”تو مجھے ہم اس کے حلق سے اس خرم سلطان نکال لیں گے۔“
شہناز باقلی کتیا کی طرح بھونکنے لگی۔ ”تم مجھے صرف ایک دن دو
جانس! میں وعدہ کرتی ہوں، خرم سلطان کو تمہارے سامنے لے
آؤں گی۔“

”جذباتی مت بنو لڑکی۔“ جانس ٹپکتے ہوئے بولا۔ ”یہ نوجوان
صرف میری بات کی تائید کر سکتا ہے، ہماری مدد منظر چوہدری
کے گائیں نے مشرق میں رہ کر مشرقی روایات اور جذبات
کا گہرا مطالعہ کیا ہے یہاں تم لوگ مذہب اور خون کے رشتوں
کے نام پر پاگل ہو سکتے ہو۔ مجھے معلوم نہیں وہ لڑکا مذہبی ہے یا
نہیں لیکن رشتوں کا تقدس اُس کے غیر میں ہونا چاہیے میں اُس
کے اسی زخم پر تک پاشی کروں گا۔ وہ میرے سامنے ٹانگیں
پھیلا کر کھڑا ہو گیا۔ ہاں مشر بار! تم اُس شخص کے لیے کام کر رہے
ہو، جسے میری تنظیم بھی دنیا کا خطرناک انسان تسلیم کرنے لگی ہے،
لہذا تم اتنے احمق نہیں ہو گے تم نے ہماری باتوں سے بہت کچھ اخذ
کر لیا ہوگا۔ ہماری دنیا میں رحم، مروت اور انسانیت کے جراثیم زندہ
نہیں رہتے، تمہیں یہ بھی معلوم ہوگا، ہم لوگ اپنے مقاصد کی خاطر کہاں
تک چلے جاتے ہیں۔ ہڈیاں توڑنے اور کھال اتروانے کے بعد عموماً
تم جیسے لوگ زبان کھولتے ہیں، کیا تم بھی وفاداری کی وہی رسم ادا
کرو گے۔“

”میں صرف اپنا وفادار ہوں مشر جانس۔“ میں نے ایک ٹانگ
موڑ کر دوسری ٹانگ پر رکھی۔ ”مجھے میا آلودہ گردن شخص جو اسٹریٹ
ہا کر تھا، جو کہنے پر چھوٹی چھوٹی وارداتیں کیا کرتا تھا، جسے اکثر اُس
نک پاتھ پر سونپا جاتا تھا، ایسے شخص کو اگر کوئی قتل کا اندھا پانچ سو
روپے روزانہ پر ملازم رکھے تو اُسے اس شخص کا وفادار رہنا چاہیے

یا اپنے مفادات سے وفاداری نچانی چاہیے۔“

”میرا تو خیال ہے۔“ جانس دو قدم ہٹ کر صوفے پر بیٹھ گیا۔
”ہر انسان کو اپنے مفادات کا وفادار رہنا چاہیے۔“
”میں ایسا ہی ہوں، لیکن نے جواب دیا۔

”اگر میں اس معاہدے میں پانچ سو کا اضافہ کر دوں تو۔۔۔۔۔۔“
”میں صرف وضاحت چاہوں گا۔“
”ڈبل رول پیارے۔“ جانس نے آنکھ دبا کر وضاحت کر دی۔
”کیا میری بات سمجھ گئے ہو؟“

”ہاں۔“ میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ لیکن ایک بات میں
واضح کر دینا چاہتا ہوں، مجھے صرف واضح ٹرانسپیر پورہ ہدایات دیتا
ہے، میں نہیں جانتا وہ کہاں رہتا ہے اور کون ہے، صرف ایک
بار ملاقات ہوئی تھی۔“

”تم صرف رابطے کا ذریعہ بنو گے۔“ جانس نے کہا۔ ”کیا تم خود بھی
اُس سے رابطہ قائم کرتے ہو؟“
”نہیں۔“ میں نے نفی میں گردن ہلاتی۔ ”ضرورت کے تحت وہ خود
رابطہ قائم کرتا ہے۔“

”ہر روز۔۔۔۔۔۔“
”ہاں، وہ گزشتہ دن کی رپورٹ لیتا ہے اور آئندہ کے بارے
میں ہدایات جاری کرتا ہے۔“

”کچھ دن تم ہمارے ساتھ رہو گے۔“ جانس نے پڑی ”میری
موجودگی میں تم ہماری تیار کردہ رپورٹ دیا کرو گے اور اُس کی ہدایات
ہم تک پہنچاؤ گے۔“

”یعنی تمہاری قید میں میں نے سرد آواز میں پوچھا۔ ”میں میڈم
سودی میں آؤں کہ کام کرنے کا عادی ہوں، آپ لوگوں کو اعتماد
سے کام لینا ہوگا، میں مزید پانچ سو کے اضافے پر اپنے سگے بھائی
کے خلاف بھی کام کر سکتا ہوں۔“

”یہ بعد کی باتیں ہیں۔“ جانس مصباحی انداز میں بولا۔ ”تم یہ بتاؤ
گے بار! کل وزیر داخلہ نے تمہیں کیوں بلایا تھا اور زیر دہاؤس کا کیا
چکر ہے؟“

”عجیب بات ہے مشر جانس، وہ لوگ بھی مجھے خرم سلطان سمجھ
رہے ہیں۔“ میں نے ہنسنے ہوئے بتایا۔ ”زیر دہاؤس کو وہ سب جیل بنانا
چاہتے ہیں، مجھ سے اسی معاملے پر بات ہوئی تھی۔“

”اوہ! یہ ایک نیا انکشاف ہے۔“ جانس چونک کر شہنازی
جانب دیکھنے لگا۔ ”اس کا مطلب ہے خرم سلطان صرف چیف اور
صدر تک محدود ہے ابھی۔۔۔۔۔۔“

”ملک نواز کے ساتھ کون گیا تھا بار!؟“ شہناز نے پوچھا۔

”شاید میرے جیسا ہی کوئی کرانے کا آدمی رہا ہوگا میڈم۔“
میں نے بتایا۔ ”مجھے خرم سلطان نے بتنا کچھ بتایا ہے، اتنا ہی
جانتا ہوں۔“

”کیا رشید بھی اسی سلسلے کی کوئی کڑی ہے؟“ جانس نے پوچھا۔
”نہیں۔“ میں نے جواب دیا۔ ”رشید اس سلسلے سے بہت
سے میرے قریب ہے بلکہ ہم دونوں رنگ بازار خان اور سیٹھ سلمان
کے لیے مل کر کام کیا کرتے تھے۔“

”اب میرا حتمی فیصلہ سن لو بار خان!۔“ جانس بولا۔ ”میرے
مگرانی رہو گے، جو میں بتاؤں گا تم خرم سلطان تک پہنچاؤ گے
اور ہمارا دوست منظر چوہدری ہمارے لیے ایسا جال تیار کرے گا،
جس میں خرم سلطان کو پھنسا ہوگا اور اُس جال تک اُسے ہر
رقم لاؤ گے، میں اپنا کام شروع کرنے سے قبل خرم سلطان کا
لوہ مٹانا چاہتا ہوں، مجھے ہیڈ کوارٹر سے یہی حکم ملا ہے کہ سب
سے پہلے خرم سلطان کو راستے سے ہٹایا جائے۔ منظر چوہدری تم
نت تم خرم سلطان کی بہن ہمارے حوالے کرو گے، اُسی وقت
میں یہ ملک چھوڑنے کے کاغذات مل جائیں گے۔“

”صرف کاغذات نہیں جناب!۔“ منظر چوہدری بولا۔ ”میں
میں کو مطلوب ہوں، خرم سلطان میرے تعاقب میں ہے، میں
آج اپنی بہن کو بھی داؤ پر لگایا تھا مگر وہ بھی قتل خرم سلطان سے
موکا کھا گئی ہے، یہی شخص اُس سے ملا ہوگا۔“

”ہم جہاز تک تمہاری مدد کریں گے چوہدری۔“ شہناز نے کہا
”مگر تمہیں مشورہ دوں گی کہ ہنگامہ جاکر ملک نواز سے مل لینا۔“
”شکریہ میڈم۔“ منظر چوہدری ممنون بیچے میں بولا۔ ”اگر
خرم سلطان راستے سے ہٹ گیا تو پھر مجھے یہاں کوئی خطرہ
نہ ہوگا، ہمارا دشمن صرف ایک ہی شخص ہے، وہ ہے
خرم سلطان۔۔۔۔۔۔“

”ٹھیک ہے تم جاسکتے ہو۔“ جانس بولا۔ ”جیک تم یہاں رہو
مگر مشر چوہدری ایک لڑکی لائیں گے اُسے مجھ تک پہنچا کر تم واپس
لڑکی پہلے جاؤ گے۔“

”بہتر پاس!۔“ جیک نے لڑکیاں جوڑتے ہوئے کہا۔ ”کیا مادام
بخود اس کے مطابق۔۔۔۔۔۔“

”ہاں۔“ جانس بول پڑا۔ ”میں شہنازی کی سیکرٹری تمہاری خدمت
کے لیے یہاں رہ رہی رہے گی۔“

”لیکن تم ہوش میں رہو گے جیک۔“ شہناز نے کہا۔ ”وہ غدار

ہے، میں اسے بطور سزا یہاں چھوڑ رہی ہوں۔“

”فکر نہ کریں مادام۔“ جیک خراپا میں اُسے خوبصورت
سزا دیتا رہوں گا۔“
”آؤ چلیں۔“ جانس اٹھتے ہوئے بولا۔

میں نے پہلے ہی فیصلہ کر لیا تھا کہ ان محفلوں کو مزید احمق
بنانا ہی سودمند ہوگا، ہاں اگر وہ جیک کے حوالے کرنے کا فیصلہ
صادر کرتے تو شاید میرا فیصلہ دوسرا ہوتا مگر خواہ مخواہ اچھل کود
بے سود رہی ہوتی، میری پوزیشن بھی کمزور تھی۔ جانس نے ہر صورت حال
سے نکلنے کا معقول انتظام کر رکھا تھا اگرچہ اندر والوں کو نیند کی
نوکیلی گولیاں دے کر باہر نکل جاتا تو باہر والے بچھے ہوئے تھے
اُن کو کاشن دے کر میں فالن کر نہیں سکتا تھا اور بچھے ہوئے مسلح

افراد سے مقابلہ آسان نہ تھا لہذا میرے لیے مصلحت کا تقاضا یہی تھا کہ
اُن کی ہاں میں ہاں ملاتا چلوں اور جب موقع ملے دھکی مارتا، ہٹا نکل
جاؤں۔ منظر چوہدری نے خون کی گردش کو متاثر کیا تھا لیکن وہ وقت کی
آڑ میں تھا، میں اوجھادار کے خرم سلطان کو ظاہر نہیں کرنا چاہتا تھا اگر
وہ پہچان لیتا تو دوسری بات تھی، نہ پہچان کر اُس نے میرا بھرم اور اپنی
جان بچا لی تھی۔ میں پہلے یہ معلوم کرنا چاہتا تھا کہ اُس نے خود میرے شکاریوں
سے رابطہ ملایا تھا یا شکاریوں نے میرے دشمن تک رسائی حاصل کی تھی،
اس کے بعد ہی اُن کے ناپاک منصوبے کا توڑ ہو سکتا تھا جانس، منظر
چوہدری کے توسط سے غالباً زینت کو اغوا کرنا چاہتا تھا اور منظر چوہدری
زینت کے ذریعے دہرا مفاد حاصل کر سکتا تھا۔

باہر تک مجھے آتیشیں ہتھیاروں کی چھاؤں میں لے جایا گیا تھا۔
دین نہ صرف ٹھیک کر دی گئی تھی بلکہ ڈرائیونگ سیٹ پر ڈرائیور بالکل
تیار بیٹھا ہوا تھا۔

ایک آدمی نے ہمارے لیے دین کا دروازہ کھولا۔ جانس نے مجھے
تھپکا کر اندر بٹھایا اور پھر خود میرے ساتھ ہی بیٹھ گیا، اُس کے دو ماتحت
پچھلی سیٹ پر جم گئے تھے، مادام شہناز نے میری کاریں بیٹھنے سے قبل
ہاتھ لہرایا تھا۔ جو اب جانس نے بھی وہی عمل دہرایا تھا۔ گیٹ سے نکل
کر وہ بائیں جانب ہو گئی تھی اور دین کو دائیں ہاتھ جانے کا اشارہ
مسلما تھا۔

”کیا صبح کی ملاقات اور پروگرام منسوخ سمجھا جائے؟“ میں نے
دیا فت کیا۔

”خا ہر ہے۔“ جانس نے جواب دیا۔ ”وہ ملاقات خرم سلطان
نے کی تھی۔“

”لیکن اُس کی ایما اور ہدایت پر سب کچھ ہوا تھا۔“

”شاہد الیاسی رہا ہو“ جانسن نے سگار ہونٹوں میں دبائے ہوئے کہا۔ لیکن اس وقت میں اندھیرے میں تھا میرا خیال تھا کہ خرم سلطان ایک بزنس من ہے، جو ملک نواز کی جگہ حاصل کرنا چاہتا ہے۔ مگر وہ امریکہ کا نمائندہ ہے اور اس ملک کے وہ تمام رستے اور ذرائع بند کرنا چاہتا ہے، جن پر مل کر منشیات یہاں سے باہر جاتی ہے، ظاہر ہے ایسے شخص سے دوستی کا خیال بھی حماقت بلکہ تباہی کو گھر دکھانے کے مترادف ہوگا، مجھے اچھے اچھے حکم ملا ہے کہ تمام کام معطل کر دیے جائیں اور تمام ذرائع خرم سلطان کو راستے سے ہٹانے پر لگائے جائیں، جب تک وہ زندہ ہے میری تنظیم کے نزدیک یہاں کوئی گروہ کامیاب نہیں ہو سکتا، یہ میری ذاتی آفر ہے مابرعان کیونکہ میں ذاتی طور پر تم سے متاثر ہوں، تم اگر اپنی خدمات مایفک کے سپرد کر دو تو میں یہاں تمہیں ایک نمایاں حیثیت دوں گا لیکن کچھ شرائط بھی ہوں گی پہلی شرط یہی ہوگی کہ تم میری نگرانی میں خود کو تنظیم کا وفادار ثابت کرو گے۔“

”مجھے افسوس ہے سر“ میں نے سر د اور خشک انداز میں جواب دیا۔ ”میں پہلی شرط سے ہی اختلاف رکھتا ہوں، میں فطرتاً بڑا آزاد منس ہوں، پابندیاں میری فطرت سے میل نہیں کھاتیں، میری وفاداری صرف پیسے اور کروڑوں کے تو میری کارکردگی خود ثابت کرتی رہے گی۔“ کسی بھی طرح خرم سلطان کو مجھ تک لے آؤ۔“ جانسن نے موضوع بدل دیا۔ ”میں تمہیں سر سے پاؤں تک دولت میں دبا دوں گا۔“

”اگر مظفر چوہدری کامیاب ہو گیا تو مجھے یقین ہے خرم سلطان اپنی بہن کی خاطر اپنی گردن خود آویںگی پر رکھ دے گا۔“

”ہاں“ جانسن بولا۔ ”میں نے اسی لیے کارآمد ٹھہرے حاصل کیلئے“ معا ایک دھماکا ہوا اور دین لڑکھڑائی ہوئی بازو دنتی ہوئی فٹ پاتھ پر چڑھ گئی۔

”یہ... کیا ہوا...؟“ جانسن نے چیخ کر پوچھا اور ساتھ ہی میری گردن پر دیوار کی مال آگئی۔

”ٹائر پیٹ گیا ہے جناب“ ڈرائیور نے جواب دیا اور دروازہ کھول کر نیچے کود گیا۔ ”جو تم بھی نیچے آؤ۔“

ایک آدمی نے مجھے کوزہ رکھا اور دوسرا نیچے اتر گیا دین کے اندر ناخوگوار سکوت طاری ہو گیا تھا۔ جانسن کی بے چینی کش لگاتے اور دھوا اٹھنے سے ظاہر ہو رہی تھی۔ جب چار پانچ منٹ بیت گئے تو اس... گارڈ کا ٹوکھا کھلے دروازے سے باہر پھینک دیا اور دوسرا سگارا... کہتے رہے۔ ”یہ سگور کہاں مر گئے ہیں؟“

”یہ...“ بول بولتا تھا۔ ”اس نے دیوار جانسن کی طرف بڑھایا۔“

”اس کی ضرورت نہیں“ جانسن نے کھانے والے بھیج دیں کہا۔ ”جاؤ دیکھو اور ملدی ٹائر بڈ لو۔“

پھر مزید پانچ منٹ گزر گئے، جو دیکھنے گیا تھا وہ بھی واپس نہ آیا تھا، تب ہی جانسن کچلی سیٹ پر گھٹنوں کے بل بیٹھ کر شیشے سے باہر دیکھنے لگا۔ میں تو تیل کی دھار سی دیکھتا رہا تھا، جب وہ پلٹا تو اس کے ہاتھ میں سیاہ ریو اور دبا ہوا تھا اور صلی سے سفاک اور بلند غراہیں ابھرنے لگی تھیں۔ ”نیچے اتر دو اور اپنے آدمیوں کو حکم دو یہاں سے چلے جائیں“ میرے آدمی... میں نے استغناء میر انداز میں پوچھا۔ ”میرا کوئی آدمی نہیں ہے جانسن۔“

”بھواس نہیں؟“ اس نے اٹا لٹ مارا۔ ”میں نے کبھی پر ضرب روک لی۔“ میرے تینوں آدمی فٹ پاتھ پر پڑے ہوئے ہیں۔ کیا باہر کی ہونے لگا کو دس لیا ہے، چلو اتر دو۔“

میں خود جبران تھا کہ آتا شارب صرف ہارون تھا اور ہارون نہ صرف بے خبر تھا بلکہ لاشیں ٹھکانے لگنے میں مصروف رہا ہوگا، وہ کون تھا جس نے اتنی کامیاب تیزی دکھائی تھی۔

جانسن کے تئو اس کے لاگ سا نر خود کار ریو الو سے کہیں زیادہ خطرناک تھے، اس نے ریو اور میری کینٹی پر رکھا اور پھر پہلے سے لگا لیا۔ میں نے اس کے حکم کی تعمیل میں بڑی استیلا برتی تھی کیونکہ وہ زخمی کورے کی مانند پھٹکار رہا تھا، اپنی سلامتی سے مایوس ہو کر وہ کوئی بھی حرکت کر سکتا تھا۔

”ہاتھ اچھا لو“ جانسن کی گرم پھینکار میری گردن سے ٹکرائی۔ ”ناگ وہ جان میں کہ ان کی کسی حماقت کا نتیجہ کیا ہوگا“ میں نے فوراً دونوں ہاتھ بلند کر لیے اور نیچے اتر کر نرم تار کی کوٹھورے لگا ڈرا نیو اور جانسن کے دونوں آدمی اوندھے بیدھے پڑے ہوئے تھے۔ ڈرائیور پہلے دھیل پر بھٹکے اسی حالت میں اوندھا ہو گیا تھا۔ ایک شخص جھاڑی میں اچھا ہوا تھا اور تیسرا فٹ پاتھ پر کر دھک کے بل بیٹھا ہوا تھا۔ اسی میں اٹھیں دیکھنے میں ہی مصروف تھا کہ ایک نیکی چرچرائی ہوئی قریب کی اور ڈرائیور نے باہر جھانک کر پوچھا۔

”کیا میری مدد کرنا ہے آپ کو؟“

”شکریہ“ جانسن نے رکھائی سے اُسے جواب دیا۔ نیکی گئی ہوئی آگے نکل گئی۔

”یہاں تو کوئی دکھائی نہیں دیتا جناب“ میں نے اطراف کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔ ”میں آپ دیکھ لیں، کوئی دوسری وجہ بھی ہو سکتی ہے۔“

”وجہ تم معلوم کر دے“ اس نے ریو اور کو جھکا دے کر مجھے

میں دو قدم آگے بڑھا اور ڈرائیور پر جھک گیا۔ اس کے ہاتھ میں تیلی تھی۔ میں نے لاش فوراً پھوڑ دی، اسی میں جواب سوچا کہ جانسن کو کتنا ہوا اسٹ گیا میں نے پھرتی سے خود کو ایک طرف دھکیلا تھا۔ میرے پاؤں جب دوبارہ زمین پر گئے تو میں نے ایک نظر دیکھا، جانسن کر دھک کے بل رو لنگ کرتا ہوا سڑک پر گیا۔ میں بندر کی مانند طویل قلائیں بھرتا ہوا دوسری فٹ پاتھ پر قیام پاؤں کے پیچھے چلا گیا تھا۔

دوسری فٹ پاتھ فیصلہ سے بھی تیز واقع ہوا تھا اگر میں کوئی فیصلہ کرتا تو بھی یسا تو شاید اس پھلاوے کو نہ روک پاتا۔ میں چند قدم نکل گیا تھا، قدموں کی مدد سے دھک پر میں نے پٹ کر دیواروں کو ہٹاتا ہوا سامنے آیا تھا، اس کے پیچھے اکبر اور اکبر کے

بچے افسوس ہے چیخ۔ ”یگن منٹائی آوازیں بولا۔“ ایک نکل گیا ہے۔ کوئی بات نہیں۔ ”میں نے کہا۔“ مجھے صرف یہ بتاؤ اسے دھکا دیا تھا۔“

”میں نے اس کی کینٹی پر کارک فار کیا تھا“ یگن نے بتایا۔ ”کارک“ میرے بھیج میں استعجاب تھا۔

”ہاں جیت“ اس نے ایک خراج بورکا پستول سامنے کر دیا۔ ہم اپنی طور پر دھمکانے اور چونکانے کے لیے کارک فار کرتے ہیں۔ آپ سے دُور کرنا چاہتا تھا۔“

”اول“ میں رشیدہ کی جانب بڑھا اور اس نے سر جھکایا۔ ”فکریہ“ میں نے اس کا حق ادا کر دیا ہے، آؤ یہاں ٹھہرنا خطرناک ہوگا۔“ ان کی گاڑی پیچھے کھڑی تھی۔ رشیدہ میرے بازو کے حصار میں سوار ساتھ میں رہی تھی اور ہمیشہ کی طرح اس کی زبان بڑی لفظی تھی۔

”میں نے میرا پیغام حاصل کر لیا تھا“ وہ بتانے لگی۔ ”اس کا نام مادام، باہر کو جانسن کے سامنے پیش کرنا چاہتی ہے، وہاں اس کو جانے کا۔“

”میں نے خود ہی کو تکلیف دے ڈالی“ میں نے پیار بھی سزاؤں کی باتیں متعل آرم کی ضرورت ہے۔“

”میں یگن بول پڑا۔“ میں تو اتفاقاً آگیا تھا، یہ دونوں دوڑتے ہوئے تھے۔

”بلک ہے ہم واپس ڈھیری حسن آباد جائیں گے“ میں نے رشیدہ کو پٹ پر جھپٹ کر کہا۔ ”بھاری بھاری سیمرا کو بھاری ضرورت ہے۔“

”مادام کے ساتھ نہیں گئی؟“ رشیدہ نے پوچھا۔



”نہیں جان اسے ہم سے بھردی جتنی بڑی سخت سزا سنا گئی ہے مادام۔“

رشیدہ نے سزا کی نوعیت جان لی تھی یا دیکھ ہی خاموش رہی تھی۔ اس نے رشتے کے تقدس کا بھرم نہ کھلیا تھا اگر وہ سزا کے بارے میں سوال کر بیٹھتی تو ایک بڑے بھائی کے صلی سے جواب خراشیں ڈالتا ہوا ابھرتا۔ گیٹ ہارن کی آواز سے با سانی کھل گیا تھا۔ میں نے رشیدہ سے کہا تھا کہ وہ جہرے کی جھلک چوکیدار کو دکھائے، چوکیدار گیٹ کھول کر ایک طرف ہو گیا تھا۔ اندر صرف جیک کو ہونا چاہیے تھا اگر کوئی اور بھی تھا تو سامنے دکھائی نہ دیتا تھا۔ ”اکبر اور رشیدہ کے ساتھ کارڈ ور سے گزرتا جا رہا تھا کہ ایک کمرے سے باتوں کی آواز سنائی دی۔ میں نے کی ہول سے آنکھ لگائی، سمیرا صوفے پر نیم دراز تھی اور جیک ہاتھ میں جام لے کر اس کے ساتھ بیٹھ کر مٹھن انداز میں سر ہلاتے ہوئے رشیدہ کو دستک دینے کا اشارہ کیا اور اکبر کو کمرے کے دیوار کے ساتھ ہو گیا۔

”کون؟“ دستک کے جواب میں جیک کی کاٹ کھانے والی آواز ابھری۔ ”میں کشیدہ ہوں، سمیرا کی دوست،“ رشیدہ نے جواب دیا۔ پھر لاگ ریڈیو ہونے کی آواز سننے ہی میں نے پھرتی سے کواڑوں کو کندھے کی سائڈ لٹ ماری اور جیک کو پٹا ہوا اندر چلا گیا۔ گلاس ننگے فرش پر قہقہہ لگا کر بکھر گیا تھا۔ اکبر فٹ میٹ پر ریو اور تان کر جم گیا اور رشیدہ دوڑتی ہوئی سمیرا کے عقب میں چلی گئی۔

جیک جو پہلی لڑکھڑاہٹوں سے سنبھلا میں نے اس کا بازو موڑ کر اس کی پشت سے لگا دیا۔ ”جیک! تم بازی لاپچھے ہو لیکن عقل تھا ہے پاس محفوظ ہے۔“

”تم کیا چاہتے ہو؟“ اس نے ٹوٹی پھوٹی اردو میں پوچھا۔ میں نے

دوسرے ہاتھ سے اُس کی بیک پاٹ سے ریلوورنگال کر اُسے دکھادیے
 "اب ہم دوستانہ انداز میں باتیں کریں گے۔ اگر تم باہر کی شکرانی
 کرو اور اکبر نے پیچھے ہٹ کر دروازہ بند کر دیا۔ بیٹھ جاؤ دوست ہمارے
 پاس پوری رات ہے، اب کسی بیرونی مدد کی بات نہ رکھنا بے فصول ہے
 وقت اور گردن بچانا چاہتے ہو تو میں مختصر سوال کروں گا اور تم بھی مختصر
 جواب دو گے۔"

"مجھے بتاؤ جب صوفے پر بیٹھ کر بولا "باس کہاں ہے؟"
 "نکل سے تو تم اتنی باتیں نہیں کر سکتے مگر جبکہ میں مسکراتے لگا "باس
 کو روانہ کیے بغیر کہا میں واپس آ سکتا تھا؟"
 "تو کیا...؟" اُس کے حلق میں آواز چھنس گئی۔

"ہاں دوست، ترازو کے پڑے اُسے جھکے رہتے ہیں۔" میں نے
 ملامت لہجے میں جواب دیا۔ جبکہ اُنہیں موند کر پشت کا ہاتھ سے ٹیک
 لگائی۔ اُس کا چہرہ بڑا چوم تھا، دکھ یا خوشی کا اظہار چھپا گیا تھا، ہر حال
 میں اس کے ردِ عمل کا انتظار کرنے لگا۔

"ٹھیک ہے مگر باہر! میں تمہاری برتری تسلیم کرتا ہوں، کچھ دیر
 بعد وہ بھرتی ہوئی آوازیں بولا پھر سنبھل کر بیٹھ گیا "پوچھو کیا پوچھنا
 چاہتے ہو کیونکہ میں کوئی شرط عائد کرنے کی پوزیشن میں نہیں ہوں اس
 لیے بالکل غیر مشروط ہتھیار ڈال رہا ہوں۔"

"اور میں بھی دوستی اور تعاون کے نام پر وعدہ کرتا ہوں کہ تمہیں
 یہاں سے نکل جانے کی ہر سہولت فراہم کروں گا۔"
 "شکر ہے بابر خان! جبکہ کے چہرے پر طنز یہ مسکراہٹ ابھری
 "اگر زندہ رہا تو میں خود چلا جاؤں گا۔"

"جانسن کا تعلق کس تنظیم سے تھا؟"
 "مافیا سے۔" جبکہ نے بے دھرمک جواب دیا "اس لیے بتا
 رہا ہوں کہ مافیا کوئی انڈر گراؤنڈ قسم کی تنظیم نہیں ہے۔"

"کراچی میں تھلا ہینڈ کو اڑا رکھا ہے؟"
 "جواب مختصر ہے، صرف تمہارے لیے اور کچھ پوچھو۔" جبکہ
 نے رشیدہ اور سمیرا کی جانب دیکھ کر جواب دیا۔

"یہاں تمہارے کتنے ممبر ہیں اور جانسن کہاں سے آیا تھا اور
 کہاں جانا چاہتا تھا؟"
 "سوری بابر! وہ معذرت خواہ نہ انداز میں سر ہلانے لگا۔

ممبر ہوں، جس طرح ہم یہاں طلب کیے گئے، کیا تم یقین کرو گے یہاں
 جو لوگ میرے ساتھ تھے، وہ میرے لیے اجنبی تھے ہم اتنا ہی جانتے
 ہیں، جتنا مقامی باس بتانا چاہتا ہے۔"
 "کل ایک کلینک سے تم لوگوں نے ملکی اخوا کی تھی، وہ کہاں

رکھی گئی ہے؟"
 "اُسے ایک مقامی ممبر جابر کے پیر دیکھا گیا ہے۔"
 "شکر ہے جبکہ" میں نے کہا "اب مجھے یقین ہو گیا ہے کہ
 تم سچ بول رہے ہو، مجھے جابر کا ٹھکانہ بھی بتا دو۔"

"مجھے مکان نمبر تو یاد نہیں البتہ وہ کوہ نور کے قریب کوئی
 آبادی ہے، وہ جبکہ کپٹی سہلاتے ہوئے بولا۔ "اگر مجھے ساتھ لے چلو
 تو میں نشاندہی کر سکتا ہوں۔"

"کیا تم یقین ہے کہ ملکی وہاں موجود ہوگی؟"
 "ہاں شام چھ بجے تک کو وہاں تھی۔" جبکہ نے بتلایا "میں
 جابر کو باس کا ایک تحریری پیغام پہنچانے گیا تھا۔"

"کیا تم نے پیغام پڑھا تھا جبکہ؟" میرے سوال کا جواب اُس
 نے سرے نفی میں دیتے ہوئے بتلایا۔
 "پیغام مٹوف اور باس کی انگوٹھی کی ہر تھی۔"

"سنو دوست! میں نے اُسے کر جبکہ کے شانے پر ہاتھ رکھ
 دیا، میں اُس ملکی کی تلاش میں ادھر آیا تھا اگر وہ تمہارے تعاون سے
 مجھے مل گئی تو میں تازہ دست تمہیں یاد رکھوں گا۔"

"میں بابر گینگ کی پوزیشن میں نہیں ہوں بابر خان! وہ نگین
 جھکا کر ملکی تھی آوازیں بولنے لگا "لیکن تم نے بات احسان اور باور
 کی کہ مجھے ایک اس دی ہے اگر خرم سلطان تمہارا دوست نہیں تو
 تمہیں بدلے میں مجھ پر ایک احسان کرنا ہوگا اگر خرم سلطان زندہ ہوگا

پیش کرنے کا چانس مجھے مل جائے تو باس کی مالی جگہ مجھے دی جاسکتی
 ہے لیکن یہ شرط نہیں ہے بابر خان، اس ایک دوستانہ درخواست
 "میں کرانے کا آدمی ہوں جبکہ" میں نے کہا "جو معاوضے
 خرم سلطان ادا کرتا ہے اُس سے کہیں زیادہ وہ ملکی مجھے عطا

ہے، اس لیے اگر تم اسے سوے کا نام بھی دیتے تو مجھے کوئی اعتراض
 نہ ہوتا، اُنہیں میں وعدہ نہیں کروں گا کیونکہ خرم سلطان آبادی
 کا شاطر ترین شخص ہے۔ ہاں میں اُسے ٹریس کر کے تمہیں آگاہ کر دوں گا
 "اودہ شکر ہے بابر خان! جبکہ کی آواز خوشی سے ہلکتی تھی

لگی "میرے لیے یہی بہت ہوگا، ویسے ہی باس کے بعد قائم مقام میں
 ہی ہوں گا میں اپنے تمام ذرائع اُسے گھیرنے پر لگا دوں گا۔"
 سمیرا جب اُٹھی تو میں چونک پڑا، وہ جیسے اپنے حواس میں
 تھی، جب وہ لوٹکر اُٹتی تو رشیدہ نے پیک کر اُسے باہر لے کر
 لیا تھا۔

میں نے جاکر ٹھنڈے پانی کے چھینٹے مارے۔
 "کوئی بات نہیں خود ٹھیک ہو جائے گی، میں نے کہا کیونکہ
 انت پہلے ہی بہت متابع ہو چکا تھا، میں جب جانسن کی حراست
 میں تھا، تب بھی میرا ذہن حویلی کے اندر گھوم رہا تھا۔"

جبکہ کو اکبر کے ساتھ بٹھا کر میں رشیدہ اور سمیرا کے ساتھ پھلی
 بٹ پر بیٹھ گیا، سمیرا نے بیٹھے ہی پشت گاہ پر گردن ڈال دی تھی۔
 بے ہوش تو نہ تھی لیکن جو کچھ ہو رہا تھا اُسے خالی خالی نگاہوں سے

پہچان رہی تھی جیسے کوئی گونگی فلم دیکھ رہی ہو۔
 کوہ نور کے مین گیٹ کے سامنے جاکر جبکہ کی ہدایت پر
 نے گاڑی سائڈ میں لگا دی تھی۔ جبکہ نے باہر جھانک کر دیکھا
 پھر بولا "اُسے چلو، کیا ڈنڈ وال جہدھر گھومتی ہے، ساتھ ساتھ

نا ہوگا۔" کئی پہلی سڑک اتراتی میں اُترتی پہلی گئی تھی۔ فرلانگ فاصلہ
 کھانے کے بعد جبکہ نے پھر گاڑی روکنے کا اشارہ کیا۔
 "میں شاید راستہ بھول گیا ہوں، وہ اُچھے اُچھے انداز میں بولا۔

ہنٹ، ایجنسی کا بورڈ ہے اُس سڑک پر..."
 "ہم کچھ آگے نکل آئیں، رشیدہ نے بتلایا "میں نے دیکھی
 زبور ڈ دیکھا تھا۔"

اکبر نے کار میں ڈال دی کیونکہ سڑک تنگ تھی سینٹ
 سے جو ذیلی سڑک اوپر جا رہی تھی۔ وہ تنگ تو نہ تھی مگر نہ عوار
 کی پہلی ہونے کی وجہ سے کار کے لیے موزوں نہ تھی، میں نے رشیدہ
 پر بے ہوش سمیرا کی نگرانی کے لیے چھوڑا، اکبر کے پاس ریلوورنگال

تھی جبکہ کا ریلوور رشیدہ کی گود میں رکھ دیا۔ جبکہ ایک تربیت
 شدہ اور تجربہ کار شخص تھا، اس لیے خود ہی ہمارے درمیان آگیا تھا
 "اگر انارزی نہ تھے، اس لیے ہم نے دایں بائیں اتنا فاصلہ ضرور
 رکھا کہ وہ اگر کوئی داؤ آزمانا چاہے تو اُسے آسانی نہ ہو۔ شاید

اُس کے ذہن میں کوئی ایسا ارادہ نہ ہوگا اگر میں اُس کی جگہ
 آتا تو اس پوزیشن سے فائدہ اٹھانے کی ضرورت کو محسوس کرتا ویسے
 فائدہ انداز نہ تھا، دیکھ رہا تھا کہ صرف اکبر مسلح ہے ایسی صورت میں
 اگر سائڈ گٹ لگائی جاسکتی تھی، اکبر بالکل گہری مالی کے کنارے

تھی، جب وہ لوٹکر اُٹتی تو رشیدہ نے پیک کر اُسے باہر لے کر
 لیا تھا۔
 "معاف کرنا بابر! جبکہ شرمندہ سے لہجے میں بولا "میں نے اپنے
 کو دکر نے ہی تھی، میں نے اسے ایک ڈوڑا سپیڈ کا دیا تھا، میں نے اسے
 اکبر کی سیر کی سڑک پر چڑھ گیا تھا۔
 "اکبر سلیم یزدانی صاحب کا مکان جانتے ہیں؟ ہم مردنے مجھ

سے پوچھا، اس کو مل ماسٹر ہیں۔"
 "جی نہیں، میں نے مہذبانہ لہجے میں بتایا، ہم بھی اجنبی ہیں۔"
 اکبر اور جبکہ چند قدم آگے نکل گئے تھے کیونکہ جبکہ رُکنا نہ تھا، اکبر
 کو اُس کا ساتھ دینا لازمی تھا۔

عین اُس وقت جب میں نے سیر جس سے قدم نیچے رکھا، ایک
 جیب دایں گلی سے نمودار ہوئی، ڈوڑا نور انارزی تھا یا اُسے جلدی
 تھی اُس نے انتہائی خطرناک رفتار سے موٹر کا ٹھکانہ اکبر اگر اچھل کر
 دیوار کے ساتھ نہ لگ جاتا تو جیب سے مچا جاتا۔

معاذ حاکم ہوا اور جبکہ ڈکراتا ہوا لوٹکر آیا اور پھر مالی
 پر گھنٹوں کے بل بیٹھا چلا گیا، دو سرفاڑ ہوا اور گولی چبختی ہوئی میرے
 سر کے اوپر سے گزرتی ہوئی دروازے میں پیوست ہو گئی تھی۔

میں نے طویل جست لگائی اور بائیں ہاتھ والی گلی میں داخل ہو گیا پھر
 جب میں نے اکبر کو جیب کے تعاقب میں بے تحاشہ دوڑتے دیکھا تو
 میں بھی دوڑنے لگا۔ یقیناً وہی خطرہ اکبر نے بھی محسوس کر لیا تھا، سو

میرے اندر خوفان لے آیا تھا، جیب میں یقیناً کوئی ایسا شخص تھا،
 جو جبکہ اور مجھے پہچانتا تھا، ورنہ گولی نہ چلا یا اگر وہ ہمارا دشمن تھا
 تو جہدہ جارہا تھا راستے میں رشیدہ اور سمیرا تھیں، اُس نے ہمیں
 دیکھ لیا تھا اور جب کار دیکھا تو اُسے جمع تفریق کے بغیر ہی جواب

مل جاتا کہ کار میں کون ہو سکتا ہے۔
 انسان اور مشینری کا مقابلہ تھا۔ جیب اچھلتی کودتی تیز رفتاری
 سے اگلا موٹر گھوم گئی تھی، اکبر تعاقب میں تھا، میں نے ایک گلی دیکھی
 اور شارٹ کٹ کے خیال سے داخل ہو گیا، میں اتنا تیز اس رات

بھی نہ دوڑا تھا جب ہانگ کا ہنگ میں موت میرے تعاقب میں
 تھی اور میں نے ایک پنجابی مزدور کی کھولی میں پناہ لے کر موت سے
 نجات حاصل کی تھی۔

جب میں آبادی سے نکل کر اُتراتی پہلا ہنگ رہا تھا تو میں نے
 وہ منظر دیکھ لیا تھا، ایک شخص، سمیرا کو کندھے پر ڈالے جیب کی جانب
 دوڑ رہا تھا اور اُس کے تعاقب میں رشیدہ لوٹکر آتی ہوئی دعوتی دکھائی
 دی تھی، اکبر نے فائر کے ساتھ ہی اُسے لٹکا کر پھر ایک فائر مزید ہوا اور

نسوانی چیخ سنائی دی۔ دوسرے فائر کی بازگشت اسی گونج ہی رہی تھی
 کہ میں نے اُس شخص کو گرتے دیکھا، سمیرا اور وہ گڈمڈ ہو گئے تھے تب
 ہی جیب نے طویل چھلانگ لگائی تھی۔
 میں جب ہنپتا ہوا سڑک پر چڑھا تو خونی کھیل کا ڈراما سین
 ہو چکا تھا اکبر نے لوٹکر آتی ہوئی رشیدہ کو بانہوں میں بھر اور وہ
 میرے سامنے اُس کی بانہوں میں جھول گئی تھی، میرا دل جیسے اچھل

کر حلق میں پھنس گیا تھا اور ٹانگوں نے میرا بوجھ اور توازن سہانے سے جواب دے دیا تھا۔ شاید میں چل کر وہاں تک نہ جاسکتا، اس روح فرسا سوچ نے میرے وجود سے طاقت چوڑی تھی کہ میری بہن رشیدہ بھی میری سیاہ بختی کی نذر ہو گئی ہے، وہ لڑکی جس نے مارشا کے بعد مجھے بہن کے پیار کے سارے ذائقے دیے تھے، جو میری ہمیشہ تھی لیکن روح کے جذبات نے اسے اپنے اندر جذب کر لیا تھا۔

میں نے جھک کر اس بھول کو ایک دم اٹھایا "جان... جان بڑا بڑا میری آواز جھرجھرنے لگی تو انھیں کھولو"

رشیدہ کے پوٹے پھڑکے اور بولوں پر اتنی حین، اتنی پیاری مسکراہٹ ابھرتی میں نے دیکھی اتنا حسن چاندنی رات کو نصیب ہوا ہے کبھی نہ کی کی چٹک میں ایسا بائگن ہوتا ہوگا پھر اس نے انھیں کھول کر دیکھا اور خون آلود ہاتھ میرے چہرے کی بلایں لینے لگا۔ میں نے فرط عقیدت سے اس کی خون سے تر انگلیوں کو چوم لیا روم... تم ٹیک ہو، نا جان؟

"اس نے..." رشیدہ کہہ رہے تھے بولی میرے سر پر ضرب لگائی تھی "میں نے بال ہٹائے اور زخم دیکھا، پیشانی سے دو انچ اوپر گھوڑے خون ابل رہا تھا۔

"چیف!" اکبر نے فانیس آکر پڑتے ہوئے بتایا "میں سیر اور دوسرا آدمی دونوں دم توڑ چکے ہیں۔ سیر کے سر میں گولی لگی ہے اور آدمی کے سینے میں شگاف ہے"

"میں نے..." رشیدہ ڈوبتی آواز میں بولی "شاید سیرا کو بھی..."

"اوہ چیف!" اکبر پریشان لہجے میں بولا "لوگ آرہے ہیں" میں نے مارچوں کی روشنی دیکھی ہے، ہمیں نکل چلنا چاہیے"

میں نے رشیدہ کو بانہوں میں سمرا اور کارکی جانب دوڑ پڑا۔ "م... مجھے..." "کراہتی ہوئی آواز نے میرے اٹھتے قدموں کو ٹھوکر ماری۔ میں نے چلٹ کر دیکھا جسے اکبر نے مردہ قرار دے دیا تھا، وہ دشمن گھنٹوں اور کہنیوں کے بل ریگ رہا تھا۔

"اکبر! اسے بھی اٹھا لو" میں نے کہا اور اکبر اسے بھی اٹھالایا چونکہ کالونی کے میکن فائرنگ کی وجہ سے گھروں سے نکل گئے تھے اور آرائی اترنے لگے تھے اس لیے کار بیلوں کے موڑنا خطرناک ہو گیا تھا۔

"اکبر!" میں نے رشیدہ کو سنبھالتے ہوئے پوچھا "یہ سڑک آگے بند تو نہیں ہو جاتی؟"

"نہیں چیف!" اکبر نے انجن اسٹارٹ کر دیا "میں اس علاقے سے واقف ہوں"

مضبوط شخص کو سیرٹ کر رکھا گیا تھا لیکن جب کارنا ہموار سڑک پر چھوٹے کھانے کی تو وہ لڑھک کر نیچے گر گیا تھا۔ بلاشبہ وہ جانس کا آدمی تھا اور ہمارا دشمن تھا لیکن ہلک زخم نے اسے قابلِ رحم بنا دیا تھا۔ میں نے اسے اٹھا کر راتوں پر رکھ لیا۔ اس کا چہرہ دیکھ کر میرے ذہن میں ایک خیال کا اندازہ ملنے سے پھٹ گیا تھا اس کا چہرہ کسی خوشخوار بلاڈاگ کا چہرہ تھا۔ جانس نے اس چہرے کا ایک نام دیا تھا میں نے اس کا چہرہ سیدھا کیا اس کی ناک اور منہ سے خون کے پیلے قاتر کے ساتھ ابل ابل کر پھوٹ رہے تھے۔

"جابر!" میں اس پر جھک گیا۔ اس نے بند ہوئی آنکھیں کھلیں بولیں کھول کر دیکھا "تم مر رہے ہو جابر خان، آخری سانسوں میں اپنے گناہوں کا کفارہ ادا کرتے جاؤ، تمہارے لیے ابھی تو یہ دروازہ بند نہیں ہوا جابر خان!"

"تت... تم...!" خون کی تھنوں نے اس کی آواز توڑ دی میرے ہاتھ اور لباس خراب ہو گیا تھا لیکن مجھے کسی چیز کی پروا نہ تھی، میں نے اپنے کان اور نزدیک کر لیے تھے "وغ... دم..."

"ہاں جابر خان! میں خرم ہوں مجھے بتاؤ زمین کہاں ہے؟" اسے... باس... لے گیا ہے..." اس نے ہچکچاہٹوں کے درمیان لڑکھرائی آواز میں بتایا۔

"کہاں... بولو بولو جابر خان کہاں لے گیا ہے؟"

"ہیٹ...!" آخری ہچکی ابھری اور اس کی آواز ہمیشہ کے لیے ڈوب گئی اس کی کھلی آنکھیں میرے چہرے پر پڑی ہوئی تھیں اور ان میں کرب، برف کی ٹلی بن گیا تھا۔

کالونی کے رہنے والوں نے تعاقب نہ کیا تھا اس لیے پڑانے ریڈیو اسٹیشن سے کچھ سڑک کے ذریعے ہماری کار بچتے رہے پر دوڑتی چوہر بازار سے گزرتی پشاور روڈ پر نکل آئی تھی۔

جانس، زمین کو نکال کر لے گیا تھا اور جابر خان کی آخری سانس نے جو کچھ بتانا چاہا تھا اس کے مطابق وہ اسے ہیڈ کوارٹر میں لے گیا تھا اگر میں اس کو بھی کو ہیڈ کوارٹر مان لیتا، جس سے وہ فرار ہو کر بولیں یا تھا تو میری طاقت ہی ہوتی۔ اس نے یقیناً کوئی متبادل ٹھکانہ بنالیا ہو گا۔ ہو سکتا ہے ہیڈ کوارٹر سے مراد کراچی والا ہیڈ کوارٹر ہو تا بہر کیف

زمین قریب آکر پھر دوڑ چلی گئی تھی میری سوچ غلط صبر کے لیے منہ ہوتی کہ قدرت میری راہوں میں رکاوٹیں ڈال کر مجھے مشن میں ناکام کرنے کے درپے ہے لیکن فوراً ہی میں نے پٹری سے اترتی ہوئی سوچ کو خیریت

انداز دیتے ہوئے سوچا تھا کہ اللہ تعالیٰ تو نیکی کا صرف ارادہ کرتے والوں کے لیے آسانیاں عطا فرماتے ہیں، ہاں شیطان فلاح کا ادنیٰ دشمن ہے میری جنگ بھی تو شیطان کے ٹوٹے سے تھی اگر شیطان اپنے جیلوں کی مدد کر رہا تھا تو مجھے یقین تھا، خدا بھی اپنے بندوں کو بے یار و مددگار نہیں چھوڑے گا۔

میری وجہی کہ میں ناکام ہونے کے باوجود اللہ تعالیٰ کے کرم سے ملاؤں نہ ہوا تھا میں نے سیرٹی سے گر کر بھی نہ غم اور عہد کا دل میں اعادہ کیا تھا کہ اگر شیطان طاقتیں میرے راستے میں آگ کے ساتھ سمندر اور ہمالیہ جیسے سات پہاڑ بھی کھڑے کر دیں گی تو بھی میرے پاؤں کا رخ نہیں پھرے گا۔

جابر انسان تھا، بڑا بھلا جیسا بھی تھا مرنے والا صرف انسان کا وجود وہ جاتا ہے اور اس وجود کا احترام مجھے میرے بزرگوں اور کتابوں نے سکھایا تھا لیکن اکبر نے رشتہ کی تھی کہ ہم اگر قانون کی حاکمیت تسلیم کرتے ہیں تو آباد سڑکوں پر لاش کے ساتھ ہمیں سفر نہیں کرنا چاہیے۔ چنانچہ میں نے دل پر جبر کرتے ہوئے اسے جابر کی لاش آبادی میں داخل ہونے سے قبل ٹھکانے لگانے کی اجازت دے دی۔ مجھے نہیں معلوم دس منٹ میں اس نے لاش کو کہاں ٹھکانے لگا دیا تھا۔

چونکہ رشیدہ کا زخم خطرناک تھا، اس لیے ہم سیدھے ہوٹل میں داخل گئے تھے۔ رشیدہ کی ڈرائیگ میری موجودگی میں ہارون نے بڑی احتیاط سے کر دی تھی۔ میں دیکھ رہا تھا، بالوں کی لٹ کٹر کر ہارون نے ایسے رکھی تھی جیسے کوئی نہایت ہی نرم و نازک شے لگی ہو۔

گو مادام شہناز نے مجھے قاتلوں کے گروہ کے سرغنہ کے حوالے کر دیا تھا، اصولاً اسے مطمئن ہو جانا چاہیے تھا لیکن وہ واپس ہوئی نہیں آئی تھی شاید جانس کی پیش کش اس نے قبول کر لی تھی اور اکی کی پناہ میں چلی گئی تھی۔

سات کا وقت کہیں جانے کے لیے موزوں تھا، بھاگ دوڑ اور مسل سہانگی اور پریشانی نے میرے جسم کو بڑا سا اور دکھتا پھوڑا بنا دیا تھا لیکن اندر جو پھوڑا تھا، وہ ہر درد پر حاوی تھا، مظہر جو ہمدردی اپنی آزادی اور سلامتی کی نئی راہ کو تلاش نہیں کر سکتا تھا، اس کے سامنے ایک پرسکون اور شاندار مستقبل کا چارہ ڈال دیا گیا تھا، وہ شاید نہیں جانتا تھا کہ اس نے کن لوگوں سے سوداے کیلئے، جو مطلب نکل جانے کے بعد اپنے گئے باپ کا ساتھ بھی برداشت نہیں کرتے تھے۔ مظہر جو ہمدردی کی باتوں نے کلثوم کی دفاعی اور اداکاری کی قسمی کھول دی تھی وہ مظہر جو ہمدردی اور گاؤں والوں کے لیے جو سہولت حاصل کرنے میرے پاس بھی گئی تھی۔ اسے میں نے اس کے

"میں بولوں گی رشیدہ تو پ کر اٹھ بیٹھی، کیونکہ میں ابھی آزاد ہوں" میں بحیثیت بہن بولوں گی۔

"جو پارٹی باہر آن ڈیوٹی ہے اس کا خیال ہی رکھنا" میں نے رشیدہ کی باتوں کو جیسے سنا ہی نہ تھا "میں اب گاؤں کی تمام تر اہلیاں بچھانے کے منہ پر ماد کر سب کو مالوس کر دیا تھا، اب مظہر جو ہمدردی اپنی سلامتی کے لیے جانس کی شرائط پر عمل کرنے کے سوا کچھ اور نہیں کر سکتا تھا۔

میں نے ہمیشہ ان لوگوں کو خود غرض بلکہ منافق سمجھا تھا، جو اول خویش اور بعد درویش کے مقولے پر ایمان رکھتے ہیں۔ میرے نزدیک وہ لوگ بھی ناقابلِ اعتماد رہے تھے، جو یہ کہتے تھے کہ اپنا گھر جل رہا ہو تو شہر کے جلنے کی پروا نہیں کرنی چاہیے۔ مگر جب میرے خاندان کی عزت اور سلامتی کی طرف آگ نے سفر شروع کیا تو میرے بھی سارے جذبے ریت کی دیواروں کی مانند گرے چلے گئے تھے، حالانکہ ایک بیش از قیمت امانت، ایک معصوم لڑکی میری وجہ سے بھیڑیوں کے جنگل میں گم ہو گئی تھی لیکن میں خود غرض بن گیا تھا۔ دوسری طرف میرے خاندان کی ناموس، حویلی کا تقدس اور زمینیت جیسی پیاری لڑکی کی زندگی خطرے میں تھی، چنانچہ جو بھی ہارون ڈرائیگ سے فارغ ہو کر ہاتھ روم کی طرف جانے لگا میں نے اسے اشارے سے روک لیا۔ اس نے استغناء میں لگا ہوں سے دیکھا۔

"میں گاؤں جا رہی ہوں ہارون" میں نے سرد لہجے میں کہا "زمینہ کو ہماری ضرورت ہے، مادام شہناز کا قرض بھی چرٹھ گیا ہے اور جانس جیسے نہرے پٹے ناگ کا سر ٹکنا بھی ضروری ہے مگر مجھے جانا ہوگا میں اس مشن کی سربراہی تمہیں دے رہی ہوں" ہارون نے کچھ بولنے کے لیے منہ بنا لیا۔ "نہیں ہارون!" میں نے برقیے اور کاٹ دار ہچے میں ہاتھ اٹھا کر اسے روک دیا بدتم کچھ نہ بولو صرف بحیثیت ماتحت میرا حکم سنو گے کل کرمانی سے مل کر زبرد و لاؤس کا معائنہ کر لینا اور وہاں شیفٹ ہو جانا پھر کرمانی اور ان دونوں لوگوں کو جانس کی تلاش پر لگا دینا۔ فی الحال مادام شہناز کو نظر انداز کرنا۔ ہاں اگر وہ جانس کے ساتھ مل چکی ہو تو دوسری بات ہے۔ بعد ہی ادھر آؤں گا کیونکہ میرا ذہن دونوں اطراف دوڑ کر ناکارہ ہونے لگا ہے۔ تم کوئی حماقت نہیں کرو گے ہارون، ادھر مجھے کوئی خطرہ نہیں ہوگا وہ میرا گاؤں ہے، وہاں میرے عہد بدوں کی خامی طاقت ہے پھر دوسری اہم بات یہ ہے کہ میں تم لوگوں کو اپنی ذات کے لیے خرچ کرنے کا مجاز نہیں ہوں"

"بہتر چیف!" ہارون نے اڑیاں جوڑ کر جواب دیا "میں حکم عدولی نہیں کروں گا، ہاں آپ کے لیے دعا کرتا رہوں گا"

"شکریہ ہارون... خدا حافظ!"

”مہرود رشیدہ کوئی اور میں دوتا ہوا ہمارا نکل گیا اگر ڈک جاتا تو شاید رشیدہ میرے ارادے کے پاؤں کی زنجیر بن جاتی اور میں اپنے ارادے کی راہ میں آنے والی رکاوٹ کو مجبوراً ٹھوکر مار دیتا رشیدہ کا وہ مان ٹوٹ جاتا اور میری محبت کا بصر بھر جاتا، فائدہ ان کی ناموس بچانے کے لیے مجھے بہت کچھ داؤ پر لگانا پڑا کیونکہ میں اعتراف کر چکا ہوں کہ جوئی کی حرمت نے مجھ سے سارے جذبے اور عزم بچھین لیے تھے، جو میں اس راہ کے لیے لے کر نکلا تھا۔

پوری جین تین گاڑیاں پارک تھیں، میں کوئی بھی گاڑی لے جانے کا حجاز تھا لیکن جس ہم پر میں روانہ ہوا تھا اس کے لیے کاریں ناکارہ تھیں مجھے تو اپنے ہی گھر اور اپنے آبائی گاؤں میں چوروں کی طرح داخل ہونا تھا گاؤں میں داخل ہونے والی گاڑی ہزاروں نگاہوں سے سو کر گزرتی ہے چنانچہ میں نے گاڑی لے جانے کی بجائے ہلے دے تک ٹیکسی میں سفر کرنا مناسب سمجھا کراں جو کہیں چند سوزدکیاں کھڑی تھیں، باقی تو لاگ آپ تھیں البتہ ایک سوزدکی کو نو عمر لڑکا دھونے کے بعد خشک کپڑے سے رگڑائی کر رہا تھا، پارسل منے پولیس میں بند بھری جھانپا لے رہا تھا۔

میں نے قطار میں کھڑی سوزدکیوں کو گزرتے گزرتے چیک کیا، دو خالی تھیں جب کہ دوسری دونوں کی فرنٹ سیٹ پر غالباً کنڈیکٹر لڑکے سوئے ہوئے تھے منگانی کرنے والا بھی عمر کے حوالے سے ڈراٹور دکھائی نہ دیتا تھا اگر وہ ڈراٹور بھی ہوتا تو گئی رات ایک اجنبی کے ساتھ ویران راستوں کے سفر پر وہ ہرگز روانہ نہ ہوتا مذہب دوستی کرنے کی گنجائش نہ تھی پولیس والے بالکل قریب موجود تھے۔

”بچے! استاد کہاں ہے تھلا؟“ میں نے سوزدکی کو ایسے دیکھا جیسے مٹی میں کھڑے بکرے کو قصائی دیکھتا ہے ”اُس نے مجھے وقت دیا تھا استاد بشیر کی گاڑی ہے نا؟“ میں نے ایک فی البدیہہ شعر میں استاد بشیر کا نام پڑھ لیا تھا، شعر کچھ یوں تھا۔

جلنے والا جلتا رہے گا استاد بشیر جتا رہے گا

”وہ تو فلم دیکھ کر گھر چلے جائیں گے جی“ لڑکے نے کپڑا اچھاٹے ہوئے

جواب دیا ”آپ کو صبح کے وقت ملیں گے۔“

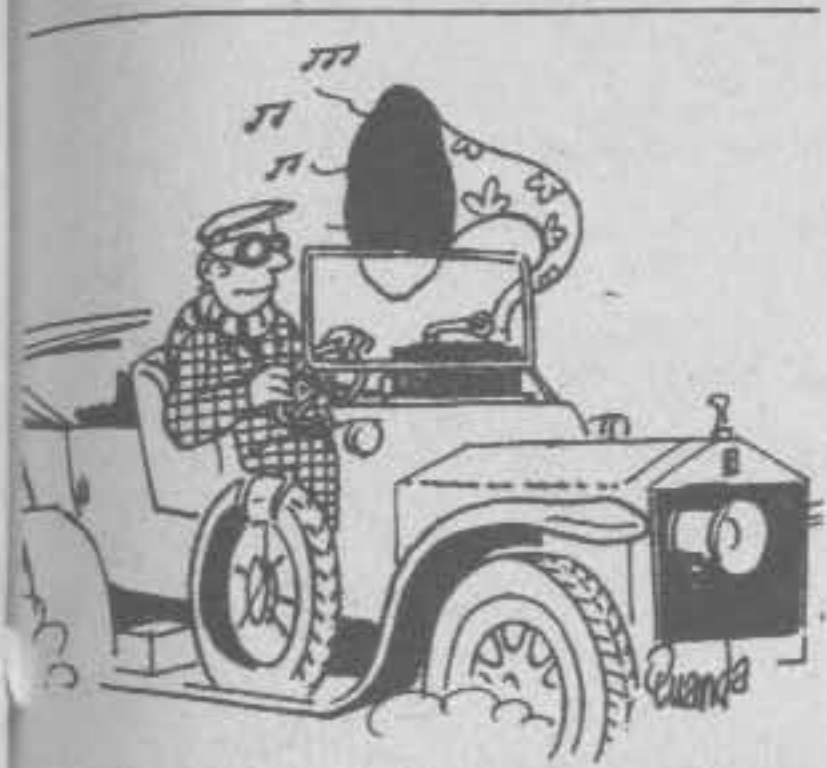
”اچھا! ذرا اشارت تو کرو، سلف اشارت ہے نا کہ دھکا لگاتے ہو؟“

”جی“ لڑکے نے سینہ تان کر کہا ”بالکل سلف اٹھاتی ہے۔“

”بیشک کے ساتھ میں سودا کر رہا ہوں میں نے جہانک کر سیٹوں پر

لٹھ مارا تو تم ہی ساتھ رہو گے؟“

”بالکل رہوں گا جی!“ لڑکا بولا ”میں تو گڈی کے ساتھ ساتھ جاتا



ہوں پیچھے یہ گڈی بتو استاد کے پاس تھی، میں استاد بشیر کے پاس گڈی کے ساتھ ہی آیا ہوں۔

”اچھا! اشارت تو کرو، تمہارا استاد پیچھے بہت مانگتا ہے۔“ کمانی کرنے والی گڈی ہے جناب۔ وہ اچھل کر سیٹ پر بیٹھا اور میں گھوم کر اس کے ساتھ ہی دوسری سیٹ پر بیٹھ گیا۔ اس نے آگینشن میں پانی لگائی اور انجن ہلنے لگا خاموش ہو گیا۔ شاید کوئی پانی کا پینٹا پڑ گیا ہے، لڑکے نے نیچے جا کر پینٹ اٹھا لیا پھر سیٹ پر آیا اور انجن دھڑکنے لگا۔

”باڈی کاواز تو نہیں کرتی رزوردار؟“ میں نے ایک قسم اُسے اور آگے چلایا ”ذرا جھوٹا سا پکڑ تو لو گاؤ۔“

لڑکے نے گھیر لگایا اور سوزدکی نے شاندار جھلانگ لگائی باگی وہ سنبھل بھی نہ پایا تھا کہ میں نے بڑی غلط کٹ اس کی کمزور گردن پر ماری، وہ کراہتا ہوا جھول گیا اور میں نے ایک دم پھرتی سے اسے سنبھال لیا پھر آہستہ آہستہ لڑکے کو اپنی رانوں سے گوارا دوسری سیٹ تک لے گیا۔ اتنی دیر میں سوزدکی ایک فرلانگ کا سفر طے کر چکی تھی۔

میں نے جب فیصلہ کیا تھا تب ہی ناگواری کی کڑواہٹ میری نسلوں میں سرایت کر چکی تھی لیکن فیصلہ ناگزیر ہی تھا۔ مجھے بہر صورت دت ضائع کیے بغیر گاؤں پہنچنا تھا کیسی ڈراٹور نے بڑے واضح انداز میں انکار کر دیا تھا اگر وہ منہ مانگے معاوضے پر آگے جانے پر رضامند ہو جاتا تو کم از کم ناخوش گوارہ قدم ہرگز نہ اٹھاتا، نو عمر اور غریب بچے پر زیادتی مجھے بے حد گراں گزری تھی۔

چوہدری منظر کے گاؤں سے ایک کلومیٹر دور ہی میں نے سوزدکی کی ساری تکیاں بچھا دی تھیں۔ آدھے چاند کی آداس آداس چاندنی میں ناہوار طرک پر مجھے خامی دشواری کا سامنا کرنا پڑا تھا بے ہوش لڑکا

بچکوں کی وجہ سے پھل کر نیچے گر گیا تھا اور گرتے ہی اُس نے آنکھیں بھی کھول دی تھیں لیکن خوف کی وجہ سے اُس کی زبان نہ نکلی تھی۔

”اوپر بیٹھ جاؤ بھائی میں نے اُس کو تھپ تھپایا بوڑھے نے گھبرانے کی ضرورت نہیں، میں تمہیں غل گاڑی کا کاریہ اور انعام دے کر واپس کر دوں گا۔“

وہ سکرنا ہوا اٹھا اور سیٹ پر اگڑا دل بیٹھ گیا۔

”مجھے بے حد افسوس ہے میں نے معذرت خواہانہ انداز میں کہا تو اُس نے ڈبے ڈبے آہستہ آہستہ چہرہ گھما کر میری جانب دیکھا اور موٹی موٹی آنکھوں سے آنسو اُس کے نچوڑ پھٹے ہوئے گالوں پر بہہ نکلے، یقین کر دیتے ہیں اُس سو دیکھ کر جی جان سے رز سا گیا تھا یہ خدا کی قسم میری نیت خراب نہیں تھی بس مجبوری تھی میں نے بریک لگائے اور جیب سے سو کے دو نوٹ نکال کر اُس کے گھٹنوں پر رکھ دیے ”گاڑی واپس لے جاؤ اور سنبھل جانا تمہیں کوئی ملامت“

اُسے حیرتوں میں ڈوبا چھوڑ کر میں نے سیٹ چھوڑ دی تھی۔ جب میں تین کھیتوں سے گزر کر برساتی نالے کے کنارے پہنچا تھا تو اُس نے ہینڈ بیس روشن کی تھیں پھر میں نے اُسے واپس جلتے دیکھا اور خود اُترائی میں ڈوب گیا تھا۔

نالیس ریت پر گیدڑوں کا غول کبڈی کھیل رہا تھا، جب میرے پاؤں کی ٹھوکروں سے پتھر بولنے لگے تو گیدڑوں نے میری طرف دیکھا اگر میری جگہ کوئی شہری نوجوان ہوتا تو ان جنگلی شرارتی گتوں کو مائل بہ استقبال دیکھ کر اُسے پاؤں بھاگ پڑتا مگر میری زندگی کا ایک حصہ اسی نالے میں مال مویشی چراتے، صبح و شام نہاتے اور اسکول، کالج جاتے گزرا تھا میں نے گیدڑوں کا شکار بھی کئی بار کھیلا تھا، ان کی تجراتیں، میری آزمائش ہوئی تھیں میں نے ایک پتھر اٹھایا اور پتھروں پر مار دیا۔ کھڑاک کی آواز سن کر گیدڑ تشر بھرتے چلے گئے، کچھ دانیں نکل گئے اور کچھ بائیں ٹہلے ہوئے چل پڑے تھے میں درمیان سے گزرتا چڑھائی پڑھنے لگا۔ تب ہی پہلے ایک گیدڑ بولا اور پھر قوالی شروع ہو گئی تھی۔

میں گاؤں کے کتوں سے چپتا بچاتا اپنی گلی میں داخل ہوا۔ گلی دوڑ تک ویران تھی اور گاؤں پر گھرے سکوت کی حکمرانی تھی۔ بڑے بزرگ ٹھیک ہی کہا کرتے تھے پہلے اور آخری پہر نیند دیواروں کو بھی آجاتی ہے میں بے آواز چلتا ہوا اپنی حویلی کے پچھاڑے جاڑکا اور پھر کاشن کے درخت پر چڑھ کر بوٹی اندر کودا ایک فائر نچا اور میں دیوار کے ساتھ لیٹ گیا تھا۔

چونکہ حویلی اندھیرے میں ڈوبی ہوئی تھی، اس لیے کسی نے محض آواز پر گولی چلائی تھی، ہدف بھی تاریکی میں تھا اور گولی چلانے والا ہتھ بھی دکھائی نہ دے رہا تھا۔ وہ کوئی دشمن تھا یا حویلی کا محافظ نہیں ہونے کا خطرہ بھی مول لینے کی پوزیشن میں نہ تھا۔ گولی ایک بار راستہ بھول گئی تھی تو دوسری آواز کا حلق چھین سکتی تھی۔ معاروشی کا جھکا ہوا اور میں ٹھٹھک گیا، میری حالت اُس بنی بیسی تھی جو مارچ کی روشنی میں اندھی ہو کر ادھر ادھر بھاگنے کی ناکام کوشش کرتی ہے۔ میرے سامنے کوئی آواز نہ تھی، میں نے چہرہ فوراً بانہوں کی اوٹ میں کر لیا تھا۔

”اوہ! یہ تو خرم ہے شاید وہ مانوس آواز میری سماعت سے ٹکرانی اور میں اٹھ کھڑا ہوا۔ وہ دونوں دوڑتی ہوئی میرے قریب آگئی تھیں میں غل سا کپڑے بھاڑنے لگا کہ زینت نے پیک کر مجھے بازو سے تھام لیا۔ میں حیران تھا، ایک آپ کے ہاؤس زینت نے مجھے کیسے پہچان لیا تھا۔ وہ ہر گز رہی تھی اور میں ہونق سا کھڑا اس کی ہچکیاں سن رہا تھا، وہ اتنی تو اُس رات بھی نہ ہوئی تھی جب اُس کا نام میری ذات کے جطر سے ہمیشہ کے لیے خارج کیا گیا تھا، اس قدر تو وہ اُس دن بھی نہ بڑھتی تھی جب اُس کا سہاگ گل کر کوئٹہ بن گیا تھا۔

میرے ہاتھ بے جان تھے اور جسم جیسے دھول دھواں بن کر تحلیل ہونے لگا تھا، اتنی سکت بھی نہ تھی کہ میں اُس کے سر کو سہلاتا لے کوئی سہارا دیتا، پس اکڑ کر پتھر میں بدل گیا تھا۔ خشک، سخت اور بے حس پتھر سا ہے کچھ پتھر بھی حساس اور نرم دار ہوتے ہیں میں شاید جملے ہوئے پہاڑ کا ٹوٹا ہوا پتھر تھا جس کی فی وقت کے مقررہ جگہ پر جوس لی تھی۔ خشک آنکھوں میں بس ملن کا احساس ہوا تھا چند آنسو بہہ جاتے تو شاید دکھ کی جلیں سرد ہو جاتی۔

”صبر اور حوصلے سے کام لیں باجی!“ عابدہ کی آواز میں بھی آنسو گھٹے ہوئے تھے ”وہ جس کے لیے آپ ہر لمحہ دعا میں کرتی تھیں۔ وہ آیا تو آپ بکھرے گی ہیں، عابدہ نے اُسے ادھیر کر مجھ سے جدا کیا تھا ”اندھیلیں ختم۔“

”تم لوگ...!“

”کچھ مت پوچھو، زینت تڑپ کر چینی، ایسا سوال پوچھنے کا

تھیں کوئی حق نہیں۔“

”سٹو زینت!“ مجھے اُس کا گستاخانہ انداز کاٹ گیا تھا میں شرمندہ ہوں نہ معافی مانگوں گا کیونکہ میں اس حویلی سے ہزاروں لاکھوں گنا بڑی حویلی کی رکھوالی کرتا رہا ہوں، آج میں اس لیے وہ ذمے داری پس پشت ڈال کر ادھر آیا ہوں کہ ہمارا دشمن شاید ادھر قدم بڑھانے والا ہے لیکن مجھے یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ میری حویلی

کے محافظ میدان میں، یکایک لوگ ہر رات پہرہ دیتی ہو؟
 "ہاں خرم!" عابدہ نے بتایا "لیکن آج ہم نے رات بھر پہرہ
 دینے کا پروگرام بنایا تھا۔
 "وجہ بتاؤ گی؟"

"ہاں کے ذرائع نے اطلاع دی تھی کہ وہ لوگ کسی بھی وقت
 دعاوا بول دیں گے۔"

"اماں بی ہم تو یہ اطلاع نہیں پہنچائی گئی؟"
 "نہیں! عابدہ بولی "ہم نے دلاور بھائی کو بھی پہرے پر لگا رکھا
 ہے، وہ اپنے دوستوں کے ساتھ باہر موجود ہیں۔"

"تھک سہ لڑکیں نے قدم بڑھاتے ہوئے کہا "میرے اندر بھی جاؤ۔
 دونوں میرے ساتھ ساتھ چلتے گئیں، جب میں برآمدے کی طرف
 کو نظر انداز کرتا ہوا آگے بڑھا تو زینت بول پڑی "تم بھی اندر چلو
 خرم نہیں کچھ باتیں کرنا چاہتی ہو۔"

"میں واپس نہیں جا رہا، باتیں صبح کریں گے۔"
 "نہیں! وہ جھجک اٹھی "تم... تم جھوٹے ہو، کیا پہلے ہی تم نے
 یہ وعدہ نہیں کیا تھا، شام آئے گا وعدہ تھا، کتنی شامیں گزار کر واپس
 آئے ہو، میں بتانا چاہتی ہوں کہ دونوں گانوں کی سیاست سمجھ کر اس
 حویلی میں آگئی ہے۔ کسی کے پاس بات کرنے کا اور کوئی موضوع نہیں
 رہا، ہر جگہ اور ہر وقت لوگ ہماری باتیں کرتے ہیں، گانوں کی بلندی
 بھی ان لوگوں کی ہمواری ہو چکی ہے۔ تم جانتے ہو چیرمین اس برادری کا
 ہے، اس نے ہمارے خلاف فیصلہ دے دیا ہے وہ... وہ... "زینت
 نے چہرہ ہلکا کر عابدہ کی جانب دیکھا اور عابدہ سیر حیاں چڑھتی اور پہلی
 گئی "جانتے ہو خرم، وہ لوگ کیا چاہتے ہیں؟"

"ہاں! میں نے ملحق میں ہی چھنکا رہا ہے جوئے کہا "میں تم سے
 دور رہ کر بھی دور نہیں ہوتا زینت! یہاں کی سیاست، سازش اور
 پل پل کی پلورٹ مجھے متنی رہتی ہے۔ آج ان بے غیرتوں نے اپنے
 خاندان کی پجڑی میرے پاؤں پر گرانا چاہی تھی۔ کلثوم کو میرے پاس
 بھیجا گیا تھا تاکہ میں اسے قبول کر لوں لیکن مجھے اپنے باپ کی پجڑی عزیز
 ہے، میں آج فیصلہ کرنے آیا ہوں اور جب تک فیصلہ نہیں ہوگا، میں
 واپس نہیں جاؤں گا۔"

"کیا فیصلہ خرم...؟"
 "زینت نے تیر زوہ آواز سے پوچھا۔
 "کیا... کیا تم...؟"
 "نہیں زینت! میں نے جواب دیا "فتح اور شکست کا فیصلہ
 مجھے بتایا گیا ہے کہ کل فاروق اپنے گانوں کے بزرگوں کی حمایت
 کے ساتھ یہاں آ رہا ہے اور میں نے فیصلہ کرنا ہے کہ وہ یہاں سے

کچھ اٹھا کر واپس چلے گیا اسے لوگ اٹھا کر لے جائیں گے۔
 "شکر یہ خرم!" زینت نے میری کلائی سہلاتے ہوئے کہا "میں
 تمہیں نہیں روکوں گی، اس حویلی کی حفاظت کے لیے فیصلہ ضروری ہے۔"
 زینت کی عدالت سے بری ہو کر میں خود کو بڑا ہلکا پھلکا محسوس
 کرنے لگا تھا، میں اگر کسی سے ڈرتا تھا تو وہ صرف زینت تھی۔ اماں بی کا
 غصہ بھی ملازم پر دغا اور مہربان ہوتا تھا لیکن زینت کی ناراضگی کچیاں
 ہی کر دے، روح کو ہوا لہان کر دیتی تھیں، اس نے میرے فیصلے کی تائید
 کر دی تھی۔

باہر جا کر میں نے دلاور کو شرمندہ کر دیا تھا کیونکہ وہ حویلی کا نگراں
 تھا اور میں ان کی نگاہوں میں آئے بغیر اندر داخل ہو گیا تھا، پچھواڑے
 سے دشمن بھی اندر داخل ہونے میں کامیاب ہو سکتا تھا، وہ تنہا تھا اور
 جب میں نے گیت کھولا تھا تو وہ دھڑکتا ہوا میرے سامنے آ گیا۔ اس
 نے نہایت ہی شرمندگی سے اعتراف کر لیا تھا کہ وہ دیوار سے ٹیک
 لگا کر بیٹھے سو گیا تھا یہی وجہ تھی کہ اس نے غازی آواز بھی نہ
 سنی تھی۔ یہ بھی ثابت ہوا تھا کہ وہی جاگتا ہے جسے درد ہوتا ہے، تھلاؤ
 تو تمام رات بیمار کی طرح نہیں جاگا کرتا۔

صبح کی سپیدی نمودار ہونے تک میں اور دلاور بدلی باری
 پہرہ دیتے رہے تھے، چونکہ میں اپنی موجودگی گانوں والوں پر ظاہر
 نہیں کرنا چاہتا تھا، اس لیے منہ اندھیرے ہی میں اندھا جا کر سو گیا تھا
 دس بجے زینت نے چہرے پر لٹکا پیر تو میں ہلکے آواز سے اٹھ بیٹھا۔
 "کتنی مدت بعد تمہیں سنا ہوا دیکھا ہے؟ اس کی آواز میں کئی
 جذبہ تھمرنے لگا تھا، تمہیں یاد ہے نا خرم! جب صبح نماز کے لیے
 جگائے میں آیا کرتی تھی اور کتنی نمازیں میری وجہ سے قصا ادا ہوا کرتی
 تھیں، میں تمہارے سر ہانے کھڑی تھیں، دھتکی رہتی تھی، وہ سب کچھ
 کہاں گیا ہے، کس کی نظر کھا گئی ہے ہمیں، پتا نہیں تمہیں ماضی کی یادیں
 ستاتی ہوں گی یا نہیں... مگر میرے اندر تو ان یادوں کے ڈور اڑتے
 رہتے ہیں۔"

"میں یاد ماضی کے عذاب کو یاد نہیں کرتا زینت! میں نے جانی
 لیتے ہوئے بتایا، حال نے مجھے گرفت میں لے کر سب کچھ چین لیا ہے
 میرے لیے ماضی سوائے ندامت اور پچھتاوے کے کچھ نہیں، وہ بھی فیصلہ
 ماضی سے ہی تعلق رکھتا ہے، جب میں نے تمہارے زیورات چر لائے
 تھے تم نے کیا کچھ نہ سوچا ہوگا؟"

"میں نے بہت کچھ سوچا تھا خرم، بہت کچھ! زینت کھولی
 کھولی آواز میں بولنے لگی "لیکن اس سوچ میں زور نہ تھا، صرف
 خرم تھا۔"

"چھوڑو ماضی کو میں نے نازک اور جلتے ہوئے موضوع سے
 گھبرا کر بات بدل دی "یہ بتاؤ اماں بی مجھ پر تعجب سے ناراض تو
 ہوں گی۔"

"پتا نہیں خرم! زینت کے لیے میں احترام دے رہا ہوں گہرا
 سندریش، دیکھو اندر خوشی سب کچھ ایسے سہارے ہیں کہ بعض اوقات میں
 ان کی گہری چُپ اندھیرے سکون سے سکون سے گھبرا جاتی ہوں، جب ہم
 لوگ نماز سے فارغ ہوتے ہیں تو ان کے ساتھ دعا مانگتے ہیں، پس
 دعائیں وہ تمہارا نام لیتی ہیں۔"

میں نے کچھ کاکولہ شکل نکال دیا تھا۔ مجھے یقین تھا دعائیں
 صرف مانتا بولتی ہوئی وہ عورت ہے اس خاندان کی عزت اور حویلی
 کی عظمت بے حد عزیز رہی ہے۔ وہ مجھ جیسے نالائق اور بے پروا
 سے خوش نہیں ہو سکتی تھی۔

"اچھا بڑی عدالت میں پیشی کب کروا رہی ہو؟"
 "پہلے ناستا کرو، زینت نے کہا "بہنچک میں چاچا اکرم دین اور
 کچھ دوسرے لوگ بیٹھے ہیں۔"

"اوہ...! میں چونک پڑا "کیا وہ جانتے ہیں میں حویلی میں
 موجود ہوں؟"
 "نہیں! زینت استہفائی نگاہوں سے دیکھنے لگی "کیوں، تم خود
 کو چھپانا چاہتے ہو؟"

"فی الحال زینت! میں نے ثابت میں گردن ہلائی اور چارپائی سے
 اتر گیا "میں نہیں چاہتا میری موجودگی کی اطلاع پا کر وہ لوگ اپنا منصوبہ
 بدل ڈالیں۔ میرے پاس اتنا وقت نہیں کہ انتظار کروں، تم خود چاچا اکرم
 سب سے بات کرو میرا خیال ہے، وہ اسی سلسلے کی کوئی کڑی لائے ہوں گے۔
 زینت جھجک کی جانب چلی گئی اور میں بچوں کے بل چلتا ہوا

باندھ روم میں داخل ہو گیا، غسل سے قبل میں نے ہلکا سا کادہ چہرہ
 اویڑا دیا تھا، جس نے کتنے ہی مشکل لمحوں میں خرم سلطان کو بچا یا تھا
 اگر ہلاک کے کھڑے کھڑے خرم سلطان کے چہرے پر چپکے ہوئے نہ ہوتے تو
 اور کوئی بچا یا نہ ہوتا مگر منظر جو بدری کو جب جانسن اور عوام
 شہناز نے شناخت پر ٹیڈ کے لیے بھلایا تھا تو گردن نفی میں ہلا کر جانسن
 جیسے بین الاقوامی غنڈے کو بے وقوف نہ بناتا اگر میری شناخت ہو جاتی
 تو منظر جو بدری تو شاید صرف خوش ہی ہوتا مگر جانسن مجھے سلاٹر ہاؤس
 میں پہنچا کر ضرور ذبح کر دیتا۔ میں نے ایک ضرورت کے تحت ہی مصنوعی
 چہرہ پہنا تھا اور نظر یہ ضرورت نے ہی اویڑا دیا تھا۔ بزرگوں کے
 قول اور میرے ذاتی تجربات کے مطابق نام کی دہشت برہ مقابل کو
 نفسیاتی طور پر مفلوج کر دیتی ہے۔

مجھے باجی کی زبانی سنا ہوا ایک سچا واقعہ یاد تھا، انھوں
 نے بتایا تھا کہ ایک شخص سجاد کی دہشت علالت میں قوت کی
 علامت بنی ہوئی تھی۔ بڑے بڑے جابر لوگ سجاد کا نام سن کر
 تھر تھرا پھٹنے لگتے تھے۔ ایک رات سجاد کیس سے آ رہا تھا کہ ایک
 نوجوان نے اس کے سینے پر پستول رکھ کر کہا "جو کچھ ہے میرے حوالے
 کر دو، سجاد! اس نو آموز ڈاکو کو دیکھ کر مسکرایا پھر بولا "خود دیکھ
 پہچانتے ہو میں کون ہوں، میرا نام سجاد خان ہے۔ یہ سنا تھا کہ
 نوجوان ڈاکو کے ہاتھ سے پستول چھوٹ کر نیچے جا پڑا اور وہ یوں
 لرزے لگا جیسے جاڑے کا بخار آ گیا ہو... چو بدری کو بھی میرے نام
 کا بیوت ہر وقت ڈراتا رہتا ہے۔ میں چاہتا تھا، جو کام سچے
 کی گرم گولی کرتی ہے اگر وہی کام میرا نام کر جائے تو خون خرابے
 کی آہستہ اور اذیت سے بچ جاؤں گا۔"

غسل سے فارغ ہو کر باہر آیا تو زینت نے پیار بھری نگاہوں
 سے میرا اہل چہرہ دیکھا جسے میں نے بالوں اور روشن سے صاف
 کر کے چمکا دیا تھا۔
 "خرم! کیا تم سی آئی ڈی کے آدمی ہو؟" زینت نے میرے
 لیے چلنے بولتے ہوئے پوچھا۔

"ہاں! کچھ ایسا ہی کام ہے" میں نے پراٹھے کا بڑا سا نوالہ منہ
 میں ٹھونسنے ہوئے جواب دیا "جو چاہے سے کیا باتیں ہوئیں؟"
 "وہ اماں بی کے پاس چلے گئے ہیں زینت نے بتایا۔
 "باتیں وہی ہوں گی، میں کہہ چکی ہوں کہ اندھیرا تو ان کا موضوع ہم
 لوگ ہی ہیں، ہر روز نئی نئی باتیں لے کر عورتیں آتی ہیں، مجھ سے کوئی
 بات نہیں کرتا، اماں بی کا خون جلایا جاتا ہے۔"
 "ان عورتوں میں کوئی قابل بھروسہ بھی ہے؟"

"کیوں؟" زینت نے ابرو اچکا کر پوچھا۔
 "اُسے سن گئے ہیں ادھر بھیجا جائے تو شاید تازہ ترین صورت حال
 معلوم ہو جائے۔"

"میری سہیلی صفراں ہے، اسی گانوں کے اسکول میں آتلی ہے۔"
 "اُلو، ایسا کرو کسی کو بھیج کر یہاں زینت کو بلاؤ، اسے صفراں
 کے لیے پیغام دے کر بھیج دیں گے۔"

"تم کرنا کیا چاہتے ہو خرم؟"
 "ناگوں کے سر کھینچنا چاہتا ہوں تاکہ اس حویلی کے کھن بے خطر
 باہر گھوم پھر سکیں۔"

"تمہارے ساتھ اور کتنے لوگ ہیں؟" زینت جرح کے انداز
 میں بولی "وہاں صرف دو ناگ نہیں ہیں خرم سلطان! وہ تو ناگوں

کی سستی ہے، تمہیں شاید معلوم نہیں کہ گاؤں کے سارے نوجوان اس مسئلے کو اپنی ناک اور گاؤں کی عزت کا مسئلہ کہہ رہے ہیں۔ بزرگ لوگ بھی ان کے پشت پناہ ہیں، جب کہ ہماری برادری صرف اس حیرانی کو کھنڈر دیکھنا چاہتی ہے۔ دلاور بھائی اور اُس کے چار دوست ہمارے ہمہ ریں اگر وہ گاؤں پر چڑھ دوں تو کیا چند لوگ مقابلہ جیت میں آئے؟

”ہاں! میں نے باوثوق بھیجے ہیں کہ اب سو منات کے لیے ایک خود ہی کافی ہوتا ہے۔ میں تو اپنی آگ میں دلاور کو بھی شریک نہیں کرنا چاہتا۔ یہ آگ خود ہی بجھانی ہوگی۔“

”تم پاگل ہو۔“ وہ تڑختی آواز میں بولی۔ ”برادری کی جنگ برادری کی مدد کے بغیر آج تک کوئی نہیں جیت سکا۔ یہی غلطی ابامیاں سے ہوئی تھی۔ وہ نہا ہی میلے میں چلے گئے تھے۔ میں نے ان کو بھی روکا تھا لیکن وہ میرے سر پر ہاتھ پھیر کر ہنستے ہوئے روانہ ہو گئے تھے پھر... پھر...“

”زینت کے حق میں آنسوؤں کا پھندا لگ گیا۔ میں نے ان کی لاش اندر آتی دیکھی تھی، اب تم بھی وہی ضد کر رہے ہو۔ میں بزدل نہیں ہوں خرم اور نہ ہی تمہیں بزدلی کا راستہ دکھانا چاہتی ہوں مگر یوں خود کشی کرنے کی اجازت بھی نہیں دے سکتی۔“

قدموں کی ٹپ سی چاپ سن کر میں نے گردن موڑی اور پھر جیسے میرے گھٹنوں سے جان نکل گئی ہو، دروازے میں اماں بی کھڑی تھیں، نہ جانے میں کیسے کھڑا ہو گیا۔

”زینت! اگرچہ دار آواز ابھری۔“ یہ بے وقوف لڑکائیوں کیا ہے اور کیا کرنا چاہتا ہے؟“

”کچھ نہیں اماں بی،“ زینت نے لڑکھڑاتے ہی میں جواب دیا۔

”شہر کی باتیں کر رہے تھے ہم لوگ۔“

”نہیں۔“ وہ میرے قریب آ کر بولیں، ”میں تمہاری باتیں سن چکی ہوں، میرے ساتھ چو خرم سلطان! میں کسی سحر زدہ انسان کی طرح ان کے پیچھے چل پڑا۔ میرے ساتھ زینت بھی سلتے کی مانند بے آواز چل رہی تھی۔ اماں بی کسی جرنیل کی چال میتی ہوئی ابامیاں کے کمرے میں داخل ہوئیں، اباجی مرحوم کا بستر اسی طرح بچھا ہوا تھا جیسے ان کی زندگی میں سفید براق بیڈ ٹیٹ بھی رہتی تھی۔ رات سونے سے قبل وہ بیڈ ٹیٹ نہ کر کے سر پر رکھ دیا کرتے تھے اور صبح نماز کے لیے بستر چھوڑتے وقت چادر بچھا جایا کرتے تھے۔ یہ ان کا ایک ایسا عہد تھا جو یقیناً آخری صبح تک قائم رہا ہوگا اور ان کی بچھائی ہوئی بیڈ ٹیٹ پھر کسی نے نہ اٹھائی تھی۔ اماں بی نے غصے سے بھرپور کمر بستر کی

جانب دیکھا اور پھر آگے بڑھ کر اندرونی کوشری کا دروازہ کھول دیا۔ ”اندراؤ خرم سلطان!“ انھوں نے تھکاتے ہی میں کہا میں اندر گیا گندھیرے میں اماں بی کا بیولا دکھائی دیا، جو دیوار کے قریب کھڑا تھا۔ زینت چراغ روشن کرو۔“

زینت آگے بڑھی، اسے جیسے اندھیرے کے باوجود وہ جگہ معلوم تھی جہاں چراغ اور مایوس تھی۔ اُس نے دیا سلائی، مگڑی، شعلہ پھیرا اور پھر کڑوے تیل کا چراغ روشن ہو گیا۔ میں اسی حویلی میں پیدا ہوا تھا اور میں جوان بھی ہوا تھا مگر وہ کمر پہلی بار مجھے دکھایا گیا تھا۔ میں نے چراغ کی ٹھنڈی روشنی میں جلتی لنگا ہوں سے دیکھا۔ دیواروں کے ساتھ پڑنے والے زمانے کے ہتھیار رکھے ہوئے تھے۔ تواریں، تبریں، ڈھالیں، برجھیاں، زنگ آلود انیوں والے رنگین منظرے اور عجیب ساخت کی چم چاتی کلہاڑیاں، دوسری دیوار کی طرف اماں کا رخ تھا۔ انھوں نے پلٹ کر میری طرف دیکھا اور میں سکڑ کر مودب ہو گیا تھا۔

”یہ تمہارے نگر دوا چوہدری بلال خان کی پگڑی ہے، یہ سیاہ دھتے رنگ کے نہیں بلکہ خون کے ہیں، ان کا سر بے عادت کے جرم میں اُس وقت کے ایک راجا نے میرا عام آثار تھا اور یہ کرتہ تمہارے دوا کا ہے۔ یہ پیچیدہ دیکھ رہے ہو، سینے پر پندہ برہمچویں کی عزتیں کھا کر گرے تھے۔ یہ لباس یقیناً تمہارا جانا بچپنا ہے یہ تمہارے باپ کا وہ لباس ہے جو ان کی لاش سے اُتار لیا تھا اور یہ تمہارے بھائی کی راکھ...“ انھوں نے ایک پوٹی پر لیے ہاتھ پھیرا، جیسے ماں بیاڑچے کو سہلا رہی ہو۔ اب تم ان پیش روؤں کے نقش قدم پر چلنے کی تیاری کر رہے ہو لیکن اب میرے ہاتھوں میں ایک اور کیل ٹھونکنے کی سکت نہیں رہی ہے میرے پیچھے ان ناواں بوڑھے ہاتھوں پر رحم کرو۔“ انھوں نے دونوں ہاتھ آگے بڑھائے اور میں نے ہلکے کر ان کے ہاتھوں کو تھام کر ہونٹوں سے چوم کر انھوں سے لگا لیا۔ آواز کہیں گم ہو گئی تھی، میں ان ہاتھوں کو آسوق سے جھکوتا رہا تھا۔

”وعدہ کرو خرم... اپنی ماں سے وعدہ کرو! ہم اس روایت کو جاری نہیں رکھو گے۔“

”نہیں اماں بی! زینت ہمارے درمیان آگئی جو خرم سے ایسا کوئی وعدہ نہ لیجے اگر مردانگی اور غیرت کی رسم نبھانے کی روایت ٹوٹ گئی تو اس حویلی کی شاندار روایات کو زندہ کون رکھے گا۔ زندگی اور موت کا فیصلہ کوئی انسان نہیں کیا کرتا، اپنے بیٹے اور اس خاندان کے سربراہ کو اپنے آباؤ اجداد کی روایت کو زندہ رکھنے کا عزم دیں اماں بی!“

”تو کیا تو چاہتی ہے کہ...؟“

”ہاں اماں بی!“ زینت کھٹک دار آواز میں بولی، ”ہمارا حافظ ایک غیرت مند ہونا چاہیے۔“

”تم کیا کہتے ہو خرم سلطان؟“ اماں بی آواز بھرنے لگی، ”تم بھی! جی ہاں اماں بی!“ میں نے مشکل اپنے ارادے کو بیان دیا تھی۔ ”میں ان شہدائی روضوں کو شرمسار نہیں کر سکتا لیکن بے غیرت بن کر زندہ رہنے پر اپنی آن پر بہادری سے لڑتے ہوئے مرنے کو ترجیح دوں گا کہ یہی زندگی کی معراج ہوتی ہے اماں بی!“

”ٹھیک ہے،“ اماں بی نے گہری سانس لی، ”اگر کہانی آگے چلے دے تو یہی منظور ہے تو میں کیا کر سکتی ہوں؟ وہ شاید بے توازن ہونے لگی تھیں کہ زینت نے ان کو سنبھال لیا۔ میں بے جان قدم اٹھاتا زینت کے کمرے میں چلا گیا تھا۔ اماں بی کا سامنا تو ہو گیا تھا لیکن میں خود میں ان کے سامنے رہنے کی جرأت نہیں پا رہا تھا۔“

بارہ بجے دلاور حلیہ میں آیا۔ ہم نے دن کا کھانا مل کر کھایا زینت نے میری خبر پوچھی اور اس نے کہا کہ ہمارے ملازم بھی حویلی سے باہر نہ چاسکے تھے۔ زینت کی وجہ سے عابدہ کہیں دیکھ گئی تھی اسے کہہ دیا گیا تھا حالات کا رخ اُس نے خود پہچان کر کتناہ کشی اختیار کر لی تھی کچھ بھی رہا ہو میرے لیے بہتر ہی ہوا تھا، میں تنہا کس کس کا مقابلہ کرتا۔ عابدہ کی زبان تو خاموش رہتی تھی لیکن اُس کی بڑی بڑی کھلے دلالان جیسی سیاہ آنکھیں میرے قریب آ کر خالی کشول بن جایا کرتی تھیں، میرے پاس کچھ نہیں تھا، میں سوائے مذمت کے ان خالی کشولوں میں کچھ ڈال بھی نہیں سکتا تھا۔ زینت کا احسان تھا اُس نے اُسے روک کر مجھے خجالت سے بچا لیا تھا۔

صفرال نے بڑی اچھی معلومات فراہم کی تھیں، اُس نے بتایا تھا کہ مظفر چوہدری نیردار کے بیٹے شاہ زمان کے گھر چھپا ہوا ہے اور گاؤں کے نوجوان اُس سے ملاقاتیں کر رہے ہیں۔ فاروق چوہدری صبح شہر جانا دیکھا گیا ہے، اُس کے ساتھ تین نوجوان تھے۔

کاراج کے زمانے میں فوجی تربیت دینے والے فوجی اساتذہ نے جنگ اور حملے کے بارے میں بتایا تھا کہ اچھا کمانڈر دشمن کی زمین پر لڑتا ہے اور حملے میں ہمیشہ پہلے کرتا ہے۔ فوج اس سہارے اصول کو ہمیشہ تو نظر رکھتی ہے۔

”بڑے کروشن کو تباہ کر دو، ورنہ وہ تمہیں نیست و نابود کر دے گا۔“ کلثوم کی فراہم کردہ اطلاع پر مجھے بھروسہ سا نہ رہا تھا۔ اسے جو کچھ بتایا گیا تھا ادھی کچھ اُسے کہنا تھا، اس لیے میں نے دوسروں کے ذرائع پر اپنی قوت کو ترجیح دینے کا فیصلہ کیا تھا۔

رات نو بجے میں مکمل تیاری کے بعد اماں بی کے کمرے میں داخل ہوا۔ وہ جائے نماز پر آتھی پالتی کی حالت میں تسبیح رول رہی تھیں۔ میں گھٹنوں کے بل ان کے پہلو سے ٹک کر بیٹھ گیا۔

”میں جا رہا ہوں اماں بی!“ میں نے ان کے شلے پر چہرہ رکھ دیا، مجھے اپنی دغاؤں کی چھاؤں میں روانہ کریں۔“ اماں بی نے میرا چہرہ دونوں ہاتھوں میں لے کر پہلے پھونک ماری پھر ان کے ہونٹوں کا لمس میری رُوح کو سیراب اور شاداب کر گیا تھا۔

”جاؤ میرے بچے! میں اپنی متاعِ عینِ رب اللہ کے سپرد کرتی ہوں۔“ انھوں نے آنکھوں کو چومنا اور میں نے دونوں ہاتھ ان کے ہونٹوں کو پیش کر دیے، مجھے ہاتھوں کے لیے ماں کی دُعا اور قوتِ درکار تھی۔ اماں بی نے میری ہتھیلیوں پر مٹکی رُوح اٹھال دی تھی۔

باہر برآمدے میں زینت ستون سے ٹیک لگائے کھڑی تھی۔ میں ہونے ہوئے مٹا اُس کے قریب چلا گیا۔ اُس کے ہاتھ اُٹھے اور میں نے ہاتھوں کو انجانی منزل سے دُور ہی ہاتھوں کی رکاوٹ سے روک لیا تھا، میں زندگی اور موت کا کھیل کھیلنے جس میدان میں اُترنے جا رہا تھا، اس کے لیے مجھے جس حوصلے اور طاقت کی ضرورت تھی، وہ ماں نے عطا کر دی تھی۔ زینت کے پاس جو جذبے تھے، وہ فراغت اور آسودہ حالی میں ہی محسوس کیے جاسکتے تھے، موت انسان کی کمزوری ہوتی ہے میں کوئی کمزوری ساتھ لے جانا نہیں چاہتا تھا، زینت جو میرے لیے مر چکی تھی، جس نے خود بھی مرنے کا اعتراف کر لیا تھا، بھائی جان کی موت نے اُسے نئی زندگی اور نئی اُمید دے دی تھی، وہ پھر نوجوان ملکی بن کر پُر خاراؤں پر کثیف لگا ہوں سے دیکھنے لگی تھی، میں اس معاملے میں اتنا بزدل تھا کہ اُسے روک بھی نہ سکتا تھا، حالانکہ مجھے اُس کی نگاہیں اذیت دینے لگی تھیں، میرے نزدیک وہ اب بھی محترم اور شہرِ ممنوعہ تھی۔

”خرم!“ اُس کی جھجھکی آواز ابھری، میں کوئی مشورہ دوں گی نہ تمہیں روکوں گی کیونکہ تمہیں اپنے فیصلے پر عمل کرنا ہے، میں صرف ایک سوال کا جواب چاہوں گی، اس لیے خرم کو تم ایک خطرناک مشن پر جارہے ہو، کچھ بھی ہو سکتا ہے، جنگ میں دونوں بائیں ہو سکتی ہیں، مجھے تمہارے جواب پر باقی زندگی کی عمارت کھڑی کرنا ہوگی، میں اُس جواب کے سہارے، تمہارے نام باقی زندگی بسر کروں گی مجھے بتاؤ خرم! تمہارے اندوہ دہلی، جس نے ہوش سنبھالتے ہی تمہیں دیکھا اور چاہا ہے اور جس کی آنکھیں اب بھی صرف ایک شخص کے لیے دیکھتی اور منتظر رہتی ہیں، تمہارے اندر بھی زندہ ہے؟“

سوال بے مدِ شکل تھا لیکن میں کسی تخراب کا متحمل نہیں تھا۔

”ہاں زینتی!“ میں نے اُس کے ہاتھوں کو سہلانا شروع کر دیا، ورنہ

ہو اور میری لاش کے اندر جب میری روح نہ رہے گی تب بھی وہ لڑکی
نہ نہ رہے گی۔
"شکر یہ ختم" زینت نے ایک دم جھک کر میرے ہاتھ چوم لیے
اور میرا جسم جھکا کر سر سرانے لگا۔ بس اب میں دونوں حالتوں میں جی
ٹول لی، جاؤ... وہ لڑکی تھیں خدا کے حوالے کرتی ہے اور پھر خدا ہی
سے واپس ملے گی۔

میں نے اس کے جھکے ہوئے سر کو تھپی دی اور تیز قدم اٹھاتا
سیڑھیوں اتر گیا تھا قہارہ کے آنے سے پہلے میں عیسیٰ سے نکل جانا چاہتا تھا۔
وہ اس کے کسی سوال کا جواب بھی منافقت سے دینا پڑا۔

نہر دار محمد زمان کا گھر اور اس گاؤں کی گلیاں مجھے پہچانتی تھیں
شاہ زمان کبھی ہم کامبرہ چکا تھا ہم جب بھی مقابلے پر جاتے تو سامنے
لڑنے کے شاہ زمان کے گھر ہی جمع ہوا کرتے تھے۔ اور شاہ زمان کی ماں گرم
گرم دودھ سب لڑکوں کو پلایا کرتی تھیں۔ میں ہر خطرے سے بے نیاز
بل کھاتی تنگ گلیوں میں چلتا رہا، خوف صرف موت کا ہوتا ہے،
جو موت کو قبول کرے اس سے خوف بھی دور چلا جاتا ہے۔ میں چار
گلیوں سے ہوتا ہوا جب نہر دار کی عیسیٰ کے سامنے گیا تو ایک شخص
چلنے کے برتن اٹھائے بیٹھ گیا۔ سے باہر نکلا میں چہرہ دوسری طرف
کرتا ہوا آگے نکل گیا بیٹھ گیا کے دروازے سے دس قدم دور عیسیٰ
کا بڑا دروازہ تھا، جب وہ عیسیٰ میں داخل ہو گیا تو میں پلٹ کر بیٹھ
کے پھوڑے چلا گیا۔

وہاں صرف ایک تبدیلی ہوئی تھی۔ لکڑی کی بھاری کھڑکیوں
کی جگہ بوسہ کی کھڑکیاں لگ گئی تھیں اور کواڑوں میں شیشے لگے
ہوئے تھے۔ میں نے شیشے سے چہرہ لگایا۔ اندر کی چار آدمی تھے، چوہدری منظر
شاہ زمان اور ایک چہرہ میرے لیے نیا تھا۔ وہ ٹھیل مونیوں والا جوان
شاید باہر سے آیا تھا، چوتھا میرا کلاس فیوا اقبال چوہدری تھا۔

میں نے کواڑوں پر بے آوازہ ناؤ ڈالا اور نئے کواڑ خاموشی سے
بٹ گئے تھے اور دو اور بچہ چھری پھرا ہوئی تھی میں نے ڈارٹ پستول چھری
میں داخل کیا اور ڈارٹنگ دیا دیا۔ شاہ زمان کے بدن کو ہلکا سا جھکا
لگا، اس نے چوبک کر منظر چوہدری کی جانب دیکھا، جو ایزی حالت
میں سرگرمی رہا تھا، اس کی رانوں پر رانٹل پڑی ہوئی تھی۔ دوسرا ڈارٹ
اقبال کی موٹی گردن میں پھوسا ہوا تھا، وہ اچھل کر نیم اسٹوڈ ہوا
پھر تیزانہ لگا ہوں سے ساتھیوں کو دیکھنے لگا، اسی وقت شاہ زمان
کری سے پھسلتا ہوا نیچے لڑکھک گیا تھا۔

جب منظر چوہدری سرگرمی دروازے کی طرف اچھال کر خود
بھی اچھل کر اٹھا۔ اس وقت تین آدمی اندر سے ہو چکے تھے منظر چوہدری

نے دروازے کی جانب چھلانگ لگائی اور میرا نشانہ خطا ہو گیا داخل
میں اسے حالت بیداری میں لٹکانا چاہتا تھا کہ کل یہ نہ کہہ سکے کہ
خستہ سلطان نے چوری چھپے ضرب لگائی تھی مگر اسے فرار ہوتے
دیکھ کر ڈارٹ چلانا پڑا تھا اگر وہ عیسیٰ میں جانے کا فیصلہ کر لیتا تو میری
راہ میں مشکلات ختم ہو جاتیں۔ اندر بول دیا محمد زمان اور اس کی بیوی
تھی۔ شاید شاہ زمان کی بیوی بھی سوئی ہوگی میں نے بے گناہ اور غیر متعلق
لوگوں کو پریشان نہیں کرنا چاہتا تھا۔

اچھا ہوا تھا منظر چوہدری بد کے ہوئے گیدڑ کی طرح گلی میں
داخل ہوا تھا میں نے دیو اور کی نال پر سائینس چڑھایا اور چوہدری کی
متحرک ٹانگوں میں فائر جھونک دیا، ڈارٹ کی طرح پہلی گولی کو بھی
چوہدری ڈانچ دے گیا تھا، چونکہ گلی سیدھی تھی اس لیے میں اس کے
تقاب میں دوڑا نہیں تھا۔ دوسری گولی کہیں نہ کہیں اسے لگ گئی تھی
وہ لڑکھڑاتا ہوا دیوار سے ٹکرایا، گرا اور سنبھل کر اس نے پھر دفعتاً شروع
کر دیا تھا۔

اندھیرے کے باوجود میں نے صوفس کر لیا تھا کہ وہ ایک ٹانگ
پر اچھل اچھل کر آگے بڑھ رہا ہے، وہ یقیناً اپنے گھر تک پہنچنا چاہتا
ہو گا۔ میں نے غلط بھڑکن کو ان گلیوں میں جھوٹا اور پھر ایک گلی
میں گھس کر دوڑنے لگا۔ وہ گلی سردار خان اونٹ بان کے گھر سے
گورتی اس گلی سے جا ملتی تھی، جس میں منظر چوہدری ایک ٹانگ سے
بڑھ رہا تھا۔

میں جب تڑپ سے گھوما تو مجھے منظر چوہدری دیواروں کا سہارا
لیتا قدم قدم بڑھتا دکھائی دیا۔

شاید بہت کم شہری یہ جانتے ہوں گے کہ دیہاتوں کے لوگ
سردیوں میں سرشام ہی گھر بند ہو جانے کے عادی ہوتے ہیں۔ بلا
ضرورت کوئی باہر نہیں نکلتا اگر کوئی کسی سے ملنے بھی جاتا ہے تو اندر
ہی بیٹھ کر ملاقات اور باتیں ہوتی ہیں یہی وہ جب تھی کہ گلیاں
ویران تھیں اور گاؤں پر سکوت طاری تھا۔ میں بھی ایک دیوار سے پشت
لگا کر خاموش کھڑا ہو گیا تھا۔ میں چاہتا تھا کہ جب وہ سامنے آئے تو
بھیٹ کر اسے اچک لوں لیکن وہ شاید جمت ہارنے لگا تھا۔ پندرہ
میں قدم دور وہ بھی دیوار کا سہارا لے کر رک گیا تھا تب ہی میں نے
آگے بڑھنے کا فیصلہ کیا اور جب میں اس سے چند قدم کے فاصلے پر
رہ گیا تو اس نے کراہتی آواز سے پوچھا۔

"کون ہو بھائی! میں زخمی ہوں مجھے گھر پہنچاؤ۔"

"اوہ، کیا ہوا چوہدری صاحب؟" میں نے آواز بدل کر پوچھا۔
"بھیس گیا تھا، شاید مورچ آگئی ہے پاؤں میں، منظر چوہدری

نے میرے دائیں شانے پر ہاتھ رکھ دیا اور میں نے بڑے ہٹا کر کندھے
پر ڈال لیا۔ وہ کراہتا اور بڑبڑاتا رہا تھا مگر میں خاموش ہی رہا تھا اس
کی جویری کی بالائی منزل روشن تھی میں نے دستک دے کر اسے نیچے
لٹھک دیا تھا۔

"کون؟" آواز میں کر میرے خون کی گردن رگوں کو پھاڑنے لگی
تھیں بولنے والا فاروقی چوہدری تھا۔

"میں ہوں فوٹے دروازہ کھولو" منظر چوہدری نے جواب دیا۔
دروازہ کھلا اور فاروق نے جویری گردن باہر نکالی میں نے کھڑی پھیل
کی ضرب اس کی گردن پر لگائی۔ مجھے اپنی آندودہ ضرب پر یقین اور بڑا
مان تھا۔ فاروق ایسے ہی میرے پاؤں میں گرا تھا جیسے درخت کی موٹی شاخ
ٹوٹ کر کوڑا کی گری ہو۔

منظر چوہدری بڑبڑاتا ہوا اٹھایا تھا کہ میری لات اس کی پشت
سے ٹکرائی، وہ کئی گز دور جا کر اوندھے منہ گرا اور بالائیٹ گیا تھا۔ فاروق
کی طرف سے میں نے فکر تھا پانچ دس منٹ بعد ہی وہ اندھیروں سے
اُبھر سکتا تھا۔

منظر چوہدری صرف ٹوٹ پھوٹ گیا تھا، جب میں نے اسے
ٹھوکر لگائی تو وہ تڑپ کر سیدھا لیٹ گیا تھا۔ میں نے اس کے چوڑے
سینے پر ایڑی ماری تو اس کے منہ سے عجیب سی آواز ابھری تھی۔

"کون... کون... ہوم...؟" اس نے کہنیوں کے بل اٹھتے ہوئے
لڑتی آواز سے پوچھا۔

"کیا اب بھی نہیں پہچانتا چوہدری؟" میں نے اس کی ٹھوڑی پر
ٹھوکر لگائی۔ دوسروں کے گھر تھمر مارنے والے کو اپنی ذات کے
شیشے کی حفاظت کرنی چاہیے۔

"میری... ٹھہرو...!" میرے اٹھتے پاؤں کو اس نے ہاتھوں
پر روکنا چاہا۔ میری بات سن کر خرم چوہدری...!"

"جلدی بچو!"
"میں اپنی زندگی کے بے تھیں ایک ایسے شخص سے آگاہ کر
سکتا ہوں جس نے میرے جیسے کسی شکاری تھماری تلاش پر لگا رکھے ہیں۔"
مجھے کچھ نہیں چاہیے چوہدری میں نے کہا کہ کوئی تم صرف
اسے شکل سے ہی جانتے ہو، تمہیں یہ بھی معلوم نہیں وہ کون ہے
اور اس کا خفیہ ٹھکانا کہاں ہے؟

"میں جانتا ہوں، بہت کچھ جانتا ہوں چوہدری، وہ بلا کا
صابر اور مضبوط شخص تھا۔ ٹوٹ پھوٹ کر بھی خود کو بابر سمیٹ
رہا تھا۔ وہ اٹھ کر بیٹھ گیا تھا، اس نے مجھے یہ فون فبر دیا تھا اگر
تم شریفانہ وعدہ کرو تو میں اس کا خفیہ ٹھکانا بتا دوں گا۔"

"میں اتنا حق نہیں ہوں کہ طفل تسلی سے کروا پس چلا جاؤں گا؟"
"میں اپنی ماں کی قسم کھاتا ہوں تمہیں دھوکا نہیں دوں گا۔"
"اچھا... کب اس سے ملاقات ہوئی تھی تمہانسی؟"
"آج تین بجے، میں اس سے پوچھنے گیا تھا کہ مال کہاں
پہنچایا جائے؟"

"ٹھیک ہے منظر چوہدری! میں تم پر نہیں اپنے علاقے کی مردانہ
روایات اور مٹی پر بھروسہ کرتے ہوئے وعدہ کرتا ہوں کہ تم سے
زندگی نہیں مل جائے گی، بتاؤ وہ کہاں ہے؟"

"آئی ناٹن میں وہ نئی کوٹھی ہے مغرب کی جانب نئی بننے والی
سڑک کی آخری کوٹھی میں نے قبر نہیں دیکھا، وہاں تین انگریز اور بھی
تھے بالکل آخری کوٹھی ہے۔"

"فون نمبر..." میں نے پوچھا اور منظر چوہدری نے ایک
انک کر بندے بولے۔

"کیا تم کھڑے ہو سکتے ہو چوہدری؟"
"شاید نہیں، اس نے جواب دیا، شاید میری پنڈلی کی تڑپی
ٹوٹ چکی ہے۔"

"ہازو اوپر کرو چوہدری! میں نے ہاتھ بڑھائے، اس نے یہی
سمجھا ہو گا اسے سہارا دیا جانے والا ہے، اس نے دونوں ہاتھ اوپر
اٹھائے، میں نے کلائیوں پر گرفت مضبوط کی اور دایاں پاؤں اس
کی چھلتی پر رکھ کر زوددار چھکوا دیا۔ منظر چوہدری کسی اونٹ کی مانند
ٹھوکر کر خاموش ہو گیا تھا، اس کے دونوں بازو کندھے کے چوڑے
لا تعلق ہو چکے تھے پھر میں نے اس کی سالم ٹانگ اوپر اٹھائی اور
گھٹنے کے جوڑ پر پاؤں کی ضرب ماری، صرف تڑپی ٹوٹنے کی آواز
ابھری تھی منظر چوہدری کی آواز اندھیروں میں ڈوبی ہوئی تھی...
منظر چوہدری تو خواہ خواہ بھائی کے رشتے اور اپنی چوہدری رابٹ کے
حوالے سے میری راہ میں چلا آیا تھا، میں تو فاروق کا دشمن تھا میرا مجرم
صرف فاروق تھا جس نے میری عزت ہی داغ دار نہ کی تھی بلکہ
سوئی کا سکون، حسن اور سربراہ قتل کر دیا تھا میں نے چوہدری منظر
سے جو وعدہ کیا تھا اسے ایفا کر دیا تھا، اسے صرف بتایا تھا کہ
زینت کا محافظ کون ہے۔

"بھائی جان!" کلثوم نے کھڑکی سے جھانک کر آواز دی۔ یہ
آواز کیسی تھی! آپ بولتے کیوں نہیں ہیں بھائی جان! کلثوم کے
سوال کا جواب اگر میں کسی بھی آواز میں دیتا تو وہ مطمئن نہیں ہو سکتی
تھی۔ وہ دوسری منزل پر تھی اگر جواب نہ پا کر وہ خود پچا دیتی تو کھانڈ
جاگ رہا تھا اور چوہدریوں کے گھر کی خانوں کا شور وہ لوگ

نظر انداز بھی نہ کر سکتے تھے، مجھے جو کچھ کرنا تھا، فوری عمل کی ضرورت لگتی تھی۔

میں نے فاروق کو گھیسٹ کر دھانسنے کی دہلیز سے نیچا نکالا اور پھر اُسے بائیں ہاتھ میں بھر لیا۔ کلثوم کھڑکی سے آدمی باہر آ کر ایک ہی سوال دہرائے جاری تھی۔ میں بیڑھیاں ملے کرتا ہوں، جو بھی کارڈ وریں داخل ہوا، کلثوم دوپٹہ لہرائی ہوئی باہر نکل آتی تھی۔ اسی میں اندھیرے میں تھا اور وہ بھی لائین کی روشنی سے باہر آ کر دیکھنے میں وقت ہی محسوس کر رہی ہوگی، میں تیزی سے آگے بڑھا اور کھلے دروازے سے آتی روشنی میں جو بھی اُس کی نگاہ میرے چہرے پر پڑی، اُس کے حلق میں چیخ گھٹ گئی تھی۔

”گھبراؤ نہیں کلثوم!“ میں نے نرم آواز میں پوچھا۔ ”اندھیرا اُس شراقی بچے کو تھوڑی سی سزا دی ہے۔ وہ گھگھکیا ہوتی اُسے پاؤں پیچھے ہٹتی اندر داخل ہوتی، اُس نے دروازہ بند کرنے کی کوشش کی تھی، جسے میں نے پاؤں پھینا کر ناکام بنادیا تھا۔ پاگل نہ ہو کلثوم! فاروق صرف بے ہوش ہے، اگر میں نقصان کے ارادے سے آیا ہوتا تو اسے اندر نہ لاتا۔“ میں نے اندر داخل ہو کر پاؤں سے دروازہ بند کر دیا اور فاروق کو فرش پر گرا دیا تھا۔

”خُرم!“ کلثوم فحش تر آواز میں بولی۔ ”خدا کی قسم میں خود نہیں گئی تھی۔ مجھے منظر بھائی نے مجبور کر دیا تھا۔ لیکن میں نے تمہیں وہ کچھ نہیں بتایا، جو بتانے مجھے بھیما گیا تھا۔ میں نے تمہیں ان کے منصوبے سے آگاہ کیا تھا۔ یہ لوگ واقعی آج رات تمہاری حویلی پر حملہ کرنے والے ہیں، منظر بھائی جائیں گے۔ فاروق بھائی اور منظر بھائی کی کسی بات پر بڑی زبرداریوں ٹول، ایسے ہیں، وہ زینت کو شہرے جاتے جب کہ فاروق اُسے اپنے گھر لانے کے حق میں تھا، اس نے اُن کا بائیکاٹ کر دیا تھا۔ اسے چھوڑو، تم فوراً حویلی چلے جاؤ خُرم، وہ بالکل تیار ہیں۔“

”شکر ہے کلثوم!“ میں نے فاروق کو جھک کر پاؤں سے پکڑ لیا۔ ”تم جانتی ہو کلثوم کہ میرا اصل دشمن اور میرے خاندان کا قاتل فاروق ہے۔ میں نے بہت دن پہلے تم سے وعدہ کیا تھا کہ فاروق کو قتل نہیں کروں گا، تم گواہ بننا نہیں اپنا وعدہ ایسا کر رہا ہوں، اسی وعدہ پونٹوں کا دائرہ مکمل ہی نہ کر پائی تھی کہ میرے دائرے کی چاروں انگلیاں خیرے کی انہوں کی طرح فاروق کی دونوں آنکھوں میں کھب گئی تھیں۔ آنکھیں فاروق کی چھیدی گئی تھیں مگر کب تک کلثوم نے ماری تھی۔“

”نہ... نہیں...“ چاقو کی کوڑا اسٹین کر کلثوم بلبلی ہوئی میرے قریب آئی۔ میں نے لالت کی ہلکی سی ضرب اُس کے پیٹ پر ماری۔ وہ کراہتی ہوئی دھری ہوئی آڑوں بیٹھتی چلی گئی۔ فاروق کلاواں ہاتھ

کند سے کے جوڑے انگ کرنے میں دو سیکنڈ صرف ہوئے تھے۔ میں نے کہا ہوا باز و ایک طرف پھال دیا اور چاقو کا پھل فاروق کے لباس سے صاف کر کے چاقو جیب میں رکھ لیا۔

میرا خیال تھا میرے جذبے کے پتے صحر کو دونوں جھانپوں کے خون سے سیراب کر دیا ہے مگر جب میں نے واپسی کا ارادہ کیا تو مجھے محسوس ہوا کہ صحر کی پیاس ابھی بجھی نہیں ہے۔ ہاتھوں کا ساتھ پاؤں نے بھی دیا تھا۔ کل ایک ہاتھ اور دھپاؤں مل کر پھر اُس گاؤں سے حویلی تک کا سفر کا منصوبہ بنا سکتے ہیں۔

”مجھے رتی چاہیے کلثوم خاتم!“ کلثوم نے ہاتھوں سے چہرہ آہستہ آہستہ نکالا اور پھر اُس کی آنکھیں خوف سے فاروق پر جم کر رہ گئی تھیں۔ وہ بیٹھے بیٹھے... اور روک کر اونٹنی ہو گئی۔

میں نے چاقو سے چارپائی کی رسی کاٹی، فاروق کی پینڈلی میں ایک سراباندہ کر دو سر کھڑکی کی سلاخ سے باندھ دیا یہ سفاکانہ طریقہ میں نے فی جوتے سیکھا تھا۔ اُس نے میرے سامنے اپنے ایک غذا رماحت کو سزا دی تھی۔ اُس نے بتایا تھا کہ سزایافتہ شخص تمام عمر نہ تو پاؤں کے بل چل سکتا ہے اور نہ ہی خود کو مرو دیکھولنے کا حق دار رہتا ہے۔ فاروق جیسے دندے اور بد معاش کے لیے اس سے کم کوئی سزا مجھے مطمئن نہیں کر سکتی تھی۔ تین جھنگولوں میں، میں نے مطلوبہ ہدف حاصل کر لیا تھا۔

جب میں فاروق کو ادھڑ اور توڑ کر باہر نکلا تو آدھا چاند مشرق افق پر میری کامیابی پر مسکرا رہا تھا۔ میں چاند کی روشن روشنی مسکراہٹ کی روشنی میں برساتی نالے میں اترتا چلا گیا تھا۔ گاؤں کے چند کتے بھونکتے ہوئے نالے تک چلے آئے تھے، جب میں اتر گیا تو کنارے رُک کر کوسنے کے انداز میں بین کرنے لگے تھے۔ میں جس مشن کی تکمیل کے لیے شہر سے گاؤں آیا تھا وہ مکمل ہو گیا تھا اگر غیرت نام کا کوئی ذرہ بھی اُن کے خون میں ہوتا وہ تاجیات میرے گاؤں کا رخ تو دور کنارا نام لینے کی بھی جرات نہ کر سکتے تھے، وہ کالا طوفان جو میرے خاندان کو ترو بالا کرنے کی تیاریاں مکمل کر چکا تھا، اُس کا رخ میں موڑ آیا تھا۔

میں صرف اپنی کارروائی کا رد عمل دیکھنے کے لیے کچھ وقت مزید حویلی میں موجود رہنا چاہتا تھا کیونکہ منظر چہرہ کی ایک نام علاقہ میں ایک تمام اور گاؤں میں پروردی رکھتا تھا۔ مجھے ایک سوچوں سا خطرہ تھا کہ شریعت لوگ میری کارروائی کو جواز بنا کر کوئی فتنہ نہ کھڑا کر دیں، میں حویلی کی خواتین کو تنہا نہیں چھوڑ سکتا تھا۔ ہمارے ہاں انتقامی جذبے نسل در نسل سفر کرتے رہتے ہیں، میں بھی تو اُسی جذبے کا مسافر تھا اگر میں اپنی بے عزتی اور نقصان کا انتقام لے سکتا تھا تو منظر جو بددی کی برادری بھی اس رسم کو نبھانے میرے گاؤں پر دھاوا بول سکتی

تھی، میں اپنی کارروائی کی سزا گاؤں کو نہیں دے سکتا تھا، جو آگ میرے لیے بھڑکی، جسے میں نے خون کے چھپر کاٹے بھایا تھا وہ اگر پھر بھڑک اٹھتی تو مجھے ہی اُس بھڑکتی آگ کا راستہ روکنا تھا۔

دوسرا دن چڑھا تو میں سماعت کی تمام تر حیات بڑے دھڑکنے پر مرکوز کر کے بظاہر ادھر ادھر گھومتا رہتا تھا لیکن میرا دھیان حویلی سے باہر بے قراری سے ٹپ رہتا تھا۔ زینت سے میں نے آدھا جھوٹ بولا تھا اور بتایا تھا کہ وہ مجھے دیکھ کر گاؤں سے فرار ہو گئے تھے۔

ٹھیک گیارہ بجے دروازہ کھڑکھڑاتا ہوا کھلا تو میں نے دوڑ کر کھڑکی سے جھانک کر دیکھا اور تیز تیز قدموں سے آگ بھڑکا۔ میرا دل متوقع خبر کے لیے توپے ہی تیار تھا۔ دلاور نے دُور سے ہی مسکرا کر ہاتھ لہرایا اور میری بے عمل کو جیسے قرار آ گیا۔

”میں ایک شکایت کرنے آیا ہوں خُرم!“ میرا ہاتھ اُس نے نظر انداز کر دیا تو میں نے ساری برادری اور معاشی کی تمام تر غیلاں پس پشت ڈال کر زنی دوستی اور نئے تعلق کی ٹوٹی ہوئی ڈوری جوڑی تھی مگر خُرم نے مجھے بڑا دکھ دیا ہے۔

”پھر زبان کو زحمت نہ دو بیارے!“ میں نے بھرائی آواز میں کہا۔ ”جو تانا تارو اور مارو۔“

”لیکن ایسا تم نے کیوں کیا ہے خُرم؟“ وہ مشکل لہجے میں بولا۔ ”کیا کبھی مجھے کسی میدان سے بھاگتے دیکھا تھا تم نے؟“

”کچھ بتاؤ بھی یار...“

”میں بتاؤں، تمہیں تو جیسے کچھ معلوم ہی نہیں۔“

”پریشان کر رہے ہو دلاور، بخدا مجھے اپنی حفاظت کا علم نہیں ہے۔“

”تم رات ادھر تنہا گئے تھے نا؟“

”ہاں تو میں نے حویل سانس لیتے ہوئے اعتراف کر لیا۔“ مجھے مجھے کی کوشش کرو دلاور، یقین کرو اگر ضرورت ہوتی تو میرا ہاتھ تمہاری ہاتھ ہی بڑھاتا مگر میں لوٹروں کے شکار میں تم جیسے درست کو تکلیف نہیں دینا چاہتا تھا۔“

”یہ کوئی جواز نہیں خُرم!“ دلاور بد دستور ناراض لہجے میں بولا۔ ”مگر تم نے جو کچھ کیا ہے، اس کے لیے تمہارے دشمن بھی انگشت بدندان ہیں۔“

”اور خبر کیا ہے دلاور؟“

”دونوں کو اسپتال پہنچا دیا گیا ہے وہ دلاور نے بتایا، وہ سب لوگ ایک ہی شخص کا نام لے رہے ہیں مگر حیرت ہے، دونوں بھائیوں کی زبان پر وہ نام نہیں آیا۔ کلثوم نے اُس نام کی تردید کرتے ہوئے بتایا ہے کہ کوئی ڈاکوؤں کا گروہ تھا۔“

”چلو ان کو اپنے بھرم کا تو خیال آیا!“ میں نے اطمینان کی سانس

لی۔ وہ خطرہ جو رات سے مسلسل میرے اندر گھنٹیاں بجا رہا تھا اُس گیا تھا تینوں بہن بھائیوں نے دانش مندی سے کام لے کر نئے دوزخ کو بھڑکنے سے بچا کر خود پر اور مجھ پر بڑا احسان کیا تھا۔

دلاور چائے پی کر جب اُٹھ گیا تو زینت دوڑتی ہوئی اندر داخل ہوئی میرا خیال تھا، وہ برتن لینے آئی ہوگی مگر وہ سیدھی میری جانب آئی تھی۔

”اوہ! خُرم! آج تم نے میری رُوح کو سرشار کر دیا ہے، میں سب کچھ کئی ہوں۔“

”میں نے اپنے اندر بھڑکتی آگ بھجائی ہے زنی! میں نے کسی پر کوئی احسان تو نہیں کیا، میں نے اُسے بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا، کیا ہماری برادری بھی میرا نام لے رہی ہے؟“

”ہاں خُرم!“ زینت چہک کر بولی۔ ”اور کون اتنا جیالا ہے ہماری برادری میں؟“

”لیکن تم اپنی زبان سے کبھی اعتراف نہ کرنا زینت، اس لیے کہ اُن لوگوں نے میرا نام نہیں لیا۔“

”ہاں! زینت بولی، یہی بات لوگوں کے لیے باعث حیرت ہے خُرم! آخر کیوں اُنہوں نے ایسا کیا ہے؟“

”اُن میں کوئی ایک عقل مند رہا ہوگا۔“

”یعنی نام چھپا کر اُنہوں نے خاموش پیغام دیا ہے کہ حساب دشمنان ہم خود چکا میں گے۔“

”شاید!“ میں نے زینت کے خیال کی تائید کرتے ہوئے کہا۔ ”لیکن فی الحال ہمارے لیے کوئی خطرہ نہیں، اس لیے میں شام گہری ہوتے ہی یہاں سے نکل جاؤں گا۔“

”کتے دفوں کے لیے؟“ زینت کی ساری خوشی کا فود ہو گئی تو تم... تم گھر والے کیوں نہیں آجاتے خُرم، تمہیں ملازمت کی ضرورت ہی کیا ہے؟“

”کاش میں ملازم ہوتا!“ میں نے پُرسوج انداز میں جواب دیا۔ ”میں ملازم نہیں ہوں زینت، اس طرح تم اس حویلی اور اماں بی کی ملازم نہیں ہو سکتی یہاں رہتے اور اماں بی کی خدمت کرنے پر مجبور ہو، اسی طرح میں بھی ایک بڑی حویلی اور اُس کے میکینوں کا خدمت گزار ہوں کیونکہ وہ حویلی محفوظ رہے گی تو یہ حویلی بھی قائم رہے گی۔“

”کیا تم کسی کے ذاتی...؟“

”نہیں زنی نہیں!“ اُس کی حیرتوں کو میں نے جواب دیا۔ ”میں اپنے پاک وطن اور قوم کا خادم ہوں، اس سے زیادہ تمہیں کچھ نہیں بتا سکتا۔ تم جاہل نہیں ہو، تمہیں جہاد کا ثواب اور تقاضے معلوم

ہوں گے جس طرح ایک جواب اپنی ذات کے مفادات سے بالاتر ہو کر جہاد کرتا ہے اسی طرح میں بھی جہاد کر رہا ہوں۔

زینت مطمئن ہوئی تھی یا نہیں لیکن اس نے زبان بند کر لی تھی۔ شام تک وہ صرف آنکھوں سے باتیں کرتی رہی تھی۔ اس کی بھوری آنکھوں کی زبان کا ماہر تھا مگر میرے پاس ان کے کسی بھی سوال کا جواب نہ تھا، بڑے مشکل سوال تھے۔

شام سات بجے میں خاموشی سے نکل گیا تھا، اماں بی نے غریب کی مانند سے فارغ ہو کر مجھے طلب کیا تھا اور عابدہ کے بارے میں پوچھا تھا چاہا کہ وہ دین اپنے بیٹے کے لیے رشتہ لایا تھا۔ لڑکا نیوی میں بیٹھا تھا، غیر تھا میرا دیکھا بھلا تھا لیکن قبول مجھے نہیں عابدہ کو کرنا تھا اور اس کی دل کی دھڑکنوں میں چلچلے کرم دیکھا بیٹا نہیں دھڑک رہا تھا، اس لیے میں نے عابدہ کی رضا مندی معلوم کرنے کا مشورہ دیا تھا۔

”جیپ اکرم سلطان زندہ تھا، اماں بی نے نرم نرم پھرانی آواز میں کہا تھا تو میرا ارادہ تھا عابدہ کو اس گھوڑی رکھوں گی مگر اب بات دہری ہے، زینت کا حق فائق ہے پھر وہ تو شاید ازل سے اس حیرت کے لیے تھی، دیرمان ایک آزمائش آگئی تھی وہ حق دار بھی ہے اور اپنی بھی عدت پوری ہو جائے تو میں اس فرض کو ادا کر دوں گی پھر تمہیں یہاں رہنا ہو گا کیونکہ زینت مجھ سے اور میں اس سے جدا نہیں ہو سکتی۔“

”اماں بی! میں نے سینے میں گھٹی ہوئی آواز دھکیں کر زبان پر لائی تو زینت میری بھالی ہے۔۔۔ میں اکرم بھائی!۔۔۔“

”ہاں بھالی تھی اماں بی نے شمشاد نگاہوں سے دیکھا مگر ان کی آواز میں دہری ٹھہراؤ اور دھار تھا، جو وقت کا کوئی طوفان ان سے نہ چھین سکا تھا یا کیا نہیں خیر شرعی اور انہونی بات کر سکتی ہوں میرے بچے، جب کسی بیٹی اور بہن کے سر سے قصائے الہی چادر سر کا دیتی ہے تو ننگے سر کو ڈھانپنا اس کی ذمہ داری ہوتی ہے زینت ہماری عزت ہے خرم سلطان اور ہم اپنی ذمہ داریاں نبھائیں گے یہ جہاد فرض ہے۔“

”بہتر اماں بی! میں نے گھٹی گھٹی آواز میں جواب دیا۔ لیکن فی الحال، اتنی جلدی نہیں میں مصروف ہوں۔ میرے پاس جوتی میں رہنے کا وقت نہیں ہے اور ابھی واپس کی راہ بھی نہیں، جب تک فرصت پاؤں گا تو مجھے بالآخر آپ کے قدموں میں ہی آنا ہے میں آؤں گا اماں بی مکمل یہ نہیں کہہ سکتا۔“

اس سے قبل کہ اماں بی حکم کا گڑا ماتیں اور میں اپنی ذات کی غلطی پر گڑا کھا کر آف ہی کر رہا تھا، اٹھا اور تیز قدم اٹھاتا باہر نکل گیا تھا۔ میں

انکار کرنے کا مجاز تھا نہ انکار کرنا چاہتا تھا، زینت مجھے روکنے نہیں کی تمام لوگوں سے عزیز تھی لیکن پہچاننا اور پھر ٹھنڈے لے لے کر بے سمت اور پاگل سا کر دیا تھا زینت عجز ہونے کے باوجود سوچوں کے افق بندھ جاتی ہوئی تھی، بالکل ایسے ہی جیسے بادلوں کی میل جیسے کے تیار ہے کا چہرہ دھندلا کر دیتی ہے، مگر تو احساس کی آنکھیں اسے تارہ بھی تسلیم کرتی ہیں، سوچ تو سارے دوشی کا احساس نہیں ہوتا، میں زینت کو سوچتا ہوا اپنی دے تک پہنچ گیا تھا لیکن فیصلے کی قدر پر مجھ سے جیسے روٹھ گئی تھی، کوئی فیصلہ نہ کر سکتا تھا، جب بھی فیصلہ لگتے تھے تو تحریر فیصلہ کا روپ دھار لیتی اور میں گھبرا کر ہاتھ پیچھے کر لیتا تھا۔

کڑاں چوک سے کسی کھڑی یہ بھی اتفاق ہی تھا کہ وہ چوکا جسے گزشتہ رات میں جبرائیل لیا تھا، سوز و گداز کے پھیلے گھر تھا لیکن اس نے مجھے پہچان نہیں تھا کیونکہ میں خرم سلطان کے اصل چہرے کے ساتھ واپس آیا تھا جب میں ہول کی لالی میں داخل ہوا تو ابھرے چونک کر دیکھا تھا اور میں نگاہوں کا سلام دیتا ہوا آگے بڑھ گیا تھا، شیدہ کا کمر لاک تھا بلکہ تینوں کمرے بند تھے، اکبر میریاں بیٹھا تھا، آگے آگے کھائی دیا میری نگاہوں میں تشویش بھرے سوالات تھے لیکن زبان تالو سے چپک گئی تھی۔

”سب لوگ یہاں سے چلے گئے ہیں جیف!“ اکبر نے میرا آواز توڑ دیا۔

”آپ کے لیے ہارون صاحب سر بہر پیغام چھوڑ گئے ہیں، اس نے نیلے رنگ کا فادہ میرے حوالے کر دیا۔“

اندر کا غڈی کتر صرف بلی فون فہر دور ج تھا۔

”اور کوئی نئی خبر...؟ میں نے چٹ مٹھی میں بند کرتے ہوئے پوچھا۔

”مہارے ہوئے کی نگرانی ہو رہی ہے جیف!“ اکبر نے تالو سے ہر دو گئے چہرے پر بل جاتے ہیں، مجھے یقین ہے اس وقت بھی وہ لوگ...“

لوگوں میں موجود ہوں گے۔“

”کیا ہارون نگرانی سے باخبر تھا؟“ میں نے پریشان بیٹھ کر پوچھا۔

”جی ہاں!“ اکبر نے اثبات میں گردن ہلائی، ”ہارون صاحب انہیں اپنے پیچھے نہیں لے گئے تھے، اس دوران میں مشر بنی لوگوں کے ساتھ نکل گئے، پھر ہارون صاحب نے واپس آکر کاؤنٹر سنبھال لیا اور مجھے باہر بھیج دیا تھا، ایک شخص میرے تعاقب میں گیا اور دوہرا ل میں جرم گیا، جب میں اسے ڈار ج دے کر واپس آیا تو ہارون صاحب جاچکے تھے اور نگرانی کرنے والا باقیہ روم میں بند مٹی چھال چھا کر گالیال بکس دیا تھا۔“

ہارون کی کارروائی اور شرارت پر میں سکڑنے لگا، وہ بیباکی باکمال شخص تھا میں نے کاؤنٹر پر جا کر ہارون کا فیرواں کیا، دوسری گھنٹی پر دھیرور اٹھانے کی آواز کے ساتھ کوئی بولا تھا، ہیلو... او... او... اسچ

شناخت پلے۔۔۔

”کے ایس۔۔۔ میں نے اپنے نام کے حروف سے کام چھنا چاہا تھا، کیونکہ دوسرے ذیادوں کو بھی پہلے حروف دیے گئے تھے۔“

”گڈ ٹائٹ سیر!“ وہ ایک دم منسوب ہو گیا، ”کرمانی حاضر ہے۔“

”کیا یہ لائن محفوظ ہے کرمانی؟“

”جی ہاں سر۔“

”میں ہوں سے بول رہا ہوں، یہاں کچھ دشمن آنکھیں مجھے دیکھ رہی ہیں، ہو سکتا ہے تعاقب کیا جائے، میں باہر نکل رہا ہوں، تم پتہ ڈراؤ چوک بس اسٹاپ پر میرا انتظار کرو گے، شاید تم پہچان سکو گے، میں نے پہلا چہرہ مانا دیا ہے، میں خود تم سے مل لیا گا، ہو سکتا ہے ان سے بھی پھارنے میں دیر ہو جائے، ناکامی بھی ہو سکتی ہے، ایسی صورت میں میں تم سے نہیں ملوں گا۔“

”نہیں سر!“ کرمانی بولا، ”بلکہ ایسی صورت میں مجھے اشارہ کر دیجیے گا، میں ان کو روک کر آپ کو نکلنے کا موقع دے سکتا ہوں۔“

”اوکے، میں نکل رہا ہوں۔“

میں نے ماضی کے آئینے میں دیکھ کر سوچا، اس ملک میں کون ایسا شخص آج بھی زندہ ہے، جس نے میرا اہل چہرہ قریب سے دیکھا ہو۔ ہندی میں تو ایسا آدمی یاد نہ آیا تھا، ہاں ملک نواز اور نوین کے آدمیوں نے مجھے قریب سے دیکھا تھا، ان میں سے یقیناً کھلوگ زندہ تھے، یہ سوچ مجھے اپنے اہل چہرے نے دی تھی کیونکہ مادام شہناز اور جانس نے خرم سلطان کے چہرے پر بابر خان کا چہرہ ہی دیکھا تھا۔ اگر شکاری ان لوگوں کے پیچھے ہونے تھے تو وہ بابر خان کی صورت لے کر آئے ہوں گے۔ میں نے کاؤنٹر سے ہٹ کر طائرانہ سی نگاہ ڈانٹنگ ہال پر ڈالی، پندرہ میں گا بک تھے، کچھ چلنے پنی رہے تھے اور کچھ نہیں لڑک رہے تھے۔ کونے میں ایک جوتا بیٹھا ہوا تھا، عورت کی پشت کاؤنٹر کی جانب تھی اور مرد پائپ ہونٹوں میں دبائے ماچس کی تیلیاں ضائع کر رہا تھا، میں نے کال کی بے مرث کی اور صر پڑا، میں دذدیمہ نگاہوں سے ہال میں بیٹھے لوگوں کو دیکھتا ہوا ابھی دین ڈور سے چند قدم دور تھا کہ وہ جوڑا اور ایک شخص تینوں تیزی سے اٹھ کھڑے ہوئے۔

میری سرکاری گاڑی پوری ج میں کھڑی تھی، میں ہٹا ہوا، بلکہ کھنڈے سے انداز میں پانچ دس بج کر پھاؤں سے اڑتا ہوا گاڑی کی جانب بڑھ رہا تھا، شیشے کا دروازہ بند ہونے کی آواز سن لی دی پھر ایک سرور خرابٹ میری سماعت سے مگرانی مجھے دکھانے کے لیے ڈراما شروع ہو چکا تھا۔

”راضیہ تم میرے ساتھ چلو گی۔“

”نہیں کمال خان!“ دوسرے کردار نے مکالمہ بولا، ”یہ میرے ساتھ آئی تھی اور میرے ساتھ ہی جائے گی۔“

”تم دونوں کان کھول کر سن لو، یہ میری بولی نہیں تم دونوں بد لغت بھیجی ہو، میں اس کی ملازم نہیں ہوں۔“

”ہوش کنائن کو محرم!“ آوازیں دندنائی تھی، میں زیادہ چپکے والی چڑیا کے پر نوج لیا کرتا ہوں، خاموشی سے میری گاڑی میں بیٹھ جاؤ۔“

”اگر میں انکار کر دوں تو کیا کرو گے؟“

”پہلے انکار کرو پھر دیکھ لینا میں کیا کر دوں گا۔“

”تو دفع ہو جاؤ، عاتقون نے چیخ کر کہا اور پھر وہ دوڑتی ہوئی مجھ سے مگرانی، پلیز مجھے ان غنڈوں سے بچائیے۔“

میں نے اسے ایک ہاتھ سے پرے ہٹایا اور گردن موڑ کر دیکھا، دونوں ایک دوسرے کے مقابل کھڑے ٹھہر رہے تھے، سرداروی میں گئی تھی کہانی میں جگہ جگہ محمول تھے، ورنہ ان کو عاتقون کو فاکو کر لینا چاہیے تھا۔ وہ مدد کے لیے جتنی اور نہیں، میری دھننے کے شوق میں پرانی آگ میں کود پڑتا اور دونوں میری ٹھکانی گئے ہوئے قیٹ لے جاتے۔

”بس باہر کی جگہ ڈراپ کر دیجیے گا، اس نے التجا میرے لیے میں کہا۔“

”کیٹ کی جانب پھلے، میں نے سرگوشیانہ آوازیں کہا، میں قریب سے گزرتے ہوئے فرنٹ ڈور کھول دوں گا، اس نے چونک کر ان کی طرف دیکھا کیونکہ کہانی میں یہ سین نہ رہا ہوگا۔

”میں اچھل کر سیٹ پر بیٹھا اور انجن اشارت کرتے ہی گاڑی کو دیں سے ٹرن میں ڈال دیا تھا، بیٹھے، ورنہ میں جا رہا ہوں تو میں نے فرنٹ سیٹ کا دروازہ دھڑکے کھول دیا اور وہ لو کھلے ہوئے انداز میں بیٹھ گئی۔

تب ہی ان احمقوں کو اپنی حماقت کا احساس ہوا تھا، وہ دونوں ہاتھ اٹھاتے ہوئے دوڑے، میں نے جب سے ڈارٹ پستول نکال کر ایک ایک ڈارٹ دونوں کی طرف روانہ کر دیا، ایک دوڑتا ہوا گاڑی سے مگر آیا تھا اور دوسرا منہ کھولے پہلے کھڑا ہوا پھر مجھ سے میں گرنا چلا گیا، جب میں نے گاڑی آگے بڑھائی تو دوسرا بھی کئی ہونی شاخ کی مانند ترچھا بیٹ گیا تھا۔

”تم... مجھے...“ عورت نے دوازے پر ہاتھ ملا کر آواز دوڑا۔

”خاموشی سے بیٹھی رہو، میں نے سر آواز میں کہا، ”وہ نہ...“

پستول دیکھ کر وہ ہانپ سی گئی تھی۔

”نن... نہیں... مجھے آواز دو... میں تمہارے ساتھ نہیں جاؤں گی۔“

”ہمارے غریب میں مال غنیمت جائز ہوتا ہے محرم!“ میں نے

جنگ بھیجی کہہ "اگر آپ نے مجھے اس حق سے محروم کرنے کی کوشش کی تو میں اپنا حق بچانے کے لیے ناخوشوار کارروائی بھی کر سکتا ہوں۔" اس نے طویل سانس لی اور پھر مائل بہ تعاون دکھائی دینے لگی۔ اس کی اچانک خاموشی مجھے کھٹکائی تھی۔ طوفان سے قبل کی خاموشی سے دانا اور محتاط لوگ طوفان سے بچنے کی تدابیر کر لیا کرتے ہیں۔ میں نے بھی اس خاموشی سے فائدہ اٹھانے کا فیصلہ کرتے ہوئے ایک ڈارٹ اس کے پہلو میں پیوست کر دیا تھا۔ وہ سیٹ پر اچھلی اور پھر ساکت ہو گئی تھی۔

میں نے گاڑی کی رفتار مناسب ہی رکھی تھی تاکہ بے ہوش خاتون سیٹ پر سوئی دکھائی دے، جب بھی وہ بے توازن ہونے لگتی تھی اسے سنبھال کر ٹھادیتا تھا۔ یہی وجہ رہی تھی کہ میں نے پندرہ منٹ کا فاصلہ پون گھنٹے میں طے کیا تھا کہ مانی لب سرک کھلی جگہ گھڑا تھا کہ اس کے قریب گاڑی روک دی، وہ دو قدم پیچھے ہٹ گیا تھا۔

"امد آجائے کرمانی!" میری شکل تو بدل گئی تھی لیکن آواز تو وہی تھی۔ کرمانی نے پہلے ہنسی کر دیکھا پھر پچھلی سیٹ کا دروازہ کھول کر اندر آگیا۔ یہ خوبصورت ڈھونگی لکھے پرگٹھی ہے، ورنہ آپ کو بلانے کا مقصد دوسرا تھا، اب ہم زبرد ہاؤس جائیں گے۔"

"بہتر ہوگا سر،" کرمانی مقدمات بھر میں بولا۔ اس ڈھونگی کو پچھلی سیٹ پر لٹکے ہیں، زبرد پوائنٹ پر چینگ ہو رہی ہے۔"

"اٹھائیں یہ۔" میں نے جواب دیا کہ کرمانی نے خاتون کو اٹھا کر پیچھے ڈال دیا۔ میں بھی جلد بیک لگا کر سیٹ پر چلا گیا کہ پیچھے چلا گیا تھا۔ دروازہ کھول کر سیٹ آپ سنبھال میں کرمانی نے کوئی گفت بات بے غیر احتیاطی سنبھال لیا تھا۔

"پرگرام کیا تھا سر؟"

"ہارون نے آپ کو کچھ بتایا نہیں؟ میں نے جواب کی بجائے سوال کیا۔

"جی بتایا تھا،" کرمانی بولا۔ "آج انہوں نے مجھے ساتھیوں کو ریڈنگ کی تھی۔ اس میں مرکزی مقصد کے علاوہ بتایا تھا کہ مایا کا ایک رکن ان لوگوں یہاں ہے۔"

"اس کے خفیہ ٹھکانے کا سراغ ملا ہے، میں دیکھنا چاہتا تھا وہ ہے یا نہیں؟"

"ابھی تو رات بہت باقی ہے سر،" کرمانی نے گھڑی دیکھ کر کہا۔ "ہم خاتون کو ڈراپ کر کے واپس آ سکتے ہیں۔"

"ہارون کہاں ہے؟"

"وہ بھی دو لوگوں کے ساتھ اس سلسلے کی کڑیاں تلاش کر رہے ہیں شاید۔"

زبرد ہاؤس کے گیٹ پر کوئی نگہبان نہ تھا کہ مانی نے آکر پائے کو تھپ تھپایا تو لوہے کا گیٹ بے آواز کھلتا چلا گیا تھا گاڑی اندر گئی تو میں یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ مانی نے مختصر وقت میں زبرد ہاؤس کا بیرونی حصہ آئینہ بنا دیا تھا۔

"سر،" وہ پورے عین کاررواک کر بولا۔ "اگر خاتون یہاں ہیں تو ان کے لیے۔۔۔"

"نہیں کرمانی، میں نے اس کی بات قطع کرتے ہوئے بتایا ہے میری اسی سلسلے ایک سہری کوئی ہے۔"

"پھر اسے ساؤنڈ پروف انٹرکشن روم میں رکھنا پڑے گا، اس نے خاتون کو اٹھا کر کونڈول پر لا دیا اور میں اس کے پیچھے چلتا ہوا ایک کمرے کے سامنے رکا۔

کرمانی نے دبیز سے ایک فٹ ڈور پر کورسید ٹائل پر دائیں پاؤں کا دباؤ ڈالا۔ دروازہ مختصر ماں کی بانہوں کی طرح کھل گیا تھا۔ مجھے وہ خود کار نظام اچھا نہ لگا تھا اگر سب دروازوں کی یہی حالت تھی تو کوئی بھی بوقت ضرورت اندر داخل ہو سکتا تھا لیکن زبرد ہاؤس میں پہلا دروازہ تھا اور کرمانی بھی نیا تھا اس لیے میں نے اپنے اعتراض کو کسی دوسرے وقت کے لیے محفوظ کر لیا تھا۔ ہم اندر داخل ہوئے تو دروازہ خود ہی بند ہوا تھا کہ مانی نے ایک سیٹ پر عورت کو ٹا کر میری جانب سوا لیا۔ نگاہوں سے دیکھا۔

"میں پہلے شریک اور ان کی بیویوں سے ملنا چاہتا ہوں تو ان کے کمرے کا گزرتے دیتے ہوئے کہا کہ کمرے میں ایذا رسانی کے جدید قواعد ہم انٹرومٹ ریکوں میں سے ہوتے تھے۔"

"کیا واقعی، وہ مشرکین کی بیٹیاں ہیں سر،" کرمانی نے تخرنہ ہے میں پوچھا۔

"ہاں وہیں نے ایک عجیب ساخت کی پیالی اٹھاتے ہوئے جواب دیا۔ اس طرح ہم بھائی ہیں وکرمانی کی روخت آنکھوں میں اپنا نیت اور احترام کی روشنی کچھ ادھی تیز ہو گئی تھی اور اس کا چہرہ اس روشنی سے دمک اٹھا تھا۔

ریشیدہ امینہ اور دیگر نئے نو زبرد ہاؤس میں مگر بالکل الگ ٹولگ بھی تھے۔ زبرد ہاؤس کو جس ذہن نے سوچا تھا اس نے چھوٹی چھوٹی چیزات پر نظر بھی تھی صرف ایک دیوار سرکے ہی وہ پورے زبرد ہاؤس کے اندر آجاتا تھا۔ دیوار خود کار نظام سے سرکے تھی جب کرمانی اسی دیوار سے راستہ سے کرمانہ داخل ہوا تو میں نے خود کو ایک سجے ہوئے ڈرائنگ روم میں پایا تھا۔ جدید فرنیچر اور وال ٹو وال دیگر خاتون اور دیگر ضروریات کی چیزیں قریب سے بھائی گئی تھیں۔

"شاید وہ لوگ ٹی وی لاؤنج میں ہوں گے وکرمانی نے بتایا۔"

میں بھی دروازہ کھول کر اندر داخل ہو گیا۔ گمان قارئین کی وجہ سے میرے پاؤں کی چاپ منقود تھی۔ کچھ وہ تینوں انگریزی فلم کی گھن گرج میں محو تھے۔ میں ریشیدہ کے عقب میں رکا اور پھر پچھن خود کر آیا۔ میں نے ہنسی کر اس کی آنکھوں پر ہاتھ رکھ دیے اس کا بدن یکساں پھرک کر بند ہو گیا تھا۔ بیگن ہنس پڑا۔

"بتاؤ بیٹے کون ہے؟" بیگن نے ہنستے ہوئے پوچھا۔ ریشیدہ نے خیرے باتوں کی پشت پر ہاتھ پھیرا اور پھر اپنا ہاتھ سونگھ کر اس نے دونوں ہاتھوں اٹھا کر میرے ہاتھ مضبوطی سے تھام لیے۔

"خوش ہو میرے بھائی کی سہ شاس نے چمک کر بتایا میں نے چہرہ اس کے بالوں پر براہ منگی رکھ دیا تھا۔

"میرے لیے بھی خوش ہو رہے تھے باجی!" امینہ اٹھتے ہوئے بولی۔ "دولت نے مجھے اپنے درمیان ہی بٹھالیا تھا، اس لیے بیگن کو اٹھ کر سامنے ملے صوفے پر بیٹھنا پڑا تھا۔ فلم تو چل رہی تھی لیکن ہم چاندل صرف ایک دوسرے کے چہرے اور آنکھوں کو دیکھنے لگے تھے کہ ان ہی چہروں اور آنکھوں میں زندگی کی پختی جھٹوں کی سلاسا سلاسا آواز نہ تصور کی تھی۔

میں نے ٹینکی خیر حاضری کو ریشیدہ سے منسوب کرتے ہوئے امینہ کو تسلی دی ہوئی تھی۔ جبکہ ریشیدہ اس کے سامنے تھی اور ٹینک پھر بھی خیر حاضری تو میں امینہ کی آنکھوں میں براہ راست دیکھنے سے گھبرا رہا تھا کہ نہ جانے کب وہ سوال کر دے گی۔۔۔ لیکن اس نے کوئی سوال نہ کیا تھا۔

"ہماری بیٹی!" بیگن تجت پاش نگاہوں سے امینہ کو دیکھ کر بولا۔

"بہت صابر اور بہادر ہے،" اس نے کہا۔ "اسے اہل صورت حال سے آگاہ کر دیا ہے، لہذا ہم امینہ کی موجودگی میں ٹینک کا نام لے سکتے ہیں اور آپ سے کسی سوال کرنا ہوں شرم سلطان! اب تک آپ نے ٹینک کی بازیابی کے لیے کیا کچھ کیا ہے اور جو وہ پوزیشن کیل ہے؟"

میں نے انہیں تفصیل کے ساتھ مداوم شہتازی دھوکا بازی جانی سے مقابلے کے واقعات بتائے۔ امینہ ہتھی پر ٹھوڑی رکھ بڑے جمل سے رو داؤسٹی رہی تھی۔

"اب ہم پہلے اکی نائن کا ایک ٹھکانہ دیکھیں گے، میں نے بات کو آگے بڑھاتے ہوئے بتایا۔ "اگر ٹینک یہاں نہ ہو تو میں اپنی پارٹی کو دو قسم کر دل گا، ایک ٹینک کو تلاش کرے گی اور دوسری اصل مشن پر اہم کرتی رہے گی۔"

"مجھے صرف یہ یقین ملا ہے کہ بھائی جان!" امینہ نے آنسوؤں میں لرگی ہوئی آواز میں کہا۔ "میری باجی یہاں بھی ہیں زندہ ہیں۔"

"گل بات تک زندہ و سلامت تھی میں نے نگاہیں اٹھتے بغیر

جواب دیا۔ "دوسری بات یہ ہے کہ وہ اسے زندہ دیکھ کر ہی اپنی شرائط میں ذلک ڈال سکتے ہیں۔"

"ان کی شرائط کیا ہیں؟" امینہ جب کھلی تو توتی جی گئی۔ "اگر میں تقاضا دولت ہے تو میرے اوتارے کنگال نہ تھے، میں چاہوں گی آخری پیسہ دے کر باجی کو رہا کر دیا جائے، ہم۔۔۔ ہم۔۔۔ منطقی دیواریں دروازے ہونے لگی تھیں، اس نے بہت دیر خود کو بیٹھے رکھا ہوگا، آخر وہ ایک قیم اور تازہ کی گئی جیسی لڑکی ہی تو تھی، کب تک تے بڑے غم کو سہل سکتی تھی۔"

"نہیں جان لاؤر!" میں نے اس کے بالوں پر ہاتھ پھرتے ہوئے کہا۔ "اگر ان کا مطالبہ دولت ہو تو کنگال ہم بھی نہیں ہیں، ہم ٹینک کو دولت سے دس بار تول کر حاصل کر لیتے لیکن وہ ٹینک کے بدلے تحرم سلطان کا مطالبہ کر رہے ہیں اگر میں صرف اپنی ماں کا بیٹا تحرم سلطان ہوتا، ایک عام شہری ہوتا تو خدا کی قسم میں اپنا سران کی ہتھی پر رکھ کر ٹینک تھیں دو لواتا مگر میری کھالسی مجبوریاں ہیں کہ اگر میں نے خود کو ان کے حوالے کر دیا تو نہ جانے کتنی مصوم زندگیاں تباہ ہو جائیں گی۔"

"اگر ان کا یہی مطالبہ ہے تو میں باجی کی موت پر بھی صبر کر لوں گی۔" امینہ میرے شانے سے لگ کر سسکا لے لے لگی تھیں بہن کے بغیر صرف دھکی رہوں گی تحرم آپ کے بعد آپ جیسے بھائی کے سہارے کے بغیر میں خود کو محفوظ نہیں سمجھ سکتی۔"

ماحول بے حد سوگوار اور غم ہو گیا تھا ہر شخص کی آنکھیں نمناک اور چہرہ دکھ کے دھوئیں سے سلا ہو گیا تھا۔ بیگن نے اٹھ کر ٹی وی کا چین آف کر دیا۔

"تمہارا بھائی بھوکا ہوگا بچہ لوگ،" بیگن بولا۔ "میں نے تمہاری بھاری کاسٹریکٹ دیا تھا بیٹی، کیا اپنے اکل کو شرمندہ کر دی؟"

"نہیں اکل!" امینہ ہتھیوں سے چہرہ صاف کرتی ہوئی کہہ رہی ہو گئی۔ "آپ تمہیں میں کھانا لاتی ہوں۔"

"تمہاری طبیعت کبھی ہے ریشیدہ جان؟" میں نے امینہ کے جاتے ہی پوچھا۔

"طبیعت کو کبھی کبھی مگر زخم خراب ہے۔"

"ماشر!" میں نے افسرانہ لہجے میں کہا۔ "بھل آپ ریشیدہ کو ڈاکٹر دولی کے لٹلے جائیں گے، اسے اوپر سے آرڈر وصول ہو چکے ہوں گے وہ ہمارا منظور شدہ ڈاکٹر ہوگا۔"

"بہتر چیف!" بیگن نے میرے بچے کو محسوس کرتے ہوئے مودب جواب دیا۔ "آپ جس کام کے لیے گئے تھے کیا کچھ کر آئے ہیں؟"

"سب ٹھیک ہو گیا ہے ماشر، میں نے مختصر سا جواب دیا۔ چند

ماہ شاید کوئی خطرہ سر نہیں اٹھائے گا، دونوں بھائی کسی اسپتال میں زیر علاج ہیں، ایک کو آنکھوں اور دوسرے کو ٹانگوں سے محروم کر دیا گیا ہے، بیگن نے اثبات میں گردن ہلائی اور ہار نکل گیا۔

کھانے سے فارغ ہو کر بیگن نے بیگن کے بتائے ہوئے طریقے پر کال میں بھائی ایک بوڑھا نہ جانے کدھر سے بونگ کے جن کی طرح حاضر ہو گیا تھا۔ بیگن کی جانب استہیام نہ لگا ہوں سے دیکھا۔

”مگر کمانی جواب دیں گے چیٹ“ بیگن بولا بوڑھے میاں ہمیں ضرورت کے لیے دیے گئے ہیں، ساتھ دالے کمرے میں اونگھے رہتے ہیں۔

”چاچا جی آپ کا تعلق کس علاقے سے ہے؟“ بیگن نے بوڑھے سے پوچھا۔

”مری سے جناب“ بوڑھا سر جھکا کر بولا ”ہال بیٹے کے گھرانے کا پرانا ملک خوار ہوں۔“

”ہال کو میرا سلام بولیں“

”بہتر جناب!“ وہ وقت دم اٹھٹے ہٹا اور پھر گھوم کر غائب ہو گیا۔

امینہ برتن ٹرے میں رکھے جنہی دروازے سے نکلے گی، ٹرے اس کے ہاتھوں سے گرنی اور برتن بکھر گئے تھے۔ قاتلین کی وجہ سے آواز اور نقصان نہیں ہوا تھا پہلے تو وجہ سمجھ میں نہیں آئی مگر جب کمانی ”اوہ سوری“ کہتا ہوا نیچے بیٹھ کر برتن چھنے لگا تو بات سمجھ آئی تھی۔ امینہ اپنی بھائی فطرت کے تحت تیزی سے باہر جا رہی تھی، ادھر سے کمانی اندر آ رہا تھا، دونوں مگر لگتے تھے یا اسے اپنا ملک سامنے دیکھ کر وہ نروس ہو گئی ہوگی۔

”رہنے دیجیے کمانی“ بیگن نے کہا ”بے بی خود اپنا کام کرے گی۔“

کمانی ایک دم ہی اٹھ کھڑا ہوا اور امینہ بیٹھ کر ایک چیز ٹرے میں رکھنے لگی۔

کمانی کے چہرے پر پریشانی تھی نہ خجالت، اوہ نے تپے قدم اٹھاتا ہوا بیگن کے ساتھ بیٹھ گیا۔

”ایک بات مجھے پریشان کر رہی ہے۔“ وہ رشیدہ پر پڑتی سی نگاہ ڈال کر بولا ”یہ الجھن دور ہو جانی ضروری ہے کہ ہم ایک خاندان کے افراد ہیں، میں خاتون محترمہ کا صورت آشنا ہوں، کیا آپ کا تعلق کسی سینما خانے سے تھا؟“

”خیرم“ رشیدہ نے بوڑھے ٹھہرے بیگن میں کہا تو کیا میں کمانی بھائی کو جواب دوں؟“

”ہاں تھا“ بیگن نے کمانی کو بتایا ”مگر وہ رشیدہ ایک تہ خانے میں دفن ہے، یہ رشیدہ اب ایک معزز باپ کی بیٹی اور خرم سلطان

کی بہن ہے کیا اب بھی کوئی الجھن باقی ہے؟“

کمانی نفی میں سر ہلاتے ہوئے اٹھا اور تن کر رشیدہ کو فوجی انداز میں سیلوٹ جاتیں اپنی عظیم بہن کو سلام کرتا ہوں۔

”شکریہ کمانی بھائی“ رشیدہ مسکراتے ہوئے دعا کیجیے، میں آپ بھائیوں کا سر کبھی جھکنے نہ دوں۔“

”کافی یا چائے؟“ امینہ نے انداز کر پوچھا کمانی نے بھر پور نگاہوں سے امینہ کے سراپا کو دیکھا۔ مجھے اس کی بیانی پسند نہ آئی۔

”تم لوگ اپنی پسند کی شے پی لینا“ بیگن اٹھ کھڑا ہوا ”میں اور کمانی جا رہے ہیں۔“

گھومتی کارڈیو سے گزرتے ہم فرنیچر کی جانب گئے تمام دروازے بند تھے، میں ایک ایک کمرے کا معائنہ کرنا چاہتا تھا مگر وہ وقت بچانے کے لیے سوزوں نہ تھا کمانی میرے پہلو میں قدم لائے مل رہا تھا اس کے ساتھ چلتے ہوئے مجھے ذات کا تو نہیں البتہ جسم کا قدم محسوس ہوا تھا۔ وہ مجھے بدن کا قد اور وجہ نوجوان تھا۔

”ہارون کے ساتھ کچھ لوگ تھے؟“ میں نے پتے چلتے پوچھا۔

”جی ہاں وہ اب ہمارے یہاں ہیں، کمانی نے بتایا، کیا ملاقات کریں گے؟“

”نی الحال تو اس خاتون سے ملوں گا“ میں نے جواب دیا کیونکہ ان لوگوں کا تعلق کراچی سے تھا اور کراچی کا فاصلہ آئی ٹائن سے زیادہ تھا۔

کمانی نے خود کار دروازہ کھولا اور ایک طرف ہٹ کر مجھے اندر جانے کا راستہ دیا میں اندر داخل ہوا، وہ اچھل کر اٹھی اور پھر دو قدم دوڑ کر روک گئی۔

”کیا میں تمہاری قید میں ہوں؟“ اس نے دیکھی آواز میں پوچھا۔

”کیا جیل کی کوٹھریاں اتنی شاندار ہوتی ہیں؟“ میں نے مسکرا کر جواب دیا۔

”مجھے چھوڑ دو خرم سلطان درنہ...!“

”ورنہ تمہاری بددعا سے راکھ ہو جاؤں گا؟“ میں نے کھوکھلا قبضہ لگایا مگر میں مانی جی میں بددعا پر وقف ہوں البتہ اگر تم نے قتل سے کام نہ لیا تو میری چھوٹوں سے تمہاری نرم نرم ہڈیاں سرسبز ضرور بن جائیں گی۔“

”میں نے انہیں بتایا تھا کہ خرم سلطان انسان نہیں کوئی بددعا ہے، مجھے بیچان لے گا وہ غصیلی آواز میں بولی ”کیا تم نے مجھے ہل میں ہی بیچان لیا تھا؟“

”ہاں“ میں نے آنکھوں کو اثبات میں نہچایا ”وہ سلام کوئی ٹھٹھنے والی شے ہوئیں نے یہ بات پوچھی تھی پھر ذہن کا کوئی گوشہ

ابا کبھی روشن ہو گیا اور لا شعور کی پیٹ پر پراپنی ڈیر کی میکر ٹری اُبھرائی جسے میں نے اس رات قید سے رہائی دلائی تھی، جب میں نوین کے تعاقب میں پراپنی ڈیر کے گھر چوروں کی طرح داخل ہوا تھا تو کیا تم اس احسان کا صلہ دینے آئی ہو؟“

”تمہارا کیا خیال ہے؟“ میں اپنی مرضی سے آئی ہوں؟“ وہ زہر خند سے بولی ”نہیں خرم سلطان، جس طرح اس رات مجھے مجبور کر کے قید کر دیا گیا تھا، بالکل اسی طرح یہاں لائی گئی ہوں کہ صرف میں ہی تمہاری مورت آشنا تھی، یہ میری غلطی تھی کہ میں نے مادام شہناز کے پیچھے سے تھلا کر لڑکھائی تھا پھر ایک رات کچھ لوگوں نے مجھے اٹھایا اور آنکھوں کا سلاخ لگا کر لے گئے تھے۔“

”اگر اب تمہاری آنکھ لگ گئی تو روزِ عشر سے قبل نہ کھل سکے گی۔“ میں نے کرسی گھسیٹ کر اسے بیٹھنے کا اشارہ کیا ”زیادہ مشکل سوال نہیں کروں گا مجھے اُمید ہے تم قتل سے کام نہ کرے گی، جواب دو؟“

”پہلے میرے ایک سوال کا جواب دو خرم سلطان“ رشیدہ دوستانہ لہجے میں بولی ”کیا ملک نواز زندہ ہے؟“

”شاید نہیں“ میں نے گول مول جواب دیا ”لیکن یہ یقینی بات ہے کہ وہ ملک میں نہیں ہے۔“

”اور میرا اس کے ہاتھوں قتل ہوئی ہے؟“

”اپنے ہاتھوں“ میرا مطلب ہے اسے مادام شہناز نے قتل کر دیا ہے۔“

”اب تم پوچھو کیا پوچھنا چاہتے ہو؟“

”مادام شہناز کہاں ہے؟“

”یقین کر لو گے خرم؟“ وہ ملتی سے انداز میں بولی ”مجھے اس تک آنکھوں پر پٹی باندھ کر پہنچایا گیا تھا لیکن میں نے اندازہ لگایا تھا، وہ کسی پرائیویٹ کھلینگ کا کمر تھا، ریڈ، کیمبل اور دواؤں کی بوتلیں میں نے اندازہ لگایا تھا۔“

”اوہ! کیا وہ بیمار ہے؟“

”نہیں“ وہ مسکراتے ہوئے ”شیطان اور اس کے چیلے کبھی بیمار نہیں ہوتے، ہاں ایک بوڑھی شاید اس کی کوئی عزیزہ یا ملازمہ ہے، وہ اسی کمرے میں بیمار ہے، اسے گلو کوڈ کا ڈب لگا ہوا تھا، میں نے شکل کام خود کو اچھٹے سے باز رکھا تھا۔“

”کیا اس کی ٹھونڈی پریک کا نشان تھا؟“

”سوری“ اس کا چہرہ ناک تک کیمبل میں تھا اور وہ بے ہوش تھی۔“

”تمہیں عمل وقوع کا کچھ انداز ہے؟“ میں نے بے غمرازی سے پوچھا۔

”کینٹ ایریا ہوتا ہے کیونکہ دس منٹ کا سفر تھا۔“

”شکریہ میں!“ مجھے اس کا نام یاد نہیں رہا تھا، ایک نام اور

سے جانس کبھی سنا تم نے۔۔۔“

”نہیں“ اس نے نفی میں سر ہلایا ”مجھے ملاوٹ نہ صرف تمہاری شناخت کا حکم دیا تھا۔“

”اب تم بتاؤ میرے ساتھ رہنا پسند کرو گی، یاد میں جانا چاہو گی؟“

”میری ماں پریشان ہو گی، اس نے بتایا ہوں اگر تم مجھے پتاہ دے سکو اور میری حفاظت کی ضمانت دو تو میں انی جان کو بہت آ کر واپس آ سکتی ہوں۔“

”ٹھیک ہے، تمہیں صبح دس دس روانہ کر دیا جائے گا، میں نے اُٹھتے ہوئے کہا ”دوست! یہاں کے لیے کھانے کا انتظام کرو۔“

کمانی نے اثبات میں گردن ہلا کر مجھ کا دی تھی۔

”ایک بات!“ وہ بولی اور میں گردن موڑ کر روک گیا ”میں نے کھڑکی سے مسجد کے مینار دیکھے تھے دو منٹ میں، ان میں سے ایک پردہ رنگ روشن کیا جا رہا ہے، جب کہ دوسرا ابھی سلاہ ہے اور ایک مینار آدھا ہے، مکمل مینار پر چار لاؤڈ سپیکر چاروں سمتوں میں گونے ہوئے ہیں، ”شکریہ“ شاید کچھ مدد مل جائے، میں دروازے کے قریب گیا تو دروازہ خود بخود کھل گیا۔ چونکہ رات کا پہلا پہر بھی بیت گیا تھا، اس لیے میں نے سب کچھ جھٹک کر برآمدے میں رکھ دیا اور کمانی کی رہنمائی میں بیڈ روم میں پہنچ گیا، کمرے میں دو بیڈ تھے اور ساتھی میری پسند اور صوابدید پر چھوڑا گیا تھا، میں کوئی فیصلہ نہیں کرنا چاہتا تھا مجھے کم کا ہر کھلاڑی عزیز تھا، میں دروازہ کھلا چھوڑ کر لیٹ گیا تھا کہ جسے ضرورت محسوس ہوگی، وہی میرا کمر استعمال کرے گا۔

آنکھ اذان کی وجہ انگریز آواز پر کھٹی تھی۔ آواز ایک چھوٹے سے اسپیکر سے ابھر رہی تھی جو دیوار میں نصب تھا، کیمبل ہٹاتا ہوا میرا ساتھی اٹھا، وہ ہارون تھا۔

”استقام علیکم برادر!“ میں نے سلام میں ہیل کی۔

کمانی نے مشرقی روایات کا خیال رکھا تھا ناشتے کی میز پر ہارون کمانی، سجاد اور نعم تھے۔ بوکیوں کی وجہ سے بیگن کے لیے الگ کچن لاور ڈرائنگ روم رکھا گیا تھا، ناشتا توڑے ملازمہ نے ہی لگایا تھا، شاید اسے کمانی نے تمام خدمات کے لیے بھلیا تھا۔ ناشتے سے فارغ ہوتے ہی میں نے دروازہ بند کر دیا، سجاد نے ہماری اجازت کے ساتھ سگریٹ سلگا کر کرسی ذرا دُور کھینچی۔

”دوستو!“ میں نے باری باری سجاد اور نعم کی جانب خندہ پیشانی سے دیکھا ”کیا آپ اپنی فستے داریوں سے فارغ ہو کر آئے ہیں؟“

”یس سر!“ نعم متانت سے بولا ”ہارون صاحب کی آرڈنٹ کال تھی۔“

”ہارون! آپ کے پاس کوئی خبر ہے؟“

”جی ہاں چیف!“ ہارون نے اتحاد کا تراشا سامنے رکھ لیا۔
”پرسوں رات پولیس کو دو لاشیں ملی ہیں، جن میں ایک شخص گناہ ہے اور دوسری لاش مادام شہناز کی سیکرٹری میراٹی تھی۔ میراٹے نے زعمی بیان میں مادام شہناز کا نام لیا ہے اور پولیس سرگرمی سے قاتل کو وہ کو تلاش کر رہی ہے، مادام کے لیے جگہ جگہ چھاپے مارے جا رہے ہیں اور ایک پارٹی لاہور روانہ ہو گئی ہے۔“

”جائسن کے بارے میں کوئی اطلاع؟“

”سو ری چیف!“ ہارون معذرت خواہانہ ہجے میں بولا۔ ”ہم نے اس کے ساتھیوں کو یہاں روک رکھا ہے، وہ صرف کراچی کی حد تک معلومات رکھتے ہیں۔“

”اب آج کا پروگرام سن لیں۔“ میں نے چہرہ دکھا کر کرمانی کی جانب دیکھا، وہ مستعد سا ہو گیا تو آپ خالوں کو حفاظت لاہور کے لیے روانہ کرنے کے بعد اتحاد کے ساتھ کینٹ ایریا میں ایسی مسجد تلاش کریں گے جس کے دو مینار مکمل ہو چکے ہوں، ایک پر جنگ ہو رہا ہو اور تعمیرات زیر تکمیل ہے۔ مینار پر چار لاڈلے پیکر ہوں گے جن کا رخ چار سمتوں میں ہے اگر وہ مسجد مل جائے تو قرب وجوار میں پرائیویٹ کلینک یا اسپتال ہونا چاہیے، آپ صرف کلینک کا محل وقوع معلوم کر کے رپورٹ دیں گے۔ کرمانی نے آنکھوں سے اور چہرے کے تاثرات سے تعجب کا اظہار کیا۔ ”مشرعیم! آپ تمام سرکاری اسپتال سے ایک انفارمیشن حاصل کریں گے۔ پرسوں رات یا صبح دو مریض منظر جو ہری اور فاروقی چوہدری داخل ہوئے ہیں ان لوگوں کے نزدیک نہیں جائیں گے آپ کوئی شک؟“

”نہیں چیف!“ نعیم نے نیم استادہ ہو کر جواب دیا۔ ”میرا شاید یہ میری جلد بازی یا گستاخی تصور ہوگی مگر بات صاف بہتر ہوتی ہے، اخراجات میرا مطلب ہے آمدورفت اور دیگر اخراجات کے بارے میں کیا حکم ہے؟“

”نی الحال آپ کو پیشی رقم ملے گی، میراٹے کو کوشش کریں گے، آپ کے لیے سواری کا انتظام کیا جائے گا۔۔۔ ہارون! دوستوں کو سفر خرچ دے دیجیے گا۔“

”سرا! کرمانی تمہاری آوازیں بولا سو حساب کتاب کے لیے کوئی کیئر رکھ لینا چاہیے۔“

”نہیں کرمانی!“ میں نے اس کی تجویز مسترد کر دی۔ ”میراٹے دیانت دار لوگ ہیں وہاں خرچ کرتے ہیں، جہاں ضروری ہوتا ہے۔ دوسری نظامی ہمارے مشن میں کوئی گنجائش نہیں ہے، جتنے زیادہ لوگ ہوں گے اتنے ہی مسائل برپا ہوں گے۔“

”اکاؤنٹ کا شعبہ مشرکین سنبھال سکتے ہیں۔“ ہارون نے تجویز

پیش کی۔

”ہاں آپ کی تجویز سے میں اتفاق کرتا ہوں، میں نے بڑی تاملی اور غیر محسوس طور پر غیر ملکی دوستوں کو پارٹی اور عملی میدان سے دور کرنے کی جو پالیسی اختیار کر رکھی تھی اس کے اعتبار سے لیکن کو اندرون خانہ مصروف رکھنے کا ایک معقول جواز تھا۔“

”ان لوگوں کو تیاری کا وقت دے کر میں کرمانی کی راہنمائی میں زیر و لاؤس کے معاملے پر نکل گیا۔ زیر و لاؤس کی ساخت اور کرمانی کی انتظامی سوجھ بوجھ نے اس کو ایک مضبوط اور محفوظ قلعے میں بدل دیا تھا۔ ضرورت کے تحت ایسے خفیہ خانے بھی تھے جن کا رابطہ ہر کمرے سے مابھوتا تھا۔ خود کار میکانزم کے ذریعے یہ خانے کی سیڑھیاں اوپر آتی تھیں اور پھر فرش پر مل جاتا تھا، ایک کمرے کو اسلحہ خانہ بنایا گیا تھا، جس میں توپ اور بڑے بم کے علاوہ ہر قسم کا ہتھیار موجود تھا۔ مجھے ہر کمرہ اور ہر شعبے کے مدینہ آئی تھی۔“

جب میں تیار ہونے بیٹھ رہا تھا تو ذہن میں داخل ہوا تو ذہن میں بے شمار توجہ طلب مسائل اُبل رہے تھے لیکن کرنے کے لیے کوئی کام نہ تھا، جس طرح فائرنگ آواز جنگل کے پرندوں، پرندوں اور درندوں کو ہوشیار کر دیتی ہے اور ہر جانور اپنی اپنی جان بچانے کی کوشش کر لیتی ہے، جیسا کہ میں بھی صورت حال اس جنگل کی بھی تھی، جس میں میں داخل ہو چکا تھا۔ ہر شکار کا اپنا اپنا جواگنا تھا، ہوتا ہے جھوٹے چوٹے جانوروں اور پرندوں کے شکاری تو دن کی روشنی میں شکار کھیل لیتے ہیں مگر درندوں کے شکار یوں کو چاہیے بنا پڑتی ہیں پھر رات کے اندھیرے میں پھر وہ سانس روک کر انتظار کی اذیت برداشت کرنا پڑتی ہے۔ میں بھی چونکہ خود بخود درندوں کا شکاری تھا اس لیے دن کی روشنی موزوں نہ تھی اور دن بھر مکیاں مارنے کا یہی حوصلہ نہ تھا۔ پچانچہ ذہن کی ڈائری کی ورق گردانی کرنے لگا کہ شاید کوئی ایسی مصروفیت ملے جسے کسی کو نہ ہو، ایک نام کی پچھڑی ہوئی، وہ نام تھا لیاقت علی، جو ملک نواز کا قریبی اور اسلام آباد کا معروف ایجنٹ تھا۔ دوسرے کونے میں بھی ایسا ہی ایک پھولسا بس نام دھند سے نکل آیا تھا، شفاعت بیگ، لیاقت علی کا ٹھکانہ تو ہارون دیکھ آیا تھا مگر شفاعت بیگ صرف نام کی حد تک جانا پہچانا تھا، اس کے بارے میں بتایا گیا تھا کہ وہ واؤں کے پیکٹوں، بوتلوں اور ٹیوبوں میں بیروں اور چرس ضرورت مندوں تک پہنچانے کا وسیع دھندا پھیلانے والے تھے۔ میں نے کچھ نہ ہونے سے کچھ ہونے کے مصداق ان دونوں کو دیکھ لینے کا فیصلہ کیا اور ہارون کے ساتھ زیر و لاؤس سے نکل گیا تھا۔

لیاقت علی کا آفس مارکیٹ کے اوپر ایک فلیٹ میں تھا، اس کی لینڈی سیکرٹری کو دیکھ کر ہی لیاقت علی کی ذاتی اور کاروباری حیثیت کا پتا چل جاتا تھا۔ وہ لڑکی بگڑی ہوئی نسل کی حقیقی نمائندہ تھی، اس نے جس انداز سے میرا اور ہارون کا نگاہوں سے پریشان کیا تھا، شہنہ ہونے کے باوجود مجھے دیکھ سہنا پڑا تھا، وہ شاید ہم دونوں کی مردانہ وجاہتوں کا فیصلہ نہ کر پاتی تھی۔

”میں!“ میں نے نگاہیں اُچھاتے ہوئے پوچھا۔ ”لیاقت صاحب سے ملاقات ہو سکتی ہے؟“

”والی ٹاٹ!“ اس نے چمک کر جواب دیا۔ ”وہی ہے ہمارے پاس ان دونوں آپ جیسے لوگوں کے لیے کوئی باب وغیرہ نہیں ہے۔“

”کس قسم کے لوگوں کے لیے ہے؟“ ہارون نے ٹھیک کر پوچھا۔

”ایسز اور ڈرائیور!“ اس نے ہارون کی آنکھوں میں مسکراہٹ کی سرچ لاسٹ مارتے ہوئے بتایا۔

”ہم دونوں کام کر سکتے ہیں سر۔“

”اوہ!“ وہ مجھ سے گئی۔ ”میرا خیال تھا آپ امریکہ کا گرین کارڈ حاصل کرنا چاہتے ہوں گے۔“

”میں نے پوسٹ کا داخلی تہ نکال کر سیکرٹری کے سامنے رکھ دیا۔ وہ ایک مایہ سی سی ہوئی تھی جیسے میں نے اس کی ٹھوڑی کے نیچے زوردار ٹپ مار دی تھی۔“

”تشریف رکھیے، میں سر کو اطلاع دیتی ہوں، اس نے حاضر کام کاٹن دبا کر دیسیور کان سے لگایا۔“

”سر! گولڈن لیف آپ سے ملاقات کے لیے آیا ہے۔۔۔“

رائٹ سر۔۔۔ اس نے دیسیور گلابی رخسار سے رگڑتے ہوئے میری جانب دیکھا۔ ”تشریف لے جائیے۔“

”میں نے پتہ اُٹھایا اور مٹی میں دبا کر سیکرٹری کا سرکہ ادا کرتا ہوا دبیر پردہ اٹھا کر اندر داخل ہوا۔ لیاقت علی بڑی میز کے نیچے بیٹھا ہوا ایک چیمبر پر بیٹھا کھینوں کے بل آگے جھکا ہوا تھا۔“

”تشریف رکھیے صاحبان!“ اس نے پلٹ بے میں گریبوں کی جانب اشارہ کیا۔ ”کیسے زحمت کی آپ نے؟“

”ایک کاروباری ضرورت لائی ہے جناب!“ ہارون ممنائی آواز میں بولا۔

”تفصیل۔۔۔“

”سر۔۔۔۔۔۔“ میں گلا صاف کرتے ہوئے بولنے لگا۔ ”آپ گھر کے بھیدی ہیں، آپ سے کیا پردہ، باس کی عدم موجودگی نے ہمیں ہٹ پٹ

ہارون کے لیے بڑی پریشانی پیدا کر دی تھی۔ ہم مال مادام نوڈین سے حاصل کرتے تھے۔ ہم مال مویشیوں کی منڈیوں اور آڈول پرکھاتے ہیں۔ لاہور کی مارکیٹ بالکل ویران ہو گئی ہے، مادام نوڈین سے رابطہ کوشش کے باوجود نہیں مل رہا، باس بھی سلسلے ٹور پر باہر چلے گئے ہیں۔“

”میرا نام کس حوالے سے ملاقیں؟“

”توازن صاحب نے ایک بار آپ کا ذکر کیا تھا۔“ ہارون بول

پڑا۔ ”سر ہم بالکل خالی ہو چکے ہیں۔“

”ذرا گولڈن لیف تو دکھاؤ!“ اس نے ہاتھ آگے بڑھایا اور میں نے پتہ اس کی تفصیلی پر رکھ دیا۔ ”اول!“ اس نے پتہ اسٹ پلٹ کر دیکھا۔

”ٹھیک ہے لیکن میں مال کیسٹن پر دول لگاؤ۔“

”کیسٹن کا ریٹ سر؟“

”پچیس پر سنٹ!“

”شکر یہ سر!“ میں نے شوک نکل کر کہا۔ ”بے کاری سے بیکار بھلی۔“

”شام چھ بجے اس پتے پر آ جانا!“ اس نے ایک کارڈ میری جانب سرکایا۔ ”دوسری شرط یہی ہے، تم اسلام آباد پنڈی ایریا میں مال فروخت نہیں کرو گے، میرے آدمی پہلے ہی کام کر رہے ہیں۔“

”ایسی صورت میں میں مال آنا مانتا چاہیے کہ ہم بار بار ادھر نہ دوڑتے دکھائی دیں۔“

”کیسٹن پے منٹ پر کتنا مال لے سکتے ہو؟“

”جتنا آپ دیں گے ہم خرید لیں گے۔“

”اوکے!“ وہ سکرلے لگا کر آئی ویل ٹرائی۔ ”اس نے ہاتھ بڑھایا اور میں نے جھک کر اس کا ہاتھ اٹھایا تمام لیا تھا۔“

پھلی کا ٹانگہ لگی تھی، اس ایک جھٹکا مارنے کی ضرورت تھی۔

”میں نے مجھے قہور سا دکھ بھی ہوا تھا کہ لیاقت علی بھر پور خوبصورت نوجوان تھا، اسی دکھ کا ذکر جب میں نے باہر نکل کر ہارون سے کیا تھا تو اس نے جواب دے کر میرے دکھ کو بے جواز بنا دیا تھا۔“

”نہیں برادر! یہ خوبصورت سانس ہے آپ کو معلوم ہے کہ سانس جتنا خوبصورت ہوتا ہے اتنا ہی زہر ہلا ہوتا ہے۔“

”میں نے بھی ہانداز میں سر ہلایا اور ہارون ڈرائیونگ سیٹ کا دروازہ کھول کر اسی جھٹکا ہی تھا کہ ایک کپڑا چرائی ہوئی رُکی میں نے پھرتی سے پلٹ کر دیکھا اور پھر میرا بدن ہیکل سا کھاکر سل چھڑ گیا تھا۔“

”میرے سامنے دو چہرے تھے جن پر حیرت اور خوشی لہریں مار رہی تھی، مارشا اور گوتم۔۔۔“

”حیرت و استعجاب کا جھٹکا اس قدر شدید تھا کہ میں۔۔۔“

بے توازن ہو گیا تھا۔ اگر اچانک سورج مغربی افق سے طلوع ہوتا دکھائی دیتا تو بھی مجھے اتنی حیرت نہ ہوتی، جب مارشا حسب عادت بیچ کر کوئی تو بھی میں جیسے بے وزن سا فضاؤں میں ڈول رہا تھا۔ حالات کے نشیب و فراز اور حادثات نے میرا اعصابی نظام اتنا شک پرور کر دیا تھا کہ میں غیر متوقع اور انہونی سچویشن کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر مسکراتے اور کوئی درندہ کی طرح غراتے کا عادی ہو چکا تھا۔ مگر مارشا اور گوتم کو دیکھ کر میرے سارے نظام لحظہ بہ لحظہ کے لیے معطل ہو گئے تھے، اگر میرے حواس بجا ہوتے تو میں وہ دیکھ سورتا اور دیکھ لیتا جو مارشا کی ایڑیوں سے چپکا ہوا تھا، لیکن میرے سوچنے کی قوت بھی میرا ساتھ چھوڑ گئی تھی، اگر کوئی جس بیدار اور زندہ تھی تو وہ مٹی دیکھنے کی قوت جو اپنی تمام تر روشنیوں کو مجتمع کر کے اُس جوڑے کو دیکھ رہی تھی۔ مارشا کی آنکھیں پہلے خوشی، محبت اور اپنائیت سے پھیلی تھیں پھر اُس کا منہ کھلا تھا۔ شاید مغربی روایات کے مطابق اُس نے "ہائے خرم" کہا ہوگا، پھر وہ دروازہ جھٹکے سے کھول کر کوئی اور اسی لمبے میری آنکھوں نے اُس کے اڑتے بالوں کے افق سے اسٹین گن کی نال دیکھ لی تھی جو ریشمی ہوئی کار کے چوکھٹے سے جھانک رہی تھی۔ میں آج بھی حیران ہوں کوئی حقیقی رائے نہیں دے سکتا کہ مال دیکھتے ہی میرے پتھر جیسے بدن میں ایک دم کرنٹ کیسے دوڑ گیا تھا۔ اسی لمحے مارشا بائیں پیلا نے مجھ سے چند فٹ کے فاصلے پر بڑھ رہی تھی۔ میں برق رفتاری سے سلسپ میں ڈوبا اور مارشا کے ٹخنوں کو ضرب لگاتا ہوا کر وٹ کے بل ہو گیا تھا۔ مارشا کی پیچ اور گولی کی کوئی گونج فضا میں تھقی تھقی ہٹ جگائیں معدوم ہو گئی تھیں۔ گولی میرے اوپر سے غزاتی ہوئی ایک جنرل اسلور کے شوکیں میں جا گھسی تھی، ابھی میں مارشا کے بوجھ تلے دبا ہوا ہی تھا کہ میری سماعت سے فائبر کا دھماکا ٹکرایا۔ میں نے مارشا کو براہ راست دیکھا کہ نیلی کار لڑکھرائی جا رہی تھی پھر دو آدمی کو دیکر باہر نکلے، اُن کے قریب دوسری کار کی اور اُن کو سمیٹ کر موٹر مڑتی نگاہوں سے اوجھل ہو گئی تھی۔

سب کچھ چند سیکنڈوں میں ہوا تھا اور پھر سکوت طاری ہو گیا تھا۔ اس عارضی سکوت کو مارکیٹ کے

ڈکانداروں اور چند گاہکوں کے سوالوں نے توڑا تھا۔ "خرم... یہ... یہ..." مارشا بدحواس سی ہو کر ہکھلانے لگی۔ "یہاں سے نکل چلو" میں نے ہاتھ اٹھا کر اُس کی آواز دبا دی۔ "تم لوگ بالی ڈسے ان میں ٹھہرو گے" اس سے قبل کہ گوتم اُترتا یا مارشا کوئی سوال کرتی میں دوڑتا ہوا اپنی کار میں گھس گیا تھا۔ وہ بات جو مارشا کو دیکھ کر مجھے فوراً سمجھ لینی چاہیے تھی۔ وہ ہنگامے نے سمجھائی تھی۔ مارشا کو جانسن کی درخواست پر مافیا کے کسی بڑے نے پاکستان بھجوایا تھا اور یقیناً اُسے خرم سلطان کا سوال دے کر رہنا مندر کیا ہوگا۔ وہ لوگ مارشا کے ذریعے اصل خرم سلطان کو بے نقاب کرنا چاہتے تھے۔ انہیں کسی نے مارشا کی اُس قدرتی خوبی کے بارے میں بتایا ہوگا کہ وہ اپنے شکار کو قوت شامہ کے ذیلے تلاش کر لیتی ہے۔ میں نے بے نقاب کرنے کا غلطیہ جا استعمال کیا ہے، اگر وہ مجھے بے نقاب کرنا چاہتے تو میری صورت دن کی روشنی میں دیکھ کر آگے بڑھ جاتے مگر انھوں نے مجھے ہلاک کرنے کا بڑا ہی آسان اور کامیاب منصوبہ ترتیب دیا تھا۔ وہ تو زندگی تھی اور نہ میرے ساتھ میری منہ بولی پیاری بہن مارشا بھی اُن کی درندگی کا شکار ہو جاتی۔

میرے لیے کیا حکم باس؟ اُس نے سپاٹ بے میں پوچھا۔

"ہمارے سامنے دو کام ہیں اور جب کہ ہم ایک وقت میں ایک ہی کام کر سکتے ہیں" میں نے بولنا شروع کیا۔ "تم مشورہ دو گے کہ پہلے کون سا کام کرنا چاہیے؟" وہ کام سرا کرمانی نے جواب دیا: "جس سے خطرہ جھانک رہا ہو!"

"تھینک یو کرمانی! میں نے سنائی آواز میں کہا: ہم پہلے جانسن سے ملاقات کریں گے؟" وہ لوہو ہلکا ہوا اس لیے مختصر وقت میں متاثر کر رہا تھا کہ وہ ایور ریڈی قسم کا انسان تھا۔ اُس نے کبھی تیاری کے لیے وقت مانگا تھا، سیل و سمیت کی تھی جو سوال کیا جاتا اُس کا جواب کبھی سوئی طرح دے دیتا اور جو شکم دیا جاتا اُسے مشین کی مانند بجا لاتا۔ اس وقت بھی اُس نے ایڑیاں ہڈ کر گویا روانگی کا اشارہ دے دیا تھا۔ میں اور ہارون تو پہلے ہی تیاری مکمل کر چکے تھے۔ میری جیب میں ڈارٹ پستل تھا اور ہارون کی تمام جیبیں آتش گیر مادے سے بھری ہوئی تھیں۔ ہارون نے زیرو ہڈ کی پیادہ مری میں بلبوں کو آپٹریشن کے مراحل گزار کر سینٹیک گیس بم تیار کر لیے تھے، اُس کا دعویٰ تھا کہ ایک بم اگر سہزی منڈی میں پھٹ جائے تو ہزاروں لوگ سہزی کے تھیلوں سمیت بے ہوش ہو سکتے ہیں۔ ایسا ہی ایک بم اُس نے پیٹ پر باندھ رکھا تھا اور گیس ماسک بھی ساتھ رکھ لیا تھا۔

ڈرائیو بگ سیٹ پر کرمانی تھیں نے اُسے جانسن کی قیام گاہ کا پتا بتا دیا تھا۔ وہ پشاور ٹوٹے کار پنڈ ورا دوڈ پر مڑا اور پھر مختصر ذیلی راستے اختیار کرتا ہوا قلعہ کارپوریشن کے سامنے سے گزرتا ہوا آئی ٹان کی پرانی آبادی سے آگے نکل گیا۔ وہ سیکٹر یقیناً نیا اور بن ہوا تھا۔ فاصلے فاصلے پر کوٹیاں تھیں زیادہ تر ابھی زیر تعمیر ہی تھیں۔ اُس نے ڈیش بورڈ سے سی ڈی اے کا ایک پڑا سا نقشہ نکال کر دیکھا اور پھر کار ہتی سڑک پر لے گیا۔ سڑک کے کنارے جا بجا بھری کے ڈھیر تھے ہوئے تھے۔ سڑک کے ٹرن پر ایک دو منزلہ کوٹھی تھی، مجھے ہولناکیاں بتاتی تھیں وہ میں نے بھی دیکھ لی تھیں۔ مٹا کار بھری کے ایک ڈھیر پر چڑھی اور پھر نہایت ہی آہستگی سے دائیں کر وٹ اُلٹ گئی جیسے بے نی کار ٹرکس پر ٹھوکر لگنے سے اُلٹ گئی ہو۔ جب میں نے خود کو اندر

لے جانے کا منصوبہ کرمانی کو بتایا تھا تو میرے ذہن میں دو دور دور تک منصوبے کے پہلے اور بنیادی قدم کا کوئی حل نہ تھا۔ میں سوچتا رہتا تھا کہ کرمانی کون سا طریقہ استعمال کرے گا۔ اُس نے بھی شاید بھری کا ڈھیر دیکھ کر ہی کار اُٹانے کا فیصلہ کیا ہو گا۔ وہ حادثہ بالکل گیٹ کے سامنے پیش آیا تھا۔ چند سو گز بائیں جانب مزدور سڑک کر رہے تھے۔ وہ کوڑے ہوئے اُترے اور بھاری آٹمی ہوئی کار کو سپر دھاک لگے۔ کرمانی اور ہارون کرمانی آواز میں مزدوروں کو میری جانب متوجہ کر رہے تھے۔

مجھے اٹھا کر زمین پر رکھا گیا، پھر کسی کا کھڑا ہاتھ میری پیشانی پر بھرنے لگا تھا۔ کسی دوسرے نے میری نبض پر انگلیاں بجاتے ہوئے ہارون اور کرمانی کو میری زندگی کی خوش خبری سنائی تھی۔

"اس نے لیفٹ مافیا تھی؟ ہارون کی آواز ابھری۔ یہ غالباً کوئی انگریز سیاح ہے؟"

"اس کو بھی میں بھی انگریز رہتے ہیں؟ کسی مزدور نے بتایا۔" اودہ... کرمانی بولا: "پھر اسے اندر لے چلو، وہ لوگ اسے کسی اسپتال پہنچا دیں گے؟"

"مجھے چار آدمیوں نے اٹھا لیا، پھر لوہے کا گیٹ، بجا یا۔ چند منٹ بعد غیر ملکی پیسے میں کوئی آدمی میں بولا تھا۔ کرمانی نے شستہ انگریزی میں اُسے بتایا۔

"جناب ہماری کار حادثے کا شکار ہو گئی ہے۔ یہ کوئی آپ کا ہم وطن سیاح ہے، اگر ہماری کار کا آمد رہتی تو ہم اسے طبی امداد کے لیے خود لے جاتے۔ براؤ کمز آپ اسے کچھ وقت پر دیکھ لیں۔ ہم ایسولینس کے لیے جا کر فون کر دیں گے؟" "نیک ہے اسے اندر لے چلو؟" انگریز نے مجھ پر جھک کر کہا: "لیکن اندر صرف دو آدمی جائیں گے۔ ہماری غواہین آرام کر رہی ہیں؟"

بہت بہت شکریہ جناب! ہارون بولا اور پھر انگریز کی نگرانی میں دو مزدور مجھے اندر لے گئے، ہینڈ گڈائی تھا۔ "کیا معاملہ ہے ڈون؟ کسی کی بھر پوری آواز دوسرے کمرے سے سنائی دی۔" "کون ہے؟" "ابھی معاملہ خود مجھے کی کوشش کر رہا ہوں ڈیوس دو مقامی آدمی ایک تھی کو چھوڑ گئے ہیں؟"

اوه... وہ اندر آگیا۔ تمہنے کہہ دیا ہوتا سوری، ہم کہیں جا رہے ہیں۔

"شاید کہہ دیتا مگر یہ اتفاق میرے حلق میں اٹک گیا ہے ڈیوئس! ایک انگریز کو جہاز سے گرنے کے ساتھ ہی حادثہ کیوں پیش آیا؟ کیا تم اس حادثے کو منظم کر سکتے ہو؟"

"اؤں... فرسش پر شاید وہ پہلے لگا تھا۔ اگر پیغامبر کو تر ہے تو اسے اب تک..."

میں ایک دم میکا کی انداز میں اٹھ بیٹھا اور آنکھیں ٹپٹپٹانے لگا۔ "تینکس ڈیوئس! ڈیوئس نے تمہارے لگا لگا..."

"تینکس ڈیوئس! میں نے اٹھ کر باس جھاڑا۔ ویسے حادثے کو قدرتی رنگ دینے کے لیے مجھے چوت آئی ہے۔"

"تم... ڈون کو برے کی مانند پھنکارا۔ ڈیوئس باہر نظر رکھو، میں لڑکے سے بات کروں گا۔ وہ تو نہیں میری جانب پلٹا، اس کے ہاتھ میں ریو اور نہ جانے کہاں سے آگیا تھا۔"

"بلن، پیارے لڑکے! جو کچھ لائے ہو دے دو اور پھر تم سے پوچھوں گا کہ اندر آنے کے لیے درمائی طریقہ استعمال کرنے کی ہدایت بھی کیا ادھر سے لائے تھے؟"

"باس کہاں ہے؟" میں نے ہونٹ سکڑ کر مڑ دے۔

"پچھ میں پوچھا۔ اس کے لیے زبانی پیغام ہے۔"

"نام تو کس باس کی بات کر رہے ہو؟ ڈون نے ریو اور اٹلی پر گھاتے ہوئے پوچھا۔ ڈیوئس کا باس میں ہوں۔"

اس سے قبل کہ میں جواب دیتا، ڈیوئس کے ساتھ دو لوگوں تکے ہوئے گڑھوں کی طرح گھر میں جھکے ہوئے اندر داخل ہوئے۔

"مادام شہناز خطرے میں ہے۔ میں نے ان لوگوں کو نظر انداز کرتے ہوئے ہونا شروع کر دیا۔ اس کی سیکرٹری کی لاش شناخت ہو گئی ہے پولیس شہر میں ہونٹوں اور اسپتالوں کی کاشی لے رہی ہے۔"

"میں تم لوگوں سے کوئی سوال نہیں پوچھوں گا۔ جواب تمہارے زرد چہروں پر تحریر ہے۔ وہ پلٹ کر اپنے ساتھیوں کو گھورتے ہوئے بولا۔

"باس! وہ پہلے سے تیار تھا۔ نو جوان منمایا۔ جو نہی لڑکی اس کی طرف دوڑی، اس نے سلب لیا اور لڑکی کو لیتا

ہوا نیچے ڈوب گیا تھا، پھر فالنگ ہوئے جی۔ ہم نے بمشکل جان بچائی ہے۔"

"کیا وہ لڑکی کو بھی لے گیا ہے؟" ڈون نے چیخ کر پوچھا۔

"ہم دیکھ نہیں سکتے باس۔ دوسرا نو جوان بولا۔ بیچوٹن ہمارے حق میں نہ رہی تھی۔"

"ٹھیک ہے، تم دوسرے حکم کا انتظار کرو۔ ڈون ماتھے کا پسینہ پونچھتے ہوئے بولا۔ ڈیوئس! تم باس کو کال کرو اور نئی صورت حال بتاؤ۔"

"میرے لیے کیا حکم ہے؟" میں نے پوچھا۔ میں بھی باس سے بات کرنا چاہتا ہوں۔"

"پہلے مجھ سے قیامت کرو۔ وہ مسکرانے لگا۔ کس کے لیے کام کرتے ہو اور کہاں سے آئے ہو؟"

"باس کے لیے کام کرتا ہوں اور پارٹی برس قبل سیکسکو سے آیا تھا اور کوئی بات۔"

"ٹھیک ہے باس کو ہم کال کر رہے ہیں۔ ڈون بولا۔

"اس نے اگر تصدیق کر دی تو آگے چلیں گے۔"

ٹیلی فون کی گھنٹی بجنے لگی تو ڈون اٹنے قدموں پیچھے ہٹنے لگا۔ تب ہی مجھے پتا چلا تھا کہ وہ میری باتوں سے مطمئن نہیں ہوا۔ اس نے ریسیور اٹھایا اور اد کے کم انگٹ کہہ کر ریسیور رکھ دیا، پھر ریو اور لہراتا ہوا بولا۔ "چلو لڑکے اپنے باس سے بات کرو۔"

میں نے اٹھ کر کندھے اچھکاتے اور اس کے آگے آگے ہل پڑا۔ ڈون کو تو میں نے باس کے حوالے سے قدرے رام کر لیا تھا، لیکن باس اگر جانسن ہی تھا تو میرے بھرم کا پتہ کھڑا ڈیوئس کے ساتھ بہ الفاظ دیگر ڈون مجھے مقتل کی جانب لے جا رہا تھا، لیکن مجھے ہر صورت جانسن کو نہیں کرنا تھا اگر وہ رئیس نہ ہوتا تو فیمن کی بازیابی ممکن نہ تھی۔ ٹرانسمیٹر سیٹ کے قریب ڈیوئس کھڑا تھا۔ سیٹ کے ساتھ ٹیلی فون سیٹ بھی دکھائی دے رہا تھا۔

"ڈیوئس! ڈون نے ریو اور اچھاتے ہوئے کہا۔ ریو اور میری ناک کی اونچائی سے ڈیوئس کی جانب جا رہا تھا کہ میں نے بیک وقت دائیں ہاتھ سے ریو اور روک لیا اور بائیں ہاتھ کی برقی کٹ ڈیوئس کے گلے پر ماری وہ اچھل کر مرنے پر جاگرا اور پھر گلے پر دو ٹوک ہاتھ رکھ کر دائیں

کرٹ سیٹ گیا تھا۔

"مسٹر ڈون! میری سرگوشی میں مرد ترین ہٹکار تھی۔

"تم... میں نے ہونٹوں پر انگشت شہادت رکھ دی۔"

کیونکہ ٹرانسمیٹر سیٹ آن تھا، اگر میں آواز سے اسے وارننگ دیتا تو دوسری طرف سننے والا باس معاملے کی تہ تک پہنچ جاتا۔ میں نے گھوم کر ایسی پوزیشن لی کہ وہ دو ٹوک ریو اور کی زوئیں آگئے تھے۔

"گڈ مارننگ باس! ڈون آن لائن! میں نے سٹی الاکان ڈون کے لیے کی نقل کرتے ہوئے کہا۔

"مارننگ! بھرتی آواز سے جواب دیا۔ یہ کیا کر رہے ہیں؟"

"کھیل کچھ بگڑ گیا ہے باس۔ میں نے کھانسی ہوئے کہا۔

"عملہ ناکام ہو گیا ہے اور وہ بوڑھی شایہ وہ ساتھ لے گیا ہے۔

میں نے پھر کھانسی شروع کر دیا۔ پولیس، مادام کو تلاش کر رہی ہے۔ سراسر رساں کتے بھی ان کے ساتھ ہیں۔ کیا مادام کو شفٹ کر دیا جائے؟"

میں نے غصوں کا میری گفتگو نے ڈون کے تھے ہوئے ہونے نرم کر دیے تھے کیونکہ میں وہی رپورٹ دے رہا تھا۔

جو وہ دینا چاہتا تھا۔

"اسے میں سنبھال لوں گا۔ تم کوئی خطرہ تو نہیں محسوس کرتے۔"

"خطرہ ہے باس! میں نے جواب دیا۔ وہ جوڑا غم سلطان کو اس اڈے کی نشاندہی کر سکتا ہے۔"

"اؤں... ٹھیک ہے ڈون! تم لوگ پوائنٹ تھری میں مستقل ہو جاؤ۔ فریج کے سوا سب کچھ ساتھ لے جاؤ۔"

"کیا آپ بھی پوائنٹ تھری پر ہیں باس؟"

"یہ سوال غیر ضروری ہے ڈون! اس نے عرض کر کہا اور سیٹ آف ہو گیا۔

"کیا تم نے باس کا حکم سن لیا مسٹر ڈون؟" میں نے ڈون کی آنکھوں میں جھانک کر پوچھا۔ اب ہم یہاں سے فوراً نکل جہاں تھے۔

"وہ تو ہو گا! ڈون مسکرانے لگا۔ لیکن تم بھی کیا ڈون ہو؟"

"کیا کوئی دوسرا یہ نام نہیں رکھ سکتا؟" میں نے بھی مسکرا کر پوچھا۔ میں ڈون مائیکل ہوں۔"

"چلو ہو گا! ڈون مسلسل مسکرانے جا رہا تھا۔ اب مسٹر

ڈون مائیکل ڈون کو ریو اور واپس کر دے، تاکہ ہم دوستی کی فضا میں یہاں سے جانے کا پروگرام بنائیں۔

"اوه... یہ تو... میں نے ایک قدم بڑھا کر ریو اور کی نال اپنی طرف کر کے ہاتھ بڑھایا اور پھر ریو اور کا دستہ ڈون کی کھٹی سے نکرایا اور وہ بے آواز ڈھیر ہو گیا۔ وہ جو نہی گرا اسی وقت ڈیوئس کھلتا ہوا اٹھ کھڑا ہوا تھا، جیسے ڈون کے حواس برقی کرنٹ کی طرح اُدھر چلے گئے تھے۔

"مسٹر ڈیوئس! میں نے ہڈیاں ٹھٹھرائے دالی آواز سے پوچھا۔ کیا تم بھی ڈون کے ہمسفر بننا پسند کرو گے؟"

ڈیوئس نے شوک نکل کر ڈون کے بے حس و حرکت جسم کو دیکھا اور پھر نفی میں گھومنے لگا۔ اس کی نیلی بلور آنکھوں میں خوف کا دھواں پھیل گیا تھا۔ اس نے جھول کر ٹھٹھکی کوشش کی مگر اٹھتے اٹھتے گلا دبا کر پھر بیٹھ گیا۔

"میں صرف ایک سوال کروں گا ڈیوئس! اور تم بھی زندگی کے نام پر درست جواب دو گے، پھر میں تمہارا شکریہ ادا کر کے یہاں سے نکل جاؤں گا۔ ڈیوئس نے ثابت میں سر ہلایا۔

"پوائنٹ تھری کہاں ہے؟"

"اگر میں غلط جواب دوں تو تم کیا کرو گے؟"

"میں غلط جگہ سے واپس اگر ٹھیک نشانہ لگاؤں گا۔ میں نے جواب دیا۔ دوسرا طریقہ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ تم میری رہنمائی کرو، ویسے بھی تمہارے باس نے تم لوگوں کو پوائنٹ تھری پہنچنے کا حکم دیا ہے۔"

"دوسرا طریقہ بہتر رہے گا۔ وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

"شکریہ ڈیوئس! میں نے نرم آواز میں کہا۔ لیکن یہاں تمہارے دوسرے ساتھی بھی ہیں۔ انہیں مطمئن کرنا تمہارا کام ہو گا۔ میں ریو اور جیب میں رکھ رہا ہوں۔"

لیکن پورے کچھ کوئی بھی دکھائی نہ دیا تھا۔ گیارہ میں ایک لیڈر رور کھڑی تھی جس پر کراچی کی نمبر پلیٹ تھی۔ ڈیوئس نے فیمر کو پاؤں کی ٹوک سے اوپر کیا تھا، پھر ڈائیونگ سیٹ کا دروازہ کھول کر میری جانب استفسار نہ نظر دور سے دیکھنے لگا۔

"تم فرنٹ سیٹ سے ڈائیونگ سیٹ پر جاؤ گے ڈیوئس! میری ہدایت پر اس نے زور سے دروازہ بند کر دیا اور آگے سے گھوم کر دوسرا دروازہ کھول کر اندر ہو گیا۔ میں نے احتیاط

اُسے دوسرا دروازہ استعمال کرایا تھا۔ اگر ڈیش پور کے خانے میں رہا اور ہوتا تو اُس کے پاس معقول وقت تھا، جب میں دوسرے دروازے تک جاتا، وہ بازی اپنے حق میں کر سکتا تھا۔ گاڑی بیک میں لاکر اُس نے فوٹن لیا اور ٹیٹ سے نکل گیا۔ میں نے ٹیٹ سے نکل کر دیکھا کہ مارون اور کرمانی کار کے اندر تھے اور دو مزدور کار کو دھکیل رہے تھے۔ غالباً انہوں نے مزدوروں کی خدمات خرید لی تھیں۔ بخوبی ڈیوس کی کار ٹیٹ سے نکلی تو انہوں نے مزدوروں کو دھکا لگانے کا اشارہ دے دیا ہوگا، اگر وہ ایسا نہ بھی کرتے تو کوئی فرق نہ پڑتا۔ کیونکہ بند کی فوری کاسر میرے ہاتھ میں تھا ڈیوس اگر قاب سے آگاہ بھی ہو جاتا تو کیا کرتا؟ ایسا ایک تک وہ مناسب فاصلہ رکھے تعاقب میں آئے تھے۔ عقب نما آئیے میں ڈیوس نے بھی اُنہیں دیکھ لیا تھا، لیکن وہ دانتوں پر دانت جملے مخاطب انداز میں ڈرائیونگ کرتا رہا تھا۔ جس کوئی کے سامنے اُس نے گاڑی روکی تھی، اُس کے ٹیٹ پر ابراہام کی نیم پٹیٹ نصب تھی۔ بالائی منزل کی ریٹنگ پر ایک دیسی لڑکی کہنیوں پر چھکی ہوئی بچے دیکھ رہی تھی۔

”کیا تمہارا پاس مقامی ہے؟“ میں نے پوچھا۔
”ہاں“ اُس نے اچن بند کرتے ہوئے کہا: ”کیا مجھے بھی اندر جانے دے گا؟“
”پیرمٹ کے بغیر تو کوئی بے جہان مال بھی داخل نہیں ہونے دیتا۔“ میں نے اُسے ریوالور کا ہوکا دیا۔ ”اتر و اور بالکل دوستانہ انداز میں پاس تک چلو۔“
”ٹیٹ کی ٹک بٹا کر وہ اندر داخل ہوا۔ ایک گول مٹول سفید کتا بچہ کتا ہوا نمودار ہوا۔“
”کم بیک ٹوٹی؟ لڑکی نے چیخ کر کتے کو شکم دیا۔ کتے نے پلٹ کر دیکھا اور پھر ہمارے آگے آگے دوڑنا سیر دھیاں چڑھتا ہوا لڑکی کے پاس آدھ چلا گیا تھا۔ میری منع قلم یقیناً کسی نہ جیس کے لیے خوش گوار نہ تھی۔ اس لیے میں آدھ پر دیکھے بغیر ڈیوس کے ساتھ چند ہیر دھیاں چڑھ کر کارینڈور میں داخل ہو گیا تھا۔“

اندر ٹائپ رائٹر کی کھٹ کھٹا آواز آرہی تھی۔ ڈیوس اُدھر ہی بڑھتا اندر چلا گیا۔ میں دروازے میں کھڑا ہو گیا۔ سامنے چھوٹی سی میز پر ایک کم سن لڑکی ٹائپ کر رہی تھی اور میز کے کونے پر ایک ادھیر عمر شخص، سٹیپلوں کے بل

جھکا ہوا مشین کے رولر پر چڑھتا ہوا کاغذ پڑھ رہا تھا۔
ڈیوس نے گردن موڑ کر میری جانب دیکھا۔ اُس کی آنکھوں میں اتنا سنی ایک سوال تھا کہ اب میرے لیے کیا حکم ہے؟ مگر میں خود اپنی ذات کا سوال بن گیا تھا۔ وہی شخص اگر پاس تھا تو میں نے جو کچھ کیا تھا، جھک کے سوا کچھ نہ تھا، مجھے جس شخص کی تلاش تھی، جس کی خاطر کرمانی نے ڈراما رچایا تھا سب کچھ بے سود ہی رہا تھا۔

”میرے آفس میں چل کر بیٹو، اُس شخص نے سرسری لیے میں کہا۔ اُس نے مجھ پر بھی اچھٹی سی نگاہ ڈالی تھی۔ ڈیوس نے پھر میری جانب دیکھا۔ تب ہی میں چند قدم آگے بڑھا تھا۔ ڈیوس ایک طرف ہٹ گیا تھا۔
”میرے پاس ستر جانشن کے لیے ایک اہم پیغام ہے۔“ میری بات سن کر اُس نے ڈیوس کی جانب استغیابانہ نگاہوں سے دیکھا۔

”یہ مجھے ریوالور کی زد میں یہاں لایا ہے، ستر برابر۔“ ڈیوس منمنانے لگا۔ ”اس نے ڈون کو قتل کر دیا ہے۔“ وہ میں نے سابقہ قریبی چکا یا ہے ستر برابر۔ میں سرور آواز میں بولا: ”وہ میرا اور فوٹن کا ذاتی معاملہ تھا۔ ہمارے بگ پاس جانتے تھے کہ جب بھی ہمارا انکار ڈھوا ایک کو گروہ سے خارج ہونا ہو گا۔“

”بگ پاس یہاں نہیں ہے۔“ ابراہام نے ٹھہرے لیے میں بتایا: ”اُسے ہیڈ کوارٹر نے شاید واپس کال کر لیا ہے۔“ وہ ہے؟ میں نے دایاں پیراٹھا کر فرسش پر مارا۔
”اور تم جانتے ہو وہ کہاں ہے؟“

”وہ نہیں ہے ستر، ابراہام نے بھی میرے کڑوے انداز کا جواب اسی کڑواہٹ سے دیا۔“ میں قائم مقام چہیت ہوں۔ اگر تم چاہو تو مجھے پیغام دے سکتے ہو۔“

”نہیں ستر، برابر۔“ میں نے نفی میں گردن ہلاتی تھی۔ اسی کوئی اطلاع نہیں دی گئی۔ دوسرے بھر کے پاس کا نام ابراہام نہیں مجھے مادام شہناز کا نام بتایا گیا تھا اور اُسے ہی خطرہ شکاری کتے کی طرح ٹونگتھا شہر میں محکوم رہا ہے۔ میرے ذمے عظیم سلطان نامی نوجوان کی تلاش اور نگرانی تھی۔ میں نے اپنے آدمی شہر میں پھیلا رکھے ہیں۔ انہی ذرائع نے بتایا ہے کہ مادام شہناز خطرے میں ہے۔“

”اگر صرف یہی کچھ بتائے آئے ہو تو مطمئن ہو کر چلے جاؤ،“

مادام محفوظ ترین چہار دیواری میں ہے اور ہمارے محافظ اُس کی حفاظت کر رہے ہیں۔“
”شکریہ ستر۔“ میں نے ایک دم تناؤ توڑتے ہوئے منقون آواز میں کہا: ”کیا آپ پاس سے رابطے کا ذریعہ بتائیں گے سر۔“
”سوری ستر۔۔۔“

”ڈون مائیکل۔“ میں نے اُس کی بات کو ٹکڑا لگا یا۔
”ہاں ستر مائیکل! میں خود لا علم ہوں۔ پاس سے رابطہ منقطع ہے۔ میں تمہیں مجبور نہیں کروں گا۔ لیکن اگر کوئی مسئلہ ہو تو مجھ سے رابطہ رکھنا۔“

”سر! مادام کو وہاں سے شفٹ تو نہیں کیا جازم؟“
”کہاں سے؟“ اُس نے اٹنا سوال کر ڈالا۔

”اسپتال سے سر۔“
”اوہ۔۔۔ اُس کی کچھ بھی سنی آنکھوں میں اچانک کوئی روشنی درآئی تھی۔“ میرے ساتھ آؤ ڈون مائیکل! تم ادھر ٹھہرو ڈیوس۔“

دوسرا کمر اُس کا آفس تھا۔ ایک میز اور چند کرسیاں، میز کی سطح گرد آلود تھی جیسے بہت دفوں سے آفس کو استعمال نہیں کیا گیا تھا۔ ایک بیک کے خانوں میں سنگ مرمر کے نوٹے سلوں اور چھوٹی چھوٹی کنکریوں کی صورت میں پرے ہوئے تھے۔ ابراہام نے ایک ڈسٹر سے دو کرسیاں صاف کیں۔ ”بیٹھو اور مجھے بتاؤ، مادام شہناز کس اسپتال میں ہے؟“ وہ بے حد پرجوش ہو رہا تھا۔

”ابھی تم نے کہا تھا کہ ہمارے محافظ وہاں موجود ہیں۔“ میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”اوہ۔۔۔ وہ کھسیانی ہنسی ہنسنے لگا۔ جانشن نے بتایا تھا۔“
”اُس لڑکی کے بارے میں بھی؟“
”لڑکی۔۔۔؟“

”ہاں لڑکی، جسے اغوا کیا گیا ہے، جو عظیم سلطان کی محبوبہ بتائی جاتی ہے۔“

”رنگ بازخان کی بیٹی، وہی ناں۔ اُسے ہی تو وہ تالوت میں بند کر کے لے گیا ہے۔ اُس کا ڈیچہ سر سینیٹ میں نے ہی حاصل کیا تھا۔ اُسے جابر خان کی بیوی قباہر کیا گیا ہے۔“

”ہائی اسر؟“
”ہاں! ابراہام نے اثبات میں گردن ہلاتی اور میرے خون

کی گردش رگوں کو قانع اور ظالم فوجیوں کی طرح ٹھوکریں مارنے لگی تھی اور پیٹ میں گولے پھٹنے لگے تھے، لیکن میں اُس لکیر کو نہ تو پھینکا جاتا تھا، جو جانشن جیسا ناگہری ذات کی گلی میں چھوڑ گیا تھا اور نہ ہی لکیر پر بیٹھ کر ماتم کرنا چاہتا تھا۔ دو طاقتوں کی جنگ تھی۔ ایک طاقت کی کمان میرے ہاتھ میں تھی اور دوسری کو جانشن بند کر رہا تھا۔ میری طاقت ایک محاذ سے پیش قدمی کرتی دشمن کی صفوں میں گھس گئی تھی اور جانشن دوسرے محاذ پر کامیابی حاصل کر کے نکل گیا تھا۔ اُس نے اپنا سنی استعمال کیا تھا کہ میدان جنگ میں ہر حربہ جائز ہوتا ہے۔ کوئی علاقہ فتح کرتا ہے اور کوئی دشمن کے آدمیوں کو قیدی بنا لیتا ہے۔

جانشن نے ٹینڈ کو قیدی بنا لیا تھا اور جنگی اصول کے تحت وہ اس اہم قیدی سے جنگی نوعیت کے مفادات کے لیے سودے بازی کرنا چاہتا تھا۔ یہ میری حکمت عملی، جرأت اور فورس پر منحصر تھا کہ میں اُس کی برتری تسلیم کروں اور اُسے سودے بازی کی پیش کش کروں یا آگے بڑھ کر اپنے قیدی کو نکال لاؤں۔ میں جس مقصد کے لیے میدان عمل میں نکلا تھا، ابراہام جیسے شخص نے سامنے آ کر کسی حد تک میری دوڑ و صوب کو ختم مندی سے بچا لیا تھا، جس طرح اللہ کے نیک بندے اپنی ذات کی روشنی سے مجھے ہونے چرخ روشن کرتے چلے جاتے ہیں۔ اسی طرح بُرائی کے پجاریوں کا بھی اپنا ایک دستور ہوتا ہے۔ وہ بھی بُرائی کے دھتے بڑے مربوط انداز میں شہر شہر قریب قریب پھیلاتے ہیں۔ میں رنگ بازخان، سینٹر سلیمان اور ان جیسے کئی دھتوں کو مٹا کر یہ سمجھ بیٹھا تھا کہ کم از کم پنڈی اسلام آباد، دونوں کے دامن صاف ہو چکے ہیں مگر وہ میری خوش فہمی تھی۔ شیطان مرتے مرتے پتھروں کی طرح گندگی میں اندے چھوڑ جاتے ہیں۔ مادام شہناز، علی رضا، لیاقت علی، نواز شش اور ابراہام جیسے لوگ اُنہی گندے اندوں کی پیداوار تھے۔

میں نے سوچا اگر اس غوطے نے گوہر مقصود نہیں دیا تو ابراہام جیسے مگر مجھ سے تعارف حاصل ہو گیا ہے۔ ایک ناکامی کی کوکھ سے دوسری کامیابی نے جنم لے کر میرے ڈکھ کی تلافی کر دی تھی۔ میں سمندر کی گہرائیوں سے کچھ نہ کچھ لے کر اُدھر آ بھرنا چاہتا تھا۔

”ستر! برابر۔“ میں نے دوستانہ انداز میں کہا۔ ”میر تو۔۔۔ انتظامی امور کی باتیں تھیں۔ پاس واپس چلا گیا ہے اور ہم چل

میں آوارہ بھیڑوں کی طرح رہ گئے ہیں۔ میں وفاداری کے ساتھ ہمیشہ فری لانسر رہا ہوں۔ جانسن کے ہاتھ کا سایہ مجھے تحفظ دیتا رہا ہے۔ اس سے قبل میں ملک نوازی بگل میں تھا۔ تحفظ کی قیمت خدمات کی صورت میں ادا کرتا ہوں، میں آوارہ گرد اور آزاد منش ہوں مسز ابراہام! ایسے لوگوں کا ہاتھ اور جیب تنگ ہی رہتی ہے۔

”نچاری جیب بھری جاسکتی ہے ڈون“ وہ آگے جھک کر بولا۔ ”تم نے ابھی خدمات کا ذکر کیا تھا، اگر اپنی خدمات میسے سوائے کر دو تو میں تمہارے ہاتھ کی تنگی دور کر دوں گا۔“

”ملازمہ مت؟“
”یہ نہیں؟“ اُس نے آگے جھک کر میرے گھٹے پر تھکی دی۔
”میں آزاد چچی کو پھرے میں قید کرنے کا عادی نہیں ہوں۔ بس معلومات دو اور معاوضہ حاصل کر لو۔“

”پوچھو کیا چاہتے ہو؟ میں معلومات کی نوعیت کا معاوضہ لگایا کرتا ہوں۔“

”کیا ترم سلطان تمہارے ذرائع کی نگاہوں میں ہے؟“
”ہاں میرے آدمی اُس کے تعاقب میں رہتے ہیں۔“
”اس وقت یعنی اب وہ کہاں ہو سکتا ہے؟“
”کہیں بھی یہ میں نے ناگوار جگہ میں حجاب دیا۔“
”تھک کے نہ بیٹھے نکلتے والا زندہ جنگل میں کہیں بھی چھپ سکتا ہے۔ اُس پر آج نامعلوم پارٹی نے ناامید کر دیا تھا۔“

”وہ میری پارٹی تھی ڈون؟“ ابراہام نے تشریف لے گیا۔
”جھکاتے ہوئے بتایا، جانسن کی کال پر یہاں ایک غریبی بھڑا آیا تھا، مجھے جانسن نے یہی بتایا تھا کہ لڑکی، ترم سلطان کو خود تلاش کرے گی میں نے اُن کے تعاقب میں کرانے کے قاتل روانہ کر دیے تھے، لیکن وہ فیضان نہ صرف نکلا گیا بلکہ اُس بھڑے کو بھی ساتھ لے گیا ہے۔“

”معلومات کے علاوہ میں کچھ اور بھی فروخت کرتا ہوں مسز ابراہام اور میرا اصل قدیمہ معاش وہی جنس ہے کیا تم اُس جنس کے بدلے میری خدمات حاصل کر سکتے ہو؟“
”ناٹو یہ وہ پوچھوں میں مسکراتے لگا، کیا فروخت کرتے ہو؟“
”ملک نواز جیسے شخص کا ماتحت گرم چنے تو فروخت نہیں کرتا ہوگا۔“

”دل چپ۔۔۔ بہت دل چپ آدمی ہو مسز ڈون۔ میری بات پر اُس نے تھہہہ لگایا۔“ اب بتاؤ! وہ مجلس صوف خدمت

کے عوض خریدو گے یا۔۔۔“

”میں اپنی ملل پوزیشن بتا چکا ہوں مگر میرے پاس مضبوط پارٹیاں بھی ہیں۔ ایسی صورت میں دونوں پارٹیاں میں دین براہ راست کرتی ہیں اور مجھے کمیشن مل جاتا ہے۔“
”کمیشن کی شرح؟“ میں نے اُس کا اشتیاق منسوس کرتے ہوئے سوچا کہ مگر مجھ آکڑا انگل رہا ہے، اگر وہ صرف سب مہر کا بیوپاری ہوتا تو میرے اشارے کی تہ تک نہ

اُتر سکتا تھا میں نے ہیروئن اور چرس کا نام استعمال نہیں کیا تھا۔ میری جنس سے جو مراد تھی وہی مطلب اُس نے لیا تھا۔ اور یہ بھی کمیشن ڈیلر سے لیتے ہو۔۔۔ یا خریدار تک محدود رہتے ہو؟“
”دونوں سے برائے نام کل دس پرنسٹ ہیں۔“
”اچھا کرتا یا؟“ بعض سودوں میں ایک پارٹی میدان مار لیتی ہے اور اپنی خوشی سے انعام بھی دے جاتی ہے۔“

”ٹھیک ہے ڈون! ہم اس جنس میں دوسری ملاقات پر کچھ باتیں کریں گے۔“ وہ اُٹھ کھڑا ہوا۔ دراصل یہاں کے حالات خاصے مایوس کن ہو چکے ہیں۔ ایک شخص نے ہم لوگوں میں عدم تحفظ کا احساس پیدا کر دیا ہے۔ بڑے بڑے طاقتور اہل باذرائع ڈیلرز زیر زمین چلے گئے ہیں تو زندہ ہیں۔ وہ بھی حال اور مستقبل سے خوف زدہ ہیں۔ ملک نواز جیسا بااثر شخص اس طوفان کی نذر ہو گیا ہے۔ یہی وجہ رہی ہے کہ میں نے مال کی سپلائی کا کوئی نیا سودا نہیں کیا۔ سنا ہے ادھر بھی ترم سلطان نے ناکہ بندی کر رکھی ہے۔ مجھے ایک دوست نے بتایا ہے کہ پارٹیوں نے روٹ بننے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ ان حالات میں میرے لیے کوئی بڑا سودا کرنا مشکل ہے۔ ہاں اگر کوئی معقول پارٹی ایڈوائس دیتی ہے تو میں کچھ فہمت کے ساتھ سودا کر لوں گا۔“
”ملک نواز نے کسی سر لیاقت علی کا بھی ایک بار حوالہ دیا تھا۔ میں نے لیاقت جیسی پھل کو ساحل کی گرم ریت پر پھینکے کا جائزہ لیتے ہوئے بات بڑھائی۔“ کیا وہ میری فوری ضروریات پوری کرنے کی پوزیشن میں ہوگا؟“

”وہ میرا شریک کار ہے۔“ ابراہام نے جواب دیا۔ ”آج صبح کوئی پارٹی اُس کے پاس گئی تھی۔ بڑے سودے کی آفر دے گئی ہے۔ لیاقت نے مجھ سے بات کی تھی۔ تم بھی اپنی پارٹی بھیجو، بلکہ ساتھ لے آؤ، اگر ریٹ اور مال زیادہ ہو تو ہم پہلی پارٹی کو فی الحال نظر انداز کر سکتے ہیں۔“

”میرے پاس ایک شخص ہے گرینڈ ماسٹر انفالتان

کے راستے لپکا ہے مگر خالی ہاتھ ہے۔ اُس کی شرط ہے کہ مال کی ڈیلیوری کراچی میں ہونی چاہیے۔ اگر مافام شہناز درمیان میں نہ ہوتی تو میں اس کے حوالے کر دیتا، لیکن مادام نے شاید اُسے اپنے لیے محفوظ رکھا ہوا ہے۔“

”کیا تم براہ راست اُس سے ملاقات کر سکتے ہو؟“ ابراہام نے پُراشتیاق لہجے میں پوچھا۔ ہم اُس کی شرط کے مطابق جہاں وہ چاہے گا ڈیلیوری دیں گے، اگر وہ ریٹ اونچا دے سکتا ہے تو مال اُسے اُس کے ملک میں ہم اپنی ذمہ داری پر ڈیلیور کر سکتے ہیں۔“

”باس کے تھرو؟“
”ہاں! اُس نے اثبات میں سر ہلایا۔“
”باس کے ذرائع محفوظ اور لا محدود ہیں۔“

”دوسری ملاقات کہاں اور کب ہوگی مسز ابراہام؟“
”تم سے رابطہ کا ذریعہ؟“

”میرے پاس ایسی کوئی سہولت نہیں ہے، پھر میں اپنے مشکلے بدلتا رہتا ہوں۔ وقت اور جگہ کا تعین آپ کو کرنا ہوگا۔“ وہ اُٹھ کھڑا ہوا۔

”چند منٹ لوں گا مسز ڈون! میں پہلے بتا چکا ہوں کہ ان دنوں ہم لوگ خالصے محاذ اور خالی ہیں۔ میں لیاقت سے بات کرنے کے بعد تمہیں جواب دوں گا۔“

”ہو نکمیر! اور ج ترم سیر آج تھا اور میرے ماتحتی قرب دھوار میں تھے۔ اس لیے مجھے یقین تھا کہ وہ ہماری گفتگو میں شامل رہے ہوں گے۔ میں نے آستین پیچھے کر کے گھڑی کا ڈائل دیکھا، حسب توقع ڈائل پر تھے تھے نقشے اس پارک کر رہے تھے، کال کا اشارہ تھا۔“

”انتظار! میں نے گھڑی منہ کے نزدیک کر کے کھانسی ہوئے کہا، کیونکہ ساتھ دالے کمرے میں ابراہام موجود تھا۔“

”وقت اور جگہ نوٹ کر لو ڈون! وہ اندر آتے ہی بولے۔“
”آج شام چھ بجے ہم تفصیلی بات چیت کے لیے لیاقت کے آفس میں ملیں گے اور تمہارے ساتھ گرینڈ ماسٹر ہوگا۔“

میں نے اثبات میں گردن ہلاتی۔ میں نے اُسے بولنے دیا، اگر وہ نہ بولتا تو میں اُس سے لیاقت کے آفس کا عمل وقوع پوچھ لیتا، لیکن اُس نے خود ہی تفصیل ایک چپ بے لکھی اور میرے حوالے کر دی تھی۔

”اوکے مسز ابراہام! اب میں چلوں گا۔“ میں نے چٹ

جیب میں رکھ کر کہا۔ اگر میری ملاقات اور کوشش کامیاب ہوئی تو میں گرینڈ ماسٹر کو مانتا ہوں گا۔ بصورتِ دمج میں صرف اپنی ضرورت کا مال خریدنے آؤں گا۔“

”سوری ڈون! اُس نے معذرت خواہانہ انداز میں سر ہلایا۔ ہم پرتھون فروش نہیں رہیں! اگر تم خرم سلطان کی لکھی خبر لا سکو تو خدمات کے عوض تمہیں کچھ مال مل جائے گا۔“

اُس نے راہداری تک میرا ساتھ دیا اور پھر ہاتھ ملا کر ایک کمرے میں داخل ہو گیا تھا۔ میں نے باہر نکل کر ایک طرف چلنا شروع کر دیا۔ میری آنکھیں بیدار تھیں اور میں نے جس خطرے کی خاطر ہیدل چلنے کا فیصلہ کیا تھا۔ وہ میرے تعاقب میں آ رہا تھا۔ ابراہام نے اپنے دو گھر گئے میرے تعاقب میں روانہ کر دیے تھے۔ تو تعاقب کے فن سے نا بلد ہی تھے۔ در نہ تیزی سے فاصلہ کم ہرگز نہ کرتے بلکہ روٹ اور کربانی نے بھی اُن کو دیکھ لیا تھا اور گاڑی میرے قریب سے گزرتے ہوئے آگے نکل گئے تھے۔

جب میں نے ایک ٹیکسی کو روکا تو تعاقب کرنے والے مجھ سے چند قدم دور تھے اور فوراً تک کسی دوسری ٹیکسی کا نشان لگ نہ سکا۔ ایک شخص نے بڑے دوستانہ اور معذرت خواہانہ انداز اختیار کرتے ہوئے ہاتھ کے اشارے سے ڈرائیور کو روکا تھا۔

”آپ کو کس طرف جانا ہے جناب؟“ اُس نے شائستہ لہجے میں پوچھا۔
”آپ کو کہاں جانا ہے؟ میں نے بھی نرم اور دوستانہ مسکراہٹ سے سوال کیا۔“

”جہاں تک آپ سہولت سے لے جاسکیں۔“
”میرا تو ارادہ آج دوزخ تک ہے۔“ میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ یہ جلیے آپ کو مقام برزخ تک لے چلا تا ہوں۔“
دوسرے نے کھل کر تھہہہ لگایا۔

”آپ جیسے زندہ دل دوست کے ساتھ ہم دوزخ کی سیر سے یقیناً محفوظ ہوں گے۔“
میں نے دونوں کو بیٹھنے کا اشارہ کیا اور پھر خود ڈرائیور کے ساتھ بیٹھ گیا۔ ڈرائیور نے جب استفسار نہ لگا ہوں سے دیکھا تو میں نے سپر مارکیٹ کا نام بتا دیا۔ ایک بات نے مجھے حیرت دی تھی کہ ابراہام خود بھی اعلیٰ تعلیم یافتہ تھا اور اُس کے گھر بھی فر فر انگریزی بولتے تھے اور بظاہر مہذب دکھائی

دیکھئے۔ اسی بات کے اصول اور دھڑکی دیا تھا کہ میری قوم کے پڑھے لکھے نوجوان اصل راستے سے ہٹ چکے تھے۔ دولت کی بوس نے علم کی روشنی کو بجھا دیا تھا۔ انھیں سپر مارکیٹ کے بس اسٹاپ پر ڈراپ کیا تو وہ ایک بس پر بیٹھ گئے۔ غالباً وہ تعاقب ختم کرنے پر مجبور ہو گئے تھے۔ کوئی بھی ذرائع اختیار کرتے تو میری نگاہوں میں آ سکتے تھے۔ بندے عقل مند تھے۔ جو بھی بس سپر مارکیٹ سے آگے گئی، میں نے ڈرائیور کے کندھے پر تھپکی دی اور ٹوٹی ہوئی اردو میں بتایا کہ مجھے پولی کلینک واپس لے چلو۔ اس نے ناگوار کی کانٹا ہارٹ سکڑ کر کیا تھا مگر ٹیکسی ڈرائیور تھا، مجھ سے ارادہ بدلنے کی وجہ پوچھنے کا مجاز نہ تھا۔ اے کرانے سے عرض تھی اگر میں اسے دنیا کے گرد چکر لگانے کا حکم دیتا تو... وہ تعمیل کرتا۔

پولی کلینک کے پارکنگ سٹیڈ میں اسے کرایہ دے کر اتر گیا۔ میں نے مارون کو تعاقب میں آتے دیکھ لیا تھا۔ بس احتیاطاً ایسا چکر لگایا تھا، ورنہ میری منزل بالی ڈسے ان تھی، لیکن وہ لوگ بھی ادھر ہی گئے تھے اور ممکن تھا، پلٹ کر دیکھتے رہے ہوں اور میری نگاہوں سے اوچھل جاتے ہی ہوٹل کے اسٹاپ پر اتر گئے ہوں۔ جب میں ایمر جنسی وارڈ کا ایک راولڈنگا کر باہر نکلا تو مارون اور کرمانی میرے منتظر تھے، آنکھوں کی زبانی خیر خبریت پوچھی گئی تھی۔

”بھائی لوگ کیوں چلے گئے ہیں؟“ مارون نے سیٹ پر بیٹھ کر پوچھا۔

”بس تعارف ہوا اور چلے گئے۔ میں نے جواب دیا۔ جس طرح ہم اندھیرے میں ٹامک ٹوئیاں مار رہے ہیں اسی طرح ہمارے مخالفین بھی اندھیروں میں ٹھوکریں کھا رہے ہیں۔“

”یعنی کامیابی نہیں ہوئی؟“ کرمانی بول پڑا۔ گوہر مقصود تو کچھ نہیں لگا۔ میں نے چہرہ گھما کر بتایا۔ ”مگر غلط بے سود بھی نہیں رہا۔ ایک اور بیڑیا دریافت ہوا ہے۔ حالانکہ میرا خیال تھا۔ پنڈی اسلام آباد انسان کی جنگل کے تمام بیڑیوں سے صاف ہو گیا ہے، لیکن یہاں تو ہر دوسری گھوہ میں ایک بیڑیا چھپا بیٹھا ہے۔ اب معلوم ہوا کہ بیڑیوں کا اصل گڑھ پنڈی نہیں اسلام آباد ہے۔“

”آپ جنگل کے اس گنجان اور محفوظ حصے میں داخل ہی نہیں ہوئے تھے؟“ کرمانی بولنے لگا۔ مجھ سے پوچھیے کہ یہ

خوش نما جنگل ناگوں اور دندوں سے اٹا پڑا ہے۔“ اور آپ جیسے محافظ بالکل خاموش رہے ہیں؟“ جی ہاں! کرمانی کے لہجے میں طنز کی کاٹ تھی۔ اس لیے کہ ہر ناگ اور بیڑی کے گلے میں معتز شہری کا پتھر ہوتا ہے اور ہم جیسے تنخواہ دار محافظ معتزین شہر کی طرف دیکھ بھی نہیں سکتے۔ اب بھی کوئی ایسی مجبوری تمھارے ساتھ ہے؟“ کرمانی نے نفی میں گردن ہلائی۔

کوئی بھی ایسا شخص جسے مارشا جانتی ہو اور اس سے ملنا چاہتی ہو، اسے اس تک پہنچنے کی کوئی دشواری ہوتی ہے نہ ضرورت پیش آتی ہے۔ مارشا خود بخود بونو کھتی ہوئی اپنے طالب تک پہنچ جاتی ہے۔ لہذا میں اور مارون کل پارک کر کے ٹہلتے ہوئے ہوٹل میں داخل ہوئے ہیں۔ میں نے مارشلے بارے میں مارون کو بتا دیا تھا۔ اس لیے اس نے کاؤنٹر کی جانب دیکھا۔ ایک ہم ناما فوس سی خوشبو احساس کے ساموں میں جذب کرتے ڈائمنگ ہال کی ایک خالی میز پر جا بیٹھے۔ ایک دھیرے اور مہذب نوجوان ویز قریب آکر تعظیماً شکر آیا۔ چونکہ ہم دونوں قومی لباس میں تھے۔ اس لیے اس نے سکرپٹ بھی دی ہی تھی۔

”ہمیں اپنے میزبانوں کا انتظار ہے۔ میں نے میز کی سطح پر انگلیاں بچھلتے ہوئے کہا اور ویز رد قدم پیچھے ہٹ کر واپس چلا گیا اور بورس جگ گلاس ٹبے میں رکھ کر لایا اور خاموشی سے پانی رکھ کر پلٹ گیا۔

”اس ہوٹل کی چمک اور سروس حاصل کرنے والے ظہیر لگی یقیناً غلط فہمی میں مبتلا ہو کر جلتے ہوئے گئے۔“

مارون کی بات کا میں نے صرف گردن سے اثبات میں جواب دیا تھا۔ میں تو مارشا کو سوچ رہا تھا کہ اس کی غیر متوقع آمد پہلے قدم پر ہلاکت خیریاں لے کر طلوع ہوئی تھی مگر بازی آؤٹ کر میرے حق میں چلی آئی تھی۔ میرے دشمن نے جو زہر بلا تیر میرے لیے کمان سے چھوڑا تھا۔ وقت کی سپاٹ دیوار پر آپٹ کر تیر کا رخ دشمن کی جانب ہو گیا تھا۔ وہی مارشا، جو میری شناخت اور تباہی کی علامت سمجھی گئی تھی۔ میری ذات کے ماحصل سے ٹکرا کر میری سلامتی اور دشمن کی تباہی کی ضمانت بن گئی تھی۔ اب میں مارشا سے وہی کام لے سکتا تھا، جو دشمن لینے میں ناکام ہو چکے

تھے۔ لیکن خطرات کچھ بڑھ گئے تھے۔ میری ذمے داریوں میں مارشا جیسی عزیز اور قیمتی جان کا اضافہ ہو گیا تھا۔ میں ٹینڈ، امینہ اور رشید کے لیے فکر مند تھا کہ مد مقابل خطرناک گروہ اوجھے اور روایاتی ہتھکنڈوں پر اتر آیا تھا۔

میری نگاہیں چاروں اطراف گردش کر رہی تھیں۔ مارشا اگر بیدار تھی تو اسے اس کی پس نے پیغام دے دیا ہو گا کہ کہیں قریب ہی خرم سلطان جو دہری موجود ہے اور خرم سلطان کی موجودگی کا پیغام پلٹے کے بعد وہ لڑی پالوں میں بھگتے ڈلنے پر بھی وقت ضائع کرنے والی نہ تھی۔

”غتم؟“ مارون کی سرگوشی میری سماعت سے ٹکرائی۔ ”اول یہیں مارشا کی یادوں سے چونک کر ابھرا۔ مارون کھڑے کل اور پریشان دکھائی دے رہا تھا۔

”میرا خیال ہے، کوئی ہمارے تعاقب میں تھا اور وہ باہر ہے۔“

میں نے خیال رکھا تو تھا دوست! میں نے نرم آواز میں جواب دیا۔ جس میں یقین نہ تھا۔

”ابھی ایک چہرہ شیشے سے لگ کر ہٹ گیا ہے۔“ مارون نے بیرونی دیوار کی جانب دیکھ کر کہا۔ ”وہ شخص لان میں پھسل رہا ہے۔“

”ہاں شاید؟“ میں نے دیکھا کہ ایک نیلے سوٹ والا لان میں پھسل رہا تھا۔ کیا اس نے ہماری طرف دیکھا تھا؟

”ہاں! مارون کے حلق سے غڑا ہٹ ابھری وہ میں اسے پٹانے جا رہا ہوں۔“

”کیسے پیارے؟“ ”اے بنانا ہے۔“ مارون اٹھ کھڑا ہوا۔ اگر وہ شرافت سے نہ بنا تو دوسرا طریقہ، ہر کیفیت اگر وہ تباہ ہے تو اسے ٹک پیاس سے لے جاؤں گا جیسے بھی ہوا۔ آپ کسی بھی صورت میں باہر نہیں آئیں گے۔“

”کوئی حماقت نہیں؟“ میں نے دوستانہ لہجے میں کہا، لیکن وہ کندھے اچکا تا ہوا کسی ساند کی طرح گداز قانون لٹا رہا ہوا مجھ سے دوڑ چلا گیا تھا۔

انسان بھی حالات اور وقت کے ہاتھوں کتنا مجبور ہوتا ہے۔ اُسے گڑبگڑ کی طرح رنگ بدلتے پڑتے ہیں۔ میں جو دعائیں مانگ رہا تھا کہ مارشا حالت بیداری میں ہو اور میری خوشبو کا پیغام اسے مل جائے، فوراً ہی یہ دعا کرنے لگ گیا تھا کہ

خدا کرے وہ گہری نیند میں ہو اور میری خوشبو پیغام میں کر اس تک نہ جاسکے۔ لیکن پہلی دعا کو پہلے دربار عالیہ سے شرف قبولیت عطا کیا جا چکا تھا۔ وہاں پہلے آؤ پہلے پاؤں کے اصول کا رواج ہے جو دربار خداوندی میں عاجزی کے ساتھ حاضر ہو جاتا ہے۔ اسے بلا تاخیر مراد سے ہٹنا کر دیا جاتا ہے۔ میری تمام تر توجہ باہر تھی۔ میں یہ دیکھنا چاہتا تھا کہ مارون میرا دست راست، میرا پیارا ساتھی، مجھے خطرے سے بچانے

کے لیے کون سا قدم اٹھاتا ہے، کیسی کارروائی کرتا ہے۔ اس کی عاجلانہ اور اتحاد کارروائی میرے مقاصد کے لیے نقصان دہ بھی ہو سکتی تھی۔ میں خود کو سات پردوں میں چھپا کر رکھنے اور منکار بیڑی کی فطرت اپنانے رکھنے کا خواہش مند تھا جس طرح بھڑیا رات کی تاریکی میں جنگل سے نکل کر آبادیوں کا رخ کرتا ہے اور پتھرم زردن میں ایک جست لگاتا ہے اور بکری دہلیز لیتا ہے، جب تک غرض شناس کتا مالک کو بیدار کرتا ہے تو بیڑیا بہت دور نکل چکا ہوتا ہے۔

مگر میری تمام تر احتیاطی تدابیر ریت کی دیواروں کی طرح مجھ پر گرنے لگی تھیں گو مجھ سے کوئی غلطی بھی نہ ہوئی تھی ہاں! رنگ باز خان کی بے سہارا بیٹیوں کو سہارا دینے کی حماقت ہو گئی تھی، اگر میرے اندر صرف بیڑی کی خصلت ہوتی تو ٹینڈ اور امینہ میرے نام سے واقف نہ ہوتیں۔ کبھی میرے سائے میں راحت محسوس نہ کرتیں، لیکن میں بنیادی طور پر ایک حساس انسان بھی ہوں۔ یہی خرابی حالات کو خراب کر رہی تھی۔

مارون بھی ٹھلٹا ہوا لان میں داخل ہو گیا تھا۔ اس شخص نے چونک کر دیکھا اور پھر ایک شارع پر جھک گیا اور دونوں ہاتھوں میں گلاب کا پھول تقام لیا۔ مارون اس کے قریب جا کر ٹک تھا۔ مغامیرے جیم کو بھر پور جھٹکا لگا ایک نوجوان پھول دار گھنی جھاڑی کی اوٹ سے نمودار ہوا تھا اور مارون اس سے بے خبر تھا۔ میں دُور تھا اور دشمن قریب تر تھا۔ مارون نے جھکے ہوئے شخص کے شلے پر تھپکی دی اور اسی وقت دوسرے نوجوان نے مارون کی پشت پر ہاتھ رکھ دیا تھا۔

میں صرف گہری سانس لے کر رہ گیا تھا۔ مارون جس مقصد کو لے کر گیا تھا۔ بلاشبہ وہ کامیاب رہا تھا، لیکن وہ کسی کدے کر نہیں جا رہا تھا بلکہ وہ اُسے دیوالیہ کی زد پر لے گئے تھے۔

"کیا میں یہاں بیٹھ سکتی ہوں؟" شیریں آواز سن کر نہیں نے دائیں جانب دیکھا۔ وہ خطہ رُوقریب کھڑی تھی۔ آپ کو یقیناً کوئی اعتراض نہیں ہوگا؟ وہ دم سے میرے سامنے بیٹھ گئی۔ وہ مار شافعی، لیکن اپنی شکل ایک آپ کی دبیز تہ میں چھپائے ہوئے تھی۔ بڑی دیر کر دی میرے بھائی نے آئے آتے؟

"بلن جان" میں نے چہرے پر جھلکاریں مارتی پریشان شکایت کی پانڈی میں منظم کتے ہوئے کہا: میں چاہتا تھا کہ تم لوگ کچھ دیر آرام کرو۔

"ہائی باتیں بھائی! اس نے حسب عادت زلفوں کے چپے بکھیرتے ہوئے کہا: اب بتاؤ، یہ کیا معاملہ ہے؟ تم تو اپنے باپ کی ناگہانی موت پر آنے تھے۔ یہ اصرار کیا کر رہے ہو؟ دیں، تم نے دیکھو کوئی بہانہ نہیں چلے گا۔ میں جانتی ہوں کہ تمہارا باپ کتنا ہی اہم کیوں نہ ہو وہ اس سلسلے کی کڑی نہ ہو گا۔ یا تو یہی پرانے پھٹے میں اپنی موتی ٹانگ اڑانے کی عادی نہیں ہے۔ اوصرا اکل کے ذریعے مافیا کا مقامی سربراہ مجھ تک گیا تھا اور اس نے بتایا تھا کہ پاکستان میں خرم سلطان کو تم دونوں کی ضرورت ہے۔ میرا ماتھا تو ٹنک گیا تھا لیکن تمہاری اس سبھری پھیلی نے ناک میں دم کر دیا تھا کہ جلدی جھاؤ خرم سلطان کسی مشکل میں ہوگا۔"

"کیا تمہیں اب بھی شک ہے مارشی؟" "اوہ... نہیں!" اس نے ہاتھ بچایا۔ لیکن پریشان ضرور ہوں۔ آخر مافیا والے تمہاری جانب کیسے اور کیوں متوجہ ہو گئے ہیں؟

"ایک مجرم گروہ کیوں اور کب کسی شخص کے پیچھے پڑتا ہے؟" وہی تو... وہ آگے جھک آئی یہ آخر کیوں؟ کیا تم نے ان کے مفادات کو نقصان پہنچایا ہے؟

"ہاں میں نے یہ کوئی شہابی جہاز دی۔ لیکن براہ راست نہیں..."

"شیر چھوڑو اب آگئی ہوں تو جان بھی لوں گی؟ اس نے پرس کھولا اور میرے سامنے رکھ دیا۔ تمہاری جیب کا کیا حال ہے خرم؟ ہمارے پاس تو کچھ تھا، وہ ستر جانسن نے رکھوایا تھا۔ میرے پرس میں صرف ایک آپ کا سامان ہے۔ ہم نے ابھی تک ہوش کو ادائیگی نہیں کی۔ تمہارے یہ

لوگ بہت اچھے ہیں۔ انھوں نے عارضی طور پر ہمیں ایک کمرہ دیا ہے۔"

"جب ہم یہاں سے جائیں گے تو ان اچھے لوگوں کو شکریہ ضرور ادا کریں گے۔ میں نے جواب دیا: جاؤ گو تم کو بے آواز ہے۔ وہ تو ٹھونڈے ہاتھی بچ کر سویا ہوا ہے۔ مارشا ہنسے لگی۔

"روم نمبر؟ میں نے پوچھا اور ایک دیر کو اشارے سے بولا: بلیو ویرس۔ ہو کہ مناسب کو جگا کر یہاں سے آئے۔"

مارشا نے انگریزی میں میری ہدایت میرے کو پہنچائی پھر جھک کر میری آنکھوں میں جھلکتے تھے۔ تمہاری آنکھوں میں پریشانی کا ڈھول بھینا ہوا ہے خرم! کیا ابھی خطرہ ڈھونڈ رہی ہو؟ میں کسی خطرے کی وجہ سے پریشان نہیں ہوں مارشی! میدان جنگ میں سپاہی کسی خطرے کی وجہ سے پریشان نہیں ہوتا۔ میری آنکھوں میں بہت سے دکھ ہیں۔ دشمن تاج محل میری ذات کی نہیں کے اندر ہے اور کچھ اہم جگہوں پر اس کا قبضہ ہے۔

"ہم... مارشل نے مڑ چلایا۔ تو شہر کے شکر خورے کو یہاں بھی شکر دے دی ہے۔ واقعی خرم سلطان یہی بات ہے؟ میں نے مسکرا کر اثبات میں آنکھیں پچائی۔

"سلسلہ وہی ہے؟" "ہاں! لیکن زمین، فضا اور حالات اور میں۔ ہر جگہ دریافتیں اور پہاڑوں کے سلسلے ہوتے ہیں، لیکن اسیر کے سلسلہ کوہ اور ہمارے ہاں کے پہاڑوں کے سلسلے میں تبدیلی فرق ہے۔"

"میں تو پہاڑ ناں! مارشا نے کہا: یہ بس اونچائی بلندی کا فرق ہوگا۔"

"ہاں میں نے گوتم کی طریت دیکھنے پر جواب دیا جو میزوں سے ٹکراتا ہوا آ رہا تھا جیسے اسے خطرہ رہا ہو کہ ذرا سی تاخیر ہوئی تو کچھ دیکھا ہے وہ شراب کی طرح بکھر جائے گا۔ وہ اسی انداز میں جو ابھی قریب آیا، میری آنکھوں کا مانوس اشارہ پا کر لمبے ساکت ہو گیا تھا، جیسے ردیوٹ کے اندر دوڑتی ہوئی برقی ردیو منتقل ہو گئی تھی۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ وہ بھرے ہاں میں اپنی محبت کا اظہار کر کے دوسروں کو متوجہ کر دے۔

"بیٹھ جاؤ خرم! میں نے جیسے میں پیارا اور محبت بھارتی

ہوئے اشارہ کیا اور وہ گہری سانس لیتا ہوا صوفے پر دم سے گر پڑا۔ میں اپنے بھائی کو سینے سے لگاتے کے لیے بے کل ہوں! خرم! یہ خواہش حالات کے حوالے کر رہا ہوں۔"

"کچھ بتائیں گے بھی نہیں باس؟" وہ جیسے رونے لگا تھا۔ ہم صورت حال سے بے خبر اور بے حد پریشان ہیں۔ مجھے احساس ہے۔ میں نے اٹھتے ہوئے کہا: میرے ماتھے آؤ کاؤنٹر کا حساب صاف کر لیں۔"

میں نے ان کی ادائیگی کرنے کے بعد کاؤنٹر پر لگا کر شکریہ ادا کیا اور گوتم کو ایک ویٹر کے ساتھ روم لے بیٹھ دیا، اگر کارون کو بے جا جانے والوں نے کچھ معلوم کر لیا تھا تو مارشا اور گوتم کے لیے جس احتیاط کی ضرورت تھی، وہ باقی نہ رہی تھی۔ اس لیے میں نے ریسک لیتے ہوئے انھیں زیر و کوس میں لے جانے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

بلرون جن حالات کا شکار ہو چکا تھا... وہ بظاہر تشویش ناک ہی تھے، لیکن سلامتی کی ایک کرن نے میری پریشانی میں اضافہ نہ ہونے دیا تھا۔ کرمانی ہماری نگرانی کر رہا تھا۔ اسے میں بھی ہدایت دے آیا تھا کہ وہ ہم پر نگاہ رکھے۔ امید تو یہی تھی کہ اس نے صورت حال کا جائزہ لے کر کوئی نہ کوئی کارروائی ضرور کی ہوگی۔ وہ ایسا ہی ذہین نڈر اور عملی انسان تھا۔

میں نے حفظ مالتقدم کے طور پر مارشا کو اپنے ساتھ رکھا تھا اور گوتم کو کرلے کی کار حاصل کر کے تعاقب کی ہدایت دی تھی۔ مقصد صرف یہی تھا کہ اگر باہر خطرہ موجود ہو تو وہ ایک وقت دونوں کاروں کو نشانہ نہ بنائیں گے۔

سپر مارکیٹ کے ٹرن تک کوئی آثار نہ تھے... میں عقب نما آئینے میں عقب کا بغور جائزہ لیتا رہا تھا۔ ٹریفک کے اڑد نام میں گوتم کی کار لہریے بناتی ہوئی ہماری کار کے پیچھے آ رہی تھی۔ سڑک پر ہر قسم کی گاڑیاں تھیں۔ اومنی بس اور سول مینی بس ایک دوسرے کو ہرنے کی احمقانہ کوشش میں گڑبڑاتی ہوئی میری کار کے پیچھے چلی آ رہی تھیں۔ میں نے انتہائی باتیں جانے کا اشارہ دیا اور مینی بس رگڑکھاتی ہوئی آگے نکل گئی۔ تب ہی ونڈا سکرین نے قہقہہ لگایا اور شیشے کے ٹپٹے تھے سخت ٹکڑے میرے چہرے پر لگے۔ چونکہ کار کی رفتار پندرہ بیس کے درمیان تھی اس لیے بریک لگانے

اور باہر کودنے میں کسی پریشانی کا سامنا نہ کرنا پڑا تھا۔ جب حواس بحال ہوئے تو مارشا نے بتایا کہ گولی اس کے دائیں کان کی کوکھ لاتی ہوئی پچھلی نشست میں بیوست ہو گئی تھی۔ ٹریفک سارجنٹ نے سیٹے ٹریفک کو روکنے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے سیٹیاں بچائیں۔ جب ہر گاڑی ٹرن لیتی چلی گئی تو وہ ٹریفک سے بچتا ہوا میرے قریب آ گیا۔

"کیا ہوا جناب؟" اس نے میرے خون آلود چہرے کو دیکھ کر پوچھا۔ میں دیکھ رہا تھا، بس آپ کی گاڑی سے ٹکرائی نہ تھی، پھر یہ شیشہ...؟

"شاید کسی بچے نے چھکا لگایا ہوگا سارجنٹ! میں نے رومال سے چہرہ صاف کرتے ہوئے بتایا۔ اس نے جھانک کر اندر دیکھا۔ پچھلی سیٹ کا ریشمی کپڑا زخمی تھا اور گول زخم کے منہ سے دھواں نکل رہا تھا۔

"کیا بات ہے جناب؟" سارجنٹ نے چپختی ہوئی نظروں سے مارشا کے سراپا کا جائزہ لیتے ہوئے پوچھا۔ آپ پر تو گولی چھلائی گئی ہے۔"

"نہیں آفیسر! مارشا نہ جانے کیسے میری مشکل... اور سارجنٹ کا سوال سمجھ گئی تھی، حالانکہ ہم اردو میں باتیں کر رہے تھے۔" آفیسر کو بتاؤ کہ میری ساتھی سگریٹ پی رہی تھی۔"

"آپ کو کچھ دیر انتظار کرنا ہوگا، جناب!" سارجنٹ نے معذرت آمیز لہجے میں کہا۔ پھر وہ شارٹ ریج ٹرانسمیٹر پر کال کے حادثے کی رپورٹ دینے لگا۔

"سینے، آفیسر! میں نے حکمانہ لہجے میں کہا: یہیں ایک سرکاری میٹنگ میں جانا ہے۔ کار اپنے قبضے میں کر لیں۔" اس سے قبل کہ وہ کوئی فیصلہ کرتا، میں ایک تماشائی کی کار کی جانب بڑھ گیا۔ اس نے فوراً ہی ہاتھ پیچھے کر کے عقبی نشست کا دروازہ کھول دیا۔ جب سارجنٹ پڑ پڑا ہوا دوڑا تو کار ٹول جیت لگا کر ٹرن لیتی ہوئی نکل گئی۔

"آپ نے بہت اچھا فیصلہ کیا دوست!" نوجوان نے عقب نما آئینہ اڈجسٹ کرتے ہوئے میری کارروائی کو سراہنا شروع کر دیا۔ "یہ پولیس فائے علانے کو روکتے نہیں۔ علانہ سمجھانے تو بس پریشان کرنا شروع کر دیتے ہیں۔ آپ کو کہاں جانا ہے؟"

"بولی کیلک" میں نے بتایا۔ اس نے خاموشی اختیار کر لی۔
 فاسل بھی مختصر تھا۔ اس نے کار اندر سے جاکر پارک کر دی۔
 "میں سر جیکل وارڈ میں جا رہا ہوں۔" اس نے انجن بند کرتے ہوئے بتایا۔ "چند منٹ کے لیے، اگر آپ کو زیادہ کام نہ ہو، تو میری خدمت حاضر ہیں۔"

میں نے ابھی شکریہ ادا کرنے کے لیے مناسب الفاظ کا انتخاب بھی نہ کیا تھا کہ ایک سرخ مزاج چرتائی بونی رُکی اور ہمارا منن "ہیلو" کی بات لگاتا ہوا ادھر بڑھ گیا۔ موقع غنیمت تھا، لہذا میں نے مارشا کا ہاتھ پکڑا اور ایمر جنسی وارڈ میں داخل ہو گیا۔ مجھے وہیں سے نکل کر شرک پر جانا تھا اور اپنا جھوٹ بھی چھپانا تھا۔ اگر وہ اندر چلا جاتا تو میں آسانی سے ایمر جنسی وارڈ سے نکل کر گیسٹ کے راستے سڑک تک چلا جاتا مگر وہ اپنے نوادہ دوست کے ساتھ وہیں جم گیا تھا۔ پانچ منٹ "ابھی مر لیوں کے چہرے دیکھا، میں وارڈ کے دوسرے کنارے تک گیا اور پھر باہر نکل آیا۔ وہ دونوں وہیں کھڑے تھے۔"

"آپ جس مریض کو دیکھنے آئے تھے، غالباً اسے فارغ کر دیا گیا ہے۔" اس نے شکر کرتے ہوئے کہا۔ ادھر میرے ساتھ بھی ایسا ہی ایک خوش گوار حادثہ ہو چکا ہے۔ یہ میرے براہِ رن لار ہیں میری اجازت کے بغیر اپنی ہمیشہ صاحبہ کو گھر لے گئے ہیں۔ لہذا میں کئی دنوں کے لیے فارغ ہوں۔ اس نے قہقہہ لگایا۔ آئیے، آپ کو گھر تک ڈراپ کر آؤں۔"

میں انڈی نہ تھا کہ اس نوجوان کی آنکھوں میں اُترتی، انسانی ہمدردی سے دھوکا کھا جاتا میں دل ہی دل میں ہنسا تھا۔ مارشا جیسی لڑکی نے میری اہمیت بڑھائی تھی ورنہ وہ جلدیے حادثہ پر شاید ایک نظر غلط ڈالتا ہوتا۔

میں نے یہی سوچ کر اس کی پیش کش قبول کر لی تھی کہ اگر کوئی شخص حصن ایک خوش رو لڑکی کو دیکھ کر احمق بن گیا ہے تو اس کی حماقت سے فائدہ اٹھانے میں حرج ہی کیا ہے۔ وہ یقیناً فہم زدہ تھا۔ غلوں میں رگدان کے جواز اور اتفاقات کو بھی شروع ہٹا کستے ہیں۔ سربراہ حادثاتی ملاقات، محبت کی فلوں سے گزرتی، شادی پر ختم ہوتی ہے۔

"شکریہ دوست! میں نے دوستانہ مسکراہٹ دی اور مارشا کو بیٹھے کا اشارہ کیا۔ مارشا کے لیے دوسرے نوجوان نے لپک کر دروازہ کھولا اور مارشا "کیلک نو" کہہ کر اندر بیٹھ گئی۔ میرے لیے جگہ چھوڑ کر وہ کونے میں جا بیٹھی تھی۔ میں جھکا تو میری خوش فہمی

میری پشت سے ٹکرائی۔ میں مارشا سے ایسے ٹکرایا تھا جیسے فری اسٹیل گشتی کے پہلوؤں نے درمقابل کو ٹکھڑی ہو۔ میرے تو میں طبق روشن ہو گئے تھے اور میری زور وار تکتے مارشا کے بھی چہرہ طبق تو ضرور روشن ہوئے ہوں گے۔ اس کے منہ سے دھڑکنے والی آہری تھی۔

"تم انڈی نہیں ہو، مسٹر! اس نے ریوالتور کی جھلک دکھائی۔ "لہذا خاموش رہو گے۔ زندگی بہر کیف، خوب صورت لڑکی سے زیادہ قیمتی ہوتی ہے۔ اگر سرور و غنہ کی کوشش کرو گے تو تمہاری لاسٹس اوجھڑاؤں میں اچھال کر ہم اس غیر ملکی بلبل کو لے جائیں گے۔" "مم... میں گائیڈ ہوں۔" میں ہلکے سے ہونے بولا۔ اگر تم اسے لے جانا چاہتے ہو تو مجھے زندہ ہی کہیں ڈراپ کر کے لے لے جانا۔ "سنو، دوست! ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھے نوجوان نے پلیٹ کر نرم آنکھیں کہا۔ "تعاون کرو اور زندہ رہو۔ یہی عقل مندی ہے۔" میں نے غصہ بھری نگاہ میں گروان ہلائی۔ مارشا بھی اس صورت حال کو سمجھ گئی تھی۔ اس لیے حصن ڈراپ کرتے ہوئے ہڈیانی انداز میں ان لوگوں کو گالیاں اور دھمکیاں دیتے تھی۔

"سنو، مس! ایک بولا۔" ہم انگریزی گالیوں سے بے مزہ نہیں بننا کرتے۔ دیکھو نا، ہندوستانی قوم سو سال تک تمہاری قوم سے گالیاں کھاتی رہی تھی، کچھ نہ کچھ اثر بھی باقی ہے۔"

جونی کا، خواجہ ناظم الدین روڈ پر پہنچی، میرا شک یقین کی راہ پر لگ گیا تھا میں نے ایک لحظہ کے لیے سوچا تھا کہ نوجوان مارشا کو دیکھ کر حواس باختہ ہوئے ہوں گے مگر ان کے بدلے تیر... اور منزل کا راستہ دیکھ کر خطرے کا احساس الارم بجانے لگا تھا۔

میرا ذہن "درپیش خطرے سے ہٹ کر سوچنے لگا تھا۔ کوئی غلطی ایسی سرزد ہوئی تھی، ورنہ وہ لوگ ہونل تک رسائی حاصل نہ کر سکتے ہیں۔ نے تعاقب کے امکانات پر نگاہ رکھی تھی لیکن میری نگاہ ابھی کئی تھی۔ میں غالباً شروع ہی سے ان لوگوں کو اپنے پیچھے لگے ہوا تھا۔ ایک سوہمہ سا خیال یہ بھی تھا کہ جانسن کے قائم مقام نے اسلام آباد کے تمام ہوٹلوں کے ریکارڈ کی چھان بین کروائی ہو اور ایک غیر ملکی کلنگ جوئے کو ٹریس کر لیا گیا ہو۔ میں ابھی کوئی فیصد نہ کر پایا تھا کہ میری نگاہ اس کار پر جا پڑی جو اوور ٹیک کرتی ہوئی آگے نکل گئی تھی میں نے گوتم کی مہادھنی گروان پہچان لی تھی۔ تب ہی اطمینان کی ایک لہر میری رگ رگ میں سرایت کرتی مجھے ہر سون کو گئی تھی۔ گوتم ایک آؤٹ کوارٹرز تھا۔ نازک ترین طہات میں اس نے کھیل کا پانسہ پٹا تھا۔ اس میں ذہنی اور جسمانی طاقت ایسی ہی تھی جس پر اعتماد کیا جا

سکتا تھا۔ گوتم کے سامنے صرف اس کا منہ بولا بھائی خرم سلطان ہی نہیں بلکہ اس کی روح کی غذا، اس کی عزیز ترین سہیلی مارشا کی عزت اور سلامتی بھی تھی، اس لیے وہ کوئی بھی جارحانہ قدم اٹھا سکتا تھا۔

جنگ تک خواجہ ناظم الدین روڈ مصروف تھی۔ زیر پوائنٹ کی جانب سے بھی ٹریفک آرہی تھی۔ میں جیسے گوتم کے ذہن سے سوچ رہا تھا، اگر میں اس کی جگہ ہوتا تو ایسی مصروف سڑکوں پر کسی قسم کی حماقت نہ کرتا۔ چونکہ اس کے جونی کا آگے نکل گیا، اچانک اگلی کار ڈرائی اور ترمیمی ہو گئی۔ چونکہ ہماری کار بھی کم فاصلہ رکھے، اس کے پیچھے دوڑ رہی تھی۔ اس لیے بریک لگاتے لگاتے بھی چند انچ قریب جا کر زوردار جھٹکے سے رُکی۔ سچویشن نے ان کے بھی اوسان خطا کر دیے تھے، کچھ کسر جھٹکے نے پوری کر دی تھی۔ ریوالتور والا ہاتھ فیرا رادی طور پر اگلی سیٹ کی پشت کا سہارا لینے پر مجبور ہوا تو میرا ہاتھ بھی قریب ہی تھا میں نے سیٹ کے ساتھ لگا ہاتھ زور سے پکڑا

جانب چلا لیا۔ ریوالتور بند شیشے سے جا ٹکرایا۔ "گود جاؤ۔" میں نے مارشا کو دھمکاتے ہوئے کہا۔ دوسرے نے مارشا کو گدگئی اور روٹنگ کرتی ہوئی اوپر ابھری اور پھر جھڑیوں کی باز کے عقب میں چلی گئی۔

میرے دونوں ہاتھ شیشی انداز میں چلنے لگے۔ ڈرائیونگ سیٹ والا تو دوسری ضرب ہی پر اسٹیئرنگ وھیل پر اونڈھا ہو گیا تھا۔ دوسرے نے ترچھا ہو کر لائیں چلائی تھیں۔ تب ہی مجھے اس کے نازک حصے پر ضرب لگانے کا موقع مل گیا تھا۔ وہ کراتا ہوا ٹھک گیا تھا جب گوتم فرماتا ہوا قریب آیا تو میں کھیل ختم کر چکا تھا۔

"شکریہ پیارے!" میں نے باہر نکل کر گوتم کے شانے پر پھینکی دی۔ اس نے جھانک کر اندر دیکھا اور پھر پلٹ کر مارشا کو دیکھنے لگا جو باڑ لادوٹ سے نکل کر لباس بھار رہی تھی۔

"تمہیں چوٹ تو نہیں آئی، جانم! گوتم نے سرسراہتی آواز میں بوجھا۔ شاید غصہ اس کی رگوں میں لہریں مار رہا تھا۔ "اب کیا حکم ہے، اے! اس نے پوچھا۔

"اندر جا کر ڈرائیونگ سیٹ خالی کرو۔" میں نے اطراف کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔ وہاں ان لوگوں کو نکالنا مناسب نہ تھا۔ چند سوگزدور مصروف شرک تھی۔ گوتم نے اندر جا کر اسے گھسیٹ لیا اور پھر باہر نکل آیا۔ "آؤ، اس کار کو فارغ کر لیں۔"

تمام کارروائی میں تین چار منٹ لگ گئے تھے۔ مارشا میرے ساتھ اگلی سیٹ پر چلی اور گوتم ریوالتور سے پچھلی سیٹ پر بیٹھ گیا تھا

وہ دونوں اس کے پاؤں میں اوندھے سیدھے پڑے تھے۔ "تم بتاتے کیوں نہیں خرم؟ مارشا دھڑک کر بولی: "یہ کون لوگ ہیں؟ کیا ان کا تعلق قاتل سے ہے؟"

"نہیں... میں نے مختصر سا جواب دیا۔ "پھر...؟" اچھا، شاید مادام سعدیہ کے تحفے ہیں۔ وہ ہنسنے لگی... "تم وہاں سے ایک بڑی ذمے داری ساتھ لائے تھے نا۔"

"کیا مادام نے تمہیں بتایا تھا؟" "اچھا، نہیں۔" مارشا نے میری لان پر ہاتھ مارا۔ "تمہارے بعد اس لڑکی مادام جوڑی نے ہمارا گھبراؤ کیا تھا۔ انکل کو خاموشی پریشانی دی تھی، اس نے۔ ایڈی کو وہ اغوا کر لے گئی تھی۔ جب انکل نے ان پورٹ اتھارٹی سے تمہارے چلے جانے کی تصدیق دی تو اس نے پیچھا چھوڑا تھا۔ پھر وہ میری دوست بن گئی تھی۔ اس نے بتایا تھا کہ مادام سعدیہ نے تمہیں کوئی چکر دے کر بھیجا ہے۔"

"کیا انکل پھر اسی فیلڈ میں چلے گئے ہیں؟" "ہاں، ان دنوں مادام جوڑی کے گرد وہیں سینڈ ماسٹر ہیں۔" "جب تمہیں میرا فرضی پیغام دیا گیا تو انکل کا رد عمل کیا تھا؟"

"اب... مارشا نے اپنے پچھلے بال پیٹتے ہوئے کہا۔ "مجھے یقین آ رہا ہے کہ انکل بھی اس سازش میں شریک تھے۔"

"یعنی میری موت کے بدلے پر وہ سمجھاؤں ان کی منشا سے ہوئے ہیں؟" "شاید ان کو دوسری بات بتائی گئی ہو۔"

"دوسری سے تمہاری مراد؟" "جس طرح میں تاریکی میں دکھایا گیا تھا۔ مارشا، انکل بیس کر کی طرف داری میں بولی، "ان سے بھی کہا گیا ہوگا کہ خرم سلطان کو مارشا کی ضرورت ہے۔"

"ما فیلے کے حوالے سے تمہیں یہ خیال نہیں آیا، مارشا، کہ خرم اور بدنام زمانہ تنظیم میں تعلق ہو سکتا ہے؟"

"در اصل... گوتم بول پڑا۔ "ہم پیغام پا کر خوشی میں سب کچھ سمجھ گئے تھے۔ جو شخص ہمارے خوابوں میں بس رہا تھا، اس نے ہمیں بلایا تھا۔ ہم کچھ اور کیسے سوچتے، باس؟"

"میں اپنے پیارا دل پر کوئی الزام تو نہیں لگا رہا۔" میں نے محبت اکیر انداز میں جواب دیا۔ "تمہاری جگہ میں ہوتا تو میں بھی تم لوگوں کا پیغام پاتے ہی خوشی کی لہروں پر سوار ہو جاتا۔"

بقیہ واقعات کے لیے پانچواں حصہ ملاحظہ کیجئے